امیر شریعت نمبر

حصّہ دوم

بیاد

امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

۱۸۹۲ء — ۱۹۶۱

مُدیر

سیّد محمد کفیل بُخاری

اندرون ملک ۱۰۰/ روپے ◎ بیرون ملک ۱۰۰۰/ روپے پاکستانی

دارِ بنی ھاشم، مہربان کالونی، مُلتان۔ فون: ۵۱۱۹۶۱

تحریکِ تحفّظِ ختمِ نبوّت (شعبۂ تبلیغ) مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان

ناشر: سید محمد کفیل بخاری، طابع: تشکیل احمد اختر، مطبع: تشکیل نو پرنٹرز، مقام اشاعت: دار بنی ہاشم ملتان

ولادت :

یکم ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ

۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء

جمعۃ المبارک۔ بوقتِ سحر

انتقال :

۹ ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء

بعد العصر بروز پیر

اشاعت خاص

سید محمد کفیل بخاری
سید محمد ذوالکفل بخاری

یہ ۱۹۳۰ء ہے! اس سال برِ صغیر میں سول نافرمانی کی تحریک عروج پر تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیت علمائے ہند، مجلسِ احرار اسلام، خدائی خدمت گار تحریک اور دیگر آزادی پسند جماعتیں، تحریک میں پیش پیش تھیں۔ "غلاموں" کا لہو سوز یقین سے گرمایا اور سامراج دشمنی سے کھولایا جارہا تھا۔ سرکاری عدالتوں کے بائیکاٹ، شراب و منشیات کی دکانوں پر پکٹنگ اور ولایتی مال اور ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ کی مہم، ملک گیر مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔ اس پہ مستزاد، "کامل آزادی" کا مطالبہ...... فرنگی کی نیندیں حرام کیے ہوئے تھا۔ مسلمان...... شاتمانِ رسول کی سرکاری سرپرستی پر سخت مضطرب اور مشتعل تھے اور "شاردا ایکٹ" کو مسلم پرسنل لاء کی توہین اور مداخلت فی الدین قرار دے رہے تھے۔ صوبہ سرحد میں پشاور کا قصہ خوانی بازار، بیک وقت پانچ سو سے زائد فرزندانِ وطن کے خونِ ناحق سے لالہ زار ہو چکا تھا۔

عین انہی دنوں، لاہور میں علمائے ہندوستان کے تاریخی اجتماع میں وقت کے سب سے بڑے محدث..... علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ یہ تاریخی اعلان فرما رہے تھے کہ

"دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کفر چاروں طرف سے یلغار کر چکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے لیے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ میں اس کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں۔ وہ نیک بھی ہیں اور بہادر بھی!"

خطیب الامت و قافلہ سالارِ حریت کو...... "امیرِ شریعت" بنا دیا گیا تو عشقِ بلاخیز کے قافلۂ سخت جاں کی مشکلیں اور منزلیں کچھ اور بڑھ گئیں! مشکلیں اتنی کہ، آساں ہو گئیں۔ منزلیں اتنی کہ، قدم کے خار نکل گئے!

امیرِ شریعت...... پنجاب میں سول نافرمانی کا آغاز کر چکے تھے۔ حکومت ان کی گرفتاری کے لئے سرگرداں تھی۔ لیکن وہ امروہہ، الہ آباد اور آگرہ سے ہوتے ہوئے بمبئی جا پہنچے۔ بندر روڈ بمبئی پر لاکھوں کا مجمع گوش بر آواز تھا۔ امیرِ شریعت نے خطبۂ مسنونہ کے بعد تقریر شروع کی......

"غلامی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اگر اس گناہ سے نکلنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریز کے خلاف پُر امن لڑائی میں شریک ہو جائیں"

ابھی یہ پہلا فقرہ ہی ادا کر پائے تھے کہ تیز دھار کا ایک خنجر لہراتا ان کی طرف آیا۔ کوہاٹ کا ایک اکیس سالہ پٹھان نوجوان

بچۂ نور خان... بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور خنجر اپنے سینے پر روک لیا۔

ع..... سنبھل اے دل کہ اظہارِ وفا کرنے کا وقت آیا!

خنجر، زہر میں بجھا ہوا تھا، اس لیے بچۂ نور خان فوراً ہی دم توڑ گیا۔

جان دی راہِ محبت میں الٰہی صد شکر
بات جو ہم نے کہی تھی، سو نباہی صد شکر

جرأت و بسالت، غیرت و حمیت، شجاعت و شہامت اور ایثار و قربانی کے پیکر

بچۂ نور خان کے نام

______ اس کی عظمت کو سلام!

سلام اسکی محبت پر سلام اس کے قرینے پر
کہ سینہ تان کر کہتا تھا خنجر آئے سینے پر!

شاہ جی کو ہم سے رخصت ہوئے چونتیس برس ہونے کو ہیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ان چونتیس برسوں میں ہم، اُن کے کارہائے نمایاں اور خدمات کا احاطہ نہیں کر سکے۔ بلکہ ان کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ ان کا وجود حقیقتہً قدرت کا عطیہ تھا۔ اللہ جل شانہ نے تنہا ان کے وجود سے وہ کام لیا جو ایک جماعت اور ایک ادارے کا کام تھا۔

ع ......وہ آدمی نہیں یزداں کی اک نشانی تھا۔

انہوں نے جب اپنی اجتماعی زندگی کا آغاز کیا تو انگریز سامراج کو للکارتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ میرا ملک چھوڑ جائیے، آپ غاصب حکمران ہیں۔"

تب اس کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا اور اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

ٹھیک تیس برس بعد انگریز خود کہہ رہا تھا۔

"میں آپ کا ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

اس کے اقتدار کا سورج غروب ہو چکا تھا، غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں اور آزادی کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

اگر غور کریں تو یہ تیس برس پلک جھپکنے میں نہیں گزر گئے۔

ع ....اک آگ کا دریا تھا اور ڈوب کے جانا تھا۔

شاہ جی اور ان کے رفقاء نے مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی اور اک نئے انداز میں آزادی کے سفر کا آغاز کیا۔ جیل کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے قبول کیں، طوق و سلاسل کو چوما اور ان سے آشنائی پیدا کی۔ قید کی طویل رات کے سناٹوں میں محشر بپا کیا۔ انگریز کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور غلامی کے سکوت و جمود کو اپنی پکار، للکار اور قہقہوں سے توڑ کر خاموش فضاؤں میں ارتعاش پیدا کیا۔ سینکڑوں احرار وفادار اس راہ میں جان ہار گئے...... مگر ہار ماننے سے انکاری رہے۔

آج شاہ جی ہم میں موجود نہیں۔ مگر ان کے زریں کارنامے، ان کی اُجلی سیرت کے نقوش، ان کا عقیدہ و فکر اور ان کی جماعت مجلس احرار اسلام ہم میں موجود ہے۔ فکر و عمل کا یہ تسلسل اور توارث، ایک نعمت بھی ہے اور امانت بھی!

شاہ جی کی شخصیت و کردار، سوانح و خدمات اور آثار و افکار کے حوالہ سے جتنا بھی تحریری کام کیا گیا، اس میں اکثر و بیشتر ایک ادھورے پن، ایک تشنگی، ایک کمی اور ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ محض تاثر، محض تبصرے، محض تذکرے اور محض "نفسیاتی مطالعے" سے کچھ خاکے اور کچھ عکس تو ضرور برآمد ہو سکتے ہیں لیکن ایک مکمل شخصیت اپنے پورے گردوپیش اور مقام و مرتبہ کے ساتھ، بہرحال سامنے نہیں آسکتی۔ اور وہ ہنوز سامنے آ بھی نہیں سکی۔ اس کے اسباب و محرکات اور علل و عوامل سے بحث کی جائے تو بات طویل بھی ہو سکتی ہے اور تلخ بھی!..... مختصر یہ کہ شاہ جی کی لسانی اور ادبی خدمات، شاہ جی کے تاریخی شعور، شاہ جی کی سیاسی بصیرت، شاہ جی کی دینی جدوجہد

اور سب سے بڑھ کر شاہ جی کی خطابت کے حوالہ سے جو کام کیا جانا چاہیئے تھا، وہ ہنوز نہیں ہو سکا۔

شاہ جی عمر بھر کون کون سے سماجی، ثقافتی، طبقاتی، گروہی، تفرقاتی، تہذیبی، سیاسی، تعلیمی، نظریاتی، عوامی، قومی اور اجتماعی رجحانات اور رویوں کی بیخ کنی اور سرکوبی کرتے رہے اور ان کے مقابلے میں کون کون سے احسن و اکمل رجحانات اور رویوں کے نقیب و داعی اور امین و پاسدار رہے، اس کا بیان کہیں نہیں ملتا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ اس کام میں بنیادی شرط "دیانت" ہے اور تاریخ کے ترازو، تجزیے کی خوردبین اور جائزے کی دوربین کی حیثیت بہرحال ثانوی ہے۔

"نقیب ختم نبوت" کا یہ خصوصی سلسلۂ اشاعت، ایسی ہی کوتاہیوں کے ازالے اور ایسی ہی ضرورتوں کی تکمیل کی جانب ایک بروقت پیش رفت ہے۔ اور سراسر خلوص و دیانت پر مبنی کاوش!

جنوری ۱۹۹۲ء میں ہم آپ کی خدمت میں نقیب ختم نبوت کا امیر شریعت نمبر پیش کر چکے ہیں۔ الحمد للہ ہماری اس کاوش و محنت کو سنجیدہ و مخلص حلقوں میں پزیرائی ملی اور ہم اُن کی دعاؤں کے مستحق ٹھہرے۔

آج ۱۹۹۵ء ہے اور امیر شریعت نمبر حصہ دوم منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہو رہا ہے۔ میرے عزیز بھائی سید محمد ذوالکفل بخاری اس اشاعت خاص کی ترتیب و تہذیب میں اگر میری معاونت نہ کرتے تو شاید یہ گلدستہ، میں آپ کی خدمت میں اس طرح سجا کر پیش نہ کر سکتا۔ عزیزی احمد معاویہ نے حروف خوانی کر کے میرا بوجھ ہلکا کیا۔ برادرم محمد عمر فاروق اور عبداللطیف خالد چیمہ کے مخلصانہ مشوروں نے حوصلہ بڑھایا۔ عزیزم ابو بیسون نے اپنی نگرانی میں طباعت کے مراحل طے کرائے۔ اللہ جل شانہ ان سب رفقاء فکر کو جزاء خیر عطاء فرمائے۔ (آمین)

اس نمبر میں شامل بیشتر مواد، پروفیسر خالد شبیر احمد کی کتاب "شاہ جی"، جانباز مرزا مرحوم کے ماہنامہ "تبصرہ"، شورش کاشمیری مرحوم کے ہفت روزہ "چٹان"، روزنامہ "مشرق" لاہور اور روزنامہ "امروز" لاہور کی خصوصی اشاعتوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ شاہ جی کی شخصیت، خدمات اور افکار کے حوالے سے ملک کے مؤقر رسائل و جرائد میں بے پناہ مواد موجود ہے۔ جن احباب کے پاس شاہ جی اور احرار سے متعلقہ مواد کا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے وہ ادارہ سے تعاون کریں اور یہ تاریخی امانت نئی نسل کو منتقل کرنے کا موقع فراہم کریں۔ ہمیں مطلع کریں تو ہم ممنون ہوں گے اور خود حاضر ہو کر استفادہ کریں گے۔

ان شاء اللہ بشرط زندگی، یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ہم اپنے وعدہ کے مطابق شاہ جی کی خدمات و سوانح پر پانچ جلدیں مکمل کریں گے۔ قارئین ہمارا حوصلہ بڑھائیں اور ہمارے لئے دعاء کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں سرخرو کرے (آمین)

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

سراپا احرار

دارِ بنی ہاشم ملتان

۹ ذوالقعدہ: ۱۴۱۵ھ

۱۰ اپریل: ۱۹۹۵ء

دل کی بات

زندگی کی بہار یہ ہے کہ زندگی میں کوئی کام ہو جائے، کوئی معرکہ سر کر لیا جائے یا کوئی معرکہ بپا کیا جائے۔ وہ اعمال جن کی اساس حُسنِ نیت پر ہو وہی حاصل زندگی ہیں۔ وگرنہ.....

"ساری گھڑیاں، سارے لمحے، ایک جیسے ہیں۔"

والد ماجد حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں تازہ کرنا اور ان کو محفوظ کرنا ایسا کام ہے جو دل و جان کو تازگی بخشتا، حیاتِ مستعار کی کٹھنائیوں کو سہل بناتا اور زندگی کو دوام عطاء کرتا ہے۔

ہر چند یہ کام اُن لوگوں کا تھا جو سفر و حضر میں ان کے رفیق تھے، جو ان کی رفاقت پہ ناز کرتے تھے، جنہوں نے وفا کے دیپ جلائے، جنہوں نے قربانی و ایثار کے نقوش جریدۂ عالم پہ ثبت کئے، جو قلم کے دھنی تھے، جو شعر و ادب، تاریخ و سیرت، دینیات اور جدید سیاسی نظریات پر بہت اثاثہ دے گئے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کا حسن و بانکپن آج ۶۵ سال بعد بھی ماند نہیں ہوا۔ جو لکھا وہ سچ ہوا، جو کہا وہ پتھر پہ نقش ہو گیا۔ مگر احرار کے یہ بزرگ لکھاری بوجوہ یہ کام نہ کر سکے۔

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی قربانی، ایثار، جدوجہد اور اخلاص ہی کا ثمر ہے کہ ہم اصاغر، یہ قومی و جماعتی فریضہ اداء کرنے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔

ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت کو فخر ہے کہ اس نے اپنی سات سالہ مختصر صحافتی زندگی میں احرار کی بقا اور دینی اجتماعیت کے لئے زبردست کام کیا ہے، نقیب ختم نبوت کا ہی یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے امیر شریعت نمبر کی ضخیم جلد اوّل کے بعد جلد دوم بھی پیش کی ہے۔ جو سیکڑوں دلوں کی بے تابی و ناشکیبائی کا درمان ہے، سکون قلب و نظر ہے، راحت جان ہے اور کتاب خانۂ ملّی میں ایک بے بہا اور انمول اضافہ ہے۔

ہم اپنی بے بضاعتی، بعض اہم لوگوں کی بے توجہی، ماضی مرحوم کے دفینوں پر غاصبانہ قبضہ جمانے والے بخیلوں کے رویّوں کے باوجود یہ قومی ورثہ، ملّی اثاثہ نئی نسل کو منتقل کرنے میں شاد کام و کامران ہو رہے ہیں۔

اگر روحانی و قلبی محبت و کیفیت کی کوئی حقیقت ہے تو ہماری روح میں حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی محبتوں کا جو پیکرِ جمیل چاند کی طرح چمکتا دمکتا ہے یہ اسی کی ضیا باریاں ہیں، یہ اسی کی کرنیں ہیں، یہ اسی ماہ وجدان کی روشنی ہے، جس نے قلب و روح کو منوّر کر دیا ہے، افکار و اذھان کی بے آب و گیاہ وادی کو رشک چمن بنا دیا ہے۔

اس اشاعتِ خاص کی تکمیل حضرت امیر شریعت قدس سرہ کا روحانی و وجدانی فیض ہے۔ دعا ہے کہ یہ فیض جاری و ساری رہے اور اللہ سے ہمیں اسکی قدر کرنے کی توفیق ملتی رہے (آمین)

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من!

سید عطاء المحسن بخاری

دارِ بنی ہاشم، ملتان

[signature] ۱۴ شوال ۱۴۱۵ھ ... ۹۵

قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حدیثِ پاک : بخاری

سید محمد کفیل بخاری

چہرہ

کشادہ پیشانی، بھرا ہوا روشن گول چہرہ............ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا نقشِ ثانی۔ شربتی غلافی آنکھوں میں سرخ ڈورے، بھنویں ہلکی، پلکیں لمبی، نظر عقابی............ جن سے غیرت و خودداری اور مومنانہ فراست کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ دراز قامت، دوہرا جسم، چوڑا سینہ اور مضبوط شانے۔ جرأت و شجاعت کے غماز سرخ گندمی رنگ، گھنے اور گھنگریالے بال، مگر......... سنتِ نبوی کی مثال سفید داڑھی جیسے انوارِ صبح کا سماں، سیاہ زلفوں میں روشن چہرہ جیسے ظلمت شب میں ماہتاب۔

طبیعت میں جلال و جمال کا حسین امتزاج، پیکر جرأت و قناعت، دل کے غنی، فراخ دست، غمگسار، مہمان نواز، خوئے وفا، خوش مزاج و خوش مذاق، سخن فہم و سخن طراز

ع نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز

دوستوں کے دوست، دشمنوں کے شریف دشمن، چائے اور پان کے رسیا، حسن و شعر کے دلدادہ، بذلہ سنج، عرب کی جھلک، سادات کی آبرو، سمرقند و بخارا کی یادگار، سراپا احرار

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شیریں کلام، جادو گفتار، اثرِ جبرئیل، تلاوت و ترتیل، قرأت میں حسن، لے حجازی، لہجہ گداز، آواز پاٹ دار، خرمنِ باطل پر برقِ شرربار۔

اسلام کا مبلغ، قرآن کا مناد، عالم دیں، نکتہ آفریں، صبا کی چال، سمندر کا خروش، پھولوں کی مہک، بجلی کی چمک، شیر کی گرج، فصیح و بلیغ، خطابت میں یکتا ملتے ہیں لوگ ایسے خال خال

القصہ ایک عہد صحابہ کی یادگار

تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں، صبح کہیں، شام کہیں، دن کہیں، رات کہیں، بستی بستی، نگر نگر، وہ گھوم گئے دیوانہ وار

اکہتر برسوں میں اکتالیس برس ریل اور جیل کی نذر کر دیئے۔ برصغیر کے کروڑوں انسانوں کو انگریز کے خلاف بغاوت پر اکسایا، شعور بخشا، غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کا صور پھونکا، عمر بھر اسلام کے ناموس اور وطن کی آزادی کے لئے جہاد کیا۔ فرنگی اور اس کے خود کاشتہ پودے قادیانیوں کے ازلی دشمن، عقیدۂ ختم نبوت کے سچے محافظ، منکرینِ ختم نبوت کے لئے برقِ عتاب، خود فروشوں کے لئے ہیبتِ احرار، پکے مسلمان، کھرے

انسان۔

اک عالم کو کر گیا بیدار

قیامِ پاکستان کے وقت امرتسر سے ہجرت کی اور ملتان کے محلہ ٹبی شیر خان میں کرایہ کے کچے مکان میں گوشہ نشیں ہو گئے

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔

پے بہ پے حوادث نے بڑھاپے کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ بیماری نے حملہ کیا تو افلاس کی قوت سے اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ مگر-----

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور-------

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی اداس شام یہ آفتابِ خطابت ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ان للہ وانا الیہ راجعون۔ برق و رعد آسودہَ بستر شدہ
شعلہ جوّالہ خاکستر شدہ---

فرمایا: دوست زندانی مصائب سُنانے میں لذت محسوس کرتے ہیں اور میں عیب، یہ اپنا اپنا زاویہَ نظر ہے۔ میں ان مصیبتوں کو رُسوا کرنے کا عادی نہیں۔ میرے لئے جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے۔ اپنے گردو پیش باغ و بہار فراہم کرلیتا ہوں۔ اور قید یوں گزر جاتی ہے جیسے صحراؤں سے بادل۔

اک شب جیل خانہ میں سورہَ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ وہ قراءت کی تاثیر میں ڈوب کر ٹھہر گیا ہے۔ ایک گھنٹہ اسی تلاوت میں گزر گیا اتنے میں پنڈت رام لال جی سپرنٹنڈنٹ جیل نے پیچھے سے پکارا۔ دیکھا تو وہ کھڑا ہے اور رُخسار اس کے آنسوؤں سے تر ہیں۔ کہنے لگا، شاہ جی خدا کے لئے بس کرو۔ میرا دل قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں۔ اللہ اللہ یہ قرآن کی محبت کا اعجاز تھا۔ ایک دن گورنمنٹ آف انڈیا کا برطانوی نژاد ہوم منسٹر معائنہ کے لئے آ پہنچا۔ میں بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ کہئے شاہ جی! آپ اچھے ہیں۔ میں نے کہا خدا کا شکر ہے۔

دوبارہ پوچھا۔ کوئی سوال۔

میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔ یہ میرا جواب تھا۔ وہ فوراً بولا۔ نہیں میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟ جی ہاں! آپ ہمارے ملک سے نکل جائیں۔

تبرکات امیر شریعت

لطف پردوں کے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے

محبت آئینہ ہو چکی تھی وجود بزم جہاں سے پہلے

دکھا جو مینا بدست ساقی رہی نہ پھر تاب ضبط باقی

ہر اک میکش پکار اٹھا یہاں زمرے پہلے یہاں کے پہلے

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول

پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

شاد عظیم آبادی

[illegible]

۱۰ اپریل ۷۶ء ملتان شہر

سب سے پہلے حسن کو پہنایا گیا تاجِ عشق
پھر ہمارے قلب کا گہرا بنا نشانِ عشق
بندگی احساس کو تولا گیا
عشق کی دشواریاں نہ پوچھیے

غم نہ کر شمع رات گزرے گی
جلتے بجھتے حیات گزرے گی

علمائے دیو بند کے نمائندے تھے۔ علامہ حافظ کفایت حسین صاحب صدر "ادارہ تحفظ حقوق شیعہ" پاکستان کے تقریباً ۱۰۰ فیصد شیعہ ملت کی نگرانی فرما رہے تھے۔ ان اکابر ملت کے علاوہ وہ تمام مسلم لیگی زعما جن میں علامہ علاؤ الدین صدیقی صدر شعبہ دینیات پنجاب یونیورسٹی اور مسلم لیگ کے کونسلر اور عہدیدار اور پنجاب اسمبلی کے ارکان موجود تھے۔ مجھے تعجب ہے کہ "ڈان" کا نمائندہ خصوصی ان حضرات کے بعد کون سے ممتاز علماء کی تلاش میں سر گرداں رہا۔ اور بالآخر الفضل کے ایڈیٹر سے مل کر بیک وقت "ڈان" اور "الفضل" میں یہ رپورٹ شائع کی اسلامیان پاکستان توجہ فرمائیں کہ قائد اعظم کا یہ اخبار کس طرف رخ کر رہا ہے۔ جن علمائے کرام اور مشائخ عظام کی مساعی جمیلہ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت منصہ شہود پر آئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کیا یہ ان سب کی بے حرمتی، بے عزتی اور توہین نہیں ہے؟ کہ ان سب کو غیر معروف اور غیر ممتاز کہہ کر اس کنونشن کو ناکام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے نام نہاد کہا گیا ہے۔ "ڈان" کو چاہیئے کہ اپنی اس روش کو بدلے اور ان تمام بزرگوں سے فوری طور پر معافی مانگے ورنہ ان مرزائیت نوازیوں کے جو نتائج رونما ہوں گے ان کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔ میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ "ڈان" کی اشتعال انگیزیوں کا احتساب کرے۔ مسئلہ ختم نبوت پر آل مسلم لیگ پارٹی کنونشن کی خبروں کو مسخ کر کے شائع کرنا مسلمانان عالم کے ایمانی جذبات سے استہزا ہے۔

روزنامہ "آزاد" لاہور

۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء

اخباری بیانات

① روزنامہ "ڈان" کی ایک خبر پر امیر شریعت کا تردیدی بیان

"آل مسلم پارٹیز کنونشن کے متعلق جو رپورٹ "ڈان" کراچی کی خبر ۱۴ جولائی میں شائع ہوئی اسے پڑھ کر مجھے انتہا درجہ کی حیرت ہے اور افسوس بھی دن دہاڑے کسی کی آنکھوں میں دھول ڈالنا دراصل اسی کو کہتے ہیں۔ لاہور ایسے مرکزی شہر میں دن کے اجالوں میں صبح نو بجے سے شام کے چھے بجے تک برکت علی محمڈن ہال میں اس کنونشن کے دو اجلاس منعقد ہوئے اس اجلاس میں مغربی پاکستان کے قابل احترام مشائخ عظام، ممتاز علماء کرام اور زعمائے ملت نے شرکت فرمائی۔

حضرت صاحبزادہ سید آل رسول صاحب سجادہ نشین اجمیر شریف، حضرت صاحبزادہ غلام محی الدین صاحب سجادہ نشین گولڑہ شریف جن کے متعلق مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وہ یقیناً پہلی مرتبہ کسی جلسہ میں شریک ہوئے۔ وہ آل مسلم پارٹیز کنونشن کا اجلاس تھا۔ مغربی پاکستان کے مسلمانوں میں سے جن لوگوں کا ہاتھ دامن حضرات چشتیہ اہل بہشت سے وابستہ ہے۔ ان میں گولڑہ شریف اور سیال شریف اور تونسہ شریف ہیں۔ حضرت مولانا حافظ قمر الدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف، صاحبزادہ سید اصغر علی شاہ صاحب علی پوری، صاحبزادہ محمد جان صاحب عثمانی نقشبندی سجادہ نشین موسیٰ زئی شریف ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور سجادہ نشین چورہ شریف کی موجودگی کتنی کروڑ جنتی مسلمانوں کی نمائندگی تھی۔ ایک اور صرف ایک مولانا ابوالحسنات مولانا محمد احمد صاحب قادری کی موجودگی اور صدارت ۸۰ فیصد علماء بریلی کی نمائندگی تھی۔ اور اہل حدیث حضرات میں سے حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب روپڑی اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی، حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب گوجرانوالہ ۱۰۰ فیصد اہل حدیث کے نمائندہ تھے۔ علمائے دیوبند میں سے حضرت مفتی محمد حسن صاحب قبلہ صدر جمعیت علمائے اسلام پنجاب حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری ۱۰۰ فیصد

(۲) "شہدائے ملتان کے حضور"

(حضرت امیر شریعت کا ایمان افروز بیان)

"ترجمہ:- کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ محض ایمان لانے سے ہی نجات حاصل کر لیں گے اور ان کی کوئی آزمائش نہ ہوگی۔ حالانکہ وہ تمام لوگ آزمائے جا چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ پس معلوم کرے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو حق و صداقت پر ہیں اور ان لوگوں کو جو کاذب و مفتری ہیں"۔ (القرآن)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام کے بنیادی عقیدہ کو گزند پہنچانے کی ناپاک کوشش کی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کاذب و مفتری سے کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٰ نبوت کے جواز میں دلیل طلب نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافظ قرآن صحابہ کرامؓ ناموس رسالت اور تاج و تخت ختم نبوت پر قربان کروائے اور اس طرح مسلمانوں کی متاع دین و ایمان کو ایک مکار اور عیار کی دست و برد سے بچا لیا اور آئندہ کے لئے ملت اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اس قسم کی ناپاک کوشش کرے اس کے متعلق اسلام اور ملت اسلامیہ کا فیصلہ کیا ہے۔ ملتان کے غیور اور صاحب ایمان مسلمانوں نے بھی اس دور پر آشوب میں جب کہ کفر و ارتداد کی سیاہ گھٹاؤں نے ایمان و ایقان کو پریشان کر رکھا ہے اسلام کی لاج رکھ لی ہے اور اپنے جگر گوشوں کو شمع رسالت ﷺ پر دیوانہ وار نثار کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان آج بھی خاتم النبیین ﷺ کی عزت و ناموس کی خاطر گولیوں کی بارش میں مسکراتا ہے۔

رتبہ شہید ناز کا گر جان جائیے
قربان جانے والے کے قربان جائیے

اور اپنے ایثار اور اخلاص سے جمہور مسلمین کے دینی اور ملی مطالبہ میں روح پھونک دی۔ خدا کی رحمتیں نچھاور ہوں تم پر شہیدان ناموس رسالت سلام ہو تم پر۔ اے ختم المرسلین کی عزت و آبرو پر قربان ہونے والو۔ مبارک ہیں ان کے والدین، ان کے نذرانے سرکار رسالت مآب میں شرف قبولیت حاصل کر گئے۔

یوں تو اس دنیا میں ہزاروں بچے جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہزاروں کلیاں

کھلتی ہیں اور باد سموم کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر مرجھا جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر وہ موت جو حق اور راستی کی راہ میں آئے حیات جاوداں بن کر آتی ہے

جو موت آئے تو زندگی بن کے آئے
قضا کی نرالی ادا چاہیئے!!

روزنامہ "آزاد" لاہور
۲۸ جولائی ۱۹۵۲ء

(۳)

۱۹۵۲ء کے سانحہ ملتان کے متعلق حضرت امیر شریعت کا بیان

اخبارات میں ملتان کے اندوہناک حادثہ کے متعلق جو سرکاری رپورٹ شائع ہوئی ہے اسے پڑھ کر ہمیں انتہائی صدمہ پہنچا اس وقت ہماری کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ راعیوں کے ہاتھوں سے رعایا کے چھے افراد شہید ہو جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون"
ہمیں شہدا کے لواحقین سے دلی ہمدردی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر اور استقامت کی توفیق بخشے

"انما اشکو بثی و حزنی الی اللہ"
ترجمہ۔ اب سوائے اس کے نہیں کہ ہم اپنی فریادیں اور اپنا حزن و ملال خداوند کریم کے حضور پیش کر دیں۔

سانحہ ملتان کے متعلق جو سرکاری رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ وہ اتنی مبہم اور گول مول ہے کہ اسے پڑھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔ اور سب سے بڑی دکھ کی بات یہ ہے کہ افسران ملتان نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی ہے۔ کیا ہجوم گولیاں چلائے بغیر واپس نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یقیناً ملتان کے مخادیم حضرات معززین شہر علماء کرام اور ذمہ داران مسلم لیگ کی وساطت سے بھی جلوس اور حادثہ کے درمیانی عرصہ میں افہام و تفہیم کے ذریعے حالات پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اس پر بے حد افسوس ہے"

(روزنامہ "آزاد" لاہور) ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء

عطا اللہ خان عطاء ایڈوو کیٹ مرحوم
ڈیرہ اسماعیل خان

سید عطا اللہ شاہ بخاری
(درحین حیاتش نوشتہ شد)

تو اے غواص دریائے معانی
تو اے سحر البیان الف ثانی
بخاری، سیدی، قاری، خطیبی
ادیبی، فاضلی، جادو بیانی
ز ذکر دودمانت ایں قدر بس
زصلب سید آخر زمانی
بہ ہنگام سخن چوں لب کشائی
شکر ریزی و گوہر مے فشانی
برآری از دل خارا نفیرے
بہ ترتیلے کہ تو قرآن خوانی
نہ چوں باشد حلاوت درکلامت
ستائش گوئے شاہ انس و جانی
امیرِ حزب احرارِ گرامی
بہ عزم و حزم چوں کوہِ گرانی
کنی "لا" رابہ استثنا مقید
کہ رمز لا والا اللہ دانی
توئی عین مسلماں ایں قدربس
چہ گویم من فلانی یا فلانی

چناں جاکردہ در قلب مردم
کہ چوں میری نہ میری زندہ مانی
زبست و پنج تا پنجاہ ودہ سال
نثار قوم کر دی زندگانی
چوشصت آمد ترانا مدگشتے
ہماں کت پیش ازیں بودی ہمانی
زامرتسر بہ خاک پاک ملتاں
بہ سختی کردہ نقل مکانی
رہیدی و ہزاراں بیکساں را
رہا یندی زجور نہروانی
تو خادم بودا قوم وطن را
بہ طیب خاطر و باجانفشانی
وے ملت نہ پرسیدت کہ چونی
پریشاں خاطری یا شادمانی
چو میری گنبدے برتربتِ تو
بے فرازندو تو ہر گز ندانی
عطاء کم دیدہ ام نظم و قصائد
بدیں خوبی و معنی و روانی

شورش کاشمیری

جامع الصّفات انسان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بلاشبہ ایک جامع الصفات انسان تھے۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ انسان الفاظ کے استعمال میں عموماً فیاض ہوتا ہے۔ مدح ہو یا قدح۔ قلم و زبان اکثر بے روک ہو کر چلتے ہیں لیکن شاہ جی کا معاملہ یہ تھا کہ کمالات و محاسن کے جتنے الفاظ بھی فراہم ہو سکتے ہیں انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے پلڑے میں شاہ جی کے حسن و خوبی کا سرمایہ ہو تو یقیناً دوسرا پلڑا ہی جھکے گا۔ شاہ جی ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ یہ سانچہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اور اس عہد کے لوگ بھی رفتہ رفتہ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ شخصیتیں ہی تہذیبی و معاشی حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں کا مظہر ہوتی ہیں۔ ان کا وجود عوام سے کہیں بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ عوام کی پیروی کے لئے نہیں عوام کے رہنمائی کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اور زمانہ سے ماورئ نہ ہو کر بھی اس سے مستثنیٰ ضرور ہوتے ہیں۔ شاہ جی فکر و نظر اور جہد و عمل کے ایک خاص عہد کی پیداوار تھے۔ اس عہد نے واقعتہً ہماری قومی صفوں میں بڑے بڑے آدمی پیدا کئے۔ شاہ جی گویا اس محفل کا آخری چراغ تھے۔ ایک دو نشانیاں اور ہوں گی لیکن وہ بھی مہمانِ نفس یک دو نفس ہیں۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

یہ لوگ جس زمانے میں اپنے بلند آہنگ حوصلوں کے ساتھ سامنے آئے تھے جب تک ہمارے سامنے اس دور کی صحیح تصویر نہ ہو اس وقت تک ہم اس مٹی کے محاسن کا اندازہ ہی نہیں کر پاتے جس مٹی سے ان لوگوں کے پیکر تیار ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ماضی اپنی خاص روایتوں کے ساتھ گور کنارے آچکا تھا اور اس کے روبرو ایک نیا دور اپنی تمام شدتوں کے ساتھ نشو و نما پا رہا تھا۔ جہاں تہاں برطانوی سامراج کے خلاف خیالات بڑی تیزی سے کروٹیں لے رہے تھے دماغوں میں بہمہ وجوہ احتجاج موجود تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتائج نے اس احتجاج کا راستہ صاف کر دیا۔ پورے ملک کی خواہش آزادی رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ اور تحریک خلافت کے داخلی و خارجی اثرات کے تحت ایک مرکز پر آگئی اس مرکز نے رہنمائی اور اس کے مظاہر کا ایک نیا قافلہ پیدا کیا شاہ جی اسی قافلے کے ممتاز حدی خوانوں میں سرفہرست تھے۔ ادھر غور کرنے سے یہ عجیب و غریب بات کھلتی ہے کہ جو لوگ اس قافلہ میں شریک تھے وہ کسی تنہا خوبی ہی میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ ان کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ احوال کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ زندگی کا ہر گوشہ تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ نہ صرف دنیا نے ایک نیا سانچہ قبول کر لیا بلکہ فکر و نظر کے سبھی دوائر ایک نیا روپ اختیار کر رہے تھے۔ شاہ جی معناً ان علماء و صلحاء کے وارث تھے جنہوں نے اسلام کی اساس پر انگریزوں کی بیخ کنی کا عہد کیا تھا۔ اور دیوبند کا مدرسہ جن کے امتیازی معتقدات کی علامت تھا۔ اس ذہن کی تعمیر میں بہت سے عوامل کا

ہاتھ کار فرما رہا۔ اب جو قومی احتیاج کی اجتماعی روح عدم تشدد کے طریق اور عدم تعاون کی تکنیک سے پرچم کشا ہوئی تو عثمانی خلافت کا سکوت اور عرب ملکوں کے حصے بخرے اس ذہن کے لئے مہمیز ثابت ہوئے۔ اسلامیت اور وطنیت کے ملے جلے جذبات نے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۹ء میں آزادی کا ایک ایسا ولولہ پیدا کیا کہ ذہنی طور پر انگریز سارے ملک کے دماغوں اور دلوں سے نکل گیا۔ رہا تو ان لوگوں کے دلوں میں جو انگریزی بساط کے مہروں کی حیثیت رکھتے اور اپنے گرد و پیش انسانوں کی ایک اقلیتی کھیپ کے وفاداری بشرط استواری کے تحت سوداگر تھے۔

انگریزی حکومت کے دبدبے نے ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر کو نہ صرف مفتوح کر لیا بلکہ مغلوب لوگوں کے ساتھ مرعوب دماغوں کا بازار بھی رونق پر تھا۔ مگر تحریک لاتعاون کے برگ و بار نے مسلمانوں کی عنان رہنمائی دفعتہً ان لوگوں کے حوالے کر دی جنہیں قدرت نے شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، اور نطق اعرابی دے کر پیدا کیا تھا اور جن میں اکثر ماضی مرحوم کے خلوت خانۂ تخیل میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔

سید عطاء اللہ شاہ اسی ماضی کا تمثیلی پیکر تھے۔ ان کا ہر وار ایک بانکے پھکیت کی طرح چوکس رہا۔ وہ کبھی نہ بجھنے والی روح لے کر آئے تھے آج چونکہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے اور اس عہد کی اداشناس پود بھی قریب قریب ختم ہو چکی یا ہو رہی ہے پھر قلم و زبان کے نئے نئے رستم و اسفند یار پیدا ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا یا سمجھانا ذرا مشکل ہے کہ ان لوگوں نے ملک و قوم کو کیا کچھ عطا کیا؟

صبح ضرور ہوتی ہے اور سورج بھی وقت پر نکلتا ہے۔ لیکن طلوع و غروب کا فاصلہ یونہی طے نہیں ہوتا پہلے ستارے اجڑتے، رات کٹتی پھر پو پھٹتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننا اور پہچاننا اشد ضروری ہے کہ قومی آزادی تاریخی اعتبار سے کبھی کسی فرد واحد کی تنہا فراست اور تنہا ہمت کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ اس کا پودا آناً فاناً بار آور ہوتا ہے۔ یہ حکایت ایک طویل عمل اور ایک طویل عہد سے مرتب ہوتی ہے یہ صحیح ہے کہ قومی خواہشوں اور ملکی ولولوں کا مظہر بسا اوقات ایک ہی وجود ہوتا ہے اور عامۃ الناس کے قدم اُن کے قدموں کے ساتھ اٹھنے لگتے ہیں۔ لیکن اصلاً حریت و استقلال کا یہ قصر بے شمار لوگوں کی جگر کاری، سرفروشی اور فراست و دانائی سے اٹھتا اور بنتا ہے۔

مثلاً بھوک ہے۔ اس کے تقاضا پر انسان روٹی کھاتا ہے۔ لیکن بھوک پہلے لقمہ سے نہیں مٹتی۔ بلکہ یکے بعد دیگرے بہت سے لقمے کھانا پڑتے ہیں۔ آخر میں ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھوک نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ یہ آخری لقمہ ہی بھوک کا مداوا نہیں ہوتا بلکہ پہلے لقمہ سے لے کر آخری لقمہ تک جتنے لقمے بھی پیٹ میں جاتے ہیں ان کی اجتماعی طاقت سے پیٹ بھرتا ہے۔ بعینہ یہی مثال آزادی کی ہے۔ کہ یہ عمارت سنگ و خشت کی نہیں ہوتی لیکن سنگ و خشت سے بنی ہوئی عمارتوں ہی کے اصول اس پر عائد ہوتے ہیں۔ بنیادیں کھودنے بنیادیں بھرنے، دیواریں اٹھانے، اینٹیں لگانے، گارا بنانے اور رنگ و روغن کرنے کے بیسیوں مرحلے پیش آتے ہیں تب ایک عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

شاہ جی بیالیس سال قبل جس ہراول دستے کے ساتھ نکلے تھے وہ لازماً قومی آزادی اور قومی استقلال کی

جدوجہد کا مقدمۃ الجیش تھا۔ ان کے سامنے صرف آخری مرحلہ ہی نہ تھا بلکہ وہ ابتدائی مرحلے میں تھے اور اس مرحلے کو پیدا کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ انہوں نے بنجر زمینوں میں ہل جوتا انہیں ہموار کیا۔ پھر بیج بویا، کھیت سینچا، موافق موسم کی نگہداشت کی، مخالف موسم کے تاؤ سے، آخر فصل پکی۔ اب کیا ضروری تھا کہ بجائی کرنے والے ہی کٹائی کے وقت موجود ہوتے۔ قافلہ چلتا اور بڑھتا رہا حتیٰ کہ منزل سامنے آگئی اور ہم آزاد ہو گئے۔ اب نصف صدی پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ان بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کی مشکلات کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے!

غرض پاکستان اور ہندوستان کا کوئی گوشہ ہو گا جہاں شاہ جی کی آواز نہ گونجی ہو۔ ان کی آواز کا علم ہر کہیں لہراتا رہا ہے۔ برصغیر کے ایک عظیم رہنما کا قول ہے کہ یہاں کا چپہ چپہ شاہ جی کے جہد آشنا قدموں کا شکر گزار ہے مگر مغربی پاکستان چونکہ ان کا مسکن اور ان کے بزرگوں کا مولد رہا اس لئے مرحوم دلی سے لے کر مرحوم پنجاب کے دور افتادہ علاقوں ہی کو انہوں نے اپنی نواپیرائیوں کے لئے منتخب کیا اور یہیں اکثر و بیشتر انگریزی حکومت کے مختلف الاصل قلعوں کو مسمار کرتے رہے۔ پنجاب اور اس طرف کے علاقے ایک خاص عسکری ضرورت کے تحت برطانوی سامراج کا بازوئے شمشیرزن تھے۔ انگریزوں نے ان علاقوں میں مختلف مفادات، کی پخت و پز کر کے یہاں کبھی سیاسی شعور اور قومی آزادی کے ولولوں کو بڑھنے یا پنپنے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم اس علاقے کی صحیح صحیح سیاسی معاشی اور معاشرتی صورت حال سے واقف نہ ہوں اس وقت تک ہم ان محرکات کو جاننے سے قاصر رہیں گے جن کا منطقی نتیجہ ہماری قومی آزادی کا وجود ہے۔ یا جس معنوی طاقت کی اساس پر یہ ساری عمارت کھڑی ہے۔

حالت یہ تھی کہ آنجہانی ہندوستان میں مرحوم پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں انگریزی مفادات کی بوقلمونیاں مضبوط بنیادوں پر قائم تھیں اور انگریز کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس صوبے کے لوگوں میں حریت خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے اس نے پنجاب کے تین فرقوں یا قوموں (ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں) کو مفادات کے خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہندوستان کا مسئلہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ تھا تو پنجاب میں یہ مسئلہ سکھوں کی موجودگی کے باعث سہ رخا تھا۔ اور تینوں کے معاشی و معاشرتی مفادات کچھ اس طرح بٹ گئے تھے کہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا ہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔ پھر چونکہ ہندوستان کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے ان کا ذہن ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور بعد کے اثرات سے منتقمانہ ہو چکا تھا۔ علماء کے خلاف جنگ امبیلا (۱۸۶۳ء) کے بعد خان غزن خان کی مخبری پر جو پانچ مقدمہ ہائے سازش انبالہ (۱۸۶۴ء) پٹنہ (۱۸۶۵ء) راج محل (۱۸۷۰ء) مالوہ (۱۸۷۰ء) اور پٹنہ (۱۸۷۱ء) قائم کئے گئے۔ ان کے عمیق مطالعہ سے انگریز نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے معاملہ میں خوفزدہ ہو چکے تھے بلکہ وہ نہیں مختلف واسطوں سے زیر کرنے کی فکر میں تھے۔

اس ضمن میں تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے کہ مرحوم پنجاب نہ صرف ان کا سب سے بڑا معاون ہو گیا بلکہ بہت سے راستے ان کے حق میں ہموار ہوتے چلے گئے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ان کا سواد اعظم ان مٹھی بھر مسلمانوں کے قبضہ قدرت میں تھا جو برطانوی امپیریلزم کے شعوری یا غیر شعوری طور پر فرستادہ تھے حتیٰ کہ

برطانوی شاطروں نے خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مذہب کی ان بنیادوں کو اکھڑوانا چاہا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے جن بنیادوں پر برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کا قلعہ ایستادہ تھا۔ ایک بڑا ہی دردناک سانحہ ہے کہ علمائے حق کے خلاف یہیں سے فتوے جاری ہوئے۔ جہاد کی تنسیخ کا الہام (مرزا غلام احمد قادیانی) بھی یہیں تصنیف کیا گیا۔ دنیائے اسلام کے خلاف تعویذوں کا انبار بھی یہیں تیار ہوتا رہا اور خلافتِ عثمانیہ کی شکست پر اس صوبے ہی کے خانہ زادوں نے چراغاں کیا۔

اب غور کیجئے جو صوبہ برطانوی ملوکیت کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہو جہاں کے لوگ تین قومی دائروں میں مختلف و متصادم مفاد رکھتے ہوں اور مفادات کے لئے موت و حیات کا مسئلہ ہو حتیٰ کہ قومی بیداری یا ملی استقلال کے راستے میں سب سے بڑی روک خود مسلمانوں کی معاشی اور دینی گدیوں کا وجود ہو۔ اور پست ہمتی کے پہلو بہ پہلو دینی گمراہیاں ان کے خون میں سرایت کر چکی ہوں۔ اس فضا میں شاہ جی کا نعرۂ جہاد بلاشبہ قدرت کے انعامات میں سے تھا اور ان کا وجود آیات من اللہ۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ محل نہیں لیکن اس تاریک دور میں مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" و "ستارۂ صبح" اور دو چار برس کے فاصلے سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت اور ایک خاص موڑ پر ان کے ہمنواؤں کی جماعت ایسی بے مثال طاقت اور گراں بہا سرمایہ ہیں کہ تاریخ کا اعتراف کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

ادھر یہ بات بڑے زور سے کہی گئی ہے کہ شاہ جی اردو کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کے بیان میں جادو اور ان کی زبان میں سحر تھا۔ ان کے حرف حرف پر لوگ سر دھنتے اور موتی چنتے تھے۔ ان کے خدا، رسول اور اسلام سے عشق کی حکایتیں بھی زبان زد عام ہیں اور لوگ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کی خطابت نے جن بتوں کو توڑا اور ان کی فراست نے جن فوجوں کو پسپا کیا ان کا ذکر پس منظر میں چلا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری اہم چیزیں پس منظر کی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال ہی یہ تھا کہ انہوں نے ملک کے جمود کو توڑا اور قوم کی سیاست میں مردانگی کا جوہر پیدا کیا۔ فی الجملہ ان کا وجود منعمات میں سے تھا۔ اس پورے ملک میں وہ اپنی ہمہ گیر خوبیوں کے باعث ایک عہد اور ایک ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قیادت و سیادت اور خطابت و سیاست کی ایک انجمن تھے۔ شاید ہی کوئی ایک شخص ان خصائص کے اعتبار سے ان کا ہمسر ہو۔ انہوں نے پچاس سال کا عرصہ صلہ و اجر کی ہر خفی و جلی خواہش کے بغیر بسر کیا اور یہ شرف صرف انہی کو حاصل رہا کہ:

۱۔ اس برصغیر میں ان کی آواز کا جادو سحر کرتا رہا اور خلاف سامراج ذہن نے ان کے آتش کدے سے نشو و نما کی حرارت پائی۔

۲۔ مسلمان نوجوانوں میں برطانوی ملوکیت سے وابستہ رہنے کا جذبہ ایک عرصہ سے راہ پا رہا تھا۔ انہوں نے اس جذبے کو بیخ و بن سے اکھاڑا۔ جن نوجوانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ تھے جن سے عوامی تحریکوں میں لیڈر شپ پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ غریبوں کی ایک ایسی جماعت (مجلس احرار اسلام) تیار کی جو امراء کے استحصالات سے برافروختہ ہو

کر نہ صرف طبقاتی شعور کی راہ پر آگئی بلکہ بازار سیاست ۔کے معرکہ ہائے خرید و فروخت سے بلند و بالا ہو کر کام کرتی چلی گئی۔

۴۔ مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جس کا عام حالات میں قحط تھا۔ اس کھیپ ہی سے اعلیٰ پایہ کے وہ مقرر پیدا ہوئے جنہوں نے انقلابی ذہن کی نقش آرائی میں قابل قدر حصہ لیا۔

۵۔ عوام کے دلوں میں نہ صرف استحصالی گروہ کے خوف کو دور کیا بلکہ ان کے جوہر خودی کو یہاں تک پروان چڑھایا کہ قربانی وایثار کا تاریک راستہ روشن ہو گیا۔

۶۔ مسلمانوں میں جن سیاسی و دینی بدعات کو بالالتزام راسخ کیا جا رہا تھا ان کا سانچہ توڑ ڈالا اور بعض معاشرتی خرابیوں کا سد باب کیا۔

۷۔ خطابت میں نئی نئی راہیں پیدا کیں قیادت کے کاسہ لیس ذہن کو ختم کیا۔ سیاست کو امراء کی جیبی گھڑی یا ہاتھ کی چھڑی بننے سے روک دیا اور اس کا ایک عوامی مزاج بنا ڈالا۔ اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ نشوو نما کے اعتبار سے اردو کا دامن ان کی خوبیٔ گفتار کا منت پذیر ہے۔

یہ حقائق اتنے واضح ہیں کہ نصف صدی کے سیاسی شب و روز کا وقائع نگار خود شاہ جی کے سوانح و افکار میں سے تاریخ کی بعض گمشدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس فرض سے کون عہدہ بر آ ہوتا ہے۔

فرمایا: میں ان سؤروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپیریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ایک فقیر ہوں۔ اپنے نانا کی سنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس ملک سے انگریزوں کا انخلا۔ دو ہی خواہشیں ہیں۔ میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے۔ یا پھر تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں۔ میں ان علماء حق کا پرچم لئے پھرتا ہوں۔ جو ۱۸۵۵ء میں فرنگیوں کی تیغِ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ ربِ ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

فرمایا: دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن! مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے۔ اور وہ ہے انگریز! میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ محبت اور نفرت کے یہ دو زاویے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہو ان کے لئے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے۔ جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی آبرو پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔

شورش کاشمیری

جرأت تری احرار کا عنوانِ جلی ہے

قربانی و ایثار کی تفسیر بخاری
ایمان کے گلزار کی ہے باد بہاری!
یہ ایک حریفوں کے ہزاروں پہ ہے بھاری
واللہ زباں اس کی ہے شمشیر دودھاری
گفتار کی گرمی سے خیالات بدل دے!
چاہے تو غلامی کی روایات بدل دے
اے قافلۂ ملت بیضا کے عناں گیر
جذبوں میں مچلتی ہے ترے جرأت شبیر
ہیں کوثر و تسنیم کی موجیں تری تقریر
لہجہ میں تڑپتی ہے ترے برش شمشیر
روشن ہوئی یہ بات ترے حسنِ عمل سے
ڈرتے نہیں توحید کے فرزند اجل سے
فطرت تری دامانِ شجاعت میں پلی ہے
جرأت تری احرار کا عنوان جلی ہے
غیرت تری ایمان کے سانچے میں ڈھلی ہے
لاریب کہ تو لختِ دل ابن علیؓ ہے
نگراں تری عزت کا زمانے میں خدا ہے
اولادِ شمر معرکہ آرا ہے تو کیا ہے؟

شورش کاشمیری

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان محبت و خلوص اور ارادت کا ایک تعلق خاص تھا۔ اس حوالے سے کئی تذکروں میں مواد ملتا ہے۔ ذیل میں جناب آغا شورش کاشمیری مرحوم کی تین کتابوں "مولانا ابوالکلام آزاد"، "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" اور "بوئے گل نالۂ دل" کے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آغا صاحب مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں اس موضوع پر قلم اٹھا کر بہت سے واقعات کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، ان شاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں مختلف تذکروں، آپ بیتیوں اور سوانحی کتابوں سے مولانا اور شاہ جی کے حوالے سے موجود مواد کو یکجا کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

شاہ جی ہندوستانی مسلمانوں کے ویرانہ آباد میں قدرت کا عطیہ تھے وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ، ایک ادارہ، ایک تحریک اور جماعت تھے، ان سے بڑا عوامی خطیب نہ اردو زبان نے پیدا کیا اور نہ مستقبل قریب میں اس کے آثار ہی نظر آتے ہیں، ان کے کلام و بیان کی تاثیر و سحر کا یہ حال تھا کہ دلوں کی سنگینی موم کی طرح پگھلتی اور دماغوں کا انجماد رواں ہو جاتا۔ انہیں ہوا کے جھونکے اور سمندر کی موجیں ہمہ تن گوش بر آواز ہو کر سنتی تھیں، ان کا بیان تھا کہ وہ مسجد ہی کے حجرے میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتے تھے اور اس نہج ہی سے ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی لیکن "الہلال و زمیندار" انہیں جدوجہد کے میدان میں لائے اور "ستارۂ صبح" نے ان کے جگر میں آگ لگا دی۔ الہلال کے بارے میں فرمایا۔

"الہلال نے ان کی شریانوں میں لہو دوڑایا اور وہ محرک انسان کی طرح قرن اول کی طرف لوٹ گئے پھر وہاں سے بال و پر لے کر ہندوستان کے افق پر پرواز کی۔ الہلال نے قرآن فہمی کے ذوق میں انہیں وسعت و تنوع دیا اور ان کی کایا کلپ ہو گئی۔ ان کی خطابت کا اسلوب اور اسکے مختلف زاوئے الہلال کے مرہون ہیں۔ آزاد...... ان کے ذہنی مرشد تھے۔ ان سے بہت سی ملاقاتوں میں فیضان حاصل کیا، ہر ملاقات علم و نظر کی ایک نئی دریافت ہوتی۔ آزاد جس موضوع پر بولتے، معلوم ہوتا انہیں کا خانہ زاد ہے، انہیں قرآن کی تفسیر میں منفرد پایا، ترجمے میں یکتا، حدیث میں یگانہ، فقہ میں بے مثال، ادب میں بحر ناپید اکنار، شاعری کا معدن اور نثر میں رستم و اسفندیار۔

گھنٹوں بولتے لیکن تکرار عنقا، فنون لطیفہ میں ان کا جوڑ نہ تھا۔ امام الہند فن موسیقی پر زبان کھولتا تو گلفشانی گفتار سے لالہ زار کھل جاتا۔ "غبارِ خاطر" کا آخری خط ان کے اسی ذوق عظیم کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مختلف تصویروں پر ان کے تشریحی حاشیے لاجواب ہیں، میں نے ایک تقریب میں مصوری سے متعلق ان کی ایک تقریر سنی ہے، ملک بھر کے نامور مصور جمع تھے اور وہ ان کی معلومات پر سر دھن رہے تھے۔ سنگ تراشی کے بارے میں ایک دن تاج محل کا ذکر کیا تو دنیا بھر میں گھماتے پھرے، سنگ تراشی و معماری کے ارتقاء، تہذیب کی تاریخ اس طرح بیان کی کہ مخصوص اصطلاحوں کے ساتھ خوبصورت الفاظ کی لہریں اچھل اچھل کر بہ رہی تھیں۔ ایک دن مختلف قوموں کے فواکہات و مشروبات کی طلسم ہوشربا بیان کی تو گفتگو کئی گھنٹوں تک پھیل گئی۔ ہم حیران تھے کہ جاپان اور میکسیکو کے فواکہات و مشروبات کی جزیات تک سے بھی آشنا ہیں۔ ایک دفعہ کبوتروں کا ذکر چھڑ گیا تو ان کی نسلوں اور خوبیوں کا مرقع سنا ڈالا، پھر چرند و پرند کی عادتوں پر روشنی ڈالی تو ایک تہائی دن اس کی نذر ہو گیا، کسی نے غالب کا ذکر چھیڑا تو سبحان اللہ گویا خود غالب ہیں، یا ان کے ساتھ عمر گزاری ہے، وہ ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر کے ہر شاعر کو جانتے اور ان کے بعض چیدہ چیدہ اشعار بھی حفظ تھے، ادب کے ہر شعبہ میں ان کی نگاہ تھی۔ ایک دن رستم زماں گاماں پہلوان ملنے آ گئے ہم لوگ وہیں تھے، اب جو پہلوانی کی تاریخ بیان کی تو ہم دنگ رہ گئے گویا رستم و اسفندیار کے ساتھ ڈنٹر پیلتے رہے ہیں۔ بنوٹ پر گفتگو کی تو پوری کتاب کہہ ڈالی۔ مولانا محمد علی الہ آباد میں سنگم پر کشتی رانی کے لئے چلے گئے واپس آئے تو ان سے یہی موضوع چھیڑ دیا، وہ گر بتائے کہ فن کی پوری تاریخ سامنے آ گئی۔ تمباکو پر روشنی ڈالی تو کہاں سے کہاں نکل گئے۔ پان کا تذکرہ کیا تو پتے سے لے کر کتھے تک اور سپاری سے لے کر قوام تک، جانے کیا کچھ بیان کیا۔ ہم ششدر تھے، الہ العالمین ابوالکلام ہیں کہ صحیفہ کائنات۔

ایک دن مختلف ملکوں کی خواتین پر اس شائستگی سے اظہار خیال کیا کہ عباسی عہد کے ان داستان گو عبقریوں کی یاد تازہ ہو گئی جو اس موضوع میں عربی زبان کے بانکپن کی رعایت سے یگانہ عصر تھے۔ مولانا کے طرز کلام کا عظیم پہلو یہ تھا کہ ان کی زبان پر کبھی مبتذل الفاظ نہ آتے، وہ ان الفاظ ہی سے ناآشنا تھے۔ فرماتے رکیک الفاظ مخرب الاخلاق قوموں کا سنڈاس ہوتے ہیں۔"

راقم وزارتی مشن کے زمانے میں شاہ جی کے ہمراہ دھلی میں تھا ایک دن وقت لے کر مولانا کے ہاں پہنچے تو اس جلسے کا ذکر آ گیا، جو گئی رات دہلی میں جامع مسجد کے سامنے ہوا تھا اور کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس جلسے میں آئے تھے۔ اور کرپس نے بھی تھوڑی سی دیر جلسے کے بے پناہ ہجوم پر نگاہ کی تھی۔

مولانا نے شاہ جی کی شیوہ بیانی کو سراہتے ہوئے استفسار کیا۔
شاہ صاحب، سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لڑھکا دیتے ہیں۔
شاہ جی نے لاحول پڑھا اور کہا:
حضرت آپ سے کس نے کہا؟
مولانا: کوئی ذکر کر رہا تھا۔
شاہ جی: کون؟
مولانا: میرے بھائی نام تو یاد نہیں رہا لیکن کوئی بیان کر رہا تھا۔ کان میں بھنک پڑی تو تعجب ہوا۔
ہر کسی کا نام نہ تو حافظے کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے۔
شاہ جی: تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا۔
مولانا: سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے، آپ سے جو تعلق خاطر ہے اسکے باعث معاً وہ چیز یاد آگئی۔
شاہ جی: "جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے۔"
مولانا: "وہ پھانس اس لئے دماغ میں رہ گئی معاً تحریکِ خلافت کا زمانہ یاد آگیا۔ آج سے کوئی چوبیس یا پچیس برس پہلے آپ نے لاہور میں ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے۔ ان میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے جن میں جل، چل، ٹل قسم کے قافیے تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگلوا دی ہو۔ اور شاید زبان لڑکھڑا گئی ہو
شاہ جی: مولانا! جس شخص نے الہلال پڑھا ہو وہ گالی دے سکتا ہے؟
شاہ جی مسکرائے اور کہا۔
حضرت ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو اب تک یاد ہے۔
فرمایا:

"میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں، گو حافظہ ہر طرح کی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں سے گزرتا ہے لیکن بعض چیزیں حافظے کے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں، وارث شاہ کا کلام تھا آپ کی وجہ سے حافظے میں ایک تاثر رہ گیا اب جو آپ سامنے آئے تو وہ تاثر بھی تازہ ہو گیا"۔

شاہ جی کھلکھلا کر ہنس پڑے، ہم لوٹ پوٹ ہو گئے۔ مولانا کی زبان سے پنجابی الفاظ اس طرح نکل رہے تھے گویا قاقم پر سنگریزے لڑھک رہیں۔ (۱)
شاہ جی نے صوم و صلواۃ کی پابندی سے متعلق لاہور کے ایک اخبار کا تذکرہ کیا کہ اس کا پورا قبیلہ صوم و صلوۃ کا باغی ہے۔ لیکن اس نے پچھلے دنوں آپ کے خلاف اپنی ایک نظم میں نماز نہ پڑھنے کا طعن کیا تھا،
مولانا مسکرائے اور فرمایا:

"شاہ صاحب، جب تک انہیں میری سیاست سے اختلاف ہے اس وقت تک میرا اسلام ان کے ہاں مشکوک ہے۔ اور اگر میں ان کی سیاست کا ہو جاؤں تو پھر اسلام سے میرا لہو ولعب بھی عین اسلام ہو گا۔ انہیں اسلام کی آڑ میں اپنی سیاست سے دلچسپی ہے۔" (۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک دفعہ مولانا کی نازک مزاجی پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب فقرہ کہا تھا کہ "آپ کے تلوے میں انسانی سر کا بال آجائے تو پاؤں میں موچ آجائے گی۔ پھر ہفتوں لیٹے رہیں گے کہ بیمار ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ عزیز تخلیہ تھا اور سب سے زیادہ پریشان بھیڑ سے ہوتے۔ وہ عادتاً ملاقاتی طبیعت کے آدمی نہ تھے۔ ان کا مؤقف تھا۔

فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے۔ (۳)

وزارتی مشن کے زمانے میں شاہ جی دہلی میں تھے۔ ہم کوئی دوماہ دہلی میں اکٹھے رہے تھے اور وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار حصہ تھا۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں اگر اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو یہ یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں لیکن وہ طرح دے گئے۔

"بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے۔؟"

"مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامیٔ حیات دو روزے نہ بود و بیش
آں ہم کلیم با تو بگویم چساں گزشت
یک روز صرف بستنِ دل شد بایں و آں
روزے دگر بکندنِ دل زیں و آں گزشت"

تفصیل طلب کیجئے تو مسکرا دیں گے، آغا فہمیدیم اور بس...... لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف ہے۔ مولانا اپنے سے باہر جھانکتے نہیں اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مولانا کے لئے تخلیہ صحبتِ عیش ہے اور شاہ جی کے لئے جاں کنی،

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

عمر بھر ایک ہی تصویر کھنچوائی ہے۔ دوچار تصویریں اور بھی ہیں لیکن سب چوری چھپے کی۔ جب ان سے یہ کہیں کہ فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت ہے) کی تصویریں عام ہیں تو وہ مسکرا دیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد ہوں شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں، بابو! میرے میاں ﷺ نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں" (۴)

اسی زمانہ میں ملک فیروز خان نون نے دہلی میں کہا تھا کہ
"پاکستان نہ بنا تو ہم چنگیز خان و ہلاکو خان بن جائیں گے"
شاہ جی نے وہیں ایک بڑے جلسے میں سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا"
"فیروز خان کو شاید اپنے نام کی مناسبت سے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مسلمان ہونے کا گمان ہوا ہے"
اگلے روز شاہ جی مولانا سے ملے تو مولانا نے ایک موضوع اٹھا کر کئی موضوع پیدا کئے۔

دعا دے مجھے اے زمین سخن
کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

مولانا گفتگو کرتے تو الفاظ سلکِ مروارید ہوتے یا رنگارنگ پھولوں کا سبدہ اور تمام اجزاء طبی لسنے کی طرح ہوتے۔ (۵)

شاہ جی نے فرمایا "مولانا مسلمانوں کے عہدِ گم گشتہ کی ذہانت و فراست کا مجسمہ اور دہلی و بغداد کے علم و نظر کا مرقع ہیں۔ وہ آیتِ ربانی ہیں۔ فی الجملہ وہ مسلمانوں کے گمشدہ اقبال کی ترت پھرت تصویر ہیں۔" (۶)

لاہور میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ایک معتقد کارخانہ دار تھے۔ (حاجی دین محمد صاحب مرحوم) انہیں لوہے کی ضرورت تھی اور لوہا ان دنوں مرکزی حکومت کے پرمٹ سے ملتا تھا۔ وہ شاہ جی کو اٹھا کر اور شاہ جی راقم کو لیکر دہلی گئے۔ وہاں بن بلائے مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا۔ شاہ جی کو اپنے تعلق خاطر پر اعتماد تھا۔ اصرار کیا۔ مولانا انکار کر چکے تھے۔ شاہ جی نہ ٹلے تو مولانا اندر سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اُن کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ شاہ جی کی بات سنی تو آگ بگولہ ہو گئے۔ فرمایا۔

"۱۹۳۷ء سے مسلمان صوبوں کی کانگریسی وزارتوں اور ہندو صوبوں کے مسلمان وزیروں کا انچارج ہوں۔ ان کا محاسبہ ضرور کیا ہے لیکن ان سے سفارش کبھی نہیں کی۔ آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ کیا ہے اور اس کے بعد جھٹ سے اندر لوٹ گئے۔

شاہ جی کے ساتھ مولانا کا سلوک فی الواقعہ غلط تھا، مولانا اگر بے نیاز تھے تو شاہ جی بھی غیرت مند تھے۔ مولانا کے متعلق انہیں اپنے ذہنی اعتماد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ بہر کیف مولانا آزاد اس قسم کی سفارشوں کے معاملے میں آخری عمر تک بے لحاظ تھے۔ (۷)

کرپس مشن کی آمد کے دنوں میں شیخ حسام الدین شاہ جی کی ملاقات کے لئے مولانا سے وقت لے آئے، اڑھائی بجے سہ پہر سے ساڑھے چھ بجے شام تک کا اور یہ شاہ جی سے ہم سخنی کے لئے کافی تھا لیکن شاہ جی گھر ہی سے چالیس منٹ لیٹ چلے، گھنٹہ بھر تاخیر سے پہنچے، مولانا کوٹھی کے دروازے پر پریشان کھڑے تھے،

موٹران کا بگڑا ہوا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہا:

"ہاں تو ذرا آپ کا موٹر مجھے چھوڑ آئے اور آپ یہاں میری واپسی تک بیٹھیں۔"

شاہ جی نے آگے بڑھ کر کندھا جھکاتے ہوئے کہا۔

حضرت، شانے حاضر ہیں،

"ہاں میرے بھائی! وہ بوجھ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں۔ (مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا)

تھوڑی سی دیر میں واپس آگئے۔

فرمایا:۔ وائسر یگل لاج تک گیا تھا کرپس سے کہا ہے جو فیصلہ بھی کرنا ہے جلد کیجئے یہاں دہلی میں گرمی کا زور ہو گیا ہے، چنانچہ گفتگو شملہ منتقل ہو گئی ہے۔"

شاہ جی نے پوچھا، حضرت! "غبار خاطر" چھپ گئی ہے؟

فرمایا:۔ "ہاں میرے بھائی، لیکن جلد سازی مکمل نہیں ہوئی، کچھ کاپیاں ناشر نے بھجوائی ہیں، ان میں سے ایک جواہر لال کو بھجوادی ہے۔"

عبداللہ کو آواز دی، غبار خاطر کی دو کاپیاں لے آؤ،

ایک کاپی شاہ جی کو دستخط کر کے دی، (اس پر مولانا نے لکھا برائے صدیقِ عزیز سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ ابوالکلام) دوسری مجھے، اس پر لکھا:

"بپاس خاطر عزیزی عبدالکریم شورش۔"

یہ میرے لئے ایک بڑا افتخار تھا، شیخ حسام الدین پریشان سے ہوئے، مولانا تاڑ گئے، ایک کاپی اور منگوا کے ان کی نذر کی، ہمارے ساتھ نوابزادہ نصر اللہ خاں بھی تھے، انہیں آٹو گراف دیا،

ہے آج جو سر گذشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

اب جو ملک کے مختلف مسائل پر باتیں چھڑیں تو گلفشانی گفتار کا نقشہ کھنچ گیا، طبع رواں کا دریا موجیں مار رہا تھا، فرمایا:

"ملک میں غیر ملکی استبداد کا رہنا ممکن نہیں رہا، حکومت کے لئے ایک ہی چارہ کار ہے کہ ہندوستان کی حکومت ملکی نمائندوں کو سپرد کر کے چلی جائے، اب اگر حکومت نے یہاں رہنے پر اصرار کیا تو اس کے نتائج خطرناک ہونگے اس کی حکمرانی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور کوئی سا دامن بھی اسے پناہ دینے کے لئے باقی نہیں رہا۔ ساری روک اب اس بات کی ہے کہ جائیں تو کس طرح اور اختیارات منتقل کریں تو کیسے اور کیونکر؟

"لیگ سے کیسے نمٹا جائے گا،" شیخ صاحب نے پوچھا،

"لیگ سے معاملہ تو بہر حال طے ہونا ہے، رہنا تو یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو ہے، پاکستان

بنالیں تو بھی ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو یہاں رہیں گے اور جن کے لئے یہاں سے اٹھ کے جانا مشکل ہو گا نہ تو پاکستان جو بنے گا۔ اس کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو سمانا اور کھپانا ممکن ہے اور نہ عام لوگوں ہی کے بس میں ہے کہ پاکستان بنتے ہی ان کی آنکھ پاکستان میں کھلے گی، یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کھٹن ہے، کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ جناح کانگرس سے غایت درجہ بدظن ہیں، ہر چند میں نے چاہا ان سے معلوم کروں کہ مصالحت ممکن ہو تو کس نقطہ پر ہو سکتی ہے یا وہ کس مقام پر ٹھہر سکتے ہیں لیکن ان کے جواب سے آپ لوگ آگاہ ہیں، گاندھی نے کئی دفعہ کوشش کی، جواہر لال بھی ہو آئے، لیکن وہ پٹھے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دیتے، ظاہر ہے ہندوستان تقسیم ہوا تو پاکستان بھی تقسیم ہو گا۔ جوش و غضب میں ہوش و خرد کہاں رہتے ہیں، اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر فریق اس کوشش میں ہے کہ پاتا کیا ہے؟ جہاں تک اختیارات کی منتقلی کا تعلق ہے، انگریز چاہیں بھی تو روک نہیں سکتے، وہ ہندوستان کو واقعی چھوڑ رہے ہیں، کانگریس چاہتی ہے یہ کام اس کی خواہش کے مطابق ہو، اور مصالحت امن سے ہو، لیگ چاہتی ہے کہ اس کا موقف پورا ہو اور بہر قیمت پورا ہو، اختیارات تو کانگرس اور لیگ ہی کو منتقل ہونگے لیکن مفاہمت کے فقدان اور اس سے پیدا شدہ آویزش نے انتقال اختیارات کی نوعیت اور اس کا تعین حکومت کے ہاتھ میں دے دیا ہے، ظاہر ہے فریقین راضی نہ ہوں تو فیصلہ تیسری جماعت کو دینا پڑتا ہے۔''

شاہ جی نے کہا.......... اس کا مطلب ہے کہ لیگ سے صلح کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے۔ مولانا نے فرمایا

''فی الحال تو ناکام ہی ہو گئی ہے۔ آئندہ کامیابی کا امکان نہیں، بلکہ حالات اور خراب ہوتے جا رہے ہیں۔۔
شاہ جی نے چاہا۔ مولانا کی طبیعت کا رخ ادبیات کی طرف پھیر دیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ تھکے ہوئے ہیں اور ان کی طبیعت پر کوئی بوجھ ہے۔ البتہ دو چیزیں جو گھنٹہ بھر کی اس صحبت میں معلوم ہوئیں یہ تھیں کہ:

(۱) صورتِ حالات سے خوش نہ تھے، ہندوستان کی آزادی کا نقشہ جو کبھی ان کے ذہن میں تھا ادھورا رہا جا رہا تھا، آزادی آ رہی تھی مگر اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہ رہے تھے جو کچھ ان کا دل محسوس کرتا کہہ نہیں سکتے تھے، انسانوں میں رہ کر بھی آخر تک انہیں اپنی تنہائی کا احساس اور اس پر اصرار رہا۔

(۲) اس ملاقات سے بہت پہلے ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو وزارتی مشن کا پلان ان کے ذہن میں تھا، اور وہ چاہتے تھے مسلمان اس کو من و عن قبول کر لیں، اس سے بہتر نتائج پیدا ہونگے، مولانا کے الفاظ جو میری یادداشتوں میں درج ہیں، تقریباً یہ تھے کہ:

''جو حل میں نے تجویز کیا ہے اگر جانبین نے اس کو مان لیا تو جس انتہا پر سیاسی ہیجان ہے

یا جس سطح پر حالات کھول رہے ہیں اس حل سے وہ ہیجان بھی ختم ہوگا اور حالات بھی معمول پر آجائیں گے۔ اس طرح ظن و تخمین، شک وشبہ، اور تکرار و تصادم کا مطلع صاف ہو جائے گا۔"

"وزارتی مشن جو سکیم پیش کر رہا ہے آپ کی ہے؟" شیخ صاحب نے پوچھا،

"نہیں بھائی! سیاسیات میں کوئی خیال، تجویز، نقشہ یا موقف کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوتا، یہ چیزیں باہمی سوچ بچار اور گفت و شنید سے وضع ہوتی ہیں، میں نے ایک خاکہ تجویز کیا تھا، میرا خیال ہے وزارتی مشن نے اس پر صاد کیا ہے، اب اس کی تفصیلات اور جزئیات کا انحصار ان کے اپنے فکر اور اپنی دسترس پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح آخری شکل دیتے ہیں۔

مولانا قدرت کا عطیہ تھے لیکن

مصحفے درمیانِ زندیقاں

پنڈت نہرو ان دنوں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن خبر لائے کہ وہ شاہ جی سے ملنا چاہتے تھے اور میں انہیں میر احمد حسن کی دکان پر کل پانچ بجے شام مدعو کر آیا ہوں۔ پنڈت جی وعدہ کے مطابق پہنچ گئے، شاہ جی سے معانقہ کیا ہم سے مصافحہ، میں تھا، شیخ صاحب تھے، ماسٹر تاج الدین انصاری تھے، مولانا حبیب الرحمن تھے اور میر احمد حسن، تعارف ہوا، پنڈت جی کوئی سوا گھنٹہ ٹھہرے، کھل کے باتیں کیں، ہندی سنسکرت کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا، سیاسی بات چیت میں انگریزی ضرور ٹپک پڑتی ہے، مجال ہے کسی اصطلاح یا کسی خیال میں انگریزی کا لفظ آیا ہو، صاف ستھری بے عیب اردو بولتے رہے جیسے کوئی فیصح لکھنوی ہو، خود الہ آباد کے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کی اپنی زبان اردو تھی۔ چوکس فقرے، روزمرہ کا غازہ، محاورے کی سرخی، سلاست کا زور، دانائی کا عمق، انشاء کی زیبائی، بول چال کی صفائی، غرض اردو ان کی زبان پر قربانت شوم کی صدا دے رہی تھی.......... پنڈت جی سیاسی، معاشی اور مجلسی مسئلوں پر گفتگو کرتے رہے، انہیں شدید احساس تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اور ہر گفتگو کے بعد مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

"تقسیم ناگزیر ہو چکی ہے تو مان لیں:" میں نے پنڈت جی سے کہا،

"بظاہر تو ناگزیر ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا حل بھی سامنے آگیا ہے، مولانا آزاد نے وزارتی مشن کو ایک خاکہ دیا ہے، شاید اس کے مطابق کوئی صورت نکل آئے، کرپس نے تو مجھ سے یہی کہا کہ وزارتی پلان کے لئے مولانا کی تجاویز ایک عمدہ بنیاد ہیں۔"

"وہ خاکہ کیا ہے"؟ میں نے سوال کیا۔

پنڈت جی مسکرائے۔ "ہفتہ عشرہ میں سامنے آجائے گا، کوئی چیز بجائے خود راز نہیں ہوتی، صرف وقت کی اڑچن ہوتی ہے کہ اب بیان کی جائے یا وقت پر اور جو چیز راز ہوتی ہے اس کا عوام سے تعلق نہیں ہوتا۔"

شیخ صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پنڈت جی نے کہا
"جناح کا ماننا اور ہمارا منانا دونوں بیکار ہو چکے ہیں، اپنی سی سب کوششیں کرلی ہیں۔
ماؤنٹ بیٹن پلان کے بعد بھی پنڈت جی کا یہی خیال تھا کہ بٹوارہ نہیں ہوگا، کیونکہ تقسیم کا ماننا اور چیز ہے اور تقسیم کا ہونا دوسری چیز، لیکن ملک تقسیم ہو گیا، پنڈت جی نے اس روز ایک عجیب سا "انکشاف" کیا کہ سکندر حیات نے قرار داد پاکستان کے فوراً بعد انہیں ایک خط لکھا تھا کہ وہ تقسیم کے حامی نہیں ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا آپ نے تو قرار داد لاہور کی تائید کی ہے؟
جواب دیا کہ "اسٹیج کی بات اور ہوتی ہے۔"
شاہ جی نے کہا وہ خط کہاں ہے؟ پنڈت جی نے کہا الہ آباد میں کہیں پڑا ہو گا، آپ ذکر کرنا چاہیں تو میرا نام لے دیں، میں وہ خط آپ کو بھجوا دوں گا۔
پنجاب کا ذکر چھڑ گیا تو پنڈت جی جھنجھلا گئے۔
"پنجاب نے ہمیشہ ہی روکاوٹیں پیدا کی ہیں۔!
میں نے کہا۔ "پنڈت جی آپ نے جو لیڈر صوبہ کے لئے منتخب کئے ہیں ان کی سزا عوام کو نہ دیں۔
مسکرائے، "نہیں صاحب، یہ بات نہیں اوّل تو ہم نے لیڈر منتخب نہیں کئے، لیڈر تو عوام منتخب کرتے ہیں، ہم نے تو انہیں کام سونپا ہے، لیکن پنجاب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جب تک آپس میں چغلی نہ کھائیں یا ایک دوسرے کو گرائیں نہیں، ان کی طبیعت ہی آسودہ نہیں ہوتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کے بیشتر کام رکے رہتے ہیں اور پنجاب کا مسئلہ ہم سب کے لئے دردِ سر بن گیا ہے، کوئی سا گوشہ اطمینان کا نہیں رہا۔"
"یہ پنجاب ہی تھا جہاں راوی کے کنارے آپ کی صدارت میں کامل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہوا اور صدارت کا پہلا شرف آپ نے پنجاب ہی کو بخشا تھا۔" میں نے کہا۔
"یوں تو پنجاب سے میرا تعلق بہت گہرا ہے، میری والدہ پنجاب کی تھیں۔ لاہور چونے منڈی میں ان کا مکان تھا لیکن پنجاب کا سیاسی مزاج ہمیشہ قابو سے باہر رہا ہے، وہاں سیاسیات سے زیادہ ذاتیات کے جھگڑے رہتے ہیں، ہم نے بہت چاہا کہ احرار کانگرس میں شامل ہو جائیں، صوبہ کانگرس کو دو سال کے لئے معطل کر کے احرار کے حسبِ منشاء ایک کمیٹی بنا دینا چاہی جو صوبائی کانگرس کے ہر کام کی انچارج ہوتی لیکن احرار ہی راضی نہ ہوئے۔"
پنڈت جی نے یہ بات کہہ کر شاہ جی کی طرف دیکھا شاہ جی طرح دے گئے،
پنڈت جی جانے لگے تو میں نے ان سے عجیب سا سوال کیا۔
"پنڈت جی، لوگ آپ سے محبت کیوں کرتے ہیں؟"

پنڈت جی مسکرائے............ بھئی یہ بھی کوئی سوال ہے؟
میں نے اصرار کیا توشاہ جی نے کہا، "یہ لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔" (۸)
پنڈت جی رک گئے۔
"جی نہیں! وجہ یہ ہے کہ لوگ آوارہ گرد ہوتے ہیں اور میں بھی آوارہ گرد ہوں، لہذا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

مسلم لیگ نے مولانا کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا وہ گالی گفتار کی انتہاء پر تھا۔ نیازمند قدرتاً اس پر برہم تھے۔ ترجمانِ احرار روزنامہ آزاد (لاہور) بھی جواباً طعن و طنز کی زبان استعمال کرنے لگا مولانا کو پتہ چلا تو راقم کو بلا بھیجا احقر دہلی پہنچا، فرمایا

"زندگی نہ بھڑک اٹھنے کا نام ہے نہ بجھ جانے کا
بلکہ سلگتے رہنا ہی زندگی کا نام ہے"

لیگ کی اپنی زبان ہے اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیئے۔
سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو راقم کی موجودگی میں کہا:

"شاہ جی خطابت آپ کو عطیہ الہی ہے۔ اور جو چیز عطیہ الہی ہو اس میں درشتی نہ ہونی چاہیئے۔ جو لوگ حریف بذلہ نہیں ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔ آپ کو ان چھوٹی موٹی ندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگریزے اگلتی اور ریت پھینکتی ہیں۔" (۹)

خلافت کی تحریک ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی لیکن ۱۹۲۰ء کا زمانہ لسکے برگ و بار کا زمانہ تھا۔ جس طرح بہار کے موسم میں پھول اگ آتے اور چمنستان لالہ و گلاب سے لاپھند جاتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں سیاسی کارکنوں، سیاسی رہنماؤں اور سیاسی خطیبوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی۔ سارا ملک ان سے متحرک ہو گیا۔ کوئی سی ہندوستانی قوم اس سے خالی نہ رہی۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، ہر جماعت میں شخصیتیں ڈھلنے لگیں۔ فی الجملہ یہی زمانہ اردو میں جاندار سیاسی خطابت کا عہدِ آغاز تھا۔ مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا احمد سعید دہلوی کے علاوہ خطیبوں کی ایک لین ڈوری لگ گئی۔ احرار رہنماؤں کی پوری جماعت خطباء کی جماعت تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری آغاز میں صرف خطیب تھے۔ ان کی سیادت کا چراغ ان کی خطابت کے چراغ سے مقابلتاً مدھم تھا۔ اردو زبان نے ان سے بڑا عوامی خطیب پیدا نہ کیا۔ ان میں یداللہی بانکپن تھا کہ مجمع ہائے عوام کے خیبر آنِ واحد میں سر کر لیتے تھے۔

مولانا آزاد میں محمد علی کی مبارزت، ظفر علی خان کی مقاومت، عطاء اللہ شاہ کی شہامت اور احمد سعید دہلوی کی نزاکت کے عناصر نہ تھے۔ لیکن وہ ہر رعایت سے اتنے جامع الصفات خطیب تھے کہ خطابت ان کے بیان کا

ہالہ تھی۔ اکثر خطباء وزعماء ان کے محاسنِ خطابت اور محامدِ نگارش سے فیضیاب ہونے کا اعتراف کرتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری قرنِ اول کے فقر و استغناء کی تصویر تھے۔ ہندوستان خطابت میں ان کا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ خود مولانا آزاد نے ان سے متعلق کہا تھا کہ:

"اس باب میں قومی جدوجہد کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے"

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ:

شاہ جی کی باتیں عطاء اللّہی ہوتی ہیں۔"

ان کا حال یہ تھا کہ گاندھی و نہرو سے بھی ایغو کے ساتھ ملتے لیکن مولانا آزاد سے اس طرح ملتے گویا ان کے خورد ہوتے اور ان کی بزرگی سے مرعوب ہیں۔ (۱۰)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس مولانا کے کئی ایک خطوط تھے۔ شیخ حسام الدین کے پاس بھی چند مکتوب تھے۔ لیکن وہ تقسیم کے خرابہ میں ضائع ہوگئے۔ (۱۱)

مجلس احرارِ اسلام کے نوے فیصد زعماء مولانا آزاد اور الہلال کی دعوت پر جنگِ آزادی میں شریک ہوئے۔ (۱۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری خطابت کے بادشاہ تھے۔ جس طرح الہلال کی صحافت میں قرآن کی آیتیں اور شاعری کے تیرو نشتر ہر بیرے یا فقرے کے موڑ پر ہوتے اسی طرح شاہ جی کی خطابت میں قرآن کا جلال اور شاعری کا جمال ہوتا۔ سامعین ان کے سحر کا شکار ہوتے۔ شاہ جی الہلال کے ذہنی شاگرد تھے۔ الہلال کا جادو تھا کہ سارا ملک اسی کا ہو گیا۔ اس نے خطیبوں اور رہنماؤں کی ایک سیاسی جماعت پیدا کی جس نے استعمار دشمن ہندوستان طیار کیا۔ الہلال کے اس فیضان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مجلسِ احرار اسلام کے ذہنی پس منظر میں اسلام کے شغف کی حد تک الہلال ہی کے دورِ اول کا ولولہ ہے۔ (۱۳)

علامہ انور شاہ کاشمیری سے متعلق مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (رئیس الاحرار) نے بتایا کہ مولانا آزاد دیو بند میں حضرت قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کی قبروں کے پاس ٹہل رہے تھے۔ علامہ انور شاہ نے دور سے دیکھا تو فرمایا:

"وہ دیکھو علم ٹہل رہا ہے۔"

فرمایا:

"ابوالکلام نے الہلال کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا ہے۔"

احرار زعماء الہلال و زمیندار کی پکار پر ملک کی سیاسی جدوجہد میں شامل ہوئے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۹۵۳ء میں تحریکِ تحفظ ختم نبوت کے ایک جلسے میں مولانا ظفر علی خان کے دونوں گالوں پر عقیدت کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا"

"ظفر علی خان! تیرے ستارہ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی۔"

لیکن مولانا آزاد سے شاہ جی کی ارادت کا یہ حال تھا کہ اپنی سیاسی زندگی کو ان کی تصنیف کہتے۔ فرماتے:
"الہلال نے مجھے خطابت سکھائی، سیاست پڑھائی اور زبان و بیان کی ندرت بخشی ہے۔
الہلال نہ ہوتا تو نہ جانے کب تک ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں خلاء رہتا"

چودھری افضل حق، احرار کا شہ دماغ تھے۔ شاہ جی انہیں مجلس احرار کا مہاتما کہتے۔ چودھری صاحب مولانا آزاد کو ملک علم کا شہنشاہ اور تدبر کے اعتبار سے بے پناہ کہتے تھے۔ فرماتے:
"ابوالکلام نے مجھے اس راہ پر ڈالا اور شاہ جی نے تھانیدار کی وردی اتروادی"

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے مولانا آزاد کو ہمیشہ اپنا مرشد کہا، فرماتے:
"ابوالکلام میں صدیق کا عشق، فاروق کا دبدبہ، عثمان کی حیاء، علی کا استغنا، ابوذر کا فقر اور احمد بن حنبل کی استقامت رچی ہوئی ہے، وہ ان خصائص کا مجسمہ ہیں۔"

شیخ حسام الدین، احرار کا بازو تھے۔ مولانا سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ ان کے خلاف اختلافی بول تک نہ سنتے۔ کسی زبان پر ایسا کلمہ ہوتا تو اس سے الجھ پڑتے۔ فرماتے:
"ہم لوگ انسانی وجود میں ابوالکلام کی تحریریں ہیں۔" (۱۴)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مولانا آزاد سے متعلق موتی لال نہرو کے یہ الفاظ راقم سے بیان کئے کہ:
"مولانا کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا نہیں بلکہ علم، فکر، فہم اور تدبر ہیں۔" (۱۵)

ایک دفعہ راقم نے شاہ جی سے کہا:
"شاہ جی آپ نے زندگی میں کتنی دفعہ مولانا سے ملاقاتیں کی ہیں؟"
فرمایا"
"یاد تو نہیں لیکن بیسیوں دفعہ ان سے فیض حاصل کیا ہے ہم نشین رہا، ہم سفر رہا، (جیل میں اکٹھے رہے) اور بارہا ملاقاتیں کی ہیں۔"
"ان ملاقاتوں کو خود لکھتے، نہیں تو کسی سے لکھوا دیجئے۔ اس طرح ایک عمدہ کتاب ہو جائیگی۔"
"بھائی میں قلم کا آدمی نہیں"
"میں حاضر ہوں آپ بولتے اور سناتے رہیئے میں لکھتا جاؤں گا۔"
"خامہ فرسائی بھی تو ایک روگ ہے، پھر یہ چیزیں سکون دل سے ہوتی ہیں۔ فرصت میں قلمبند کی جا سکتی یا کرائی جا سکتی ہیں۔ آج زمانہ وہ ہے کہ سکون و فرصت دو نو عنقا ہیں۔"
"اس طرح ان گفتگوؤں کے اکارت ہو جانے کا احتمال ہے۔ ایسا شخص جو آپ کے نزدیک اسلامی معاشرے کے اس قحط الرجال میں سب سے بڑا عبقری ہے اس کی گفتگوئیں قلمبند کرنا آئندہ نسلوں کی ایک امانت انہیں سونپنا ہے۔"

"ہاں بھائی ٹھیک ہے، لیکن مولانا کی زبان کہاں سے لاؤں ہم لوگ مولانا کے افکار کے سوانح ہیں۔
شاہ جی ٹال گئے لیکن صبح و شام کی یکجائی کے باعث مولانا کا ذکر چھڑ ا رہتا، کئی باتیں معلوم ہوتیں، مولانا کے عظیم فقرے شاہ جی کے نوکِ زباں تھے۔

شاہ جی نے فرمایا:

"احرار کی بنیاد مولانا ہی کے مشورے پر رکھی گئی۔ لیکن ہم لاہور میں وہ کلکتے میں، ہم جلوت کے وہ خلوت کے، انہیں ملنا سرخ گندھک ڈھونڈ لانے کے مصداق تھا، ہم ان سے دوستانہ بے تکلفی نہ رکھتے، ہمارے اور ان کے درمیان علم کا فاصلہ تو تھا ہی لیکن ان کا ادب و احترام بھی ایک طبعی فاصلہ تھا۔ ہمارے سامنے روزمرہ کے عوارض تھے۔ اور وہ ان کی طرف نگاہ ہی نہ کرتے تھے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ احرار الہلال کی باز گشت ہیں۔"

"مولانا مسلمانوں سے اس قدر مایوس کیوں ہیں؟" راقم نے شاہ جی سے پوچھا۔

فرمایا:

وہ تو نہیں لیکن مسلمان ان سے مایوس ہیں۔ مولانا نہ ان کی سطح پر اترتے ہیں اور نہ ان کے دماغوں کی پستیوں سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ مسلمان شاعری کی پیداوار ہیں، وہ لیڈر شپ سے اپنی خواہشوں کا اتباع چاہتے اور خود لائحہ عمل تجویز کر کے اسے تختہ دار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی مضبوطی کے بعد مسلمانوں کی لیڈر شپ سرکاری امراء کی تحویل میں چلی گئی، اور وہ اجتماعی طور پر بڑے بڑے جاگیر داروں، زمینداروں، تعلقہ داروں اور تمنداروں کی ملکیت ہوگئے، مسلمان زندہ ہوتے تو مولانا مایوس نہ ہوتے اور مولانا تعلقہ دار ہوتے تو مسلمان اُن سے بد دل نہ ہوتے۔"

"مولانا کی عبقریت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

"مولانا چونکہ مسلمان ہیں اس لئے ہر جتی اعتراف مفقود ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام کانگرس کی سب سے بڑی فراست کا نام ہے وہ کانگرس کو طوفانوں سے نکالتے اور مخالفین کے دلوں میں اتارتے ہیں۔"

شاہ جی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مسلمانوں نے انہیں کربلا میں کھڑا کیا ہے ان کے لئے مسلمانوں کی اکثریت فرات کا کنارہ ہے، آج مسلمان صرف مسلمان ہوتے اور انہیں اپنی تاریخ کا علم ہوتا تو ان کی عقیدت کا مرجع ہوتے، یہ کوئی معمولی چیز ہے کہ جس ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینا تھا اس ہندوستان کی آزادی کے لئے ابوالکلام انگریزوں سے گفتگو کر رہا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو کو اپنی

متاع سمجھتے ہیں اور مسلمان اردو پر سیاستہً بچھے جاتے ہیں گو مجھے خدشہ ہے کہ مسلمانوں کی اس عصبیت کے باعث اردو نہ صرف ہندوستان میں زخم کھائے گی بلکہ ایک عظیم ابتلاء کا شکار ہو گی۔ لیکن مولانا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندوں سے، کہ ان کی زبان ہی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے، اردو مین مذاکرات کرتے اور اردو میں، ہمکلام ہوتے ہیں۔ افسوس نہ بابائے اردو اس پر فخر کرتے اور نہ مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایک جذباتی بات ہی سہی لیکن جذباتی قوم جب سیاسی طور پر نابینا ہو جائے تو وہ حسن پر قبح کو ترجیح دیتی اور زیاں پر سود کا گمان کرتی ہے۔ مسلمانوں کی سرگزشت انہی حادثوں سے اٹی ہوئی ہے۔"

شاہ جی نے کہا......... ابوالکلام:

۱۔ اس زمانے میں ملت اسلمیہ کے سب سے بڑے عبقری ہیں اور فی الواقعہ ابوالکلام ہیں۔

۲۔ ان کا وجود قدرت کا عطیہ اور ان کا دماغ معجزہ الہی ہے۔

۳۔ وہ مسلمانوں کی اس لیڈر شپ کے میر قافلہ ہیں۔ جو تحریک خلافت کے زمانے میں ابھری اور قربانی و استقامت کی مظہر ہو گئی اور اب بھی مسلمانوں کی ناقدری کے باوجود ہندوستان میں سرگرم جہد ہے۔

۴۔ وہ قرن اوّل کے حجاز کی آواز ہیں جو صدیوں کی مسافت کے بعد ہندوستان پہنچ کر خود مسلمانوں کے لئے اجنبی ہو گئی۔

۵۔ ان کے ذہنی کمالات صرف اس وجہ سے عوام میں نہیں آتے کہ مسلمان ہیں، مسلمان انہیں مانتے نہیں اور ہندوؤں کے لئے ایک مسلمان کی پوجا (ورشپ) کیونکر ممکن ہے؟

۶۔ وہ ہندوستان میں اسلام کی صدائے رستخیز تھے، لیکن برطانوی عہد میں مسلمانوں کو رزم کے حدی خوان کی نہیں بزم کے نغمہ خوان کی ضرورت رہی ہے اور وہ ہمیشہ گفتار کے غازی ہی کا اتباع کرتے ہیں۔

۷۔ مولانا نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، ممکن تھا ہندوستان کوئی اور کروٹ لیتا اور مسلمانوں کی سیاسی رفتار بیابانوں کی سمت مڑ جاتی۔ (۱۶)

---

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری، صفحات ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳
(۲) ایضاً صفحہ ۵۱
(۳) ایضاً صفحہ ۵۲
(۴) (سید عطاء اللہ شاہ بخاری ص ۱۹-۱۶-۱۵)
(۵) مولانا ابوالکلام آزاد، شورش کاشمیری، صفحہ ۵۹
(۶) ایضاً صفحہ ۶۹، ۷۰
(۷) ایضاً صفحہ ۸۲، ۸۳
(۸) بوئے گل نالہ دل، از شورش کاشمیری صفحہ ۴۰۲ تا ۴۰۸
(۹) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری صفحہ ۸۹
(۱۰) ایضاً، صفحات ۲۴۳ تا ۲۴۵
(۱۱) ایضاً صفحہ ۳۶۵
(۱۲) ایضاً صفحہ ۴۰۵
(۱۳) ایضاً صفحہ ۴۱۵
(۱۴) ایضاً صفحہ ۴۵۸، ۴۵۹
(۱۵) ایضاً صفحہ ۴۶۱
(۱۶) ایضاً صفحہ ۴۹۳ تا ۴۹۶

SAVOY HOTEL
MUSSOORIE.
TELE { GRAMS "SAVOY"
PHONE NO. 10

سیوائے ہوٹل
۱۰ ستمبر ۴۴ء

محبی فی اللہ — میں چاہتا ہوں کہ آپ دو تین دن کی
مہلت نکال کر آئیں اور مجھ سے ملیں۔ میں یہاں ۱۵ ستمبر تک ہوں
پھر دہلی جاؤں گا اور دہلی سے آپ کو اطلاع دوں گا کہ میرا قیام
کہاں ہوگا۔ امید ہے کہ آپ زحمت گوارا کریں گے
اور آکر ملیں گے۔ بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں

والسلام علیکم

ابوالکلام

عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری
امرتسر

MEMBER FOR EDUCATION
INDIA

۴۶
دہلی ۱۰ فروری

عزیزی۔ آپ جس دن آئے لیکن کاموں کی
مشغولیت سے ایسا بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ ایسپیشل
گورنمنٹ کمیٹی کا وقت ساڑھے نو تھا اور
میں دس بجے تک بھی فارغ نہ ہو سکا۔ اسلئے عذر خواہی
کے سوا چارہ کار نہ دیکھا۔ خیال تھا کہ آپ ٹھہریں گے
اور دوسرے دن مل سکینگے لیکن آپ ٹھہر نہ سکے۔
اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو آئندہ ہفتے کے
دن آ جائیے تاکہ کچھ وقت ملاقات کے لئے نکال
سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس دن وقت نہ نکال سکا

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری

امرتسر

بنتِ امیر شریعت مدظلہا

توضیحات بہ سلسلہ امیر شریعتؒ اور ابوالکلامؒ

۲۰ ستمبر ۶ ۴ء کا خط الیکشن سے پہلے کا ہے اور یقیناً "ضروری باتیں" اسی سے متعلق تھیں ابا جی نہ مسوری گئے تھے نہ دلی۔ اور مولینا حبیب الرحمن لدھیانوی صاحب نے ماسوائے ابا جی کے باقی حضرات کی رضامندی و علم سے "ضروری معاملہ" طے کر لیا تھا قاضی احسان احمد صاحب اور شورش صاحب مرحومین بھی کہتے تھے ہم لاعلم تھے، (یہ "احرار یونینیسٹ انتخابی مفاہمت" کا معاملہ تھا۔)

واللہ اعلم بالصواب

---

۱۰ فروری ۷ ۴ء کے خط کا سببِ ورود یہ واقعہ بنا۔

ایم۔ اے۔ ایس اینڈ کمپنی حبیب گنج لاہور کے مالک حاجی دین محمد صاحب مرحوم و مغفور حضرت مولانا احمد علی رحمہ اللہ کے مرید خاص تھے اور ابا جی کا بھی ازحد اکرام و احترام کرتے تھے بقول شورش صاحب مرحوم انہیں لوہے کا کوٹہ درکار تھا مجھے یوں یاد ہے انہیں کوئی پرمٹ درکار تھا بہر حال انکے شریک کار کوئی اور صاحب تھے، جن سے ابا جی قطعاً واقف نہ تھے ان صاحب کو لیکر حاجی صاحب دہلی گئے۔ اور حضرت مولانا آزاد سے ملاقات کی کوشش کی۔ اتنے ہنگامی دور میں مولانا کے پاس وقت بھی نہ ہوگا۔ اجمل خاں صاحب (مولانا کے پرائیوٹ سیکرٹری) سے ان حضرات نے ملاقات کا وقت مانگا، انہوں نے عذر کر دیا۔ یہ بیٹھ گئے کہ وقت لیکر جائینگے۔ اجمل خاں بھی اڑ گئے اور صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر یہ حضرات ابا جی کے پاس آئے اور مذکورہ واقعہ کا قطعاً کوئی ذکر نہ کیا بلکہ اپنا معاملہ یوں پیش کیا کہ آپکی سفارش مولانا مان لیں گے ہمارے ساتھ تشریف لے چلیئے۔ اب حاجی صاحب سے صرف سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے تو تعلق نہ تھا وہ سرمایہ دار ایسے تھے کہ انکے کارخانے میں نمازوں کے اوقات میں کام بالکل بند ہو جاتا اور حاجی صاحب معمولی ملازمین کے ساتھ جس صف میں جگہ مل جاتی کھڑے ہو جاتے اور جس روز حضرت مولانا تشریف فرما ہوتے نماز کے فوراً بعد وہ انکے جوتوں کے پاس آکر کھڑے ہو جاتے۔ اور حضرت مولانا جب فارغ ہوتے تو وہ جوتے اٹھا کر انکے آگے رکھ دیتے۔ ان وجوہ سے ابا جی انکی قدر کرتے تھے۔ انکے اصرار پر ابا جی مان تو گئے مگر کہا کہ شورش کو ساتھ لے لیتے ہیں۔ حاجی صاحب کو اتنی عجلت تھی کہ اس زمانہ میں انہوں نے دو سیٹیں ہوائی جہاز کی ریزرو کرائیں ایک اپنے لئے اور ایک ابا جی کے لئے لیکن ابا جی نے شورش صاحب اور حاجی صاحب سے فرمایا کہ آپ لوگ ہوائی جہاز پر جائیں میں گاڑی میں آؤنگا۔ وہ اپنے کارکنوں سے یہی سلوک کرتے تھے۔ شورش صاحب کی اللہ بال بال مغفرت فرمائے، جاتے ہوئے روزنامہ آزاد میں آٹھ کالمی سرخی لگا گئے کہ حضرت امیر شریعت مولانا آزاد سے اہم مذاکرات کے لئے بذریعہ طیارہ دہلی روانہ ہو گئے۔ حضرت امیر شریعت شورش صاحب کے بعد ریل

دہلی ۱۲ - فروری ۴۴ء

جناب خورشید
اس ہفتہ ضرورت کی ناگہانی مصروفیت رہی تھی
مجھے خود افسوس ہوا تھا کہ آپ آئے اور
ایک معاملہ کی نسبت کہا اور میں مجبور تھا
کچھ نہ کرسکا

میں ایک خط ڈاک کے ذریعہ بھیج رہا ہوں
کسی سنیچر یا اتوار کو دہلی آ جائیے تاکہ اطمینان
سے گفتگو ہو

والسلام
جوگندر سنگھ

گاڑی میں دہلی پہنچے وہاں سب کا قیام میر احمد حسن صاحب شملوی کے ہاں ہوتا یا دفتر احرار میں۔ صبح جب مولانا کے ہاں پہنچے جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے انہیں کسی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے جانا تھا اور بروقت تیار نہ ہو پائے تھے۔ جب یہ حضرات پہنچے تو اجمل خاں صاحب نے جا کر بتلایا کہ وہی لوگ اب شاہ صاحب کو لیکر آ۔ئے ہیں اباجی نے فرمایا جب مولانا باہر آئے تو منہ پونچھتے ہوئے آرہے تھے معلوم ہوتا تھا ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی آرہے ہیں میں نے تو اتھا دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ غصہ چڑھا ہوا ہے آج خیر نہیں سلام و مصافحہ کے بعد غرضِ آمد دریافت فرمائی جو اباجی نے حاجی صاحب کی روایت سے بیان کر دی مولانا کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے کہا میرے بھائی یہ لوگ پہلے بھی آئے اور دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ ملے بغیر نہیں جائینگے۔ اسکے بعد اس سلسلہ میں کچھ بھی کرنے سے انکار فرما دیا اور موٹر میں بیٹھکر دفتر چلے گئے۔ اباجی کو بہت افسوس تھا کہ حاجی صاحب نے اخفاء کر کے بات بگاڑ دی۔ دوسرے مولانا نے حد سے زیادہ ہی بے نیازی کا مظاہرہ فرمایا اور یہی ملاقات زندگی کی آخری ملاقات ثابت ہوئی پھر اباجی نہ کبھی دہلی گئے نہ ملے۔ حاجی صاحب سے اباجی نے گلہ کیا کہ اگر تم نے مجھے لاہور بتا دیا ہوتا کہ تم لوگ پہلے کوشش کر چکے ہو تو میں کبھی ساتھ نہ آتا۔ بعد میں مولانا کو احساس ہوا۔ تو ۱۰ اور ۱۳ فروری کو یہ مکتوب لکھے۔

ایک خط میں نے امرتسر میں بھی اباجی کے نام دیکھا تھا عید کی امامت کا مسئلہ تھا کلکتہ کے کچھ لوگ ان سے درخواست کرتے تھے انہوں نے انکار فرمایا۔ غالباً دو آدمی امرتسر آئے اور اباجی سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلئے اور سفارش کیجئے اباجی نے پوچھا مولانا کے علم میں ہے کہ آپ لوگ مجھے لینے آئے ہیں؟ انہوں نے انکار کیا اباجی نہ گئے۔ لیکن مولانا کو معلوم ہو گیا کہ کوئی صاحب اباجی کو لینے گئے ہیں۔ مجھے خط کا اتنا فقرہ یاد ہے "یوں آپ کلکتہ آئیں تو مجھ سے زیادہ خوشی کس کو ہو گی؟ لیکن اس مسئلہ کے لئے نہ آئیں"

اور اباجی تو پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔ ۵۰ء میں ملتان میں ایک شب میں نے ریڈیو لگایا تو اچانک دلی لگ دیا حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی کارروائی نشر ہو رہی تھی۔ اعلان ہوا کہ مولانا آزاد تقریر فرمائیں گے انکی آواز کبھی نہ سنی تھی۔ میں بھاگم بھاگ گئی اور بیٹھک کے دروازے پر زور سے دستک دی بھائی جان[1] آئے تو بتایا کہ مولانا آزاد کی تقریر ہونے لگی ہے۔ میرے آتے آتے تقریر شروع ہو گئی۔ اتنا یاد ہے آیہ مبارک ومن الناس من يشري نفسه ابتغاء مرضات الله پڑھی تھی اباجی کی آنکھوں میں آنسو تھے ایک آہ بھری اور کہا چلو آواز ہی سن لی۔ حضرت مولانا کی تقریر میں خطابیہ جملے کچھ اس انداز کے تھے کہ "آپ دیکھو گے" "آپ سنو گے" اباجی فرمانے لگے کہ یہ ہے تلعلی کی زبان اور اب ابوالکلام کے بعد یہ کون بولے گا؟!

"وزارتی مشن کے دنوں میں ایک روز مولانا سے ملاقات کے لئے گئے تو شیخ حسام الدین اور شورش صاحب ساتھ تھے۔ میر احمد حسن صاحب کی موٹر میں گئے مولانا

(۱) مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری

وائسریگل لاج جانے کے لئے کوٹھی کے باہر کھڑے تھے اور پریشان۔ انکی موٹر سٹارٹ نہ ہو رہی تھی۔ اباجی پہنچے تو سلام و مصافحہ کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میں آپکی موٹر لئے جاتا ہوں اباجی نے کہا حضرت دوش حاضر ہیں۔ فرمایا۔ "وہ بوجھ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر بعد واپس تشریف لے آئے اور گھنٹہ بھر ملاقات رہی چائے بھی پلوائی۔ "غبارِ خاطر" چھپ چکی تھی اسکا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ ہدیہ کیا۔ لکھا تھا۔ "برائے صدیقِ عزیز سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری" اسی ملاقات میں اباجی نے فرمایا مولانا اللہ آپکو عمرِ خضر عطاء فرمائے تو فرمانے لگے نہیں میرے بھائی تھوڑی ہو مگر قرینے کی ہو"۔ اس سے پہلے "تذکرہ اور ترجمان القرآن بھی اباجی کو ہدیتہ" ہی دی تھیں۔ ان پر لکھا تھا برائے "محب عزیز" سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب۔ غبار خاطر پر "صدیق عزیز" دیکھ کر میں نے کہا اباجی اب آپکے مرتبہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اباجی مسکرانے لگے۔ (یہ تمام کتابیں تقسیم کے وقت امرتسر میں ہی رہ گئیں)

دلی جیل کا واقعہ "اباجی نے سنایا تھا۔ مولانا آزاد بھی اسی جیل میں تھے مولانا احمد سعید صاحب مرحوم و مغفور بھی۔ ایک روز موقع پا کر اباجی اور مولانا احمد سعید صاحب ملاقات کے لئے مولانا کے کمرے میں پہنچے ہی تھے کہ جیلر یا سپرنٹنڈنٹ راؤنڈ کرتا ہوا ادھر آتا دکھائی دیا مولانا نے فرمایا میرے بھائی آپ بیٹھئے میں انہیں "مصروف" کرتا ہوں باہر تشریف لے جا کر اس سے گفتگو شروع فرما دی پھر اسنے کیا ادھر آنا تھا وہیں سے واپس ہو گیا۔ مولانا احمد سعید سنا ہوا ہے بڑے بے دھڑک بزرگ تھے مولانا آزاد سے کہنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ آپکے پاس آنا تو ایسے ہے جیسے کوئی شریف آدمی دن دہاڑے "اس بازار" میں پکڑا جائے۔ بے چارے مولانا یہ ریمارک پی گئے۔ پھر چائے بنائی اور پوچھا کیسی ہے؟ اباجی نے تعریف کے ساتھ کہا حضرت ایک کمی رہ گئی۔ اباجی کہتے اب مولانا سے کوئی یہ کہے کہ آپ کی چائے میں کمی رہ گئی؟ بڑی بڑی ایرانی آنکھیں اٹھا کر تعجب اور حیرت سے پوچھا وہ کیا میرے بھائی؟ میں نے کہا دو پتی زعفران بھی ہوتی۔ فرمایا آپ اضافات کی بات کرتے ہیں۔ پھر کسی روز آئیے آپ کو مزعفر پلاؤ لگا۔ چنانچہ پھر ایک روز زعفرانی چائے بھی پلائی۔

قرآن مجید سے متعلق شاہ جی فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں قرآن مجید کے سوا کسی دوسری کتاب کے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں جو کچھ ہے قرآن و سنت میں ہے۔ اور جو کچھ اس کے باہر ہے وہ باطل ہے۔ اور ایک باطل کے مطالعہ کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر آج دنیا قرآن چھوڑ کر دوسری کتابوں کی طرف نگاہ کر سکتی ہے تو میں کیوں نہ دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے اپنی تمام تر توجہ قرآن پر مرتکز کروں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں۔ میری باتوں میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی وجہ سے ہے۔ جو چیز مجھے قرآن سے الگ کرے اسے آگ لگا دوں۔

زندہ باد سحر البیان بخاری

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ۱۹۱۶ء سے جہاد آزادی میں مصروف ہیں۔ عمر کا بڑا حصہ قید فرنگ میں گذارا ہے۔ ان کی تقریر مسمریزم کی طرح دماغ پر اثر کرتی ہے۔ وہ بلا مبالغہ تقریر کے ذریعہ جادو کرتے ہیں ان کی تقریر کے بعد دس فیصدی سامعین اپنی ذاتی رائے سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ آٹھ گھنٹہ تک مسلسل بول سکتے ہیں اور یہ کمال ہے کہ مجمع پُر سکون پُر جوش، جس طرح یہ چاہیں بیٹھا رہتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ غرضیکہ وہ اس دور کے بہترین اور ایثار پیشہ مسلمان ہیں۔ چونکہ بد قسمتی سے اس زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے مفلس ہیں۔ اگر ہندو قوم میں ہوتے تو لالوں کے لال ہوتے، سونے میں تولے جاتے اور امیرانہ زندگی بسر کرتے۔ مگر چونکہ آزاد خیال مسلمان ہیں۔ اس لئے منافقوں اور سامراج کے ایجنٹوں کے نزدیک یہ قابل گردن زونی ہیں۔ مگر لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لئے بے پناہ جذبۂ عقیدت ہے۔

سال گذشتہ پنجاب کی مسلم لیگی حکومت نے ان کے خلاف دو مقدمے قائم کئے جن میں سے ایک گجرات (پنجاب کی تقریر کی بنیاد پر جس میں سرکاری رپوٹر (لدھارام) نے اپنی شہادت میں بے حد شرمناک الزام حکومت پنجاب کے وزیراعظم پر (جو مسلم لیگ ہائی کمانڈ کے رکن ہیں (۱)) لگائے اور ہائیکورٹ سے شاہ صاحب بری ہوئے۔ اس مقدمہ میں پھانسی اور کالے پانی کی سزا ہو سکتی تھی۔ ایسا ہی دوسرا مقدمہ راولپنڈی کی تقریر پر چلا۔ جس سے لاہور کے سیشن جج نے بری کر دیا۔ الحمدللہ علی احسانہ۔

میں صمیم قلب سے اپنے دوست حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کو اس حیات نو پر مبارک دیتا ہوں۔ ان کی رہائی کے لئے رات کے سناٹے میں کتنی دعائیں مانگیں۔ تب جا کر کہیں یہ رہا ہوئے۔ اگرچہ دعا کے ساتھ مقدمہ کی پیروی بھی زبردست ہوئی اور ہزارہا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے شہادتیں دیں اور جنہوں نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی شہادت سے پھانسی کے تختہ پر پہنچا دیا۔ کیا ان سے کوئی باز پرس نہ ہوگی؟

میری رائے میں اس معاملہ کو یہیں تک نہ ختم کرنا چاہیئے بلکہ پنجاب اسمبلی، مرکزی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبران کے پاس اس مقدمہ کی سمری بھیجنی چاہیئے۔ اور ان تمام مقامات پر سوالات کرا کے گورنمنٹ ہند کو مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ آزادانہ تحقیقات کرے اور شاہ صاحب کو ہرجہ اور خرچہ کا مقدمہ فوراً حکام متعلقہ کے خلاف شروع کر دینا چاہیئے۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے اس قسم کے مقامات کا خاتمہ ہو جائے۔

(ادارتی شذرہ، ماہنامہ "پیشوا" دہلی جمادی الاول ۱۳۵۹ھ، جون ۱۹۴۰ء شمارہ ۴۔ جلد ۱۷)

۱۔ سر سکندر حیات، وزیراعظم پنجاب

بخاری تقریر کر رہا ہے

فضا کو تسخیر کر رہا ہے
نیا تصور ابھر رہا ہے
جہانِ چنگیز مر رہا ہے
ـــــ بخاری تقریر کر رہا ہے

عروسِ افکار کا چمن ہے
خیالِ تازہ کا بانکپن ہے
نوائے اسلام ہم سخن ہے
ـــــ بخاری تقریر کر رہا ہے

جلالِ پیغمبری نہ پوچھو
کمالِ جادوگری نہ پوچھو
خطیب کی ساحری نہ پوچھو
ـــــ بخاری تقریر کر رہا ہے

خیال کروٹ بدل رہے ہیں
غزل کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
جدید الفاظ چل رہے ہیں
ـــــ بخاری تقریر کر رہا ہے

گلاب و لالہ کا سلسلہ ہے
بلند آواز حوصلہ ہے
قرونِ اولیٰ کا دلولہ ہے
ـــــ بخاری تقریر کر رہا ہے

مجھے بھی تیغے اچھالنے دو
مجھے بھی الفاظ ڈھالنے دو
مجھے بھی راتیں اجالنے دو
ـــــ بخاری تقریر کر رہا ہے

وطن کی لوٹے نہ آس لوگو!
رکو نہ اب اے اداس لوگو!
کہاں ہو معنیٰ شناس لوگو!
ـــــ بخاری تقریر کر رہا ہے

شورش کاشمیری

تحریر: مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی جامعی — روایت: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریک نمکین ستیہ گرہ

کانگریس (سول نافرمانی) تحریک کے سلسلہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے طوفانی دورہ لاہور سے شروع کیا۔ وہ لاہور، امرتسر میں تقریریں کرتے ہوئے جالندھر پہنچے۔ تو میں نے اپنے لڑکے مولوی جلیل الرحمٰن اور اپنے خاص رازدار والنٹیر عبدالرحمٰن غازی عرف ماما کے ذریعے شاہ جی کو کہلا بھیجا کہ وہ لدھیانہ جیل میں مجھ سے مل کر امروہہ کے اجلاس جمعیت العلماء ہند میں شرکت کریں۔ جس میں کانگریس تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ چنانچہ شاہ جی تشریف لائے۔ اس موقعہ پر پنڈت من موہن سپرنٹنڈنٹ لدھیانہ جیل نے ملاقات کا موقعہ دیا۔ شاہ جی پر ہر طرف سی آئی ڈی تھی۔ ہر قدم پر شاہ جی کو گرفتار کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ پنڈت موہن نے سکیم کے مطابق شاہ جی کو اپنے مکان پر ٹھہرایا اور جالندھر سے آنے والی موٹر کار کو گیرج میں بند کر کے چھپا دیا۔ رات کو جیل میں خاموشی سے ملاقات ہوئی اور دو گھنٹے تک جمعیت العلماء کے اجلاس میں کانگریس کی شرکت کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

میں نے شاہ جی سے کہا کہ جمعیت کے اجلاس میں ایسے لوگ بھی آئیں گے جو مسلمانوں کے دستوری تحفظ کا دروازہ کھول کر جمعیت العلماء ہند کو کانگریس کی تحریک میں شرکت کرنے سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن آپ یہ کوشش کیجئے گا کہ دستوری تحفظ کی بحث کا دروازہ نہ کھل سکے۔ اور جمعیت العلماء ہند غیر مشروط طور پر ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہو جائے۔

شاہ جی اس گفتگو کے بعد پنڈت من موہن کی کار میں بیٹھ کر انبالہ چلے گئے۔ انبالہ سے سیدھے سہارنپور ہوتے ہوئے ۲ مئی ۱۹۳۰ء کو جمعیت العلماء کے اجلاس امروہہ میں پہنچ گئے۔ جمعیۃ العلماء نوجوان پارٹی کے لیڈر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تجویز کہ جمعیت العلماء ہند کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں شریک ہو جائے۔ پر شاہ جی نے مجلس مضامین میں سرگرم حصہ لیا اور کانگریس میں شرکت کے مخالفین کو آخر کار شاہ جی کے دلائل کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور متفقہ طور پر مولانا حفظ الرحمٰن کی تجویز مولانا حسین احمد مدنی کی تائید سے منظور ہو گئی۔ رات کو جمعیت کے کھلے اجلاس میں مولانا شاہ معین الدین اجمیری کی صدارت میں شاہ جی نے سات گھنٹے تک تقریر کی۔ اس اجلاس میں ایک ہزار علماء شامل تھے۔ ۵۰ ہزار سے زیادہ عوام کا مجمع تھا۔ اجلاس امروہہ کی کامیابی کا سہرا مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سر بندھا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری امروہہ کے بعد یوپی بہار کا دورہ کرتے ہوئے بنگال جا پہنچے۔ اور دیناج پور میں جا کر گرفتار ہو گئے۔ اس دورہ میں ایک لاکھ آدمی شاہ جی کی تقریروں سے متاثر ہو کر گرفتار ہونے والوں میں ۳۰ ہزار مسلمان تھے۔ آگرہ آباد میں جب شاہ جی پہنچے تو پنڈت موتی لعل کے ہاں ٹھہرے۔ پنڈت جی نے خود شاہ جی کے کھانے کا انتظام کیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں وقت چائے بنا کر پلائی۔ پنڈت جی بار بار شاہ جی سے کہتے کہ "کانگریس ستیہ گرہ کی

کامیابی صرف آپ ہی سے وابستہ ہے"۔ پنڈت موتی لعل نہرو شاہ جی کی سحر بیانی کے عاشق تھے۔
کانگریس تحریک میں پنجاب کے احرار رہنماؤں کی شرکت اور شاہ جی کے دورہ کا یہ اثر ہوا کہ گاندھی اروِن پیکٹ کے بعد جب بھی احرار رہنما گاندھی جی سے ملنے گئے تو گاندھی جی اٹھ کر خود دروازے تک چھوڑنے آتے۔ یہ امتیازی بات تھی۔ جو زندگی میں گاندھی جی نے صرف احرار رہنماؤں کی عزت و تکریم میں کی"

اس واقعہ سے حضرت شاہ جی کا جذبۂ آزادی اور انگریز کے خلاف نفرت و حقارت کا ولولہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح وہ ملک کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک تحریک نمک کے حق میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے دیناج پور میں گرفتار ہوگئے۔ لاہور سے چل کر یہ مرد مجاہد امرتسر، جالندھر، لدھیانہ، سہارنپور، امروہہ اور پھر ساری یوپی، سی پی، بہار اور بنگال کو روندتا ہوا دیناج پور جا پہنچا۔ اور کس طرح انہوں نے اپنے فن خطابت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک لاکھ انسانوں کے جذبات کو انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ کر لیا۔ ان میں ۷۰ ہزار کے قریب ہندو اور دیگر غیر مسلم بھی شامل تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ آپ کی صلاحیتوں کا شکار عقیدت مندوں میں ہندو اور دوسرے غیر مسلم بھی برابر کے شامل تھے۔ یہی کام کرنے کا صلہ اور انگریز کی مخالفت کا جنون تھا کہ پنڈت موتی لعل نہرو گاندھی جی اور خود تمام کانگریس جماعت حضرت شاہ جی کے محتاج تھے۔ اور ان کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ اور شاہ جی کی خدمت کرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ جیسا کہ پنڈت موتی لعل نے کہا کہ
"شاہ صاحب کانگریس میں ستیہ گرہ کی کامیابی صرف آپ ہی سے وابستہ ہے"
یہ تھا حضرت شاہ جی کے کام کرنے کا طریقہ جس کے آگے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے طول و عرض سکڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ تھا جذبۂ حریت کہ جس کی دھاک بڑے بڑے ہندو لیڈروں پر پوری سطوت و شوکت کے ساتھ مسلط تھی۔ اللہ! اللہ حضرت شاہ جی کا تحریک آزادی میں جو حصہ ہے اس پر زمانہ فخر و ناز کرے گا۔ اور تاریخ اپنی جبین ناز حضرت شاہ جی کے اسی جذبہ کے آگے خم کرتی ہوئی فخر محسوس کرے گی۔
(منقول از "رئیس الاحرار اور جنگ آزادی")

لے کے ڈنڈا ہاتھ میں نکلے عطاء اللہ شاہ
جب نہ دیکھا کام چلتا وعظ سے اور پند سے
(ظفر علی خان)

ماسٹر تاج الدین انصاری

وہ دن کہاں گئے وہ زمانے کدھر گئے

پروردگار عالم نے ابن آدم کو عجیب عجیب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ مشت خاک مجموعہ کمالات ہے۔ غور فرمائیے کہ انسان حافظے کی کمندیں ڈال کر اپنے ماضی کو کس آسانی سے کھینچ لاتا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے کے گزرے ہوئے واقعات آن واحد میں اس طرح سامنے آجاتے ہیں گویا ابھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے آج سے تقریباً چالیس سال قبل جب میں روزنامہ زمیندار کا مطالعہ کرتا تو ترکوں پر برطانیہ کے مظالم پڑھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا۔ پھر رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا تھا کہ اسی برطانیہ نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ اور اسی کے ہاتھوں آج ترکوں کی تباہی اور بے آبروئی ہو رہی ہے۔ پھر سوچتا کہ ہم بالکل بے بس ہیں اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ایک دن مایوسی ناامیدی اور بے کسی کے خیالات میں گھرا ہوا گھر سے تھوڑی دور باہر چوک پر پہنچا تو میرے بچپن کے دوست میر محمد فیضی نے بتایا کہ وہ امرتسر سے آرہے ہیں وہاں گزشتہ رات ایک جلسہ عام تھا۔ اس میں ایک نوجوان مولوی نے ایسی پیاری تقریر کی سبحان اللہ! ایمان تازہ ہو گیا۔ پوچھا کیا نام تھا مولوی کا؟ میر محمد فیضی نے جواب دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ پھر کہنے لگا مولوی کیا ہے فرشتہ ہے سید زادہ بڑا ہی خوبصورت نوجوان ہے۔ اللہ نے لحن داؤدی عطا فرمایا ہے۔ قرآن پڑھتا ہے تو سامعین پر وجد طاری ہوتا ہے۔ بولتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں تقریر ایسی دل پذیر کہ دلوں میں اتر جاتی ہے۔ مجھے تو اب تک نشہ ہے۔ امرتسر سے مسرور ہو کر آیا ہوں۔ "اس ظالم نے بخاری کی باتیں سنا سنا کر مجھے ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کیا کہ جہاں طبعتیں نیا راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے دوست سے حضرت شاہ جی کی تعریف سن کر سوچنے لگا کہ ایسی تقریر تو ضرور سننا چاہیئے میں امرتسر پہنچوں یا انہیں لدھیانے بلاؤں چنانچہ میر محمد فیضی سے مشورہ کئے بعد طے ہوا کہ شاہ جی کو لدھیانے بلا کر جلسہ عام کیا جائے۔ جلسہ کیسے ہو گا۔ انتظام کون کرے گا۔ جلسہ کس جگہ کیا جائے؟ جوانی کے جوش نے کچھ سوچنے سمجھنے نہ دیا۔ دوسرے دن میر فیضی کو امرتسر روانہ کر دیا۔ اور تاکید کر دی کہ شاہ جی لدھیانے تشریف لانے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو مجھے تار کے ذریعے اطلاع کر دی جائے۔

میر فیضی بڑے ذہین اور جوشیلے نوجوان تھے وہ امرتسر پہنچے اور شاہ جی سے دوسرے دن لدھیانے آنے کا وعدہ لے کر واپس آگئے۔ پہلے جلسے کا اعلان بھی ہم نے خود ہی کیا۔ گیس کے ہنڈے، فرش اور ٹھنڈے پانی کا بندوبست غرضیکہ جلسے کے لوازمات اور انتظامات سے فارغ ہو کر ہم نے دوستوں کو ہمراہ لیا اور شاہ صاحب کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی لدھیانہ اسٹیشن پر آکر رکی۔ تو میں شاہ جی کو پہچانتا نہ تھا۔ فیضی نے انہیں دیکھا ہم سب لپک کر ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ سڈول جسم کا خوبصورت نوجوان جس کی پیشانی شرافت، نجابت اور شجاعت کا پتہ دے رہی تھی۔ نہایت سادہ لباس

میں گاڑی سے مسکراتا ہوا پلیٹ فارم پر اترا۔ میں نے معزز مہمان کو غور سے دیکھا بھرپور جوانی کی خوبصورت آنکھوں میں مستی کے بجائے حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تھے بخاری جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ بخاری خراماں خراماں دوستوں عقیدت مندوں اور اجنبیوں کے جھرمٹ میں ریلوے اسٹیشن سے باہر تشریف لائے۔ ہم انہیں گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر میر فیضی کے مکان پر لے گئے۔ انہیں کمرے میں بٹھا کر میں نے اپنے دوست سے کہا فیضی میرے دل میں سید زادے کو دیکھ کر اتنا اثر ہوا ہے۔ تقریر سنوں گا تو کیا ہو گا؟ فیضی نے ہنس کر کہا جلسے کے بعد دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ ہم نے شاہ جی کو کھانا کھلایا اور عشاء کی نماز کے لئے سامنے والی مسجد میں چلے آئے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے۔

خلوص میں برکت ہے۔ ہمارے ساتھ کون تھا۔ ہم نوجوانوں کی حیثیت ہی کیا تھی مگر لدھیانے میں پہلا جلسہ اس ٹھاٹھ کا ہوا کہ دریا کے کنارے کا بہت وسیع میدان ہندو اور مسلمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ لوگوں کے دلوں میں نیا نیا شوق اور جوش تھا۔ وہ بخاری کی تقریر سننے کے لئے جوق در جوق چلے آرہے تھے جلسہ شروع ہوا۔ بخاری نے خطبہ مسنونہ پڑھا۔ قرآن پاک کی تلاوت شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے آیات ابھی ابھی نازل ہو رہی ہیں۔ مجمع پر سکوت طاری تھا قرآن پاک کی تلاوت دل کی آلودگیوں کو صاف کر کے نور ایمان سے جگمگا رہی تھی۔ سامعین پر وجد طاری تھا۔ جلسہ گاہ میں مکمل سکوت تھا۔ جب بخاری نے بولنا شروع کیا تو گویا لالہ زار کھل گیا۔ اور جب اپنے خاص انداز اور ترنم سے برمحل شعر پڑھتے تو سامعین پھڑک اٹھتے۔ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کی صدائیں بلند ہوتیں۔ تکبیر کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی۔ رات کے ایک بجے تک جلسہ رہا۔ بخاری نے پہلی تقریر ہی سے اپنی دھاک بٹھا دی۔ تحریک کے لئے میدان ہموار ہو گیا۔ تقریر بخاری نے کی مگر اپنے شہر میں ہمیں عقیدت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ یعنی لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگا۔ ہزارہا لوگوں کی زبانوں پر بخاری کا قصیدہ تھا۔ میرے ساتھیوں اور ہاتھ بٹانے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ بہادر اور مخلص نوجوان میرے گرد جمع ہو گئے۔ شہر والوں نے پھر تقاضا کیا کہ بلاؤ بخاری کو ہم نے دوبارہ درخواست کی جسے بخاری نے قبول فرما لیا۔ بخاری کی بار بار تشریف آوری سے ہمارے ہاں کے اکثر نوجوان صبغ رنگ میں رنگے جا چکے تو ایک روز جلسے کے اختتام پر وہ مجھے الگ لے گئے اور فرمانے لگے کہ لدھیانہ تو علماء کا زبردست تاریخی مرکز ہے۔ یہ دوسرا دیوبند ہے۔ تم مولوی حبیب الرحمان کو جانتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ ہم تو ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ بخاری نے فرمایا کہ پھر مجھے کیوں بلاتے ہو۔ وہ تو بڑی خوبیوں کے مولوی ہیں خاندانی وجاہت کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے مقرر ہیں۔ ان کا خاندان تو انگریز دشمنی میں نمبر ایک پر شمار ہوتا ہے۔ تم ان سے ملو۔ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ تم ہر ہفتے مجھے بلا لیتے ہو۔ مجھے امرتسر اور لاہور ہی میں کام کرنے دو۔ مگر مجھے چونکہ بخاری سے بے پناہ عقیدت اور غایت درجہ کی محبت تھی۔ میری درخواست پر وہ لدھیانے آہی جاتے تھے حقیقت یہ ہے کہ مجھے سیاسی میدان میں کھینچ کر لانے اور غلامی سے نفرت اور بیزاری پیدا کرنے میں انہیں کا ہاتھ ہے۔ ورنہ میں تو قطعی دنیا دار اور کھلنڈرا نوجوان تھا۔ شکار سے فرصت ملی تو کرکٹ کھیل کر دن ضائع کر دیا۔ بخاری کی محبت

بھری طاقتوں نے میری زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ آزادیٔ وطن کے لئے قربانی کا جذبہ بخاری نے میرے دل میں اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دیا کہ مجھے حال کے دریچے سے ماضی کو جھانکنے ہی کی فرصت نہ ملی۔ جیل جس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا تھا کوچہ محبوب بن گیا۔

طواف کوچہٗ محبوب اپنا مشغلہ ٹھہرا
جانا ہو کہیں مگر جانا ادھر ہو کر

۱۹۱۹ء میں جب بخاری نے خداداد قابلیت اور آتش بیانی سے برطانوی سامراج کا انجر پنجر ڈھیلا کرتا شروع کیا تو فرنگی نے کان کھڑے کئے اور بھانپ لیا کہ اس جادو بیاں نوجوان کو آہنی پنجے سے دبوچ نہ لیا تو یہ دل جلا ہر ہندوستانی کے دل میں ایسی آگ سلگائے گا جس پر قابو پانا محال ہو جائے گا چنانچہ کسی ایک تقریر کی بنا پر حضرت شاہ صاحب کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ مجسٹریٹ نے جب انہیں تین سال قید سخت کا حکم سنایا تو انہوں نے فقرہ چست کرتے ہوئے فرمایا

''واہ بھئی واہ تین خداؤں کو ماننے والی حکومت نے سزا بھی تین سال ہی کی دی۔''

بخاری کو امرتسر سے لاہور اور لاہور سے میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا۔ میرے ایسے ہزاروں عقیدتمندوں نے بخاری کی جدائی کو سختی سے محسوس کیا۔ دل بے تاب ہونے لگے۔ سلگنے والی آگ بھڑکنے لگی۔ میں اس وقت ''گونگا مجاہد'' تھا۔ فن تقریر سے قطعی ناآشنا۔ جیل جانے کے لئے بے تاب تھا مگر اندر جانے کا کوئی طریقہ کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کے رہنما سول نافرمانی کی راہیں تلاش کر رہے تھے مگر ان کو بھی مناسب طریقہ اور صحیح راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اس مشکل کو برطانوی کارندوں نے آسان کر دیا چنانچہ حکومت کی جانب سے لاامنڈمنٹ ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ میں دوڑا دوڑا لاہور پہنچا تو صوبائی رہنماؤں کی مجلس مشاورت ہو رہی تھی۔

مجھے بخاری کی یاد نے تڑپا رکھا تھا۔ میں نے رہنماؤں کے سامنے استدعا کی اور آٹھ سو رضا کاروں کے حلف نامے پیش کرتے ہوئے سول نافرمانی کی اجازت حاصل کر لی۔ گھر پہنچا شہر میں اعلان کیا، بہت بڑا جلوس نکلا اور گرفتار ہو گیا۔ میری خوش قسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ میں لاامنڈمنٹ ایکٹ کا پہلا قیدی تھا۔ اور اس فخر کے حاصل کرنے میں بھی بخاری کی مہربانیوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔

میں جب گرفتار ہونے کے لئے زیادہ بے تاب تھا تو میرے دل میں ایک جذبہ کار فرما تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ پکڑا جاؤں گا تو بخاری کے پاس پہنچا دیا جاؤں گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مہینہ بھر میرا دل کروٹیں لیتا رہا بالآخر قدرت نے یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ لدھیانے سے انبالہ اور انبالہ سے میانوالی جیل پہنچ گیا۔ دیکھا زندگی میں میل ملاپ کی کس قدر کشادہ راہیں موجود ہیں مگر اب........ ''ہم کہاں بیٹھ کے اب نالہ و فریاد کریں''

حضرت شاہ جی اپنے خدا کے پاس وہاں پہنچ گئے جہاں بلاوے کے بغیر کوئی جا بھی نہیں سکتا اور جو چلا جائے وہ واپس نہیں آتا۔ اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر''

شیخ حسام الدین

قافلہ سالار

غالباً شاہ جی کی وفات سے ڈیڑھ سال قبل ان کے مرشد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری لاہور تشریف لائے اور شاہ جی کو طلب فرمایا۔ انہیں پہلی اطلاع کے مطابق یہی معلوم تھا کہ شاہ جی سخت بیمار ہیں۔ مگر ان دنوں شاہ جی کو افاقہ تھا۔ وہ حاضر خدمت ہوئے۔ پیر اور مرید کے درمیان کچھ کہنے کہلانے کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب شاہ جی ہمارے لئے فارغ ہوئے تو ہم الگ ایک کوٹھڑی میں بیٹھ گئے۔ حسن اتفاق سے وہاں کوئی اور نہ تھا غالباً دس بارہ سال بعد یہ موقع ملا کہ میں اور شاہ جی صرف دونوں یکجا بیٹھے۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے دروازہ کی طرف دیکھا شاہ جی فرمانے لگے۔ "اب کوئی نہیں آئے گا۔ فرمائیے کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟" میں نے کہا کہ آج میرے ساتھ یہ تکلف کیوں برتا جارہا ہے۔ پہلے تو آپ مجھے اس پر تکلف خطاب کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔ آج کیا بات ہے؟ آخر شاہ جی بولے "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا اب ٹھیک ہے! "تو اس وقت میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ۔ "آپ اور ہم آج کے زمانے میں عبرت بن گئے ہیں" شاہ جی ذی فہم تھے۔ پہنچے میری بات کی گہرائیوں تک۔ سر کو جنبش دی اور فرمانے لگے۔ اے کاش ایسا ہوتا۔ دنیا ہم سے عبرت لیتی اور پھر شاہ جی نے یہ شعر پڑھا۔

بیدلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

یہ شعر سن کر میں نے عرض کیا کہ "یہ شعر غالب نے اس دور میں کہا تھا جب اسلام کی نگہداشت و خدمت شاہ ولی اللہ مرحوم ایسے بڑے بڑے صاحب نظر و بصیرت علماء کر رہے تھے" اس پر شاہ جی نے کہا "ہاں! یہ شعر اسی دور میں کہا گیا تھا" میں نے کہا "اور اگر غالب آج کے زمانے میں ہوتا تو۔۔۔۔۔۔۔ وہ کب کا خودکشی کر چکا ہوتا" اس کے بعد شاہ جی نے یہ شعر پڑھا

نہ جانے کیوں زمانہ ہنس رہا ہے میری حالت پر
جنوں میں جیسے ہونا چاہیئے ویسا گریباں ہے

اور مجھ سے یوں مخاطب ہوئے کہ "ہم گزشتہ طویل عرصہ سے انگریز کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔ اب انگریز جاچکا ہے۔ لیکن وہ ہمارے لئے انتظام کر گیا ہے۔ جیسے بھی حالات ہیں۔ ان پر اب قانع رہو"۔

ہم نے گذشتہ زندگی کے دوران انگریز کی مخالفت کرنے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہمارا مشن تھا۔ ہے اور رہے گا۔ کہ ہم انگریز کے خلاف نفرت پھیلاتے رہیں۔ جو اسلام اور اسلامیوں کو ایک عرصے تک مصائب میں مبتلا کرنے اور انہیں محکوم و مجبور رکھنے کے لئے ہر ظلم و ستم کو روا رکھتا رہا۔ آپ نے کہا کہ ہم نے جو کچھ کیا ہمیں اس پر فخر ہے۔ ہم اسی مشن کے لئے جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔ جب تک زندہ رہے ہم

شاہ جی مرحوم کے اختیار کردہ اس لائحہ عمل پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہیں گے۔

پاکستان کے قیام کے بعد کئی سالوں تک ہمارے برسر اقتدار مختلف سیاسی رہنماؤں نے باہمی چپقلش کا جو تباہ کن ڈرامہ رچائے رکھا اور ہماری قوم اور ملک جن غیر یقینی حالات سے دوچار رہے۔ وہ آپ سب حضرات پر واضح ہے۔ میں اس وقت ان مایوس کن تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔

انگریز نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور اہل اسلام کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ کانٹے بچھائے ہیں۔ اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے انگریز کی غلامی کے دور میں ۱۸۵۷ء سے قربانیاں دینے کا تانتا باندھ دیا گیا۔ اور اس راہ میں بڑے بڑے جید علماء بھی کام آئے۔ جس کی آخری آواز مدرسہ دیو بند کے بانی شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ اسیر مالٹا جیل تھے۔ آپ نے کہا کہ انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دینے کا تمام سلسلہ علمائے ہند کی وجہ سے قائم رہا جنھوں نے جمع ہو کر انگریز سے عدم تعاون کے پیمان پر دستخط کئے ہم کون تھے کالجوں کے پڑھے ہوئے نوجوان، نہ آگا نہ پیچھا۔ ڈگری حاصل کر لی۔ اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے دفاتر کے گرد کتوں کی طرح چکر لگاتے رہے۔ انگریز نے کالج اور سکول ملک میں اس لئے جاری نہیں کئے تھے کہ ہم لوگ زیور تعلیم سے آراستہ ہوں۔ بلکہ انگریز کا مقصد یہ تھا کہ اس کی حکومت چلانے والی مشینری کے پرزے تیار ہوں۔ آپ نے اس موقع پر اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر پڑھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

دفاع پاکستان کے ضمن میں امیر شریعت مرحوم نے پاکستان میں بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کیں اور لاکھوں جانباز رضاکاروں سے قربانیاں پیش کرنے کے حلف لئے۔ ان کانفرنسوں کی صدارتیں سرکاری اعلیٰ حکام نے بھی کیں۔ استحکام ملک کے لئے شاہ جی مرحوم نے انفرادی اور اجتماعی طور پر جس بھرپور انداز سے خدمات انجام دی ہیں۔ اس طریقے پر کسی دوسرے نے عملی ثبوت نہیں دیا۔ اسی سلسلہ میں ان دنوں لکھی گئی سرکاری خفیہ رپورٹوں کو ایک نظر دیکھ لینے سے میری بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے بعد جو ہیجان پیدا ہوا اور بین الاقوامی طور پر انگریز نے مسلمانوں کی تباہی کے لئے جو کردار ادا کیا۔ اس کے شاہد ترکوں کے حالات ہیں۔ آج کیا ہو رہا ہے۔ کل کے ترک حاکم آج پھانسیاں پا رہے ہیں۔ آپ نے کہا ان دنوں انگریز کو کمزور کرنے کے لئے متحدہ ہندوستان میں ہندو رہنماؤں اور علمائے اسلام نے مشترکہ معاہدے پر دستخط کئے۔ مسلم علماء اور عوام انگریز کی بین الاقوامی اسلام دشمن پالیسی کا مقابلہ کرنے کے لئے دیوانہ وار سامنے آئے۔ ان دنوں امیر شریعت مرحوم طالب علم تھے۔ صورت حالات کو سمجھتے ہوئے شاہ جی بپھرے ہوئے شیر کی طرح میدان جہاد میں اتر آئے۔ اور اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک "شیر" نے کبھی پلٹ کر ہی نہیں دیکھا۔ شاہ جی ۱۹۱۴ء میں ایک واعظ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جس کوچے کی مسجد کے وہ امام ہوئے لطف کی بات یہ ہے امرتسر میں اس کوچے

کا نام بھی "کوچہ جیل خانہ" تھا۔ شاہ جی نے اس زمانے سے قوم و ملک کی خدمت شروع کی اور پوری زندگی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ مگر ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ شاہ جی نے اپنے اعلیٰ کردار کی بدولت ایک ایسی شاندار تاریخ بنائی ہے جو شاید کسی دوسرے قومی رہنما کو نصیب نہ ہو گی۔

شاہ جی مرحوم اپنی قوم میں جس زندگی کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی سامراج اس کی راہ میں بہت بڑی دیوار بن کر حائل رہا۔ جس کا مقابلہ کرنے میں شاہ جی نے کبھی کمزوری نہیں دکھائی۔

شاہ جی مرحوم نے مذہب و ملت کی خدمت کے لئے جو خاندان بنایا تھا۔ اس میں یہ گنجائش تھی کہ جب کوئی چاہے نکل جائے اور جب کوئی چاہے شامل ہو جائے۔ انہوں نے کبھی جاتے ہوئے کو روکا نہیں اور آنے والے کو منع نہیں کیا۔ شاہ جی ہم سے ہمیشہ کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ ہمارے ہاں شخصیتوں کی پوجا نہیں ہوتی۔ بلکہ دلوں میں ایک دوسرے کے لئے اخلاص اور محبت تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس چالیس پچاس سالہ تاریخی دور کی یادگار تھے۔ جس میں انگریز کی حکومت کے خلاف ٹکر لی جاتی رہی۔ شاہ جی وطن و ملت کی خدمت کی راہ میں بڑے جری اور پاکباز قافلہ سالار تھے جنہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ خدمت کی اور قربانیاں دیں۔

کسی صاحب نے شاہ جی سے سوال کیا۔ شاہ صاحب ملکی سیاست میں آپ کا نظریہ کیا ہے جس کے لئے آپ ہندوستان کی آزادی کے لئے اتنے کوشاں ہیں؟ امیر شریعت نے فرمایا۔ میرے اس نظریہ سے متعلق تم خود ہی فیصلہ کر لو۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہنوں سے انگریزوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے۔ میں تو وہاں بھی گیا ہوں۔ جہاں کہ دھرتی پانی پینے سے عاجز تھی۔ اب سوال یہ رہا۔ کہ میں آزادی کے کس تصور کے لئے لڑ رہا ہوں۔ تو اس کے متعلق سمجھ لیجئے۔ کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ تم میرے بابو مجھ سے شاید کوئی کتابی ایڈیالوجی پوچھ رہے ہو۔ یہ کتابی نظریئے عام طور پر روگ ہوتے ہیں۔ فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت کا نہیں۔ منفی تصور کا ہے۔ ہم سب سے پہلے تو غیر ملکی طاقت سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس ملک سے انگریز نکل جائیں۔ نکلیں کیا؟ نکالے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کے خطوط پر غور کیا جائے گا۔ بابو تم نکاح سے پہلے چھوارے بانٹنا چاہتے ہو۔ پھر میں دستوری نہیں سپاہی ہوں۔ تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہوں گا۔

اور اگر ایسے وقت سؤر بھی میری مدد کریں گے۔ تو میں ان کا بھی منہ چوم لینے کے لئے تیار ہوں۔ میں تو ان چیونٹیوں کو کھانڈ کھلانے کے لئے تیار ہوں۔ جو صاحب بہادر کو کاٹ کھائیں۔

خدا کی قسم میرا صرف ایک دشمن ہے وہ ہے فرنگی جس ظالم نے مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بلکہ خیرہ چشمی کی بھی حد ہو گئی کہ تحریف کے لئے مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی۔ اب اس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے۔

برق و رعد آسودۂ بستر شدہ
شعلۂ جوّالہ خاکستر شدہ

(علامہ محمد حسین عرشی امرتسری...... بنام.... حکیم محمد موسیٰ امرتسری)

سید بخاری علیہ الرحمتہ میں بہت سی خوبیاں تھیں جو اخباروں کے ذریعہ تشہیر ہو چکی ہیں۔ ایک خاص خوبی یہ بھی تھی کہ مذہباً فراخ دل اور روا دار تھے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ مولوی طبقے میں صحیح ذوقِ شعر کا کوئی آدمی میں نے ایسا نہیں دیکھا۔ ان دونوں خوبیوں کے متعلق اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں۔

جب کبھی قید فرنگ سے رہا ہو کر آتے تھے تو مجھ سے ملنے کے لیے دکان پر ضرور تشریف لاتے۔ ایک مرتبہ غریب خانے پر بھی آئے اور دیر تک اپنی صحبت سے لطف اندوز کرتے رہے۔

ان کے عقیدت مند مجھ سے ملنے کے لیے روکتے تھے تو جواب دیتے تھے کہ میرے عرشی کے ساتھ خاص تعلقات ہیں جنھیں تم نہیں جانتے۔

وہ تعلقات ادبی تھے جن میں مذہبی فروعی اختلافات کو حائل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ بعض دفعہ ان سے گھنٹوں اور پہروں ادبی صحبتیں رہتیں۔ جس انداز سے وہ اچھے شعر کی داد دیتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شعر زمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر شب دیگ اور ہریسے کی دعوتیں بھی کھائیں۔ الوانِ نعمت سے زیادہ لطف ان کی صحبت کا ہوتا تھا۔ خواجہ عبدالکریم نانک رحمتہ اللہ علیہ یاد آتے ہیں۔ ایسی مجلس باقاعدہ ہر سال ان کے دولت کدہ پر ہوتی تھی۔ اور کبھی صوفی تبسم کے ہاں۔ ایک مرتبہ میں نے انھیں اپنے چند تازہ شعر سنائے۔ بہت متاثر ہوئے۔ اور اسی وقت اپنی بیاض میں نقل کر لیے۔ ان کی بیاض بہترین منتخب اشعار پر مشتمل تھی۔ کاش وہ حوادث سے بچ گئی ہوتی اور اشاعت پزیر ہو سکتی۔

مجھے اس وقت اپنے ان شعروں میں سے صرف ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ باقی دوسری چیزوں کے ساتھ نذرِ حوادث ہو گئے

بگزر از اسمِ در مسمّٰی رو!
حرف و لفظ و کتاب را بگزار(۱)

ان کی آخری حالت سے متاثر ہو کر میں نے جو شعر کہا تھا وہ حاضرِ خدمت ہے۔

برق و رعد آسودۂ بستر شدہ
شعلۂ جوالہ خاکستر شدہ

میں عیادت کو گیا تو مولانا بہاء الحق قاسمی پہلے سے وہاں موجود تھے، انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ آپ ان کو پہچانتے ہیں؟ نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر کہا گیا کہ یہ عرشی ہیں۔ اس پر بھی انہوں نے لاعلمی ظاہر

کی- زبان کام نہیں کر رہی تھی- آہ؛ وہ لاؤڈ اسپیکر سے بے نیاز پہروں گونجنے والی زبان- تقسیم ملک کے بعد مجھے ان سے ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا- اس طویل فصل کے ساتھ مرض کی شدت نے حافظے کو بھی متاثر کر رکھا تھا- اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو- (انا للہ وانا الیہ راجعون)!

---

(۱)

بی خم و جام نشۂ بی ہم ہست
خم وجام و شراب را بگزار
بی نی و چنگ نغمہ بی ہم ہست
نے وچنگ و رباب را بگزار
بگذار از اسم در مسمیٰ رو
حرف و لفظ و کتاب رابگذار!

(از نقش ہائے رنگ رنگ ص ۱۴۱)

❁

ہے شریعت کا امیر، اور ہے طریقت کا سفیر

راستہ جس نے دکھایا ہے ہمیں اللہ کا
ہم سمجھتے ہیں اسے نائب رسول اللہ کا
ہے شریعت کا امیر اور ہے طریقت کا سفیر
جس طرف جانا ہو، دانا ہے یہ ہر اک راہ کا
جس نے سلائی ہے چُندیا قادیانی دجل کی
فرق سمجھایا ہے جس نے کوہ کا اور کاہ کا
نو کروڑ اسلامیانِ ہند کے قائد ہیں یہ
دم بھریں کیونکر نہ ہم سید عطاء اللہ کا

(علامہ طالوت رحمتہ اللہ علیہ)

سید عطاء المحسن بخاری

"وہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں جو اُن کی صحبت میں کٹ گئی ہیں"

(حضرت امیر شریعت کے ممدوح و مداح..... علامہ عرشی امر تسری سے ایک یادگار ملاقات کا تذکرہ)

علامہ محمد حسین عرشی امر تسری (۱۹۸۵ء..... ۱۸۹۳ء) حضرت امیر شریعت کے ہم عصر بھی تھے، ہم عمر بھی، ہم نشیں بھی اور ہمدم دیرینہ بھی! ایام شباب کی یکجائی اور محفل آرائی، عمر بھر کے تعلق خاطر پر منتج ہوئی۔

عرشی..... ہفت زبان تھے۔ محقق و نقاد تھے۔ ادیب و فلسفی تھے اور کسی حد تک..... مفسر قرآن اور عالم دین بھی۔ وہ "اہل قرآن" تھے، لیکن نیچری، منکر حدیث یا متجدد نہیں تھے۔ علامہ اقبال سے ان کی نیازمندی ایسی تھی جسے دوستی بھی کہا جا سکتا ہے۔ مولانا حسین علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (تلمیذ شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ) سے باقاعدہ بیعت کا تعلق تھا۔

عرشی کی تالیفات و تصانیف کی تعداد سولہ تک پہنچتی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی تعداد نہیں۔ بعض جریدوں اور مجلوں کے لئے ان کی ادارتی خدمات اور معرکہ آرا اشاعتوں کی تدوین اس کے علاوہ ہے۔ ان کی فارسی، اردو اور پنجابی شاعری بلاشبہ اپنے رنگ میں بہت منفرد اور اپنے اسلوب میں بہت مجلا ہے۔ حکیمانہ بھی، عارفانہ بھی اور عاشقانہ بھی! زندہ رہنے اور یاد رہنے والی شاعری۔

۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء، کو لاہور کے سفر میں، محترم حکیم محمد موسیٰ امر تسری کے مطب میں ملاقات کے لئے جانا ہوا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ہمیشہ کی طرح مختلف موضوعات پر گفتگو کا آغاز ہو گیا میں مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی ایک میٹنگ اور اس کے احوال واقعی کا تذکرہ کر رہا تھا کہ ایک صاحب..... مسنی مگر صحت مند وجود، سادہ سا لباس، چہرہ پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی، کپڑے کی ایک پوٹلی سی ہاتھ میں تھامے ایک گوشہ میں آکر فروکش ہوئے۔

میری گفتگو میں مخل ہوئے بغیر ہی حکیم محمد موسیٰ صاحب کو ایک کارڈ، پڑھنے کے لئے دے کر بے نیاز ہو کر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب کارڈ نامکمل چھوڑ کے میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ شاید آپ کا ان بزرگوار سے تعارف نہیں۔ ابھی یہ الفاظ انہوں نے ادا ہی کئے تھے کہ میں نے کہا عرشی صاحب؟ میں اٹھ کے بڑے تپاک سے بغل گیر ہو گیا۔ اپنا نام عرض کیا تو بڑی شفقت و محبت سے مجھے سینہ سے چمٹا لیا۔ عرشی صاحب سے کوئی تیرہ برس قبل دوران سفر ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی سرسری سی۔ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے۔

جب میں نے شاہ صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھا تو بالکل بے ریش تھے اور بغل میں چند کتابیں لئے پڑھنے کے لئے جا رہے تھے۔

اتنا فرمایا......اور پھر سوچ کی گہرائیوں میں کھو گئے۔ بہت دیر تک یہ افسردہ سا سکوت طاری رہا۔ پھر عرشی نے امر تسر کی یادگار محفلوں کا ذکر چھیڑ دیا کہ..... میں اور شاہ صاحب اکثر محفل شعر و ادب میں اکٹھے ہوتے حفیظ جالندھری کا وہ دور اوّل تھا اور وہ اپنا کلام لہک لہک کے سنایا کرتے تھے۔ سراج نظامی، جو ڈاکٹر تاثیر کے بہت قریب تھے، خوش رُو اور خوش گو تھے میری ایک غزل گایا کرتے تھے اس کا ایک شعر یاد ہے۔

کعبہ و دیر بے نصیب ماندہ و سنگ در گہے

دولت سجدہ یافتہ از سرِ پر غرورِ من

پھر حافظہ کی کمزوری کا اظہار فرمانے لگے۔ اس پر ایک بڑا عجیب و غریب واقعہ سنایا کہ میرا ایک ہی بیٹا تھا جو بچپنے میں انتقال کر گیا۔ محمد سعید نام تھا اس کا۔ اس کی بیماری کے دنوں میں بہت پریشان و مضطرب تھا تو ایک شعر کہا مگر وہ حافظہ سے محو ہو گیا۔ ماسٹر شیخ عبداللہ امرتسری ملے تو انہوں نے وہی شعر سنایا۔ میں نے داد دی اور پوچھا...... یہ شعر کس کا ہے تو انہوں نے کہا آپ کا ہے! وہ شعر یہ ہے۔

یا رب سعید من کہ نحیف است جان او

مپسند امتحانِ من، از امتحانِ او

گفت گو کا رخ بدلنے کے لئے میں نے ایک سوال کیا کہ عرشی صاحب! آپ بھی "اہل قرآن" ہیں اور غلام احمد پرویز بھی "اہل قرآن" کہلاتا ہے۔ اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اب ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ کیا بلیغ تبصرہ فرمایا۔ کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے اگر شاہ رفیع الدین رحمتہ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن کا عربی ترجمہ کیا جائے تو عبارت قرآن کے قریب قریب ہو جائیگی اور جو "مفہوم القرآن" پرویز لکھ رہا ہے۔ اسکی عربی کیجائے تو کوئی اور ہی کتاب تیار ہو جائیگی۔"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور پرویزیت فضا میں تحلیل ہو گئی۔ میں نے جب طبیعت کچھ بحال دیکھی تو پھر امرتسر کی مجالس شعر و ادب کا ذکر چھیڑ دیا اور پوچھا کہ عرشی صاحب! آپ کی مجالس میں شوق اندرابی نام کے کوئی صاحب تھے؟ تو انہوں نے یاد نہ ہونے کا اظہار کیا میں نے سید محمد مقیم شاہ صاحب (والد صاحب کے رشتہ میں چچا) کے حوالہ سے ایک فارسی غزل کا ذکر کیا جو شعری کاشمیری امرتسری کی تھی اور مقیم شاہ صاحب کے بقول وہ غزل شوق اندرابی کہ خود بھی شاعر تھے گا کے سنایا کرتے تھے۔ سوچ کر فرمایا کہ ہاں، اس غزل کا ایک شعر یاد آ گیا ہے۔

حالِ دلم بہ دانی ازمن، بہ دانی ازمن،

ناگفتہ دانا، ناگفتہ دانا، نہ نوشتہ خوانا، نہ نوشتہ خوانا

مگر غالب اس سے بہت بہتر انداز کہہ گیا ہے۔

حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو

نالہ بسینہ بشکری اشک بدیدہ بشمری

اب طبیعت جو حاضر ہوئی تو پھر مسلسل یادوں کے نقوش ابھرتے گئے اور یہ عرشی صفت اشعار میں نے قارئین کی حظِ طبع کے لئے نقل کر لئے ملاحظہ فرمایئے۔

سار باں ناقہ را بجانب نجد
کز درو بام او بخیز د وجد

این مایر کع القمر و الشمس
این مایسجد العلیٰ والمجد

صد موسیٰ و ہزار مسیح است زیر بام
کس را گر درون حریم تو راہ نیست

ان کی شفقت و محبت کا دامن پھیلا ہوا دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ میں بھی شعر کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ مستند ہو جائے۔ اجازت پا کر، میں نے عرض کیا۔

سو بار تجربات کی بھٹی میں میں جلا
محبوب کی رضا کی نہ گہرائیاں ملیں
مہتاب کی جبیں پہ بھی اترا ہے آدمی
واحسرتا کہ واں بھی نہ رعنائیاں ملیں

ان دو شعروں پر مجھے بہت تحسین و آفرین کہی اور ساتھ ہی اپنا اور شیخ سعدی کا ایک ایک شعر اسی مضمون پر سنایا

بماز پیرویٔ شیخ و برھمن نہ رسی
ہزار دررہ مازم زم است و صد گنگ است

....

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

میں نے پھر جرأت کی اور عرض کیا کہ تاثیر مرحوم سے حضرت شاہ جی کی آخری ملاقات ہوئی تو تانگہ پہ سوار کرا کے تاثیر نے یہ تین شعر سنائے تھے جو میں نے حضرت شاہ جی سے سنے تھے۔

دل است بندهٔ احرار و جاں اسیر فرنگ
نہ چارهٔ ہمہ صلح و نہ بہرهٔ ہمہ جنگ

میانِ کعبہ و بت خانہ عرصہ یک گام
میانِ شیخ و برہمن ہزار ہا فرسنگ
نمود سر بسر اظہار و کوہکن یک تن
ہزار پیکر شیریں فسردہ دررگِ سنگ

سن کے وجد میں آگئے اور سوالیہ انداز میں پوچھا، یہ تاثیر کے ہیں؟...... "بڑی بات کہہ گیا تاثیر! عجیب آدمی تھا۔" اس کے ساتھ ہی یہ یادگار محفل اختتام پذیر ہوئی۔ عرشی فرمانے لگے...... آج شاہ صاحب کی یاد ہمہ جہت تازہ ہو گئی۔

علامہ عرشی کا آٹوگراف..... سید عطاء المحسن بخاری کے لئے

الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ

گر بہ دریا می توانی راہ یافت
بہر یک شبنم چرا باید شتافت

عرشی
۱۲ / دسمبر / ۱۹۷۵ء
۲۵ / ۱۲ / ۱۳۹۵ھ

ہفت روزہ "چٹان" /اداریہ

ایک ایسا محور، جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چوں مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

جی چاہتا ہے آج جی بھر کر رولوں، بالآخر وہ بھی رخصت ہو گیا جو اس زمانے میں اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھا۔ جس نے مرتے دم تک فقر و استغناء کے پرچم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کی زندگی بہت سی زندگیوں کی مجموعہ تھی۔ جس کا وجود ایک تاریخ تھا۔ جو ایک عہد تھا ایک ادارہ تھا۔ ایک انجمن تھا ایک تحریک تھا۔ غرض ایک ایسا محور تھا جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے۔ وہ اس پائے کا خطیب تھا کہ اس کی آتش بیانی کا لوہا اسکے حریف بھی مانتے تھے۔ اردو زبان نے اس مرتبہ کا خطیب نہ کبھی پیدا کیا اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گی۔

وہ ایک مجاہد عظیم تھے۔ انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق سے کبھی گریز نہیں کیا۔ ۲۷ برس کی عمر مستعار میں انہوں نے ۱۲ سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے میں بسر کئے اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں شائد ان کے ارادوں کی بابت شک رہا ہو۔ مگر انہیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ وہ اس مدرسہ فکر کے علمبردار تھے جن کی بنیادیں محمد قاسم نانوتوی اور محمود حسن کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں۔ تمام زندگی ایک ہی مشن رہا کہ برصغیر سے انگریز کی حکومت کیونکر نکالی جا سکتی ہے۔ وہ علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ میرے سامنے دو چیزیں ہیں اولاً انگریز کی حکومت یہاں سے ختم ہو جائے۔ ثانیاً وہ ختم نہیں ہوتی تو میں اس کے خلاف تبلیغ کرتے کرتے تختہ دار پر لٹک جاؤں۔

پھر ان کا دل عشق رسول ﷺ کی جلوہ گاہ تھا۔ حضور ﷺ کے عشق میں وہ اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی عشق تھا۔ اس عشق ہی نے انہیں ختم نبوت کے عقیدہ کی حفاظت کا مجاہد بنا دیا۔ پھر جس عشق و ایثار کے ساتھ انہوں نے اس راستے کا سفر کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بہت سی غلطیوں کو معاف کرتے رہے مگر دو چیزوں سے نہ وہ کبھی سمجھوتے پر آمادہ ہوئے اور اس کے مقابلے میں وہ عفو و درگزر کو پسند کیا کرتے۔

اوّل..... انگریز کی غلامی اور اس کے گماشتوں کا دوستانہ۔

دوم..... ختم نبوت کے قزاقوں کا تعاقب۔

وہ کہا کرتے تھے میں توشہ آخرت کے طور پر یہی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ وہ یہی لے گئے۔

وہ اپنے عہد کے ابوذر غفاری تھے۔ فقر و فاقہ ان کا شعار تھا۔ انہوں نے کبھی کسی تحریک و تنظیم کے قائد

وجماعت کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ وہ خطابت وضمیر کی سودا بازی کے بازار سے ہی ناآشنا تھے۔ ان پر زمانے نے بہت سا گردوغبار پھینکا۔ اور خود فروشوں نے الزامات کے چولہے سے چنگاریاں لے کر بارہا ان کی دستار فضیلت پر پھینکیں۔ مگر وہ تہمتوں کے بازار سے کنکریاں کھاتے ہوئے نکل گئے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں سرخرو ہوگئے ہیں۔ انشاء اللہ قیامت کے روز بھی سرخرو ہی اٹھیں گے۔

تذکروں میں ہے کہ جب امام ابن تیمیہ کا جنازہ اٹھا تھا تو پورا شہر اشکبار ہو کر نکل آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مظلومیت نے لوگوں کے دلوں کو احاطہ کر لیا ہے اور بے چین عوام وقت کی اس عظیم الشان دولت کو آخری خراج ادا کرنے کے لئے جمع ہوگئے ہیں۔

شاہ جی کا جنازہ بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ ایک انسان جو عمر بھر مہاجر رہا اور جب امرتسر سے مہاجرت کر کے ملتان میں پناہگزین ہوا تو ایک کچا مکان کرائے پر لے کر بارہ برس اس میں رہا۔ آخر وہیں اس کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کیا۔ وہیں سے اس کا جنازہ اٹھا۔ لیکن فقیر کا جنازہ شاہوں کے جنازے کو مات دے گیا۔ ایک شخص جو بالطبع فقیر تھا۔ جس کے دامن میں اللہ کے خوف اور رسول ﷺ کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کو ہمیشہ زنجیروں نے سلام کیا۔ جس کا سیم وزر کے بت خانوں میں ذکر تک مفقود رہا۔ جس نے ایک لحظہ کے لئے بھی اخباروں اور کتابوں کے صفحوں میں اپنا نام ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ جو آخر تک چاپائی پر بیٹھتا، لیٹتا اور سوتا رہا۔ جو اس مقام میں بھی رسول ﷺ کی زندگی کی عکس تھا اور جب اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو ایک اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان لوگ اشکبار چہروں کے ساتھ اس کی میت کے گرد جمع ہوگئے۔ ان میں ایک تہائی لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ لوگوں نے سینے پیٹ لئے۔ کیا اس فقیر نے یہ آنسو خریدے تھے؟ وہ تو شاید دوسرے وقت کی روٹی خریدنے پر بھی قادر نہ تھا۔

یہ سب کچھ اس کی بے غرضی اور بے نفسی کا صلہ تھا۔ وہ اگر لاہور، لائلپور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ میں رحلت فرماتے تو ہجوم کئی لاکھ تک پہنچ جاتا۔ لیکن دورافتادہ اور پسماندہ ملتان میں بھی ان کا ماتم اس شدت سے کیا گیا کہ ملتان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔ ہم نے اپنے اس وطن عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علماء اور فضلا آغوش لحد میں اتارے گئے۔ لیکن شاہ جی کی میت کے گرد عشاق کا جو ہجوم تھا اور لوگوں نے جس بے اختیاری کے ساتھ ان کا ماتم کیا۔ فقرا و علماء کی پوری صف اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب دماغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوصف انہیں اس اقلیم میں جو وقار اور اقتدار حاصل تھا۔ اس کا اقرار واعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رفاقت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ سر دینے کے لئے تیار ہوجاتے۔ ان کے فدائیوں کا قبیلہ ملک کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلاء پیدا ہوگیا وہ کبھی پر نہ ہوگا۔ خطابت بیوہ ہوگئی۔ لوگ کبھی اس طرف سے گزریں گے جہاں شاہ جی

گرجتے اور گونجتے رہے ہیں تو دلوں سے ہوک اٹھا کرے گی کہ یہاں کبھی وہ مردِ مجاہد صرصر بہ آغوش راتوں میں اپنا چراغ جلایا کرتا تھا جس کی نواپیرائیوں پر قیاس ہوتا تھا کہ قرونِ اولیٰ کا کوئی غزوہ نقاب اُلٹ کر سامنے آ گیا ہے یا پھر لوگ غارِ حرا کے ارد گرد کھڑے ہیں۔ قرآن اتر رہا ہے اور قند و نبات کی طرح گھلتا ہوا کانوں کے راستے سے دلوں کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح بیٹھتا چلا جا رہا ہے لیکن اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

(شورش کاشمیری)

روزنامہ "جنگ" کراچی / تعزیتی شذرہ

ملک کی تاریخ انہیں کبھی نہیں بھلا سکتی

ممتاز احرار لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات کی اطلاع کو ملک کے صرف مذہبی حلقے میں ہی نہیں قومی حلقوں میں بھی بڑے رنج و غم اور بڑے افسوس و صدمے کے ساتھ سنا جائے گا۔ امیر شریعت گزشتہ چار سال سے برابر علیل چلے آ رہے تھے۔ ان کے آخری ایام حزن المناک اور اندوہناک مشکلات میں گزرے وہ اپنی جگہ ایک المناک داستان سید عطاء اللہ شاہ بخاری جن کا ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس پورے برصغیر کی ممتاز اور محترم شخصیت کی حیثیت سے لاکھوں انسانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز رہے۔ وہ ایک جادو بیاں مقرر اور برصغیر کی تاریخ کے سب سے زیادہ مؤثر خطیبوں میں شامل تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ساری عمر قومی خدمت میں گزری۔ پندرہ سال تک قید افرنگ میں رہے اور سامراجی طاقت کے ساتھ لڑنے میں اپنا تن من دھن لٹاتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک مخلص، دیانتدار، اصول پرست اور عوام دوست رہنما کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ حق یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت تھی جو ہم سے جدا ہو گئی۔ ایک مخلص راہنما سے یہ قوم محروم ہو گئی لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور انہوں نے قوم کو آزاد کرنے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لئے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔ ان کی جماعت مجلس احرار نے آزادی سے پہلے جس خلوص اور جذبہ سے کام کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور اسے اس ملک کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اس قوم کے نوجوانوں میں وہ خلوص وہ جذبہ اور وہ کردار پیدا کرے جس کا مظاہرہ اس مجاہد نے عمر بھر کیا۔

مولانا عبد الرحمن میانوی

حرفِ عقیدت

جو مخلصین و محبین بانیٔ احرار حضرت امیر شریعت سید عطااللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بے حد باعث زیادتی ایمان و عمل ثابت ہوگا کہ وہ اپنے وقت کے عظیم خطیب، بے عدیل بہادر اور لامثال محب نبی کریم ﷺ کی ذات ستودہ صفات اور محافظ عقیدۂ ختم نبوت کا ذکر خیر پڑھیں گے۔ اس کے مطالعہ کرنے سے جذبۂ خلوص ایمانی اور عقیدۂ دینِ اسلام کے ساتھ والہانہ عقیدت مستحکم ہوگی جیسے پھولوں کی نکہت اور خوشبو سے دل و دماغ معطر اور شگفتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کے خاص مقبول و برگزیدہ انسانوں کی سیرت و عمل کردار کے پڑھنے سے انسان کی روح مستفید و محظوظ ہوتی ہے اور اس سے جذبۂ عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے یارانِ عقیدت و محبت کے متعلق خود خالق کون و مکاں نے شہادت دی

اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔

لہذا آپ ﷺ کی امت جس کو خیر الامم کہا گیا اس میں جو لوگ نبوت و صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نور عقیدت اور حسن اعمال سے مستفیض ہوتے ہیں ان میں بھی اس شان کا پایا جانا لازمی ہے۔ میرے حضرت امیر شریعت میں دونوں باتیں کہ کفار کے افراد سے نفرت کاملہ اور سرکار دو عالم کے فدائیوں کے ساتھ مخلصانہ والہانہ محبت و الفت تھی۔ لہذا اس سے بہتر مسلمان کے لئے کیا تحفۂ عقیدت و اخلاص ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے مجاہد اعظم حضرت بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے حالات کے ذکر خیر سے آج پھر بہرہ ور ہو رہے ہیں اور افرادِ قوم کے لئے یہی واحد ذریعہ ہے کہ مسلمان نبی اکرم ﷺ کی صفات کے قریب اور حضور پر نور کے برکات و فیوضات سے مستفیض و منور ہوں اور وہ خدا کے خاص بندے کی سیرت و اعمال کو پڑھ کر استحکام دین کی شاہراہ پر گامزن رہیں اور اسی کی بقاء و تحفظ کے لئے جان دے دیں۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا:

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں اور نہ ہی اس میں مبالغہ ہے کہ حضرت بخاری قدس سرہ نے اپنے وقت کے ساتھیوں اور مخلصوں سے محبت کی ہے اس میں راقم الحروف کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے وہ بھی بے عدیل و لامثال ہے اور مجھ فقیر کے لئے باعث ناز ہے کہ راقم کو جو قرب بخاری حاصل ہوا تھا اور ان کے گھر کے تمام افراد یعنی بخاری صاحب کی اہلیہ محترمہ (جنہیں میں اپنی اماں کہتا ہوں) اور فرزندانِ ارجمند کے قلوب میں بھی میرے متعلق وہی جذبۂ محبت ہے اور سبھی میری عاقبت کے دعا گو ہیں۔ میری گود عقیدت انہیں موتیوں سے بھرپور معمور ہے جو ان شاء اللہ تعالیٰ عاقبت میں میرے کام آئیں گے۔

مولانا مجاہد الحسینی

دیوانے یاد آتے ہیں

لاہور کی آخری جیل کے آخری قیدیوں کی سرگزشت

حضرت مولانا مجاہد الحسینی مدظلہ ایک کہنہ مشق صحافی، متبحر عالم دین اور وسیع الظرف شخصیت کے مالک ہیں۔ ماضی میں وہ مجلسِ احرار اسلام کے سرگرم رہنما رہے ہیں۔ مجلسِ احرار کے ترجمان روزنامہ آزاد اور روزنامہ نوائے پاکستان (لاہور)، ہفت روزہ ساربان لاہور اور ہفت روزہ خدام الدین لاہور کے ایڈیٹر رہے ہیں اور سہ روزہ مستقبل ملتان کے ادارہ تحریر میں بھی شامل رہے ہیں۔ آجکل فیصل آباد سے "صوت الاسلام" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کر رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون دراصل تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے ایام اسیری کی سرگزشت ہے۔ اس میں تحریک کے مرکزی رہنماؤں کے حوالے سے اُن کی خوب صورت یادیں ہیں۔ جو یقیناً ہماری تاریخ کا سرمایہ ہیں۔ مولانا کا وجود ایسی بے شمار یادوں کا دفینہ ہے اگر وہ اس موضوع پر مسلسل لکھیں تو تاریخ کے ان گنت خفیہ گوشے منظرِ عام پر آسکتے ہیں ہم مولانا کے شکر گزار ہیں کہ ہماری خواہش پر ذیل کا مضمون انہوں نے خاص طور پہ نقیب کے لئے لکھا۔ (مدیر)

اللہ تعالیٰ نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بہت سی خوبیوں اور محاسن سے نوازا تھا۔ برصغیر پاک و ہند ہی نہیں غالباً پورے کرۂ ارضی پر اردو زبان کا سر طراز خطیب اور وجد آفریں قاریٔ قرآن ان جیسا موجود نہ تھا۔

اردو، پنجابی میں ان کے خطاب کے جادو سے وہی صحیح طور پر واقف ہیں جنھوں نے سخت گرم اور ٹھٹھری سرد راتوں میں اذانِ فجر تک سراپا گوش بر آواز ان کی خطابت کی معرکہ آرائی کا مشاہدہ کیا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بیان و خطاب کی سحر آفرینی اور اثر خیزی کیا تھی در حقیقت افصح العرب والعجم ﷺ کی آلِ سادات کے خونی اثر کی جلوہ نمائی تھی، آپ کی شخصیت سید وُلد آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد

"وان من البیانِ لسحراً"

کا پورا مصداق اور آئینہ دار تھی۔

آپ کی خطابت تو اکثر موضوع سخن رہتی ہے لیکن امیر شریعت کی کتاب حیات کے بعض اوراق ایسے بھی ہیں جو ابھی تک لوگوں کے مطالعے میں نہیں آئے ہیں۔ آج اسی کی ورق گردانی ہے۔ اور وہ یہ کہ جن دنوں ۱۹۵۳ء کی تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت پورے شباب پر تھی، سارا ملک مسلم لیگی حکومت کی قادیانیت نوازی کے خلاف سراپا احتجاج بن چکا تھا، ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ دراز اور ملک گیر ہو رہا تھا۔ تمام دینی سیاسی جماعتیں شانہ بشانہ اور ہمقدم تھیں، دوسری طرف پنجاب مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کی طرف سے مطالبات کی تائید میں قرار داد منظور کر لینے کے باوجود اسکی حکومت انگریز کے خود کاشتہ پودے کی حفاظت

پر کمر بستہ تھی۔ اس تحریک کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ ٹیلیگراف، ٹیلیفون، ریلوے کے محکموں اور سول سکرٹیریٹ لاہور میں پہلی مرتبہ ہڑتال ہوئی تھی۔

تحریک تحفظ ختم نبوت کے مطالبات واضح تھے، علامہ اقبال کی تحریک اور تجویز کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ناموس رسالتﷺ کا تحفظ، اور حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ کا فرض منصبی اداء کرنے کے بجائے سرکاری خرچ پر قادیانیت کی تبلیغ کرنے اور مختلف ممالک میں قادیانی جماعت کے دفاتر قائم کرنے کی مہم کا انسداد کرنے کے لئے قادیانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں کی وزارت سے علیحد گی اس کا مقصود تھا۔

مسلم لیگی حکمرانوں نے مطالبات تسلیم کرنے کے بجائے ناموس رسالتﷺ کے تحفظ کی خاطر تحریک میں حصہ لینے والوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے، چوک دالگراں اور چوک دہلی دروازہ لاہور، چوک بازار ملتان مسجد پھول ہٹ اور مسجد ولی محمد اور سیالکوٹ، لائل پور (فیصل آباد) وغیرہ کئی شہروں میں ناموس رسالتﷺ کے محافظوں کو خاک اور خون میں تڑپا دیا گیا تھا۔

کئی لاکھ فرزندان اسلام اور عشاق رسولﷺ پس دیوار زنداں کر دیئے گئے تھے، جیل خانوں کے احاطے قیدیوں سے بھر گئے تو خاردار تاریں بچھا کر قید خانے بنائے گئے اور ان میں عقیدہ ختم نبوت کی بابت اپنا ایمان ظاہر کرنے والوں اور حضور خاتم الانبیاءﷺ کی ذات اقدس کو اللہ کا آخری نبی و رسولﷺ تسلیم کرنے والے پابند سلاسل کر دیئے گئے تھے۔

یہ تحریک کسی ایک دینی یا سیاسی جماعت کی جانب سے نہ تھی بلکہ تمام مکاتب فکر، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، اور مشائخ حضرات کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلسِ عمل کی تحریک تھی، البتہ مجلسِ احرار اسلام اس تحریک کی داعی جماعت تھی اور اسی کی کوششوں سے یہ مجلسِ عمل معرضِ وجود میں آئی تھی۔

مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری خطیب مسجد وزیر خاں لاہور اس مجلس عمل کے سربراہ تھے، تحریک تحفظِ ختم نبوت کی مجلس عمل کی جانب سے ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء مطالبات تسلیم کرنے کے لئے حکومت کو آخری تاریخ کا نوٹس دیا گیا تھا۔ حکومت نے مطالبات تسلیم کرنے یا اس سلسلے میں مذاکرات کرنے کے بجائے ۲۸ فروری کو مجلس عملی کے تمام قائدین کو کراچی میں گرفتار کر لیا، ان میں صدر مجلس عمل مولانا ابو الحسنات، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبد الحامد بدایونی صدر جمیعت علماء پاکستان، ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار اسلام پاکستان، صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار شریف، مرکزی مبلغ ختم نبوت مولانا لال حسین اختر، اور سید مظفر علی شمسی جنرل سیکرٹیری تحفظِ حقوقِ شیعہ پاکستان اور دیگر شخصیات شامل تھیں۔

اسی تاریخ کو رات گیارہ بجے تحریک تحفظ ختم نبوت کے ترجمان روزنامہ آزاد لاہور اور اس تحریک کی

تائید و حمایت کرنے کی پاداش میں مولانا ظفر علی خاں کی زیرادارت مؤقر روزنامہ زمیندار لاہور کی اشاعت ایک ایک سال کے لئے حکومت پنجاب نے ممنوع قرار دیدی تھی۔ اور روزنامہ آزاد کا ایڈیٹر ہونے کے جرم میں راقم الحروف کو گرفتار کر کے جیل خانے میں نظر بند کر دیا تھا۔

مجھے ایک ماہ مظفر گڑھ جیل میں رکھا گیا، سالار معراج الدین سالار جیوش احرار اسلام پاکستان میرے رفیق جیل خانہ تھے ایک ماہ بعد انہیں ڈیرہ غازی اور مجھے لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں کے سیاست خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں محبوس کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں مولانا محمد اسمٰعیل سلفی ناظم اعلیٰ جمیعت اہلحدیث پاکستان اور مولانا غلام محمد ترنم خطیب جامع مسجد سول سیکرٹریٹ حکومت پنجاب لاہور مظفر گڑھ کے حکیم نور محمد اور سٹی مسلم لیگ کے رہنما مظفر علی حصاروی اور دیگر حضرات پابند کر دیئے گئے تھے۔ یاد رہے کہ سیاست خانے میں ہمیں مرزائی آئی جی جیل خانہ جات کرنل بشیر جمیل کے حکم سے رکھا گیا تھا۔ میری کوٹھڑی کے مقابل "شوکت ڈاکو" قید تھا۔ اسے روزانہ مار مار کر ادھ موا کیا جاتا تھا۔ وہ کیوں ڈاکو بنا؟ (اسکی تفاصیل پھر بیان ہونگی انشاء اللہ)

بہر نوع ایک ماہ بعد سیاست خانے سے بم کیس وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ وارڈ تحریک آزادی کے مشہور رہنماؤں بھگت سنگھ اور دت کی یاد میں متحدہ پنجاب کے وزیر بھیم سین سچر نے تعمیر کرایا تھا۔ جنہیں اسمبلی ہال میں بم پھینکنے کے الزام میں گرفتار کر کے اس جگہ رکھا گیا تھا۔ اس وارڈ میں پاکستان کی عظیم شخصیات موجود تھیں، جن میں شیخ التفسیر مولانا احمد علی امیر انجمن خدام الدین لاہور، نامور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نائب امیر جماعت اسلامی، میاں محمد طفیل قیم جماعت اسلامی، نعیم صدیقی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور اور مولانا کوثر نیازی (جماعت اسلامی) کے اسماء گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ حضرت شیخ لاہوری کے ساتھ راقم الحروف کو جیل میں رفاقت اور اکتسابِ فیض کا شرف حاصل ہوا، ہفت روزہ خدام الدین کے اجراء کا فیصلہ بھی اسی دوران جیل خانے میں ہوا تھا۔

حضرت شیخ لاہوری کی صحت طبعی عمر کے تقاضے کے علاوہ ملتان جیل میں حکومت کے کارندوں کی معرفت مبینہ "زہر خورانی" سے بھی نہایت خراب تھی مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے بھی رہائی کے بعد اس سازش کا ذکر کیا تھا کہ حضرت کے ساتھ مجھے بھی "زہر" سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر مارنے والے سے بچانے والی ذات قوی تر ہے۔

بہر نوع حضرت شیخ لاہوری کی بابت ان کے "مبینہ" مرید ملک فیروز خاں نون وزیر اعلیٰ پنجاب کو ان کی خرابیٔ صحت اور سخت علالت کا پتہ چلا تو ان کی رہائی کے فوری طور پر احکام جاری کر دیئے گئے تھے۔

بعد ازاں شیخ حسام الدین جنرل سکرٹری مجلس احرار اسلام پاکستان کو گرفتار کر کے جب لاہور سنٹرل

جیل میں لایا گیا تو انہوں نے جیل کے عملے سے تحریک کے قیدیوں کی بابت معلومات حاصل کیں کہ کون کس وارڈ میں محبوس ہے۔

اسیرانِ تحریک کی خاصی تعداد چونکہ بم کیس وارڈ میں موجود تھی ان میں سے جب میرا نام لیا گیا تو شیخ صاحب نے کہا کہ ہم دونوں کو جیل کے کسی وارڈ میں اکٹھا کر دیا جائے۔ چنانچہ ہمیں دیوانی احاطے میں منتقل کر دیا گیا دیوانی احاطے میں قبل ازیں سرخپوش رہنما ... الغفار خان، فیض احمد فیض اور سید سبط حسن محبوس تھے۔

تحریک کی مقبولیت اور ہمہ گیری کے باعث گرفتار شدگان کی تعداد روز افزوں تھی جیل کے احاطے تنگ ہو گئے تھے۔ ان تینوں حضرات کو مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ دیوانی احاطے میں دیوانی مقدمات کے قیدی رکھے جاتے تھے اس میں جیل کے روایتی انداز میں سلاخوں کا وجود نہ تھا بلکہ دیہات کے کھلے ماحول میں آبادی کی مانند اس کے درمیان میں کمرے تعمیر تھے اور ان کے ارد گرد کی جگہ میں روشیں بنا کر گارڈ نیا لگا دیا گیا تھا، گراؤنڈ میں سایہ دار درخت بھی موجود تھے، ہم نے دیوانی احاطے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک "قد آور مرغ" ٹہل رہا ہے۔ اور کمرے کے اندر سامنے دیوار کے ساتھ انجیروں کی ایک تسبیح نما لڑی لٹک رہی تھی، اربابِ جیل سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں عبدالغفار خاں کی امانت ہیں چند روز تک انہیں پہنچا دی جائیں گی۔ اُدھر حالات پنجاب کی عدالتی تحقیقات کا آغاز ہو چکا تھا تحقیقاتی کمیشن کی طرف سے مختلف جماعتوں کو اپنا اپنا موقف پیش کرنے کو کہا گیا تو اس بناء پر مختلف جیلوں میں نظر بند قائدینِ تحریک کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس پر احرار رہنما مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات فاتح قادیان، مولانا محمد شریف جالندھری اور ملک عبدالغفور انوری ملتان سے ہمارے احاطے میں پہنچا دیئے گئے تھے۔

تحریک کے مرکزی قائدین کراچی سنٹرل جیل سے چونکہ حیدر آباد اور سکھر کی جیلوں میں منتقل کر دیئے گئے تھے اس لئے انہیں یکجا کرنے میں غیر معمولی تاخیر سے کام لیا گیا۔ ادھر تحقیقاتی کمیشن کی جانب سے شدید تقاضا ہونے لگا کہ تحریک کے "روحِ رواں" اور مرکزی قائدین کی لاہور میں غیر موجودگی سے تحقیقات کا نظام متاثر ہو رہا ہے لہذا تمام رہنماؤں کو بلا تاخیر لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا جائے۔

ان شخصیات کی تشریف آوری سے قبل ایک شب نماز عشاء کے بعد ہمارے احاطے میں ایک نیا قیدی لایا گیا۔ جیل کے افسر نے تعارف کرایا کہ یہ مشہور ادیب اور علمی شخصیت "سید سبط حسن" ہیں۔ ان کے نام سے تو متعارف تھا اور مختلف ادبی رسائل میں ان کے مضامین بھی نگاہ سے گزر چکے تھے۔ بالمشافہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔

شیخ حسام الدین صاحب اور راقم نے ان کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل امتیاز حسین نقوی صاحب ان دنوں مجھ سے قرآن کریم مع ترجمہ پڑھ رہے تھے، انہوں نے خصوصی

اختیارات اور احترام استاد کے تحت ہمیں چارپائیاں فراہم کر دی تھیں، سبط حسن صاحب چونکہ عشاء کے بعد آئے تھے ضابطے کے مطابق ان کا بستر زمین پر بچھانا تھا۔

میں نے سوچا یہ نامور ترقی پسند ادیب اور ممتاز علمی شخصیت ہیں آج اگر صرف یہی اکیلے زمین کے فرش پر سوئے اور ان کی موجودگی میں ہم چارپائیوں پر محو استراحت رہے تو دینی حلقے اور علماء کے خلاف انکی نفرت میں زبردست شدت آ جائے گی۔ چنانچہ میں نے اپنے مشققی فتح دین صاحب سے کہا کہ میرا بستر تو زمین پر بچھا دیا جائے اور میری چارپائی پر سبط حسن صاحب کا بستر! لیٹنے سے قبل سبط حسن صاحب کی نگاہ میرے بستر پر پڑی تو دریافت کیا کہ آپ یہاں تپتی زمین پر اکیلے کیوں لیٹے ہیں؟ یہ تو مناسب نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ میری کمر میں کچھ تکلیف رہتی ہے اس لئے زمین پر لیٹنے میں سکون ملتا ہے۔

میری اس توجیہہ سے وہ پورے مطمئن نظر نہ آتے تھے۔ "اچھا جی"..... کہا اور اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔!

صبح کو سبط صاحب نے مجھے بتایا کہ اس مشققی نے مجھے آپ کے زمین پر لیٹنے اور مجھے چارپائی عطا کرنے کی ساری تفصیلات بتا دی ہیں۔ آپ کے اس اخلاق و محبت سے میں بہت متاثر ہوا ہوں، میں جذبات تشکر نوک زباں پر لا کر اسکی خوشبو فضا میں تحلیل کرنا نہیں چاہتا۔

بہر نوع۔ یہ طرزِ عمل اور معمولی اخلاقی مظاہرہ سبط حسن کے ساتھ گہرے روابط کا موجب بن گیا۔ اسی اثناء میں مشہور لیگی رہنماء عطاء اللہ جہانیاں بھی مسٹر ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ پنجاب کی مخالفت کی پاداش میں گرفتار ہو کر ہمارے ہی دیوانی احاطے میں لائے گئے۔ چند روز بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے خوشخبری سنائی کہ سکھر جیل سے مرکزی قائدین آج لاہور جیل کے اسی احاطے میں لائے جا رہے ہیں۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو ۱۱ بجے صبح امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر مجلس عمل، اور سید مظفر علی شمسی سکھر جیل سے اور ۲۷ جولائی کو ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار اسلام پاکستان، مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیت علماء پاکستان اور صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آلومہار شریف حیدر آباد جیل سے یہاں تشریف لائے۔

لاہور سنٹرل جیل میں ان عظیم المرتبہ اور جلیل القدر شخصیات کا اجتماع تاریخی نوعیت کا تھا۔ مختلف مکاتب فکر کے دینی اور ملی رہنماؤں کی اتنی بڑی تعداد کو شاید ہی قبل ازیں یکجا ہو کر پیش آمدہ مسائل پر اجتماعی فکر و تدبر کا موقع ملا ہو۔ سبط حسن صاحب کو تحریک سے اگرچہ کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ہماری شب و روز کی مصروفیات، باجماعت نمازوں کی یکجا ادائیگی (کیونکہ باہر تو باجماعت نمازیں مکاتب فکر کی اساس پر الگ الگ آئمہ کی اقتداء میں ادا ہوتی ہیں) اور مسئلہ ختم نبوت کی بابت یگانگتِ فکر اور باہم دگر احترامِ عظمت، محبت و اخوت کے ساتھ میل ملاقات وغیرہ سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔

باجماعت نمازوں کے حوالے سے اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے یہ مرکزی قائدین جب دیوانی احاطے میں تشریف لائے تھے تو حضرت شاہ جی نے امامت کے لئے

مولانا ابوالحسنات کا بازو پکڑ کر یہ کہتے ہوئے مصلے پر کھڑا کر دیا، بڑے میاں! یہ فریضہ مستقل طور پر آپ انجام دیں گے۔

مولانا ابوالحسنات نے مقتدیوں کی جانب ایک نگاہ ڈالی۔ میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے میرا بازو پکڑا اور اپنی جگہ مصلے پر کھڑا کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ خدمت مستقل طور سے آپ انجام دیں گے۔ چنانچہ ان بزرگوں کی موجودگی میں امامت کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ اور جب تک لاہور سنٹرل جیل میں رہا فقیر اس سعادت سے سرفراز رہا۔

مقتدیوں میں مندرجہ بالا مرکزی قائدین کے ساتھ مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد حیات فاتح قادیان۔ مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری جنرل سیکرٹری تنظیم اہلسنت والجماعت پاکستان، ملک عبدالغفور انوری، مولانا محمد شریف جالندھری، سائیں محمد حیات پسروری اور دیگر شخصیات دوش بدوش تھیں۔ تعصب یا کشمکش کا کوئی تصور بھی موجود نہ تھا۔ دیو بندی مکتب فکر کے امام کے پیچھے سب متحد و متفق تھے۔

غرضیکہ اس مجلس زندانیاں اور محفل روحانیاں میں سبط حسن خوب گھل مل گئے تھے۔ ہمارے روابط میں گہرائی اور گیرائی کا اضافہ ہو رہا تھا ایک روز نقوی صاحب کو مجھ سے ترجمہ قرآن کریم پڑھتے دیکھ کر کہنے لگے مجاہد صاحب! علماء اور دینی پیشواؤں کی بابت قبل ازیں میری رائے کوئی اچھی نہ تھی۔ مگر آپ کے ان بزرگوں کی زیارت کر کے اور آپ حضرات کو بہت قریب سے دیکھ کر میری رائے یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی آپ سے عربی زبان سیکھنے کے لئے آپ کی شاگردی اختیار کر لوں۔

میں نے کہا اس سے بڑی سعادت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

چنانچہ انہوں نے مجھ سے عربی اور میں نے ان سے انگریزی پڑھنا شروع کر دی۔ رات کو عشاء کے بعد اور صبح کی سیر کے وقت ہم دونوں جیل کے احاطے میں چہل قدمی کرتے وقت باہم دگر عربی اور انگریزی میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے، سبط حسن نے چند ماہ کے اندر عربی زبان پر خاصا عبور حاصل کر لیا تھا۔

دلچسپیاں:

جیل خانے کی تنگ و تاریک فضا اور گھٹے گھٹے ماحول میں دلچسپی پیدا کرنا بھی خاصا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ رفقاء زنداں غصیلے، تند خو، اور سڑیل مزاج ہوں تو دلچسپ گفتگو اور ہنسی مزاح کی بات بھی ناگواری طبع کا باعث ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر کہ ہمارے احاطے میں بزرگوں سے لے کر خوردوں تک سبھی خوش مزاج اور کھلے دل و دماغ کی شخصیات موجود تھیں، ہر ایک کا ظرف وسیع، اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی دلچسپیاں تھیں،

سبط حسن اور راقم الحروف دونوں پھولوں کی کیاریاں بنانے اور سینچنے سجانے میں لگے رہتے، شیخ حسام الدین نے پھولوں کی کیاری کے ساتھ آم کی گٹھلیاں کاشت کیں تو میں نے ازراہ تفنن طبع عرض کیا شیخ صاحب! لگتا ہے آپ جیل خانے میں طویل مدت تک ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جبھی تو آپ نے یہ

"ہزار سالہ" منصوبہ شروع کیا ہے۔ میرا یہ جملہ سن کر محفل زندانیاں زعفرانِ زار بن گئی۔

شام کے وقت دوسری بارکوں اور جیل کے دیگر احاطوں کے نظر بند بھی ارباب جیل کی اجازت سے بغرض ملاقات آسکتے تھے۔ ایک شخصیت ہمارے احاطے میں جب بھی قدم رنجہ فرماتی۔ تو "رہائی" انکا موضوع سخن ہوتا تھا، آج فلاں صاحب کی رہائی آگئی ہے، کل فلاں صاحب جا رہے ہیں۔ اور ان شاء اللہ ایک روز ہماری "رہائی" کی باری بھی آجائے گی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ جیل خانے کے اوپر سے شہری ہوا بازی کا چھوٹا سا طیارہ نیچی پرواز سے گزرا۔ تو اس شخصیت نے حیرت ناک لہجے میں پوچھا!

مجاہد صاحب! دیکھا آپ نے یہ جہاز کس قدر نیچی پرواز سے گزرا ہے۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔

میں نے کہا ہاں دراصل حکومت کے کارندے اس میں سوار ہو کر جیل میں ہونے والی ہماری گفتگو سننے آتے ہیں۔ اور یہ دیکھتے ہیں کہ جیل کے اندر اب ہماری سرگرمیاں کیا ہیں؟ کیونکہ رہائی کے احکام ہمارے طرز عمل کی بنیاد پر ہی صادر ہونگے۔ اسکی یہ رپورٹ تیار کرتے ہیں۔

بس آپ مطمئن رہیئے۔ بہت جلد آپ کی رہائی کے احکام بھی صادر ہو جائیں گے۔ کیونکہ سال گزر جانے کے بعد اب کس بناء پر حکومت ہماری نظر بندی میں توسیع کرے گی؟

میں نے انہیں پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ یہ جواب دیا۔ سبط حسن صاحب ہنسی ضبط نہ کرسکے تو لوٹ پوٹ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اتنے میں "وہ صاحب" اپنے وارڈ کی جانب واپس چلے گئے تو سبط صاحب نے کمرے سے باہر آکر پوچھا یہ کون صاحب تھے؟

میں نے انکا تعارف کراتے ہوئے مزاحاً کہا یہ صاحب! محکمہ تعلقاتِ عامہ کے ڈائریکٹر ہیں اور ہمیں جیل سے رہائی کی بشارتیں۔ اور تسلیاں دینے عموماً تشریف لاتے رہتے ہیں۔ سبط حسن نے میری اس توجیہ پر زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا یہ تعلقات عامہ اور بشارتوں کی اصطلاح بھی خوب رہی بہر نوع۔ جیل کے دن اور جیل کی راتیں ہم نے ہنسی خوشی، اور خوش مزاجی کے ساتھ بسر کی تھیں، اور بزرگ و خورد سب حضرات خوب سے خوب تر تھے۔

نیز یہ بشارت بھی مسرت افزا ہو گی کہ جیل خانے میں ہماری بیڈمنٹن اور والی بال کی ٹیم بھی موجود تھی۔ اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں پر مشتمل بم کیس وارڈ کی ٹیم کے ساتھ بروز جمعہ ہمارا میچ ہوتا تھا۔ نتیجتہً جماعت اسلامی کو اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو باہر سیاسی میدان اور الیکشن کے نتائج کی صورت میں اسے درپیش ہوتی ہے۔

جیل خانے کے لطائف و ظرائف کی بات چھڑی ہے تو ایک دلچسپ بات اور بھی سن لیجئے۔!

جماعت اسلامی کے بانی امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جمعیت علماء پاکستان کے رہنما مولانا عبدالستار خاں نیازی کو مارشل لاء کے تحت پہلے پھانسی کی سزائیں سنائی گئی تھیں جو بعد ازاں ۱۴-۱۴ سال قید بامشقت میں

تبدیل ہو گئی تھیں۔ جیل خانے کے اندر قید محض گزارنا مشکل اور قید بامشقت اچھی رہتی ہے۔ مولانا مودودی کو یہ مشقت دی گئی تھی کہ روزانہ الجھے ہوئے ٹیگ (کاغذ باندھنے کے دھاگے) کی گتھیاں سلجھا کر صاف کر کے الگ الگ باندھ دیا کریں۔ اور مولانا عبدالستار خاں نیازی کو چرخہ کاتنے کی مشقت دی گئی تھی۔ جیل کا ایک افسر راوی ہے کہ

ہمارے سپرنٹنڈنٹ جیل شیخ اکرام صاحب انگلستان کے دورے سے حال ہی میں آئے تھے، انگریز حکمرانوں کے طور طریقے اور ان کے لب و لہجے کی جھلک ان میں رچ بس گئی تھی۔ آتے ہی جیل خانے کا معائنہ کیا۔ اس دوران مولانا مودودی صاحب کے وارڈ میں چلے گئے، مولانا کے ساتھ تو نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ پیش آئے۔ البتہ مولانا عبدالستار خاں نیازی کے ساتھ ان کی گفتگو کا انداز فرنگیوں جیسا تھا۔ مولانا نیازی چرخہ کاتنے کی مشقت فرما رہے تھے روئی کی اٹیا پکڑتے اور موٹا سا سوت کات کر بے ہنگم سے دھاگے کا ڈھیر لگا دیتے تھے۔

شیخ صاحب۔! (صاحبوں کے لہجے میں) نیازی صاحب۔ دیکھیے آپ موٹا سوت کات رہے ہیں۔!

مولانا عبدالستار خاں نیازی نے اپنے روائتی پاٹدار لہجے میں جواب دیا ہاں شیخ صاحب..... تاکہ تمہاری سمجھ میں آجائے۔

جیل سے رہائی

بہر نوع سال گزرنے پر حکومت نے اندازہ لگا لیا کہ باہر تحریک کا زور ختم ہو گیا ہے۔ اور حالاتِ پنجاب کا تحقیقاتی کمشن اپنا کام کر رہا ہے۔ تو سیفٹی قوانین کے تحت نظر بندوں کی مدت میں توسیع کے بجائے رہائی کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

حسب ترتیب میری نظر بندی کی مدت بھی ختم ہو گئی تو ارباب جیل نے صبح ناشتے کے وقت اطلاع دی کہ آپ کی رہائی کے احکام بھی آ گئے ہیں ۔ میں نے اسے مذاق سمجھا۔ اور اپنے معمولات میں لگ گیا۔

اتنے میں ڈیوڑھی سے پھر طلبی ہوئی کہ جلدی کرو۔ ہم نے جیل کا سب اچھا کہنا ہے (اس کا مطلب یہ ہے کہ رہا ہونے والے کو احاطہ جیل سے باہر کر کے قیدیوں کی گنتی پوری ہونے پر سب اچھا کا اعلان کیا جاتا ہے) چنانچہ سامان سمیٹا بزرگوں اور رفقاء زنداں سے علیک سلیک اور دعاؤں کے ساتھ جیل خانے سے باہر آ گیا اور

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

قیام پاکستان کے بعد چونکہ مظفر گڑھ میں رہائش تھی۔ گھر گیا۔ اور چند روز کے بعد ہی واپس لاہور آ کر حضرت شاہ جی اور سبط حسن صاحب کی خدمت میں کچھ چیزیں جیل خانے میں بھجوائیں۔ وصول کر کے سبط حسن صاحب نے لکھا

"المنجد اور میٹھی روٹیاں ملیں، ایک نے دیدہ و عقل کو روشن کیا تو دوسرے نے کام و دہن کو لذت -

بخشی! بھائی آپ کا اور آپ کی پر خلوص محبتوں کا شکریہ اداء کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں، صبح چار بجے اٹھتا ہوں، چائے کے ساتھ میٹھی روٹیاں خوب مزہ دیتی ہیں، کھاتا ہوں اور بھائی کو دعائیں دیتا ہوں۔ پھر عربی پڑھتا ہوں اور المنجد کی ورق گردانی کرتا ہوں، میٹھی روٹیوں کے بارے میں شاہ صاحب کا فرمانا ہے کہ ان کے مقابلے میں تو محکم دین لاہور کے بسکٹ گوبر کے اوپلے معلوم ہوتے ہیں۔

امید ہے آپ یونہی دولت کی زکواۃ نکالتے رہیں گے۔" (اقتباس)

سبط حسن صاحب کے ساتھ سلسلہ خط و کتابت جاری رہا، ان کے مکتوبات علم و ادب کا شاہکار اور گرانقدر ادبی سرمایہ ہے۔ان شاءاللہ پھر کسی وقت ان کی اشاعت کا اہتمام ہو گا۔

بھر نورع۔ سبط حسن صاحب بھی رہا ہو گئے اور پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کی مطبوعات پاکستان ٹائمز اور امروز کے دوش بدوش ایک منفرد معیار کے ساتھ شائع ہونے والے ہفت روزہ لیل و نہار لاہور کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے تھے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کا ترجمان مجلس احرار کا روزنامہ آزاد لاہور چونکہ سال بھر کے لئے جبراً بند کیا گیا تھا اسکی تجدید ڈیکلریشن کے لئے کسی طور پر بھی حکومت آمادہ نہ ہو سکی۔

اندریں حالات میں نے لاہور سے "ساربان" کے نام سے ہفت روزہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کئی ماہ کی صبر آزما کوشش کے بعد ڈیکلریشن مل گیا۔ تو اس کے پہلے شمارے کے لئے میں نے سبط حسن صاحب سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ جس پر انہوں نے ایک فکر انگیز مختصر مضمون تحریر کر کے عنایت فرمایا۔ جو "ساربان" کے شمارہ اول اگست ۱۹۵۸ء میں پرانی قدریں کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

پرانی قدریں

میرے دیرینہ کرم فرما اور استاد جناب مجاہد الحسینی صاحب "ساربان" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کر رہے ہیں۔ استاد محترم نے مجھے حکم دیا ہے کہ ساربان کی پہلی اشاعت کے لئے میں بھی کچھ لکھوں۔ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ اس لئے استاد کی حکم عدولی کو معیوب سمجھتا ہوں استادی شاگردی کا رشتہ اگر اس کا احترام کیا جائے تو ہوتا بڑا پیارا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل نہ استادوں میں وہ پرانی شفقت اور محبت باقی رہی ہے۔ اور نہ شاگردوں میں استاد کے احترام کا احساس رہ گیا ہے، نہ استاد کو شاگرد سے ہمدردی ہوتی ہے نہ شاگرد استاد کی باتوں پر کان دھرتے۔ مگر میں تو پرانی وضع کا شاگرد اور میرے استاد بھی خوش قسمتی سے پرانی قدروں ہی کے پرستار ہیں!

ہماری شاگردی استادی کا قصہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سکیورٹی آف پاکستان ایکٹ کے تحت نظر بندی کے دن لاہور جیل میں گذار رہا تھا۔ دفعتاً سارے ملک میں ایک ہلچل مچ گئی۔

میں ان دنوں منٹگمری جیل میں تھا۔ اخبار پڑھتا تو ذہن کی عجیب کیفیت ہوتی۔ پھر نعروں سے جیل کی دیواریں ہلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جیل کی ہیبت ناک اور سنسان فضا میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ آس پاس کے دیہات اور قصبوں سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں نظر بند ہو کر آنے لگے۔ ان میں سفید ریش بزرگ بھی تھے۔ جوانی کے نشوں میں سرشار سورما بھی، اور خوردسال لڑکے بھی۔ ان کی اکثریت زراعت پیشہ تھی سیدھے سادے لوگ، بھولے بھالے لوگ، نہ سیاست کی شطرنجی چالوں سے واقف، نہ رموز مملکت سے آگاہ، ان کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس جرم کی سزا میں اندر لائے گئے ہیں، ان میں سے شاید ہی کسی نے جیل کی زندگی گزاری ہو۔ پھر وزارتیں ٹوٹنے لگیں اور مارشل لاء کی مسموم ہوائیں چلنے لگیں اور فضا تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی، ملک میں قادیانیت کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ (تحریک تحفظ ختم نبوت)

اسی درمیان میں مجھے منٹگمری جیل سے لاہور جیل منتقل کر دیا گیا یہاں چھ مہینے ایسے گذرے جن کی یاد مجھے برابر تڑپاتی رہتی ہے۔ حسنِ اتفاق دیکھیئے کہ پاکستان کے چوٹی کے عالموں کو اسی بارک میں لایا گیا جہاں میں مقیم تھا۔ مولانا ابوالحسنات، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا محمد علی جالندھری وغیرہ اس محفل روحانیاں میں مجھ جیسے گنہگار کی رسائی میرے لئے فیض و برکت کا پیغام لے کر آئی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے کارناموں سے تو میں مدت سے واقف تھا۔ لیکن ان کی خدمت میں نیاز جیل ہی میں حاصل ہوا، اور پہلی ملاقات کے بعد ہی یوں محسوس ہوا گویا اپنے کسی عزیز ترین بزرگ کے سایہ عاطفت میں پناہ ملی ہے۔ یوں تو سبھی اس شمع محفل کے پروانے تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان مولوی صاحب کو ان سے بڑی عقیدت و وابستگی ہے، اور شاہ صاحب بھی ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان اتنا خوش مزاج اور نیک طبع تھا کہ رقابت کے بجائے اسے محبت کرنے کو جی چاہا اور رفتہ رفتہ ہم دوست ہو گئے، اسکا نام مجاہد الحسینی تھا۔ مگر شاہ صاحب اسے یوسف کہہ کر پکارتے تھے۔ (۱)

یہاں مجاہد الحسینی صاحب میرے استاد بنے۔ اور چھ مہینے کے اندر انہوں نے مجھے اتنی عربی پڑھا دی کہ میں قرآن شریف کی عبارت کو بلا ترجمے کے آسانی سے سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ یوں تو ہر استاد خواہ وہ سخت گیر ہو یا نرم دل، لائق احترام ہوتا ہے لیکن ایسا مشفق استاد جس نے جیل کے اندر عربی زبان سکھائی ہو مجھے کتنا عزیز ہو گا۔ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ یہ چند سطریں دراصل اعتراف محبت اور اظہار عقیدت کے طور پر لکھ رہا ہوں ورنہ اپنی مصروفیتوں کے باعث نہ میرے پاس مضمون لکھنے کے لئے وقت ہے۔ اور نہ مولانا مجاہد الحسینی کو ساربان کے صفحات خراب کرنے کی ضرورت۔

میری دعاء ہے کہ ساربان اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور قوم کے گم کردہ راہ کارواں کو ترقی اور آزادی کی منزل کی طرف رہبری کرنے کا فرض خوش اسلوبی سے ادا کرے۔ (سبط حسن ۱۴ اگست ۱۹۵۸ء)

ایک دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں حضرت امیر شریعت کی علالت کا سن کر ان کی صحتیابی کے لئے دعا

---

(۱) اصل نام محمد یوسف اور قلمی نام مجاہد الحسینی ہے۔

کی اور حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں خط بھی ارسال کیا تھا۔

بتوسط۔ نواب زادہ امتیاز علی خاں

۴۹ لارنس روڈ لاہور

استاد محترم سلام شوق

نوازش نامہ ملا۔ میں نے کیمبل پور کی جیل سے آپ کو کئی خط لکھے لیکن غالباً مصروفیت کے سبب سے آپ نے جواب ہی نہ دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ جب تک فیڈرل کورٹ فیصلہ نہیں کرتی زندگی یونہی اعراف میں گزرے گی۔ دو ٹوک فیصلہ ہو جائے اور انشاء اللہ ہمارے حق میں ہو گا۔ تو پھر کچھ سوچا جائے۔ اب کے میرا حتمی ارادہ کھیتی باڑی کا ہے چنانچہ اس کوشش میں ہوں کہ کہیں تھوڑی سی زمین الاٹ ہو جائے۔ تل میں سہی۔ تو پھر ایک جھونپڑی بنا کر زراعت شروع کروں۔ کل شیخ صاحب(۱) سے ملنے گیا تھا مگر لیڈر لوگ گھر پر کب ملتے ہیں خط چھوڑ آیا۔ پھر کسی دن جاؤں گا۔ سنا ہے شاہ صاحب قبلہ علیل ہیں۔ خدا انہیں جلد صحت دے۔ ان کا پورا پتہ معلوم نہیں پھر بھی ملتان کے پتہ پر خط لکھ رہا ہوں۔ غالباً مل جائے گا۔ آپ ملیں یا خط لکھیں تو میرا بہت بہت آداب کہیئے گا۔ آپ لاہور آنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔ میں رہائی کے دوسرے دن ہی بیمار ہو گیا۔ یہی نزلہ زکام بخار! مگر اب بالکل اچھا ہوں۔ پرسوں یہاں بارش ہوئی جس نے موسم کو نہایت خوشگوار بنا دیا ہے۔ سردی کم ہو گئی ہے اور دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ کیمبل پور میں تو قیامت کی سردی پڑتی تھی۔ مفصل خط پھر لکھوں گا۔

آپ کا سبط حسن ۲ جنوری ۱۹۵۴ء

امیر شریعت کی دفتر سبط حسن میں تشریف آوری:

چند سال بعد لیل و نہار بند ہو گیا۔ سبط حسن صاحب تصنیف و تالیف کے کام میں انہماک کی وجہ سے بیمار پڑ گئے تھے۔ ان دنوں میں وہ میکلوڈ روڈ پر واقع علامہ اقبال اکیڈمی کی گلی میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں مقیم تھے۔

مجھے ان کی سخت بیماری کی خبر ملی تو حضرت شاہ جی کی خدمت میں اسکا تذکرہ کیا۔ شاہ جی ان دنوں حاجی دین محمد صاحب کے کارخانے واقع بادامی باغ لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے شاہ جی نے سبط حسن کی بیماری کا سن کر فرمایا۔

اسکی عیادت کو جانا چاہیئے۔ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں نے رہائش گاہ کی معلومات فراہم

---

(۱) شیخ حسام الدین رحمہ اللہ (جنرل سیکرٹیری مجلس احرار اسلام پاکستان)

کیں۔ تو شاہ جی نے توقف کے بعد فرمایا۔ تیمارداری مسنون ہے۔ ہمارا اخلاقی فرض بھی ہے کہ اپنے جیل کے اچھے ساتھی کی عیادت کریں!۔

چنانچہ شاہ جی! حاجی دین محمد کے بڑے لڑکے حاجی محمد احمد کی کار میں میکلوڈ روڈ اس بلڈنگ میں پہنچ گئے۔!

بلڈنگ کی پہلی منزل میں روزنامہ کوھستان لاہور کا دفتر تھا، اخبار کے عملے نے شاہ جی کو دیکھتے ہی چیف ایڈیٹر جناب نسیم حجازی کو مطلع کیا، اناً فاناً سارا عملہ شاہ جی کےلئے سراپا استقبال تھا۔ نسیم صاحب نے سمجھا شاید شاہ جی کوھستان کا دفتر دیکھنے اور ان سے ملاقات کو تشریف لائے ہیں

اتنے میں شاہ جی نے میری جانب دیکھا تو میں نے اوپر کے حصے میں جانے کا اشارہ کیا۔

کوھستان کے ایک رکن ادارہ نے کہا۔ کہ اوپر تو کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ہے شاہ جی نے فرمایا۔ مجھے مکان سے نہیں مکین سے غرض ہے۔ اور میرا تو یہ دینی فریضہ ہے کہ

علىٰ حفرة من النار

جہنم کے کنارے پر بھی کوئی کھڑا ہوگا تو اسے بچانے کی کوشش کروں۔

چنانچہ حضرت شاہ جی اوپر دفتر میں تشریف لے گئے۔ کوھستان کے عملے کے بعض اہم ارکان بھی ہمراہ تھے۔ سبط حسن صاحب بیماری سے نڈھال بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی چارپائی سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ والہانہ انداز میں شاہ جی سے جھک کر سلام کیا۔ اور گلو گیر لہجے میں کہا شاہ جی! بڑی شفقت فرمائی آپ نے۔ نہایت مہربانی، آپ کی کرم فرمائی کا بے حد ممنون ہوں۔

پھر میری جانب متوجہ ہو کر سبط حسن صاحب نے کہا

آپ نے خواہ مخواہ شاہ جی کو زحمت دی، مجھے شرمندہ کیا۔ مجھے حکم دیا ہوتا اچھی حالت میں شاہ جی کا نیاز حاصل کرنے حاضر ہوتا۔ اور سبط حسن کی آنکھوں میں عقیدت و احترام، اور محبت کے آنسو تیر گئے تھے۔

رہائشی الاٹمنٹ کی پیشکش

میاں افتخار الدین تحریک آزادی کے ممتاز رہنما اور شاہ صاحب کے حلقہ احباب و ارادت میں سے تھے وہ پاکستان کی مرکزی وزارت بحالیات پر فائز ہوئے تو ایک روز شاہ صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائے، مخدوم سجاد حسین قریشی (سابق گورنر پنجاب) سید علمدار حسین گیلانی، میاں محمد شفیع ناظم بلدیہ ملتان اور دوسرے رہنما ہمراہ تھے۔ شاہ صاحب کچہری روڈ محلہ ٹبی شیر خاں ملتان میں واقع ایک کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ یہ مکان تنگ گلی میں واقع تھا دروازے تک پہنچنے کا راستہ کچا تھا اور اینٹوں پر قدم رکھ کر پہنچا جا سکتا تھا۔ کسی لڑکے نے آکر اطلاع دی کہ ایک کار جھنڈی والی آئی ہے وہ آپ (شاہ صاحب) کا نام لے رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے مجھے فرمایا دیکھو! کوئی وزیر آیا ہوگا۔

میں نے باہر گلی میں دیکھا تو میاں افتخار الدین مقامی عمائدین اور انتظامیہ کے ہمراہ آرہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی علیک سلیک کے بعد متعجب ہو کر شاہ صاحب سے کہا شاہ جی۔۔۔ آپ یہ کہاں آکر بیٹھ گئے؟

آپ ایک درخواست لکھ دیں میں ابھی آپ کے نام کوئی بڑی کوٹھی یا اچھا وسیع مکان الاٹ کر دیتا ہوں۔

شاہ صاحب نے میاں افتخار الدین کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

بابو افتخار۔۔۔۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو میں گنہگار اور خطاکار ہوں میرا رب ستار و غفار ہے۔

میں نے زندگی میں ایک گناہ ہرگز نہیں کیا ہے اس سے میرا دامن پاک ہے۔ اور وہ یہ کہ۔۔۔۔۔ میں نے کبھی کسی حکمراں کے حضور یہ نہیں لکھا۔

"فدوی کی درخواست یہ ہے"

اگر میں نے یہی گناہ کرنا ہوتا تو پھر "انگریز بہادر" کے حضور درخواست پیش کرتا میری بے شمار وسیع و عریض کوٹھیاں ہوتیں۔ کئی مربعے زمین کا مالک ہوتا نوکر چاکر میرے ارد گرد ہوتے، کئی دربان میری چوکھٹ پر دست بستہ ایستادہ رہتے۔ اور تمہارے سمیت کوئی بدوں اجازت میرے آنگن میں جھانکنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔

شاہ صاحب کا جواب سن کر میاں افتخار الدین اور ان کے ساتھی سرنگوں رہ گئے۔ برصغیر کا یہ سحر بیاں خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔۔ اپنی خطابت کا جادو اگر اپنی ذات کے لئے جگاتا تو واقعی ان سے بڑا کوئی دولت مند اور صاحب جائیداد نہ ہوتا۔ مگر وہ قناعت پسند اور اپنی خاندانی روایات کے امین تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جس خانوادے کا خون میری رگ و پے میں گردش کر رہا ہے ان کے گھر سے بھی کئی کئی روز تک دھواں نہ اٹھتا اور چولہا سرد رہتا تھا۔

یہ تو ہمارا سرمایہ افتخار اور خاندانی ورثہ ہے۔ الفقر فخری۔

غرضیکہ نہ تو شاہ صاحب نے کسی بھی حکومت سے کچھ لیا نہ اس کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا اور نہ ہی کسی نے آپ کی عظیم دینی و ملی خدمات کے صلے میں کوئی منصب عطا کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

ترے وجود کے سلئے کو پا نہیں سکتا
دروغ، صدق سے آنکھیں ملا نہیں سکتا
تو آدمی نہیں یزداں کی اک نشانی ہے
ترے بڑھاپے میں احرار کی جوانی ہے

(عبدالحمید عدم)

(۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور میں تقریر کر رہے ہیں)

خطیبِ اعظم عرب کا نغمہ عجم کی لے میں سنا رہا ہے — سرِ چمن چہچہا رہا ہے، سرِ وغا مسکرا رہا ہے

حدیثِ سرو و سمن نچھاور، زبانِ شمشیر اس پہ قرباں! — مسیلمہ ایسے جعلسازوں کی بیخ و بنیاد ڈھا رہا ہے

قرونِ اولیٰ کی رزم گاہوں سے مرتضیٰ کا جلال لے کر — دبیز نیندیں جھنجھوڑتا ہے، مجاہدوں کو جگا رہا ہے

ہیں اس کی للکار سے ہراساں محمد مصطفیٰ کے باغی — وغا کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں، غنیم پر دندنا رہا ہے

میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس کر رہا ہوں — کہ جیسے کوثر پہ شام ہوتے ہی کوئی دیا جھلملا رہا ہے

خدا فروشوں کی خانقاہوں پہ ایک بجلی سی کوندتی ہے — ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

"وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

اسی کی صورت کو تک رہا ہے سفر سے ٹوٹا ہوا زمانہ

شورش کاشمیری

☆

پروفیسر خالد شبیر احمد

آتا ہے بہت محرم اسرار وفا یاد

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ہم سے رخصت ہوئے قریباً چونتیس برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں ایک لمحہ بھی شاید ایسا نہیں آیا جس لمحے ان کی شخصیت کی گرفت ڈھیلی پڑی ہو یا ان کی شخصیت کا سحر کم ہوا ہو، یا پھر وہ یاد نہ آئے ہوں۔ اس بات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی شخصیت کتنی عظیم، کتنی پُر اثر اور کتنی پُر کشش تھی۔ گزرنے والا ہر لمحہ ہمیں ان کے زیادہ قریب کرتا جا رہا ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں جب ہم اپنے چاروں طرف ایسی کوئی دوسری شخصیت نہیں پاتے جو اُتنی اہم، اتنی پر کشش، اور پروقار ہو یا کم از کم ان کے قریب تر ہو، تو پھر وہ اور زیادہ یاد آتے ہیں اور دل و دماغ کو تڑپا جاتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی جدائی میں گزرتے ہوئے یہ ماہ و سال ہمیں بجائے ان سے دور لے جانے کے اور نزدیک لے آئے ہیں۔

یوں دل نشیں ہوا ہے وہ روشن ضمیر شخص
جاتا نہیں ہے دل سے روایات کی طرح

حضرت امیر شریعت سے میرا تعلق خاطر میری زندگی کا وہ سرمایہ ہے جس پر مجھے بجا طور پر فخر ہے۔ انہیں محض دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں قریب ہو کر جانچا اور پرکھا بھی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بلند شخصیت تھے۔ جنہیں انسانوں سے بے پناہ محبت تھی۔ کسی کا دل توڑنا ان کے مسلک میں نہیں تھا۔ ہر قریب آنے والا یہی سمجھتا تھا کہ جتنا شاہ جی اسے چاہتے ہیں اور کسی کو نہیں چاہتے اور جتنا اس کے قریب ہیں اور کسی کے قریب نہیں۔ جس فرد نے انہیں جتنا قریب سے دیکھا وہ ان سے اتنا ہی متاثر ہوا۔ پھر یہ تاثر عارضی نہیں بلکہ مستقل ہوتا ہے۔ یہ ان کے خلوص ہی کا تو ثبوت ہے کہ آج جب ان کے جاننے والا اور ان کے پاس بیٹھنے والا فرد جب ان کی بات کرتا ہے یا انہیں یاد کرتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے ہم نے انہیں کیوں اتنی شدت سے چاہا کہ آج ان کی فرقت میں تڑپ تڑپ جاتے ہیں اور بے اختیار لبوں پہ یہ اشعار رواں ہو جاتے ہیں۔

کہاں گئے وہ جنوں آشنا وہ دیوانے
بڑے اداس ہیں یارو خرد کے ویرانے
عجب سزا ہے تیری مختصر رفاقت کی
بھرے جہاں میں اکیلے ہیں تیرے دیوانے

حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کو جب میں نے پہلی دفعہ چنیوٹ میں دیکھا تو محض چھے سات برس کا بچہ تھا۔ الٰہی بخش شہید (تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء) کے بیٹے خالد (جوان کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے تھے) میرے ساتھ تھے ہم دونوں احرار یونیفارم میں ملبوس تھے۔ مجھے یاد ہے شاہ جی نے ہمیں بہت پیار کیا تھا اور ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔ وہ اس وقت الٰہی بخش شہید جو احرار کی تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء کے پہلے شہید تھے۔ کا ذکر کر کے ان کی جرأت اور بہادری کو اپنے معیار کے الفاظ میں خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ اور ہم ان کے منہ کی طرف ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک ماہتاب مجسم انسان کی شکل اختیار کر کے آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے۔ شاید چاند میں وہ رعنائی نہ ہو جو اس متکلم چاند میں موجود تھی۔ آپ سے اس پہلی ملاقات کا اثر آج تک میرے وجدان اور میرے دل و دماغ کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ وہ کیفیت وہ سرور شاید میں اپنے الفاظ میں بیان نہ کر سکوں جو میں محسوس کرتا ہوں۔ شاید کیفیت نام ہی ایسی شے کا ہے جو الفاظ کے نرغے سے ماوراء ہو۔

آپ سے دوسری ملاقات بھی تقسیم ملک سے پہلے چنیوٹ ہی میں ہوئی تھی جب ۱۹۴۶ء کا انتخابی یُدھ اپنے عروج پر تھا۔ وہ چنیوٹ تشریف لائے تو مجلس احرار اسلام کا ایک جلسہ عام شاہی مسجد کے عقب میں غلہ منڈی میں تھا۔ خان مظہر نواز درانی کو آپ ملتان سے اپنے ساتھ لائے تھے وہ سٹیج پر آپ کے ہمراہ تشریف فرما تھے مظہر نواز درانی احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شاہ جی کی تقریر سے پہلے خواجہ عبدالرحیم عاجز مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں پنجابی کی نظم پڑھی تھی۔

"لڑناں لڑناں احرار نے ہُن الیکشن والا جنگ"

بے پناہ مجمع تھا لیکن اتنی ہی خاموشی بھی۔ سب کی نظریں امیر شریعت پر لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے اپنی باری پر حسب معمول آخری تقریر فرمائی اور لوگ عش عش کر اٹھے۔ یہ تقریر بھی اگرچہ ایک انتخابی تقریر تھی لیکن آپ نے انتخابی سیاست پر بہت کم تبصرہ کیا تھا اور انگریز کے ذلہ خواروں کو زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل میں انگریز دشمنی کا پودا کاشت ہوا اور آج خدا کے فضل و کرم سے جب میں بوڑھا ہو رہا ہوں یہ پودا تناور درخت بن چکا ہے۔ ساری عمر جو کچھ پڑھا اور جو کچھ بھی میرے مشاہدہ اور تجربہ میں آیا وہ سب کچھ اس بات کی تائید میں ہے کہ "اس دھرتی پر ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہی ہے۔ جس سے خیر کی توقع کا تصور بھی گناہِ عظیم ہے۔ جو کچھ آپ نے اس وقت کہا، وقت کے ساتھ ساتھ درست ثابت ہوا۔

ہے حقیقت بس وہی جو تو نے کر دی تھی عیاں
اور سب کچھ وقت کی آنکھوں میں تھا مثلِ سراب
تجھ پہ جو الزام تھا رد ہو گیا ہے وقت سے
تیرے نکتہ چیں ہوئے ہیں شرم سے اب آب آب

اس دفعہ بھی حضرت شاہ جی کا قیام اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں ہی تھا۔ جہاں پر ہر وقت لوگوں کا ایک جم غفیر موجود رہتا تھا۔ کچھ لوگ اگر آپ کی محفل سے چلے جاتے تو کچھ آ بھی جاتے تھے۔ اسی طرح حضرت شاہ جی کی محفل ہر وقت اپنے عروج پر رہتی تھی۔ میں بھی اس محفل میں اکثر موجود رہتا اور اپنی بساط کے مطابق آپ کی باتوں سے مستفیض ہوا کرتا تھا۔ نہ جانے وہ کیا جاذبیت تھی جو مجھ جیسے ناسمجھ کو بھی ان کی محفل سے اٹھنے نہیں دیتی تھی۔ ان کی گفتگو میں بلا کی چاشنی تھی۔ لوگ ان باتوں پر اکثر سر دھنتے تھے۔ محفل میں بھی بعض اوقات کیا اکثر اوقات تقریر جیسی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ شاہ جی کبھی سنجیدہ موضوع پر گفتگو کرتے تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جایا کرتی اور جب کبھی ہنسنے ہنسانے پر آجاتے تو ارد گرد بیٹھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی محفل میں آنجہانی سر سکندر حیات وزیر اعلی پنجاب کا ذکر بھی آیا۔ مجھے اب تک یاد ہے شاہ جی فرما رہے تھے۔

میں نے زندگی بھر کسی کے لئے بد دعا نہیں کی۔ میری عادت ہے کہ لوگوں کے قصور معاف کر دیا کرتا ہوں۔ میری فطرت کے ہی خلاف ہے کہ میں ذاتی انتقام کے بارے میں سوچوں۔ میری کوئی ذاتی دوستی یا ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میری دوستی بھی خدا کے لئے ہے اور میری دشمنی بھی خدا کی رضا کے لئے ہی ہے لیکن اگر میں نے زندگی میں کسی کے لئے بد دعاء کی ہے تو وہ سکندر حیات" اور اس جیسے دو تین آدمیوں کے لئے جس نے انتہائی سازشی انداز میں میرے خلاف سراسر جھوٹا بغاوت کا مقدمہ دائر کرا کر مجھے پھانسی دلوانے کی ناکام کوشش کی۔"

یہ بات سکندر حیات کی زندگی کی ہے۔ اس کی موت اس واقعہ کے بعد ہوئی اور آج تک جو کچھ اس خاندان سے ہو رہا ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔

شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے تھے مجھے اطلاع ہو جایا کرتی تھی۔ کیونکہ ان کی قیام گاہ اور جلسہ گاہ میرے گھر کے قریب ہی واقع تھی۔ پھر شاہی بازار کے احرار رضا کاروں کے ساتھ میرا رابطہ ہوتا تھا۔ جن کے ذریعہ سے شاہ جی کے آنے کے پروگرام کا مجھے پہلے سے ہی علم ہو جاتا۔ شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے تو آپ کی دو فرمائشیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک سعید کے چھوچنے دوسرے بخش الہی کو کہیں سے لاؤ۔ سعید ہمارے شہر میں چنے بنایا کرتا تھا۔ مسلم بازار میں اسکی دکان تھی۔ یہ چنے اتنے مزے دار ہوتے کہ جو کھاتا بس ہونٹ چاٹتا رہ جاتا۔ شاہ جی کو یہ چنے بڑے ہی مرغوب تھے۔ چونکہ میں عمر میں چھوٹا تھا بڑے احرار رضا کار ان فرمائشوں کے لئے مجھے ہی دوڑایا کرتے تھے۔

"بخش الہی" ہمارے شہر کے ایک مشہور مجذوب تھے۔ چنیوٹ کی شیخ برادری سے ان کا تعلق تھا۔ بخش الہی اپنی حالت میں مست گلیوں اور بازاروں میں اکثر گھومتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی لوگ بخش الہی کو تقریر کے لئے کہتے تو وہ کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر تقریر کرتا۔ تقریر میں مسلمانوں کو ان کی غیرت و حمیت کا

احساس دلاتا اور بے پردہ خواتین کی مذمت کیا کرتا۔ اکثر اوقات یہ تقریر مرزائیوں کے خلاف ہوتی۔ لوگ اس پر اسے داد دیتے اور وہ داد وصول پا کر خوشی کا اظہار کرتا۔ کبھی کبھی یہ تقریر وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی کیا کرتا تھا۔ جب وہ مرزائیوں کے خلاف تقریر کرتا تو مغلظات بھی بک دیا کرتا تھا۔ لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو کر اس کی ان تقریروں کو بڑے غور اور دلچسپی سے سنتے تھے اور کہتے تھے کہ مجذوب لیکن بات درست کرتا ہے۔ حضرت شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے بخش الٰہی سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ نہا دھو کر جب اپنی قیام گاہ پر تشریف فرما ہوتے تو بخش الٰہی کو تلاش کرنے کو کہتے کہ اسے بلاؤ مجھے اس سے ملنا ہے۔ یہ فریضہ بھی عموماً مجھے ہی ادا کرنا ہوتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے جب میں تلاش کرنے کے لئے نکلتا تو سوچتا کہ ایک مجذوب آدمی جس کا کوئی ٹھکانا ہے نہ کوئی پتا؟ گھر پر وہ بیٹھتا نہیں اسے کیسے تلاش کروں گا، وہ نہ جانے کہاں ہو گا؟ میں ہر مرتبہ اسے ایک مشکل کام تصور کرتا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ جب بھی میں ایسا سوچتا وہ مجھے کہیں نزدیک سے ہی مل جایا کرتا تھا۔ میں خوشی سے اچھل کر اسے کہتا "او بخش الٰہی! عطاء اللہ شاہ بخاری آئے ہوئے ہیں تجھے بلاتے ہیں چلو؟" وہ عجیب انداز میں میری طرف دیکھتا اور پھر ہنس کر کہتا۔

"ہاں ہاں چلو چلو، بخارا، بخارا یار ہے یار ہے۔ بخاری کی بجائے وہ ہمیشہ شاہ جی کو بخارا کہتا تھا۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے بخاری نہیں سنا۔ میں اسے لیکر شاہ جی کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ شاہ جی جب اسے دیکھتے تو اٹھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور اسے بغل گیر ہو کر بڑے اہتمام کے ساتھ ملتے تھے۔ بڑے انہماک کے ساتھ اس سے گفتگو فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ گفتگو خاصی طویل بھی ہو جایا کرتی تھی لیکن کیا مجال کہ پاس بیٹھے ہوئے ذرہ بھی بور ہوں۔ بڑی ہی دلچسپ باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بخش الٰہی شاہ جی کی ہر تقریر میں موجود ہوتا تھا۔ وہ بڑے غور سے آپ کی تقریر کو سنتا تھا۔ لوگ اس بات پر بھی حیران ہوتے کہ ایک مجذوب آدمی جس کو کسی لمحے چین نہیں۔ کئی گھنٹوں تک مسلسل ایک جگہ بیٹھ کر شاہ جی کی تقریر کیسے سن لیتا ہے؟

مجھے یاد ہے کہ ایک بار شاہ جی نے "نارتھ انڈس" ٹرین سے چنیوٹ پہنچنا تھا۔ جو رات کو تقریباً ایک بجے سٹیشن پر آتی تھی۔ میں اگرچہ بچہ تھا تاہم ضد کر کے اپنے بڑے رضا کاروں کے ہمراہ اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ میں حیران ہو گیا جب میری نگاہ بخش الٰہی پر پڑی جو ہم سے پہلے رات کو ایک بجے سٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "بخش الٰہی" شاہ جی آ رہے ہیں۔ کہنے لگا۔ "ہاں ہاں بخارا بخارا اپنا یار ہے۔ یار ہے آ رہا ہے۔" راہ چلتے ہوئے جب بھی لوگ سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کا نعرہ لگاتے تو وہ جواب میں زور سے زندہ باد کا نعرہ بلند کرتا اس کی آواز سے ایک گونج سی پیدا ہوتی تھی۔ ان دونوں (امیر شریعت اور بخش الٰہی مجذوب) کے درمیان جو وجدانی اور روحانی تعلق تھا کسی کو معلوم نہیں۔

چنیوٹ میں شاہ جی کے سب سے قابل اعتماد ساتھی، ملک اللہ دتہ مرحوم تھے۔ جو بڑی مدت تک مجلس احرار اسلام کے مقامی صدر بھی رہے۔ بلوچ خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ انتہائی زیرک اور بہادر انسان تھے۔

اپنے وقت کی پوری سیاسی تاریخ ان کے دماغ میں محفوظ تھی۔ کوئی اہم سیاسی واقعہ ایسا نہیں تھا جو ملک اللہ دتہ مرحوم کی یاد سے باہر ہوتا۔ حضرت شاہ جی کے شیدائی تھے۔ ملک کی آزادی تک شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ چنانچہ آپ کی شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ ملک رب نواز ایڈووکیٹ ان کے فرزند ہیں جو ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ملک اللہ دتہ تحریک تحفظ ختم نبوت میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ ملک صاحب کے علاوہ سالار "نذر محمد" "شیر محمد آزاد" "ظہور احمد" "شیر محمد وسیر" "نذر محمد کیتھ" "محمد حسین ہمارے بازار کے نڈر احرار رضا کار تھے۔ جو سارے شہر میں جماعتی کام کے لئے مشہور و معروف تھے۔

ایک دفعہ شاہ جی چنیوٹ تشریف لائے تو ملک اللہ دتہ صاحب کے گھر پر ہی مقیم ہوئے۔ دوران قیام شاہ جی نے ملک صاحب کو کہا کہ کوئی دلچسپ بات سناؤ؟" ملک صاحب نے انہیں اپنے بزرگ کا واقعہ سنایا کہ جب فیصل آباد (لائل پور) نیا نیا بنا تھا تو وہ اپنے ایک کم عمر بیٹے کو لیکر شہر چلا گیا۔ کہ نیا شہر دکھائے شہر میں گھومتے پھرتے بچہ باپ سے الگ ہو گیا۔ باپ نے اپنے بچے کو انتہائی پریشانی کی حالت میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بچہ نہ ملا۔ اب یہ بھی اتفاق ہے کہ جب بھی وہ بزرگ کسی سمت سے گھوم گھام کر آتا تو سامنے اس کے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر آجاتا تھا۔ ایک طرف سے بچے کی گمشدگی کی پریشانی اور دوسری جانب سے یہ صورت حال کہ گھنٹہ گھر ہر بار سامنے آجاتا۔ اسے مزید پریشان کر رہا تھا۔ بالآخر وہ گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر غصہ میں بولا۔ اے گھنٹہ گھر میرے بچے کو تونے ہی گم کیا ہے۔ اسے تونے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ جب بھی میں اسے تلاش کرنے لگتا ہوں تو تو میرے سامنے آجاتا ہے۔ اور میرے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے؟" بس ملک صاحب نے یہ واقعہ کیا سنایا کہ شاہ جی مارے، ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے اور دیر تک اس لطیفہ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ رات کو جلسہ گاہ پہنچے تو اپنی پوری تقریر کو اس واقعے کے تناظر میں بیان کر دیا، پہلے جلسہ میں یہ واقعہ سنایا اور پھر انگریزی سامراج کو لائل پور کے گھنٹہ گھر سے تشبیہ دی اور بچے کو عظمت رفتہ کے ساتھ اور مسلمانوں کو باپ کے ساتھ تشبیہ دیکر بات بنائی کہ

"ہم ایک مدت سے اسلام کی عظمت رفتہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن اس راستے کی عظیم رکاوٹ برطانوی سامراج ہے جو ہمارے راستے کو روکے کھڑا ہے۔ ہماری ہر ترکیب، ہماری ہر کوشش، ہماری ہر کاوش اس سامراج کی وجہ سے بہ ظاہر ناکام ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر ہمیں عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنا ہے تو پھر اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے پورے وسائل کے ساتھ برطانوی سامراج کے ساتھ ٹکرا جائیں۔ اس کی طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیں جس کے بعد ہمارا راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور ہمارا اپنی منزل مقصود پہنچنا آسان اور سہل ہو جائے گا۔"

۱۹۴۵ء کا اواخر تھا یا پھر غالباً ۱۹۴۶ء کا آغاز کہ ہم لوگ چنیوٹ سے دہلی نقل مکانی کر گئے۔ قبلہ والد ماجد محترم نذیر احمد مجیدی مرحوم وہاں پر کاروبار تھا۔ انہوں نے ہمیں بھی وہیں بلوالیا۔ ہم لوگ "چاندنی چوک" اور

"بلی ماراں" کے سنگم پر ایک مکان پر مقیم ہوئے۔ جہاں سے فتح پوری مسجد چند قدم کے فاصلہ پر تھی۔ فتح پوری مسجد کے اوپر "فتح پوری مسلم ہائی سکول میں مجھے ساتویں جماعت میں داخلہ ملا۔ ان دنوں مجھ پر مجلس احرار اسلام کا جنون پورے جوبن سے طاری تھا۔ یہ پورا علاقہ مسلم لیگ کا گڑھ شمار ہوتا تھا۔ فتح پوری مسجد میں جمعہ کے روز مسلم لیگ کا پرچم لہرایا کرتا تھا۔ جبکہ جامع مسجد دہلی میں مجلس احرار اسلام کا سرخ ہلالی پرچم لہرایا کرتا۔ فتح پوری مسلم سکول میں بھی مسلم لیگ ہی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکوں کی اکثریت بھی مسلم لیگی ہی تھی۔ میں نے بھی باوجود اس صورت حالات سے واقفیت کے پہلے دن جب سرخ قمیض پہن کر سکول جانے کا قصد کیا تو قبلہ والد صاحب نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ "وہاں سکول میں سب لڑکے لیگی ہونگے۔ اور وہ پھر تجھے تنگ کریں گے"۔ لیکن میں نے ان کی ہدایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلے دن تو ہر لڑکے نے مجھے روک کر میری سرخ قمیض کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "ابے تو احراری ہے کیا؟" میں نے سینہ چوڑا کر کے ہر ایک کو جواب میں کہا ہاں میں احراری ہوں دوسرے دن چھٹی کے بعد لڑکوں نے اکٹھے ہو کر مجھے گھیرا اور باقاعدہ پٹائی کی۔ میں اکیلا اور وہ بے شمار، اب ہر روز یہ ان کا معمول ہو چکا تھا۔ تعداد میں کثرت کی وجہ سے پلڑا ہمیشہ ان کا ہی بھاری رہتا تھا اگرچہ میں بھی اپنی ہمت کے مطابق کچھ نہ کچھ تو مدافعت کرتا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ والد صاحب نے صحیح کہا تھا۔ اور یہ میری غلطی تھی۔ تاہم اب کیا ہو سکتا تھا ایک دن انہیں باقاعدہ منصوبہ کے تحت جوش دلا کر میں اپنے ہمراہ گھر تک لایا جو سکول سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اور اپنے چچا جان کو اوپر سے بلا لایا۔ چچا جان اس وقت ٹھیٹھ پنجابی لباس میں تھے۔ پاؤں میں سلیپر، دھوتی، لمبے بال، سفید دیسی کرتا۔ انہوں نے جو لڑکوں کو للکارا تو لڑکے ڈر کے مارے کتابیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوسرے دن لڑکوں کو سکول میں سرگوشیوں کے اندر یہ کہتے ہوئے سنا۔

"اس کے پاس بدمعاش ہے اس کے قریب مت جائیو، نہیں تو قتل کروا دے گا۔ ہم نے خدا کی قسم اپنی آنکھوں سے بدمعاش دیکھا ہے"

دراصل جس لباس میں لڑکوں نے چچا جان کو دیکھا تھا وہ وہاں بدمعاش پہنتے تھے اور دہلی کے لوگ بدمعاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ خدا نے اس طرح میری مدد کی کہ اب اسی سکول میں میرا رعب تھا۔ اور کوئی لڑکا میری ہوا کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دہلی میں جاتے ہی ہم نے اپنے مکان پر مجلس احرار اسلام کا پرچم لگا دیا تھا اور ہر جمعہ کو جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے۔ ہم سارے بھائی پیدل بلی ماراں سے چاوڑی بازار ہوتے ہوئے جامع مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ جمعہ کے روز جامع مسجد کے محراب کے قریب اور باہر صحن میں مجلس احرار اسلام کے پرچم لہراتے ہوئے نظر آتے تھے جس سے یہ تاثر عام تھا کہ اس علاقہ میں مجلس احرار اسلام کے حامیوں کی اکثریت ہے۔ ویسے بھی احرار کے تمام جلسے بالعموم اسی جامع مسجد میں ہی ہوا کرتے تھے۔ شورش کاشمیری مرحوم کو سب سے پہلے اسی

مسجد میں دیکھا اور سُنا۔ میرے خیال میں وہ فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک ۱۹۳۹ء سے سات سال کی قید کاٹ کر جو رہا ہوئے تو سب سے پہلے دہلی تشریف لائے۔ ان دنوں دہلی میں سب احراری اکٹھے ہوئے تھے۔ شورش سے پہلے امیر شریعت نے خطاب فرمایا۔ ملکی سیاست پر احرار کا موقف تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا۔ آپ نے اپنی تقریر کے بعد شورش کو بلایا جو اس وقت مسجد کے ہال میں محراب کے قریب بیٹھے تھے۔ لیکن شورش شاہ جی کے بعد تقریر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے برابر انکار کر رہے تھے۔ بالاخر شاہ جی کے شدید اصرار پر شورش آئے اور انہوں نے شاہ جی کے بعد تقریر کی۔ یہ شورش کی وہ پہلی تقریر تھی جو میں نے سنی۔

پھر جب "آزاد ہند فوج" رہا ہوئی۔ ان سب فوجیوں نے اپنی پھٹی پرانی وردیوں میں ملبوس دہلی کے بازاروں میں مارچ کیا۔ آزادی اور سبھاس چندر بوس کے نعرے لگائے۔ ایک عجیب سماں تھا وہ جدھر سے بھی گزرتے لوگ سراپا عقیدت بن جاتے تھے۔ آزاد ہند و فوج کے سپاہی جوش و خروش کی مثال بنے۔ اطمینانِ قلب، اعتماد، عزمِ راسخ کی تصویر، قدم سے قدم ملا کر مارچ کر رہے تھے۔ میں اس فوج کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ جدھر جاتے میں بھی ان کے ساتھ قدم ملاتا نعرے لگاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں کہاں گئے، لیکن وہ جہاں جہاں بھی گئے میں ان کے ہمراہ تھا۔ دل میں ایک عجیب جذبہ تھا۔ ہائے وہ کیفیت، آج بھی جب اس کیفیت کا احساس کرتا ہوں تو مزاج عجیب رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس رنگ میں فقط ایک ہی ترنگ موج زن نظر آتی ہے۔ اور یہ انگریز دشمنی کی ترنگ ہے۔ آزادی وطن کی آرزو، جس کا پودا امیرِ شریعت نے دل و دماغ میں بچپن ہی میں لگا دیا تھا۔

کیپٹن ڈھلون، کیپٹن سہگل اور کیپٹن شاہنواز کی رہائی کے موقع پر ایک جلسہ عام کانگریس کے زیر اہتمام گاندھی گارڈن میں ہوا تھا۔ یہ بڑا عظیم الشان اجتماع تھا۔ تاحد نگاہ انسان ہی انسان تھے۔ انگریز دشمنی کا اتنا عظیم مظاہرہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مجلس احرار اسلام دہلی نے بھی کیپٹن شاہنواز کو انہی دنوں شاہی مسجد کے سامنے ننگی تلواروں سے سلامی دی حالانکہ احرار رضا کاروں پر پابندی تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود جامع مسجد میں مجلس احرار اسلام کا جلسہ بھی ہوا اور ننگی تلواروں سے سلامی بھی دی گئی۔ جس سے کیپٹن شاہنواز نے خطاب کیا۔ میں اس جلسے میں شریک تھا۔ سٹیج کے بالکل قریب کیپٹن شاہ نواز کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ کیا خوبصورت جوان تھا۔ چہرے کی سرخی میں بلا کی رعنائی تھی۔ قد و قامت دلکش، نگاہ میں عقابی عزائم کی تصویر جھلک رہی تھی۔ اندازِ تقریر بے خوف اور بے باک تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر نہیں کر رہا بلکہ میدان جہاد میں کھڑا کوئی بہادر تلوار چلا رہا ہے۔ تقریر کا آغاز ہی اس نے اس شعر سے کیا تھا۔

غازیوں میں بُو رہے گی جب تلک ایمان کی
تیغ لندن تک چلے گی اہل ہندوستان کی

آزاد ہند فوج کے اس نڈر اور بہادر کیپٹن نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے خلاف یہ محض پراپیگنڈا ہے کہ ہم کانگرس کے ایجنٹ ہیں، ایسا نہیں ہے۔ ہم انگریزوں کے خلاف کانگریس کے ساتھ ہیں۔ اگر کبھی حالات کا بہاؤ ہمیں اس مقام پر لے گیا کہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے کانگریس سے لڑنا ضروری ہو گیا تو جس دلجمعی کے ساتھ آج ہم انگریزوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں اسی دلجمعی کے ساتھ ہم آپ کو کانگریس کے ساتھ بھی لڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہم پہلے مسلمان ہیں بعد میں ہندوستانی"

اس جلسے کے بعد احرار رضا کاروں کے خلاف مقدمات بھی بنائے گئے کہ انہوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی ہے۔ شاہ نواز کو ننگی تلواروں سے سلامی دی ہے۔ اس کے اعزاز میں جلوس مرتب کیا اور جلسہ منعقد کیا ہے۔ بہر حال یہ کھیل تو احرار رضا کار مدت سے کھیلتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی نیا مشغلہ نہیں تھا۔

جامع مسجد دہلی کے جنوبی دروازے کے سامنے تمام سیاسی جماعتوں کے دفاتر تھے۔ ہر دفتر پر اس جماعت کا پرچم لہراتا تھا۔ ایک عجیب سماں تھا جو دیکھنے کے قابل ہوتا۔ مجلس احرار اسلام کا دفتر بھی یہیں پر تھا۔ ایک دن میں سرخ وردی میں ملبوس دفتر احرار میں اکیلا بیٹھا تھا کہ ضیغم احرار حضرت شیخ حسام الدین رحمتہ اللہ علیہ دفتر میں تشریف لائے۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شیخ حسام الدین ہیں انہوں نے قریب آ کر السلام علیکم کہا اور خود اپنا تعارف کرایا۔ نہایت دھیمے اور نرم لہجے میں فرمایا "مجھے حسام الدین کہتے ہیں"۔ میں سراپا عقیدت اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو انہوں نے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا۔ میں انہیں اپنے قریب پا کر نہایت خوش تھا کہ وہ بھی ان شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے زندہ باد کے نعرے عموماً ہم لگایا کرتے تھے۔ یہ ان سے پہلی ملاقات تھی وہ کچھ اس طرح ملے کہ جیسے وہ مجھ سے کم تر شخصیت ہوں۔ ان کی عجز و انکساری سے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ شاید مجھ سے خوفزدہ ہیں۔ وہ اس طرح آہستہ آہستہ مجھ سے بات کرتے کہ جیسے مجھ سے مرعوب ہوں۔ لیکن بعد میں دہلی میں منعقد ہونے والے جلسوں میں جوانہیں دیکھا اور سنا تو ان کی تقریر کی گھن گرج سے دہلی کے در و دیوار لرزتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انگریزی سامراج کے خلاف ایک للکار جو زمین سے آسمان تک کی فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ ایسے میں اکثر یہی سوچتا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو مجھے دفتر احرار میں ملا تھا۔ اپنوں کے لئے نرمی اور کفر کے لئے اس بلا کی سختی تو دفعتاً ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر ذہن میں ابھرتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

بلی ماراں کے عقب میں مشرق کی جانب ایک بہت ہی مشہور کوچہ "کوچہ رحمان" ہے جس میں ایک بہت ہی بڑے وسیع مکان میں تمام احرار رہنما قیام پذیر تھے۔ یہیں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تشریف فرما تھے۔ میں اکثر چھٹی کے بعد گھر پر بستہ رکھ کر چلا آتا یہاں اکابر احرار کی گفتگو سے محظوظ ہوتا اور حضرت امیر شریعت کی محافل کا لطف اٹھایا کرتا۔ شاہ جی اب مجھے میرے نام سے پکارتے۔ شبیر بیٹا کہتے اور بعض اوقات کسی کام کے لئے بھی کہہ دیتے جیسے گھر میں بڑے بچوں کو بازار کے کام کے لیے کہہ دیتے ہیں۔ یہ روز کی ملاقاتیں مجھے ان کے بہت قریب لے آئی تھیں۔ اکثر جب آپ گفتگو سے فارغ ہوتے تو مجھے جسم دبانے کے لئے کہتے۔ میں ان کی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پکڑ کر ان کی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر انہیں دبایا کرتا تھا۔ اس دوران وہ اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے مجھے محظوظ فرمایا کرتے۔ ایک دن لتاڑتے ہوئے اچانک میرا پاؤں ان کے پیٹ پر پڑا تو مسکرا کر فرمانے لگے" یوں نہیں بیٹا! یہ چوری وار کرتے ہو۔ چوری وار کرنا مردوں کا شیوا نہیں ہے۔ مرد تو للکار کر حملہ آور ہوتے ہیں" مجھے فرمانے لگے اب میرے پیٹ پر اپنے دونوں پاؤں رکھو۔ میں نے تعمیلِ ارشاد میں جب اپنا پاؤں ان کے پیٹ پر رکھا تو آپ نے اپنا پیٹ اس اثنا میں پھلا کر کس لیا تھا جو میرے پاؤں رکھنے کے باوجود مجھ سے نیچے نہ دبایا جا سکا۔ پھر انہوں نے مجھے دوسرا پاؤں بھی اپنے پیٹ پر رکھنے کے لیے کہا میں نے اپنا دوسرا پاؤں بھی ان کے پیٹ پر رکھ دیا۔ حکم ہوا کہ اب میرے پیٹ کو نیچے دباؤ لیکن میرے زور لگانے کے باوجود بھی پیٹ نیچے نہ دبا تو ہنس دئیے اور دیر تک میرے ساتھ باتوں میں مصروف رہے۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے یہ سب کچھ وہ میرے لئے کرتے تھے۔ یہ ان کا مزاج تھا کہ وہ اپنے مخاطب کی عمر کے مطابق اس سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اسے اس دوران کبھی یہ احساس نہ ہوتا یا پھر وہ کسی کو یہ احساس نہ دلاتے کہ وہ کتنے عظیم انسان ہیں؟ وہ بچوں کے ساتھ بچوں والی حرکتیں کر کے یہ تاثر دیتے کہ گویا وہ بھی ان جیسے بچے ہی ہیں۔ میں نے اکثر و بیشتر ان کی مجالس میں دیکھا کہ جب بھی ان کی محفل مین کوئی بچہ آ جاتا تو وہ سب سے توجہ ہٹا کر اس بچے کی طرف متوجہ ہوتے اپنی زبان کو توتلہ کر کے اس سے باتیں کرتے۔ وہ خواہ جتنی بھی اہم بات کر رہے ہوتے اسے روک کر آنے والے بچے کے ساتھ باتیں کرتے یہ باتیں بعض اوقات کافی وقت لے لیتی تھیں۔ یہ باتیں ایسی پیاری ہوتی تھیں کہ سننے والا ان باتوں سے کئی سبق حاصل کرتا تھا۔ اور کبھی بور نہ ہوتا تھا۔ کوئی عالم دین تشریف لے آتے تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری بطور عالم دین اس کے ساتھ ہمکلام ہوتے تھے۔ اب سیرت، فقہ، حدیث، قرآن، تفسیر موضوعِ گفتگو بن جاتے امیر شریعت کو کئی مفسرین و مترجمین کے قرآن کے تراجم از بر تھے۔ وہ ایک آیت کا ترجمہ مختلف مترجمین کے حوالے سے کرتے اور کہتے کہ جو اس مفسر و مترجم حضرت صاہ عبدالقادر دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے ترجمے میں بات پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے کے ترجمہ میں نہیں ہے۔ علماء حضرات جو اس دوران آپ سے ہمکلام ہوتے تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ اب میں اکثر سوچتا ہوں یہ سب کچھ وہ بیان کرتے جو کہا کرتے تھے

۔ کہ "میں نے تو اپنی کتابوں کی گرد جھاڑ کر بھی نہیں دیکھی۔ جو احترام علماء حضرات کا آپ کرتے تھے وہ فقط آپ کا ہی حصہ ہے۔ آپ کی محافل کا عجیب رنگ ہوتا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا۔ اسی دوران شاعر اگر آجاتے تو اب سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک شاعر نظر آتے۔ نظم، غزل، مرثیہ، قطعہ، دوہا، رباعی، نعت، منقبت غرضیکہ شاعری کی وہ کونسی صنف ہے جو زیر بحث نہ آتی۔ اور سننے والے اس سے لطف اندوز نہ ہوتے۔ علم و ادب کا ایک خوبصورت بازار سج جاتا تھا۔ دیکھنے سننے والا حیران و ششدر رہ جاتا کہ امیر شریعت ادب و فلسفہ میں بھی ایسی مہارت تامہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ادیب و شاعر آپ کی ہر بات اور آپ کی نکتہ آفرینیوں پر سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے انہیں شعراء کا کلام سناتے ہوئے بھی دیکھا اور شعراء کو اپنا کلام سناتے ہوئے بھی دیکھا۔ بڑے بڑے شاعران کے سامنے کلام پڑھتے تو ایک عجیب کیفیت میں محو ہو جاتے۔ امیر شریعت کچھ اس انوکھے انداز سے داد دیتے کہ شاعر تڑپ اٹھتا ایک اچھے شعر کے بارے میں دس پندرہ منٹ تک گفتگو ہوتی رہتی فرماتے کہ یہ شعر آپ کا بہت ہی عمدہ ہے۔ غالباً غالب نے اسی مفہوم کو اس طرح سے ادا کیا ہے لیکن جو بات نظیری کے اس شعر میں ہے وہ کسی میں بھی نہیں ہے۔ فارسی شعراء میں غالب، اقبال کے ساتھ ساتھ حافظ، فردوسی، اور بیدل کے سینکڑوں شعر آپ کو زبانی یاد تھے۔ آپ شعر پڑھتے تو سننے والا حیرت میں ڈوب جاتا کہ یہ وہی شخص ہے جو کچھ تھوڑی دیر پہلے علم فقہ، حدیث اور تفسیر پر علماء کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیصل آباد میں مدرسہ اشرف المدارس کے سالانہ جلسہ پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ گورونانک پورہ گلی نمبر ۱۱ کے ایک مکان کی بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ حافظ لدھیانوی تشریف لائے تو آپ کے چہرے پر ایک خاص چمک دیکھی۔ چند منٹ تو خیریت معلوم کرنے میں گزر گئے بعد میں آپ نے فرمائش کی کہ حافظ بیٹے کچھ سناؤ" حافظ لدھیانوی انہیں اپنا کلام سناتے رہے اور شاہ جی اپنے انداز میں انہیں داد دیتے رہے۔ اتفاقاً میں اور حافظ لدھیانوی ایک ہی وقت میں ان کی پرلطف محفل سے اٹھ کر باہر آئے تو حافظ لدھیانوی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہہ رہے تھے۔

> "نہ جانے یہ کیا شخصیت ہے کہ انسان کو مبہوت کر دیتی ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں بیٹھے اور کیا کر رہے ہیں۔ شعر کو سمجھنا اور شعر پر داد دینا کچھ شاہ جی پر ختم ہے۔ یہ انداز بہت ہی عجیب اور انتہائی منفرد ہوتا ہے۔ ایسی کیفیت میں شاعر محو ہو جاتا ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔"

کوچہ رحمن کے اسی مکان جس کا تذکرہ اوپر ہو رہا تھا میں نے امیر شریعت اور علامہ انور صابری مرحوم کو آمنے سامنے بیٹھے فی البدیہہ شعر کہتے بھی دیکھا ہے۔ علامہ انور صابری اپنے سامنے سگریٹوں کا ایک ڈھیر لگائے بیٹھے تھے۔ کاغذ آپ کے سامنے دھرا تھا اور کش پہ کش لگاتے ہوئے شعر پہ شعر لکھتے جا رہے تھے۔ شاہ جی ان کے سامنے بیٹھے ان کے اشعار پر داد دیتے جا رہے تھے۔ باقی سب لوگ یہ نظارہ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ مجھے

اس دن پتہ چلا کہ انور صابری شعر کس طرح کہتے ہیں۔ ان کے دماغ میں گویا کوئی شعر ساز فیکٹری ہے جس میں شعر ڈھل ڈھل کر ان کی زبان پر منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ایک بچہ تھا دیکھ کر حیران تھا کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو شعر گوئی جیسے مشکل فن پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ گویا شعر کہنا ان کے لئے کوئی کام ہی نہیں ہے؟

شعر گوئی اور شعر فہمی سے حضرت امیر شریعت کو ایک فطری اور خصوصی لگاؤ تھا۔ غالب اور اقبال از بر تھے۔ تقریر کے دوران شعر پڑھنا کوئی ان سے سیکھے۔ یوں محسوس ہوتا کہ شاعر نے یہ شعر اسی موقع کے لئے لکھا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ فیصل آباد جو اس وقت لائل پور ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں سکھر جیل سے ایک سال قید کے بعد رہا ہو کر آئے تھے تقریر کے دوران سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس بیان پر تنقید کر رہے تھے جو انہوں نے منیر انکوائری کمیشن کے سامنے دیا تھا جو کچھ اس طرح کا تھا۔

"میں نے تو انہیں (مجلس عمل والوں کو) منع کیا تھا کہ تحریک نہ چلائی جائے لیکن انہوں نے تو میری مانی ہی نہیں۔ میں تحریک چلانے کے خلاف تھا۔ میری مثال تو اس مسافر کی سی ہے جو سڑک کے کنارے چلا جا رہا ہو ایک ٹرک پیچھے سے آئے اسے اپنی لپیٹ میں لے کر روندتا ہوا آگے نکل جائے"

شاہ جی نے اپنی تقریر کے دوران مودودی صاحب کے اس بیان پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ جس وقت ہم نے مجلس عمل کے تحت تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تھا مودودی صاحب اس فیصلے میں موجود تھے۔ یوں ان کے گھٹنے کے ساتھ میرا گھٹنا تھا۔ وہ اس فیصلے میں میرے اور میرے دوسرے ساتھیوں اور تمام علماء کے ساتھ شریک مشورہ تھے۔ اب اس بات سے اگر وہ مکر گئے ہیں تو ہم کیا کریں؟" اس پر آپ نے ایک شعر پڑھا۔

حضرت ناصح نے مے پی کے یہ اچھی چال کی
"محتسب" سے جا ملے رندوں کے "مخبر" ہو گئے

غالب کے شعر آپ کو خاص طور پر بڑے پسند تھے۔ اکثر و بیشتر اپنی تقاریر اور نجی محافل میں پڑھتے اور کچھ اس انداز سے کہ سننے والوں پر سحر طاری ہو جاتا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کافی عرصہ تک دہلی میں مقیم رہے۔ روزانہ کسی نہ کسی جگہ پر مجلس احرار اسلام اور جمعیت العلماء ہند کا ایک مشترکہ اجتماع ہوتا تھا۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے۔ ان جلسوں میں میں بھی مجلس احرار اسلام کے ایک رضا کار کے طور پر شریک ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی جلسے میں احرار رضا کاروں نے مسلم لیگیوں کی پٹائی بھی کی تھی۔ یہ جلسہ لیگ کے گڑھ "بل بنگش" کے علاقے "جناح پارک" میں ہوا تھا۔ ایک مسجد کے سامنے ایک بڑا ہی وسیع میدان تھا۔ جسے پنڈال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس کے ارد گرد کچی دیوار تھی۔ دیوار کے ارد گرد احرار اسلام کے جاں نثار ہزاروں باوردی رضا کار اپنی

اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ میری ڈیوٹی مسجد کے اوپر اس کی چھت پر لاوڈ سپیکر کے ایک مائیک پر تھی۔ میں چونکہ بلندی پر تھا اس لئے پوری جلسہ گاہ میرے سامنے تھی اور میں ایک بڑی ہی اچھی جگہ سے سارے جلسے کا نظارہ کر رہا تھا۔ جلسے سے شوش کاشمیری، مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمتہ اللہ علیہم کے علاوہ امیر شریعت نے بھی خطاب کیا تھا۔ مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کو پہلی مرتبہ اسی جلسہ میں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ کیا تقریر تھی کہ آج تک اس کی گونج میرے ذھن میں محفوظ ہے۔ بڑے ہی تیز بولنے والے مقرر تھے۔ احرار میں اتنی تیز بولنے والا کوئی مقرر نہیں تھا۔ صاحبزادہ فیض الحسن کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ احرار مقررین میں سب سے زیادہ تیز بولتے تھے لیکن مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کے مقابلے میں وہ بھی ماند تھے کیا غضب کے مقرر تھے۔ اتنی تیزی کے ساتھ تقریر کرنے والا میں نے ساری زندگی میں نہیں سنا۔ تقریر کیا کرتے یوں محسوس ہوتا کہ کوئی مردِ مجاہد میدان کارزار میں اپنے دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا رہا ہو۔ الفاظ آپ کی زبان سے اتنی تیزی اور تسلسل کے ساتھ نکلتے تھے جیسے کوئی مشین گن گولیوں کی بوچھاڑ کر رہی ہو۔ بلا کی کشش اور غضب کی گرفت تھی۔ مولانا احمد سعید دہلوی کو بھی پہلی مرتبہ اسی جلسے میں ہی سنا اور دیکھا۔ کیا خوبصورت چہرہ تھا۔ شرافت اور متانت کی بولتی تصویر دکھائی۔ جلسے کے ارد گرد مسلم لیگی بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے جو مخالفانہ نعرہ بازی کر رہے تھے جس کی وجہ سے مقررین کو تقریر کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مولانا حفظ الرحمن اور مولانا احمد سعید نے تو ان حالات میں اپنی تقریر جاری رکھی لیکن جب آغا شورش کاشمیری نے تقریر شروع کی تو وہ بھلا مخالفت میں نعرہ بازی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ آغا صاحب نے صورتِ حالات پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے احرار رضاکاروں کو انہیں بھگا دینے کا حکم صادر فرمایا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں اوپر چھت سے اس پٹائی کا نظارہ کر رہا تھا جو احرار رضاکاروں نے ان لیگی نعرہ زن افراد کی کی تھی۔

آغا صاحب کے بعد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر تھی۔ اس جلسے مین بھی آپ نے قیامِ پاکستان کے حوالے سے اپنے ان خدشات کا اظہار کیا جو آپ عموماً ان دنوں کی تقریریں میں کیا کرتے تھے۔ یہ خدشات قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگی قیادت نے اپنی ضد اور حماقت سے پورے کر کے دکھا دیئے ہیں اور جو باقی رہتے ہیں وہ بھی ان سے توقع ہے کہ خدانخواستہ ضرور پورے کریں گے۔

اسی طرح کا ایک جلسہ ہمارے محلہ بلی ماراں میں بھی ہوا۔ جس کو اس وقت کے سپرنٹنڈنٹ پولیس "مسٹر ٹیل" نے اشک آور گیس اور لاٹھی چارج کے ذریعہ سے درہم برہم کر دیا تھا۔ یہ انگریز ایس۔ پی یقیناً وہی ہے جس نے ۱۹۳۹ء کی تحریک قومی بھرتی بائیکاٹ کے دوران ملتان کے جلسہ عام میں شورش کاشمیری کو دورانِ جلسہ تقریر کرتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ یہ لاٹھی چارج بھی انتہائی شدید تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ لوگ بیچارے جوتے اتار کر اور قمیض اتارے ہوئے دریوں پر بڑے آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ جی ابھی جلسہ گاہ

میں تشریف نہیں لائے تھے۔ انور صابری سٹیج پر اپنی نظم پڑھ رہے تھے۔ کہ پولیس نے بلا متنبہ کئے مجمع پر لاٹھی چارج کر دیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے۔ کئی افراد زخمی بھی ہوئے جس کو جہاں پناہ ملی اس جگہ کو غنیمت سمجھ کر وہیں دبک گیا۔ میں بھی ایک مکان کی سیڑھیوں میں پناہ گزیں ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انور صابری بھی وہیں پر مجھ سے پہلے موجود تھے۔ موٹے جسم کے آدمی گرمی بے تحاشا ان کا سانس اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ تمام لوگوں کو بڑی آسانی سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ بہر حال پولیس جب اپنا کام کر کے وہاں سے رخصت ہوئی تو ہم لوگ سیدھے اس مکان پر پہنچے جہاں امیر شریعت قیام پذیر تھے۔ وہاں پر موجود سب لوگوں کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ جلسہ پولیس تشدد کی نذر ہو چکا ہے۔ میرے بعد جلد ہی انور صابری صاحب بھی اسی مکان پر تشریف لائے۔ ہانپتے کانپتے ہوئے، ش سانس پھول رہی تھی۔ گرمی سے برا حال تھا۔ شاہ جی کو خطاب کرتے ہوئے کہا

"مروا دیا شاہ جی آج تو آپ نے واقعی ہی مروا دیا۔ پولیس ظالم نے اتنا شدید لاٹھی چارج کیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ظالموں کو ذرہ ترس نہیں آیا نہ جانے کتنے لوگ زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ تو غالباً پہلے ہی بھانپ گئے تھے اسی لئے جلسہ گاہ میں تشریف نہیں لائے"؟

شاہ جی انور صابری کی اس تقریر پر مسکرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے

"احرار کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے ہو تو ذرا ہمت سے کام لو ہمارے ساتھ تو نہ جانے کب سے یہ کام ہو رہا ہے اور نہ جانے کب تک ہوتا رہے گا؟"

ہم جلسہ کے درہم برہم ہونے کے بعد کافی دیر تک شاہ جی کے ساتھ اس مکان میں محو گفتگو رہے اور بھی بہت سے لوگ وہاں پر موجود تھے۔ میرے والد محترم جناب نذیر مجیدی مرحوم بھی میرے ساتھ اس وقت موجود تھے۔ ہم گھر سے اکٹھے ہی جلسے میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ جب بھی ہم اٹھ کر جانے کی کوشش کرتے تو لوگ یہ کہہ کر ہم دونوں کو روک دیتے کہ باہر پولیس والے موجود ہیں اور لوگوں کو تنگ کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو گرفتار بھی کر چکے ہیں۔ لہذا ذرا کچھ دیر اور رک جاؤ! ہم پھر بیٹھ جاتے لیکن آخر جب رات ڈھل گئی تو مجھے والد صاحب نے کہا کہ "آؤ اب چلیں" کوچہ رحمٰن سے ہمارا گھر کچھ زیادہ دور نہیں تھا لیکن حالات کی کشیدگی کی وجہ سے ایک ان جانا سا خوف میرے دل و دماغ پر ضرور تھا۔ میں ساتویں جماعت کا طالب علم بھلا کہاں تک بہادر ہو سکتا تھا؟ جب ہم باپ بیٹا دونوں مکان سے باہر آئے تو ایک آدمی ہمیں سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس نے ہمارے قریب آتے ہی میرے والد صاحب سے کہا بچے کو سرخ قمیض پہنا کر کہاں لئے جا رہے ہو پولیس تو سرخ قمیض والوں کو تلاش کر رہی ہے کیا بچے کو گرفتار کروانے کا ارادہ ہے؟ میں ڈر کر رک گیا اور فوراً ابا جی سے کہا کہ ابا جی میں قمیض اتار دوں" مجھے والد صاحب کا جواب آج تک یاد ہے فرمانے لگے۔

"یا تو سرخ قمیض پہنتے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ سرخ قمیض اب انگریز دشمنی

کی علامت بن چکا ہے اور اگر ایک مرتبہ پہن لی جائے تو اسے اتارتے نہیں۔ لہذا اب خواہ کچھ ہو جائے تم اسے نہیں اتار سکتے، خدا پر بھروسہ رکھو اور چلو؟"

چنانچہ ہم پولیس والوں سے بچ بچا کر بخیریت اپنے گھر پہنچ گئے لیکن میں نے وہ سرخ قمیض اس وقت اتاری اور نہ ہی آج تک اسے اتارا ہے وہ یوں کہ میں آج بھی تحریک احرار سے اسی طرح متاثر ہوں جس طرح اس وقت تھا بلکہ اب میں زیادہ پختگی کے ساتھ اس پر قائم ہوں، میرا ایمان ہے کہ احرار کی یہ اسلامی تحریک برصغیر کی وہ پہلی اسلامی انقلابی تحریک ہے جس نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنی لڑائی لڑی۔ اس کے دو بڑے محاذ تھے۔ ایک جنگ آزادی دوسرا احیاء و نفاذ اسلام، اس تحریک کو بہ ظاہر ختم کرنے میں دو بڑی سرمایہ دار جماعتوں کا یکساں کردار ہے جن کو عرف عام میں مسلم لیگ اور کانگریس کہتے ہیں۔ جن کو نہ تو اسلام قبول تھا اور نہ ہی غریب، احرار آج بھی اسی مقام پر موجود اور اسی مؤقف پر قائم ہیں جو ان کے اکابر نے ان کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان عزائم اب بھی بلند ہیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یا پھر میرا اپنا ایک شعر اسی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

ہے ناؤ شکستہ سی اور بادِ مخالف بھی
پر عزم جواں اپنا آئے تو بھنور آئے

ایک دن میں کوچہ رحمٰن کے اسی مکان میں موجود تھا۔ اس وقت احرار کابینہ کے تمام مقتدر رہنما میرے سامنے موجود تھے۔ جن میں شیخ حسام الدین، شورش کاشمیری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہاں البتہ آج ان میں ایک شخصیت کا اضافہ تھا۔ یہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھے جن کو میں نے پہلی دفعہ اسی روز دیکھا تھا۔ کیا پر رعب شخصیت تھی۔ عینک کے بھاری شیشوں کے نیچے سے بڑی عقابی آنکھیں اتنی پُر ہول تھیں کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ یہ سب رہنما ایک دائرہ میں فرش پر بچھی دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص تحفتاً کچھ خربوزے لیکر آیا۔ خربوزے اس کے اپنے کھیت کے تھے۔ اور تھے بھی اعلی قسم کے۔ ایک ایک خربوزہ کے آگے رکھ دیا گیا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خربوزے کو کاٹا اور کھانا شروع کیا۔ شورش کاشمیری نے بھی اپنا خربوزے کو کاٹا اور کھانا شروع کیا تو میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات کچھ اچھے نہ تھے۔ شاید خربوزہ میٹھا نہ تھا۔ اسی دوران حضرت امیر شریعت نے اپنا خربوزہ کاٹ کر کھایا تو آپ نے چکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں اللہ تعالی کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا۔ شورش بھانپ گئے کہ شاہ جی کا خربوزہ بہتر ہے۔ خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ شورش نے بھی اپنے خربوزے کی تعریف شروع کر دی۔ واہ کیسا میٹھا ہے اور کیسا خوشبودار اس کے ساتھ ہی شورش اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے

خربوزے کو اٹھا کر شاہ جی کے سامنے رکھ دیا اور شاہ جی کے سامنے سے ان کا خربوزہ اٹھا کر اپنے آگے رکھ کر کھانا شروع کر دیا۔ اب جو شاہ جی نے شورش والے خربوزے کو کاٹ کر چکھا تو سب کچھ بھانپ گئے۔ مجھے اچھی طرح اب یاد ہے کہ شاہ جی کے منہ کے ساتھ خربوزے کی پھانک لگی ہوئی ہے اور شاہ جی کی آنکھیں شورش کے چہرے پر اور پنجابی میں کہہ رہے ہیں۔

"پُتّر پیو نال وی داکھیڈ گیاں ناں؟"

شاہ جی کا یہ کہنا تھا کہ شورش کھکھلا کر ہنس پڑا جس کے ساتھ ہی ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔ اب سوچتا ہوں کہ یہ سب کیسے عظیم لوگ تھے اور کیسی محفلیں تھیں آپس میں کس طرح شیر و شکر اور دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔ یقیناً جو لوگ آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں وہی کفار کے مقابلے میں سخت جان ثابت ہوتے ہیں۔ اکابر احرار اشدآء علی الکفار رحماء بینهم کی عملی تفسیر تھے

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اسی طرح ایک دوسرے روز کی بات ہے کہ ہم سب اسی مکان میں بیٹھے تھے کہ شورش نے بار بار کہنا شروع کر دیا۔ کہ "چلو شاہ جی چلیں" دو ایک بار تو شاہ جی نے شورش کی بات پر کچھ توجہ نہ دی لیکن جب شورش کا اصرار زیادہ ہو گیا تو کہنے لگے "اچھا بھائی چلتے ہیں" جیسے شاہ جی کا اپنا جی نہ ہو اور مجبوراً ہاں کہہ رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ شورش شاہ جی کو کہیں لیکر جانا چاہتے ہیں۔ پھر شورش نے کہا کہ شاہ جی ملاقات کا وقت قریب آ گیا ہے اٹھیں اور تیار ہو جائیں۔ شاہ جی اٹھے اور اپنے موٹے کھدر کی شلوار قمیض کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

"اس گاندھی کی بھی سن لو، لوگوں کو کہتا پھرتا ہے کہ کھدر پہنو۔ اور خود اس نے ساری زندگی کھدر کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ پوری زندگی ململ کی ایک لنگوٹی میں بسر کر دی۔ اب لوگ ہیں کہ موٹا کھدر پہن رہے ہیں۔ میری طرف ہی دیکھو یہ قمیض تقریباً چار سیر کی تو ہو گی اور اتنی ہی بھاری یہ میری شلوار ہے"

حضرت شاہ جی شلوار قمیض پہن کر شورش کے ساتھ چلے گئے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی کے ساتھ ملاقات کا وقت ہے۔ اس لئے شاہ جی اسے ملنے کے لئے شورش کے ساتھ گئے ہیں۔ شورش نے اپنی کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کے دوسرے ایڈیشن میں یہ واقعہ ذرا تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے جس سے تائید ہو گئی ہے کہ آپ دونوں گاندھی کو ہی ملنے گئے تھے۔ دہلی میں ان دنوں تقریباً ہر مشہور مقام پر جمیعتہ العلما ہند اور مجلس احرار اسلام کے اشتراک سے جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ غالباً مدنی فارمولا کی حمایت میں ان جلسوں کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ "مدنی فارمولا" کے بارے میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ جب ان دونوں جماعتوں کی جانب سے اتفاق رائے کے ساتھ بجائے پاکستان مدنی فارمولا پنڈت نہرو کو پیش کیا گیا

تو اس نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اس سے بہتر یہ ہے کہ ہم پاکستان کی تجویز تسلیم کر لیں کیونکہ یہ فارمولا تو ہندوستان کے ہندوؤں کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا!

دہلی کے یہ متحدہ اجتماعات اسی تجویز کو شاید مؤثر بنانے کے لئے کئے جا رہے تھے۔ یہ وقت ہندوستان کی سیاست میں انتہائی مشکل، تیز اور نہایت اہم مرحلہ تھا۔ ہر سیاسی جماعت اپنی حیثیت کے مطابق پہلے سے زیادہ فعال تھی اور اپنے اپنے مؤقف کے بارے میں بڑی تگ و دو میں مصروف نظر آتی تھی۔ تاکہ ہندوستان کے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق اپنے حق میں فتح کر سکیں۔

مجلس احرار کا آخری اور سب سے بڑا جلسہ دہلی کے اردو پارک میں اپریل ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اس میں کہی گئی باتیں آج حرف حرف صحیح اور درست ثابت ہوئی ہیں۔ سب سے اہم تقریر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تھی۔ اردو پارک کے وسیع و عریض میدان میں شاہی مسجد کے عین سامنے سٹیج لگایا گیا تھا۔ سٹیج کی پشت پر دہلی کے لال قلعے کی عظیم الشان فصیل ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ لوگوں کا بے مثال اجتماع جسے بلاشبہ انسانوں کا سمندر کہا جا سکتا ہے۔ شاید میری زندگی کا یہ سب سے بڑا جلسہ تھا تاحد نگاہ انسان ہی انسان تھے۔ جن کو احرار کے ہزاروں رضاکاروں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سٹیج بہت اونچا اور بڑا وسیع بنایا گیا۔ مجلس احرار اسلام کے تمام اکابر سٹیج پر فروکش تھے۔ شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، ماسٹر تاج الدین انصاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شورش کاشمیری، نواب زادہ نصر اللہ خان، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (اگرچہ وہ جماعت کو چھوڑ چکے تھے۔ لیکن جلسہ سننے کے لئے تشریف لائے۔ وہ کبھی کبھار کوچہ رحمان میں احرار رہنماؤں کے پاس تشریف لاتے تھے)۔ لیکن یہ سب رہنماء ایک عظیم رہنما کا انتظار کر رہے تھے اور وہ تھے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ شاہ جی سب سے آخر میں تشریف لائے تو شرکاء جلسہ جھوم اٹھے عجیب و غریب سماں ان کی آمد پر دیکھنے میں آیا پورا مجمع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے پوری فضاء گونج اٹھی۔ اسی گونج میں شیخ حسام الدین (جو سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے) کی آواز بلند ہوئی جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہو آپ نے کہا!

"میں احرار رضاکاروں کو حکم دیتا ہوں کہ جلسے کے انتظام و فرائض میں کوئی کوتاہی نہ ہو، جس شر پسند کا سر جہاں سے اٹھے اسے وہیں کچل دیا جائے اور ہاں یاد رہے کہ کلہاڑی سیدھی پڑنی چاہیئے حالات کا میں خود ذمہ دار ہوں"

یہ آواز پورے ماحول میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی۔ شاہ جی نے چند تقاریر کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر درود شریف پڑھنے کے لیے کہا۔ خود بھی درود شریف پڑھتے رہے، لوگ حیران تھے کہ شاہ جی کا یہ آغاز ان کے معمول کے مطابق نہیں تھا۔ دفعتاً امیر شریعت نے فرمایا کہ میں نے دانستہ درود شریف پڑھوایا ہے

کیونکہ مجھے یقین ہے کہ صبح کو ہمارے مخالفین نے اپنے اخباروں میں یہی کچھ لکھنا ہے کہ عطاء اللہ شاہ نے اگرچہ لاکھوں کے مجمع کو خطاب کیا لیکن ان میں مسلمان ایک بھی نہیں تھا۔ سب غیر مسلم اکٹھے کر رکھے تھے۔ اب کم از کم وہ یہ بات نہیں لکھ سکیں گے۔ لاکھوں نے خود درود شریف پڑھا اور سنا ہے۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بحمدہ مجمع مسلمانوں کا ہے جو بخاری کی باتیں سننے کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی تاریخی تقریر کا آغاز باقاعدہ خطبہ مسنونہ کے ساتھ کیا اور یوں پوری رات آپ نے اس عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرنے میں بسر کر دی۔ تقریر کیا تھی شاہ جی کی سیاسی بصیرت اور روحانی عظمت کا ایک حسین مرقع جس میں آپ نے آنے والے سیاسی حالات کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار فرمایا تھا۔ جو وقت نے صحیح اور درست ثابت کر دیئے ہیں۔ پاکستان بنے ۴۷ سال بیت چکے ہیں لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں ایک بات بھی ایسی ہوئی ہو جس سے بخاری کی تردید ہوئی ہو۔ میں خود جلسہ گاہ میں موجود تھا۔ مجھے سٹیج کے ایک گوشے میں بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر میں جلسہ گاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے شاہ جی کا چہرہ تھا۔ جس سے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرے بالکل قریب بیٹھ کر تقریر کر رہے ہوں۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی کے پہلے فقرے کچھ اس طرح تھے۔

"مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جیسے اس بات پر کہ صبح کو مشرق سے سورج طلوع ہونے والا ہے۔ جو اس وقت مسلمانان پاک و ہند کے دل و دماغ میں پاکستان کا جو نقشہ موجود ہے۔ وہ حقیقت سے بالکل مختلف ہو گا۔

وہ پاکستان کیا ہو گا؟ اس پر ساری رات آپ نے تقریر فرمائی۔ لوگ سنتے رہے اور سر دھنتے رہے۔ وہ تاریخی لمحات گزر گئے لیکن جو جو باتیں آپ نے فرمائیں وہ ایک ایک پوری ہو کر رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو نتائج سامنے آئے ہیں ان سے شاہ جی کی کہی ہوئی باتوں کی تائید ہوتی ہے۔ قائدین تحریک پاکستان چاہتے تو ان خدشات کو سامنے رکھ کر اس دھرتی پر حکومت کر سکتے تھے۔ اور ان خطرات سے ملک محفوظ بھی رہ سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

ہے حقیقت بس وہی جو تو نے کر دی تھی عیاں
اور سب کچھ وقت کی آنکھوں میں تھا مثل سراب
تجھ پہ جو الزام تھا رد ہو گیا ہے وقت سے
تیرے نکتہ چیں ہوئے ہیں شرم سے اب آب آب

اس تاریخی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا

"بھائی بات لڑنے اور جھگڑنے کی نہیں سمجھنے کی ہے۔ تم ایک ملک پر اسلام کی حکومت کی بات کرتے ہو۔ مجھے تم اس بات کا یقین دلا دو کہ کل کو کسی گاؤں کے کونے پر اسلام نافذ ہونے والا ہے۔ تو میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن جو لوگ اپنی ڈھائی من کی

لاش اور چھے فٹ کے قد پر اسلام نافذ نہیں کر سکتے۔ جن کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، وضع قطع، لین دین، شکل و صورت، لباس و معاملات، طور طریقے، کچھ بھی اسلام کے مطابق نہیں ہے ان سے میں کیسے توقع رکھوں کہ وہ ایک ملک پر اسلام کی حکومت قائم کر دیں گے۔ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

تم یہ ملک چلاؤ گے کیسے۔ مجھے یہ تو سمجھا دو (کلہاڑی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اسے بلند کر کے کہا) یہ ہمارا مشرقی پاکستان ہو گا۔ اور یہ مغربی پاکستان۔ درمیان میں ہزاروں میلوں پر مشتمل ہندوؤں کی حکومت ہو گی۔ ہندو، کون ہندو؟ مکار ہندو، عیاش ہندو جن کو تم نے اتنے لمبے عرصے تک غلام بنائے رکھا وہ تم سے اس کا انتقام لیں گے۔ تمہیں طرح طرح سے تنگ کریں گے۔ کبھی تمہارے دریاؤں کا پانی بند کر دیا جائے گا۔ کبھی تمہاری سرحدوں پر فوج کھڑی کر دی جائے گی اور تمہاری حالت یہ ہو گی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان والے مغربی پاکستان کی مدد نہیں کر سکیں گے اور مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ جناح سے کہہ دو۔ یہ بات مجھے سمجھا دے کہ یہ ملک کیسے قائم رہے گا۔ بس ایک بار مجھے سمجھا دو۔ پھر تم گھر بیٹھ جانا میں اور میرے رضا کار تمہاری اس تحریک کو اکیلے کامیاب کر دیں گے۔ لیکن یہ تم سے نہ ہو سکے گا۔

"پاکستان کے اندر کیا ہو گا۔ چند خاندانوں کی حکومت ہو گی۔ وہ خاندان جو ٹوڈی خاندان کہلاتے ہیں۔ جاگیردار اور سرمایہ دار خاندان، ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے غریب، دن بہ دن غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں گے اور امیر، امیر سے امیر تر یہی چند خاندان اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر پورے ملک پر حکومت کریں گے اور غریبوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ اسلام ایک مسافر کی طرح ہو گا"

شاہ جی کی یہ تاریخی تقریر صبح تک جاری رہی۔ نماز فجر کی اذان کے ساتھ جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا۔ قیام پاکستان سے پہلے دہلی میں شاہ جی کی یہ آخری تقریر تھی۔

دہلی میں سیاسی فضا میں بلا کی کشیدگی تھی۔ ایک زبردست تموّج تھا۔ جلسے جلوس روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ مسلم لیگ، کانگرس، مجلس احرار اسلام اور دوسری سیاسی جماعتیں بڑی فعال نظر آتی تھیں۔ انگریزی حکومت نے یہ بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کے دن اب تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اگرچہ سیاسی جماعتوں کا موقف اور مشن ایک دوسرے سے جدا اور مختلف تھا۔ تاہم ایک بات سب میں مشترک تھی کہ ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ اختلاف اگر تھا تو اس بات پر کہ آزادی کی شکل کیا ہو، دوسری جنگ عظیم میں فتح انگریزوں کا مقدر ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں ہندوستان میں اپنی شکست بھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ محکمہ ڈاک کی ہڑتال، نیوی کے اندر زبردست ہڑتال، لوگوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی اور انگریزوں

کے خلاف ان کا اظہار نفرت، ان حکمرانوں پر عیاں ہو چکا تھا۔ دہلی کے حالات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگریز اپنا بوریا بستر باندھ رہا ہے۔ حکومت نے جاپان کی فتح پر جشن فتح منانے کا اعلان کر دیا۔ جشن فتح کی تیاریاں حکومت کی طرف سے بڑی دھوم دھام سے شروع ہو گئیں۔ لیکن اس جشن کو ناکام بنانے کے لئے بھی پروگرام وضع کر لئے گئے۔ جس روز جشن فتح کا اعلان تھا۔ اس روز شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ چاندنی چوک اور ماراں کی پوری آبادی جس میں ہندو، سکھ، اور مسلمان سبھی شامل تھے سڑکوں پر نکل آئے۔ لوگوں کی ٹولیاں ادھر ادھر انگریزوں کے خلاف نعرے لگاتی پھر رہی تھی۔ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں گئیں تاکہ پولیس کے تعاقب سے محفوظ رہا جاسکے۔ عوام نعرے لگاتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر سرکاری عمارت جس کو سجایا گیا تھا عوامی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہی تھی۔ درختوں پر لگائے گئے برقی قمقمے لوگوں کے ڈنڈوں کی زد میں تھے۔ رفتہ رفتہ جذبات میں شدت پیدا ہو گئی۔ سرکاری عمارتوں پر حملے کئے گئے، بجلی گھروں کو جلا دیا گیا۔ پولیس نے اشک آور گیس کی بارش کر دی تھی۔ لوگ اس پر بھی باز نہ آئے تو پھر کئی جگہوں پر گولی چلائی گئی کئی افراد ہلاک ہوئے اور سینکڑوں زخمی۔ ٹیلی فون اور بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے۔ بجلی کے کھمبے دوہرے کر دیئے گئے۔ غرضیکہ پورا دن پولیس اور لوگوں کے درمیان ایک مسلسل جنگ کی صورت برقرار رہی اور اسی کشمکش میں شام ہو گئی۔ لیکن روشنی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ پورا شہر دہلی تاریکی میں ڈوبا ہوا انگریزی ظلم و ستم پر ماتم کناں تھا۔ لیکن اس بات پر ہر شخص خوش بھی ضرور تھا کہ انگریزوں کا جشن چراغاں اندھیرے میں ڈوب چکا ہے۔ شاید یہ کیفیت ویسی ہی ہو، یہ اندھیرا اپنی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے ویسا ہی ہو جو ان دنوں تھا جب ہڈسن کی قیادت میں دہلی والوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی تھی۔ بے پناہ تشدد اور بے پناہ قتل و غارت کر کے دہلی والوں کو عتاب کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ لیکن آج کے اندھیرے اور ۹۰ سال پہلے کے اندھیرے میں ایک فرق ضرور تھا۔ کہ ظلم کی رات کے آغاز کا اندھیرا تھا اور یہ صبح صادق سے ذرا پہلے کا اندھیرا تھا اس غلامی کے اندھیرے کو آزادی کی روشنی میں تبدیل کرنے کے لئے ایک طویل اور انتھک جدوجہد، کو عمل دخل حاصل رہا۔ پاک و ہند کی غلام فضا میں سانس لینے والوں کو آزاد فضاؤں سے روشناس کرانے کے لئے نہ جانے کتنی قربانیاں دینا پڑیں۔ اس تگ و دو میں کتنی جوانیاں کام آئیں۔ کتنے بڑھاپے بے سہارا ہوئے اور نہ جانے کتنے سہاگ اجڑ گئے اور اس کوشش اور کاوش میں اللہ کے فضل و کرم سے مجلس احرار اسلام کا حصہ وافر ہے۔ مجلس احرار نے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ولولہ انگیز قیادت میں ایک نیا جوش پیدا کیا، انگریز دشمنی کا وہ بیج بویا کہ تشدد کے سائے میں بھی وہ اب تناور درخت بن چکا تھا۔ جس کو اکھاڑنا انگریزوں کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد ہم نے یہ سب کچھ بھلا دیا۔ کہ کتنی بڑی قربانیوں کے بعد اللہ نے ہمیں یہ نعمت عطاء کی تھی۔ اے کاش آزادی کی یہ نعمت احیائے اسلام اور اتحاد بین المسلمین کا ذریعہ بنتی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس پر جتنے بھی آنسو گرائے جائیں کم ہیں۔

جس صبح کا وعدہ تھا اس دیس کے لوگوں سے
اے کاش کبھی خالد وہ بھی تو سحر آئے

۱۹۴۶ء کے آخر میں ہم پنجاب (چنیوٹ) چلے آئے۔ چند روز رشتہ داروں کے درمیان رہ کر واپس دہلی جانے کا پروگرام تھا۔ والد محترم نذیر مجیدی دہلی میں اچھا بھلا کام کر رہے تھے۔ مکان اور کارخانہ جہاں ہمارے کاریگر جفت سازی کا کام کرتے تھے وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اللہ تعالی کو ہمارا دوبارہ دہلی جانا منظور نہیں تھا۔ مجھے تپ محرقہ ہوا اور طویل ہو گیا۔ میری تیمارداری اور بیماری دہلی واپس جانے کے راستے میں حائل ہو گئی۔ پھر فسادات تیز ہو گئے اور قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد غالباً ۱۹۴۷ء میں فیصل آباد (جو اس وقت لائل پور تھا) میں ایک بہت بڑی احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ چنیوٹ جسے پنجاب میں مجلس احرار اسلام کے اہم مرکز کی حیثیت حاصل تھی اس کانفرنس کی تیاریوں میں پیش پیش تھا۔ گردو نواح کی بستیوں سے بھی احرار رضا کار چنیوٹ پہنچ گئے اور ایک بہت بڑا جیش لائل پور کے لئے روانہ ہوا۔ دھوبی گھاٹ جو اب اقبال پارک کے نام سے موسوم ہے میں کانفرنس کا اہتمام تھا۔ وسیع پنڈال میں ہر جگہ مختلف شہروں سے آنے والوں جیوش کے خیمے لگے ہوئے تھے یہ پورا علاقہ احرارستان کا سماں پیش کر رہا تھا۔ غالباً دو روزہ کانفرنس تھی۔ صبح کو رضا کاروں کے مظاہرے شہر میں پریڈ اور رات کو اجتماع ہوئے۔ جلسہ گاہ میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا ہمارے شہر کے ایک رضا کار محمد حسین اور چند دوسرے رضاکاروں کی گیٹ پر ڈیوٹی تھی شاہ جی جب اپنے ساتھ کافی لوگوں کے ہمراہ گیٹ پر اندر داخل ہونے کے لئے تشریف لائے تو محمد حسین نے شاہ جی سے داخلہ ٹکٹ طلب کر لیا جو غالباً ایک روپے کے عوض دستیاب تھا۔ شاہ جی نے کہا کہ بھائی ٹکٹ تو میرے پاس نہیں ہے جواب میں محمد حسین نے کہا کہ پھر جائیے اور ٹکٹ لے کر آئیے شاہ جی نے رضاکار کے حکم کی تعمیل کی اور جا کر باقاعدہ ٹکٹ خریدا جس کے ساتھ ہی ان تمام لوگوں کو بھی ٹکٹ خریدنا پڑا جو آپ کے ہمراہ تھے بعد میں شاہ جی نے محمد حسین کو شاباش دی اور اس کے اس کام کو سراہا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رضاکار اور احرار رہنما ڈسپلن کے معاملے میں کتنے پابند تھے۔ رضاکار کا اعتماد اور رہنما کی تعمیل دونوں قابل ستائش ہیں۔ اسی نظم و ضبط اور رضاکارانہ تنظیم نے مجلس احرار اسلام کو کو ایک زبردست قوت بنا دیا تھا۔ اجلاس میں شورش کاشمیری اور جنرل شاہنواز (آزاد ہند فوج) بھی تشریف لائے اور انہوں نے بھی احرار کانفرنس کو خطاب فرمایا۔ نور محمد دستکاری سکول کی عمارت میں حرار کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ دروازے پر میری ڈیوٹی تھی۔ سالار اعلی کا مجھے حکم تھا۔ کہ کوئی شخص اوپر نہ جائے چنانچہ میں نے اسی حکم کے تحت صاحبزادہ فیض الحسن شاہ اور مولانا محمد علی جالندھری کو روک دیا۔ یہ دونوں احرار لیڈر اس وقت تک میرے حکم پر رکے رہے جب تک سالار اعلی نے انہیں اجازت نہیں دی۔ یہ تھا ہماری جماعت کا رضاکارانہ نظام جو ہماری قوت کی اصل بنیاد تھی۔ وہ

رضاکار جو باہر اپنے رہنما کے حکم پر جیل جانے اور گولی کھانے تک کو تیار ہو جاتے تھے۔ جماعتی ڈسپلن میں وہی رہنما رضاکاروں کے حکم کی تعمیل میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ جس سے رضاکاروں میں اعتماد اور نظم و ضبط کی خوبی پیدا ہوتی تھی۔ جو دین کے عسکری نظام کا ایک بہت اہم رکن ہے۔ لائل پور کی یہ کانفرنس قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار کی سب سے اہم کانفرنس تھی۔ جو ہر لحاظ سے کامیاب رہی۔ رضاکارانہ تنظیم تو ہر لحاظ سے اپنے عروج پر تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ایک نیا ولولہ نیا جذبہ، نرالا انداز کار دیکھا گیا۔ جذبہ جہاد سے سرشار ہر رضاکار عزم و استقلال کا نشان بنے اپنے ہائی کمانڈ کے حکم پر جان نچھاور کرنے کے لئے پوری طرح تیار نظر آتا تھا۔

اس کانفرنس کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں لاہور کی دفاع کانفرنس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جو دہلی دروازے کے باہر منعقد ہوئی۔ ربیع الاول کے مہینے میں عید میلاد النبی کے جلوس میں پاکستان بھر سے آنے والے احرار رضاکاروں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ جماعت کا یہ عسکری نظام قابل دید تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں احرار سرخپوش سارا دن لاہور کی سڑکوں پر مارچ کرتے رہے، لاہور، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ لائل پور کے احرار بینڈ فوجی دھنوں کے ساتھ ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ فوجی بینڈ کی دھنوں پر رضاکاروں کی عسکری پریڈ نے لوگوں کو مبہوت کر دیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ ٹریننگ احرار رضاکاروں نے کیسے حاصل کی۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور قلعہ کے جنوبی دروازے پر اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کو احرار رضاکاروں نے سلامی بھی دی تھی۔ دفتر احرار میں احرار رہنماؤں کی اہم میٹنگ جاری تھی اور اسی میٹنگ کے نتیجے میں احرار نے اپنی نئی حکمت عملی وضع کی۔ احرار کو عارضی طور پر سیاست سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اور سیاسی کام کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کا فیصلہ ہوا۔ جبکہ جماعت کو دینی، سماجی اور تبلیغی سرگرمیوں تک محدود کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ رہنماؤں نے یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ جلسہ میں اس فیصلے کا اعلان کون کرے گا۔ تاثر یہ تھا کہ رضاکار اس فیصلے کو شاید تسلیم نہ کریں کیونکہ ان کی اکثریت پاکستان میں مسلم لیگ کے لئے حزب اختلاف کی حیثیت میں کام کرنے کے لئے ذہنی طور پر ہر طرح سے تیار تھی۔ جب کوئی بھی رہنما اس اہم اعلان کے لئے تیار نہ ہوا تو شاہ جی نے یہ کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ چنانچہ رات کے اجتماع میں جب جلسہ گاہ میں شاہ جی نے احرار کی سیاسی حیثیت کو ختم کر کے سیاسی کام کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کے فیصلہ کا اعلان کیا تو میں نے رضاکاروں کو اپنے اپنے خیموں میں بے تحاشہ روتے ہوئے دیکھا اور بعض اوقات توسسکیوں کی یہ آواز بھی جلسہ گاہ میں سنائی دیتی تھی۔ اس کے باوجود فیصلے کی تعمیل کی گئی احرار رضاکاروں اور رہنماؤں کی ایک محدود تعداد نے مسلم لیگ میں شمولیت بھی اختیار کی۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلم لیگ سے عوامی لیگ اور عوامی لیگ کا چکر کاٹ کر کچھ لوگ دوبارہ احرار میں شامل ہو گئے۔ اسی اجتماع میں امیر شریعت نے پاکستان کے بارے میں کہا کہ

"قیام پاکستان سے پہلے ہماری رائے ایک اصول پر مبنی تھی۔ وہ قصہ اب ختم ہوگیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہم اپنی رائے کی شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ ملک ہمارے لئے بھی اتنا ہی مقدس ہے جتنا کسی دوسرے کے لئے ہوسکتا ہے اس ملک کے ساتھ وفاداری میں جزو ایمان سمجھتا ہوں۔ اختلاف کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ اب اسے مرتے دم تک برقرار رکھا جائے اب اسے ختم کردو۔ پاکستان کی بہتری اور بقا کے لئے ہماری خدمات تمہارے سپرد ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صدا دیتے پھرتے ہیں کہ میں توشۂ وفاداری لئے پھرتا ہوں میری انگلی پکڑ کر ساتھ لے چلو اور جس مقتل میں چاہو مجھے ذبح کردو۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں خوش ہوں۔ میری خوشی بیکراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں سامراج کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں اسکو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہار گئی اب اس کہانی کو یہیں ختم کردو۔ اب پاکستان نے جب بھی پکارا واللہ باللہ اس کے ذرے ذرے کی حفاظت کرونگا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور اس کا دعوی کرسکتا ہے۔ میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آنکھ پھوڑ دی جائے گی، کسی نے ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلے میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد۔ میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے"

اس موقعہ پر سٹیج پر ہی شاہ جی سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ انتہائی مختصر ملاقات تھی۔ میرے ہاتھ میں شاہ جی کا فوٹو تھا۔ خیریت پوچھی بعد میں فرمانے لگے یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے میں نے کہا حضرت آپ کی تصویر ہے۔ کہنے لگے تمہیں بھی تصویر کی ضرورت ہے۔ تم نے میری تصویر کیوں خریدی ہے۔ تصویریں بنانا اور تصویر بیچنا خریدنا چونکہ شرعی طور پر منع ہے۔ اس لئے ان سے منع فرماتے تھے۔ چند لمحوں کی یہ مختصر ملاقات تھی لیکن اس ملاقات میں بھی وہی خلوص وہی محبت جو کہ آپ کی شخصیت کا لازمہ تھی۔ مجھے ان چند لمحوں کی ملاقات سے بھی بے پناہ خوشی ہوئی کیونکہ جب میں چنیوٹ سے کانفرنس میں شرکت کے لئے چلا تھا تو جہاں پر مجھے کانفرنس میں شمولیت کی خوشی تھی وہیں اس سے بھی بڑھ کر خوشی اس بات کی بھی تھی کہ حضرت شاہ جی سے ملاقات ہوگی۔

دوسرے روز قومی اخبارات میں مجلس احرار اسلام کا اہم سیاسی فیصلہ شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ پورے ملک میں اس فیصلے کو بنظرِ استحسان دیکھا گیا۔ اخبارات نے اس پر اداریے لکھ کر اسے قومی استحکام اور ملکی فلاح و بہبود کے لئے نیک فال قرار دیا۔ مجلس احرار اسلام نے اس فیصلہ کے بعد رد قادیانیت کے کام کو مزید تیز کردیا۔ احرار سیاسی امور میں مسلم لیگ کے ہمنوا تو ہوگئے لیکن وہ قادیانیت کے بارے میں مسلم لیگ کی حکمت عملیوں کے صریحاً خلاف بھی تے۔ جس سے اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ یہ اتحاد کہیں عارضی

ثابت نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ملک کے اندر ضمنی انتخاب کا مرحلہ آیا تو مسلم لیگ نے احرار کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے بعض قادیانیوں کو بھی مسلم لیگ کے ٹکٹ دیئے۔ جس پر احرار نے سخت رد عمل کا اظہار کیا۔ اور اعلان کر دیا کہ وہ قادیانی امیدواروں کی مخالفت کرے گی خواہ ان کے پاس مسلم لیگ کا ہی ٹکٹ کیوں نہ ٹکٹ ہو۔ ہر اس قادیانی کی مخالفت ہو گی جو الیکشن میں مسلمانوں کے نمائندہ بن کر اسمبلی کا ممبر بننے کی کوشش کرے گا چنانچہ احرار اسلام نے چک جھمرہ کے حلقے سے بھی ایک قادیانی امیدوار عصمت اللہ کی مخالفت کا اعلان کر دیا اس کے علاوہ کئی دوسرے حلقوں میں بھی قادیانی امیدوار کھڑے کئے گئے۔ ہر جگہ ہر قادیانی کے مقابلے میں احرار ڈٹ گئے اور انہیں ناکام بنانے کے لئے کوششیں شروع کر دی گئیں۔ چک جھمرہ کے حلقے میں قادیانی امیدوار کے خلاف وسیع پیمانے پر عوامی جلسوں کا اہتمام کیا گیا جن میں سے کئی جلسوں کو امیر شریعت نے بھی خطاب فرمانا تھا۔ شاہ جی نے ریل گاڑی کے ذریعے فیصل آباد ریلوے سٹیشن پر اترنا تھا۔ انسانوں کا جم غفیر آپ کے استقبال کے لئے وہاں پر موجود تھا۔ استقبال کرنے والے خوش نصیبوں میں میں بھی تھا۔ جب آپ کی گاڑی ریلوے سٹیشن پر آکر رکی تو فضا نعرۂ تکبیر کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے ماحول تھرا گیا۔ گاڑی کے جس ڈبے میں امیر شریعت موجود تھے اس کے ساتھ والے ڈبے میں علاقے کے بہت بڑے پیر جو مولوی قطبی کے نام سے معروف تھے بھی موجود تھے۔ انہیں بھی کسی کام کے سلسلے میں فیصل آباد میں ہی اترنا تھا۔ ان کی نگاہ جب امیر شریعت پر پڑی تو انہوں نے ازراہ احترام شاہ جی سے فرمائش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ کا بستر میں اٹھالیتا ہوں۔ شاہ جی (جو غالباً انہیں پہلے سے ہی جانتے تھے) نے جواب میں فرمایا کہ یہ بوجھ تو میں اکیلا بھی اٹھا لوں گا تم اس بوجھ میں میرا ہاتھ بٹاؤ جو رد قادیانیت کے سلسلے میں مجھ پہ آن پڑا ہے آؤ میرے ساتھ ملکر قادیانی امیدوار کے خلاف تقریریں کرو اور اسے ناکام بنانے میں میرا ساتھ دو سنا ہے اس علاقے میں تمہارے مریدوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ انہیں منع کرو کہ قادیانی امیدوار کو ووٹ نہ دیں تاکہ قادیانیوں کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت میں ان کے ووٹوں کے ذریعے اسمبلی کے رکن ہیں۔ چنانچہ پیر قطبی نے حامی بھر لی اور دوسرے روز ہم نے دیکھا کہ جلسہ گاہ میں وہ بھی موجود تھے۔ یہ خوبی تو حضرت شاہ جی میں بدرجہ اتم موجود تھی کہ وہ راہ جاتے ایک فرد کو اپنے ساتھ ملالیتے تھے اور اس سے دین کی خدمت کا کام لیتے تھے۔ چنانچہ یہ انتخابی معرکہ آج تک لوگوں کو یاد ہے، میں خود روزانہ سائیکل پہ سوار ہو کر علاقے کے اندر ہمیشہ جلسوں میں احرار رضا کاروں کے ساتھ شریک ہو کر لوگوں کے جذبۂ ایمانی سے اپنے ایمان کو تازہ کرتا۔ مسلمانوں کا جذبہ ان کا ولولہ اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ شاہ جی پر نچھاور ہوتے جاتے اور کہتے کہ انشاء اللہ ہم اس قادیانی کو مسلمانوں کا نمائندہ نہیں بننے دیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ چک جھمرہ کے ریلوے سٹیشن پر قادیانیوں اور احرار رضا کاروں کے درمیان ایک زبردست لڑائی بھی ہوئی تھی۔ جس میں قادیانی امیدوار عصمت اللہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا بہ امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اسی انتخابی معرکہ کے دوران اس وقت کے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان لائل پور ریلوے سٹیشن پر ایک سپیشل سیلون کے ذریعے پہنچے ان کے پروگرام میں قادیانی، مسلم لیگی امیدوار کے حق میں تقریر کرنا تھی۔ اس پروگرام پر علاقے کے مسلمان اچھے خاصے مشتعل تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لیاقت علی خان عصمت اللہ کے حق میں انتخابی تقریر کریں۔ لیکن احراری حلقے اس بات پر متفکر بھی تھے کہ اگر لیاقت علی یہ تقریر کر گئے تو الیکشن میں ہمارے خلاف ایک غلط تاثر قائم ہو گا۔ اور شاید قادیانی امیدوار جیت بھی جائے اس طرح امیر شریعت کی اس تحریک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ادھر احراری حلقے اس سوچ میں تھے اور ادھر قدرتِ کاملہ بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو اللہ تعالی نے توفیق دی کہ انہوں نے ریلوے سٹیشن پر خان لیاقت علی خان کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کی۔ تاکہ وزیر اعظم کو قادیانیت کے خدوخال سے آگاہ کر کے انہیں جلسے میں خطاب سے باز رکھیں چنانچہ اس کوشش میں وہ کامیاب ہو گئے۔ دس منٹ کی ملاقات تقریباً ایک گھنٹے کی ملاقات میں تبدیل ہو گئی، قاضی صاحب نے اتنی خوبصورتی کے ساتھ قادیانیت کا تارو پود ان کے سامنے بکھیرا کہ وہ اس بات پر متفق ہو گئے اور تقریر کئے بغیر واپس چلے گئے خان لیاقت علی خان نے قاضی صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف اس حلقے میں بلکہ ملک بھر میں کسی قادیانی امیدوار کے حلقے میں نہیں کریں گے۔ انہیں قادیانیت اور اسکی درپردہ سازشوں سے واقفیت ہو چکی تھی ان دونوں رہنماؤں کے درمیان کچھ ایسے وعدے بھی ہوئے جو مستقبل قریب میں قادیانیت کے لئے نقصان دہ ہو سکتے تھے۔ اس بات کا علم جب قادیانیوں کو ہوا تو وہ پھر خبردار ہو گئے یہی وجہ ہے کہ قادیانی اس سازش میں برابر کے شریک تھے جو لیاقت علی خان کو شہید کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ اگر اس مقدمہ شہادت میں دیانتداری سے کام لیا جاتا اور مقدمہ کی ساری فائل کو ضائع نہ کیا جاتا تو قادیانی سازش اسی وقت ہی طشت از بام ہو جاتی۔ بہر حال وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کے واپس چلے جانے سے قادیانی حلقے پر اوس پڑ گئی اور وہ بری طرح مایوس ہو گئے۔ انتخاب کے نتائج کا جب اعلان ہوا تو پورے ملک کے اندر ایک قادیانی بھی منتخب نہ ہو سکا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالی کا کرم اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قیادت میں مجلس احرار اسلام کا پاکستان میں قادیانی اور قادیانی نواز حکمرانوں کے خلاف پہلا کارنامہ تھا جس پر ملت اسلامیہ امیر شریعت کی ممنون ہے۔

چنانچہ اس عظیم کارنامے پر لاہور کے اندر مجلس احرار اسلام پاکستان کی جانب سے یوم تشکر منایا گیا۔ یوم تشکر کی اس تقریب میں میں بھی شامل تھا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر کے دوران خداوند تعالی کے شکر ادا کرتے ہوئے قادیانیوں کی عبرتناک شکست کو مسلمانوں کی ایک عظیم فتح قرار دیا۔ دہلی دروازے کے باہر احرار کا یہ عظیم الشان اجتماع مسلمانوں کے جوش و خروش کی عکاسی کر رہا تھا۔ ان کے

چہروں پر خوشی کے آثار ہویدا تھے۔ انہیں مجلس احرار اسلام کی اس تحریک کی اہمیت کا اب شدت کے ساتھ احساس ہو چکا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی یہ عظیم فتح قادیانی مذموم مقاصد پر ضرب کاری ہے جس کا سارا "کریڈٹ" سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ذات کو جاتا ہے۔ شاہ جی نے فرمایا جب تک میری زندگی ہے اس فرقہ ضالہ کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ اور اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔

ہائے وہ بھی کیا سماں تھا، جسے آج بھی چشم تصور سے دیکھتا ہوں تو دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ ایک عجیب قسم کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ امیر شریعت سٹیج پر فروکش ہیں اور ان کا نورانی چہرہ تمتما رہا ہے۔ سامنے لاکھوں کا مجمع، ارد گرد سرخ وردیوں میں ملبوس ہزاروں کی تعداد میں احرار کے بہادر، مخلص، انتھک رضا کار ہر پانچ منٹ کے بعد نعروں کی لرزا دینے والی آواز گونجتی ہے۔

قادیانی ہیں علیحدہ ملت اسلام سے
اس میں شامل ہے تیری کاوش مثال آفتاب
دہر سے تھا مختلف آواز کا جادو تیرا
تیرے لب پہ دیدنی تھی زینت ام الکتاب

اسی جلسے میں مولانا ظفر علی خان ضعیف العمری کے باوجود امیر شریعت کو اس عظیم کامیابی پر مبارک باد دینے کے لئے بہ نفس نفیس تشریف لائے ان کے جسم پر اور کپکپی طاری تھی۔ لیکن قادیانیوں کے خلاف ان کے جذبات اب بھی جوان نظر آتے تھے۔ ان کی جلسہ گاہ میں آمد پر ایک عجیب سماں تھا۔ کیف و سرور، جوش و جذبہ سے فضا معمور نظر آتی تھی۔ ان دو بزرگ رہنماؤں کو ایک مدت کے بعد اکٹھا دیکھ کر کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ شاہ جی نے سٹیج پر اپنے مخصوص انداز میں مولانا ظفر علی خان کا استقبال کیا اپنے دونوں ہاتھوں میں مولانا کے رخسار لیکر انہیں خوش آمدید کہا اور عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ اور پھر مصروف گفتگو ہو گئے۔ جب میں یہ پرانی یادیں سمیٹ رہا ہوں تو مولانا ظفر علی خان کا قادیانیوں کے خلاف صحافت کے میدان میں ایک طویل جہاد نظروں کے سامنے ابھر کر آجاتا ہے۔ روزنامہ زمیندار پوری قوت کے ساتھ قادنیت کا محاسبہ کر رہا ہے۔ مولانا کی نظموں کا ایک لامتناہی سلسلہ۔ کیا خوب اور کیا نرالا انداز تھا۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوکل کی
مگر یہ بانسری والا کنہیا ہو نہیں سکتا
غلام احمد کو کیا نسبت مجدد الف ثانی سے
ثریٰ جتنا بھی بڑھ جائے ثریا ہو نہیں سکتا

میں دیر تک شاہ جی پاس بیٹھا رہا انکی باتیں سنتا رہا۔ بلکہ دل پر نقش کرتا رہا میں نے زندگی میں ان کی باتوں

سے ہی رہنمائی حاصل کی ہے۔ اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور تعلق خاطر کا یہ رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ ہم لوگ چنیوٹ سے لائل پور (فیصل آباد) آ گئے۔ جب بھی آپ لائل پور تشریف لاتے میں سب کچھ چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاتا۔ گورونانک پورہ کے مدرسہ اشرف المدارس کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے آپ ضرور تشریف لاتے تھے۔ فیصل آباد کا یہ مشہور دینی مدرسہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس جلسہ کے موقع پر تشریف لائے تو دھوبی گھاٹ گراؤنڈ میں آپ کی تقریر کا اہتمام تھا۔ تقریر کے دوران بڑے زوروں سے آندھی آئی۔ شامیانے اڑاڑ جاتے تھے۔ لوگ بانس پکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریر جاری تھی۔ کہ آندھی کے بعد بارش شروع ہو گئی بارش بھی بے تحاشہ تھی چند منٹوں میں گراؤنڈ پانی سے بھر گیا۔ شاہ جی نے تقریر ختم کرنے کا اعلان کیا تو لوگوں نے پرزور انداز میں تقریر جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ کہ حضرت تقریر جاری رہے ہم پانی میں بیٹھ کر بھی تقریر سنیں گے۔ شاہ جی نے چند منٹ تقریر جاری رکھنے کے بعد اس وعدہ پر جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا کہ کل پھر اس جگہ جلسہ ہو گا۔ لوگوں نے اس وعدہ پر جلسہ کے خاتمے پر اتفاق کیا۔

غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں زیر تعلیم تھا۔ کالج کی ہاکی ٹیم کے ہمراہ ملتان جانا ہوا۔ ملتان میں ہمارا قیام کالج کے ہوسٹل میں تھا۔ جہاں چند قدموں کے فاصلے پر حضرت شاہ جی کی رہائش گاہ تھی۔ آپ سے ملاقات کا شوق بے چین کئے ہوئے تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ شاہ جی کے پاس حاضر ہو گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے شاہ جی کی ہی آواز آئی آجائیے۔ چنانچہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ آپ زمین پر تشریف فرما تھے۔ چند افراد بیٹھے تھے۔ یہ غالباً ان دنوں کی بات ہے جب آپ پر فالج کا پہلا حملہ ہو چکا تھا۔ کمزوری کے علاوہ گفتگو میں فالج کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن چہرہ ویسے ہی شگفتہ اور طبیعت پر کوئی ملال نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ میرا بیٹا کہاں سے آ گیا ہے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ کے ملتان والوں سے ہاکی میچ کھیلنے آیا ہوں۔ فوراً سرائیکی زبان کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اچھا توں ہن "اساں ملتانیاں کوں ہراون آ گئیں۔ اینویں نہ تھیسی" ("اچھا تو اب تم ہم ملتانیوں کو ہرانے کے لئے آ گئے ایسا نہیں ہو گا") جس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے طبیعت کا پوچھا فرمانے لگے بھئی طبیعت کا کیا پوچھتے ہو بس میں تمہارے سامنے موجود ہوں دیکھ لو۔ اب میرا جسم میرے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ، آنکھیں، زبان غرضیکہ جسم کا ایک ایک عضو میری رعایا ہے اور میں اس کا حاکم۔ میں نے اپنی رعایا سے زیادہ کام لیا۔ اتنا زیادہ کہ ان کا بھرکس نکال دیا ہے۔ کیا اب انہوں نے میرے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ چند روز پہلے فالج کا حملہ ہوا تو سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑا مضبوط جسم لیکن میں نے ستر برسوں میں اسے دین پر قربان کر دیا۔ اب اس میں جسم کا کیا قصور ہے۔ بہر حال میں الحمدللہ! اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہوں۔

شکر ہے اللہ کا جس حال میں رکھے۔ میں خوش ہوں اس کی خوشی میں، اس طرح وقت گزرتا رہا۔ اور ہم باتوں میں مصروف رہے۔ بالاخر میں نے اجازت طلب کی۔ آپ نے مجھے دعاؤں سے رخصت کیا۔ باہر آ کر میں نے اپنے دوستوں سے پہلی بات یہی کی کہ یار یہ اچھی بات نہیں ہوئی شاہ جی نے ہمیں ہماری شکست کی پیشگی خبر دے دی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب ہمارا میچ ہوا تو ہم واقعی ملتانیوں سے میچ ہار گئے۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک میں ایم اے کے سلسلے میں لاہور مقیم رہا۔ ان دو برسوں میں دو دفعہ امیر ان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات جیل روڈ پر صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر اور دوسری لاہور ریلوے سٹیشن پر۔ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر تو آپ سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہاں شاہ جی کے مرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قیام پزیر تھے اور شاہ جی ان سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ انہی دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات ہوئی۔ میں ۴ مزنگ روڈ پر خضر تمیمی ایڈووکیٹ کے دفتر پر قیام پذیر تھا وہ میرے والد محترم کے دیرینہ دوست تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر شہر میں منادی بھی ہوئی اور اخبار میں ایک اشتہار بھی چھپا کہ مولانا داؤد غزنوی موچی دروازے کے باہر آپ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائیں گے چنانچہ میں اپنے ایک ساتھی ممتاز سہارن کے ساتھ مزنگ روڈ سے پیدل چل کر موچی دروازے پہنچا۔ جنازے سے فارغ ہی ہوا تھا۔ کہ کسی جاننے والے نے بتایا کہ حضرت شاہ جی شملہ پہاڑی کے قریب حاجی عبدالمتین صاحب کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھی ممتاز سہارن سے ان کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بھی شاہ جی سے ملنے کا کہا تو ہم دونوں وہاں سے پیدل حاجی عبدالمتین کی کوٹھی پر پہنچے۔ لیکن وہاں سے ہمیں پتہ چلا کہ شاہ جی صوفی عبدالحمید کی کوٹھی جیل روڈ پر اپنے پیرومرشد کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں شملہ پہاڑی سے جیل روڈ پر صوفی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو حضرت شاہ جی کوٹھی کے مشرقی لان میں اپنے عقیدت مندوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ جبکہ کوٹھی کے اندر ایک وسیع کمرے میں حضرت عبدالقادر رائے پوری کی محفل تھی۔ حضرت شاہ جی کو میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ حضرت آج تو آپ کے لئے بہت پیدل چلا ہوں۔ آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا شکر ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پھر میں نے اپنے سفر کی کہانی بھی کہہ ڈالی جواب میں فرمانے لگے۔ تو کیا یہ تیرا مجھ پر کوئی احسان ہے۔ اپنے بیٹے ہو ملنے کے لئے آئے ہو۔ آؤ بیٹھو۔ میری طرف بھی تو دیکھو اس عمر میں تین منزلہ ہسپتال میں اوپر گیا اور دانت لگوا کر آ رہا ہوں۔ میں وہیں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور تذکرہ جاری تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا۔ زبان امیر شریعت کی بات ابوالکلام کی۔ مولانا ابوالکلام کا کردار، آپ کا علم و فضل شاہ جی کی زبان سے بیان ہو رہا تھا اور وہاں پر موجود تمام لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ فرمانے لگے۔

یہ حکومت ہندوستان کا مولانا ابوالکلام پر احسان تھا کہ انہوں نے مولانا کو وزیر اعظم بنایا ہوا تھا۔ بھائی یہ تو مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان کی حکومت پر احسان تھا کہ وہ ان کے وزیر تعلیم تھے۔ میری تمام زندگی پڑھے لکھے لوگوں میں بسر ہوئی ہے ایسا عالم فاضل شخص شاید ہی کوئی اور میری نظروں سے گزرا ہو۔ عربی

جنکی مادری زبان ہو، اردو جس کے ہاتھ کی چھڑی اور فارسی جس کے گھر کا پانی بھرتی ہو اور انگریزی بھی ایسی خوب جانتے تھے (مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا) کہ بابو اتنی اچھی انگریزی تم بھی کیا جانو، وہ ہمارے دور کے واقعی امام ابن تیمیہ تھے۔ کیا کیا خوبیاں تھیں جو خدا نے ان کے دل و دماغ میں سما دی تھیں۔
اب بڑی اچھی باتیں ہو رہی تھیں۔ شاہ جی ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار پر اپنے مخصوص انداز میں ابھی باتیں کر ہی رہے تھے۔ کہ ایک آدمی نے آپ سے کہا کہ حضرت رائے پوری آپ کو اندر کمرے میں یاد فرما رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ جی فوراً کھڑے ہو گئے آپ پر یکسر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ چہرے کا رنگ بدل گیا سرخی کی بجائے اب چہرے پر زردی کے آثار ہویدا تھے۔ متانت اور سنجیدگی پہلے سے وافر تھی۔ پہلے ننگے سر بیٹھے تھے اندر جانے کے لئے باقاعدہ سر پر رومال باندھا اور اس طرح عجز و انکسار کی تصویر بنے ایک سعادت مند مرید ایک باکمال پیر کی بارگاہ میں حاضری کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔ ہم آپ کے پیچھے پیچھے کمرے کے دروازے تک تو آئے۔ اندر تو جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ کمرہ پہلے ہی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہاں دروازے سے حضرت رائے پوری کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ پہلی اور آخری زیارت تھی جو مجھے نصیب ہوئی۔ اس کے بعد حضرت رائے پوری کو کبھی نہ دیکھ سکا البتہ ان کے جنازے میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی یہ جنازہ خالصہ کالج لائل پور کی وسیع گراؤنڈ میں ہی ہوا تھا۔ کمرے کے اندر ایک جانب کونے میں حضرت رائے پوری پلنگ پر اکیلے میں تشریف فرما تھے۔ انتہائی کمزور اور نحیف و نزار جیسے ہڈیوں کی ایک چھوٹی سی ڈھیری کسی نے بستر پر رکھ دی ہو۔ شاہ جی چپکے سے اندر داخل ہوئے۔ سلام کیا اور چارپائی کے ایک طرف چپکے سے بیٹھنے لگے تو حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ نہیں شاہ جی یہاں میرے پاس چارپائی پر تشریف رکھیں ان لوگوں کو کچھ وعظ کریں حضرت شاہ جی نے اپنے پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وعظ کرنا شروع کر دیا دیر تک ہم بھی دروازے باہر کھڑے شاہ جی کی باتوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ جس کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے ہمیں دیر ہو رہی تھی۔ اور پھر پیدل ہی اپنی منزلِ مقصود ۴ فرنگ روڈ پر پہنچنا تھا۔

غالباً ۱۹۵۸ء کا سن تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے جنہوں نے مجلس احرار اسلام سے پابندی اٹھا دی۔ یہ پابندی ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران لگائی گئی تھی۔ پابندی اٹھتے ہی بہت جلد شاہ جی کے حکم پر مجلس احرار اسلام نے جماعت کی تنظیم نو کے ضمن میں لاہور میں مولانا داؤد غزنوی کے مدرسہ میں احرار کنونشن طلب کیا تھا اس وقت میں ایم اے فائنل کا سٹوڈنٹ تھا اور کنونشن میں شریک تھا۔ ملک بھر سے سرخ قمیضوں میں ملبوس ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین بھی کنونشن میں شریک تھے۔ رضاکاروں اور رہنماؤں کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے کہ قافلۂ اہل جنون پھر سوئے منزل روانہ ہونے والا ہے۔ نیا ولولہ، نیا جذبہ عجیب ترنگ، انوکھی امنگ دکھائی دے رہی تھی۔ قبیلۂ احرار ایک

مرتبہ پھر صفوں کو درست کر کے میدان کارزار میں کودنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہی ولولہ، جنہیں دیکھ کر نظیری کا وہ شعر یاد آ گیا جو شاید نظیری نے احرار کے لئے ہی کہا تھا کہ اس دور میں انہی پر منطبق ہوتا ہے۔

گریزد از صفِ ماہر آنکہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

کنونشن میں محترم شیخ حسام الدین کو چیف آرگنائزر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ تاکہ وہ پاکستان بھر میں مجلس احرار اسلام کو دوبارہ منظم کریں اسی کنونشن کے خاتمے پر ایک اعلان کے ذریعے احرار رضاکاروں کو مطلع کیا گیا کہ امیر شریعت ملتان سے ایک ٹرین کے ذریعے رات کو لاہور پہنچ رہے ہیں۔ لہذا تمام احرار رضاکار حضرت شاہ جی کے استقبال کے لئے گاڑی سے پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ جائیں۔ اعلان میں نے بھی سنا، خوشی ہوئی کہ شاہ جی کی زیارت کا ایک اور موقع مل رہا ہے۔ چنانچہ پلیٹ فارم پر استقبال کے لئے پہنچ گیا۔ یہ ہر طرف سرخ پوش پھیلے ہوئے تھے۔ عزم و ہمت کے نشان جب بھی نعرہ زن ہوتے تو در و دیوار گونج اٹھتے۔ ایک عجیب سماں تھا۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے فضاء میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایک جم غفیر، فقیر کے استقبال کو بے تاب ہوا جاتا تھا۔ اسی سوچ میں مستغرق تھا کہ شاہ جی کی گاڑی پلیٹ فارم پر آتی دیکھائی دی۔ اب اتفاق ہے کہ شاہ جی کا ڈبہ وہیں آ کر رکا جہاں میں کھڑا تھا میں سب سے پہلے اندر داخل ہوا اور سب سے پہلے آپ سے ملا۔ شاہ جی نے نظر میں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا بیٹا یہ میرا سامان ہے میں نے وہ سامان اٹھایا اور باقی کچھ دوسرے رضاکاروں نے ہم ڈبے سے پلیٹ فار پر حضرت شاہ جی کے جلو میں باہر آئے ہر طرف سر ہی سر تھے تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے شاہ جی کے لئے راستہ بنا۔ لوگ باری باری آپ سے ملتے جاتے اور آپ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے تھے۔ اس بار شاہ جی پر خاموشی کا غلبہ تھا۔ بے نیازی اسقدر کہ مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر بھی پورے استقبال کو کمزوری بھی پہلے سے زیادہ تھی۔ شگفتگی پر سنجیدگی اور متانت کا غلبہ تھا۔ میں تو جیسے شاہ جی کے ساتھ نتھی ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ مجمع کے ساتھ پل عبور کر کے باہر ڈیوڑھی میں آئے تو آگے ایک کار کھڑی تھی جس پر آپ نے سامان رکھ دیا اور آپ اپنے پیر و مرشد کی قیام گاہ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں بھی دوسرے رضاکاروں کے ساتھ شاہ جی کی کار کو دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ اب شاہ جی کسی اور کیفیت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور ہم انکی محفلوں سے شاید اس طرح لطف اندوز نہ ہو سکیں گے۔ جیسے عمر بھر ہوتے رہے ہیں اور اسی سوچ کے دوران آپ کی کار میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہے۔ مقام ملاقات جامع مسجد فیصل آباد میں اپنے سب سے بڑے فرزند مولانا سید ابومعاویہ ابوذری کے نکاح کے موقع پر آپ یہاں تشریف لائے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی باقر صغیر احمد کے ہمراہ مسجد میں پہنچا تو آپ مسجد کے شمالی حصہ میں تشریف فرما تھے۔ ذرا قریب ہوئے تو سنا کہ کسی سے کہہ رہے تھے کہ بھائی ذرا میرے لئے پینے کا پانی مٹی کے اس برتن میں لے آؤ اتنے میں ہم دونوں پر

نظر پڑ گئی تو اسے کہا رہنے دو میرے اپنے بیٹے آ گئے ہیں۔ یہ فقرہ خلوص اور محبت میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ آج بھی اس کی حلاوت سے دل و دماغ معطر ہو جاتے ہیں۔ میرے اپنے بیٹے آ گئے۔ چھوٹا بھائی صغیر جلدی جلدی پانی لینے چلا گیا اور میں شاہ جی کے پاس بیٹھ کر ان سے ہمکلام ہوا۔ شاہ جی آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ جواب میں فرمایا۔ جاؤ میں تم سے کلام نہیں کرتا۔ تم تو بڑے نالائق بیٹے ہو۔ میری یہ حالت ہو رہی ہے تم نے کبھی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر پتہ کیا ہے کہ تیرے ابا کا کیا حال ہے۔ بس یہ فقرہ آپ نے کہا کہ مجھ پر جیسے بجلی کوند گئی۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی معاً خیال آیا کہ شاہ جی تو میرے خط کا انتظار کرتے رہے ہیں اور یہاں میرے تصور میں بھی نہیں ہے کہ انہیں خط لکھ کر حال پوچھوں کہ ان کے اور میرے درمیان اگرچہ ایک تعلق تو ہے ہی لیکن مقام و مرتبے کا اتنا فرق ہے کہ اس فرق کی موجودگی میں میں اسے ایک جسارت ہی خیال کرتا رہا وہ میرے خط کا انتظار کریں۔ اللہ اللہ کتنا بڑا انسان کتنی بڑی خوبیوں کا مالک جس میں سب سے بڑی خوبی انسانوں سے محبت کرنا ہے۔ بہر حال معذرت کی معافی مانگی اور انہوں نے معاف کر دیا۔

شاہ جی دعا کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔ آپ ابھی مائیک پر آئے ہی تھے کہ لوگوں نے تقریر کا تقاضہ شروع کر دیا۔ بظاہر تو یہ مطالبہ درست تھا۔ لیکن اب شاہ جی کچھ بے نیاز سے تھے۔ تقریروں کا شوق و ذوق وقت کے ساتھ ساتھ ان کی طرح جیسے بوڑھا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تقاضہ تقریر بڑھا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

''بس بھائی بہت ہو چکی تقریریں۔ اب دل میں کوئی حسرت باقی نہیں ہے۔ میں تو اپنے بیٹے کے نکاح کے سلسلے میں آپ کے شہر میں موجود ہوں۔ بس دعا کریں۔ ہمارے دو خاندانوں کے درمیان یہ نکاح باعث خیر و برکت ثابت ہو اور یہ معاملہ بخیر و خوبی انجام پائے۔ اسی دوران لوگوں نے دوبارہ تقریر کی فرمائش کی تو آپ نے کہا۔ تقریر تو نہیں لیکن اب بھی ایک ترنگ اور امنگ سی دل میں ضرور پیدا ہوتی ہے کہ خدا مجھے توفیق دے تو میں اپنے یار ناصر (صدر ناصر کی طرف اشارہ تھا) کے قصیدے بیان کروں کہ اس نے کس طرح سے انگریزوں کو جوتے مار مار کے سویز سے نکالا ہے۔''

یہ آپ کی زندگی کی مختصر ترین تقریر تھیں جو اس روز آپ نے کی تھی۔ بظاہر تو یہ ایک فقرے میں ختم ہو گئی۔ لیکن اس ایک فقرے میں بھی انگریزوں کے خلاف بلا کی نفرت جھلک رہی تھی سویز نہر کا بحران اور مصر کا انقلاب آپ کے سامنے تھا۔ جس ہزیمت کا سامنا انگریزوں کو اس بحران میں اٹھانا پڑا اس کی طرف ہی آپ کا اشارا تھا۔ چنانچہ نکاح کے بعد جب شاہ جی واپس جانے لگے تو میں آپ کا ہمراہ تھا مسجد کے شمالی جانب کا دروازہ تھا۔ سامنے گلی میں تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ آپ رک گئے اور آپ نے مولانا ابوذر بخاری صاحب کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

''حافظ جی دیکھ رہے ہو لوگوں کا اکٹھ یہ سب میرے پاس کیا لینے آ جاتے ہیں۔ میں تو ایک فقیر ہوں دوسرے وقت کی روٹی پر بھی قادر نہیں ہوں۔ یہ لوگ انتہائی مخلص ہیں مجھ سے محبت

کرتے ہیں مجھ سے محبت لینے آجاتے ہیں میں نے بھی ان سے زندگی بھر محبت ہی کی ہے۔ یہ میرے خلوص کی کمائی ہیں لوگ مرنے سے پہلے جائیدادیں چھوڑ کر مرتے ہیں۔ میری جائیداد یہی لوگ ہیں جسے میں تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ واللہ باللہ میں نے جب بھی زندگی میں ان لوگوں کو دین کے تحفظ کے لئے پکارا یہ لوگ سروں پر کفن باندھ کر اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے میرے کہنے پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور سینے پر گولیاں کھائیں۔ اگر تم نے بھی ان کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ جاری رکھا تو دین کے لئے یہ تمہارے کام بھی آئیں گے ان شاء اللہ"

یہ وہ تاریخی چند فقرے ہیں جو تمام عمر کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ شاید زندگی بھر یہ محبت، یہ خلوص کا مظاہرہ بھی اسی لئے تھا۔ اس کے ذریعے لوگوں سے دین کے تحفظ اور ناموس رسالت کے لئے کام لینا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے یہ کام لیا۔ وہ اس میں سو فیصد کامیاب و کامران تھے۔ اس کے بعد ایک بزرگ صورت غالباً چترال ہاؤس والے بزرگ جن کی دکان مسجد کے قریب ہی تھی شاہ جی سے اصرار کر رہے تھے کہ شربت کے ایک گلاس کے لئے دکان پر تشریف لائیں۔ اور شاہ جی برابر معذرت کر رہے تھے۔ کہ وہ ذیابطیس کے مریض ہیں۔ پھر وہ ہم سے پیپلز کالونی کے لئے رخصت ہو گئے اس کے بعد پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شام وہ ہم سب کو داغِ مفارقت دیکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ لیکن وہ اب بھی دل و دماغ میں موجود ہیں۔ اور موجود رہیں گے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما۔

وہ سید کہ تھا صدر احرار ملت
جسے لوگ کہتے تھے شاہِ خطابت
یہ دنیا کہ مومن کا ہے قید خانہ
اسے چھوڑ کر رہ گیا سوئے جنت
ہوئی جستجو اختر واصفی کو
چو از بہر ارقام تاریخ رحلت
ندا آئی کیوں ہو نہ تاریک عالم
گیا مہر تاباں امیر شریعت
۱۹۶۱ء
اختر واصفی

گئے دور کا فسانہ

میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ اردو زبان کا سب سے بڑا خطیب ایک بوسیدہ مکان کے ملبہ میں اپنے بڑھاپے کی فراٹے بھرتی ہوئی عمر گزار رہا ہے۔
شاہ جی نے کھجور کی چٹائی پر اپنے ماتھے کی تھکی ہاری شکنیں بکھیرتے ہوئے جو کچھ کہا میں نے اس خوبصورت گفتگو کو اشعار کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔(شورش کاشمیری)

ہمارا ذکر گئے دور کا فسانہ ہوا
لگا کے آگ ہمیں کارواں روانہ ہوا
کبھی مصائبِ منزل سے آشنائی کی
کبھی نوشتۂ تقدیر قید خانہ ہوا
ہر ایک موج بہر رنگ ہم کلام ہوئی
ہر ایک پھول بہر شاخ آشیانہ ہوا
یہ ایک بات زباں قلم تک آپہنچی
یہ ایک حرفِ دلآویز محرمانہ ہوا
ہوا کہ دوش پہ اڑتا رہا کلامِ خطیب
اگرچہ گوش برآواز یہ زمانہ ہوا
اٹھے تو شاخِ چمن سے کہانیاں اٹھیں
گئے تو برق کا مرہون آشیانہ ہوا
ہم ایسے لوگ بھلا کس سے آشنا ہوتے؟
ہُوا تو گردشِ دوراں سے دوستانہ ہُوا

(شورش کاشمیری)

حافظ عبد الرشید ارشد

ترس گئے ہیں تری آوازِ دل کشا کے لئے

شروع میں بغیر کسی تکلف یا انکسار کے عرض ہے کہ راقم آثم نہ تو صاحبِ علم ہے اور نہ ہی صاحبِ قلم۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کی حد تک صاحبانِ علم و قلم اور اپنے دائرہ وحالات کی حد تک اہم خطیب حضرات کو سُنا پڑھا جانچا اور بہت قریب سے دیکھا۔ زیرِ قلم مضمون میں چونکہ اُردو اور برصغیر کی علاقائی زبانوں کے سب سے بڑے خطیب کا تذکرہ ہے۔ لہذا میں کوشش کروںگا کہ اپنے وَارِدَات ومشاہدات پیش کروں، متعلقات پر اس نمبر میں اور بہت مضمون ہوں گے---- اختر شیرانی نے کہا تھا" کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ادبیات نے تین جامع شخصیات پیدا کیں، ابوالفضل، اسد اللہ خاں غالب اور ابوالکلام آزاد----" میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ خطابت میں جامع الصفات---- وجاہت، خوبصورتی، مردانگی، آواز، اثر اور قرآنی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کے معانی اور پھر موزوں اشعار عام فہم بیان و خطاب اور ایسا لہجہ اور انداز کہ ایک دیہاتی اور تانگہ بان سے لے کر ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، محمد علی جوہر، علامہ شبیر احمد عثمانی، صلاح الدین احمد، مولانا احمد علی، مولانا محمد ابراہیم جگرانوی رحمہم اللہ، غرضیکہ ہر طبقہ وخیال اور کند ذہن اور عبقری، دیہاتی، شہری، علماء، صوفیاء، انگریزی داں، فلسفی و دانشور سبھی بیک وقت مستفید و مستفیض ہوں---- ایسا خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ شاید کسی بھی اُمت، کسی بھی ملک میں نہ پیدا ہوا ہو---- جلال و جمال، حُسنِ صورت اور حسنِ صوت جس لحاظ سے بھی دیکھیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ اُمتِ مسلمہ کے فردِ وحید خطیب تھے۔

میں نے "بیس بڑے مسلمان" کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے سات آٹھ سال کی عمر میں امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی پہلی تقریر سُنی لیکن اس کے بعد کئی دفعہ غور کیا، سوچا، تو محسوس ہوا کہ اس عمر کی تو مجھے بہت سی ایسی باتیں یاد ہیں جن کا تعلق فہم وشعور سے ہے اگر یہ تقریر اس عمر میں سُنی ہوتی تو بہت سی باتیں یاد ہوتیں۔ لامحالہ یہ پانچ برس کی عمر کے لگ بھگ کی بات ہو گی جب ۱۹۳۷ء کے الیکشن ہو رہے تھے کہ ایسے ہی حالات میں زعمائے احرار کا دورہ دیہات میں ہوا ہو گا کہ جس میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمہ اللہ اور حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ اور خواجہ عبدالرحیم عاجز، نکودر (ضلع جالندھر) تحصیلی مرکز سے چھ میل دُور مخشم پور میں تشریف لائے ہوں گے کہ مجھے اس جلسہ میں سوائے "بخاری و حبیب" کے چہرے اور عاجز مرحوم کی پنجابی نظم کے مطلع کے اور کچھ یاد نہیں۔

راتیں سُتیاں پیاں ہنوں اک خواب آ گیا
گئے بدیشی ایتھوں، ایتھے انقلاب آ گیا

انہی دنوں عاجز مرحوم کی ایک اور نظم بہت مشہور تھی جس کے چند شعر یاد رہ گئے ہیں:

او مسلماناں کدھر گئی اج مسلمانی ترِی
دین لئی ہندی وقف سی کدی زندگانی ترِی
لے گئی سی روہڑ کے پربت کفر دے بے شمار
آئی سی جد عرب وِنّوں چڑھ کے طغیانی ترِی
رکھ دتی توں راہ مولا فرزند دے گل تے چھری
بھل نہیں سکدی کدی دنیا نوں قربانی ترِی
نس گئے سن تخت چھڈ کے کئی بہادر سُورمے
جس جگہ بھی جا کے چمکی تیغ برّانی ترِی
عاجزاں وانگوں کیوں جھکدا جاوناں ایں ہر جگہ
نہ جھکی سی کسریٰ دے اگے پیشانی ترِی

عاجز مرحوم سے متعلق ایک اور بات یاد آئی کہ ۱۹۲۹ء میں کانگرس کا راوی کنارے جو اجلاس ہوا تھا اس میں موصوف نے جب ایک ولولہ انگیز نظم پڑھی تو مولانا ابوالکلام آزاد مائیک پر آئے اور کہا کہ جب میں جنت میں جاؤں گا اور اللہ کے فضل سے اُمید ہے ایسا ہو گا تو عاجز کا بازو پکڑ کر ساتھ لے جاؤں گا۔

اس طرح گویا میں نے اس نوعمری میں تین عظیم المرتبت شخصیتوں کی زیارت کی۔ رئیس الاحرار رحمہ اللہ، امیر شریعت رحمہ اللہ، اور عاجز مرحوم کی نسبت سے یہ یاد میری زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔ شہروں سے دُور ستلج کے کنارے ایک گاؤں میں ان حضرات کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

امیرِ شریعت رحمہ اللہ، کی دوسری زیارت نکودر میں ہوئی جہاں عید گاہ میں مجلسِ احرارِ اسلام کی ڈسٹرکٹ کانفرنس تھی اور یہ بھی اس دور کے لگ بھگ کی بات ہے اس میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ، کی ایک بات یاد ہے کہ ایک دیہاتی عورت آٹا گوندھ رہی تھی کہ کہیں دور سے ڈھول کی آواز آئی وہ عورت آٹا گوندھنے کی بجائے کھڑے ہو کر دھمال ڈالنے لگی۔ گھر والوں نے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے تو اس نے کہا سُنتے نہیں کہ ڈھول کی آواز آ رہی ہے انہوں نے کہا کہ آواز تو کہیں بہت دور ہے تو اس نے اس کیفیت میں کہا:

ایتھے کی تے اوتھے کی

چونکہ یہ بات ایسی تھی کہ ایک چھوٹا بچہ یاد رکھ سکتا ہے لہذا یاد ہے لیکن یہ یاد نہیں کہ یہ مثال کس بات کو سمجھانے کے لیے دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سوائے اس کے اور کچھ یاد نہیں کہ اس کانفرنس کے صدر استقبالیہ علاؤ لپور کے صاحبزادہ سید سلیمان صاحب تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد سانگلہ میں آباد ہوئے انہوں نے طویل سپاسنامہ یا خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ لوگ اس طویل تحریر سے بور ہو رہے ہیں کہ سامعین اور علاقہ

تقریباً دیہاتی تھا۔ اس کانفرنس میں صاحبزادہ سید فیض الحسن بھی تھے۔ مذکورہ بالا دونوں جلسوں کے متعلق میں نے بہت احباب سے دریافت کیا، کب تھے لیکن کسی نے تسلی بخش جواب نہیں دیا کہ جس سے میں صحیح سن کا تعین کر سکوں۔

اس کے بعد تیسرا جلسہ تلون ضلع جالندھر میں ہوا کہ جہاں کے مشہور لیڈر حبیب اللہ سعدی مرحوم خاکساری تھے اور اگر میری یادداشت کام کرتی ہے تو مولانا ضیاء الرحمان فاروقی کے والد ماجد مولانا محمد علی جانباز بھی اس قصبہ کے تھے۔ میں ان دنوں پرائمری کرنے کے بعد مدرسہ عربیہ رائے پور گوجراں میں قرآنِ مجید یاد کر رہا تھا اس جلسہ میں بھی رئیس الاحرار ساتھ تھے۔ رائے پور میں ہمارے استاد و مربی حضرت مولانا عبدالعزیز رحمہ اللہ، جو قیامِ پاکستان کے بعد چک نمبر ۱۱ چیچہ وطنی میں آباد ہوئے، لحیم شحیم اور ہمارے نزدیک خاصے وجیہ تھے اور واقعتاً وجیہ تھے لیکن اب بات جب ہو رہی ہے تو لکھنا پڑتا ہے کہ حضرت مولانا جب حضرت شاہ صاحب کے ساتھ سٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گو حضرت مولانا وجیہ ہیں لیکن حضرت شاہ صاحب کے ساتھ آتے ہوئے شاہ صاحب ہی نظر آ رہے تھے کہ ان کے علاوہ کسی پر نظر نہ ٹکتی تھی یہ ان دنوں کی بات ہے جب ۱۹۴۶ء کے انتخابات کی توقع کی جا رہی تھی۔ ان دنوں چونکہ میں قرآنِ مجید حفظ کر رہا تھا لہذا پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ہم تو قرآن پنجابی میں پڑھ رہے ہیں۔ عربی قرآن مجید تو یہ ہے جس کی تلاوت شاہ صاحب فرما رہے ہیں--- یہاں اچھی خاصی سیاسی تقریر تھی۔ چونکہ یہ بھی علاقہ دیہاتی تھا لہذا ایسی عام فہم تقریر تھی کہ جس کو گھاس کھودنے والے دیہاتی بھی سمجھ سکیں---- اور ان تینوں جلسوں کی حاضری کا حال یہ تھا کہ آج لاہور ایسے شہر میں بھی اتنے بڑے جلسے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ میں ساری تقریر میں مسلسل ٹکٹکی باندھے حضرت شاہ صاحب کی طرف دیکھتا رہا اب سب باتیں سمجھ آ رہی تھیں---- رئیس الاحرار اور امیرِ شریعت رحمہم اللہ، کی تقریریں ایک ہی نشست میں ہوئیں رعد کی کڑک اور بجلی کی چمک تھی۔

اس کے بعد ۱۹۴۶ء کا الیکشن آ گیا اور نکودر کی صوبائی نشست پر مجلسِ احرار اسلام کی جانب سے حضرت مولانا محمد علی جالندھری، مسلم لیگ کی جانب سے میرے رشتہ میں پھوپھا چودھری ولی محمد گوہیر اور یونینسٹ پارٹی کی جانب سے چودھری اسد اللہ خاں (آنریری مجسٹریٹ) کھڑے تھے ہمارے علاقے میں ایک بہت بڑا گاؤں سنگووال تھا جس میں ہمارے ایک بزرگ چودھری اسد اللہ خاں کے بہت قریبی دوست تھے باقی سارا گاؤں احرار کا حامی تھا۔ گوہیر صاحب مرحوم یہاں کے ایک بڑے قریبی گاؤں پرجیاں کے تھے اور اسد اللہ خاں مرحوم کا قصبہ مہت پور بھی دو میل پر تھا لہذا اس جلسے کی بہت دھوم تھی۔ ہم جلسہ گاہ جا رہے تھے اور مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ اور امیرِ شریعت رحمہ اللہ پیدل گاؤں کی جانب آ رہے تھے لوگ مصافحوں کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے---- حضرت شاہ صاحب کی عقابی نگاہیں دائیں بائیں لوگوں کو دیکھ رہی تھیں آپ نے دیکھا کہ ایک دو آدمی راستے سے ایک طرف گم سم کھڑے ہیں شاہ صاحب اِدھر گھوم گئے اور اُن سے پنجابی میں مخاطب ہوئے کہ "تُسیں اک پاسے کیوں

کھلوتے ہو" انہوں نے بڑی مدھم آواز میں کہا کہ "اسیں چوڑھے آں" ہم خاکروب ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر کیا ہوا آؤ گلے لگو اور اُن سے پُرزور انداز میں معانقہ و مصافحہ کیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ وہ بھرے جلسے میں پورے خاندان کو لائے اور مسلمان ہو گئے ---- میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ ہندوؤں کو ہم گالیاں دیتے ہیں لیکن اُن کے رسوم و رواج ہماری تہذیب و تمدن میں رچے بسے ہیں وہ اچھوتوں اور مسلمانوں کو اپنے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے ہم نے ہندوؤں کو تو کچھ نہ کہا لیکن اچھوتوں سے وہی برتاؤ کیا جو ہندو ہم سے کرتے تھے۔ اگر ہم ان سے وہ برتاؤ کرتے جس کا اسلام نے ہمیں سبق دیا ہے تو ہندوستان کے سب اچھوت مسلمان ہو جاتے مسٹر گاندھی نے تو ان کو قریب کیا لیکن ہم اسی طرح ان سے نفرت کرتے رہے قیامِ پاکستان کے بعد سب خاکروب عیسائی ہو گئے اور ہمارا معاملہ اب بھی ان سے وہی ہے اور یورپ سے انگریز پادری آ کر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا ہے ہم پادری اور انگریزوں کو اب تک گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن اپنے ملک کے عیسائیوں کو اسی طرح اچھوت سمجھتے ہیں جس طرح قیامِ پاکستان سے پہلے سمجھتے تھے۔ اگر متحدہ ہندوستان میں ہم ان سے انسانی اسلامی سلوک کرتے تو ہندو اکثریت میں نہ ہوتے مسلمان اکثریت میں ہوتے اور پاکستان کے مطالبہ کی نوبت ہی نہ آتی۔ اکبر نے ہندو راجاؤں سے تو رشتے ناطے کئے مگر اچھوتوں کو قریب نہ کیا اور افسوس زیادہ علما پر ہے کہ انہوں نے بھی ادھر توجہ نہ دی۔

یہاں ایک واقعہ لکھنا ضروری ہے جن دنوں مسٹر گاندھی ہندوؤں کو کہہ رہے تھے کہ اچھوتوں کو اپنے مندروں میں آنے دو اور کنوؤں پر جانے دو اور خود اچھوتوں کی بستی میں رہنے لگے تو مخدوم و محترم حضرت مولانا محمد ابراہیم جگرانوی رحمہ اللہ نے خیال کیا کہ مسٹر گاندھی کی تو یہ سیاسی چال ہے ہمارا تو دین اس کا حکم دیتا ہے کہ انسانیت کا احترام کیا جائے چنانچہ انہوں نے اپنے علاقے میں یہ مہم چلانا چاہی اور ایک گاؤں کے خاکروبوں سے کہا کہ ہم تمہارے گھر میں کھانا کھائیں گے لیکن اس طرح کہ تم ہمارے سامنے ہاتھ دھو کر برتن صاف کر کے ان میں کھانا پکاؤ۔ انہوں نے ایسا ہی کیا حضرت مولانا رحمہ اللہ نے کھانا کھایا قاری عصمت اللہ مرحوم ان کے ساتھ تھے وہ سُناتے تھے کہ مولانا تو بڑے سکون اور جمعیتِ خاطر سے کھانا کھا رہے تھے۔ بڑا اچھا گوشت اور حلوہ پکا تھا لیکن میں جب لقمہ منہ میں ڈالتا تھا تو وہ بجائے حلق کے نیچے جانے کے معدہ میں پہلی چیزوں کو بھی اوپر لا رہا تھا حضرت مولانا رحمہ اللہ سے بھی میں نے یہ قصہ سُنا، فرماتے تھے کہ لوگ ارد گرد جمع ہو گئے اور یہ خبر آناً فاناً علاقے میں پھیل گئی اور اگر میں کسی گاؤں میں جاتا تھا تو اس گاؤں کے لوگ خصوصاً بچے میری طرف اشارہ کر کے کہتے تھے "ایہہ او مولوی آ، جیہڑا چوہڑا ہو گیا----" اگر سب علماء ایسا کرتے تو وہ صورت ہوتی جو سنگووال میں ہوئی۔

سنگووال کی جلسہ گاہ ایک بڑا میدان تھی میں اب ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے لوگ موچی دروازہ یا مینارِ پاکستان کو ٹولیوں اور قطاروں کی صورت میں جلسہ گاہ کو جا رہے ہوں----- میں سٹیج کے قریب اتنا قریب بیٹھا کہ شاہ صاحب کا قریب سے بغور مشاہدہ کر سکوں اس علاقے میں چونکہ یونینسٹ پارٹی کے اُمیدوار کا آنریری مجسٹریٹ

ہونے کا رعب تھا لہذا حضرت شاہ صاحب کی تمام تر توجہ یونینیسٹ پارٹی اور اسد اللہ خاں کی طرف رہی اور شاہ صاحب ان صاحب کو پہلے سے جانتے تھے کیونکہ وہ صاحب دو دفعہ پہلے احرار اسلام اور راعی برادری کے اُمیدوار کے مقابلہ میں علی الترتیب ڈسٹرکٹ کونسل، اور صوبائی سیٹ پر کھڑے ہو کر ہار چکے تھے۔ لیکن اب پھر کھڑے تھے، اور زخم خوردہ سانپ کی طرح تھے لہذا شاہ صاحب نے اس جلسہ میں انہی کے متعلق تقریر کا زیادہ حصّہ صرف کیا اور مشہور کہاوت

موتیاں دے لونگ والیے تیری ہر مسّیا بدنامی

پڑھ کر اس کی خوب تشریح کی کہ ہمارے علاقے میں ہندو نام کو تھے اور "مسّیا" کا مفہوم نہ سمجھتے تھے لہذا اس کا سیاق وسباق بیان کیا۔ اب بھی شاید اکثر احباب اس کا مفہوم نہ سمجھ سکیں۔ "مسّیا" سکھوں کا ایک تہوار ہے جس میں مرد عورتیں رات کو کسی ندی، دریا یا چشمے پر نہانے جاتے ہیں۔ آماس سنسکرت میں مہینہ کو کہتے ہیں، اس سے "مسّیا" بنا۔

ایک شخص نے شاہ جی کو چٹ دی کہ گذشتہ صوبائی انتخاب میں مولوی پیر محمد کے لڑکے میاں عبدالرب کو آپ نے مجلس کے ٹکٹ پر کامیاب کرایا تھا۔ لیکن وہ سکندر حیات کے ساتھ مل گئے تو اگر اب مولانا محمد علی جیت کر کسی دوسری پارٹی میں چلے گئے تو پھر کیا ہوگا۔ اس پر شاہ صاحب نے آدھ پون گھنٹہ زمینداروں کے فہم کے مطابق مختلف مثالیں دیں کہ اگر ایک سال ٹڈی دل کھیتی چٹ کر جائے تو کیا تم اگلے سال گندم بونا چھوڑ دیتے ہو۔ اگر ایک سال یا دو سال مسلسل کماد کو کیڑا لگ جائے تو کیا کماد کی کاشت کرنا ترک کر دیتے ہو۔ اگر کسی سال خربوزے کی فصل اچھی نہ ہو تو کیا اگلے سال خربوزے کا خیال چھوڑ دیتے ہو۔ اور پھر آخر میں کہا کہ اگر تمہارے ایک دو بچے پیدا ہو کر مر جائیں تو کیا بیوی کے پاس جانا چھوڑ دیتے ہو--- نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ جدوجہد وسعی کرتے ہو کہ پہلی تلافی بھی ہو اور پھر مولانا محمد علی کی جانب متوجہ ہو کر کہا کہ اس دفعہ ہم نے ایک ایسا جنا "جوانمرد" کھڑا کیا ہے کہ جس کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ وہ جیت کر کسی اور پارٹی سے مل جائے گا، اور مولانا کے متعلق خاصی تعریفی تقریر کی "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" مثالیں دے کر خطاب کرنا شاہ صاحب پر ختم تھا۔

چند دن بعد چودھری ولی محمد گوہیر کے گاؤں "پرجیاں" میں جلسہ تھا اور جلسے کا اہتمام سکول کی وسیع گراؤنڈ میں تھا جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کا خطبہ اور نماز حضرت مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ ساہی وال نے پڑھائی جو ان دنوں خیر المدارس جالندھر میں استاد حدیث تھے۔ "پرجیاں کلاں" بہت بڑا گاؤں تھا پورا علاقہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تقریر سُننے کے لئے اُمڈ آیا تھا۔ اس زمانہ میں کسی گاؤں میں پندرہ بیس ہزار کا مجمع آج کے لاکھوں کے برابر تھا اور پھر جبکہ آج کل کے اخبارات پانچ سات ہزار کے جلسے کو لاکھوں کا مجمع بنا دیتے ہیں۔ وہ جلسہ آج کل لاہور کے بڑے جلسوں کے برابر تھا۔ جمعہ کے بعد مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ کی تقریر تھی۔ ایک جانب گوہیر صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ چونکہ تحریکِ پاکستان کا زور تھا لہذا مخالف موافق دونوں کا اجتماع تھا گو دیہاتی علاقہ تھا تاہم شرافت تھی تھوڑا بہت شور وغُل ہوا شاہ صاحب سکول کے کمرے میں تھے شور سُنا

تو فوراً جلسہ کی جانب آئے مجھے خوب یاد ہے کہ نسواری (براؤن) رنگ کی چادر باندھے ہاتھ میں لمبے دستے کی کلہاڑی لئے جسے پنجابی میں "ٹکوا" کہتے ہیں جلسہ کی طرف ذرا تیزی سے آئے مولانا جالندھری رحمہ اللہ کو فرمایا کہ تم تقریر ختم کرو انہوں نے آخری کلمات کہے اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تقریر شروع کی۔ بہت مختصر خطبہ پڑھا کہ وقت بھی کم تھا، اور تحریکِ پاکستان کے موضوع پر تنقیدی تقریر کی۔ آپ نے اپنی اس کلہاڑی کو سر کے برابر بلند کیا اور لکڑی کے دستے کے دونوں سروں کے متعلق کہا کہ یہ پاکستان ہے اور درمیان میں طویل ترین علاقہ ہندوستان ہے۔ اگر ادھر کی جانب کوئی ضرورت ہوئی تو اُدھر سے امداد نہیں پہنچ سکے گی اور ایسا ہی اس کے برعکس ہوگا اور یہ کہنا کہ ہندوستان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ہوگا محض طفل تسلی اور غلط فہمی ہے۔ نقصان ہمارا ہوگا چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ چھ کروڑ دوطرف تقسیم ہوں گے اور درمیان میں تیس کروڑ کی آبادی کا ملک ہندوستان ہوگا۔ تقریر اس قدر مدلل اور موثر تھی کہ سناٹا چھا گیا بخیر و عافیت جلسہ اختتام کو پہنچا یہاں سنگووال سے واپسی پر "مہت پور" کار پر پتھراؤ ہوا کہ وہ اسد اللہ خاں کا قصبہ تھا---

دو تقریریں خیر المدارس کے سالانہ جلسہ میں سُنیں۔ اور وہ بھی اسی زمانے کی تھیں اور اس میں بھی باوجود احتیاط کے سیاسی مسائل آگئے ایک تقریر میں **و ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت اید یکم**- کی آیت کریمہ پڑھی۔ تین ساڑھے تین گھنٹے تشریح کی علوم و معارف کا ایک سمندر تھا جو اس آیت کی تشریح کے ضمن میں بیان ہوا۔ اور خیر المدارس کے جلسہ میں حضرت شاہ صاحب نے "چکدش" والی نعت سُنائی تھی اور نعت میرا خیال ہے کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی موجودگی میں سُنائی تھی۔ یہ نعت شاہ صاحب کے کلام "سواطع الالہام" اور اب "ماہنامہ الرشید" کے تاریخی "نعت نمبر" میں شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے:

ہزار صبحِ بہار از نگاہ می چکدش
جنوں زسایہ زلفِ سیاہ می چکدش

خیر المدارس کے سالانہ جلسے اسی طرح اپنے زمانے میں معروف تھے جس طرح کبھی "انجمن حمایت اسلام" کے لاہور میں ہوتے تھے۔ عموماً جمعہ کے بعد تقریر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی ہوتی اور تیسرے دن آخری تقریر رات کو عشاء کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی۔ ملتان میں ابتدائی سالوں میں خیر المدراس کے جلسے اسی دُھوم دھام سے ہوتے لیکن ان سب جلسوں کی رونق حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اور ان اکابر کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اب مدارس میں جلسوں کا رواج تو ہے لیکن رسم نبھانے والی بات ہے وہ رونق تو کیا اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا---

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ کے ایک شاگرد حضرت فاضل رشیدی رحمہ اللہ نے ساہی وال میں سالانہ جلسہ کی طرح ڈالی اس جلسہ میں بھی ملک کے تمام بڑے علما تشریف فرما ہوتے---- شروع کے سالوں میں پہلی تقریر جمعہ کے بعد صاحبزادہ فیض الحسن صاحب کی ہوتی اور آخری شاہ صاحب کی۔ خیر المدراس کے جلسے عام خاص

باغ میں اور جامعہ رشیدیہ کے کمیٹی باغ میں میں ہوتے اور حاضری دیدنی ہوتی---- بعد میں دونوں جلسے مدرسہ کے احاطہ میں ہونے لگے۔

میں نے اور میرے بڑے بھائی حکیم حافظ محمد اسلم نے اپنے گاؤں ہرلی پور میں پہلا جلسہ کرایا۔ قیام پاکستان کے بعد مئی ۱۹۵۰ء کے پہلے ہفتے میں میاں چنوں مجلسِ احرارِ اسلام کی کانفرنس کرائی۔ ملتان کا ڈپٹی کمشنر مرزائی تھا میاں چنوں میں کوئی جلسہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ میری عمر تھوڑی تھی لہذا ناظم اعلیٰ مجلسِ احرارِ اسلام میاں چنوں کے نام سے دو دن کا جلسہ کرایا، اپنا نام نہ لکھا کہ جگ ھنسائی نہ ہو کہ مجلسِ احرارِ اسلام کو میاں چنوں میں ناظم اعلیٰ ایک لڑکا ملا حالانکہ بڑی عمر کے لوگ موجود تھے۔ ماسٹر تاج الدین صاحب، قاضی احسان احمد صاحب، جانباز مرزا، مولانا محمد علی جالندھری اور امیر شریعت رحمہم اللہ تشریف لائے---- اس جلسہ کا سارا اہتمام میں نے کیا۔

میاں چنوں کے ساتھ ایک چک نمبر ۱۳۰ تھا (اب وہ میونسپلٹی میں آگیا ہے) اس میں ایک مستری صاحب بنام محمد دین رہتے تھے شہر میں لکڑی کا اچھا کاروبار تھا۔ وہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مرید تھے ۵۰-۵۱ میں انہوں نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کو بیس ہزار روپیہ پیش کیا کہ آپ اپنا ملتان میں مکان بنوالیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا میاں صاحب آپ کی بچیاں ہیں ان کا نکاح کرنا ہے یہ روپیہ ان کے لئے محفوظ رکھیں۔ البتہ لاہور ساہی وال (اس وقت منٹگری) آتے جاتے ان کی دکان پر گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے تشریف لاتے بشرطیکہ کار پر لاہور ساہی وال جانا ہوتا۔ ایک دفعہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں دس بارہ دن ان کے گاؤں میں ان کے گھر قیام فرمایا ان دنوں مکتبہ رشیدیہ کے نام سے میں میاں چنوں میں دکان کرتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ تیس چک سے پیدل یا تانگہ پر سیدھے مکتبہ رشیدیہ تشریف لے آتے اور باہر بنچ پر یا دکان کے پچھلے کمرے میں چار پائی پر تشریف رکھتے اور لوگ زیارت کے لئے آتے۔ انہیں دنوں ربیع الاول تھا ہائی سکول میں آسی صاحب (ہیڈ ماسٹر) نے جلسہ رکھا اور کوشش کی کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تشریف لائیں لیکن آپ نہ مانے پھر ایک استاد حاضر ہوئے اور عرض کیا تشریف لے چلیں آپ نے انکار فرمایا انہوں نے کہا حضرت پیچھے شاید آسی صاحب بھی آتے ہوں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فوراً فرمایا کہ اس کے پیچھے تھانیدار صاحب بھی آتے ہوں گے---- اسی سفر کی بات ہے چک نمبر ۱۳۰ کی مسجد میں تقریر پر ضرور آمادہ ہوگئے۔ مسجد بھر گئی صحن میں جلسہ تھا۔ ایک نوجوان مشہور نظم پڑھ رہا تھا۔

دلا غافل نہ ہو یکدم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے

میں اندر گیا تو دیکھا حضرت شاہ صاحب سر جھکائے رو رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگی ہوتی ہے۔ اس کے بعد باہر تشریف لائے اور مختصر تقریر فرمائی جو پند و نصیحت اور ختم نبوت کے متعلق تھی۔ ایک دن مکتبہ میں تشریف رکھتے تھے کہ رازی پاکستانی کے چھوٹے چھوٹے بھائی آصفی نے کیمرہ سے تصویر بنانا چاہی لیکن رعب کے مارے ہاتھ کانپ گیا اور تصویر نہ بنا سکا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور شاہ صاحب کے بتائے ہوئے وظیفہ سے مستری محمد دین کے کئی لڑکیوں کے بعد لڑکا پیدا ہوا۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ آج کل امریکہ میں ہے اور بہت

اچھا کاروبار ہے----

میاں چنوں سے آگے کسووال کے تین چار میل اِدھر ایک چک میں میاں محمد شفیع رہتے تھے وہ شاہ صاحب کے عاشق تھے اور تقریباً ہر سال شاہ صاحب وہاں جلسہ پر تشریف لے جاتے اور مرزائیت و ختم نبوت کے متعلق تقریر کرتے۔

میں ملتان خیر المدارس میں دو دفعہ داخل ہوا ایک دفعہ ۱۹۴۸ء میں اور دوسری دفعہ ۱۹۵۳ء میں اکثر جمعہ مسجد "سراجاں" بازار حسین آگاہی میں پڑھتا جہاں مولانا محمد علی جالندھری تقریر کیا کرتے تھے، اور اس کے بعد حضرت شاہ صاحب کو سلام کرنے حاضر ہوتا---- ایک دفعہ حاضری ہوئی تو مرتضی احمد میکش، ملک نور الٰہی مالک اخبار "احسان" اور ابوسعید بزمی بیٹھے تھے گفتگو ہو رہی تھی یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ شاہ صاحب اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ سچ کہتے تھے (یہ ابتدائی سالوں کی بات ہے) شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک سائنس دان نے کہا کہ زمین گول ہے اور اس کو اس پر زہر کا پیالہ پینا پڑا لیکن اب سب لوگ کہتے ہیں کہ زمین گول ہے اس کے بعد مختلف باتیں سنجیدہ سی ہوتی رہیں پھر یہ لوگ جانے لگے شاہ صاحب نے پوچھا کہ اب کدھر کا ارادہ ہے میکش نے کہا کہ (ایک مولوی صاحب کا نام لے کر) فلاں طرف۔ آپ نے فرمایا میں تو سمجھتا تھا کہ اس شہر میں ہی آپ کا شناسا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی ہیں یہ صاحب مولوی نواب دین مرحوم کے لڑکے مولوی غلام ربانی تھے۔ جب یہ لوگ جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو شاہ صاحب نے شعر پڑھا۔

وہ آئے تو آئے نشیب و فراز دیکھ کر
اور جب چل دیئے تو بہر حال چلائے

اس پر وہ لوگ پھر بیٹھ گئے اور شعر و شاعری کی مجلس جم گئی۔

ایک دفعہ میں، رازی پاکستانی، آصفی پاکستانی حاضر ہوئے حضرت شاہ صاحب نے نفیس چائے پلائی۔ میں نے عرض کیا یہ لوگ تو لسی کے عادی ہیں فرمایا یہ تو تیری حسن طلب معلوم ہوتی ہے۔ آصفی سے نام پوچھا تو اس نے کہا کہ آصفی۔ فرمایا رازی کے وزن پر تو نازی چاہیے تھا---- پھر آصفی سے سلطنت آصفیہ دکن کی طرف ذہن منتقل ہو گیا اور آپ نے سورۃ ہمزہ لحن کے ساتھ تلاوت فرمائی اور جمع مالا وعددہ یحسب ان مالہ اخلدہ۔ اور ان سے اگلی آیات پر زور دے کر پڑھا اور فرمایا کہ آصفی سے تو ذہن اِدھر ہی منتقل ہوتا ہے آصفی نے آٹو گراف کے لئے کاپی پیش کی تو اس پر شعر لکھا:

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

یہی وقت رازی صاحب کو فرصت کا ملا اور انہوں نے جھٹ آپ کی تصویر لے لی آپ نے فرمایا کہ شرارت سے باز نہیں آئے یہی وہ تصویر ہے جو آغا شورش مرحوم نے آپ کی سوانح کے پہلے ایڈیشن کے شروع میں لگائی تھی کہ شاہ

صاحب کچھ لکھ رہے ہیں بہت خوبصورت پوز ہے

۱۹۵۲ء میں لیاقت علی کی شہادت ہو چکی تھی اور احرار دفاع کانفرنسیں کر رہے تھے۔ اوکاڑا میں دفاعِ پاکستان کانفرنس تھی میں ان دنوں جامعہ رشیدیہ مشکوٰۃ شریف پڑھ رہا تھا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد عبد اللہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۸۵ء) نے ازراہ کرم مجھے کتب خانہ میں سونے کی اجازت دی ہوئی تھی---- ایک رات تقریباً ایک بجے کا عمل ہو گا میں جاگ رہا تھا کہ میرے کانوں میں آواز آئی مولوی عبد اللہ، مولوی حبیب اللہ، میں چونکا کہ یہ تو شاہ صاحب کی آواز ہے۔ غلہ منڈی کی طرف گیٹ سے آواز آ رہی تھی میں دوڑ کر گیا اور دروازہ کھولا تو شاہ صاحب کے ساتھ مختصر سامان ٹوکری وغیرہ تھی، وہیں کتب خانہ میں لے آیا، ان دنوں محمودیہ ہائی سکول والی جگہ میں جامعہ رشیدیہ تھا تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں یہ جگہ ضبط کر لی گئی۔ میں نے عرض کیا میرے پاس سوجی گھی وغیرہ ہے حلوہ بنا لیتا ہوں آپ نے فرمایا کہ یہ جمعہ کی شب ہے جامعہ میں گوشت پکا ہو گا بوٹیاں وغیرہ تو نہیں ہوں گی دیگچہ میں بچا ہوا شوربہ پڑا ہو گا اور روٹیاں بھی ہوں گی وہ لاؤ---- میں اٹھا لایا اس کو گرم کیا اور دو تین روٹیاں اس میں ثرید بنا کر کھائیں اور کہا کہ لطف آ گیا ایسا مزا حلوے میں کہاں ہوتا--- صبح کو شیخ الحدیث مولانا محمد عبد اللہ صاحب، حضرت ناظم صاحب، حضرت مفتی صاحب، رحمہم اللہ اجمعین اور مولانا مقبول احمد سبھی فجر کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب کے پاس آ گئے اور بڑی علمی مجلس ہوئی میں چائے بنا رہا تھا۔ شاہ صاحب چائے دانی، عمدہ چائے، پان اور لوازمات ساتھ رکھنے کے عادی تھے۔ میں نے پتی چائے دانی میں ڈال کر ابلتا ہوا پانی اوپر ڈالا۔ دل و دماغ تو باتوں کی طرف تھے صرف ہاتھ کام کر رہے تھے شاہ صاحب گفتگو بھی فرما رہے تھے اور مجھے چائے بناتے بھی دیکھ رہے تھے پانی زیادہ پڑ گیا اور کیتلی سے باہر آ گیا شاہ صاحب نے فوراً فرمایا واکثرھم لا یعقلون۔

حضرت شاہ صاحب ۱۹۵۰ء سے مجھ سے متعارف تھے کہ جلسوں کا شوقین ہے مجھ سے پوچھا کہ جلسے میں چلو گے میں نے کہا ضرور لیکن حضرت مولانا سے اجازت لینا ہے شاہ صاحب نے میری سفارش کی تو حضرت مولانا نے شفقت سے ہنستے ہوئے فرمایا کہ آپ سفارش کریں یا نہ کریں میں اجازت دوں یا نہ دوں یہ تو ضرور جلسہ میں جائے گا۔ دل تو شاہ صاحب کے خادم کی حیثیت سے جانے کو چاہ رہا تھا لیکن میرے کپڑے دھلنے گئے ہوئے تھے لہذا عرض کیا کہ شام کو حاضر ہوں گا---- اوکاڑہ میں پہلی نشست کی صدارت ڈپٹی کمشنر منٹگمری (ساہی وال) نے کی اور احرار رضا کاروں نے سلامی دی۔ پورے صوبہ سے رضا کار سینکڑوں کی تعداد میں آئے ہوئے تھے، اور ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بھی تھا ہفتہ کے دن ہائی سکول میں میٹنگ ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ دیکھوں کہ میٹنگ میں کون کون شریک ہیں اور کس طرح کی بحث ہوتی ہے۔ لیکن باہر گیٹ پر پہریدار تلواریں تانے کھڑے تھے۔ میں ادھر سے ادھر گذر جاتا ایک دفعہ دیکھا شاہ صاحب صحن میں ٹہل رہے ہیں میں دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا شاہ صاحب کی نظر پڑی اور آواز دی۔ رضا کاروں نے تلواریں نیچی کر لیں اور میں اندر چلا گیا۔ میٹنگ میں سبھی لیڈر شریک تھے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اتنی بڑی میٹنگ کو ہوتے دیکھا عصر کی نماز کے بعد ویسے ہی ایک مجلس ہوئی جس میں خاص خاص احباب

شریک تھے چودھری افضل حق رحمہ اللہ کے بھتیجے چودھری ظہور الحق بھی موجود تھے۔ میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ لیاقت علی کے قتل کا حادثہ ہو چکا تھا حضرت شاہ صاحب نے اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے شعر پڑھا۔

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل

بے دست و پا کو دیدہ بینا نہ چاہیے

رات کو اے ڈی ایم ساہی وال کی صدارت اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر تھی۔ اے ڈی ایم کو میں پہلے سے جانتا تھا کہ اچھا مقرر ہے۔ اس نے شروع میں تقریر کی اور کہا کہ قدرت کے کام ہیں کہ آج مجھے ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا ہے کہ میں احرار کا شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے دفاع کانفرنسیں کر کے ملک کو بیدار کیا اور خون کو گرمایا لیکن تقسیم سے قبل میں فاضلکا میں تحصیل دار تھا اور وہاں شاہ صاحب کی تقریر تھی ڈی سی فیروز پور نے مجھے حکم دیا ہوا تھا کہ تمہارے شہر میں ایسا مقرر آ رہا ہے کہ اس کی تقریر میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اگر وہ لوگوں کو کہے کہ دریا میں چھلانگیں لگا دو تو وہ اس پر عمل کریں گے اور اگر کہے کہ آگ میں کود جاؤ تو لوگ اس پر عمل کریں گے۔ جب تقریر اس نقطہ پر پہنچے تو تم نے تحریر بھیجنی ہے کہ تقریر ختم کر دو، اگر ختم نہ کریں تو گرفتار ہی کرنا ہے۔ ڈپٹی کمشنر انگریز تھا میں حیران تھا کہ اس کی معلومات کس قدر ہیں بہر حال میں جلسہ گاہ میں گیا اور تقریر جب شباب پر پہنچی تو واقعی ایسا وقت آیا کہ میرے ضمیر اور نفس میں کشمکش شروع ہو گئی۔ ضمیر کہتا تھا کہ تقریر جاری رہنا چاہیے کہ ملک اور قوم کے مفاد میں ہے لیکن نفس کہتا تھا کہ اپنے حاکم کا حکم مانو ورنہ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے کئی منٹ یہ کشمکش رہی بالآخر نفس غالب آیا کہ تو نے ترقی کر کے نجانے کہاں تک جانا ہے اپنے افسر کی بات مانو میں نے رقعہ بھیجا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا حکم ہے کہ تقریر بند کر دیں اور جلسہ ختم کر دیں شاہ صاحب نے کہا پندرہ منٹ اور۔۔۔ میں نے کہا کہ نہیں احرار کا فیصلہ تھا کہ حکومت سے ٹکرانے کا ابھی موقعہ نہیں ہے لہذا شاہ صاحب نے تقریر ختم کر دی اور آج ڈپٹی کمشنر کا حکم ہے کہ شکریہ ادا کروں اس طرح قریباً آدھ گھنٹہ باتیں کر کے اے ڈی ایم بیٹھ گیا اور شاہ صاحب نے تقریر شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ تقریر پاکستان میں سُنی جانے والی تقریروں میں میرے لیے سب سے اہم تھی کہ اس میں خطابت کا وہ تمام شکوہ اور انداز موجود تھا کہ جس کی ہر کوئی تعریف کرتا تھا۔ اس تقریر میں زیادہ حصہ مرزائیت، ظفر اللہ اور لیاقت علی کا قتل تھا آپ نے فرمایا کہ عدالت کی کرسی ہو اور فیصلہ میں نے کرنا ہو تو پھر میں تفصیل سے وہ تمام باتیں مدلل لکھ کر ثابت کروں کہ اس قتل میں اصل ہاتھ ظفر اللہ کا ہے۔ اس لئے کہ احرار کی کوششوں سے وزیر اعظم لیاقت علی خاں پر مرزائیوں کے تمام منصوبے اور عزائم منکشف ہو چکے تھے۔[1] آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ مرزائی وزیر خارجہ آج تک

۱۔ احرار کا سب سے پہلا رابطہ مسلم لیگ سے جو ہوا وہ میاں چنوں مسلم لیگ کے دفتر میں ہوا کہ میر خلیل الرحمان سیکرٹری پاکستان مسلم لیگ کی زمین میاں چنوں کے قریب تھی قاضی احسان احمد صاحب خلیل الرحمان سے ملے دونوں کی تخلیہ میں بات چیت ہوئی اس کے بعد خواجہ ناظم الدین اور وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم سے مفصل ملاقاتیں ہوئی۔

افغانستان کیوں نہیں گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومتِ افغانستان نے دو مرزائی مبلغوں کو ختم نبوت کے انکار پر شرعی سزا دی تھی ہمارا وزیرِ خارجہ افغانستان کو اس کی سزا دے رہا ہے، اور پاکستان اور افغانستان جو آپس میں بھائی ہیں ان کو اس نے ایک دوسرے کے مدِ مقابل کھڑا کر دیا ہے، اور فرمایا کہ افغانستان کے لوگ پاکستان کے خلاف اس طرح مشتعل ہیں گویا ہماری ان سے کفر و اسلام کی جنگ ہے اور یہاں شاہ صاحب نے سر سے ٹوپی اُتاری، بالوں کو بکھا دیا اور ڈاڑھی کو منہ میں لیا اور کلہاڑی کو کندھے پر رکھا اور فرمایا کہ اس مرزائی کی وجہ سے افغانستان کے لوگ ہمارے خلاف اس طرح مشتعل بیٹھے ہیں اور یہاں پھر وہی شعر پڑھا جو شام کی مجلس میں پڑھا تھا اُس وقت تو عام لہجہ میں تھا مگر اب یہ شعر پورے درد و سوز اور ترنم سے پڑھا۔ مجمع کی یہ حالت تھی کہ اگر سوئی گرے تو اس کی آواز آئے۔ ہر شخص اس المیہ کا درد اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔

سردیوں کا آغاز تھا اور اس دن بارش بھی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود فٹ بال گراؤنڈ لوگوں سے بھری ہوئی تھی حضرت شاہ صاحب کی یہ تقریر تقریباً تین گھنٹہ جاری رہی----

آپ نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآنِ پاک کی آیت کریمہ واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوالله وعدوكم و آخرين من دونهم- پڑھ کر اس کا ترجمہ اور تشریح کی و اعدوالهم ما ستطقم من قوة کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں اپنی پوری قوت جمع کرو اپنی طاقت کی حد تک۔ جبکہ کسی اور فرض اور رکن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ پوری قوت خرچ کرو لیکن جہاد کے متعلق یہ فرمایا ترهبون به کے متعلق کہا کہ اس کا معنی ہے کہ "اوہناں نوں یرکا دیو" "اوہ یرک جان۔" پھر فرمایا میں کہ آپ کو بتاؤں کہ "یرکنے" کا مفہوم کیا ہے اور سوال کیا کہ کیا تم نے کبھی دو سانڈوں کو لڑتے دیکھا ہے فرمایا کہ دونوں خوب زور آزمائی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو پیچھے ہٹ ہٹ کر ٹکریں مارتے ہیں بالآخر ایک میدان چھوڑ دیتا اور بھاگنا شروع کرتا ہے دوسرا اُس کا تعاقب کرتا ہے بھاگنے والے کو "موک" (اسہال) لگ جاتی ہے اور وہ ہرا ہرا پتلا گوبر نکالتا، مسلم لیگ کا جھنڈا بناتا ہوا سر پٹ بھاگتا ہے (یہ بات شاہ صاحب نے از راہ تفنن کہی) اسے کہتے ہیں "یرکنا" فرمایا ترهبون به کا ترجمہ اُردو میں یہ ہے کہ اتنی تیاری کرو کہ اللہ کے دشمنوں پر تمہاری دھاک بیٹھ جائے اس دھاک بیٹھنے کو پنجابی میں فرمایا "یرکا دیو" اس کے بعد ہے وآخرين من دونهم لاتعلمونهم الله يعلمهم- اور دوسروں پر ان کے سوا۔ جن کو تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے۔ فرمایا کہ یہ ہمارے ملک کے ففتھ کالم ہیں اور سب سے بڑے ففتھ کالم مرزائی ہیں---- جن لوگوں نے اوکاڑہ کی یہ تقریر سُنی ہے ان میں سے بہت سے زندہ ہوں گے وہ گواہی دیں گے کہ اس تقریر میں شاہ صاحب کی جوانی کی جھلک نظر آتی تھی۔ افسوس کہ شاہ صاحب کے زمانے میں ٹیپ ریکارڈر نہیں تھے اگر ہوتے تو آج لوگوں کو پتہ چلتا کہ خطابت کس کو کہتے ہیں اور شاہ صاحب کیسے خطیب تھے آخر کوئی بات تو ہے کہ ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، بہادر یار جنگ، جیسے یگانہ روزگار خطیبوں نے آپ کی خطابت کا اعتراف کیا۔

آج بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ بتاؤ شاہ صاحب کی تقریر کیسی تھی ان کو کیا بتایا جائے اور کیا مثال دی جائے---- میرا احساس ہے کہ دعوت و عزیمت میں ابوالکلام، قومی شاعری میں علامہ اقبال اور عوامی خطابت میں امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی مثال شاید اُردو زبان میں کبھی پیدا ہو۔ جیسا شاہ صاحب خطیب تھے اس کے دس پندرہ فیصد کے قریب بھی کسی کو نہیں دیکھا۔

میں نے اپنے استاد حضرت مولانا عبداللہ دھرمکوٹی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ شاہ صاحب کی جوانی کیسی تھی آپ نے مختصر سا فقرہ کہا فرمایا شاہ صاحب کی جوانی قہر تھی۔ (آپ کا فقرہ تھا "جوانی سی؟ قہر سی!") پنجابی زبان کے مشہور واعظ حضرت مولانا عبدالعزیز ملسیانوی سے میں نے یہی سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ ابتدا میں قصبات میں بجلی نہیں ہوتی تھی گیس لیمپ ہوتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب دورانِ تقریر جب سر سے ٹوپی اُتار کر سر کو جنبش دیتے تھے تو آپ کے بالوں کی حرکت کے ساتھ لوگوں کے دل حرکت کرتے تھے

گذشتہ سطور میں رازی صاحب، آصفی صاحب کی شاہ صاحب سے ملاقات کا ذکر گذرا اس میں ہم میں سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت سُنا ہے آپ کی تقریر مسعود کھدر پوش نے ریکارڈ کی تھی آپ نے فرمایا کہ ہاں میرے علم کے بغیر ایسا ہوا تھا---- اس کی کچھ تفصیل سُنائی یہ مفصل قصہ مولانا مجاہد الحسینی کی زبانی میں نے سُنا تھا---- مظفر گڑھ میں ایسی ہی کوئی دفاع کانفرنس تھی اور مسعود کھدر پوش بحیثیت ڈپی سی صدر تھے۔ مسعود مرحوم کسی غیر ملک سے اس زمانے کی ٹیپ ریکارڈر لائے تھے یہ ٹیپ مشین خاصی بڑی ہوتی تھی اور اس کا مائیک لاؤڈ سپیکر کے ساتھ باندھنا پڑھتا تھا اس کی چرخی بھی (کیسٹ) خاصی بڑی ہوتی تھی شاہ صاحب کے سٹیج پر تشریف لانے سے قبل مائیک کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ کا مائیک باندھ دیا گیا تھا۔ شاہ صاحب آئے تو پوچھا کہ یہ کیا ہے بتایا گیا کہ آپ کی تقریر ریکارڈ کریں گے شاہ صاحب سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم میری تقریر کے ریکارڈ تیار کرکے "دینے قوال" کی طرح سُنا اور سُنایا کرو گے۔ (دینا قوال اپنے زمانے کا بہت بڑا قوال تھا اور اس کی نظیر آج تک نہیں ہوئی) اسے اُتارو۔ قیل و قال کا کوئی سوال نہ تھا فوراً وہ مائیک اُتار لیا گیا اور شاہ صاحب کچھ دیر خاموش سوچتے رہے اور منتظمین نے ٹیپ کا مائیک ایک سپیکر کے ساتھ رکھ دیا اور ساری مشین بھی اُٹھا کر وہاں رکھ دی۔ شاہ صاحب کو اس کا علم نہ ہوا آپ نے اپنے مخصوص انداز میں خطبہ مسنونہ پڑھا اور تقریر کی---- اگلے دن یہ طے ہوا کہ شاہ صاحب کو یہ تقریر سُنائی جائے نوابزادہ نصر اللہ صاحب نے کہا کہ شاہ صاحب ذرا سیر کر آئیں--- کار پر باہر نکلے تو ایک بڑی کوٹھی کے سامنے کار جا رکی اور وہاں مسعود مرحوم استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم نے بہت بُرا کیا میں ساری زندگی کسی افسر کے مکان پر نہیں گیا لیکن مسعود صاحب سے پرانی شناسائی بھی تھی انہوں نے بڑھ کر سلام کیا۔ شاہ صاحب کار سے اُترے اور اندر ڈرائینگ روم میں جا بیٹھے۔ انہوں نے پہلے سے رات والی تقریر کا گھر میں سُنانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ بیٹھے ہی تھے کہ اچانک ایک جانب سے لحن داوٗدی میں الحمد للہ کی بلند آواز آئی۔ حضرت شاہ صاحب الحمد للہ کہہ کر کچھ دیر کے لئے خاموش رہ کر پھر دوسری دفعہ الحمدللہ کے ساتھ

نحمدہ پڑھنا شروع کرتے تھے۔ کاش صرف "الحمدللہ" ہی (ریکاڈ) محفوظ ہو جاتا تو اس سے خطاب اور تلاوت کا اندازہ ہوتا۔ اب جب یہ آواز آئی تو آپ ایک دم متوجہ ہوئے معلوم ہونے پر آواز کی جانب جا کر پاؤں پر بیٹھ کر دونوں ہتھلیاں رخساروں پر رکھ لیں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور فرمایا کہ کلکتہ سے پشاور تک کروڑوں انسانوں نے میری بارہا تقریریں سُنی ہیں لیکن میں آج پہلی دفعہ اپنی آواز سن رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سُن کر خوشگوار حیرت ہوئی ہو گی اور کہا کہ میں نے محسوس کیا کچھ تھوڑا بہت بول لیتا ہوں۔

جب شاہ صاحب سے ہماری یہ گفتگو ہو رہی تھی اب مجھے یاد نہیں مولانا سید عطاء المھیمن پاس بیٹھے تھے یا سید عطاء المومن، کم عمر تھے انہوں نے تبصرہ کیا کہ آج کل اکثر و بیشتر مقرر حضرات کی تقریر اگر ان کو سُنائی جائے تو وہ گالی دے کر پوچھیں گے کہ یہ کون بکواس کر رہا ہے۔

اس کے بعد ایک دفعہ لاہور میں قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ تشریف لائے ہوئے تھے ان دنوں مسعود مرحوم لاہور تھے پھر پروگرام بنا کہ آج شاہ صاحب کی مجلسی گفتگو ریکارڈ کی جائے چنانچہ طے ہوا کہ صبح کا ناشتہ ان کے ساتھ کیا جائے۔ باہر نکلے کار پر بیٹھے لیکن تھوڑی دُور جا کر فرمانے لگے کہ طبیعت رک رہی ہے جی نہیں چاہتا کہ اپنے شیخ کے پاس سے اُٹھ کر کسی افسر یا دنیادار کے پاس جایا جائے۔ کار واپس کرو اور واپس تشریف لے آئے اور وہ تقریر جو مظفر گڑھ میں ریکارڈ ہوئی تھی کسی خال خال شخص کو اس کا پتہ تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ لاہور آنے پر مسعود مرحوم سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میرے پاس بہت سی ریلیں ہیں کسی دن تلاش کروں گا۔ پھر پتہ کیا تو فرمانے لگے کہ وہ گرمی سے جڑ گئی ہیں۔ میں ۱۹۷۸ء میں انگلستان گیا تو وہاں بہت سے دوستوں نے کہا کہ وہ ریل ان سے لو اب تو ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے اس کو کسی صورت درست کر لیں گے اور ۸۳ء میں تو بہت اصرار سے دوستوں نے توجہ دلائی لیکن اسی دوران میں مسعود مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ ع

آں قدح بشکست و ساقی نماند

اللہ کو منظور نہیں تھا کہ امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی تقریر عام ہو اس طرح آج کل کے خطبا کا بھرم رہ گیا ورنہ کوئی کسی کو نہ پوچھتا۔ کس نے پرسد کہ بھیا کیستی"

جیسا کہ معلوم ہوا میری حضرت شاہ صاحب سے قدرے بے تکلفی تھی میں نے ایک دن شاہ صاحب سے پوچھا کہ حضرت کبھی آپ نے ایسا بھی محسوس کیا کہ آپ تقریر کرنے میں بے بس ہیں آپ نے فرمایا کہ ہاں دو دفعہ ایسی صورت حال پیش آئی ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ الہ آباد میں جواہر لال نہرو کے والد موتی لال نہرو کی صدارت میں جلسہ تھا اور سائمن کمیشن آیا ہوا تھا کانگرس نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا اور اسی سلسلے کا جلسہ تھا۔ موتی لال کی تقریر پہلے تھی۔ خالص سیاسی مسئلہ تھا۔ سامعین میں ہندو زیادہ تھے موتی لال نے اس قدر مدلل اور مسکت تقریر کی کہ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ حیران تھا اور سر جھکائے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لوگ کہیں گے مولوی کو دو تین تقریریں یاد تھیں وہ یہاں کر گیا اب کچھ پاس نہیں ہے کہ موتی لال نہرو نے یہ کہہ کر تقریر ختم کی کہ

اب میں آپ کے محبوب مقرر کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا۔ اس پر میں نے سر اُٹھایا دیکھا تو پنڈال کے آخری سرے پر کچھ رضا کاروں (والنٹیروں) نے سائمن کمیشن کی ارتھی (جنازہ) اُٹھائی ہوئی ہے اور وہاں رکھ کر اس کو آگ لگانا تھی، جونہی میری اس پر نظر پڑی مجھے یہ شعر یاد آگیا

ہوئے مَر کے تم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

بس میں نے بلند آواز سے یہ شعر پڑھا تو موتی لال نہرو نے اپنے زانوؤں پر دو ہتڑ مارا اور کہا کہ شاہ صاحب آپ نے میری ساری تقریر کا بیڑا غرق کر دیا (یا ستیاناس کر دیا) بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ موضوع یکسر پلٹ گیا تھا میں نے تین چار گھنٹہ تقریر کی۔

اور ایک واقعہ آگرہ کا ہے کہ بہت بڑا جلسہ تھا پنڈال کے درمیان سٹیج تک جانے کا راستہ بنا ہوا تھا میں وہاں سے گزر کر سٹیج کی جانب جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ لوگوں کے چہرے پڑھتا جا رہا تھا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لوگوں کے چہروں سے موضوع کا انتخاب کرتا ہوں اور چہروں کو دیکھ کر بھانپ لیتا ہوں کہ کیا صورتِ حال ہے ہر سو پچاس آدمیوں میں سے ایک کے پاس اخبار تھا میں دیکھتا سوچتا آگے بڑھتا رہا اور سٹیج پر پہنچ گیا۔ وہاں میز پر انقلاب اخبار کی ایک کاپی پڑی تھی جس میں میرے متعلق ایک بے سروپا بات لکھی ہوئی تھی کہ اس نے فلاں جگہ یہ تقریر کی (کہ گاندھی کا پیشاب کوثر و زمزم کے پانی سے پوتر ہے) بات ایسی تھی کہ کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا میں یہ اخبار پڑھ کر سوچنے لگا کہ میں پہل کروں یا مجمع پہل کرے کہ اتنے میں پنڈال کے آخر میں سے ایک شخص نے مجھے گالی دے کر کہا کہ اس کی ڈاڑھی پکڑو اور سٹیج سے اُتار دو میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ "شرابی ہے بکواس کرتا ہے۔" لوگوں نے اس کا مُنہ سونگھا تو شراب کی بُو آ رہی تھی بس پھر کیا تھا اس کی پٹائی ہوئی اور امیر شریعت زندہ باد کے نعرے لگے اور میں نے گھنٹوں تقریر کی---- قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ شاہ صاحب اپنے متعلق اس قسم کی باتیں کرنے یا سُنانے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی کبھی بعد از تقریر کسی سے پوچھتے کہ سُناؤ کیسی تقریر رہی اور نہ ہی کسی کو یہ جرأت ہوتی تھی کہ تقریر کی تعریف کرے جیسا آج کل کا معمول ہو چلا ہے---- یہ تو میری بے تکلفی یا یوں کہیے کہ اس طرح کی باتوں میں دلچسپی دیکھ کر بات سُنا دی---- میرا خیال ہے کہ یہ دونوں واقعات یا پہلا واقعہ آغا شورش مرحوم کی کتاب میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ حضرت کوئی بزرگ یا رہنما ایسے بھی تھے کہ جہاں آپ اپنے آپ کو محسوس کرتے ہوں کہ یہاں بات کرنا مشکل ہے فرمایا وہاں دو جگہیں ایسی تھیں کہ ایک جگہ تو دو تین دفعہ ہی جانا ہوا دوسری جگہ البتہ بارہا گیا بارہا اکٹھے خطاب کیا تاہم ایک رعب اور حجاب رہا میں نے عرض کیا یہ کون حضرات تھے فرمایا ایک حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد

حضرت تھانوی رحمہ اللہ والا واقعہ میں نے بالتفصیل اپنے استاد حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ سے بھی سُنا تھا وہ یہ کہ جب علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کا انتقال ہو گیا تو احساس ہوا کہ کوئی اور جگہ ہونا چاہیے کہ جہاں جا کر دُعا کرائی جائے ان دنوں قادیاں کانفرنس والی تقریر پر مقدمہ چل رہا تھا اور سنگین نوعیت کی دفعات کے تحت کیس قائم ہوا تھا شاہ صاحب حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ کے پاس جالندھر گئے اور کہا کہ تھانہ بھون جانا ہے انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ قاعدہ ہے کہ جانے سے پہلے اطلاع دیتے ہیں اور ویسے بھی میں چند دنوں پہلے حاضری دے کر آیا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا کہ نہیں میرے ساتھ چلیں چنانچہ دونوں حضرات نے تھانہ بھون جانے کا قصد کیا۔ سہارنپور جا کر شاہ صاحب نے پوچھا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کھانے کی کونسی چیز پسند کرتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ سنگترے مرغوب ہیں چنانچہ ایک ٹوکری سنگتروں کی لے لی۔ سہارنپور کے احباب نے رات واپسی پر تقریر کا وعدہ لے لیا اب جب تھانہ بھون جانے والی گاڑی پر بیٹھے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرا تو دل گھبرا رہا ہے واپس ہو جائیں مولانا نے کہا کہ اتنی دُور سے مجھے لائے ہیں اب چلنا چاہیے۔ تھانہ بھون پہنچے تو حضرت گھر جا چکے تھے مولانا حضرت کو اطلاع دینے گھر گئے اور حضرت سے ملتے ہی فرمایا کہ آیا نہیں لایا گیا ہوں اور ساری روداد اور پھر گاڑی والا قصہ سُنایا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ چلیں میں آتا ہوں۔ مولانا اور شاہ صاحب تالاب کے پاس اپنے دھیان کھڑے تھے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تشریف لے آئے اور ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے شاہ صاحب دوزانو بیٹھ گئے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شاہ صاحب بے تکلفی سے بیٹھیں اس طرح تادیر بیٹھنا آپ کے لئے مشکل ہوگا کوئی تکلف یا حجاب کی بات نہیں ہے۔ دیکھئے میں ٹوپی پہن کر آیا ہوں پگڑی نہیں، اور پھر آتے ہی چارپائی پر لیٹ گیا ہوں تاکہ بے تکلفی کا ماحول پیدا ہو۔ چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور پھر شاہ صاحب نے کچھ اشعار سُنائے اور دُعا کی درخواست کی۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پوچھا کہ آپ کی جماعت کا چندہ کتنا ہے آپ نے کہا کہ ایک روپیہ سالانہ---- حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے غالباً ۲۵ روپے نکال کر دیے اور کہا اتنی مدت کے لئے تو ممبر سمجھیے او اس کے بعد زندہ رہا تو پھر سہی اور فرمایا کہ خط و کتابت رکھئے لیکن اس کے لیے اپنا مرموز نام بتایا اور شاہ صاحب کو بھی فرمایا کہ آپ اس نام سے خط لکھا کریں---- فرمایا اپنا اپنا کام کرنے کا انداز ہے ہم دونوں ایک ہی کام کر رہے ہیں---- اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت---- حضرت تھانوی رحمہ اللہ سمجھ گئے اور فرمایا کہ ہاں شاہ جی آپ میرے لئے کیا لائے ہیں شاہ جی نے بتایا تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ تشریف رکھیں میں کسی کو بھیج کر منگواتا ہوں ایک دو دفعہ کے اصرار و انکار کے بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اچھا آپ ہی لائیں۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ بہت بڑے خطیب ہیں میں آپ کی چال سے پہچانوں گا۔ اب شاہ صاحب اپنی چال بھول گئے۔ پاؤں رکھتے کہیں ہیں اور پڑتا کہیں ہے بہر حال ٹوکری لائے اور لا کر کھڑے سوچتے ہیں کہ کہاں رکھوں۔ حضرت تھانوی خاموش ہیں آپ نے پائینتی کی جانب رکھدی تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا اوہو شاہ صاحب یہ تو سر پر رکھنے کی چیز تھی---- حضرت مولانا خیر محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے بعد کسی ایک موقعہ پر

جب شاہ صاحب کا ذکر چھڑا تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان کی باتیں تو عطاء الٰہی ہوتی ہیں---- یہاں ضمناً ایک بات ذکر کرتا چلوں کہ حضرت شاہ صاحب بزرگوں کا بہت ادب کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی اللہ والے کے پاس جاؤ تو کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور لے کر جاؤ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق میں نے تفصیل نہیں پوچھی آغا شورش نے "چٹان" میں لکھا تھا کہ ایک دفعہ شاہ صاحب مولانا آزاد کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے تو مولانا باہر کھڑے تھے اور کہیں جانے کی تیاری تھی لیکن کار میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ مولانا جب کسی عجلت میں ہوتے تھے تو ان کے کندھے جنبش کیا کرتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد فرمایا کہ میرے بھائی! اس کم بخت کو اسی وقت خراب ہونا تھا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے کندھے حاضر ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ میرے بھائی ان پر تو پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔

ایک دفعہ کانگریس کی عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا کہ شاہ صاحب مولانا آزاد سے ملنے گئے اندر چٹ بھیجی تو مولانا باہر تشریف لے آئے شاہ صاحب صوفے پر بیٹھے تھے اُٹھ کھڑے ہوئے مصافحہ ہوا اور شاہ صاحب قالین پر بیٹھنے لگے تو مولانا نے ہاتھ پکڑا شاہ صاحب نے ابھی اتنا ہی کہا کہ حضرت---- (یعنی میں قدموں میں بیٹھوں گا) تو مولانا نے فرمایا کہ "میرے بھائی! وہ بات تو ہو گئی۔" بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ میرے تایازاد بھائی کا فون آیا جو مسلم لیگی ہیں اور کٹر مسلم لیگی۔ پوچھا کیا کر رہے ہو میں نے بتایا کہ شاہ صاحب پر مضمون لکھ رہا ہوں تو انہوں نے بتایا کہ میں نے آپ کی دو تقریریں سنی ہیں ایک ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں کسی گاؤں میں اور ایک نکودر، جب وہ نکودر ہائی سکول میں پڑھتے تھے انہوں نے کہا کہ آپ کا قرآن مجید پڑھنا ایسا تھا کہ ہندو تک مسحور ہو جاتے تھے اور پھر نکودر میں جو تقریر کی اس میں انگریز کے مظالم کا ذکر کیا تو سارا مجمع ہندو مسلم دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

مضمون طویل ہو گیا لیکن ایک دو باتیں مزید سنیے مولانا حبیب اللہ فاضل رشیدی رحمہ اللہ ناظم جامعہ رشیدیہ کی روایت ہے کہ لاہور میں جمعیۃ علماء ہند کا جلسہ تھا اور احرار رضا کار سرخ وردیاں پہنے جلسہ گاہ میں بطور حفاظت موجود تھے کہ جمعیت کے ایک بزرگ نے (مولانا مفتی محمد نعیم) حضرت مدنی سے فرمایا کہ یہ لوگ سرخ قمیصیں پہنے پھر رہے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ احرار نے جلسہ کروایا۔ جمعیت جلسہ نہیں کر سکتی تھی۔ حضرت ساتھیوں کی رائے کا بہت احترام کرتے تھے فرمایا کہ میں شاہ صاحب کو کہے دیتا ہوں چنانچہ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے شاہ صاحب سے فرمایا کہ رضا کاروں سے کہہ دیں کہ وہ وردی اُتار دیں۔ شاہ صاحب جانتے تھے کہ حضرت سے کسی نے کہا ہے ورنہ آپ از خود ایسی بات نہیں فرما سکتے تاہم ادب ملحوظ رکھتے ہوئے دل پر جبر کر کے رضا کاروں سے کہا کہ وردیاں اُتار دو۔ اس کے بعد جلسہ شروع ہو گیا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا خطبۂ صدارت تھا آپ مائیک پر آئے ہی تھے کہ مسلم لیگی نوجوانوں کا ایک جم غفیر سٹیج کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ اس پر حضرت شاہ صاحب نے فراستاً مفتی صاحب سے کہا

کہ جلسہ کا انتظام سنبھالئے اب وہ ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہیں اور پریشان ہیں۔ تب حضرت شاہ صاحب اٹھے اور حضرت مدنی رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ تشریف رکھیں اور خود کھڑے ہو کر گرجدار آواز میں کہا کہ تمام احرار رضا کار اپنے فرائض سرانجام دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔ پھر کہا کہ کوئی سپاہی جلسہ کے اِرد گرد نظر نہ آئے تیسری بات یہ کہی کہ جو عنصر شرارتی ہے ان کو میں تنبیہ کرتا ہوں کہ جہاں کھڑا ہے وہاں بیٹھ جائے ورنہ میں اپنے رضا کاروں کو بزن کا حکم دوںگا۔ کچھ لوگ آگے بڑھتے رہے اور باقی بیٹھ گئے یا سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اب جب کچھ لوگوں کو شاہ صاحب نے کھڑے دیکھا تو احرار رضا کاروں سے کہا کہ اپنی ذمہ داری پوری کریں۔ بس پھر کیا تھا پانچ چار منٹ میں سب لوگوں کی پٹائی ہو گئی۔ فاضل رشیدی فرماتے تھے کہ شرارتی لوگوں کو بھاگنے کا راستہ نہ ملا اور کئی ایک افراد کو موچی دروازے کے ساتھ گندے نالے میں گر پڑنے پر نکالا گیا۔ جن لوگوں کو نکالا گیا ان میں مشہور سیاسی رہنما مولانا عبدالباری بھی تھے۔ حضرت شاہ صاحب اور رئیس احرار مولانا حبیب الرحمان رحمہ اللہ کی وجہ سے احرار رضا کاروں کی ایسی تربیت اور انتظام تھا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ۱۹۴۰ء سے پہلے جناح صاحب کی ایک تقریر اُن کی درخواست پر احرار رضا کاروں نے اپنی حفاظت میں کرائی جبکہ سر فضل حسین وغیرہ جلسے میں گڑبڑ کرانا چاہتے تھے۔ اسی تنظیم اور مقبولیت کی وجہ تھی کہ سر فضل حسین نے مسجد شہید گنج کا ملبہ احرار پر گرایا۔

حضرت شاہ صاحب مشکل سے مشکل مسئلہ کو عام دیہاتیوں کو، پڑھے لکھے لوگوں کو اس طرح سمجھا دیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ایک دفعہ معراج پر تقریر کر رہے تھے کہ لمحہ بھر میں سب کچھ کیسے ہو گیا۔ مختلف توجیہات و تشریحات کرتے رہے کہ حضور ﷺ کائنات کی روح تھے جب اس روح نے مرکز کی جانب سفر شروع کیا تو ہر چیز اپنی جگہ رک گئی، تھم گئی--- پھر دیکھا کہ کچھ ان پڑھ دیہاتی لوگ سمجھ نہیں رہے تو فرمایا:

ترے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

(محبوبہ کے لونگ کی چمک پڑی تو ہل چلانے والوں کے ہاتھ ہل چلانے سے رک گئے) اور مسئلہ نظری کی بجائے بدیہی بن گیا اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔ کوئی تو بات تھی کہ آغا شورش مرحوم جیسا خطیب اکثر دورانِ تقریر رندھی ہوئی آواز میں آپ کا ذکر کرتا تھا آغا مرحوم لاہور موچی دروازہ ہی میں ایک بہت بڑی اہل حدیث کانفرنس جو خاص پس منظر میں منعقد ہوئی تھی تقریر کر رہے تھے کہ شاہ جی یاد آ گئے بے اختیار پنجابی میں کہا کہ عطا اللہ شاہ بخاری (رحمہ اللہ) کتھے یاد آ گئیوں اج تری بڑی لوڑ سی۔ ترا ایک کالا کوا آج موچی دروازے میں کائیں کائیں کر رہا ہے--- کیا یہ کچھ کم خراجِ عقیدت ہے آخر میں آپ کی ذہانت اور حاضر جوابی کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں روز نامہ "جنگ" راولپنڈی میں ایک عالم حافظ ریاض اشرفی مرحوم کام کیا کرتے تھے۔ میں ان کی زندگی میں جب بھی پنڈی جاتا تو ان سے ضرور ملتا۔ بہت بڑے عالم خطیب تھے میرا خیال ہے کہ اگر وہ خطابت کو ہمہ وقت اختیار کرتے تو شاید حضرت شاہ صاحب کی خطابت کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ میں ایک دفعہ غلام احمد پرویز کی تقریر سُننے گیا۔ پرویز صاحب نے بڑا رو رو کر تقریر کی، میں بہت متاثر ہوا اور حضرت شاہ صاحب سے ذکر کیا تو حضرت شاہ

صاحب نے فوراً فرمایا:

"جاؤ حافظا صرف رون تو متاثر ہو گیاں اور پھر لحن داودی میں قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھی و جاؤ اباھم عشاء یبکون - یوسف کے بھائی اس کو کنویں میں گرا کر رات کو روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے۔"

حافظ صاحب کہتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کا یہ آیت پڑھنا تھا کہ میرا دل آئینے کی طرح صاف ہو گیا، اور پرویز کی باتوں کا ذرا بھی اثر نہ رہا۔

پکار وادیٔ خاموش سے خدا کے لئے
ترس گئے ہیں تری آواز دل کشا کے لئے

حضرت شاہ صاحب جیسا عاشقِ رسول ﷺ میں نے کیا کسی نے بھی نہیں دیکھا ہو گا---- سن ہ چکا ہے۔ جسم کی توانائی ختم ہو چکی ہے زبان ساتھ نہیں دیتی پھر بھی راولپنڈی میں مولانا غلام اللہ خاں رحمہ اللہ کے جلسہ میں ختم نبوت کے موضوع پر تقریر کی یہ تقریر بوجوہ ضائع ہو گئی یا کر دی گئی البتہ اس کا ساتھ آٹھ منٹ کا حصہ باقی محفوظ رہ گیا ہے اکثر لوگوں کے پاس ہے۔ میں نے برطانیہ لے جا کر اس کو تھوڑا صاف کرایا لیکن پھر بھی ضعفِ زبان کی وجہ سے بمشکل سمجھ آتی ہے اور وہ جتنی بھی ہے بوڑھے شیر کی ایسی للکار ہے کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخصیت جب صحت مند ہو گی تو کیا قیامت ہو گی۔ ختم نبوت کا مسئلہ گو ۱۹۷۴ء میں حل ہو گیا لیکن اس کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں امیرِ شریعت رحمہ اللہ کا سب سے زیادہ کردار ہے۔ آپ نے عوام و خواص میں مرزائیت کو گالی بنا دیا۔ آخری عمر میں آپ کو سوائے ختم نبوت کے کچھ کام نہیں تھا کچھ یاد نہ تھا حتیٰ کہ آپ نے انتہائی ضعف کی حالت میں چارپائی پر لیٹے لیٹے اس مشن کی خاطر تقریریں کیں اور کون کہتا ہے کہ سید بخاری رحمہ اللہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ انہی کی لگائی ہوئی آگ تھی کہ جس میں انگریز کا یہ خود کاشتہ پودا خشک ہو کر جل گیا۔ آپ کے دو مشن تھے ہندوستان کی آزادی اور مرزائیت کا خاتمہ الحمدللہ ایک آپ کی زندگی میں پورا ہو گیا اور دوسرے کے متعلق فرمایا کہ میں نے ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت میں ٹائم بم رکھ دیا ہے جو اپنے وقت پر پھٹا، اور اس نے مرزائیت کے قلعہ میں شگاف کر دیے۔

مجھے بارہا یہ خیال آیا کہ اگر سید بخاری رحمہ اللہ مکہ معظمہ حاضر ہوتا اور کعبہ کو دیکھتا تو اس کی کیا کیفیت ہوتی اور اس کے بعد مدینۃ الرسول ﷺ روضۂ اطہر پر حاضری ہوتی تو اس سید زادے کی کیفیت دیدنی ہوتی۔ آپ حسان بن ثابتؓ کے قطعہ کو وہاں جا کر پڑھتے اور درود و سلام کا ہدیہ پیش کرتے تو درو دیوار وجد میں آ جاتے اور شاید یہ سید وہیں اپنی جان اپنے نانا ﷺ پر نچھاور کر دیتا لیکن آپ کے پاس پوری زندگی میں کبھی اتنی رقم نہیں آئی کہ آپ پر زکوٰۃ فرض ہوتی، حج کا سفر تو دور کی بات ہے---- یاد آیا، ابھی اگلے روز میں جناب احمد ندیم قاسمی کے ہاں گیا تو وہاں مولانا گرامی رحمہ اللہ کا دیوان رکھا تھا۔ میں نے اُسے دیکھنا شروع کیا کہ معاً شاہ جی رحمہ اللہ کی شان میں کہی گئی رباعی سامنے آ گئی۔ دیکھیے کتنی برمحل ہے۔

شیخِ اکمل آں بخاری مردِ راہ — حضرتِ سید عطاء اللہ شاہ
بیخودِ آں نازشِ فقرم کہ چید — میوۂ قربِ حضور از شاخِ آہ!

میں نے آپ کی آخری زیارت مولانا محمد اکرم کی کوٹھی (ماڈل ٹاؤن لاہور) پر کی اس دن آپ کے استاد حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ کی کراچی میں وفات ہوئی تھی شیخ حسام الدین نے آپ کو یہ خبر سنائی اور اس کو سن کر آپ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے لیکن آواز نہیں نکلتی تھی۔ آپ کا جسم ایسا کسرتی اور اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ شاید و باید لیکن حساس بہت تھے اور پھر اپنے جسم و جاں سے اتنا کام لیا کہ اس کو دیکھ کر شیروں کا پتا پانی ہو جائے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر آپ اپنے جسم سے اتنا کام نہ لیتے تو آپ کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ سو سال سے زیادہ تک جیتے۔ لیکن بات تو وہی ہے جو آپ سے مولانا آزاد نے کہی۔ شاہ صاحب نے مولانا سے کہا کہ خدا کرے کہ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ اللہ آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔ مولانا نے فرمایا "نہیں میرے بھائی! تھوڑی ہو مگر قرینے کی۔" سو آپ نے اپنی زندگی ایک مشن میں بتا دی۔ ۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ء کو ملتان میں آپ کی وفات ہوئی۔

ایمرسن کالج کی گراؤنڈ نے ایسا کثیر اجتماع کسی جنازے میں کاہے کو دیکھا ہوگا۔ اگر آپ کا جنازہ لاہور ہوتا تو اگلے پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ جاتے۔ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، فیصل آباد، شیخوپورہ اور لاہور سے اتنے لوگ اکٹھے ہوتے کہ دنیا دیکھتی۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے — جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

رات کو ملتان قاسم باغ میں جلسہ ہوا۔ تمام احرار اکابر نے تقاریر کیں اور مولانا مظہر علی اظہر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا کہ "امیر شریعت رحمہ اللہ نے اس دنیا سے جاتے ہوئے ہم سب کو ایک دفعہ پھر اکٹھے کر دیا ہے یہ ان کی بعد از مرگ کرامت ہے۔"

مجلسِ احرار اسلام کے قائدین اور عوام سبھی مخلص تھے دو ایک جو جدا بھی ہوئے تو انہوں نے مجلس یا باقی حضرات کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہی جو دیانت امانت اور اخلاص یا نظریہ پر حملہ ہو۔ جانبین میں برابر احترام رہا۔۔۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے:

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری — نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش — قلندری و قباپوشی و کلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے — انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انھیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد — یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

جانباز مرزا

تیرے قدموں میں رہا تاج فرنگی کا وقار

تیری آواز سے ہے زلزلہ کہساروں میں تیری آواز سے ہے حشر جہانداروں میں
تو نے آباد کئے سینکڑوں ایماں کے دیار تیرے قدموں میں رہا تاجِ فرنگی کا وقار
تو نے دیکھا تو زمانے کی نگاہیں بدلیں اک قدم تیرا اٹھا، کفر نے راہیں بدلیں
تیرا انداز خطابت ہے پیمبر کا سنگھار تجھ سے وابستہ رہا ختم نبوت کا وقار
تیری اک ضرب سے زنجیرِ کہن ٹوٹ گئی عہد افرنگ کی ہر شاخ چمن ٹوٹ گئی
شاہ گفتار ہے تو صاحبِ کردار ہے تو وقت اک قافلہ ہے، قافلہ سالار ہے تو
جب بھی ٹکرایا کبھی کفر کے ایوانوں سے ہاتھ الجھے ترے شاہوں کے گریبانوں سے
تیری تقریر سے تقدیر بدل جاتی تھی آئینہ لاکھ ہو تصویر بدل جاتی تھی
پھر سے منصور کا اندازِ سخن پائیں گے تیرے نغمات کبھی دار و رسن گائیں گے
گرچہ فرعون رہے تیرے خریداروں میں تو خریدا نہ گیا مصر کے بازاروں میں
تجھ سے تاریخ کے عنوان بدل جائیں گے تو نہ ہو گا تو مسلمان بدل جائیں گے

وقت دہرائے گا اس دور کے افسانے کو
عقل خود چاہے گی جانباز سے دیوانے کو

حافظ عبدالرشید ارشد

شاہ جی کی زندہ تحریک

ہر خاندان یا جماعت کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ برصغیر کی سیاسی جماعتوں میں مجلسِ احرار اسلام ایسے سرفروشوں کی جماعت تھی کہ جو ہر وقت جان ہتھیلی پر اور کفن، کندھے پر لیے پھرتے تھے۔ ''احرار'' نام کا پوری جماعت میں اثر تھا کہ حریت و جرأت چھوٹے سے چھوٹے رضا کار کی گھٹی میں پڑی تھی اور خوف نام کی چیز ان کی چرمی میں نہ تھی اور نہ ہے۔ یہ لوگ اس لکڑی کی طرح ہیں جو ٹوٹ تو سکتی ہے لیکن لچک نہیں کھا سکتی۔ اور یہ سب کچھ زعمائے احرار، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مفکر احرار چوہدری افضل حقؒ اور دوسرے احرار رہنماؤں کی تربیت کا اثر تھا کہ اب بھی کہیں اگر کوئی پرانا احراری مل جائے تو اس کی باتیں اورحالات پر بغیر کسی خوف اور لومۃ لائم کے رواں دواں تبصرہ سن کر محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں جب ان کی یہ حالت ہے تو اس وقت جب جماعت باقاعدہ پنجاب میں انگریز کے خلاف اپنا کردار ادا کر رہی تھی اس وقت کیا ہو گی۔ اپنے وقت کے شیخ اور مجلس احرار اسلام امد تحریک تحفظِ ختمِ نبوت کے مربی و سرپرست حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی مجلس میں کسی شخص نے کسی احرار رہنما کے متعلق کچھ نامناسب الفاظ کہے تو حضرت رحمہ اللہ جوش میں آ گئے اور فرمایا کہ خبردار کوئی ان لوگوں کے متعلق میری مجلس میں اس طرح کی کبھی بات نہ کرے اور فرمایا کہ تم لوگوں میں کوئی ان سا جانباز بھی ہے۔

ہمارے ایک دوست از راہ تفنن کہا کرتے تھے کہ کسی عام احرار مقرر کی تقریر سنو تو اس کا انداز یہ ہوتا تھا کہ گرجدار آواز میں خطاب کرتے ہوئے کہتا کہ چرچل تو بھی سُن لے ہٹلر تو بھی سُن لے، مسولینی تو بھی سُن لے اور جاپان......... تو بھی سُن لے گویا وہ ان لوگوں کو ایسا خطاب کرتے کہ وہ اُن کے برابر کے حریف اور مقابل ہیں---- یہ تو ایک لطیفہ تھا واقعہ یہ ہے کہ مجلسِ احرار اسلام جب شباب پر تھی تو ان کی تقریروں کی بازگشت برطانیہ کے ایوان پارلیمنٹ میں سُنی جاتی تھی مسجد شہید گنج کے واقعہ کے لگ بھگ مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ نے دہلی دروازے کے باہر برطانوی ایمپائر (سلطنت) کے متعلق اتنی زور دار تقریر کی کہ پنجاب کی حکومت کے درودیوار ہل گئے سر فضل حسین کی سی آئی ڈی بہت مضبوط تھی اور اس کو پل پل کی خبر ملتی تھی سر فضل حسین نے کہا کہ مولوی حبیب الرحمان لدھیانویؒ نے یہ تقریر کی ہے اور اس سے پہلے احرار کے دفتر میں کھانے کے لیے کچھ نہ تھا چند آنے کے بھنے چنے کھا کر احرار لیڈر جلسے میں گئے اور ایسی آتشبار تقریر کی اگر خدانخواستہ ان کو کچھ سرمایہ یا اقتدار فراہم ہو جائے تو نمعلوم کیا حال ہو۔

عام لوگوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ سید اگر آگ میں چھلانگ لگا دے تو اس کو آگ نہیں جلاتی، لفظاً یا ظاہراً یہ ہر سید کے لیے صحیح ہو یا نہ ہو لیکن امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ واقعتاً ساری عمر آگ میں گھرے رہے لیکن ان کے حوصلے میں کمی ہوئی نہ ہمت نے ساتھ چھوڑا۔ شاہ صاحبؒ جلال و جمال کا مجموعہ تھے ان کا جمال رضاکاروں کو ان کے گرد پروانوں کی طرح اکٹھا رکھتا تھا اور ان کا جلال دشمنوں کے لیے خصوصاً برطانوی استعمار اور اس کے گماشتوں کے لیے تیغ براں تھا جس کی کاٹ کا کوئی جواب نہ تھا۔ فرمایا کرتے کہ میری عمر جیل یا ریل میں گذر گئی کل ہی مجھ سے ایک شخص پوچھ رہا تھا کہ قلندر کسے کہتے ہیں اور ساتھ کہا کہ لوگ کہتے ہیں اس زمانہ کا قلندر اقبال تھا۔ میں نے کہا اقبال کو تو نہیں دیکھا لیکن شاہ صاحبؒ کو قریب سے دیکھا ہے سنا ہے پڑھا ہے، جانچا ہے آپ کو جس طرح اور جس سمت سے دیکھیں محسوس ہوتا تھا کہ قلندر ایسے ہوتے ہیں وہ قلندر کہ جس کے متعلق کسی نے کہا ہے:

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

علامہ اقبال مرحوم بھی آپ کی بے حد قدر کیا کرتے تھے، اور آپ اقبال کے مداح تھے لیکن یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ کبھی دو چار دفعہ اقبال کے پاس گئے انھوں نے خود بتواتر اور دوسروں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ فلاں شخص اقبال کے بہت قریب تھا۔ تاریخ کو مسخ اور محرف کرنے کے باوجود سچائی کی روشنی تاریکی کی دبیز تہوں کو پھاڑتی ہوئی نمودار ہو جاتی ہے پسرِ اقبال جناب جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال نے تین جلدوں پر اقبال کی زندگی پر ایک کتاب بنام "زندہ رود" لکھی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس میں خاصے حقائق آگئے ہیں کہ جن کی روشنی میں بہت کچھ دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں پنجاب اسمبلی میں بطور امیدوار کھڑے ہوئے ان انتخابات کے متعلق جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں:

> "جلسوں کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا ان جلسوں میں مولانا غلام مرشد اور ملک لال دین قیصر کے علاوہ جو معروف شخصیتیں تقریریں کیا کرتی یا نظمیں پڑھتی تھیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں مولانا محمد بخش مسلمؒ، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ، مولانا مظہر علی اظہرؒ۔ بڑے بڑے جلوس بھی نکلتے جن میں اقبالؒ شامل ہوتے۔" (زندہ رود جلد ۳ صفحہ ۳۰۰)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ مولانا مظہر علی اظہرؒ کے ۱۹۲۶ء میں اقبال سے گہرے تعلقات تھے جبھی تو جاوید اقبال صاحب نے ان کا معروف شخصیتیں کہہ کر ذکر کیا ہے۔ اور پھر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور علامہ اقبال دونوں شخصیتیں ایسی تھیں کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق نہ ہو اور پھر جب اقبال خود بیٹھ کر بخاری کی تقریر سنتا ہوگا تو اس کا کیا احساس ہوتا ہوگا

اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے. بخاری کی عمر ان دنوں ۳۶، ۳۵ سال ہوگی اور اقبال کی ۵۰ سال۔

اب تھوڑا سا حال دوسری طرف کا بھی سُن لیجیے، کہ جو لوگ آج اقبال کے مجاور بننے کے دعویدار ہیں وہ اقبال کی زندگی میں اقبال پر کفر کے فتوے لگاتے رہے اس کتاب کے صفحہ نمبر ۳۰۲ پر جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

"ملک محمد دین کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے "زندہ رود" نے اداراتی نوٹ لکھا کہ جن مسلمانوں نے ملک محمد دین کے حق میں اپنے ووٹ ڈالے ان میں دو ہزار تو ناخواندہ ارائیں تھے جو اقبال کی علمی قابلیت سے ناواقف محض تھے باقی چار پانچ سو پرچیاں غالباً ان حضرات نے ڈالیں جنھیں "بریلوی حنفیت" کا ہیضہ تھا اور جو ایک صنال مُضل مقامی اخبار اور حزب الاحناف کے اسلام فروشانہ پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے۔"

اب علامہ اقبال کے متعلق پورا لٹریچر پڑھ جائیے آپ کو سوائے اس حوالے کے یا جہاں سے یہ لیا گیا ہے اس کے سوا کہیں سے یہ پتہ نہیں چل سکے گا کہ بخاری و اقبال کے کیا تعلقات تھے آغا شورش کاشمیری نے "چٹان" کے مختلف شماروں میں ضرور روشنی ڈالی ہے کہ بخاری و اقبال کی اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ بخاری، اقبال کے پاس جاتے تو بخاری "یا مرشد" کہہ کر اپنی آمد کا اعلان کرتے اقبال کہتے "آ بھئی پیرا بہت دناں بعد آیاں ایں۔"---- اس کے بعد اقبال حقہ ہٹا دیتے۔ سیدھے ہو کر بیٹھ کر کلی کرتے رکوع سنتے پھر بخاری سے اپنا کلام سنتے لیکن اس کے متعلق یہ کہہ دیا جائے گا کہ یہ تو احرار کے سالاروں میں سے تھے لیکن یہ بھول جائیں گے کہ "یوم اقبال" کو سج دھج سے منانے کی جو طرح آغا شورش کاشمیری نے ڈالی اور تا عمر جس آن بان شان اور کرّوفر کے ساتھ وہ مرکزی مجلسِ اقبال کے سیکرٹری جنرل رہے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ بخاری کے ایک والہ و شیدا نے یومِ اقبال" کو ہر سال منانے کو انتہا تک پہنچا دیا اور یہ تقریب لاہور میں اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے علاوہ کسی اور تقریب میں وہ رونق اور وارفتگی نہیں ہوتی جو "یومِ اقبال" میں ہوتی ہے اور آغا صاحب نے آمریت کے ادوار میں بھی حریت کی روح کو زندہ رکھنے کے لیے اس سٹیج سے کام لیا۔ مجھے یاد ہے کہ محمد ایوب خاں کے مارشل لاء کے اوئل میں "یومِ اقبال" جناح ہال میں منایا گیا۔ اس کے مقررین میں جسٹس کیانی اور چودھری محمد علی بھی تھے کیانی نے تو اپنے طنز و مزاح کے انداز میں مارشل لاء کی مخالفت کی کہ پہلے لوگ سبز باغ دکھاتے تھے آج کل کالا باغ دکھاتے ہیں لیکن چودھری محمد علی مرحوم نے بڑے جذبے اور جرأت سے گفتگو کی اس پر آغا شورش کاشمیری نے چودھری صاحب کو اپنے مخصوص انداز اور مترادف الفاظ میں جو خراجِ تحسین پیش کیا اور خود جس قلندری کا مظاہرہ کیا وہ آغا صاحب کی بے مثال جرأت اور شجاعت کی حیران کن مثال تھی کہ اس پر سری عدالت قائم کر کے کوڑے بھی لگائے جاسکتے تھے اور انجام تختہ دار بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر سٹیج پر بیٹھے ہوئے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل بختیار صاحب بار بار پہلو بدلتے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس جلسہ میں چیف جسٹس کیانی (غالباً) مہمان خصوصی یا صدر تھے ورنہ شاید دوران اجلاس

ہی گرفتاری عمل میں آجاتی تو یہ احراری کردار تھا جو آغا صاحب کو "احرار" سے ملا تھا۔ اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شورش جیسے نڈر اور بے باک شخص کی جگہ "احرار" ہی میں ہو سکتی تھی۔

بات اقبال و بخاری کی ہو رہی تھی کہ ان کے تعلقات کا ثبوت ۱۹۲۶ء میں تو دستاویزی ہے اور اس سے پہلے یہ مراسم کب قائم ہوئے اس کا اقبالیات کے ماہرین ہی بتا سکتے تھے لیکن وہ اس معاملے میں مہر بلب رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ پتہ نہ چل جائے کہ مجلسِ احرارِ اسلام کے برصغیر کے ان چوٹی کے لیڈروں سے کیسے تعلقات تھے جو بعد میں سیاسی حالات و نظریات کی بناء پر ایک دوسرے سے دُور ہو گئے اور قیامِ پاکستان کے بعد جدید محققین اور مورخین نے تو کمال ہی کر دیا کہ ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت آزادی پسند جماعتوں کو عوام سے روپوش کرنے کا بطورِ خاص اہتمام کیا گیا لیکن قدرت کا اپنا انتظام ہے اللہ تعالیٰ نے مجلسِ احرارِ اسلام کے ایک شاعر جانباز سے "کاروانِ احرار" کی آٹھ جلدیں تحریر کروائیں کہ جس میں برصغیر کی گذشتہ تمام تحریکوں کا حال پڑھا جاسکتا ہے۔ اور اسی جانباز نے کتاب "تحریک مسجد شہید گنج" لکھ کر تحریک شہید گنج کا پورا ملبہ کھدوا دیا کہ وہ اس کے عینی گواہ تھے۔ اور ایسے ہی ایک مسماۃ، محترمہ روزینہ پروین صاحبہ سے "جمعیتہ علماء ہند کے خطبات مدون کروا کر حکومت کے ایک ادارے سے شائع کروا دیئے۔ اور اسی طرح جناب ایچ بی خاں صاحب نے "برصغیر پاک وہند میں علماء کا کردار" نامی کتاب لکھی جو "قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت" اسلام آباد نے شائع کی۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مجلسِ احرارِ اسلام کے متعلق ایک اقتباس قارئینِ کرام کے سامنے پیش کیا جائے:

مجلسِ احرارِ اسلام اور کشمیری مسلمان

"مجلسِ احرارِ اسلام ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی تھی جمعیت احرار کی تاسیس اور تشکیل میں، جن لوگوں نے حصہ لیا وہ زیادہ تر علماء تھے۔ الا یہ کہ بقول چودھری خلیق الزمان، چودھری افضل حق ایک سابق پولیس ملازم۔ تھے۔ مگر بہت ہی دیانت دار اور بڑی سمجھ بوجھ کے حامل تھے، اور ثانیاً غازی عبدالرحمان بھی علماء میں سے نہ تھے۔ باقی تمام موسسین حضرات میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، مولانا عبدالقادر قصوریؒ، وغیرہ طبقۂ علماء میں سے تھے۔[1] ان کے علاوہ بعد میں جو لوگ اس جماعت میں شریک ہوئے یا اس جماعت سے متعلق تھے ان میں زیادہ تر علماء ہی تھے۔ مثلاً مولانا غلام غوث ہزارویؒ، اس جماعت کے شرکاء میں جو لوگ طبقۂ علماء میں سے نہ تھے، ان کا عمل و کردار بھی صالح اور متدین تھا۔"[2]

"اسی جذبہ مساوات و اخوت نے، احرارِ اسلام کو کشمیری مسلمانوں کی حالتِ زار کی طرف متوجہ کیا، جو

۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۵۴۶ پیامِ مشرق "۱۴- اگست ۱۹۵۴ء، ص ۲۸ (اداریہ) Path Way to Paklsatn .

۲۔ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۳۹۶-۳۹۷ "خطباتِ احرار" ص ۵۵-۷۷ مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۵۴۷

کشمیر میں اکثریتی فرقہ ہونے کے باوجود خستہ حالی اور پریشانی میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انھیں اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے اکتوبر ۱۹۳۱ء میں احرار اسلام نے ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف ایک تحریک شروع کی، اور کشمیر میں داخل ہو کر مسلمانانِ کشمیر کے حقوق بحال کرانے کے لیے سول نافرمانی کی، اور اپنے ہزاروں رضا کار جیل میں پہنچا دیئے، (۱) مجلسِ احرارِ اسلام کے روح رواں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو بھی اس تحریک میں زیرِ دفعہ ۱۲۴ الف ایک سال کی قید و بند برداشت کرنی پڑی۔ (۲) حسب بیانِ سابق اس جماعت کا قیام ۱۹۲۹ء میں ہوا تھا۔ مگر اس میں شریک علماء و دیگر حضرات ملکی سیاست میں تحریکِ خلافت اور جمعیت علماء ہند کی تشکیل کے وقت ہی سے عملی حصّہ لے رہے تھے اور اس نے اپنی تشکیل کے بعد بھی اپنا سیاسی مسلک، جمعیت علماء ہند دہلی کی مطابقت میں ہی رکھا۔ نیز ملک کے سیاسی مفاد اور مسلمانانِ ہند کے سیاسی اور مذہبی حقوق کے پیش نظر کانگریس کے ساتھ بھی تعاون کیا۔ لہذا کانگریس کے متعصب اور مہاسبھائی ذہنیتوں کے حامل افراد پر تنقید بھی کرتے رہے، اور اپنے دین متین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بھی شعبہ تبلیغ بھی قائم کیا۔ جماعت احرار اسلام نے بیک وقت مندرجہ ذیل اُمور انجام دیئے یعنی سیاست ملکی، خدمتِ خلق، رضاکاروں کی تنظیم، ردِ مرزائیت، مدحِ صحابہؓ اور مسجد شہید گنج کی بحالی وغیرہ وغیرہ، احرارِ اسلام نے مندرجہ بالا اُمور میں حتی المقدور کوشش کی نیز اپنی مالی او اقتصادی مشکلات کے باوجود جماعت کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے برابر کوشاں رہی۔"(۳)

آپ نے مندرجہ بالا کتاب کا اقتباس پڑھا اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں بہت کچھ ہے اور وہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے جبکہ شروع میں صفحہ نمبر ۵، ۶ پر یہ درج ہے:

علماء کے طبقے یا علماء کی اقسام:

عام طور پر علماء کی دو قسمیں ہیں یعنی علماء حق، اور علماء سوء۔ علماء حق کا سب سے پہلا اور اہم کام نہی عن المنکر" یعنی بھلائی پھیلانا اور برائی سے روکنا ہے مگر علماء سوء جائز و ناجائز کا خیال کیے بغیر ابن الوقتی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں یوں تو احادیث کی کتابوں میں علماء حق کے متعلق بہت سے اقوال اور احادیث موجود ہیں جن میں سے ایک معروف حدیث یہ ہے کہ العلماء ورثۃ الانبیاء۔ یعنی علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں اس ضمن کی ایک دوسری حدیث یہ ہے افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جابر۔ یعنی سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جابر ظالم سلطان (حکمران) کے سامنے بلا جھجک حق بات

۱۔ پیام مشرق ۱۳، اگست ۱۹۵۴ء، صفحہ ۲۸، مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۵۴۳

۲۔ "بیس بڑے مسلمان" صفحہ ۵۶۷ ۳۔ خطباتِ احرار صفحہ ۲۷

کہہ دی جائے۔"

اور پھر اس ۴۰۸ صفحات ۲۰×۳۰=۸ سائز کے صفحات میں اس کی تفصیل ہے اختصاراً قطب الدین ایبک سے لے کر التمش کا ذکر کرتے ہوئے عہدِ مغلیہ کے دور کو لیتے ہوئے ۱۹۴۰ء تک برصغیر میں علماء کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

سچ کڑوا ہوتا ہے۔ بُرا لگتا ہے سچ کہنے والوں کو دار و رسن سے گزرنا پڑتا ہے اور انقلابِ زمانہ سے بعض دور ایسے بھی آتے ہیں کہ اس کو چھپایا جاتا ہے لیکن حق اور سچ چھپنے کے لیے نہیں آتا وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے اور اس کی روشنی سے تاریک راہوں میں تحریکیں اپنی مشعل کے لیے تیل حاصل کرتی ہیں۔ آج کل نہ چاہتے ہوئے بھی اخبارات میں سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، تحریک ریشمی رومال، ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، کا نام بار بار آتا ہے۔

اکبر اور جہانگیر کے مزار و قلعے سیر و تفریح گاہ بنے ہوئے ہیں لیکن مجدد الف ثانی کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

احرار اسی قبیلہ سے تھے جیسے جیسے زمانہ گزرے گا ان کی یاد زیادہ آئے گی، تذکرہ نکھر کر سامنے آئے گا۔ اور ردِ مرزائیت، تحفظ ختم نبوت میں تو اس کے کردار نے اس کو عالمِ اسلام کی اہم جماعتوں میں شامل کر دیا ہے۔ یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس کا تذکرہ ان شاء اللہ پھر کسی فرصت میں کیا جائے گا۔

★★★

فرمایا:

مسلم لیگ والو! تم ہندوستان کے مسلمانوں کا حل پاکستان بتاتے ہو۔ میرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تمہاری مجوزہ تقسیم سے کبھی حل نہیں ہوگا۔ ہاں اس سے دس کروڑ مسلمان تین حصوں میں بٹ جائیں گے۔

جواہر لال کو...... تم، اشوک (۱) کا تخت بچھا کر دے رہے ہو۔ ہندو کو اتنی بڑی سلطنت (۲) اس کے بعد کبھی نہیں ملی۔

---

(۱) اشوک اعظم (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق م): قدیم ہندوستان کا نامور راجہ، ۲۵۵ ق م میں تخت پر بیٹھا۔ ہمالیہ سے مدراس تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔

(۲) بھارت کا موجودہ رقبہ ۱۲۶۱۵۹۷ مربع میل اور پاکستان کا موجودہ رقبہ ۳۱۰۴۰۳ مربع میل ہے۔

حافظ لدھیانوی

دلوں کو چھیڑ گئی اس کی شوخی گفتار

اپنے ملتان کے قیام میں، میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہ کی ادبی، علمی، مذہبی اور روحانی صحبتوں سے مستفیض ہوا۔ علم و ادب کے بے شمار گوشے آداب و اخلاق کے کئی پہلو سامنے آئے۔ بزرگان دین علمائے کرام کے علم و فضل، طہارت و تقویٰ، زہد و ورع اور روحانی کمالات کی کئی داستانیں شاہ جی رحمہ اللہ علیہ کی زبانی سنیں۔ قلب و ذہن کو منور کیا۔ ماضی کے نقوش حال کے آئینے میں جلوہ گر ہوتے رہے۔ شاہ جی رحمہ اللہ کی صحبتوں میں گزرے ہوئے لمحات بیتے دنوں کے روشن چراغ تھے۔ جو افق ذہن پر قطار اندر قطار روشن ہوتے گئے۔ وہ علمائے کرام اور بزرگان دین کا ذکر انتہائی عقیدت اور ادب سے کرتے۔ گفتگو کرتے وقت شاہ جی رحمہ اللہ کے وجود پر ان بزرگان دین کے فیضان کے اثرات نمایاں ہو جاتے۔ سیاسی رہنماؤں کے قصے ان کی بے لوث خدمت ان کی قربانیاں ان کا بے پناہ ایثار سب کچھ شاہ جی رحمہ اللہ سے سنا۔ ایک ایک جملہ کتاب کا درجہ رکھتا تھا مشاہدے کی باتیں تھیں۔ دیکھے ہوئے واقعات تھے۔ سامنے گزری ہوئی داستانیں تھیں۔ اگر ان سب کو تحریر کروں تو الگ ایک کتاب کا موضوع بنتا ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ زندگی میں روشنیاں زیادہ ہیں۔ اندھیرے کم ہیں روشنی میرے ارد گرد پھیلتی ہے۔ میری رہنمائی کرتی ہے۔ میری ذات کی تاریکی کو روشنی میں بدل دیتی ہے۔ ان صحبتوں سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ان بزرگوں کے قرب سے ان کی گفتگو سے ان کی پاکیزہ زندگی سے ان کے علمی کمالات سے اکتساب روحانی کرتا ہے۔ یوں تو ہر بزرگ اپنے دامن کرم میں ایسے ایسے گلہائے رنگا رنگ رکھتا ہے جس سے قلب مطمئن اور ذہن آسودہ ہو جاتا ہے۔ جو ان کے باطنی کمالات کا حصہ ہوتا ہے۔

بعض مجالس ایسی ہوتی ہیں جن کی یاد سے کتاب زندگی کے اوراق تابندہ رہتے ہیں۔ یہ مجالس ان علماء، ادباء اور اہل دل حضرات کی ہوتی ہیں جنکا ہر جملہ ادب پارہ، ہر لفظ حکمت کا گوہر اور ہر بات تاریخ ساز ہوتی ہے۔ عام گفتگو ہو یا علمی تبصرہ۔ سیاست کا عنوان ہو یا دینی مسائل پر اظہار خیال، شعر و ادب موضوع بحث ہو یا ذاتی واقعات و مشاہدات۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو ان کے ایک ایک جملے سے علم و ادب کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ ہر جملہ ان کے علمی تبحر، شعری ذوق، حسن بیان اور دلکش اسلوب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایسی علمی و ادبی مجالس میں شرکت ادب عالیہ کی درجنوں کتابیں پڑھنے سے زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوتی ہے۔ مجھے زندگی میں جید علماء، ممتاز دانشور، معروف شعراء، مستند رہنما اور روحانی پیشوا کی صحبتوں سے مستفیض ہونے ان سے اکتساب علم کرنے کے بیشمار مواقع میسر آئے۔ ادبی انجمنوں، تنقیدی اجلاس اور ہندوستان گیر مشاعروں میں شریک ہونے کا اعزاز نصیب رہا۔ بزرگوں کی صحبتوں نے میرے ادبی ذوق کو جلا بخشی آداب و اخلاق کے قرینے سمجھ میں آئے۔ مجلسی زندگی کے نئے رخ سامنے آئے مگر جو لطف جو کیف سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ

اللہ علیہ کی صحبت میں نصیب ہوا وہ سب سے منفرد تھا شاہ جی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ایک پیکر میں ہزار رنگ، ایک وجود میں بے شمار صفات ایک شخص متضاد علوم و فنون کا شاہکار تھا۔ اگر سیاست کی بات ہو تو ان کا انداز فکر جداگانہ۔ دین پر اظہار خیال ہو تو انکا طرز بیان سب سے الگ۔ شاعری موضوع گفتگو ہو تو ان کا شعری ذوق سب سے منفرد تھا۔ ان میں انفرادیت بدرجۂ اتم موجود تھی وہ ہر مسئلے کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شعر فہمی وہبی ہے۔ ہر ممتاز شاعر اچھا شعر فہم نہیں ہوتا۔ یہ ملکہ خداداد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کو ایسی شعری بصیرت اور کمال ذوق سے نوازا تھا جس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا خوبصورت شعر سنتے ہی اس کی اس حسین انداز سے تشریح فرماتے کہ اہل ادب حضرات ان کی شعر فہمی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے۔ شاہ جی کے داد دینے کا انداز سب سے نرالا اور مختلف تھا۔ شاعر شاہ جی کی آنکھوں کی سجاوٹ اور ہونٹوں کی بناوٹ سے شعر کا معیار پرکھ سکتا تھا۔ شعر کے معانی اور محاسن ان کے چہرے پر بکھرتے نظر آتے جیسے پھول کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔ ایسی حسین داد وہی دے سکتا ہے جو شعر کی روح سے واقف ہو اور اس کی نزاکتوں سے کماحقہ آگاہ ہو لطافت شعر بے ہنگم داد کی بھی تو متحمل نہیں ہو سکتی۔ شاہ جی کی پسند اور ناپسند سند کا درجہ رکھتی تھی شعر فہمی شعر گوئی سے زیادہ مشکل ہے شعر فہمی میں خداوند کریم نے اپنی عطائے خاص سے شاہ جی کو وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

شعر فہمی کا تعلق ایک خاص وجدانی کیفیت سے ہوتا ہے۔ یہ وجدانی کیفیت ہر شخص کا ورثہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ایک خاص قسم کا ادبی ماحول، روحانی لطافت، پاکیزگی خیال اور حسن مطالعہ درکار ہوتا ہے۔

جب شاہ جی لاہور تشریف لاتے تو ان کی قیام گاہ (دفتر مجلس احرار اسلام) پر لاہور کے ممتاز شعراء حاضری دیتے ان شعراء میں صوفی تبسم، عابد علی عابد، احسان دانش، حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، ایم ڈی تاثیر جیسے اہل علم ہوتے۔ شاہ جی کی قیام گاہ اچھے خاصے مشاعرے میں تبدیل ہو جاتی اور شاہ جی اس ادبی و شعری انجمن کے روح رواں ہوتے۔ ہر شاعر کی خواہش ہوتی کہ شاہ جی کسی شعر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کریں اور وہ اس کے لئے ادبی سند بن جائے۔

شاہ جی غالب کی شاعری کو سراہتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ " غالب تو جنت ہے اپنے ذوق کو کیا کروں اس سے کم درجے کا شاعر میرے مذاق سخن پر پورا ہی نہیں اترتا" شاہ جی کو غالب کے فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ جب کبھی اس گل کدے کا دروازہ کھولتے تو انجمن مہک مہک جاتی۔ گل تازہ کا حسن اور خوشبو دیدہ و دل کو منور کر جاتا۔ شاہ جی کے شعر پڑھنے کا انداز کوئی نہ اپنا سکا۔ شاہ جی کو خداوند کریم نے حسن صوت اور کمال ادائیگی سے نوازا تھا۔ شعر اس انداز سے پڑھتے کہ معانی اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے۔ شعر کا حسن رگ و پے میں سرایت کرتا اور ذہن و خیال کو تازگی بخشتا ہوا گزر جاتا۔ شاہ جی کا شعری انتخاب مثالی تھا۔ کوئی شعر معیار سے گرا ہوا لطافتوں سے معرا شاہ جی کی زبان سے نہیں سنا۔ ہر شعر فنی عروج اور حسن خیال کا شاہکار ہوتا۔

قحط بنگال پر نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ساحر لدھیانوی نے نظم "بنگال" لکھی جو کسی ساتھی نے شاہ جی کو پڑھ کر سنائی شاہ جی روزنامہ "آزاد" کے دفتر لاہور میں مقیم تھے۔ آپ نے نظم سنتے ہی فی البدیہہ شعر کہا اتفاقاً چند دنوں بعد ساحر چند دوستوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور نظم "بنگال" سنائی۔ ساحر کی نظم کے ایک بند کا شعر یہ تھا۔

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

شاہ جی ساحر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اس بند کا دوسرا شعر کہاں ہے؟ ساحر نے جواب دیا کہ وہ نہیں ہو سکا۔ اس پر شاہ جی نے اپنا یہ شعر سنایا۔ اور فرمایا۔ ساحر! یہ شعر تمہاری نذر کرتا ہوں۔

چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

ساحر نے بہ اشتیاق و عقیدت قبول کر کے اسے اپنی نظم کا حصہ بنا لیا۔

شاہ جی نے فارسی اور اردو میں شعر کہے۔ جلسے جلوسوں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ اس فن کو باقاعدہ اپناتے۔ چیدہ چیدہ اشعار کہے جو ان کے جانشین برادرم سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ نے "سواطع الالہام" کے نام سے شائع کر دیئے۔ شاہ جی کا فارسی کا بے پناہ مطالعہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں فارسی اشعار از بر تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا معروف فارسی شاعر ہو جس کے اشعار شاہ جی کو یاد نہ ہوں۔ اگر شاہ جی شاعری کو اپناتے تو اس دور کے عظیم شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔ مگر شاہ جی کی عدیم الفرصتی نے انہیں اس طرف پوری طرح متوجہ نہ ہونے دیا۔

ایک دفعہ شاہ جی نے فرمایا کہ بچپن پٹنہ عظیم آباد میں گزرا شاد عظیم آبادی جیسا قادر الکلام شاعر محاورے اور روزمرہ کی تصحیح کے لئے ہمارے گھرانے کی طرف رجوع کرتا تھا۔ ایسی علمی ادبی اور دینی فضا میں شاہ جی کا بچپن گزرا۔ علماء کی صحبت سے مستفیض ہوئے گھریلو تربیت اور دین کے حصول نے اخلاق و آداب کے دروازے کھول دیئے۔

زبان و بیان پر شاہ جی کو قدرت کاملہ تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے جہاں تقریر کی اہل زبان حضرات سے داد وصول کی۔ لکھنؤ میں جلسہ ہو یا دہلی میں اہل زبان حضرات نے میری زبان کو سند مانا میرے کسی جملے یا لفظ پر کبھی اعتراض نہیں کیا" شاہ جی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں بھی تقریر کے لئے تشریف لے جاتے اس علاقے کی زبان بلکہ لب و لہجہ میں تقریر کرتے۔ سامعین تک اپنی بات ان کے لب و لہجہ اور زبان میں پہنچانے سے زیادہ موثر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے شاہ جی کی تقریر خطابت کا شاہکار تھی۔ میں نے ان کی خطابت کے بارے میں اشعار کہے تھے۔

زبان ایسی فصاحت بھی جس پہ اترائے
کلام ایسا سنے جو بھی اس کو رشک آئے

ہر اک سخن میں دل سنگ کو گداز کرے
وہ جس پہ فن خطابت ہزار ناز کرے
تھی جس کے حسن تلاوت میں بارش انوار
دلوں کو چیر گئی اس کی شوخئ گفتار

اسی خطابت اسی فن تقریر میں کمال کی وجہ سے سیاسی رہنماؤں، علماء اور شعلہ بیان مقررین نے انہیں خطیب اعظم کے لقب سے یاد کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور نے شاہ جی سے بڑا خطیب پیدا ہی نہیں کیا۔ ایک روز حفیظ جالندھری سے شاہ جی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ حفیظ جالندھری نے عجیب و غریب جملہ فرمایا کہ "شاہ جی کی تقریر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی ماندہ معجزات میں سے ایک معجزہ تھی" اس جملے میں سرور کائنات ﷺ کے کرم کی جھلکیاں اور شاہ جی کے بخت کی معراج نظر آتی ہے۔

شاہ جی جس احترام، ذوق و شوق اور حسن تجوید کے ساتھ کلام پاک پڑھتے تھے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آواز میں سوز، اور لحن میں عجیب تاثیر رکھی تھی۔ شاہ جی کی تلاوت دلوں میں نور کی قندیلیں جلاتی، روحوں کو مجلیٰ کرتی اور تطہیر قلب و نگاہ کرتی نظر آتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ دلوں کی تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔ پاکیزگی کی فضا قائم ہو رہی ہے۔ یہ تاثیر یہ انداز یہ کمال شاہ جی کے ذاتی تقدس قرآن مجید سے شیفتگی اور احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ تھا۔ شاہ جی کی تلاوت سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ خواہ اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو۔ دوسرے مذاہب کے لوگ شاہ جی کی تلاوت سننے کے لئے جلسہ گاہ میں آتے تھے۔ اس ضمن میں شاہ جی نے ایک واقعہ بیان کیا۔

شاہ جی تہجد کے وقت تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے۔ ایک بندہ اپنے خدا سے ہم کلام تھا۔ دل کے خلوت کدے کو کلام الہیٰ کے نور سے منور کر رہا تھا۔ اس جیل کا جیلر ہندو تھا۔ شاہ جی کی آواز سن کر ان کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ شاہ جی کی آواز کے سوز نے اس میں رقت پیدا کر دی آخر اس نے شاہ جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا شاہ جی تلاوت بند کر دیجئے اب رویا بھی نہیں جاتا۔ شاہ جی نے مڑ کر دیکھا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

شاہ جی کی حسن قرأت کے اور بہت سے قصے ہیں، ایک واقعہ شاہ جی نے خود بیان کیا۔

دہلی میں ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ اکابرین ملت، زعمائے کرام مقتدر سیاسی رہنما کانگرسی لیڈر اور معروف مقررین موجود تھے۔ مجمع کسی مسئلے پر متفق نہ تھا۔ مخالف گروہ کی اکثریت تھی وہ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لئے جلسہ درہم برہم کرنے کو تیار تھے وہ کسی مقرر کی تقریر سننے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو تک کو انہوں نے تقریر نہ کرنے دی۔ ابوالکلام آزاد نے مجمع کی یہ کیفیت دیکھی تو ان کی نگاہ انتخاب شاہ جی پر پڑی۔ ان کو معلوم تھا کہ شاہ جی عوام کی نفسیات سے واقف ہیں وہ کسی نہ کسی طرح مجمع کو قابو میں کر لیں گے۔ ابوالکلام آزاد نے شاہ جی کو تقریر کرنے کو کہا۔ تعمیل میں شاہ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاحد نظر اُمڈے ہوئے تند و تیز سیلاب کو دیکھا۔ شاہ جی نے تلاوت شروع کی جلسہ گاہ میں مکمل خاموشی ہو گئی۔ شاہ جی نے ایک گھنٹہ کلام

پاک کی تلاوت کی مجمع شاہ جی کے حسن قرأت میں اپنا موقف بھول گیا۔ شاہ جی خدائے بزرگ و برتر کی آخری کتاب کی تلاوت کر رہے تھے لوگوں کے چہروں سے مخالفت کا غبار ڈھل رہا تھا۔ جذبات کے شعلے مدھم ہو گئے۔ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ جلسہ گاہ میں مکمل سکوت تھا۔ ہر شخص شاہ جی کی تلاوت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے کلام پاک کی تلاوت اور خطبہ مسنونہ *** کے بعد تقریر کا آغاز کیا۔ شاہ جی کی تلاوت نے دلوں کو نرم کر دیا۔ وہی مجمع جو کچھ دیر پہلے زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے آیا تھا۔ زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ شاہ جی نے تفصیل کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا اور اپنے نظریئے کی وضاحت کر کے مخالف گروہ کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ شاہ جی نے ایسے کئی معرکے سر کئے جن کی تفصیل کے لئے ضخیم کتاب درکار ہے۔

ایک روز میں نے شاہ جی سے سوال کیا کہ آپ نے فن تجوید و قرأت کس سے سیکھا۔ شاہ جی اس سوال پر مسکرائے فرمایا۔ یہ بہت عجیب و غریب واقعہ ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہمارے پٹنے میں ایک عرب تھے۔ وہ بچوں کو قرأت کا درس دیا کرتے تھے۔ میں ان کی قرأت کو غور سے سنتا اور گھر آکر انکی نقل اتارتا۔ ایک روز میں مسجد کے حجرے میں ان کی نقل اتار رہا تھا وہ عرب قاری (عمر عاصم) باہر غور سے میری تلاوت سنتے رہے۔ جب میں تلاوت کر چکا اندر حجرے میں آئے ان کی اچانک آمد سے میں حواس باختہ ہو گیا۔ انہوں نے آتے ہی سوال کیا تم نے فن تجوید کس سے سیکھا میں نے حواس مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں تو آپ کی نقل اتار رہا تھا۔ اس عرب قاری نے فرمایا "تم سارق الطبع ہو" شاہ جی نے فرمایا بس میرے فن تجوید میں سماعت ہی کو دخل ہے۔

شاہ جی کا سب سے بڑا وصف حاضر دماغی اور حاضر جوابی تھا۔ جلسے میں کوئی سوال کیا جائے شاہ جی نہایت سکون اور وضاحت کے ساتھ اس کا برجستہ اور مسکت جواب دیتے تھے۔ سوال کرنے والے کی تسلی ہو جاتی تھی۔ اس کو مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ لاکھوں کے مجمع میں مخالفین نے شاہ جی سے سوال کئے اور شاہ جی کے چند جملوں نے انکی تشفی کر دی۔

شاہ جی کی تقریر سننے اس سے مستفیض ہونے کے لئے علمائے کرام مفسرین، مقررین، سیاسی رہنما، اہل ادب، اہل ذوق حضرات اور عوام الناس سبھی قسم کے لوگ آتے تھے۔ حسن خطابت کا کمال یہ تھا کہ دس دس گھنٹے شاہ جی تقریر کرتے اور مجمع میں سے ایک شخص بھی اٹھ کر نہ جاتا۔ شاہ جی جب چاہتے مجمع کو رلاتے جب چاہتے ہنساتے۔ گویا لاکھوں اشخاص کی نبضوں پر شاہ جی کا ہاتھ تھا۔ وہ عوام کے چہروں سے عنوانات چن کر تقریر سجاتے۔ ان کی تقریر ایک ان پڑھ کے لئے اتنی ہی پرکشش تھی جتنی ایک عالم کے لئے۔ ایک مفسر قرآن بھی آیات کریمہ کے ترجمے اور نکات سے محظوظ ہو رہا ہے اور ایک ادیب اور شاعر بھی شعر کے برجستہ استعمال سے مسحور ہو رہا ہے۔ ہر ایک کا دامن بھرا جا رہا ہے لوگ کیسۂ دل میں یادوں کے انمول موتی لے کر لوٹتے۔ حاضر جوابی کے سلسلے میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی سے ایک پر لطف واقعہ سنا ڈیرہ غازی خاں میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا شاہ جی کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ہزاروں معتقدین شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے آئے۔ مضافات میں سے میلوں پیدل چل کر جلسہ میں شرکت کی غرض سے آئے۔ اس علاقے کے لوگ

بزرگان دین کے مزاروں سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ عقیدت کا جذبہ شرک کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ یہ عقیدت یہ مزاروں سے قلبی وابستگی ان کو اپنے آباؤاجداد سے ورثے میں ملی ہے۔

شاہ جی کی تقریر کے آغاز ہی میں کسی نے مزاروں پر حاضری اور مزاروں کے جواز کے بارے میں استفسار کر دیا۔ ان دنوں سعودی عرب میں شاہ سعود مزارات کے قبوں کو مسمار کر رہے تھے۔ قاضی صاحب فرماتے تھے کہ میں حیران تھا کہ شاہ جی اس نازک مرحلے سے کس طرح نکل سکیں گے۔ اگر مزاروں کے خلاف بات کرتے ہیں تو جلسہ گاہ میں ایک ہنگامہ بپا ہو جائے گا اگر ان کے نظریات کی تائید کرتے ہیں تو عقیدے میں خلل واقع ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ نہایت کٹھن تھا۔ سوال کرنے والے نے یہ بھی کہہ دیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تو مدینہ منورہ میں مزار ہے۔ شاہ جی نے اس نوجوان سے پوچھا کہ کیا واقعی جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک ہے۔ مجمع اس سوال پر حیران تھا کہ وہی روضہ اطہر تو قلوب کی تسکین کا مرکز، انوار کا سرچشمہ، پناہ عالمیاں اور تشنہ نگاہوں کی سیرابی کا نشان ہے۔ شاہ جی نے خطابت کے انداز میں جواب دیا کہ جب میرے آقا کائنات کے آقا کا مزار مقدس موجود ہے تو دوسرے مزار کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ شرک فی النبوۃ ہے۔ یہ بات کچھ اس انداز سے بیان کی کہ مجمع امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگ اپنا عقیدہ اور مسلک بھول گئے۔

شاہ جی کی تقریر مزاج کو بدل دیتی تھی۔ نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیتی تھی۔ اعتقادات میں انقلاب برپا کر دیتی تھی۔ لوگ شاہ جی کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ یہ زور بیان، یہ حسن خطابت، یہ انداز کلام بہت کم لوگوں پر نصیب ہوتا ہے۔

شاہ جی کی خطابت کا ایک اور معرکہ برادر محترم اعجاز احمد چشتی نے بیان کیا۔ اعجاز احمد چشتی گارڈن کالج راولپنڈی میں زیر تعلیم تھے۔ شاہ جی کی تقریر کا اعلان ہوا چشتی صاحب کے کچھ دوست کمیونسٹ ذہن کے تھے۔ چشتی صاحب نے انہیں تقریر سننے پر آمادہ کر لیا۔ وہ چشتی صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچے وہ اپنے ذہنوں میں بہت سے سوال لے کر آئے تھے کہ وہ دوران تقریر اپنے نظریئے کے مطابق شاہ جی سے سیاسی نوعیت کے سوال کریں گے۔ ان کو اپنے مطالعے، اپنے نظریے پر ناز تھا۔ وہ تمام مسائل کا حل کمیونزم سمجھتے تھے۔ ملحدانہ عقائد نے ان کے ذہنوں کو مسخ کر دیا تھا۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ لوگ بے تابی سے شاہ جی کی آمد کے منتظر تھے۔ شاہ جی پنڈال میں داخل ہوئے ہزاروں عقیدت مند نگاہیں ان کے استقبال کے لئے اٹھیں شاہ جی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے شاہ جی نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کی مجمع خاموش ہو گیا۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی نے تقریر کا آغاز کیا۔ وہ کمیونسٹ طلباء محو حیرت بنے ہوئے شاہ جی کی تقریر سن رہے تھے۔ سوالات کا نقشہ ذہن سے محو ہو گیا۔ ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ ایک موج خطابت تھی کہ بہائے لئے جا رہی تھی۔ ایک سوز تھا کہ دل کے خلوت کدے روشن کر رہا تھا۔ خداوند کریم کے آخری پیغام کی تشریح و تفسیر ہو رہی تھی۔ دلوں کی سیاہی دھل رہی تھی۔ دلوں کا زنگ دور ہو رہا تھا۔ اعجاز احمد چشتی صاحب کا بیان ہے کہ جلسہ گاہ میں سب سے زیادہ رونے والے یہی کمیونسٹ طلباء تھے۔ جو اعتراضات کے کانٹے

لے کر آئے۔ عقیدت و محبت کے پھول لے کر لوٹے۔

شیخ حسام الدین احرار کے سر کردہ لیڈروں میں سے تھے۔ شعر و ادب کے دلدادہ، باوضع و باوقار انسان، تقریر میں گرج، مجلسی گفتگو میں لطافت، آزادی کا بے باک و نڈر سپاہی۔ زندگی کی نصف صدی کی داستانوں، واقعات و حادثات، سیاسی کشمکش، قید و بند کے حالات دار و رسن کے قصے، انگریزوں کے مظالم، جدوجہد آزادی کی تفسیر۔ یعنی شیخ صاحب کی ذات تاریخ کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ دوران گفتگو مجلس احرار کے معرکوں، خطابت کے انداز، مقتدر سیاسی شخصیتوں کے کارہائے نمایاں بیان کرتے تو تاریخ کے اوراق کھل جاتے۔

ایک دن دوران گفتگو سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کو امیر شریعت کا لقب ملنے کا واقعہ شیخ حسام الدین رحمہ اللہ کی زبانی سنا۔ شیخ صاحب اس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ آپ نے فرمایا۔

شیرانوالہ گیٹ میں مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ نے انجمن خدام الدین کا سالانہ جلسہ منعقد کیا۔ جس میں ہندوستان بھر کے پانچ سو علماء جمع تھے۔ ان دنوں قادیانی تحریک زوروں پر تھی۔ حکومت انگریزیہ اس کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ جیسے بزرگان دین بھی موجود تھے۔ علامہ محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ قادیانی فتنے کے رد کے لئے اس کی نشر و اشاعت کو روکنے کے لئے لوگوں کو بے دینی سے بچانے کے لئے ہمیں ایک امیر منتخب کر لینا چاہیئے تاکہ منظم طریقے سے اس فتنے کا سد باب کیا جا سکے۔ حضرت رحمہ اللہ کی رائے سے تمام علمائے کرام نے اتفاق کیا اور بیک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہم سب میں بزرگ، سب سے زیادہ محترم و مکرم ہیں۔ آپ جو فیصلہ فرمائیں گے ہمیں منظور ہو گا۔

علامہ محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شاہ جی کو طلب کیا شاہ جی لپک کر حاضر ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اس کام کے لئے آپکے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور امیر شریعت کا لقب عطا فرمایا۔ شاہ جی کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بزرگ جس کی علمیت، جس کی بزرگی، جس کے تقویٰ کا ہر شخص معترف تھا۔ جو تمام علماء کا مخدوم تھا جس کی دینی خدمات بے مثل تھیں۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ ختم نبوت اور ناموس کی خاطر ایک نوجوان عالم دین کے ہاتھ پر بیعت کر رہا تھا۔ حضرت رحمہ اللہ کے بعد پانچ سو کے قریب علمائے دین، مفسرین، محدثین نے رد مرزائیت کے سلسلے میں شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر حضرت انور شاہ کاشمیری قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ "خداوند کریم نے اس عظیم کام کے لئے آپ کو منتخب کر لیا ہے۔ اس کار خیر کی سعادت آپ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے"

شاہ جی نے اس لقب کی لاج رکھ لی۔ سینکڑوں اجتماعات سے اس مسئلہ پر پرزور تقریریں کیں۔ اس جھوٹے مدعی نبوت کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔ ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچا لیا۔ اس مشن کی تکمیل کے لئے اس دینی خدمت کے لئے ساری زندگی وقف کر دی۔ جوانی سے بڑھاپے تک اس محاذ پر لڑے۔ قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ آخر ان کی سعی جمیلہ، ان کی عمر بھر کی کاوش بار آور ہوئی اور مرزائیوں کو خارج از اسلام قرار دیا گیا۔ اور حکومت نے مرزائیوں کو اقلیت قرار دے کر اس مسئلہ کو

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

شاہ جی علمائے کرام اور بزرگان دین کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب کسی بزرگ کا ذکر کرتے تو ادب و احترام کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر ذکر کرتے۔ شاہ جی احرار کے دفتر لاہور میں تشریف فرما تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ شاعری کا دور ہو رہا تھا۔ شورش کاشمیری نے اپنی گفتگو سے محفل کو زعفران بنا رکھا تھا۔ اچانک کسی نے مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی نور اللہ مرقدہ کی آمد کی اطلاع دی۔ محفل کا رنگ یکسر بدل گیا۔ ہر شخص احترام و عقیدت کا پیکر بن گیا۔ شاہ جی نے آگے بڑھکر حضرت کا استقبال کیا۔ اور نہایت ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے حضرت تشریف فرما ہوئے۔ شاہ جی سے فرمایا کہ تشریف رکھئے شاہ جی دو زانو ہو کر نظریں جھکا کر حضرت کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ جب تک حضرت احمد علی رحمہ اللہ تشریف فرما رہے شاہ جی اسی انداز سے بیٹھے ادب و احترام سے ان کے ارشادات سنتے رہے۔

اسی طرح شاہ جی کو اپنے مرشد و مربی حضرت عبد القادر رائے پوری قدس سرہ العزیز کی مجلس میں مؤدب بیٹھے دیکھا لاکھوں کے مجمع کو اپنی خطابت سے مسحور کرنے والا، ہر جگہ زبان و بیان کا جادو جگانے والا، خطیب اعظم شعلہ بیان مقرر خاموشی و عقیدت سے سر جھکائے حضرت رحمہ اللہ کی خدمت اقدس میں حاضری دیتا۔ آداب کے تمام تقاضے احترام کے تمام پہلو، نیاز مندی کے تمام رخ سامنے آجاتے۔ اگر حضرت رحمہ اللہ کوئی بات دریافت فرماتے تو مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

جالندھر میں خیر المدارس کا جلسہ تقسیم اسناد تھا۔ مدرسے میں جگہ ناکافی ہونے کی وجہ سے جلسے کا انتظام کمپنی باغ میں کیا گیا۔ یہ کمپنی باغ شہر میں واقع تھا۔ اور سیر کی بہترین جگہ تھی۔ نماز جمعہ کے بعد جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا چند علماء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مدرسے کی دینی خدمت کو سراہا مولانا خیر محمد نور اللہ مرقدہ کی ذات بابرکات کو خراج تحسین ادا کیا۔ سب سے آخر سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا خطاب تھا حد نگاہ تک لوگوں کا مجمع تھا۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ شروع کیا ہی تھا کہ کسی نے شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ ہزاروں لوگوں کے سروں پر مکھیوں نے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ شاہ جی نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے پتھروں کی طرح جم کر بیٹھے رہو۔ شاہ جی کے چہرے پر مکھیوں نے ڈنگ مارنا شروع کر دیئے شاہ جی نے فرمایا کہ چہرے کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں مکھی نے ڈنگ نہ مارا ہو۔ میں نہایت ضبط سے خطبہ پڑھتا رہا۔ ایک مکھی نے میری آنکھ کے کونے میں ڈنگ مارا۔ مجھے جھرجھری سی آئی۔ مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اس نے دونوں ہاتھوں سے مکھیوں کو چہرے سے اتارا چہرہ سوج گیا۔ بخار کی شدت ہو گئی۔ لدھیانہ میں احرار کا عظیم الشان جلسہ تھا۔ دوسرے روز شاہ جی اسی عالت میں لدھیانہ تشریف لائے۔ چہرہ بے حد سوج گیا تھا۔ تیز بخار تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ العزیز کی تقریر تھی۔ حضرت کرسی پر بیٹھے تقریر فرمار ہے تھے۔ مجمع نہایت احترام سے آپ کے ارشادات گرامی سن رہا تھا۔ انوار کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک وجود گرامی جو دین کی تفسیر تھا۔ خداوند کریم کی آخری کتاب سے خداوند کریم کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہا تھا۔ احادیث نبوی کے حوالوں سے ساری مجلس دائرہ نورانیت میں آگئی۔ ایک آواز دلوں میں گھر

کر دی جا رہی تھی۔ حضرت کی گفتگو میں تقویٰ کا حسن، علم کی خوشبو، پاکیزگی کا جمال اور عمل کی لذت تھی جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو شاہ جی فرط شوق و محبت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت کو بلیغ انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی دے۔ آپ کی تقریر کا ایک ایک لفظ میری سال بھر کی تقریروں کا موضوع بن گیا۔ آپ نے علماء کے ذہنوں میں علم کے چراغ روشن کر دیئے۔ آپ نے جس انداز سے قرآن مجید کی تعلیمات کو ہم تک پہنچایا وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں تو حضرت کا خوشہ چین ہوں۔ غرضیکہ شاہ جی نے اپنی محبت و عقیدت کا حسین انداز میں اظہار فرمایا۔ جیسا کہ اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ شاہ جی کو بزرگوں سے، اہل اللہ سے مقربان بارگاہ الہیٰ سے انتہائی عقیدت تھی۔ یہ جملے بھی اسی عقیدت کے اظہار کی علامت تھے۔

ملتان کے دو سالہ قیام میں باقاعدگی سے شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ شاہ جی کے علمی خزانے سے دامن طلب بھرتا رہا۔ مختلف موضوعات پر شاہ جی کی گفتگو سنی۔ علمائے دین کی مجالس کی روئداد، ان کے علمی کمالات، ان کی بے نفسی ان کے تقویٰ کی داستانیں شاہ جی سناتے۔ مجلسی آداب کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتے۔ ایک روز اخلاق پر گفتگو فرماتے ہوئے کہا کہ "اخلاق کا سرچشمہ ادب کا مصدر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں ایک بار بھی مجلس میں لات پسار کر نہیں بیٹھے" بھر جذبے کے ساتھ فرمایا" حضور ایک بار لات پسار کر بیٹھتے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کے قدم مبارک کو آنکھوں سے لگاتے۔ ان کے پائے مبارک پر چہرے کو ملتے مگر اس معلم اخلاق اس سرچشمہ رشد و ہدایت سے ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"

شاہ جی درویش صفت انسان تھے۔ سادہ زندگی بسر کی۔ ان کے دل میں دولت و ثروت کی کبھی خواہش پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ہندوستان کا خطیب اعظم کرائے کے مکان میں رہا۔ جس میں برسوں سے قلعی نہ ہوئی تھی۔ جس کی مٹی گرتی رہتی تھی۔ اسی مکان میں ہندوستان بھر کے علماء شاہ جی کی ملاقات کے لئے آئے۔ اسی مکان میں شعر و ادب کی مجلسیں آراستہ ہوئیں۔ سرمایہ دار اسی ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر شاہ جی کے ارشادات سے مستفیض ہوئے۔ اس گھر کے دروازے رنگ و روغن سے بے نیاز رہے۔ خطیب اعظم کے گھر میں قالین نہ تھا۔ صوفے نہ تھے۔ دروازوں پر ریشمی پردے نہ تھے۔ ایک چھوٹا سا غسل خانہ تھا جس میں نلکا لگا ہوا تھا۔ خطیب اعظم اسی غسلخانے میں نلکے سے پانی نکال کر غسل کرتا۔ اس غسل خانے میں مشکل سے غسل ہو سکتا تھا۔ اندر کے کمروں کا بھی یہی حال تھا۔ صحن کچا تھا۔ ایک روز میں نے شاہ جی کو حیدر دہلوی کا شعر سنایا۔

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا۔ پھر اپنے گھر کے در و دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی۔

شاہ جی اگر چاہتے تو ایک تقریر میں ایک کوٹھی کے پیسے جمع کر سکتے تھے۔ لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں ہزاروں

روپیہ اکٹھا کرنا مشکل کام نہ تھا مگر شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے توکل اور غنا کی دولت سے نوازا تھا۔ انہوں نے مادی دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ فقر و فاقہ کو زندگی کا حسن بنایا۔ اگر شاہ جی دولت کمانا چاہتے تو آج پاکستان میں ان کے فرزندوں سے زیادہ امیر کوئی نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو علم کی دولت دی، دین سکھایا، دین پڑھایا، سب کو قرآن مجید حفظ کرایا اس سے زیادہ بہتر ورثہ کیا ہو سکتا ہے کہ اولاد کا ہر نیک عمل والدین کے درجات کی بلندی کا سبب بنے۔

شاہ جی کے مسلسل قرب سے ان کی ذاتی خوبیاں، ان کے زندگی کے بے شمار پہلو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایسے بزرگوں میں سے تھے جن کے قرب سے ان کی عظمت کے مینار اور بلند نظر آتے ہیں۔ شاہ جی اوصاف کا پیکر جمیل تھے۔ شاہ جی کی مجلس میں گھنٹوں گزارے۔ شاہ جی نے تمام عمر کسی کی غیبت نہیں کی۔ یہ بظاہر بہت معمولی بات نظر آتی ہے مگر ہماری کوئی مجلس بھی غیبت سے مبرا نہیں۔ جہاں چند دوست اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی کی برائی، عیب جوئی ضرور درمیان میں آجاتی ہے۔ شاہ جی نے اپنے دشمنوں کے بارے میں بھی کبھی غیر محتاط گفتگو نہیں کی۔ کسی کی ذات کے بارے میں نازیبا لفظ استعمال نہیں کئے۔ یہ ان کے اخلاق کا کمال اور ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ عالی ظرفی، یہ رکھ رکھاؤ، یہ وضعداری ان سے مختص تھی۔

شاہ جی کی زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ انہوں نے کسی حال میں بھی کسی معتقد کسی مرید یا کسی دوست کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ یہ فقر کی شان ہے، یہ بے نیازی کی شان یہ غنا کا ورثہ، یہ توکل کی دولت انہیں آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔

ایک روز سکندر مرزا صدر پاکستان ملتان آئے شاہ جی کو پیغام بھیجا کہ اگر تشریف لا سکیں تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔ شاہ جی نے قاصد سے کہا کہ مجھے مرزا صاحب سے کوئی کام نہیں اگر وہ اس فقیر سے ملنا چاہتے ہیں تو دروازے کھلے ہیں بصد شوق تشریف لائیں۔

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

تیسری بات جس کا میں نے مشاہدہ کیا کہ شاہ جی نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا اگر کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ بھی ہوتا تو اس کی وضاحت فرما دیتے۔ ایک روز شاہ جی حکیم حافظ حنیف اللہ صاحب کے مطب میں تھے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کی اہلیہ کی تیمارداری کے لئے جانا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑی۔ زیادہ چل نہیں سکتا۔ پھر فرمایا کہ گھر سے ارادہ کر کے نہیں نکلا تھا راستے میں خیال آیا تھا۔

حدیث شریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ مسلمان میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں ایک بخل دوسرے جھوٹ۔ شاہ جی کی زندگی ان دونوں برائیوں سے پاک صاف تھی۔

مولانا محمد یٰسین صاحب شاہ جی کے حلقۂ احباب میں سے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں خانہ کعبہ کے سامنے راقم الحروف کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ بزرگان دین کا ذکر خیر ہوتا رہا۔ اسی گفتگو میں شاہ جی رحمۃ اللہ کا ذکر خیر بھی آیا مولانا محمد یٰسین صاحب نے شاہ جی کی شفقت محبت اور حسن کردار کا عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا۔

مولانا کا تعلق ضلع جھنگ سے ہے اور ان کے خاندان کے کئی افراد یہیں آباد ہیں۔ مولانا نے بیان فرمایا کہ "ہیڈ تریموں کا بند ٹوٹ گیا اور سیلاب سے ایک وسیع علاقہ زیر آب آگیا۔ میرے بھائی کی زمین بھی اسی علاقے میں تھی۔ پانی کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ بھائی کے مکان کے قریب تیس فٹ گہرا گڑھا پڑ گیا۔ اور مکان بہہ گیا۔ اس ہنگامی صورت حال میں بھائی نے خواتین کو محفوظ مقام تک پہنچایا۔ پھر چارپائی اور دوسرا کچھ سامان اٹھانے گئے۔ تو پانی کے شدید ریلے کی نذر ہوگئے اور اسی میں وفات پا گئے۔ میں ایک چھوٹی کشتی کے ذریعے خواتین کو لیکر علاقہ "واسو وستانہ" پہنچا۔ کچھ دنوں بعد ملتان آیا تو بھائی کی اس حادثاتی موت پر سخت دل گرفتہ اور مغموم تھا۔ اسی حال میں اپنے پیر و مرشد اور مشفق و مربی حضرت امیر شریعت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شاہ جی کو حال دل سنا کر کچھ غم ہلکا کیا۔ میں نے واپس جانے کے لئے اجازت چاہی تو مجھے ایک طرف تخلیہ میں لے گئے۔ اور فرمایا میری جیب میں ہاتھ ڈالو۔ جیب میں پانچ سو روپے تھے۔ شاہ جی نے فرمایا انہیں اپنے اخراجات میں لانا۔ پھر فرمایا کہ معلوم ہے میں نے آپ کو جیب میں ہاتھ ڈالنے کے لئے کیوں کہا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ میرے دوست کو ہاتھ پھیلانے کی ذلت اور شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ یہ حسین انداز یہ محبت کا رخ یہ حسن اخلاق کی ادا شاہ جی ہی کی حسن تدبیر کا کرشمہ ہو سکتی تھی۔

میں نے شاہ جی کو ایک لاثانی خطیب، ایک شعلہ بیان مقرر، ایک محفل آرا شخصیت ایک بلند پایہ ادیب، ایک جید عالم کے علاوہ ایک بلند کردار، راست باز، متوکل، ہمدرد اور دوست نواز شخص بھی پایا۔ یہ اوصاف یہ خوبیاں یہ وضع داریاں اسلاف کا ورثہ ہیں۔ یہ ورثہ اب نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی کی بیعت اول قطب دوراں حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز سے تھی۔ بعد میں وہ حضرت عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ کے دامن سعادت و کرم سے وابستہ ہوگئے۔ شاہ جی نے حضرت اقدس سے روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کی خدمت میں نہایت ادب و احترام سے حاضری دیتے رہے۔ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

ایک روز پنجابی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاہ جی رحمہ اللہ پنجابی زبان کی وسعت اس کی جدت اور اس کی بے ساختگی کی داد دے رہے تھے۔ شاہ جی نے پیر وارث شاہ سے چند اشعار بھی سنائے۔ دوسرے پنجابی شعراء کا تذکرہ رہا۔ راقم الحروف نے بھی میاں محمد رحمہ اللہ کے کچھ اشعار سنائے۔ صوفیائے کرام کی شاعری پر شاہ جی نے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں جو سوز، رقت اور واردات قلبی کا اظہار ہے وہ دوسری زبانوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ صوفیاء کی شاعری حال کی شاعری ہے۔ وہ اپنی کیفیات باطنی کو چند اشعار میں بیان کر کے اہل دل حضرات کو سوز کا بہت بڑا سرمایہ عطا کر جاتے ہیں۔ پنجابی کی مختلف اصناف شاعری کا ذکر رہا۔ آج کی مجلس پنجابی زبان کے بارے میں معلوماتی اور کیف آور مجلس تھی۔ دوران گفتگو شاہ جی نے پنجابی زبان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ایک بلیغ جملہ ارشاد فرمایا "پنجابی زبان خیال کو آنگن دیتی ہے"۔

میں نے شاہ جی کو پنجابی کا ایک شعر سنایا۔

میری گھگھری نوں گھنگرو لوآ دے
جے توں میری ٹور ویکھنی

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا۔ مجھے اس شعر میں کوئی جدت یا ندرت خیال نظر نہ آئی۔ مجھے شاہ جی کی شعر فہمی کے بارے میں علم تھا خاموش رہا۔

حضرت اقدس حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ فیصل آباد میں خالصہ کالج کی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ جی بیماری کی وجہ سے سفر کے قابل نہ تھے۔ نقاہت بہت بڑھ گئی تھی۔ حضرت اقدس کے ارشاد پر شاہ جی کو کار بھیج کر بلوایا گیا۔ عصر کے بعد حسب معمول حضرت اقدس کی محفل جمی شاہ جی نے اپنی دھوتی کا پلو پکڑ کر حضرت اقدس سے مخاطب ہو کر شعر پڑھا۔ فرمایا حضرت ایک درخواست ہے۔ میرے بیٹے حافظ لدھیانوی نے شعر سنایا تھا۔ پھر اپنی مخصوص لے میں مندرجہ بالا شعر پڑھا۔ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ دو تین سو آدمی اشکبار ہو گئے۔ شاہ جی شعر پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ حضرت اقدس پر بھی کیفیت طاری ہو گئی۔ شعر کی قسمت جاگ اٹھی اس ادائے خلوص و محبت، نیازمندی، حضرت اقدس سے وابستگی کے ہزار پہلو روشن کر دیئے۔

ابتداء میں شاہ جی کو روحانی فیض اپنے والد ماجد قدس سرہ کی نظر التفات اور خاص توجہ سے ملا۔ شاہ جی نے ایک روز فرمایا تھا۔ جب وہ چلتے تو درخت اور دیواریں انہیں پیچھے ہٹتی ہوئی معلوم ہوتیں اور بھی روحانی کمالات کا تذکرہ کیا۔ شاہ جی کی ساری زندگی تقویٰ، پرہیز گاری، درویشی اور توکل پر گزری، اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن و جمال کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا۔ ان کی طبیعت دنیا کی طرف کبھی راغب ہی نہ ہوئی عشق رسول اللہ ﷺ نے ہر خواہش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کو اگر دھن تھی تو یہ کہ وہ حضور اکرم ﷺ کا پیغام زندگی جو ابدی نجات کا ذریعہ ہے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچا دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے ہزاروں تقریریں کیں۔ حضور اکرم ﷺ کے لاکھوں شیدائیوں کو حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ناموس اور تحفظ ختم نبوت پر جہاد بالا ان کیا۔ حضرت سید محمد انور شاہ کاشمیری نور اللہ مرقدہ نے جس مشن کے لئے آپ کا انتخاب کیا تھا اس کو تمام عمر بطریق احسن پورا کیا۔ شاہ جی نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہم نے انگریزوں کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا جب مائیں اپنے بچوں کو انگریز کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ اس حق گوئی و جذبہ حریت کی پاداش میں انہیں بارہا جیل جانا پڑا۔ مقدمات چلے۔ مگر انہوں نے ہزاروں کے مجمع میں انگریز کے خلاف تقاریر کیں۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

شاہ جی سے لاکھوں انسانوں کو بے پناہ عقیدت تھی۔ شاہ جی کا نام ان کے دل کی دھڑکنوں میں بس گیا تھا۔ شاہ جی کے لئے ہزاروں دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آ گیا جو شاہ جی کی زبانی سنا تھا۔

لدھا رام حکومت کا رپورٹر تھا سر سکندر حیات کی حکومت نے شاہ جی کی تقریر کے متن کو مسخ کرا کے لدھا رام سے نئی رپورٹ لکھوائی یہ بہت بڑا مقدمہ تھا۔ اس مقدمے میں شاہ جی کو بڑی سے بڑی سزا دی جا سکتی تھی۔ آخری پیشی کے وقت لدھا رام نے شاہ جی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ لدھا رام کا مردہ ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے برسر عدالت حقیقت کا انکشاف کر دیا اور عدالت میں بیان دیا کہ شاہ جی کی تقریر کے متن کو مسخ کر کے اس سے دوبارہ رپورٹ تیار کرائی گئی ہے۔ جو الزامات شاہ جی پر لگائے گئے ہیں وہ بے بنیاد، فرضی اور بعید از حقیقت ہیں۔ اس طرح شاہ جی تختہ دار تک پہنچ کر واپس آگئے۔ (مقدمہ سے باعزت بری کر دیئے گئے) یہ ان دعاؤں کا نتیجہ تھا جو لاکھوں انسانوں نے بارگاہ رب العزت میں کی تھیں۔

شاہ جی نے فرمایا کہ میں ایک جلسے میں تقریر کر کے سٹیج سے نیچے اترا ایک ضعیفہ لاٹھی سے ٹیک لگائے راستے میں کھڑی تھی۔ جونہی میں اس کے پاس سے گزرا اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میرے قدم یکدم رک گئے۔ میں اس عفیفہ ضعیفہ کے قریب گیا۔ ادب سے سلام کیا۔ بڑھیا کہنے لگی عطاء اللہ شاہ تیرا ہی نام ہے۔ ادب سے کہا کہ اس گنہگار ہی کو عطاء اللہ کہتے ہیں۔ بے شمار دعائیں دیں کہنے لگی کہ اس بوڑھی جان کے ساتھ سینکڑوں نفل پڑھ کر تیرے لئے دعائیں کی ہیں کہ اے خدا اس نے تیرے حبیب کے ناموس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے یہ حق کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس کو سلامت رکھنا۔ اس کو دشمنوں پر فتح نصیب کرنا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری ہوئی۔ یہ حضور اکرم ﷺ کے کرم کے انداز ہیں۔

شاہ جی کی صحبتوں کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے چراغ روشن کرتا رہا۔ شعر و ادب کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ مذہب کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوئے۔ سیاست کے عروج و زوال کی داستانیں سنیں، بزرگوں کے روحانی درجات کے واقعات نے ذہن میں اجالا کیا۔ علمائے کرام کے تقویٰ، پرہیز گاری، ان کے علمی مقامات اور ان کی بے نفسی و خدا ترسی کے بہت سے قصے سنے۔ ملتان کے دو سال کے قیام کے دوران دل و نظر کی تربیت کے بے شمار مواقع میسر آئے۔

کالج کا نوجوان طبقہ شاہ جی سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ پروفیسر صاحبان کالج کے طلباء اور نوجوان اکثر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ شاہ جی کی تبلیغ کا انداز منفرد تھا وہ نوجوانوں پر کفر کے فتوے لگانے، انہیں مذہب سے دور رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ نوجوان شاہ جی کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے۔ حالات حاضرہ پر باتیں ہوتیں۔ سیاست زیر بحث آتی۔ ملکی معاملات پر تبادلہ خیالات ہوتا۔

ایک روز اسلامیہ کالج کے چند طلباء شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ شاہ جی کالج کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے جہاں داڑھی رکھنا بہت مشکل ہے۔ شاہ جی نے داڑھی رکھنے کے جواز میں کوئی حدیث نہ پڑھی نہ ہی کلام پاک کی کسی آیت کی تلاوت کی۔ فرمایا "آپ نے ٹھیک فرمایا۔ خالصہ کالج میں داڑھی رکھنا آسان ہے اسلامیہ کالج میں واقعی بہت مشکل ہے" اس جواب سے ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ انتہائی شرمندہ ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شاہ جی ایسا جواب دیں گے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر

چکا ہوں- شاہ جی کی تبلیغ کا انداز سب سے جدا تھا- یہ ان کی فراست اور حاضر جوابی کی دلیل تھی-

شاہ نے ساری زندگی قصداً تصویر نہیں کھنچوائی جب جلسے میں کیمرہ مین سامنے آتا تو آپ چہرے پر کپڑا ڈال لیتے- مگر لوگ کسی نہ کسی طرح تصویر اتار لیتے- اس میں شاہ جی کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا-

ایسے بہت سے پر لطف واقعات ذہن میں محفوظ ہیں جو شاہ جی کے منفرد انداز کلام کے ضامن ہیں- اس مضمون میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں-

میرا تبادلہ فیصل آباد ہو گیا- اکتساب فیض کا یہ سلسلہ دیر تک جاری نہ رہ سکا- ایک روز جھنگ کے دورے پر تھا کہ شاہ جی کی علالت کی خبر سنی- شاہ جی کو فالج کا حملہ ہو گیا تھا- خبر ملتے ہی شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا- عصر کا وقت تھا- برادر محترم سید عطاء المحسن بخاری نے میری آمد کی اطلاع دی- شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا- عرض کی "بے وقت حاضر ہو گیا ہوں- آپ کی علالت کی خبر سن کر طبیعت پریشان ہو گئی- مجھے معلوم ہے کہ یہ آپ کے اوراد و وظائف کا وقت ہے مگر مجھ سے رہا نہ گیا- آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب تھا-" شاہ جی کی زبان پر فالج کا اثر تھا- رک رک کر گفتگو فرما رہے تھے- انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "انگلیاں کام نہیں کرتیں- وظائف کا تسلسل ٹوٹ چکا ہے- یادداشت ساتھ نہیں دیتی- صحت جیسی ہے تم دیکھ رہے ہو- اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس حال میں رکھے شکوہ کس کا کروں- میں نے اپنے جسم کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں نہیں کی- تین سو پینسٹھ دنوں میں چار سو تقریریں کی ہوں گی- اب اس نے اگر میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس کا کیا قصور یاد رکھو اگر کوئی حکومت اپنی رعایا سے اچھا سلوک نہیں کرے گی تو رعایا ایک نہ ایک دن ضرور بغاوت کر دے گی- پھر جسم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میں نے اپنی رعایا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا- اس کے آرام کا خیال نہ رکھا- اس نے بغاوت کر دی"-

اتنی مختصر سی گفتگو کے بعد شاہ جی تھک چکے تھے- کافی دیر خاموشی رہی- اس دوران میری نظروں کے سامنے وہ تمام جلسے آ گئے جن میں شاہ جی کی سحر بیانی دیکھی تھی- انہیں دلوں کو مسخر کرتے اور دلوں پر قبضہ جماتے دیکھا تھا- ان جلسوں میں شاہ جی کی بے پناہ قدر و منزلت اور احترام دیکھا تھا- شاہ جی کو تلواروں کی سلامی دی جاتی- احرار کے خدام انہیں مارچ کرتے ہوئے جلسہ گاہ تک لاتے- شاہ جی کے جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہی ہزاروں لوگ شاہ جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے- پنڈال شاہ جی زندہ باد مجلس احرار زندہ باد، امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے گونجتا رہتا- شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے دوسرے شہروں سے لوگ گروہ در گروہ آتے- سینکڑوں لوگ میلوں پیدل سفر کر کے جلسے میں شریک ہوتے- تقریر سے گھنٹوں پہلے لوگ سٹیج کے قریب جمع ہونا شروع ہو جاتے- تاکہ دوران تقریر شاہ جی کو دیکھ سکیں- مشتاقان دید ہمہ انتظار بنے شاہ جی کی جلسہ گاہ میں آمد کے منتظر رہتے- بیک وقت ہزاروں نگاہیں شاہ جی کے استقبال کے لئے اٹھتیں- شاہ جی شاہانہ طمطراق کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوتے-

شاہ جی نے خطبہ مسنونہ پڑھا- تقریر کا آغاز کیا- لاکھوں کے مجمع میں سکوت کا عالم طاری ہو گیا- علماء شاہ جی کی خطابت سے مسحور ہو رہے ہیں- انگریزی دان طبقہ الگ جھوم رہا ہے- شعروں کے برجستہ استعمال پر اہل

ذوق داد دے رہے ہیں۔ حفاظ اور قراء شاہ جی کی تلاوت پر قربان ہو رہے ہیں۔ ہر ایک کی جھولی بھری جا رہی ہے۔ ہر ایک کے ذوق کی تسکین کا سامان بہم ہو رہا ہے۔ ہر ایک علم کے خزانے سے دامن بھر رہا ہے۔ خطابت دلوں کے تاروں کو ہلاتی اور ذہنوں کو شاداب کرتی چلی جا رہی ہے۔ مجمع دنیا و مافیہا سے بے خبر ہمہ تن گوش تقریر کے حسن میں کھویا ہوا ہے۔ ہزاروں نگاہیں شاہ جی کے چہرے پر جمی ہیں۔ شاہ جی کی سحر بیانی اور آتش نوائی زوروں پر ہے۔ شاہ جی موضوع کی مناسبت اور موقع کی مطابقت سے قرآنی آیات وجد آفریں قرأت کے ساتھ تلاوت فرما رہے ہیں۔ تقریر کے دوران فارسی اور اردو کے اشعار روحوں کو گرما رہے ہیں۔ شاہ جی اشعار اپنے مخصوص ترنم سے پڑھ رہے ہیں۔ آواز کے زیر و بم کے ساتھ معانی و مطالب کی خود بخود وضاحت ہوتی چلی جاتی ہے۔ الفاظ موضوع کے لحاظ سے تقریر کا حصہ بن گئے۔ ہزاروں کے مجمع میں سانس تک کی آواز نہیں ایک ہی آواز ہے جو دلوں کو گرماتی، روحوں میں سماتی جا رہی ہے۔ شاہ جی لوگوں کے چہروں سے عنوانات چن رہے ہیں ان کا ہاتھ لوگوں کی نبضوں اور دھڑکتے دلوں پر ہے وہ بے پناہ ہجوم کا دھارا جس طرف چاہتے ہیں موڑتے جاتے ہیں۔ مخالفین کی زبانوں سے واہ واہ کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مخالفین اپنی مخالفت بھول گئے۔ معتقدین ایثار کے پیکر، خلوص کے مجسمے اور فدائیت کا نشان بنے بیٹھے ہیں۔ یہ مرد مجاہد، یہ بے لوث انسان، یہ خطیب اعظم اپنے مخصوص انداز میں خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہا ہے۔ اپنے فرض سے سرخرو ہو رہا ہے۔ حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ دینِ خدا کا سپاہی ان سب طاغوتی طاقتوں سے تن تنہا نبرد آزما ہے۔ اس کو کسی طاقت کی مخالفت کی پرواہ نہیں۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے شاہ جی کے بارے میں کہا تھا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

شاہ جی کی تقریر میں جلال و جمال کا حسین امتزاج تھا۔ شاہ جی کے الفاظ میں شبنم کی نرمی، شاخِ گل کی لچک، بلبل کا زمزمہ، ستاروں کی چمک اور بہاروں کا حسن تھا۔ اگر شاہ جی کی زبان پر خدا اور رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کا ذکر ہوتا تو شاہ جی کی تقریر میں بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، سمندر کا خروش، شاہوں کا جلال اور مرد مجاہد کی شان نمایاں ہو جاتی تھی۔ وہ موضوع کے مطابق لب و لہجہ اور انداز بیان بدل لیتے تھے۔ اور تقریر کو انتہائی موثر بنا لیتے تھے۔ الفاظ ہیں کہ پرے باندھے چلے آ رہے ہیں۔ دریا ہے کہ بہاؤ پر ہے۔ سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور اس سمندر کی ہر موج دلوں اور ذہنوں کو بہائے لئے جا رہی ہے۔ فرط جذبات سے لوگ مشتعل ہو رہے ہیں اور ہر دس پندرہ منٹ بعد فلک شگاف نعروں کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد امیر شریعت زندہ باد۔

میں ان فضاؤں میں کھویا ہوا تھا اس دور کو تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ان درخشاں تصورات کا سلسلہ شاہ جی کی مدھم آواز نے توڑا تمام معرکے تمام نقشے، تمام ہنگامے آن واحد میں غائب ہو گئے۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹا میں نے اس سحر بیان مقرر، شیریں مقال خطیب، شعلہ نوا اور آتش بیاں عالم دین

کو اس حالت میں دیکھا جس کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔ جس کی زبان سے بمشکل گفتگو ہو رہی تھی۔ جس کے قوائے ذہنی و جسمانی کمزور ہو چکے تھے۔ جس کی بینائی دھندلا چکی تھی۔ جو ایک خستہ و شکستہ مکان میں رہتا تھا۔ جس کی دینی وملی خدمات کا صلہ عزلت و تنہائی اور جدوجہد آزادی کا انعام مسلسل پریشانی اور کسمپرسی تھا۔ جس کی صحت جو کبھی قابل رشک تھی۔ آج وہ اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھا۔ آج اس کے جوڑ جوڑ اور نس نس میں نصف صدی کی تکان اور مشقت بسی ہوئی تھی۔ جس کا ذہنی اثاثہ کافی حد تک لٹ چکا تھا۔ جس کا جسمانی سرمایہ آہستہ آہستہ گھٹ رہا تھا۔ میری نظروں میں ماضی کی درخشاں تصویر حال کے بوسیدہ چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ چوکھٹا کتنا دیمک خوردہ تھا۔ کتنا بے رنگ و بے آب تھا۔ یہ حال کا چوکھٹا ماضی کے تابندہ و درخشاں نقوش پر اپنا گہرا سایہ ڈال رہا تھا۔

تحیر کی اس زنجیر کو پھر شاہ جی کی آواز نے توڑا۔ شاہ جی نے سلسلہ کلام شروع کیا اور لمبی آہ بھر کر فرمایا۔ "یادداشت کافی حد تک جواب دے چکی ہے۔ بات کرتے کرتے بھول جاتا ہوں جب کوئی بات یاد نہ آئے تو بہت پریشانی ہوتی ہے" میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ میں شاہ جی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کتنا عظیم المیہ ہے۔ کتنا اندوہناک واقعہ ہے۔ وہ شخص جس کے ذہن میں سینکڑوں احادیث پورا کلام پاک اور بیشمار عربی، فارسی اور اردو کے اشعار تھے اور وہ قدرت کے اس عطیے سے جب چاہتا تھا جس وقت چاہتا تھا حافظے کی قوت اور یادداشت کے سہارے استفادہ کر سکتا تھا۔ آج وہ شخص بات تک یاد نہیں رکھ سکتا۔ اس کے دل و دماغ پر کیا قیامت گزرتی ہو گی۔ آج وہ گفتگو کرنے سے عاجز ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور ملتان کے ایک کوچے میں زندگی کے المیے کی تصویر بنا ہوا ہے۔ جس کی محفلیں ہر ذوق کے انسان کے لئے انمول سرمایہ ہوا کرتی تھیں آج وہ خود دوستوں کی محفلوں کو ترس گیا ہے۔

ایک بار شاہ جی نے ایک نشست کے دوران فرمایا تھا "حافظ جی یہ کوئی زندگی ہے یہ تو زندگی کا ماتم ہے۔ گزری ہوئی زندگی کا مرثیہ ہے۔ میری زندگی مسلسل نوحہ بن کر رہ گئی ہے"۔ پھر فرمانے لگے کہ "زندگی کا بیشتر حصہ علماء کی صحبت، شعراء کی مجالس اور، بزرگوں کی خدمت میں بسر ہوا۔ پیر مہر علیؒ شاہ نور اللہ مرقدہ کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ حضرت اقدس حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری قدس سرہ العزیز کی باطنی توجہ سے قلب و روح میں اہتزاز پیدا ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ علیہ کے علمی وادبی خزانے سے مستفیض ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ سے ایک عمر رفاقت رہی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی زندگی کے ساتھی تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے جید علماء کی صحبتیں نصیب رہیں۔ ان میں سے اکثر داغ مفارقت دے گئے۔ یہ بزرگ علم و عمل کے پیکر، زہد و تقویٰ کی تفسیریں اور تبلیغ دین کے علمبردار تھے۔ یہ لوگ جہاں دین کے داعی تھے وہاں جدوجہد آزادی کے رہنما بھی تھے۔ ادیبوں اور شاعروں میں ایم ڈی تاثیر، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عابد علی عابد، عبد المجید سالک، غلام رسول مہر، پطرس بخاری میری مجلسوں کی زینت میری ادبی محفلوں کی رونق تھے علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ان میں سے بھی اکثر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

جو موجود ہیں ان کی صورت دیکھے برسوں گزر جاتے ہیں۔ عبدالمجید سالک تو میرے جیل کے ساتھی تھے۔ ایسے ہی رفیقوں کے سہارے جیل انجمن یاراں بنی رہی۔ فرمایا کہ ایک دفعہ صوفی تبسم جیل میں ملنے آئے عبدالمجید سالک سے مل کر چلے گئے۔ مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرے لئے ایک شعر چھوڑ گئے۔ میں نے عرض کی اگر شعر حافظے میں موجود ہو تو سنائیے پھر شاہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھا۔

حیف کہ من بخوں تپم از تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری، نالہ بہ سینہ بنگری

فرمایا یہ غالب مرحوم کا شعر ہے اسی غزل کا مطلع ہے۔

دیدہ وراں کہ تا نہد دل بشمار دلبری
در رگ سنگ بنگرد رقص بتان آذری

دکھ بھرے لہجے میں فرمایا۔ وہ صحبتیں خواب ہو کر رہ گئیں وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ خواب تھے کہ بکھر گئے اس سینے میں کن کن صحبتوں کے داغ ہیں۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

حافظ صاحب اب تو اس محلے میں رہتا ہوں جہاں کوئی اخبار پڑھ کر بھی نہیں سنا سکتا۔ میری بینائی کمزور ہو چکی ہے۔ آپ آجاتے ہیں تو بھولی بسری صحبتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لاہور سے کوئی دوست آجائے تو ماضی جگمگانے لگتا ہے۔ کمزوری اور نقاہت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ ذیابیطس سے جسم گھل کر رہ گیا ہے۔"

ایسی کئی محفلوں کے نقوش ذہن میں تازہ ہیں۔ کن کن صحبتوں کا ذکر کیا جائے۔ کن کن لمحات کو احاطہ تحریر میں لایا جائے۔ کن کن واقعات کو دہرایا جائے۔ شاہ جی کی صحبتیں میرے لئے کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔ جن کے ایک ایک ورق میں علمی و ادبی خزانے محفوظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی، صحابہ کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جاں نثاری کے واقعات شعرائے کرام کے تذکرے، بذلہ سنجی، خوش مذاقی، انقلاب زمانہ کی ہولناک تصویریں، دیمک خوردہ خاکے ماضی کے تابندہ نقوش، حال کی شکستہ زندگی قید و بند کی جاں سوز حکایتیں۔ ان مجالس میں شاہ جی نے کس موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا۔ کونسا وہ خزانہ نہ تھا جس کی کلید شاہ جی کے پاس نہ تھی۔ ایک شخص کے ہزار رخ ہزار جلوے تھے مگر اس دینی سیاسی علمی پیکر کو مسلسل بیماری نے نحیف و نزار کر دیا تھا۔ اب اس کے ذہن میں ہنگاموں اور معرکوں کے دھندلے خاکے بھی نہیں تھے۔

عید کا روز تھا شاہ جی غسل خانے سے وضو کر کے نکلے غسل خانہ جس میں ایک آدمی اچھی طرح بیٹھ کر وضو بھی نہیں کر سکتا۔ جس کا دروازہ نہیں تھا۔ دروازے کی جگہ پردہ لٹکا ہوا تھا۔ غلسخانے سے نکل کر مجھے افسردہ دیکھا "فرمایا کیوں پریشان ہو" میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آپ نے یہ شعر سنایا۔

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

میں شاہ جی کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ شعر کون پڑھ رہا ہے وہ شخص جس نے بے شمار ویران دلوں کی آبیاری کی جس کے سائے میں ہزاروں لوگوں کو آسودگی نصیب ہوئی۔ جس نے لاکھوں دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی جس نے ان گنت لوگوں کو دین کا درس دیا۔ اللہ اکبر کیسا حیرت کن انقلاب تھا۔ جس کے تصور سے روح کے تار لرزنے لگتے ہیں۔

شاہ جی کا ذاتی کتب خانہ فسادات کی نذر ہو گیا بہت سے قلمی نسخے ضائع ہو گئے۔ قیمتی دواوین اور سینکڑوں اشعار کا خوبصورت انتخاب امرتسر رہ گیا۔ جو عمر بھر کے ذوق کا ادبی سرمایہ تھا۔ اس علمی خزانے کے لٹ جانے سے شاہ جی پر کیا بیتی ہو گی۔ اس کا اندازہ ادب سے شغف رکھنے والے ہی لگا سکتے ہیں۔

ایک دن فرمایا کہ آج کل نوجوانوں میں فارسی ادب کا ذوق ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لئے صحیح ادبی ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ پھر مولانا غلام قادر گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں کا ذکر کرنے لگے۔ مولانا گرامی رحمۃ اللہ علیہ کے معراج کے واقعہ پر لکھے ہوئے اشعار سنائے۔ فرمایا" یہ اشعار مولانا گرامی ہی کا حصہ ہیں" صوتی آہنگ، تکرار لفظی، حسن معنوی، انتخاب الفاظ اور پھر شاہ جی کے پڑھنے کا دلکش انداز۔ عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔

بلا در ہر شکن پیچیدہ زلف سیم تابش را
اجل دریک گریبان ست چشم نیم خوابش وا
شبے در خانہ زیں آں امام انبیا آمد
قضا گیرد عنانش را قدر گیرد رکابش را
قضا گیرد قدر گیرد ازل گیرد ابد گیرد
رکابش راعنانش راعنانش را رکابش را
سوار برق شدما ہے فلک آمد عناں گیرش
رکابش بوسہ بر پا زد ملک بوسد رکابش را
گرامی در قیامت آں نگاہ مغفرت خواہد
کہ در آغوش گیرد جرمہائے بے حسابش را

فارسی ادب کا بہت دیر تذکرہ رہا۔ شاہ جی نے اس روز متقدمین شعراء کے بہت سے اشعار سنائے۔

شاہ جی باتوں باتوں میں ایسے جملے کہہ جاتے تھے جو ادب کی تاریخ ہوتے تھے۔ کتنے ہی جواہر پارے ہونگے جو ضبط تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے ضائع ہو گے۔

ایک دفعہ حدیث کے بارے میں فرمایا" حدیث تو دعوے کی مثل ہے" ایک دن فرمایا" دوستی اور دشمنی کا ترازو تو صرف انبیاؑ کے ہاتھ میں رہا ہے" مولانا محمد انور شاہ کاشمیری نور اللہ مرقدہ کے بارے میں نہایت بلیغ جملہ ارشاد فرمایا۔ واقعہ یوں ہے کہ شاہ جی کسی جلسہ میں شرکت کے لئے گئے۔ سٹیشن پر لوگ ان کے استقبال کے لئے آئے کسی بزرگ نے شاہ جی سے درخواست کی کہ آج وہ علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ

کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں۔ ہماری نئی پود کو اپنے اکابرین کے بارے میں بھی علم ہونا چاہیئے۔ وہاں شاہ جی نے فرمایا کہ حضرت کے بارے میں کیا عرض کروں "صحابہ کا قافلہ جارہا تھا حضرت پیچھے رہ گئے" اس مختصر سے جملے میں حضرت محمد انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے اوصاف حمیدہ ان کے تقویٰ، ان کی بزرگی، ان کا جناب رسالت مآب سے عشق، ان کی اتباع سنت غرضیکہ خصائل و شمائل کی ایک دنیا آباد ہے۔ اگر اس کی تشریح کی جائے تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کی بات ہو رہی تھی شاہ جی نے دو شعر سنائے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فکر کی معراج نظر آئے۔

وجدت العلم فی الاشراف عظماً

وفی الاجلاف مقبوحاً و ذماً

کماء المطرفی الاصداف دُراً

وفی فم الافاعی صارساً

میں نے شرفاء میں علم کو معزز پایا اور کمینوں میں ذلیل و خوار دیکھا۔ جیسے سواتی کا پانی سیپ کے منہ میں موتی اور سانپ کے منہ میں زہر۔

میں نے جب آخری بار شاہ جی کو دیکھا وہ صاحب کمال اور صاحب علم و فضیلت بزرگ نشتر کالج میں بے سدھ پڑا تھا جس کا وجود نصف صدی کی جدوجہد کی تاریخ تھا۔ جس نے اپنی سحر بیانی ایثار و قربانی اور علم و فضل سے لاکھوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کی۔ جس کے صدائے کلمتہ الحق سے اہل باطل کانپ کانپ اٹھتے تھے جس کی ساری زندگی مسلسل جدوجہد، مستقل آزمائشوں اور قید و بند کی صعوبتوں میں گزری مگر کسی امتحان کسی آزمائش میں اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

شاہ جی نے وطن کی آزادی کے لئے قابل رشک جوانی قربان کر دی اور ناموس رسول اللہ ﷺ کے لئے ساری زندگی۔ اس شخص کو نہ زنجیر و سلاسل کا خوف تھا نہ دار و رسن کا اس نے ظلم و استبداد کا عالی حوصلگی اور پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس نے کبھی اپنی قربانیوں کا صلہ نہیں چاہا۔ خلافت کے زمانے میں لاکھوں روپے اکٹھے ہوئے عورتوں نے شاہ جی کی تقریر سے متاثر ہو کر زیورات سٹیج پر پھینک دیئے۔ اگر شاہ جی چاہتے تو اپنی ذات کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان کی بے لوث اور پر خلوص زندگی نے دنیوی آرام و آسائش کو قبول نہیں کیا۔ شاہ جی کو قدرت نے حسن کلام اور حسن خطابت کا جوہر عطا فرمایا تھا۔ وہ زندگی کی اعلیٰ ترین آسائشیں حاصل کر سکتے تھے مگر اس مرد قلندر اس فرشتہ سیرت بزرگ نے آخرت کے لئے سرمایہ اکٹھا کیا وہ مطمئن تھا کہ اس نے کبھی ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ بر سر عام حق بات کہی۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ وطن سے محبت کی، آزادی کا علم بلند کیا۔

آج وہ مرد درویش، خطیب اعظم، شعلہ بیان مقرر، عاشق رسول اللہ ﷺ آزادی کا بیباک اور نڈر سپاہی دین کا مبلغ اپنا فرض ادا کر کے زیر زمیں آسودہ خاک ہے۔

وے لوگ تو نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے

حکیم محمد بخش کامل چشتی
جالندھری مرحوم

منکر ختم نبوت پر تو اک صمصام ہے

شہ عطاء اللہ سبطِ حیدرِ کرار ہے اور نواسہ ختمِ مرسل احمد مختار ہے
عالم اسلام کی ہاں تیغ جوہر دار ہے کفر اور الحاد سے تو برسرِ پیکار ہے
بادۂ توحید کا گویا چھلکتا جام ہے
قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے

جلوہ گر تیری جبیں سے مصطفےٰ کی شان ہے تو علیؓ شیر خدا اور فاطمہؓ کی جان ہے
مخزنِ علم و عمل تو چشمۂ عرفان ہے اخترِ اقبال اور سرتاجِ ہندوستان ہے
ہند کیا چرچا تیرا تو مصر و روم و شام ہے
قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے

سچ تو ہے عالم تیرا شرمندۂ احسان ہے جان جب ناموس احمد پر تیری قربان ہے
تیری قربانی کی عالم میں نمایاں شان ہے سطوتِ فاروقؓ اور خالدؓ کی دل میں آن ہے
اہل حق کے واسطے الطاف اور اکرام ہے
قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے

کانپ جاتا ہے فلک جب نعرۂ تکبیر سے لرزاں ایوانِ حکومت کیوں نہ ہو تقریر سے
ہاں الجھ جاتی ہے تیری تیغ جب تقدیر سے حل نہ کیونکر ہوں بھلا عقیدے تیری تدبیر سے
منکرِ ختم نبوت پر تو اک صمصام ہے
قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے

بند زنداں میں کیا جونہی حکومت نہ تجھے دی صدائے مرحبا!! ختم رسالت نے تجھے
دیدیا پیغامِ آزادی صداقت نے تجھے دی مبارکباد حید کی شجاعت نے تجھے
دینا پیغامِ عمل ہاں غازیوں کا کام ہے
قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے

زندگی ہے وقف تیری ملک و ملت کے لئے جیل کی جھیلی مصیبت دیں کی عظمت کے لئے
سربکف بیتاب ہے جامِ شہادت کے لئے ہے تڑپ دل میں تیرے احمد کی اُمت کے لئے
زندہ کرنا سنتِ اسلاف تیرا کام ہے
قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے

محمد عمر فاروق

شاہ جی اور مولانا محمد گل شیر شہید

اللہ کریم نے مجلس احرارِ اسلام کو ایسے عظیم المرتبت رہنماؤں اور قابلِ صد تحسین کارکنوں سے نوازا تھا کہ ان میں سے ہر ایک فرد اپنے مقام پر استقامت کا پہاڑ اور غیرتوں کا مرقع تھا۔ قیامِ ازل سے انہیں بے شمار خوبیاں ودیعت ہوئی تھیں۔ جن کی مثال دیگر جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں میں آج بھی مفقود ہے۔

حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ مجلسِ احرار کی آبرو تھے۔ یا عبداللہ ملک کے الفاظ میں "شاہ جی اور احرار میں گل و بلبل کا رشتہ تھا"۔ اور اس رشتے و تعلق کو صرف موت ہی جدا کر سکی۔ شاہ جی کی سحر طراز شخصیت کا طلسم تھا کہ لوگ کھنچے چلے آتے۔ اور پہروں جمالِ ہمنشینی کا لطف اٹھاتے۔ شاہ جی اپنے سکندرانہ جلال اور قلندرانہ اداؤں کی بدولت لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں یوں بس گئے کہ پھر کوئی دوسرا اُن کی جگہ نہ لے سکا۔ شاہ جی حسباً اور نسباً صدیوں کی امانتوں کے امین تھے۔ اور اپنی صفاتِ عظیمہ میں قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔ ان کے مجاہدانہ معرکوں کا اعتراف کس نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب اُن کی وفات کی خبر اُن کے مرشد قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری تک پہنچی تو وہ شدتِ غم سے دھاڑیں مار مار کر روئے تھے۔ کیونکہ مُرشد کے آئینۂ دل سے بڑھ کر کس پر مُریدِ باصفا کے باطن و ظاہر کے احوال منعکس ہو سکتے تھے۔

الغرض شاہ جی کو اگر مشاطۂ ازل نے اس طرح بنا سنوار کر یہاں بھیجا تھا کہ ماضیٔ مرحوم میں اُن کے حسنِ ظاہری اور باطنی میں اُن کا کوئی مثیل نہ تھا۔ تو قدرت کے دستِ فیاض نے انہیں ساتھی بھی ایسے عظیم عطاء کئے تھے جو اپنے مقام و مرتبے، علم و عمل اور مزاج و طبعیت کے اعتبار سے بھی سراپائے احرار تھے۔ اور میں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ وہ سب شاہ جی کی ذات ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ چودھری افضل حقؒ ایسے رہنما سے لے کر جانباز مرزاؒ ایسے کارکن تک ہر رہنما و کارکن تمام تر احراری صفات کا مکمل آئینہ دار تھا جو سیرتِ رسول ﷺ ازواج و اصحابِ رسول رضی اللہ عنھم کا عکسِ جمیل تھیں۔ ہر ایک کا شاہ جی سے اور شاہ جی کا ہر ایک سے اپنا ہی تعلقِ خاص تھا جو بس اسی کے لئے مخصوص تھا۔

مولانا محمد گل شیر شہیدؒ بھی شاہ جی سے اپنے تعلقِ خاطر کے لحاظ سے منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ مجلس احرار میں شمولیت سے پیشتر مولانا گل شیر شہیدؒ کے تاریخی کام کا دائرہ کار گجرات، راولپنڈی، جہلم، اٹک، چکوال، میانوالی، بھکر، خوشاب، شاہ پور، سرگودھا اور مظفر گڑھ وغیرہ کے اضلاع میں پھیلا ہوا تھا اور وہ ان علاقوں میں اپنے اثر و رسوخ کے حوالے سے جانباز مرزا کے بقول "مسلمانوں کے دلوں پر راج کرتے تھے"۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ مولانا گل شیر نے اصلاحِ رسوم و تبلیغِ اسلام، عورتوں میں پردے پر زور اور ان کے حقوق پر توجہ، ہندوؤں کے تجارت پر قبضہ کے خلاف تحریکات، مسلمان قبائل میں صلح و اتحاد، غریب مسلمان کاشتکاروں کی مالی امداد اور خاکسار تحریک کے عقائد و نظریات کی سرکوبی میں گزارا۔ اس وقت تک آپ سیاسیاتِ ہند میں وارد نہ ہوئے تھے۔ اور

انگریز پرستوں کے پھیلائے گئے پروپیگنڈے کے تحت آپ بھی مجلس احرار کو کانگریس کی زرخرید جماعت سمجھتے تھے۔ جب کبھی ان علاقوں میں شاہ جی یا مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ وغیرہ تشریف لاتے تو آپ دوسرے ہی روز اسی مقام پر جلسہ کرتے اور احرار رہنما کی تقاریر کے اثرات کو اپنی شعلہ بیانیوں سے ختم کر کے رکھ دیتے۔ شاہ جی بھی مولانا گل شیرؒ کی اثر انگیز شخصیت کے معترف تھے اور ان کی عوام میں مقبولیت اور جادو بھری خطابت سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ یہاں تک کہ شاہ جی نے میانوالی کے ایک اجتماع میں مولانا کی عوام میں اثر پذیری کا اعتراف کر ڈالا اور سامعین سے فرمایا کہ:

"بھائی! تمہارا کیا اعتبار ہے تم تو ریت کے ٹیلے ہو۔ جب انگریز کے خلاف تمہارا ذہن تیار کر کے چلا جاتا ہوں تو ایک تند و تیز بگولہ آتا ہے اور تمہیں اُڑا کر لے جاتا ہے"۔

ابھی تک ان دونوں رہنماؤں کی آپس میں کہیں ملاقات نہ ہو پائی تھی کہ غلط فہمیوں کے بادل چھٹتے۔ ۱۹۳۸ء میں ہی عالمی سطح پر جنگ عظیم دوم کے آثار واضح ہو رہے تھے بڑی سیاسی جماعتیں ان اہم نوعیت کے فوجی اضلاع پر نظر جمائے بیٹھی تھیں۔ لیکن مولانا کے ہوتے ہوئے یہاں کسی سیاسی جماعت کا قیام عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ اب صرف ان کی ذات ہی امیدوں کا مرکز تھی۔ کیونکہ آپ کا وزن جس پلڑے میں جاتا وہی جماعت یہاں قدم جمانے میں کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔ مگر آپ نے تمام جماعتوں کی دعوتوں کو یکسر مسترد کر دیا۔

حج کے ایام نزدیک آچکے تھے اور آپ اپنی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اسی اثناء میں لاہور میں شاہ جی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ شاہ جی بڑے تپاک سے ملے۔ دونوں طرف سے محبت بھرے جذبات کا سیلاب امنڈ آیا۔ شاہ جی بالآخر دل کی بات زبان پر لائے اور آپ سے فرمایا کہ:

"گل شیر! میں تمہاری دینی خدمات سے کماحقہ واقف ہوں۔ تمہارا ہر دینی قدم مجھے بے حد عزیز ہے۔ ہم سب کا مقصود خدمت اسلام ہے۔ اور جب منزل ایک ہے تو یہ دوری اچھی نہیں لگتی۔ ہمارے ساتھ مل کر تم اپنی خدمات کو وسیع پیمانے پر انجام دے سکتے ہو۔ میں ایک بات کا اظہار اگر اس موقع پر کر دوں تو شاید غیر مناسب نہیں کہ اب دینِ متین کی سب سے بڑی خدمت انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے جہاد کرنا ہے۔ کیونکہ اس نے ہند پر ہی تسلط نہیں جمایا بلکہ جزیرۃ العرب کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے اور اپنے خود کاشتہ پودے سے قادیانیت کے ذریعے دینِ مصطفیٰ ﷺ میں نقب لگائی ہے۔ متحد ہو کر ہی لٹتے ہوئے غریب الوطن دین کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ہمارا ساتھ دیں تو دشمن منہ کی کھائے گا (ان شاء اللہ)

مولانا گل شیر نے شاہ جی کی گفتگو سن کر عرض کیا:

"حضرت! آپ کا فرمان بجا ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں آیا تو باجماعت آؤں گا۔ میں نے دیگر کئی دعوتوں پر غور کیا ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے کہ جب سوچتا ہوں تو ذہن ساتھ نہیں دیتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ:

"گل شیر! ابھی وہ گھڑی نہیں آئی" "میں کیا جانوں کہ وہ گھڑی کب آئے گی"۔

اس بات چیت کے بعد مولانا گھر واپس تشریف لے آئے۔ یہ ۱۹۳۸ء کے آخری دن تھے جنوری ۱۹۳۹ء کے اوائل میں آپ حج بیت اللہ کے لئے عازم سفر ہوگئے۔ آپ کے ہمراہ مولانا قطب الدین آف غور غشتی، مولانا عبد الغفور ہزاروی، مولانا غلام اللہ خان اور مولانا قاضی زاہد الحسینی بھی زائرینِ حرمین تھے۔

مولانا نے روضتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ بارگاہِ ایزدی میں شہادت کی موت کے لئے دعاء کی اور اسی مقدس مقام پر رب العزت کے حضور گڑگڑا کر عرض کیا کہ:

"اے اللہ! میرا تعلق اس جماعت سے جوڑ دے جو خالص تیری رضاء اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سر بلندی کے لئے مصروف عمل ہو"۔

آپ گھر سے یہ ارادہ باندھ کر چلے تھے کہ: "روضۂ رسول ﷺ سے جواب لے کر ہی لوٹوں گا"۔ دعاء مستجاب ہوئی اور آپ وہیں زیارتِ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہوئے جیسا کہ احرار میں شمولیت کے بعد ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

"مجھے احرار کے سٹیج پر دلی مسرت ہوتی ہے کہ میں یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ مجھے لانے والا کوئی چھوٹی حیثیت کا مالک نہیں بلکہ میں سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا مامور ہوں اور فرض کی بجا آوری کو ہی اپنا فرض خیال کر کے کام میں مشغول ہوں۔ مجھے اس بات کا حکم میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت دیا جب میں اُن کی ادب گاہ کے زائر کی حیثیت سے مدینتہ النبی ﷺ میں مقیم تھا۔ رات سویا تو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور ارشاد فرمایا:

"گل شیر! اگر اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہو تو جاؤ ہندوستان میں احرارِ اسلام کے ساتھ تعاون کرو"۔ (روزنامہ "آزاد" لاہور "احرار نمبر" ۲۷ ستمبر ۱۹۵۸ء ص ۲۶)

اس واقعہ کے ساتھ ہی آپ کی فکر و نظر کے زاویے تبدیل ہو گئے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے چند دن گاؤں (ملمووالی ضلع اٹک) میں گزار کر دفترِ احرار لاہور میں تشریف لے گئے۔ حضرت شاہ جیؒ اپنے احباب کے ہمراہ دفتر میں موجود تھے۔ آپ کی دفتر میں غیر متوقع آمد پر حیرت و تجسس اور مسرت کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ آپ کا استقبال کیا گیا۔ آپ اور دفترِ احرار؟ یہ جوڑ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مولانا نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے مدینتہ النبی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا اور اپنی خدمات مجلسِ احرار کے لئے پیش کرنے کا اعلان کیا تو شاہ جی نے آپ کو سینے سے چمٹا لیا اور شاہ جی پر گریہ طاری ہو گیا۔ آپ کی احرار میں شمولیت پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ مولانا احرار رہنماؤں سے ملنے کے بعد اپنے علاقے میں مجالس احرار کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب فرنگی کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اور ان مخصوص اضلاع میں جہاں مولانا اثر و رسوخ رکھتے تھے انگریز اور اس کے حاشیہ برداروں کی عوام پر اتنی مضبوط گرفت تھی کہ کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ مجلسِ احرار اسلام ایسی حریت پرور جماعت کا نام ہی سرمایہ پرستوں کے لئے کھلا چیلنج تھا۔ ان جاں سوز حالات میں مجلسِ احرار کے پلیٹ فارم سے مولانا کا اُبھرنا کسی بڑے خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن آپ نے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری میں اس راہِ عزیمت میں اپنی جان تک لڑا دی۔

آپ کی دعوت و انتظام کے نتیجے میں ۱، ۲، ۳ جون ۱۹۳۹ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس پنڈی گھیب ضلع اٹک میں انعقاد پذیر ہوئی۔ مولانا مظہر علی اظہر اور شاہ جی نے مختلف نشستوں سے خطاب کیا۔ ایک نشست کی صدارت پیر لال بادشاہ آف مکھڈ نے کی اور یونینسٹ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک بھی پیش کی۔

اس کامیابی کے بعد احرار رہنماؤں کی یہاں آمد و رفت میں حائل تمام رکاوٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۲۱ تا ۲۹ جولائی ۱۹۳۹ء کو آپ کے پروگرام کے تحت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ حضرت شاہ جیؒ اور خواجہ عبدالرحیم عاجز امرتسریؒ نے ضلع میانوالی میں پانچ بڑے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ اور تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ کے سلسلے میں عوامی اذہان کو بیدار کیا۔

۳۰، ۳۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس ملھوالی ضلع اٹک اپنے گاؤں میں منعقد کی۔ شاہ جی اور مولانا لدھیانوی نے فوجی بھرتی کے خلاف مہم کو تیز تر کرنے کے لئے اپنی تمام تر شعلہ گفتاری سے کام لیا۔

ان اجتماعات کے انعقاد پذیر ہونے کے ساتھ ہی مولانا گل شیر اس علاقے میں بالخصوص اور ہندوستان بھر میں بالعموم احرار کے مشن کو لے کر اٹھے اور غلامی کی تاریکی میں غرقاب قوم کو لیلائے آزادی سے روشناس کرانے میں دیوانہ وار مصروف ہو گئے۔

مذکورہ بالا اجتماعات کے بعد شاہ جی مولانا کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے تھے اور ایک جلسۂ عام میں مولانا کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ!

"آج میں اپنے نال اک ہور جنا لے کے آیا واں"۔

کہ "میں آج اپنے ساتھ ایک اور مردِ نر لے کر آیا ہوں" لفظ "جنا" ان علاقوں میں بہادر شخص کے لئے بولا جاتا ہے۔

شاہ جی اور مولانا کا تعلق ایسا جڑا کہ موت کا عارضی وقفہ ہی انہیں کچھ وقت کے لئے جُدا کر سکا۔

اللہ کریم نے شاہ جی اور مولانا میں بعض مشابہتیں بھی پیدا کر دی تھیں۔ شاہ جی کی کیف آور اور وجد آفریں قرأت نے ایک عالم سے خراج وصول کیا تھا۔ یہی حال مولانا کی تلاوت کا بھی تھا۔ شاہ جی نے اس سوال پر کہ "آپ کو کبھی کسی کی تلاوت نے متاثر کیا؟" فرمایا کہ:

> "مجھے اپنے ساتھیوں میں سے مولانا گل شیر خان شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تلاوت کلام الہی نے بے حد متاثر کیا۔ مولانا کی تلاوت قرآنِ حکیم سُن کر لوگ بے سُدھ ہو جاتے تھے۔ مجھے آج تک کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں مل سکا جس کی تلاوت اتنی مؤثر اور کیف آور ہو"۔

یہی صورت تقریر کی تھی۔ شاہ جی اور مولانا کی تقریر میں حیرت انگیز مشابہت نظر آتی تھی۔ جس پر مرکزیہ مجلس احرار ہند کو یہ سرکلر جاری کرنا پڑتا تھا کہ:

> "ماتحت جماعتیں متوجہ ہوں کہ ایک ہی جلسے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا گل شیر خان کو مدعو نہ کیا جائے"۔

اسی وجہ سے دونوں حضرات کی تقاریر کی مثال ایک مقام پر کم ہی ملتی ہے۔ جس شہر میں مولانا گل شیر تاریخ دے دیتے اور منتظمین شاہ جی کو مدعو کرنا چاہتے تو شاہ جی سختی سے یہ کہہ کر انکار فرما دیتے کہ:

"مولانا گل شیر کے ہوتے ہوئے میری ضرورت نہیں ہے"۔
جو قلبی موانست کا بھی بھرپور اظہار و اعتراف ہوتا تھا۔
۱۹۴۳ء میں آل انڈیا احرار کانفرنس گوجرانوالہ میں شاہ جی اور مولانا اتفاق سے اکٹھے ہو گئے شاہ جی کی صدارت تھی مولانا کی خطابت نے وہ سماں باندھا کہ شاہ جی وجد میں آ گئے اور وارفتگی سے اٹھ کر آپ کا ماتھا چوم لیا۔
۱۹۳۹ء میں شاہ جی پر مشہور زمانہ مقدمہ بغاوت "لدھا رام کیس" قائم کیا گیا لیکن آپ باعزت بری کر دیئے گئے۔ اسی دوران مولانا پر بھی ایسا ہی ایک مقدمہ سکندرِ وزارت نے بنانا چاہا۔ لیکن آپ کے بیانِ صادق نے اُن کی تمام آرزوؤں کو خاک بسر کر دیا۔
جن دنوں شاہ جی مذکورہ مقدمہ میں رہا ہوئے تھے اس دوران سر سکندر حیات کا بیٹا سردار شوکت حیات مصر میں جنرل رومیل کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ سکندر حیات خان بیٹے کی رہائی کے لئے مصر گئے۔ اس واقعہ اور شاہ جی کے مقدمہ کو مولانا نے بڑے خوبصورت پیرائے میں چنیوٹ کے ایک جلسہ عام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:
"ویکھ میرے مولا دے رنگ ٹُدھ وزیر دا پتر اسیر تھی گیا تے جنوں توں پھانسی لگوانا چاہندا اسی او ضیاء اللہ شاہ دا پتر عطاء اللہ شاہ رہا تھی گیا۔

چھنا لنج چھنیندا یار
مولانا مولہ گھم مریندا یار

(میرے اللہ کے رنگ تو دیکھ کہ تم وزیر اعظم (سکندر حیات) کا بیٹا گرفتار ہو گیا لیکن سید ضیاء اللہ شاہ بخاری کا بیٹا سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں تم پھانسی لگوانا چاہتے تھے رہا ہو گئے)
سکندر حیات چونکہ جرچل سے بیٹے کی رہائی کے لئے مصر گئے تھے۔ حج کے ایام قریب تھے۔ وہ حج پر نہ گئے۔
اس پر مولانا نے انور صابری مرحوم کی یہ رباعی پڑھی تو مجمع تڑپ اٹھا۔

حرم کو بندۂ لات و منات کیا جانے
خدا کے گھر کو سکندر حیات کیا جانے
کسی غریب کی اختر شماریوں کے مزے
نہ جس نے رو کے گزاری ہو رات کیا جانے

مولانا اور شاہ جی میں محبت و الفت کا بھی عجیب ہی سلسلہ تھا۔ ریل و جیل کی صعوبتوں سے ... کبھی فرصت ملتی تو شاہ جی دفترِ احرار لاہور میں شعر و ادب، دین و سیاست کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی اور چٹکلہ بازی کا وہ میدان گرم کرتے کہ الاماں۔ اس محفل میں اگر مولانا تشریف لے آتے تو سب حضرات خصوصاً شاہ جی دیکھتے ہی احتراماً خاموش ہو جاتے۔ لیکن کب تک! شاہ جی تو روتوں کو ہنسانے والے تھے۔ بھلا کیوں کر چپ بیٹھتے۔ کچھ دیر بعد ادھر کوئی دوست بات چھیڑتا ادھر شاہ جی کو پھڑکتا ہوا لطیفہ بر آمد ہوتا اور ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جُڑ جاتا۔ مولانا بھی شریک ہو جاتے اور محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی۔
مولانا کے دل میں شاہ جی کی عظمت کا نقش کچھ اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ تادمِ واپسیں کسی کے مٹائے نہ مٹ

سکا۔ یہی حال شاہ جی کا تھا۔ وہ جب کبھی ماضی کی یادوں کو کریدتے مولانا کا تذکرہ لازماً آتا۔ اور وہ تادیر مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنائے رکھتے۔ ان دونوں شخصیتوں میں اُنس و محبت کی جو فضا قائم تھی وہ ہر دو کے خلوص و بے غرضی کی بنیاد پر تھی۔ اس پر ایک ہی مقصد کی لگن اور ایک ہی منزل کی جستجو نے قربتوں کے مزید سامان میسر کر رکھے تھے۔ دو عزیز ترین ساتھی تو شاہ جی نے اپنے پالنہار سے مانگ کر لیے تھے۔ ایک بقول ابو یوسف قاسمی مرحوم کے چودھری افضل حقؒ اور دوسرے بقول مولانا عنایت اللہ چشتیؒ کے مولانا گل شیر خان دونوں احباب سے شاہ جی کا تعلق دیگر رہنماؤں سے الگ نوعیت کا تھا۔ اور ان دونوں کی اچانک رحلت و شہادت نے شاہ جی کی صحت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

برصغیر کے قومی و سیاسی حالات اتنے گھمبیر ہو گئے تھے کہ احرار رہنماؤں کو بھی اتنی ہی شدت سے آزادی کی جنگ کو تیز تر کرنے کے لئے راس کماری سے پشاور تک ہر محاذ پر دادِ شجاعت دینا پڑ رہی تھی۔ اور انہیں مہینوں بچوں کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔

ادھر مولانا گل شیر خان کو لاحق تمام خطرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اعلان و اظہارِ حق کے لئے طویل دوروں میں مصروف تھے۔ آپ نے ۲۶، ۲۷ اگست ۱۹۴۳ء کو دو روزہ حکومتِ الٰہیہ کانفرنس تلہ گنگ ضلع اٹک میں شرکت فرمائی۔ جناب کپتان غلام محمد صاحب (آف چکڑالہ ضلع میانوالی) کی روایت ہے کہ مولانا نے اس کانفرنس میں فرمایا کہ:

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ پھر میں کبھی تلہ گنگ نہیں آسکوں گا۔ یہاں میری یہ آخری تقریر ہے۔ ہاں میرے بعد شاہ جی یہاں آئیں گے اور تمہیں قرآن سنائیں گے"۔

اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد آپ تلہ گنگ تشریف نہ لا سکے۔ شاہ جی کے بارے میں آپ کا مندرجہ بالا جملہ شاہ جی سے آپ کی سچی محبت کا ترجمان ہے۔

مولانا گل شیر احرار میں شامل ہوتے ہی تحریکی کاموں میں ایسے مصروف ہوئے کہ فراغت کے لمحات بہت ہی کم نصیب ہوئے۔ اب مرکزی مجلسِ عاملہ کے اجلاسوں یا مرکزی اجتماعاتِ احرار کے موقع پر ہی شاہ جی سے ملاقات ہوتی۔

۱۹۳۹ء میں احرار نے فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک چلا رکھی تھی۔ مولانا نے اس تحریک کو اپنے اضلاع میں اتنے زور و شور سے ہوا دی کہ فرنگی اور فرنگی نواز حلقے بوکھلا گئے۔ مولانا نے فوجی بھرتی میں اتنی مضبوط رکاوٹیں کھڑی کیں کہ انگریز کو یہاں سے جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء) کی نسبت جنگِ عظیم دوم (۱۹۳۹ء) میں بہت کم فوجی رنگروٹ ہاتھ آئے۔ جس پر جاگیردار عناصر کے مفادات کو بھی سخت دھچکا لگا اور انگریزی دربار میں اُن کے غلامانہ وقار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ علاوہ ازیں مولانا نے سینکڑوں مقامات پر مجالسِ احرار کا قیام عمل میں لایا۔ جس کے نتیجے میں عوام میں آزادی کا شعور جاگا اور وڈیروں کو مظلوم عوام پر سے اپنا دبدبہ و دہشت بکھرتا ہوا نظر آیا۔ اس پر مستزاد مولانا کا کالا باغ سے غریب مکینوں کے شہری و سماجی حلقوں کے تحفظ و بحالی کے لئے آواز اٹھانا تھا جس پر کالا باغ کے رئیس کو اپنا حاکمانہ غرور خاک میں ملتا ہوا دکھائی دیا۔

مولانا گل شیر کے ان اقدامات نے وڈیروں کی نیندیں حرام کر دیں۔ نخوت و تکبر اور ظلم و بہیمت کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بجائے اس کے کہ مولانا کے کئے گئے عوامی و سماجی کاموں کی قدر کی جاتی۔ عقیدت و محبت بھری نگاہیں ان کے فرشِ راہ کی جاتیں لیکن جبر و تشدد اور سفاکی و درندگی نے بار کب مانی ہے کہ اس سے سرِ پُرغرور بہرحال ختم کرنا ہی پڑتا ہے۔ انگریز، ہندو اور فرنگی کے چہیتے فرزند نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کے شیطانی منصوبے کے تحت بالآخر ۲۳، ۲۴ مئی ۱۹۴۴ء کی درمیانی شب مولانا کو اپنے گھر میں سوتے میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

اس دوران شاہ جی سرسہ ضلع حصار (انڈیا) کے دورے پر تھے۔ رات کے جلسے سے پہلے آپ کو اس اہم قومی و دینی حادثہ اور عزیز ساتھی کی اچانک رحلت کی اطلاع ملی۔ اور آپ اس صدمے کے زیرِ اثر بغیر تقریر کئے امرتسر روانہ ہو گئے۔

مولانا کی شہادت کی خبر ملتے ہی مرکزی دفتر احرار لاہور میں پرچم احرار سرنگوں کر دیا گیا اور صدر مرکزیہ احرار نے پنجاب بھر میں ۱۰ جون تا ۱۰ جولائی مولانا کی یاد میں احرار اجتماعات منعقد کرنے کا حکم دے دیا۔

مولانا گل شیر شہید کی جدائی کا صدمہ شاہ جی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ یہ شاہ جی کے لئے نہ صرف محبوب رفیق کی فرقت کا غم تھا بلکہ انگریزی استعمار کی کمین گاہوں یعنی ان فوجی اضلاع میں جاگیرداری کے خلاف ایک توانا آواز کا خاموش کر دیا جانا شاہ جی کے لئے بار خاطر تھا۔ انگریز کے گماشتوں کی اس سفاکانہ واردات پر شاہ جی شعلۂ جوالہ بنے ہوئے تھے۔ آپ نے ۲ جون ۱۹۴۴ء کو فیصل آباد میں "یومِ گل شیر" سے خطاب کیا اور نواب آف کالا باغ کو مولانا کے قتل کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"اے امیر محمد خان! تو نے ایک مسلمان، حافظ قرآن، اسلام کے مبلغ اور میرے رفیق مولانا گل شیر خان کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر قتل تو کروا دیا لیکن یاد رکھنا تیری قبر بھی تجھ کو پناہ نہ دے گی"۔

شاہ جی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور نواب کالا باغ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن بظاہر اس کے قاتلوں کی نشاندہی قانون کے ہاتھوں نہ ہو سکی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ آج نواب کی قبر کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ کالا باغ کے نواح میں یہ بات مشہور ہے کہ نواب کی لاش کو دریائے سندھ کی موجوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

و الله عزیز ذوانتقام

"اور اللہ ہی زبردست انتقام لینے والا ہے"۔

شاہ جی "یومِ گل شیر" کے سلسلہ میں مولانا کے ضلع اٹک میں تشریف لائے۔ اور ۹ جولائی ۱۹۴۴ء کو تحصیل تلہ گنگ کے گاؤں "لاوہ" میں مسجد باہیاں والی میں خطاب فرمایا۔ شاہ جی کی یہ تقریر اُن کے دلی جذبات، غیرتِ دینی اور حزن و ملال کا اظہار تھی۔ آپ نے شہادت گل شیر کا پس منظر اور پیش منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مولانا گل شیر خاندانِ اسلام کے وہ عظیم بیٹے تھے جنہیں احرار میں شرکت کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں فرمایا۔ اس سے بڑھ کر ان کے لئے کون سی سعادت و خوش بختی ہو

سکتی تھی۔ وہ آج جس مقامِ اعلیٰ پر فائز ہو چکے ہیں وہ ہماری مدح و توصیف کا محتاج ہی نہیں ہے۔

مولانا گل شیر کا یہی ایک قصور تھا کہ انہوں نے سامراجی غلامی کے گھٹتے ہوئے اس علاقے میں اللہ کی حاکمیت کا پرچم بلند کیا۔ اور فرنگی اور اس کے خواجہ تاشوں کی اندرون خانہ گھناؤنی سازشوں کو بے نقاب کیا لیکن افسوس کہ ملک وملت اور دین اسلام کے درد میں ڈوبی ہوئی صدائے گل شیر پر لبیک کہنے کی بجائے خود انہیں ہی راستے ہی ہٹا دیا گیا۔ کتنے بد بخت تھے وہ لوگ! جنہوں نے ان کے خون بے گناہی سے اپنے ہاتھ رنگے اور کیسا خوش قسمت ہے گل شیر! کہ جسے دینِ حق کی خاطر شہادت عظمیٰ نصیب ہوئی۔

ہائے گل شیر! تجھے اپنی آرزوؤں کی معراج مل گئی۔ لیکن شہادت کا جام اپنے تک ہی کیوں رکھا۔ میں نے سنا تھا کہ اعوان بہت سخی ہوتے ہیں لیکن تو تو بخیل نکلا۔ اگر اپنے لئے شہادت کی دعا مانگی تھی تو میرے لئے کیوں نہیں مانگی۔ ہاں! جس جانور میں کوئی نقص ہو وہ قربانی پر نہیں لگتا شاید۔۔۔۔ میں ہی اس قابل نہ تھا کہ میرے حصے میں بھی شہادت آتی۔ (یہ کہتے ہی شاہ جی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور سارا مجمع بھی اشکبار ہو گیا۔ طبعیت سنبھلی تو فرمایا)

گل شیر کا قتل معمولی قتل نہیں ہے کہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ گل شیر خان کا خون رنگ لا کر رہے گا۔ پھر تمہاری نوابی اور سرداری بھی تمہارا تحفظ نہیں کر سکے گی۔

گل شیر نے انگریز کو غاصب اور تم جاگیرداروں کو وطن کا غدار کہا اور تمہارے کرتوتوں کا پردہ چاک کیا۔ لو سنو! آج اسی مقام پر جہاں گل شیر نے تمہیں للکارا تھا اور تمہیں قوم و ملک کا بے وفا اور نمک حرام قرار دیا تھا بخاری بھی تمہیں اور تمہارے فرنگی آقا کو ڈنکے کی چوٹ غاصب، لٹیرا، غدار، ٹوڈی، دینِ محمد ﷺ کا دشمن اور امتِ محمدیہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا باغی کہتا ہے۔ تم نے جو تعزیر مجھ پر جاری کرنی ہے ابھی کر لو۔ سید حاضر ہے۔

اے فرنگی زادو! تمہاری حیثیت و اہمیت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ فرنگی کی چوکھٹ پر جبہہ سائی اور زلہ ربائی تمہارا کردار رہا ہے۔ تم وہی ہو جنہوں نے کعبۃ اللہ کی مقدس دیواروں اور سید عبد القادر جیلانیؒ کے مزار کو اپنی گولیوں سے چھلنی کیا ہے۔ انگریزی حکومت کو مضبوط کر کے قوم کی عزت و آبرو کو گروی رکھ دیا ہے۔ وقت کے کسی فرعون وہامان کا رعب و رعونت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم احرار ایک بات جانتے ہیں کہ حکم بھی اللہ کا ہے اور زمین بھی اللہ کی ہے۔ جب تک آزادی کامل کا سورج طلوع نہیں ہو جاتا احرار کا ہر گل شیر انگریز اور اس کے زر خرید غلاموں کی دسیسہ کاریوں کی راہ میں رکاوٹ بنتا رہے گا۔ چاہے کچھ ہو جائے ہمارا کارواں اسی خلوص اور لگن سے چلتا رہے گا جس طرح مولانا گل شیر نے زندگی کی ہر گھڑی و ساعت کو دعوتِ حق کی خاطر صرف کیا۔"

"آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی"

۱۰، ۱۱ جولائی ۱۹۴۴ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس مسجد عید گاہ تلہ گنگ (ضلع اٹک) تب میں منعقد ہوئی جس کے مہمانِ خصوصی شاہ جی تھے۔ خطبہ استقبالیہ مولانا محمد علی جالندھریؒ نے پیش کیا جبکہ دیگر مقررین میں مولانا مظہر علی

اظہرؒ، مولانا عبدالرحمن میانویؒ، مولانا عبدالرحیم جوہر جہلمیؒ، حافظ عزیز الرحمنؒ، جانباز مرزاؒ، مولانا محمد باز گلؒ، غلام محمد ہاشمیؒ، کپتان غلام محمد اور رفیق غلام ربانی شامل تھے۔

شاہ جی جب بھی ان اضلاع میں آئے گل شیر شہیدؒ کو ہمیشہ یاد کیا۔ شاہ جی اور گل شیر خان میں جو دینی رشتہ قائم ہوا تھا وہ اللہ کے فضل سے آج بھی قائم ہے۔ شاہ جی کی نسبی و روحانی اولاد اور ان کی محبوب جماعت مجلسِ احرار اسلام آج بھی اُس تعلق کو بڑی پامردی و استقامت سے نبھا رہی ہے۔ اور مولانا شہیدؒ کے نام و کام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آغا شورش کاشمیریؒ نے مولانا کی شہادت پر خوب لکھا تھا کہ:

"آپ کی شہادت سے اس ویرانہ آباد میں استقامت کا چراغ روشن ہوتے ہی بجھ گیا اور اس قیمتی انسان کے اُٹھ جانے سے ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی کہ نہ احرار میں اس قسم کا انسان دوبارہ آسکا نہ کیمبلپور کی مٹی ہی سے کوئی ایسا شخص اٹھا"۔

اور یہ تھی بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت کہ مولانا کے بعد اگرچہ مجالسِ احرار نے ان علاقوں میں کام کی رفتار کو کم نہ ہونے دیا لیکن اس کے وہ اثرات ظاہر نہ ہوئے جن کی توقع صرف مولانا سے ہی کی جا سکتی تھی۔ ان کی شہادت کے بعد یہ علاقہ ایسی محرومیوں کی گرداب میں آگیا کہ کوئی مضبوط قیادت اب تک سامنے نہیں آسکی۔

مجلسِ احرارِ اسلام کے سٹیج سے ہی مولانا شہیدؒ کا نام سننے میں آتا رہتا ہے۔ جبکہ دیگر وہ پیشہ ور مولوی اور نام نہاد قومی و سیاسی قائدین جنھوں نے مولانا کے نام پر اپنے جہنم کا ایندھن سمیٹا اور اب تک انہی کے واسطے سے مفادات حاصل کر رہے ہیں۔ انہیں کبھی یہ توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ گزشتہ اڑتالیس برس میں محض ایک دن ہی مولانا شہیدؒ کی یاد میں کسی کارنر میٹنگ کا اہتمام ہی کرتے لیکن خوش قسمت کہ یہ سعادت صرف مجلسِ احرار اسلام کے ہی حصے میں آئی کہ انہوں نے مولانا کے بعد اُن کے مشن کو زندہ رکھا اور تمام تر تہی دامانیوں کے باوجود صحیح سمت میں کاروان آگے بڑھایا۔ جس کی نشاندہی مولانا کر گئے تھے۔ اور بحمد للہ اسی کا ثمر ہے کہ نصف صدی بیت جانے کے بعد بھی اُن کی یاد زندہ و تابندہ ہے۔

لیکن میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک آرزو ہے جو برسوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے ہے کہ اے کاش! مولانا شہید کے اپنے خاندان میں سے کوئی ایسا رجلِ رشید اٹھ کھڑا ہو جو ان کی محبوب جماعت، جس کے لئے انہوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمِ پاک پر اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیا تھا۔ کا سرخ پرچم تھام کر میدانِ عمل میں نکل پڑے۔ اور مولانا کی چھوڑی ہوئی دینی و خاندانی وراثت کا امین ہو۔ آمین بجاہ النبی الکریم و آلہ واصحابہ اجمعین۔

وگرنہ مولانا تو آج بھی غالب کی زبان میں کہہ رہے ہیں:

کون ہوتا ہے حریف مے مردِ افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اللہ کریم ہمیں شاہ جی اور مولانا گل شیر شہید کے مشن کے ساتھ تا دمِ آخریں وفا کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمارا حشر و نشر بھی انہی برگزیدہ ہستیوں کے ہمراہ کرے۔ آمین۔

یاد پارینہ

عزیز بھائی جانباز صاحب السلام علیکم،

تینوں یاد ہووے گا جد قادیاں کانفرنس ہوئی تے اوتھے نظم توں وی پڑھی تے میں وی پڑھی۔ جیہڑی امیر شریعت خلدمکانی نے اوتھے تقریر کیتی اوہدے بارے شاہ جی تے اک مقدمہ قائم کیتا گیا تے انہاں دناں دے بعد روزیاں وچ جمعتہ الوداع گورداس پور وچ شاہ جی نے پڑھایا تے قریباً لکھ آدمی نے شاہ جی دی بیعت کیتی، کیونکہ فرداً فرداً بیعت کرنی مشکل ہو گئی سی، ایس واسطے شاہ جی نے حکم دتا کہ اک پگ دالڑ مینوں پھڑا دیو تے اگوں اوس پگ نال ہور پگاں بنھی جاوَ۔ تے پگاں دا اک جال مسلماناں دے سراں تے بن گیا سی تے شاہ جی حکم دتا کہ جتھے جتھے وی کسے دا پگ نوں ہتھ پیندا اے ہتھ پا لے میں اکو واری سبھناں دی بیعت لیناں واں تے ہر شخص نے حکم سندیاں پگاں نوں ہتھ پالئے تے شاہ جی نیں بیعت لئی، ایہ وی اک عجب منظر سی۔ سبھ تھیں پہلے مینوں نظم پڑھن دا حکم ہویا، مینوں یاد ئے تینوں وی یاد ہوویگا کہ میرے نظم پڑھن ویلے ہزار ہا مخلوقِ خدا روندی سی بس میں ایہہ پرانی نظم ایس کر کے بھیج رہیا واں تا کہ پرانی یاد تازہ ہو جائے میں انشاء الرحمن اج تیکر اوس بیعت تے قائم ہاں۔ تے او نظم پیش کرناں،

عطاء اللہ کی جاندائے ایس قید دی زنجیر نوں ختم الرسل اومندائے بس اکو عربی پیر نوں

اک طرف آلِ نبی تے اک طرف آل یزید کلمہ پڑھ مڑمار دے نے تیرپے شبیر نوں

گود وچ چھ ماہ دے بچے مذہب لئی ایہہ دسیا دودھ دی تھاں تے جھلناں لئی ظالماں دے تیر نوں

گل حق دی دسنی جاتیغاں دے میدان چہ شرف مولا بخشیائے ایہہ فاطمہ دے شیر نوں

جال پگاں دا بنا اج بیعت لئی شاہ جی جے توں

کر دعا رب قائم رکھے ایس تے عاجز میر نوں (میر محمد دین میر جلالپوری)

حفیظ رضا پسروری

شاہ جی کی باتیں خوبصورت یادیں

میں تو کسی کا نقش قدم بن کر مٹ گیا مجھ سے نہ پوچھئے کہ گیا کارواں کہاں

امیر شریعت کو میری زندگی میں مرکزی روح (RULING SPIRIT) کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھے۔ وہ اس عہد کے سب سے بڑے محب رسول ﷺ تھے۔ انہوں نے حب رسول ﷺ میں ڈوب کر سنت صدیق اکبر ادا کی اور حضور ختم المرسلین ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ کرنے والے غاصبوں اور گرہ کٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ اور اپنے پیچھے مجاہدین احرار کی ایک ایسی جماعت چھوڑ گئے۔ جس کا اوڑھنا بچھونا حب نبی ﷺ ہے۔ اور جو حضور ﷺ کی ختم نبوت کا ہر دو میں دفاع کرتی رہی ہے۔ اور کرتی رہے گی۔ شاہ جی نے جس دور میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا وہ ہر لحاظ سے ایک مشکل دور تھا۔ ایک طرف انگریزی حکومت کا جبر و استبداد زوروں پر تھا۔ تو دوسری طرف پنجاب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کا گروہ احرار کی تحریک کے اسلئے خلاف تھا۔ کہ اس نے غریب مسلمانوں میں جینے کا حوصلہ۔ حب نبی ﷺ کا ولولہ اور غیر ملکی حکومت کو برصغیر سے نکال باہر کرنے کا بے مثال جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ شاہ جی اور احرار غریب اور متوسط مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ جنہوں نے قرآن اور حدیث کو اپنی جدوجہد کا رہنما بنا کر اس قدر طویل اور شاندار تاریخ حریت مرتب کی۔ کہ آج اور کل کا مؤرخ ان کا تذکرہ اور اعتراف کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شاہ جی بڑی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے مقلد۔ مسلک ولی اللہیؒ پر کاربند اور اکابر دارالعلوم دیوبند کے ہم فکر تھے۔ اپنے عقائد میں بڑے راسخ اور مضبوط تھے۔ اور عقیدے کے معاملے میں فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے عقیدے میں تین چیزیں شامل ہیں۔

(۱) قرآن سے محبت (۲) ختم نبوت کا تحفظ (۳) انگریز سے نفرت۔

شاہ جی کو ایک بار ملنے اور دیکھنے کے بعد بڑے بڑے مخالف بھی ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ برصغیر کی بعض ممتاز شخصیتیں۔ اختلاف فکر و نظر کے باوجود ان کا احترام کرتی تھیں۔ اور ان سے باقاعدہ ملاقات کے لئے اہتمام کرتی تھیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔ اقبال کا شعر شاہ جی کی شخصیت پر کتنا صادق آتا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مرد درویش دیئے ہیں حق نے جس کو دیئے ہیں انداز خسروانہ

شاہ جی کے توسط سے حضرت علامہ اقبال علمائے دیوبند کے بہت قریب ہو گئے تھے اور بعد میں حضرت محدث العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے تبحر علمی کے تو وہ بہت معتقد ہو گئے تھے۔ مشہور انگریز مؤرخ سرجان گنتھر جب ہندوستان کے دورے پر آیا۔ تو اس نے اسی عظیم مجاہد آزادی کو دیکھنا اور ملنا چاہا مگر شاہ جی ان دنوں راولپنڈی جیل میں تھے۔ اس نے اپنی کتاب "INSIDE INDIE" میں شاہ جی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے

لکھا ہے۔

"یہ شخص اگر انگلستان میں پیدا ہوتا، تو اس کی تصویریں کلیساؤں میں لگائی جاتیں۔"

۱۹۴۶ء میں شاہ جی دہلی میں مقیم تھے اور میر احمد حسین شملوی کے مکان پر قیام فرما تھے۔ جواہر لال نہرو وہاں ملنے آئے اور دیر تک رسمی خیر خیریت اور غیر رسمی، سیاست کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر عزیز الرحمن جامعی پہنچے کہ مہاتما گاندھی ملنا چاہتے ہیں۔ فلاں وقت اور فلاں دن۔۔۔۔ شاہ جی مقررہ دن ٹانگہ پر بیٹھ کر اپنے دوستوں کے ساتھ انہیں ملنے گئے۔ بھنگی کالونی دہلی میں گاندھی جی کا قیام تھا۔ وہاں پہنچے تو باہر چارپائی پر خان بادشاہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے گلے لگایا، پھر شاہ جی گاندھی جی کو ملنے اندر چلے گئے۔ جہاں بقول شورش کاشمیری، سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کے ترجمے اور تفسیر ہی میں وقت کٹ گیا۔ یہ دونوں سورتیں گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں پڑھتے تھے۔

اسی طرح امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ۔۔۔۔ شاہ جی کو دعوت دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جامعہ ملیہ کے میدان میں رات کو شاہ جی کا جلسہ تھا۔ جس میں انہوں نے وارث شاہ کے کچھ حسب حال پنجابی اشعار سنائے۔ دہلی والوں نے اسے گالی سمجھا۔ کسی نے امام الہند سے تذکرہ کیا کہ رات عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر میں گالیاں دی ہیں۔

اگلے روز شاہ جیؒ مولانا کے ہاں ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ تو مولانا نے فرمایا

"شاہ صاحب سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لڑھکا دیتے ہیں"

"حضرت! آپ سے کس نے کہا؟"

"کوئی بیان کر رہا تھا"

"کون؟"

"ہر کسی کا نام تو حافظے کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے"

"تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا"

"سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے۔ آپ سے جو تعلقِ خاطر ہے، اس کے باعث معاً وہ چیز یاد آگئی"۔

"جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے"

"الحمد للہ وہ پھانس اسلئے دماغ میں رہ گئی کہ آج سے چوبیس یا پچیس سال پہلے، آپ نے ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے جن میں جل، تل قسم کے قافیے تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگلوا دی ہو"

شاہ جی مسکرائے اور کہا

"حضرت، ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو یاد ہے؟"

"میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں۔ گو حافظہ ہر طرح کی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں۔۔۔۔ گزرتا ہے لیکن بعض چیزیں حافظے کے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وارث شاہ کا کلام تھا۔ آپ کی وجہ سے حافظے میں ایک تاثر رہ گیا۔ اب جو آپ سامنے آئے تو وہ تاثر بھی تازہ ہو گیا"

۔۔۔ سب سے بہت پہلے کی بات ہے۔ شاہ جی میانوالی جیل میں تھے۔ انگلستان کا ہوم ممبر ہندوستان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے شاہ جی کو ملنے اور دیکھنے کے لئے میانوالی جیل کا دورہ رکھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل بہت

گھبرایا ہوا تھا۔ وہ بار بار شاہ جی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں سے التجائیں کرتا۔ کہ یہ دورہ کامیاب رہے اور رہنما کوئی ایسی بات نہ کریں۔ شاہ جی نے کہا۔ کہ لالہ جی آپ فکر نہ کریں۔ اس دورہ کے روز شاہ جی نے اپنے تمام ساتھیوں سے کہا۔ کہ وہ لیٹ جائیں۔ اور اپنے اوپر کمبل اوڑھ لیں۔ صرف اپنے اپنے پاؤں ننگے رکھیں۔ اور ان کا رخ دروازے کی طرف ہو۔ ایسا ہی ہوا صرف شاہ جی بیرک کی سلاخوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہوم ممبر بڑی رعونت و تمکنت کے ساتھ سیاسی قیدیوں کی بیرک پر پہنچا تو ماسوا شاہ جی سب نے اپنے پاؤں اس کی طرف کر کے اپنی حقارت و نفرت کا اظہار کیا۔ برطانوی نژاد ہوم ممبر شاہ جی سے مخاطب ہوا۔

شاہ صاحب: آپ اچھے ہیں؟

شاہ جی: خدا کا شکر ہے۔

ہوم ممبر: کوئی سوال؟

شاہ: میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔

ہوم ممبر: میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

شاہ جی: جی ہاں! آپ میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائیے!۔۔۔۔

شاہ جی۔۔۔۔ علماء و اکابر دیو بند اور بزرگان رائے پور۔ گنگوہ۔ مکان شریف۔ سیال شریف۔ دین پور۔ آلو مہار شریف، گولڑہ شریف۔ علی پور سیداں سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ان مقامات پر اکثر حاضری بھی دیتے اور تقاریر بھی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ہماری معیت میں (۱۹۵۱ء) سیال شریف کے مدرسہ شمس الاسلام کے سالانہ جلسہ پر تشریف لے گئے تھے اور خواجہ قمر الدین سیالوی رحمہ اللہ کے مہمان تھے۔ انہوں نے شاہ جی کی بہت آؤ بھگت کی۔ ہمارے ساتھ معروف احرار رہنما مولانا عبد الرحمن میانوی بھی تھے۔ خواجہ صاحب اور ان کے مریدین نے مثالی مہمان نوازی، حسن سلوک اور بے پناہ احترام کا مظاہرہ کیا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ سیال شریف والے اب یہ بات کیوں بھول گئے ہیں؟ کہ اتحاد بین المسلمین کا اس دور میں سب سے بڑا داعی ان کے ہاں مہمان خصوصی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیو بند تشریف لے گئے۔ رات دارلعلوم میں تقریر کی اور سونے کے لئے مدنی منزل حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی کے ہاں تشریف لے گئے۔ فجر کی اذان ہو گئی تو ابھی وہ سو رہے تھے۔ حضرت مدنی متفکر ہوئے اور ان کے پاس بیٹھ کر شاہ جی کے پاؤں دبانے لگ گئے۔ شاہ جی ہڑبڑا کر اٹھے اور حضرت مدنی کو پاؤں دباتے دیکھ کر از حد پریشان ہوئے۔ کہنے لگے حضرت! آپ گنہگار کر رہے ہیں۔ حضرت مدنی نے فرمایا شاہ جی! نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا آپ کو جگا لوں۔ لیکن پھر خیال آیا آپ تھکے ہوئے ہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ پاؤں دابوں۔ تھکاوٹ دور ہو گی، آنکھ کھلے گی تو ممکن ہے نماز قضا نہ ہو!

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے نتیجے میں آپ لاہور جیل میں تھے۔ آپ کے ساتھ مشہور بریلوی عالم سید ابوالحسنات قادری تھے۔ جو نام نہاد مسلکی اختلافات اور سیاسی راہوں کے جدا ہونے کی وجہ سے شاہ جی سے کبھی نہ ملے تھے۔ جب جیل میں شاہ جی کو دیکھا۔ ان کے عشق رسول ﷺ عقیدۂ ختم نبوت کی پختگی اور ایمان کی لازوال دینی و روحانی دولت کا مشاہدہ کیا تو شاہ جی کے گرویدہ ہو گئے۔ اور اس بات پر ہمیشہ افسوس کرتے رہے۔ کہ عمر کا زیادہ

حصہ شاہ جی کی معیت کے بغیر کیوں گزارا؟

شاہ جی کی محفل میں تذکرہ ختم نبوت چھڑتے ہی رنگ محفل تبدیل ہوجاتا تھا- اور جوش سے لبریز اشعار کی آمد شروع ہوجاتی تھی- خصوصاً وہ اشعار جو آپ کے مزاج اور فکر کے آئینہ دار ہوتے وہ حاضرین کے قلوب پر بے حد اثر چھوڑتے تھے- آپ کو نبی کریم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی- اسی وجہ سے تمام مدعیان نبوت و رسالت سے آپ کو سخت عداوت تھی- حقیقت ایمان سے ناآشنا لوگ اس عمل کو مذہبی اور احرار رہنماؤں کی تنگ نظری قرار دیتے ہیں- مگر جاننے والے جانتے ہیں- کہ یہ تعصب یا ضد نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی انتہا ہے- جو شاہ جی کے دل و دماغ پر جلوہ گر ہوئی- لاؤڈ سپیکر تو آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ایجاد ہوئے تھے- مگر شاہ جی کی آواز کی بلندی کو اگر دیکھا جائے تو رسول کریم ﷺ کے زمانہ کے ہاشمی یاد آجاتے تھے- حضور ﷺ کے عم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب کی آواز کے متعلق علمائے تفسیر نے لکھا ہے- کہ آٹھ میل تک پہنچتی تھی- اسی طرح لاؤڈ سپیکر کے بغیر شاہ جی نے بڑے بڑے شہروں میں دو دو لاکھ کے کثیر مجمع سے خطاب فرمایا-

یہ بات اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے- کہ تقریر اور خطاب میں شاہ جی کا کوئی ثانی گزشتہ ایک صدی کے دوران برصغیر میں پیدا نہیں ہوا- ان کو اپنی تقریر کے دوران اکثر اوقات سامعین، حاضرین کے عجیب اور مشکل ترین سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا- جن کا وہ اس خوبی اور تاثیر خطابت سے جواب دیتے تھے- کہ مجمع عش عش کر اٹھتا تھا- اگر ایسے سوالات کسی اور عالم یا خطیب سے کئے جاتے- تو وہ جواب کے لئے شاید مہینوں کتابیں کنگالتے مگر شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے برجستہ گوئی اور فی البدیہہ گفتگو کا جوہر خاص عطاء فرمایا تھا- وہ کسی دوسرے کے حصے میں کم ہی آسکا- ان کے تبحر علمی کے سبھی معترف تھے- مولانا ابوالکلام آزاد بے شک بہت بڑے خطیب اور عالم تھے- مگر وہ شاہ جی کی طرح عوامی خطیب نہ تھے مولانا کے ہاں اختصار تھا اور شاہ جی کے ہاں ابلاغ-

ایک جلسہ شاہ جی سے کسی نے سوال کیا- حضرت! سیدہ فاطمہ افضل ہیں یا جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری صاحبزادیاں افضل ہیں- جب کہ سیدہ رقیہ- سیدہ ام کلثوم- اور سیدہ زینب- آپ سے عمر میں بھی بڑی تھیں- فرمایا- فاطمہ افضل ہیں کیونکہ وہ نزول وحی کے بعد پیدا ہوئی تھیں اور دوسری نزول وحی سے پہلے! ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدہ خدیجہ میں کیا فرق ہے؟ ارشاد فرمایا بڑا فرق ہے- سیدہ خدیجہ کا نکاح محمد بن عبداللہ سے ہوا تھا اور سیدہ عائشہ کا نکاح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا-

کسی نے سوال کیا- حضرت آپ کو صاحبزادہ فیض الحسن نے کیوں چھوڑ دیا- ارشاد فرمایا وہ نوری ہیں اور میں خاکی- ان نوریوں سے امید کب تک! سب سے بڑے نوری جبریل علیہ السلام ہیں- انہوں نے شب معراج میں میرے نانا کو سدرۃ المنتہیٰ پر ہی چھوڑ دیا تھا-

آزادی سے چند ماہ بعد جب کہ پاکستان کے مسلمان احرار رہنماؤں کے سیاسی اختلافات کی بناء پر کھچے کھچے ہوئے تھے- شاہ جی پاکستان چوک ڈیرہ غازی خان کی سیرت کانفرنس سے خطاب کرنے لگے تو اچانک نزدیکی مکان سے جلسہ گاہ میں پتھروں کی بارش شروع ہوگئی- شاہ جی وظیفہ پڑھتے رہے- اور پتھر برستے رہے- جب یہ سلسلہ بند ہوا تو اس کوہ استقامت نے کہا-

"تم پتھر برساتے رہے تو میں دل ہی دل میں خوش ہو کر کھڑا رہا اور اسی انتظار میں تھا- کہ کوئی پتھر آکر

میرے دانت توڑ دیتا۔ تو میں اپنے نانا کی سنت کو تازہ کر دیتا۔ جو طائف اور اُحد میں ایسی ہی صورت حال سے دو چار ہوئے تھے۔۔۔"

یہ بات کچھ اسی انداز سے کی کہ یک لخت سارا مجمع زار و قطار رونے لگ گیا۔ اور جلسہ کے بعد بہت سے لوگوں نے آکر ان سے معافی طلب کی۔

آزادی سے قبل پشاور کے جلسۂ عام سے خطاب فرما رہے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو سکھ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مسلمان نعرۂ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ مگر ہندو سکھ خاموش تھے۔ انہوں نے ہندوؤں سے پوچھا۔ مجھے بتاؤ "رام" کون ہے؟ انہوں نے کہا خدا۔ پھر سکھوں سے پوچھا۔ "واہ گورو" کس کو کہتے ہو۔ جواب ملا۔ اللہ کو۔ ! بلند آواز میں فرمایا۔ اگر رام اور واہ گورو اللہ ہے۔ تو پھر تم اللہ اکبر کیوں نہیں کہتے۔ اس پر سب نے نعرۂ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔

شاہ جی کی شخصیت فقر و استغنا۔ صبر و قناعت۔ خودداری اور خود نگہداری کا دلاویز مرقع تھی۔ چاہتے تو آج کل کے خطیبوں اور واعظوں کی طرح لاکھوں روپے کما سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ساری عمر ایسا نہ کیا۔ جو کچھ مل گیا وعظ کو اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ تو بنایا معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اسی میں گزارا کیا۔ اور آزادی کے بعد کا تمام عرصہ کرائے کے ایک معمولی مکان میں بسر کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ضلع میانوالی کا دورہ کر رہے تھے۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ میانوالی سے روانگی کے وقت صوفی اللہ داد مرحوم جو مجلس احرار کے نامور رہنما کار تھے۔ اور شاہ جی کے انتہائی عقیدت مند، وہ شاہ جی، مولانا محمد علی، مولانا عبدالرحمن میانوی اور سائیں حیات کے لئے سکینڈ کلاس کی ٹکٹیں لے آئے۔ شاہ جی نے ٹکٹیں دیکھیں اور مولانا محمد علی سے پوچھا۔ ان کا رنگ کچھ اور ہے۔ میں جو ٹکٹیں دیکھتا ہوں وہ زرد ہوتی ہیں اور یہ سبز معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ یہ اونچے درجے کی ہیں۔ فرمایا! مولوی صاحب! آگے کی فکر کرو وہاں اگر اچھا درجہ مل گیا۔ تو بات بن جائے گی۔ یہاں کے درجوں کو چھوڑو ٹکٹوں کو واپس کر کے وہی زرد ٹکٹیں لاؤ (تھرڈ کلاس) صوفی صاحب ٹکٹیں واپس کر آئے اور غالباً۔ سات روپے کا فرق واپس ملا۔ شاہ نے وہ رقم مولوی محمد علی صاحب کو دے دی۔ کہ اس کی رسید کاٹ دو۔ وہ ساری عمر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے رہے۔ میں نے ایک بار سوال کیا۔ حضرت ایسا کیوں؟ اونچے درجہ میں سفر کرنے میں حرج کیا ہے۔ ارشاد فرمایا۔ تھرڈ کلاس میں گدڑی کے لعل مل جاتے ہیں۔ اور میرے وہاں بیٹھنے سے غریب مسلمانوں میں حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

میں ملتان میں ۱۹۶۰ء میں تھا۔ لائل پور (فیصل آباد) سے مولانا تاج محمود مرحوم وہاں کے ممتاز مل اونر میاں محمد شفیع (کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز) کو لے کر آئے جو شاہ جی کے لائل پور میں قیام کے لئے ایک اچھی رہائش گاہ اور مکمل کفالت کی درخواست لے کر آئے تھے۔ ہو سکتا ہے میاں محمد شفیع اس میں اخلاص رکھتے ہوں۔ مگر جب شاہ جی سے مولانا محمد علی نے میاں محمد شفیع سے ملاقات کی درخواست کی۔ اور ساتھ ہی پیشکش کا ذکر کیا۔ تو ارشاد فرمایا۔

"بھائی محمد علی! مجھے کسی مل (MILL) والے سے نہ ملاؤ۔ کسی دل والے سے ملاؤ۔ یہ پیشکش سگوں کے مقابلے میں ان کی سیاسی اور معاشرتی ضرورت ہو گی۔ مجھے اب آخر عمر میں کیوں رسوا کرنے لگے ہو؟"

میاں محمد شفیع شاہ جی سے ملے مگر دوران ملاقات اس بات کا قطعی ذکر نہ کیا۔ !

۱۹۵۹ء میں ملتان کے کچھ دوستوں قاضی احسان احمد، اور مظہر نواز خان درانی نے شاہ جی کے عظیم آباد (پٹنہ) اور امرتسر کی رہائشی جائیداد کے عوض ملتان میں کلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا ان دوستوں نے بحالیات کمشنر کی عدالت میں خود ہی کلیم داخل کر دیا۔ اور جب شاہ جی کا بیان لینے کے لئے انہیں عدالت میں لے جانے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں شاہ جی سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان دوستوں نے کسی طرح شاہ جی کو راضی کر لیا۔

جب شاہ جی عدالت میں پہنچے۔ تو وہاں انکی پذیرائی کی گئی۔ بیان کے دوران صرف اپنی دینی ادبی کتابوں اور لائبریری کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اور بعد میں وہ اپنے مندرجہ بالا ساتھیوں سے کچھ عرصہ ناراض رہے کہ وہ انہیں دنیا کی طرف کیوں راغب کر رہے ہیں۔ مظہر نواز خان درانی کی ذاتی کوششوں سے کلیم منظور ہو گیا اور ایک مکان الاٹ کر دیا گیا۔ آج کل اس جگہ شاہ جی کے بیٹوں نے ایک دینی مدرسہ اور جامع مسجد تعمیر ہے۔ یہ جگہ دار بنی ہاشم کے نام سے معروف ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ   ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی   (اقبال)

شاہ جی کی زندگی کا یہ استغنائی پہلو اس حدیث کا مفہوم یا تفسیر تھا۔ کہ جس میں فرمایا گیا

(بہترین آدمی فقیہ ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس حاجت لے کر جائیں تو نفع پہنچائے اور اگر اس سے کنارہ کریں تو وہ بھی بے پرواہ رہے)

وہ صرف عبادت کے ڈسپلن اور پروگرام کے پابند رہتے تھے۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی ان کے پروگرام میں تبدیلی نہ کر سکتا تھا۔ جماعت کے پروگرام کے علاوہ وہ اپنے احرار رضا کاروں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور ان پر شفقت عطاء فرماتے تھے۔ کہ ہر کوئی اپنی جان کا ہدیہ دینے تک کے لئے تیار رہتا تھا۔ وہ اپنے رضاکاروں کی درخواست جو اپنے شہروں میں انہیں لے جانے کے لئے کرتے تھے۔ کبھی رد نہ فرماتے تھے۔ فوراً اپنی جیبی ڈائری نکال کر تاریخ عطا فرما دیتے تھے۔

شاہ جی عالم و خطیب سیاستدان اور روحانی شخصیت ہونے کے علاوہ شاعری بھی فرماتے تھے ان کا مجموعہ کلام "سواطع الالہام" کے نام سے ان کی زندگی میں انکے فرزند حضرت سید ابو ذر بخاری نے شائع کیا۔ شاد عظیم آبادی کی صحبت کی وجہ سے وہ شعر و ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال سے بڑے اعلیٰ تعلقات تھے۔ اور جیسا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت علامہ اپنا کلام شاہ جی کو سنا کر بہت مسرور ہوتے تھے۔ افسوس اقبال کے نام نہاد مورخین نے محض تعصب اور تنگ نظری کے سبب اس کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ حضرت علامہ عقیدہ ختم نبوت کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اور انکی فکر کا یہ پہلو شاہ جی اور دیگر علمائے دیو بند کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے مضبوط و مربوط ہوا۔

برصغیر کے ممتاز شعراء فیض۔ جگر۔ روش۔ نصرت قریشی۔ ---- تاثیر اور بعد کے دور میں--- عدم۔ ساغر۔ احمد ندیم قاسمی۔ عاصی کرنالی۔ عبدالکریم ثمر۔ طاہر شادانی۔ علامہ طالوت (مرحوم) اسد ملتانی۔ شاہ جی کے ہاں اکثر حاضری کرتے تھے۔ دیگر ممتاز شعراء علامہ انور صابری۔ علامہ لطیف انور، آغا شورش کاشمیری۔ عبدالرحیم عاجز، طفیل امرتسری۔ جانباز مرزا۔ استاد دامن سائیں حیات تو ان کے شریک سفر تھے۔ الغرض شاہ جی کی شخصیت جامع کمالات تھی۔

یہ شاہ جی کی شخصیت کا جاذب نظر اور روحانی پہلو تھا۔ کہ مجلس احرار اسلام میں مختلف عقائد کے قومی رہنما اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور ان میں محبت اور اتحاد کا جو شاندار نظم و ضبط چشم فلک نے دیکھا وہ پھر کہیں نظر نہ آسکا شاہ جی اپنے تمام ساتھیوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان تمام راہنماؤں نے شاہ جی کے جذبہ جہاد اور عشق رسول ﷺ کے فیضان سے قربانیوں کی ایک لازوال تاریخ حریت ترتیب دی۔ ان رہنماؤں میں مولانا محمد داؤد غزنویؒ چودھری افضلؒ، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن مرحوم، مولانا عبدالقیوم کانپوری مرحوم مولانا عبدالقیوم پوپلزئی مرحوم (پشاور) مولانا غلام غوث مرحوم شیخ حسام الدین مرحوم۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم۔ ماسٹر تاج الدین انصاری۔ قاضی احسان احمد مولانا گلشیر شہید، حافظ علی بہادر، سید نوشیر علی، مولانا عبدالرحمٰن جانباز مرزا، خواجہ عبدالرحیم عاجز، غازی محمد حسین (تاندلیانوالہ) عبدالرحیم جوہر، سردار محمد شفیع، چودھری عبدالعزیز راہوں اور حافظ عبدالمجید نابینا (فیصل آباد) شامل تھے۔ یہ تمام بزرگ اور رہنما شاہ جی کے جذب دروں اور نعرۂ حق کی تصویر تھے۔

شاہ جیؒ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک برصغیر کی آزادی (۱۹۴۷ء تک) اور عقیدۂ تحفظ ختم نبوت کے محاذوں پر مردانہ وار لڑتے رہے۔ ان کی یہ جدوجہد جو بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ نہایت کٹھن اور مشکل تھی۔ انہوں نے تحریک خلافت تحریک فوجی بھرتی، بائیکاٹ، تحریک کشمیر، تحریک تحفظ ختم نبوت اور دیگر کئی ملی اور قومی تحریکوں میں حصہ لیا۔ جن کی پاداش میں وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ انگریزی دور میں ان پر سنگین سے سنگین مقدمات چلائے گئے۔ مگر وہ اپنے غیر متزلزل ایمان، روحانی قوت، بزرگان ملت کی دعاؤں اور اپنی جماعت کے وفادار ساتھیوں کی قربانیوں سے ان مشکل مراحل سے باعزت سرخرو ہوتے رہے۔ لالہ موسیٰ کی ایک تقریر کی وجہ سے ان پر آزادی سے قبل دفعہ ۱۲۴ کے تحت مقدمہ چلا۔ اور حکومت پنجاب نے ان کو سزائے موت دلوانے کی سازش کی۔ تو ایک ہندو رپورٹر لدھا رام کے ہائیکورٹ میں اعتراضی بیان کی وجہ سے حکومت کو شرمندہ ہونا پڑا۔ لدھارام جو سرکاری رپورٹر تھا اس نے جسٹس ڈگلس ینگ کے سامنے کہا:

"میں اس رشی اور منی (روحانی شخصیت) کو دیکھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ سچ یہ ہے کہ دی رپورٹ میں تحریف ورضانہ حکومت کے ایماء پر کیا گیا ہے۔

۱۲۴۔ الف کے اس مقدمہ سے شاہ جی باعزت بری ہوئے۔

چارہ گر نے مجھ کو باندھا تھا سمجھ کر ناتواں ؎ ذرا تڑپا تو ٹکڑے ہی نہ تھے زنجیر کے (جگر)

شاہ جی کی زندگی کے بے شمار واقعات اور پہلو ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے ایک عرصہ چاہیے۔ ان کی داستانیں قریہ قریہ، بستی بستی، پرانے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ وہ جامع الصفات شخصیت تھے۔ اور ان جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ شاہ جی نے لوگوں کے اعتراض یا اعتراف کی پرواہ کئے بغیر تمام عمر اعلائے کلمتہ الحق کا فریضہ انجام دیا۔ وہ علمائے حق کے محبوب تھے۔ حضرت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری نے برصغیر کے ۵۰۰ نمائندہ علماء کے اجتماع میں انہیں امیر شریعت کا خطاب عطا فرما کر ان کے دست مبارک پر بیعت جہاد کی۔ شاہ جی حضرت شیخ العصر علامہ انور شاہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا۔ انور شاہ پیچھے رہ

گئے" اسی طرح شاہ جی کے متعلق حضرت اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ: "شاہ جی کی باتیں عطاء اللّٰہی ہوتی ہیں"

حضرت شیخ الاسلام مولانا بشیر احمد عثمانیؒ فرماتے تھے" شاہ جی اسلام کی مشین ہیں" مولانا حسین احمد مدنیؒ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ۔ مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہندؒ۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ۔ پیر طریقت عبد القادر رائے پوریؒ۔ حضرت گولڑویؒ۔ حضرت خواجہ ضیاء الدینؒ۔ (سیال شریف) معنوی طور پر شاہ جی سے بہت محبت رکھتے تھے۔ آپ کی پہلی بیعت طریقت پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف سے تھی۔ ان کے انتقال کے بعد تجدید بیعت حضرت رائے پوریؒ سے کی۔

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی کرم نوازی تھی کہ میرے لاشعوری دور میں، جب میں مڈل کا طالب علم تھا، مجھے حضرت امیر شریعت کی نگہ لطف کرم عطا فرما دی۔ میرے سکول کے ایک سکھ استاد سردار خزان سنگھ اپنے درس میں حضرت امیر شریعت کا نام گرامی اکثر لیا کرتے تھے۔ مجھے "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کا نام۔ اس کا حسن۔ اس کی ترکیب بہت پسند آئی۔ اور میں غائبانہ طور پر اس شخصیت کا عقیدت مند ہو گیا۔ پھر حضرت مولانا بشیر احمد جو قافلہ احرار و جمعیت کے ممتاز رہنما تھے۔ کی قیادت و سیادت میں شاہ جی کا اکثر ذکر ہوتا۔ انجمن تبلیغ الاسلام۔ چونڈہ ہر سال چونڈہ میں دینی جلسہ منعقد کیا کرتی تھی۔ اس انجمن کی خدمات تبلیغ اسلام اور دین کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں بہت قابل قدر ہیں میں نے انجمن کے سالانہ جلسہ کا اشتہار پڑھا۔ اور اس میں شاہ جی کی تقریر کا اعلان پڑھا تو اپنے طالب علم ساتھیوں کے ہمراہ پیدل چونڈہ گیا۔ وہاں شاہ جی کو دیکھا اور سنا۔ لاشعوری دور کی بات ہے یاد نہیں کیا کیا سنا۔ مگر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس شخصیت کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد پسرور میں احرار سٹوڈنٹس کا قیام عمل میں لے آیا۔ اور دور و نزدیک شاہ جیؒ کی تقریر میں سنے چلا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ۸۔۹ اپریل ۱۹۴۴ء کو میں فیروز پور احرار پراونشل کانفرنس پر چلا گیا۔ وہاں شاہ جی ایک مینٹ میں قیام پذیر تھے۔ میں نہایت عقیدت سے ملا۔ پاس صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہؒ بیٹھے تھے۔ مجھ سے میرا پتہ پوچھا۔ میں نے پسرور کا ذکر کیا۔ تو گلے لگا لیا فرمانے لگے۔ یہ تو میرے استاد حضرت مولانا نور احمدؒ پسروری ثم امرتسری کا شہر ہے۔ پھر مولانا روشن دینؒ پسروری کی اپنے ساتھ رسارت میانوالی جیل ۱۹۲۱ء کا حوالہ دیا۔ مولانا بشیر احمد کے تعلق کی بات ہوئی۔ شاہ جی سراپا شفقت بن گئے۔ اُس وقت سے لے کر ۱۹۶۲ء تک وہ میرے ساتھ عزیزانہ شفقت برتتے رہے۔ سیالکوٹ، لاہور، امرتسر، چونڈہ اور دوسرے کئی مقامات پر انکی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ اور پھر میری عاجزانہ دعوت پر پسرور بھی آئے۔ ۲۔ روز قیام فرمایا ۴۶۔۱۹۴۵ء کے انتخابات میں وہ اکثر مولانا مظہر علی اظہر (سیالکوٹ/ پسرور/ نارووال/ قلعہ سوبھا سنگھ کے حلقہ) صاحبزادہ فیض الحسن شاہ مرحوم (دیہاتی حلقہ تحصیل ڈسکہ پسرور) اور جناب چوہدری محمد عبد اللہ خان (چونڈہ/ ظفروال) کی انتخابی مہموں میں حصہ لینے تشریف لاتے رہتے تھے۔ اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان کی تقاریر نوٹ کر کے "آزاد" لاہور میں رپورٹنگ کر دیتا تھا۔ تعلیم میرے لئے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اسی دوران انہوں نے قوم کا وہ شاندار تجزیہ پیش کیا۔ جو تمام برصغیر میں مشہور ہوا۔ چونڈہ کے ایک اجتماع میں شاہ جی نے صاحبزادہ فیض الحسن سے پوچھا۔ شاہ صاحب! آپ کے حلقہ انتخاب کا کیا حال ہے؟ صاحبزادہ صاحب نے کہا۔ شاہ جی جیت رہا ہوں۔ انشاء اللہ نشست میری

ہے۔ شاہ جی ہنسے۔ صاحبزادہ صاحب سے کہا شاہ صاحب! میں اس قوم کو اچھی طرح جانتا ہوں یہ تقریر میری سنتی ہے۔ بچہ نہ ہو تو تعویذ آپ سے لیتی ہے۔ "تفسیر ابوالکلام کی پڑھتی ہے۔ حدیث حسین احمد مدنی سے سنتی ہے۔ فقہ اور فتویٰ کے لئے مفتی کفایت اللہ کے پاس جاتی ہے۔ علم احمد علی سے سیکھتی ہے مگر ووٹ کسی اور کو دیتی ہے۔"

بعد میں شاہ جی کا یہ تجزیہ صحیح ثابت ہوا۔ اور صاحبزادہ صاحب چوہدری سرفراز سے شکست کھا گئے۔

میں نے ۱۹۴۸ء میں گرینڈلیز بنک میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ء میں شاہ جی لاہور آئے۔ پوچھا کیا کرتے ہو؟ عرض کیا "بنک میں ملازم ہوں۔" فرمانے لگے بنک کیا ہوتا ہے۔۔۔ کچھ الٹا سیدھا جواب دیا۔۔۔ پھر پوچھا یہ بنک کس کا ہے۔۔۔ میں نے کہا انگریزوں کا! اس پر خاموش رہے اور قاضی احسان احمد جو پاس بیٹھے تھے سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

"احسان احمد! میری بد قسمتی ملاحظہ ہو۔ باپ ساری عمر انگریز کے خلاف لڑتا رہا۔ انگریز گیا۔ تو اولاد نے اس کی ملازمت کر لی"

میں نے اگلے روز جا کر استعفیٰ دے دیا۔ اور ملتان چلا گیا۔ سارا ماجرا بتایا فرمانے لگے میرا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا۔ پوچھنے لگے اب کیا ارادہ ہے میں نے کہا آپ کے پاس رہوں گا۔ مسلسل تین ماہ تک شاہ جی کے ساتھ رہا۔ سینکڑوں جلسوں کی رپورٹنگ کی۔ اور ان کی کسی بھی ملازم سے بڑھ کر خدمت کی۔ کندیاں سٹیشن پر مجھے گھر جانے کا حکم دیا۔ اور تین سو روپے کی خطیر رقم مجھے دی کہ میں اپنی اہلیہ کو جا کر ان کی طرف سے دے دوں! میں نے بہت انکار کیا مگر نہ مانے فرمانے لگے۔

"تم نے میری بہت خدمت کی۔ میں بہت خوش ہوں۔ اور تمہارے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گا، تم کبھی اپنے آپ کو اکیلے محسوس نہ کرنا میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا"

بعد کی ساری زندگی میں وہ ہمیشہ میرے لئے دعا گو رہے۔ میں ان کی خدمت میں مسلسل ملتان حاضری دیتا رہا۔ وہ اس عہد کے عظیم انسان، تاریخ ساز شخصیت اور سب سے بڑے عاشق رسول ﷺ تھے۔

حافظ جان محمد خادم

شامِ غم

امیر شریعت عطاء اللہ شاہ
چوں رختِ سفر بست روح برفلک
بگفتند خادم ہمہ چشمِ تر
عزیز و اقارب کہ غفران لک

۱۳۸۱ھ

نذیر مجیدی (لاہور)

اُن کا تخاطب، اُن کا تکلّم

بزم وطن ہے درہم برہم ارض و سما میں برپا ماتم
موت العالم، موت العالم رنج سراپا، حزنِ مسلسل
آج فضا بے کیف یکدم آج نہیں پہلا سا دم خم
آج طبیعت ہے افسردہ کیسا نغمہ؟ کیسا ترنم
چشم فلک نے کس کو تاکا کس کا دیا ہے آج ہمیں غم
تیرِ قضا نے سونپ دیا ہے نالۂ پُرنم، گریۂ پیہم
رو رو کر اب یاد کریں گے ان کا تخاطب، ان کا تکلم
ان کی بات نبات کی ڈلیاں ان کے قہقہے، ان کا تبسم
یوں تاریخ مجیدی کہدو سکتہ سا ہے طاری تاہم

رحلتے سید و شیر مجسم
قائد افضل و دین مکرم

۱۳۸۱ھ

نجابت ہم، شجاعت ہم، خطابت ہم، صباحت ہم

خوشا مردے کہ بعد از مرگ خود نام نکو دارد!
ہے پنہاں شدار عالم دلے دلبار گرو دارد
وگرنہ ہر کہ آمد خیبر عدم ہر گز نیاید
بہار ہر کمالے واز دالے دوبدو دارد
نجابت ہم، شجاعت ہم، خطابت ہم، صباحت را
کجا یابد سے یکجاؤ گر صد جستجو دارد
عطاء اللہ از عشاق ختم المرسلین آمد
زبانِ ساکنان ہندو پاک ایں گفتگو دارد
دہم تسکین دل خود راجیو از مارفت آں شاہ ہے
عطاء المنعم آں خلف الرشید ایں رنگ و بو دارد
دعائے مغفرت از باجابت از در مولے
بپے شاہ بخاری ہم شفیعش آرزو دارد

(مفتی محمد شفیع سرگودھوی رحمۃ اللہ علیہ)

حفیظ رضا پسروری

حضرت رائے پوری اور شاہ جی

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، بزرگان رائے پور کے پاکباز وارث تھے۔ آپ ولایت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ اور برصغیر کے بیشتر علماء حق انکے دست حق پرست پر بیعت تھے۔ جن میں حضرت امیر شریعت۔ شیخ حسام الدین۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا محمد علی جالندھری۔ مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی۔ مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی ایسے اکابر شامل تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ روحانی منزلت اور مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ بزرگان دیوبند بالخصوص حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی۔ حضرت قاری محمد طیب۔ بزرگان سہارنپور۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا۔ حضرت مولانا خلیل احمد۔ بزرگان جمیعت۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا عتیق الرحمن۔۔۔ اجتماعی طور پر حضرت شاہ عبدالقادر کے عقیدت مند تھے۔ اور اپنی دینی و سیاسی جدوجہد میں انہیں اپنا سرپرست تسلیم کرتے تھے۔ فی الحقیقت حضرت شاہ عبدالقادر کاروان علماء حق کی جدوجہد حریت کے امام تھے۔ اور تمام بزرگوں کو اپنے قیمتی مشوروں اور دعاؤں سے نوازا کرتے تھے۔

گو حضرت امیر شریعت۔ حضرت رائے پوری کے مرید تھے۔ مگر حضرت رائے پوری انکو بڑا اہم مقام دیتے تھے۔ اور امیر شریعت کے ساتھ انہیں خصوصی محبت اور لگاؤ تھا۔ حضرت امیر شریعت فرمایا کرتے تھے۔ کہ جدوجہد آزادی میں کئی ایسے مشکل مقام آئے جہاں زندگی اور موت میں بہت تھوڑا فاصلہ رہ جاتا تھا۔ مگر حضرت رائے پوری کی خاص روحانی توجہ سے وہ مرحلے بآسانی طے ہوجاتے۔ شاہ صاحب کو جب کبھی فرصت ملتی تو وہ حضرت کی خدمت میں رائے پور تشریف لے جاتے۔ اور انکے فیضان نظر سے مستفید ہوتے رہتے۔

جب ۱۹۶۰ء میں حضرت رائے پوری بیماری کی حالت میں بغرض علاج لاہور تشریف لائے۔ تو شاہ جی بھی ملتان سے لاہور پہنچ گئے۔ اور شب و روز حضرت رائے پوری کی خدمت میں رہنے لگے۔ حضرت رائے پوری اکثر انہیں دعا کے لئے کہتے اور شاہ جی نظریں جھکا لیتے۔ میں ان دنوں لائل پور تعینات تھا۔ ایکدن قاضی جی (قاضی احسان احمد شجاع آبادی) بھاگے بھاگے آئے۔ فرمانے لگے۔ لاہور چلنا ہے۔ حضرت رائے پوری کی حالت تشویشناک ہے۔ ہم بذریعہ کار لاہور پہنچے۔ حضرت کا قیام ڈیوس روڈ کے قریب اپنے ایک عقیدت مند حاجی عبدالمتین کے ہاں تھا۔ ہم وہاں پہنچے۔ حضرت چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور مشتاقان دید کا ہجوم ارد گرد موجود تھا۔ اندر ایک کمرے میں شاہ جی اور شیخ حسام الدین بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ساتھ کے کمروں میں آغا شورش کاشمیری۔ ماسٹر تاج الدین۔ جناب عبدالوحید وزیر مغربی پاکستان۔ سابق جنرل حق نواز۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔ مولانا عبیداللہ انور۔ مولانا غلام غوث ہزاروی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا عزیزالرحمن لدھیانوی اور دہلی سے آئے ہوئے کچھ اور بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔

میں باہر صحن میں بیٹھا تھا۔ اور حضرت رائے پوری بستر علالت پر تھے۔ سب لوگ بارگاہ رب العزت میں حضرت کی صحت کے لئے دعا کر رہے تھے۔ حضرت نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ میں نے ایک بار یہ شعر پڑھا:

جواجہ من نگہدار　　　آبروئے گدائے خویش

میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ کہ حضرت نے آنکھیں کھول کر میری طرف مختصراً دیکھا۔ اور پھر مو استراحت ہوگئے۔ قاضی جی نے دیکھا تو حیران ہوئے۔ مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ شعر پڑھا تھا۔ فرمانے لگے کہ یہ حضرت کا روحانی تصرف تھا۔ اب نہ پڑھنا۔ حضرت کو آرام کی ضرورت ہے۔ پھر میں اور قاضی صاحب۔ اندر شاہ جی کی خدمت میں جا بیٹھے۔ شاہ جی حضرت سے اپنے تعلق کے واقعات سنا رہے تھے۔ فرمانے لگے:

آزادی برصغیر اور تحریک ختم نبوت کی مسلسل جدوجہد کے دوران انہوں نے محسوس کیا کہ جب وہ رات پچھلے پہر تہجد کے لئے اٹھتے ہیں۔ یا اٹھنا چاہتے ہیں۔ تو اکثر نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ وہ اس سے ازحد پریشان تھے۔ انبالہ کی ایک ملاقات میں انہوں نے اپنی اس مشکل کا تذکرہ حضرت رائے پوری سے کیا تو انہوں نے پڑھنے کے لئے ایک وظیفہ بتادیا۔ شاہ جی نے پڑھا۔ تو اس کے بعد یہ کیفیت ہو گئی۔ کہ نیند بالکل غائب ہو گئی۔ اور اشد ضرورت کے وقت بھی نیند نہ آتی تھی۔ رات گئے تقریر کے بعد جب قیام گاہ پر آتا۔ تو بقیہ وقت کروٹیں بدل بدل کر گزر جاتا۔ مگر تہجد ضرور ادا ہو جاتی۔ اس سے ازحد پریشانی رہی۔ کچھ دوائیاں بھی استعمال کیں۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جماعتی کاموں میں بے پناہ مصروفیت کے سبب حضرت رائے پوری سے جلد ملاقات نہ ہو سکی۔ آخر دو ماہ بعد سہارنپور میں ملاقات ہوئی۔ تو میں نے اپنی اس مشکل کا ذکر کیا۔ فرمانے لگے کہ مجھے بھی اس کا بے حد فکر رہا۔ آپ (شاہ جی) کے اصرار پر وظیفہ بتادیا تھا۔ وگرنہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقتاً آپ کی جدوجہد اور تقریر ہی عبادت کا ایک ایسا ذریعہ ہیں۔ کہ کسی نفلی عبادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کی تقریر ہی عبادات نفلیہ کی ضرورت پوری کر دیتی ہے۔ میرا مشورہ ہے۔ آپ تقریر کے بعد نماز فجر تک آرام کیا کریں۔ اس کے بعد نیند کی حالت معمول کے مطابق ہو گئی۔ میں سو بھی لیتا تھا۔ تہجد بھی ادا کر لیتا تھا۔ اور پھر بروقت نماز فجر کے لئے تیار بھی ہو جاتا تھا۔ تھکاوٹ یا نیند کی کمی کا پھر کبھی احساس نہ ہوا۔

فرمایا۔۔۔ کرپس مشن کے زمانے (۱۹۴۶ء) میں ہم سب دہلی میں مقیم تھے۔ حضرت رائے پوری وہاں تشریف لائے تو میرے ہاں، میر مشتاق احمد کے گھر پر بھی گئے۔ ہم علیحدگی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ حضرت! اب بہت تھک گیا ہوں۔ آپ کیوں دعا نہیں کرتے۔ کہ انگریز ہندوستان سے چلا جائے۔

فرمانے لگے۔ کہ میں دعا کیوں نہیں کرتا۔ لو آج! تمہارے سامنے دعا کرتا ہوں۔ حضرت نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا میں مستغرق ہو گئے۔ عجیب و غریب روحانی کیفیت و انداز تھا۔ فارغ ہوئے تو فرمانے لگے۔ عطاء اللہ! اب چند دنوں کی بات رہ گئی ہے۔ تمہاری جدوجہد کامیاب ہو گی۔

یہ واقعہ ہے کہ چند دنوں کے بعد لارڈ ویول نے برصغیر کی آزادی کا پروگرام دے دیا۔

حضرت رائے پوری لاہور کے اسی قیام کے دوران انتقال فرما گئے۔ بھارت سے تقاضہ تھا کہ آپ کو رائے پور دفن کیا جائے۔ مگر احباب کے اکثریتی فیصلے سے حضرت رائے پوری کو موضع جھاوریاں (سرگودھا) میں انکے

آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون)

اب کہاں دنیا میں ایسی ہستیاں

لاہور میں حضرت رائے پوری کی نماز جنازہ ادا ہوئی۔ تو انسانوں کا ایک جم غفیر اس میں شریک تھا۔ پھر خالصہ کالج فیصل آباد کی گراؤنڈ میں لاکھوں فرزندان توحید نے انکی نماز جنازہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اقتدا میں ادا کی اور حضرت کے جسد خاکی کو جھاوریاں (سرگودھا) لے جایا گیا۔ جہاں ہزاروں مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھنے کے بعد اس آفتاب روحانیت، علماء حق کے سرپرست امام الاولیاء اور صدر مجلس پیشہ وران حریت کو سپرد خاک کر دیا۔ (مجھے جھاوریاں تک جانے کی سعادت حاصل رہی)۔ آپ کی وفات کے بعد۔ آپ کے وابستگان طریقت خصوصاً امیر شریعت، شیخ حسام الدین، مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی اور قاضی احسان احمد شجاعبادی از حد مغموم رہنے لگے۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ لوگ بھی اپنے اللہ کے پاس چلے گئے۔

کہاں گیاہ وہ رنگ محفل کہاں گئے وہ لوگ
جن کی خاطر ہم ایسوں کے دل کو لگ گئے روگ

یہ تمام بزرگ مسلمانان برصغیر کے لئے اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور انعام تھے۔ ان کے بعد ان کا کوئی بدل پیدا نہ ہوسکا۔ اور نہ مل سکا۔ افسوس! ہماری موجودہ سوسائٹی اور تاریخ ان بزرگان سلف کے تذکرہ سے خالی ہے۔ اور کوئی امید نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے۔ جس قوم اور سوسائٹی کے مورخ مادی تقاضوں کا شکار ہو کر اپنے قلم کا سودا کر لیں۔ تاریخ اور تاریخ ساز شخصیات کا دیانتدار! نہ ریکارڈ اگلی نسل تک نہ پہنچائیں۔ وہ ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر جاتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ جسے مستقبل کا مورخ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

آئے قرار کیسے دلِ بے قرار کو؟

شکوہ ہے تیری موت پہ لیل و نہار کو
آنکھیں ترس گئی ہیں خزاں کی بہار کو
تارے غم فراق میں شب بھر نہ سو سکے

اٹھ اٹھ کے دیکھتے ہیں تری رہگزار کو
تیرا سا بانکپن ہے نہ تیرا سا سوز دل
آئے قرار کیسے دل بے قرار کو

(جانباز مرزا)

سکوت خطابت

اے دیوِ اجل! قاطعِ برہانِ تمنا بے مطلعِ تقریر ہے، دیوانِ تمنا
عنوان غمِ دل ہے کہ عنوانِ تمنا اٹھا نہ یہاں زیست سے احسانِ تمنا
چپ کیوں ہے ذرا عظمتِ آدم کو صدا دے
ڈوبی ہوئی کشتی کو کنارے سے لگا دے

اے جبرِ قضا! کس کی صدا چھین لی تو نے دنیائے خطابت کے مناظر ہوئے سونے
صدیوں یہاں ڈھونڈے گی وفا ایسے نمونے پروان چڑھایا جنہیں تابندہ لہو نے
شیرینیٔ گفتار سے کردار عیاں تھا
تاثیر تلاوت تھی، حلاوت کا جہاں تھا

اے سیلِ فنا! تجھ سے گلہ کس کو نہیں معلوم بھی ہے کون یہ پیوند زمیں ہے
کیا تیرے لئے منزل احساس کہیں ہے؟ اک موج تیری عالمِ صد چیں بہ جبیں ہے
لیکن دلِ زندہ کی صدا مر نہیں سکتی
تعظیمِ محمد کی ادا مر نہیں سکتی

جس سینے میں ہو عشقِ محمد کا قرینہ دب سکتا نہیں قبر کی مٹی میں وہ سینہ
تھا کعبہ اگر دل میں تو آنکھوں میں مدینہ کیا وقت ڈبوئے گا یہاں اس کا سفینہ
وہ قلزمِ توحید کا پیراک رہے گا
باطل کا گریبان یہاں چاک رہے گا

(علامہ لطیف انور)

حکیم محمود احمد ظفر

باتیں شاہ جی کی

برصغیر پاک و ہند میں جب بھی "شاہ جی" کا لفظ بولا جاتا ہے تو سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس سے مراد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ ان کے لئے مختص ہو گیا ہے۔ شاہ جی کے اور بھی کئی القاب تھے۔ "بابا ڈنڈے والا" "احرار کا بوڑھا جرنیل" وغیرہ وغیرہ لیکن "شاہ جی" کے لقب نے جو شہرت پائی وہ کسی اور لقب کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس برصغیر میں آپ کی شہرت کی کئی وجوہات ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ شہرت آپ کی خطابت تھی۔ ہند و پاک کے ہر قریہ اور ہر شہر میں اس خطیب اسلام کی آواز خطابت گونجی اور چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ان کی آواز پر مردوں نے اپنی جانیں اور عورتوں نے اپنے زیورات نچھاور کر دیئے۔ شاہ جی اپنے وقت میں خطابت کے بادشاہ بلکہ خاتم تھے۔ ماضی مرحوم میں بھی ایسے لوگ خال خال تھے۔ اور مستقبل میں تو امیدیں ہی بانجھ ہو گئی ہیں۔ شاہ جی کی خطابت میں شیر کی گرج اور نسیم سحر کی سبک خرامی کا بہترین امتزاج تھا۔

قاری محمد طیب صاحب قاسمی قدس سرہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک مرتبہ شاہ جی کی خطابت کے بارہ میں فرمایا تھا۔

"ان کا مشہور زمانہ وصف جس میں وہ بے مثال تھے۔ خطابت تھا۔ ان کی خطابت جاذبیت کا ایک جادو تھی۔ جس میں بے پناہ کشش تھی۔ ہزاروں انسانوں کا مجمع جو تاحد نظر پھیلا ہوا اور ان کی تقریر کی مسلسل زنجیر میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جس میں کسی کا اکتا کر اٹھ جانا تو کیا معنی کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی تقریر اسے جکڑ کر باندھ لیتی تھی اور کیا مجال کہ کوئی شخص اپنی توجہ کو بھی ان سے ہٹا سکے۔"

"یہ کشش محض الفاظ کی نہ تھی۔ اور الفاظ محض میں یہ جاذبیت ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ الفاظ میں گہری معنویت نہ ہو اور محض معنویت بھی زنجیر کشش نہیں بن سکتی جب تک اس معنویت میں معرفت نہ ہو۔ اور محض معنویت بھی کشش کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔ جب تک کہ اس میں محبت نہ ہو۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے مثال خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب معنویت صاحب معرفت اور صاحب عشق و محبت تھے۔ بالفاظ دیگر وہ محض انسان نہ تھے بلکہ صاحب دل انسان تھے۔ محبت نبوی ان کے دل کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی سے ان کے جوش کا تعلق تھا اور اسی سے ہوش کا اور اسی سے ان کی خطابت کا چشمہ ابلتا تھا۔ جس میں دوسروں کے دلوں کی رگ و پے میں سما جانے کی خصوصیت ہوتی تھی۔"

ایک خطیب کے لئے ذہین ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ قدرت نے شاہ جی کو ذہانت میں بھی حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ چھوٹے چھوٹے فقرے جہاں شاہ جی کی طباعی اور ذہانت کی غمازی کرتے تھے۔ وہاں وہ بہت سی حقیقتوں اور صداقتوں کو بھی اجاگر کرتے اور ایک فہیم انسان اس چھوٹے سے فقرے سے ہی مسئلہ کی گہرائی

اور گیرائی کو سمجھ جاتا۔ ان سطور میں شاہ جی کے ان شہ پاروں کو پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جن میں انہوں نے بڑی بڑی حقیقتوں کو چند لفظوں اور جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان میں بعض وہ مجاہدانہ جملے بھی ہیں جو تیرگی سے الجھتے اور ستاروں سے کھیلتے ہیں۔ جن میں کچھ داستان حرم کے ٹکڑے اور کچھ نغمہ حق کی نئے نوازی کے فقرات ہیں۔

جیل خانے کی آبرو

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن۔ اور مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ محبت اور نفرت کے یہ دو زاویئے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں انکا سودا ہوان کے لئے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے۔ جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی "آبرو" پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔ اور

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

لیکن ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت کے زمانہ قید طلب پر غور کرتا ہوں تو نگاہوں میں ایک تصویر سی کھنچ جاتی ہے۔ میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم، سب اہل ذوق، اہل نظر، اہل دل اور اہل علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے۔ عبدالمجید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے، مولوی لقاء اللہ کی نپی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتی ہے۔ صوفی اقبال پانی پتی کے "اشتلے" خدا کی پناہ! عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں اور آصف علی کھلتے تو پھولوں کے تختے بچھ جاتے۔ جی خوش کرنے کے لئے مشاعروں کا اہتمام ہوتا۔ کبھی سالک صدر ہوتا کبھی آصف اور کبھی

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اختر علی خاں نے ایک دفعہ معرکہ کی غزل سنائی۔ سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کچھ یاد سا آگیا۔ میں نے اختر سے کہا۔ میاں مقطع کہو۔ وہ کسی قدر جھنیپا میں نے کہا تو لو پھر مجھ سے سنو مقطع تھا۔

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو
امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں

(امیر مینائی)

تین چیزوں پر ایمان

شاہ جی اکثر فرمایا کرتے تھے۔ "خدا کی عبادت، رسول کی اطاعت اور انگریز سے بغاوت یہ میرا ایمان ہے اور رہے گا۔ خدا معبود ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب اور انگریز مغضوب خدا کو جو جی چاہے کھو اس کا محاسبہ وہ خود کرے گا۔ مگر محمد ﷺ کے متعلق سوچ لینا یہ معاملہ عقل و خرد کا نہیں ہے یہ عشق کا

ہے۔ عشق پر زور نہیں ہوتا نہ اپنے پر اختیار۔ یہ نہیں سوچا جائے گا کہ قانون کیا کہتا ہے۔ پھر جو ہونا ہوگا ہو جائے گا اور جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

صرف قرآن کی ضرورت

شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ میں قرآن مجید کے علاوہ کوئی دوسری کتاب پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں۔ جو کچھ ہے قرآن و سنت میں ہے اور جو کچھ اس کے باہر ہے وہ باطل ہے اور ایک باطل شے کے مطالعہ کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں کی طرف نگاہ کر سکتی ہے تو میں کیوں نہ دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے اپنی تمام تر توجہ قرآن پر مرتکز کروں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں۔ میری باتوں میں اگر تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی وجہ سے ہے۔ جو چیز مجھے قرآن سے الگ کردے اسے آگ لگا دوں۔

قرآن کی بلاغت

ایک موقع پر فرمایا۔

"اللہ کی کتاب کی بلاغت کے صدقے جائیے۔ خود بولتی ہے کہ میں محمد پر اتاری گئی ہوں۔ بابو اس کی قسمیں نہ کھایا کرو۔ اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی طرح نہ سہی۔ اقبال کی طرح ہی پڑھ لیا کرو۔۔۔۔۔۔ دیکھا آپ نے کہ اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا تو مغرب کی دانش پر ہلہ بول دیا پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں وہ [illegible]"

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

منکرین بشریت

ایک موقع پر منکرین بشریت کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

"بھائی لوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی نسل ہو اور بٹیروں کی بھی لیکن ہم ایک سید ایسے ہیں کہ جن کی نسل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تم بشر نہیں مانتے تو ہم کس کی اولاد ہوئے"

مدح صحابہؓ

جن دنوں مدح صحابہ اور تبرا ایجی ٹیشن (لکھنؤ) کا زور تھا تو شاہ جی نے دہلی دروازہ کے باہر ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اور گرجدار آواز میں فرمایا۔ قدح صحابہ کرنے والو! خدا سے ڈرو۔ اتنے میں دور سے آواز آئی۔ شاہ جی خدا کا خوف کرو۔ سید ہو کر خلافت کے غاصبوں (معاذ اللہ) کی مدح کرتے ہو۔ بس اس جملے سے شاہ جی جلال میں آگئے چہرہ تمتما اٹھا۔ پھر بلند آواز میں فرمایا۔ میں علیؓ کا بیٹا ہوں اور صدیقؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی مدح کرتا ہوں۔ اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ تم کون ہو؟ ہائے وہ لوگ جنہیں رسول کے پہلو میں جگہ

ملی ہو تم انہیں گالی دیتے ہو۔ ظالمو حشر کے دن آقا کو کیا جواب دو گے؟ پھر اس کے بعد صحابہ کے فضائل پر وہ تقریر کی کہ کائنات ہمہ تن گوش ہو گئی اور صرف بخاری کے قلندرانہ الفاظ ہی سنائی دیتے تھے۔

ازواج مطہرات اور اہلِ بیت

۱۹۵۳ء میں مظفر علی شمسی جیل سے منیر انکوائری کمیٹی میں بیان دینے کے لئے آئے۔ بیان دے کر جب واپس گئے تو شاہ جی نے پوچھا شمسی! کیا کیا سوالات ہوئے۔ شمسی نے ایک سوال یہ بھی بتایا کہ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا تم ازواج مطہرات کو اہل بیت نبوت میں شمار کرتے ہو۔ شاہ جی نے پوچھا۔ اس سوال کا تم نے کیا جواب دیا مظفر علی شمسی نے کہا کہ میں نے جواب دیا کہ ہم ان کو اہل بیت میں شمار نہیں کرتے یہ سننا تھا کہ شاہ جی جلال میں آگئے اور فرمایا۔

اہلِ گلشن کے لئے بابِ گلشن بند ہے
اس قدر کم ظرف کوئی باغباں دیکھا نہیں

سیدہ خدیجہؓ اور سیدہ عائشہؓ

ایک دفعہ غالباً مظفر علی شمسی ہی نے دریافت کیا کہ خدیجہؓ اور عائشہؓ میں کیا فرق ہے؟

شاہ جی نے فرمایا۔

"خدیجہؓ کا نکاح محمد بن عبداللہ سے ہوا اور عائشہؓ کی شادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ بنیں اور یہ نبوت کی زوجہ بنیں"۔

قبور کی زیارت

ایک مرتبہ درگاہ امام ناصر (جالندھر) کے جلسہ میں کسی نے اس وقت کا اختلافی مسئلہ چھیڑ دیا۔ مخالفوں نے شاہ جی کے بارہ میں مشہور کر رکھا تھا کہ وہابی ہیں۔ چنانچہ آپ سے سوال کیا گیا کہ آپؒ کا زیارت قبور کے بارہ میں کیا خیال ہے؟ شاہ جی نے فرمایا!

"اپنے اپنے ظرف اور ذہن کی بات ہے۔ کچھ لوگ انگور نعمت خداوندی سمجھ کر کھاتے ہیں۔ کچھ اس میں شراب نکالتے اور عقل کی بازی بدلتے ہیں۔ میں بھی مزار کی زیارت کر کے آیا ہوں اور تم بھی کرتے ہو۔ میں خدا کے فضل سے کچھ لے کر آیا ہوں اور تم ایمان میں سے کچھ دے کر آئے ہو"۔

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

قوم کی نفسیات

شاہ جی عام طور پر فرمایا کرتے تھے۔ میں نصف صدی اس ملک کے چپہ چپہ پر پھرا ہوں۔ میری قوم کی نفسیات یہ ہے کہ یہ ڈنڈے والے کے آگے اور دولت والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔

اذہان یورپ کے لطف و کرم کا نتیجہ

ایک مرتبہ علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں یوپی کی سرزمین میں پہنچا تو میں نے اکثر لوگ ایسے دیکھے جو کالی اچکن اور سفید پاجامے پہنے ہوئے تھے مگر سروں پر انگریزی ٹوپی (ہیٹ) اور گلوں میں نکٹائیاں لٹک رہی تھیں۔ تو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں غاصب یورپ کی سرزمین پر پھر رہا ہوں یا کہ غلامی کی زنجیروں سے گلو خلاصی کرنے والوں کی سرزمین میں آیا ہوں۔ تو یکایک میرے ذہن نے میری یاوری کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے جسم تو آزادی کے پرستاروں میں پلے ہیں لیکن اذہان یورپ کے لطف و کرم کا نتیجہ ہیں"

روس کی کتیا

شاہ جی چند احباب میں بیٹھے ہوئے تھے موضوع سخن تھا خلائی سائنس کی ترقی۔ ایک دوست نے کہا۔ "شاہ جی! سنا ہے کہ روس کی کتیا واپس آگئی ہے۔ شاہ جی نے فرمایا۔ بھائی شکر کرو کہ تمہاری عزت و ناموس رہ گئی ورنہ اوپر والی مخلوق کو یہی گمان ہوتا کہ نیچے ایسی ہی مخلوق بستی ہے۔"

میرے دل نے غلطی نہیں کی

ایک موقع پر فرمایا کہ

"میں نے جو کچھ کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے کیا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی کسی حرکت پر ندامت نہیں۔ میرا دماغ غلطی کر سکتا ہے لیکن میرے دل نے کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھ سے زیادہ وفاداری کا ثبوت مانگنے والے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو وفاداری کا ثبوت دیں۔"

"میں ان لوگوں میں نہیں جو انسانی ضمیر کی سوداگری کرتے ہیں۔ اس شخص کو دھوپ چھاؤں کی اولاد سمجھتا ہوں جو قوم کو بیچتا پھرتا ہے۔ ملک سے غداری کرتا ہے اور جس ہنڈیا میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے۔ میں نے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنا سیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کا وارث نہیں جنھوں نے درباروں کی دہلیزیں چاٹی ہیں۔ میں ان کا وارث ہوں جو شہادت کے رستہ میں سروں کو ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔"

قول کا نہیں عمل کا آدمی

ایک موقع گفتگو پر فرمایا!

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو یہ صدا دیتے پھریں کہ میں توشۂ وفاداری لئے پھرتا ہوں۔ میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو اور جس مقتل میں چاہو مجھے ذبح کردو۔ میں خوش ہوں۔ میری خوشی بے کراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصہ میں بھی سامراج کو دیکھ نہیں سکتا۔ میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

"تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہار گئی۔ اس کہانی کو یہیں ختم کردو۔ اب

پاکستان نے جب بھی پکارا۔ واللہ! باللہ! مَیں اس کے ذرہ ذرہ کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور عزت کے مقابلہ میں نہ اپنی جان عزیز سمجھتا ہوں اور نہ اولاد۔ میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اب بھی تمہارا ہے۔"

انگریز کی فطرت

ایک موقع پر فرمایا:

"انگریز کی فطرت کا خمیر سانپ کے زہر سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اپنی غذا کے لئے اسے انسانی خون کی جو چاٹ پڑی ہوئی ہے بڑی مشکل سے چھوٹے گی"

ہندوؤں کا خدا

شاہ جی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ۔

"ہندو قوم مسلمانوں کا کیا مقابلہ کرے گی جس کا خدا (گائے) مسلمانوں کی غذا ہے"

قادیانیوں کو خطاب

ایک دفعہ شاہ جی نے قادیانیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے قادیانیو! اگر نیا نبی مانے بغیر تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر تم جی نہیں سکتے تو ہمارے مسٹر جناح ہی کو نبی مان لو۔ ارے مرد تو تھا۔ جس بات پر ڈٹا کوہ کی طرح ڈٹ گیا۔ آہوں کے بادل اٹھے، اشکوں کی گھٹا چھائی، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ مگر کوئی چیز مسٹر جناح کے عزم کو نہ ہلا سکی۔ اس نے تاریخ کے اوراق کو پلٹ دیا اور ملک کے جغرافیہ کو بدل کر رکھ دیا۔ ارے تمہاری نبوت کو بھی لٹ پٹ کر جگہ ملی تو اسی کے قدموں میں تمام عمر گزار دی مگر انگریز کی نوکری نہیں کی حکومت سے خطاب نہیں لیا۔ انگریزوں سے کوئی تمنا وابستہ نہیں کی۔ اور ایک تمہارا نبی ہے کہ حضور گورنمنٹ کے آگے عاجزانہ درخواستیں کرتے کرتے پچاس الماریاں سیاہ کر ڈالیں"

جماعت کا بت

ایک مرتبہ شاہ جی دفتر احرار دہلی دروازہ لاہور میں تشریف فرما تھے۔ کئی اور احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ جی کے سامنے اخبار آیا جس کی شہ سرخی تھی کہ "حکومت نے مجلس احرار پر پابندی لگا دی" یہ سرخی پڑھ کر شاہ جی فرمانے لگے۔

"لو! یہ بھی ایک بت ٹوٹا" پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ جماعت کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جماعت خود مقصد بن جاتی ہے۔ اس وقت جماعت ایک بت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ پھر جائز و ناجائز طریق سے آدمی اس جماعت کا دفاع کرتا رہتا ہے اور بت کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز آپ کو اللہ تک پہنچنے سے روکتی ہے وہ بت ہے۔

سیاسی بصیرت

شاہ جی ایک درویش طبع انسان تھے۔ لیکن سیاست میں بھی انہیں ایک خاص بصیرت عطا ہوئی تھی۔ وہ "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" کے مصداق تھے۔ آپ کی وہ تقریر جو انہوں نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو اردو پارک دہلی میں قریباً پانچ لاکھ کے اجتماع میں کی۔ ان کی سیاسی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں یہ بحث چل رہی ہے کہ آیا ہندوستان میں ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے؟ قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق سے طلوع ہو گا۔ لیکن یہ وہ پاکستان نہیں بنے گا جو دس کروڑ مسلمانان ہند کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کے لئے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"بات جھگڑے کی نہیں سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔ لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد اور بنیادی فرق ہے۔ اگر مجھے کوئی اس بات کا یقین دلائے کہ کل کو ہندوستان کے کسی قصبہ کی گلی میں یا شہر کے کسی کوچہ میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو رب کعبہ کی قسم امیں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں"

"لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھ فٹ قد پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے جن کا اٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا، جن کا جاگنا، جن کی وضع قطع، جن کا رہن سہن، بول چال، زبان و تہذیب، کھانا پینا، اور لباس وغیرہ غرض کہ کوئی چیز بھی اسلام کے مطابق نہ ہو وہ دس کروڑ کی انسانی آبادی کے ایک قطعۂ زمین پر اسلامی قوانین کس طرح نافذ کر سکتے ہیں؟ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لئے تیار نہیں"-----

"ہندو اپنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتا رہے گا۔ اسے کمزور بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس تقسیم کی بدولت آپ کے دریاؤں کا پانی روک لے گا۔ آپکی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ کی یہ حالت ہو گی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی کوئی سی مدد کرنے سے قاصر ہو گا۔ اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہو گی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے خاندان ہوں گے۔ امیر دن بدن امیر تر ہوتا چلا جائے گا اور غریب غریب تر-----"

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۲۸ اپریل ۴۶ء۔ بحوالہ کردار قائد اعظم مصنفہ منشی عبد الرحمن ملتان)

شاہ جی کی یہ چند باتیں تھیں جو قارئین کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ وگرنہ انکی زبان کا ایک ایک بول ایک انمول موتی تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جس شخص نے ابو حنیفۂ وقت حضرت مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ خلیفۂ ارشد حکیم الامت تھانوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہو اور شیخ العصر، خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری کے چہرہ سے علم کشید کیا ہو اس کے منہ سے ایسی باتیں غیر متوقع بھی نہیں۔

سید قاسم نوری

نہ کر سکے گی کبھی موت پائمال اُسے

بساطِ وقت سے افسوس اٹھ گیا وہ خطیب
مزاجِ عصر کا جو عمر بھر طبیب رہا
وہ جس کے فکر و عمل میں فرشتگی تھی اسیر
تمام عمر جو اخلاص کا نقیب رہا!
ہیولا بن کے جھپٹتا رہا جو باطل پر
مخالفت کے ہر ایک جبر کا رقیب رہا
یہ واقعہ ہے کہ جس نے سنا نہ اسکا سخن
حصولِ علمِ بصیرت میں کم نصیب رہا
تھا اسکا قلب حریم صفات کا محرم
خلوصِ عشقِ محمد کی سلسبیل لئے
وہ اک شعورِ مجسم تھا عظمت دیں کا
حق آگہی کی شکیبائی جمیل لئے
شکوہ و عظمتِ ملت کا پاسدار رہا
سخن تھا اس کا تب و تابشِ جلیل لئے
وہ اس کی صدق بیانی وہ اس کا صدق و خلوص
تلاش کرتا تھا خود شاہدِ مثال اسے

گزر گیا جو ہر اک موڑ کاٹ کر غم کا
ڈرا سکا نہ کبھی موت کا جلال اسے
نگل سکی نہ جسے صَر صَر حوادث بھی
خدا نے بخشا تھا وہ دردِ لازوال اُسے
ستیزہ کار رہا شاطر فرنگی سے
تمام عمر رہا قوم کا خیال اُسے
اُتر گیا جو دلِ قوم میں لہو بن کر
نہ کر سکے گی کبھی موت پائمال اُسے

قاری ظہور رحیم (ضلع رحیم یار خان)

شاہ جی، ایک متحرک شخصیت

قافلے باد بہاری کے جدھر جاتے ہیں
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی نکھر جاتے ہیں

ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر شریعت کے بیان و تقریر میں تاثر کا سبب ان کا روحانی تزکیہ بھی تھا کیونکہ انہوں نے عنفوان شباب میں سلوک و طریقت کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔ اور سرزنش نفس کے لئے دو دو سال تک متواتر روزے رکھے۔ چھ چھ گھنٹے میں قرآن مجید ختم کیا۔ شب زندہ داری کا یہ عالم تھا کہ خود فرمایا کرتے تھے میں نے ستاروں سے بازی لگا دی تو انہیں ہرا دیا۔ جب ریاضت طبیعت پر غالب آ جائے تو پھر زبان کا رس سحر آفرینی کا کام کرتا ہے۔ زمین کی وسعتیں اس کے آگے سمٹ کر رہ جاتی ہیں اور فضا پر اس کی حکمرانی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ہم نے بارہا محسوس کیا کہ جب امیر شریعت کی خطابت زور پر آتی تو زمین اور آسمان کے درمیان سکوت کا عالم طاری ہو جاتا اور کائنات کا ذرہ ذرہ جھومتا نظر آنے لگتا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریز نے ہندوستان پر رولٹ ایکٹ رائج کیا تو ملک میں نفرت و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ مزید غیض و غضب کا سبب بنا۔ مسلمانوں میں تحریک خلافت نے سر اٹھایا۔ ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج کی بنیاد ڈالی گئی۔ مولانا داؤد غزنوی نے اس موقعہ پر نہایت جسارت سے کام لیا اور انگریز کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اسی اثناء میں مولانا داؤد غزنوی نے امیر شریعت کو اپنا ہم خیال بنا کر آمادہ احتجاج کیا۔ یہاں طبیعت پہلے ہی سے معرکہ حق و باطل کے لئے تیار تھی۔ فوراً سیاسی خطیب کی حیثیت سے میدان عمل میں آ گئے۔ ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا اور انگریز کے خلاف ایسی مدلل اور ولولہ انگیز تقاریر کیں کہ ظالم کے ایوان استبداد میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ آپ نے عمر عزیز کا ہر لمحہ استخلاص وطن کے لئے وقف کر دیا۔ ان کا ایک جملہ ہمیشہ احباب کے درمیان گھومتا رہا ہے۔ وہ زندگی کی تقسیم پر فرمایا کرتے تھے۔

"کچھ ریل میں کٹ گئی اور کچھ جیل میں کٹ گئی"

عقیدہ کے لحاظ سے امیر شریعت حنفی مسلک کے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اسلاف سے انہیں والہانہ عقیدت تھی نہ تو کٹر وہابی تھے اور نہ روایتی صوفی۔ وہ تصوف کو اسلام کی جزو سمجھتے تھے۔ اور ہر سلسلے کے بزرگوں سے انہیں قلبی ربط تھا۔ قدوۃ السالکین حضرت مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ گولڑہ شریف سے بیعت تھے۔ ان کے وصال کے بعد اپنی روحانی لذتوں کو برقرار رکھنے کے لئے حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کر لی۔ اس طرح سے امیر شریعت کی زندگی دو کامل بزرگوں کے درمیان بسر ہونے لگی۔ اور یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہو گا کہ امیر شریعت کی زندگی مجموعہ اضداد تھی۔ ملنگوں میں ملنگ خطیبوں میں خطیب۔ عالموں میں عالم درویشوں میں درویش اور سیاست دانوں میں غضب کے سیاست دان۔ ان کی محفل میں جب بھی کسی کو بیٹھنے کی سعادت ملی تو وہ پکار اٹھتا

پر تو منت نہ کنجد در زمین و آسماں
اندرون خانہ حیرانم کہ چوں جا کردہ

محفل کو ہمیشہ کشت زعفران بنا دیتے۔ متقدمین اساتذہ کا کلام ازبر تھا۔ فارسی عربی اور اردو کے اشعار اس سلیقہ سے ادا کرتے کہ جاہل سے جاہل انسان بھی مفہوم و معنی پانے میں دقت محسوس نہ کرتا۔ اور ہر طرح کے طبائع کو لطف اٹھانے کا موقع ملتا۔ ان کی محفل میں امیر و غریب کے ساتھ برابر کا سلوک کیا جاتا۔ اور ہر ایک یہ خیال لے کر اٹھتا کہ امیر شریعت میرے ہیں گویا وہاں خلوص و محبت کے ایسے گلدستے تیار کئے گئے تھے کہ جن کی مہک اور خوشبو سے ہر طبقہ کے لوگ فیض یاب ہوتے۔ امیر شریعت حزن و یاس کے عالم میں بھی ہمیشہ خندہ پیشانی سے رہے۔ اور ہر مصیبت کو اس طرح لبیک کہا کہ شاید ان کی آغوش میں آکر پیغام مسرت و رحمت بن گئی ہے۔ ان کا اگر کوئی کمزور پہلو تلاش کیا جائے تو اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ وہ حسن کے فریفتہ تھے۔ حسن کائنات کی جس چیز میں بھی انہیں نظر آتا وہ اس پر وارفتہ ہو جاتے۔

ناصح کو بلاؤ میرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اس نے محبت کی نظر سے

امیر شریعت کو تدبر فی القرآن کا ملکہ ازل ہی سے ودیعت ہوا تھا۔ زندگی بھر مسائل مختلفہ پر قرآن مجید کی آیتیں تلاش کرتے رہے۔ اور اس کی تائید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آئمہ کبار کے حالات جمع کرنے میں لگے رہے۔

لطیفہ بازی اور برجستہ گوئی میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ جب خطابت کی سحر آفرینیوں کا جلوہ دکھاتے تو جم غفیر کو آہ و بکا، نالہ و فریاد پر مجبور کر دیتے اور پھر اسی لمحے میں ظرافت کے ایسے پھول بکھیر دیتے کہ تمام کا تمام مجمع ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

ہر علاقہ کی زبان پر انہیں تصرف و تبحر تھا۔ اور ہر علاقہ کے اخلاق و عادات سے بھی کماحقہ واقف تھے۔ جہاں گئے لوگوں نے آنکھیں بچھا دیں۔ لیکن اپنے دادا جان اور والدہ ماجدہ کی سنت کے مطابق بے انتہا بے نیاز تھے کسی سے کوئی چیز لینے کے روادار نہ تھے۔ البتہ اپنے مخلصین کے تحفے قبول فرماتے تھے۔ سادگی کا یہ حال تھا کہ بقول اختر الہ آبادی۔ ”غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ گھر میں رونق افروز ہوئے تو ہر کسی کی مزاج پرسی فرمائی۔ میری بیوی نے عرض کیا ابا جان کھانا تیار ہے۔ یہاں تناول فرمائیں گے یا دریر پر۔ فرمایا بیٹی تمہارے پاس چٹائی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہیں بیٹھ کر کھا لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ بین الاقوامی شہرت کا وہ خطیب جو ہر نظر میں محبوبیت کا درجہ رکھتا ہو جس کی توجہ کا متمنی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس سادگی کے ساتھ ایک غریب انسان کے ہاں تلطف آمیزیاں فرما رہا ہو کہ جس کی مثال آج ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔ میری بچی عطیہ بتول ان دنوں کوئی سال دو سال کی ہو گی۔ آپ کے سامنے کھیل رہی تھی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ میں نے عرض کیا حضرت اس نے اگر پیشاب کر دیا تو آپ کو زحمت ہو گی۔ فرمایا بابو تمہیں ان کی عظمت کا اور عزت کا کیا پتہ (میرے میاں) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا مقام پوچھو۔ میرا بھانجہ حبیب

الرحمٰن سولنگی آپ کا مرید تھا۔ زندگی کی ۱۹ویں بہار دیکھ رہا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا امیر شریعت پہلے ہی سے اس کی علالت پیہم کا علم رکھتے تھے۔ میں نے اس کے انتقال کی اطلاع کی تو بہت زیادہ محزون خاطر ہوئے اور جواب میں صرف یہ شعر لکھ دیا

گر پیر نودسالہ بمیرد عجبے نیست
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

پھر ملاقات پر کچھ ایسے انداز میں اظہار تعزیت فرمایا کہ جاتا ہوا صبر پھر لوٹ آیا۔ لاریب یہ کہنا پڑے گا کہ امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی ذات میں انسانیت کا احترام اور دوستوں، عزیزوں کی پریشانیوں کا دکھ درد بدرجہ اتم تھا۔ وہ جب بھی کسی کو آزردہ خاطر دیکھتے تو مضطرب ہو جاتے۔ اس معاملہ میں ان کا یہ نظریہ تھا۔

صدیوں کی جان درد کا قالب دیا مجھے
جو کچھ دیا کسی نے مناسب دیا مجھے

حالات کے خاکے بتلاتے ہیں کہ امیر شریعت کے نظریات میں پختگی اور اصول کی پاسداری کا لحاظ نہایت ضروری تھا۔ ان کے سلسلہ مودّت و ارادت میں جو بھی ایک دفعہ منسلک ہو گیا وہ عمر بھر کے لئے انہی کا ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی امیر شریعت سے وابستہ رہے ہیں جنہیں ان سے سیاسی اختلاف تھا۔ مگر تعلقات میں کبھی کوئی فرق نہ آنے پایا۔ یہ اس لئے کہ وہ ایک مومن کا ایمان اور مسلمان کا اخلاق رکھتے تھے۔ ان کا دل ہر طرح کی گرد کدورت سے صاف تھا۔ علامہ اقبال مرحوم سے دلی تعلق پیدا ہوا تو ہمیشہ اس کے احترام کا خیال رکھا۔ جب کبھی ان کے ہاں جاتے تو راز و نیاز کی باتیں ہوتیں ان کی سنتے اور اپنی سناتے۔ وہ کوئی تازہ نظم سناتے تو حضرت امیر شریعت داد دیتے۔

بڑی ہستیوں کے بارے میں ان کی رائے اٹل ہوتی گاندھی جی کو سیاست کا مہاتما مانتے۔ پنڈت موتی لال اور سی آر داس کو پکا نیشلسٹ مالویہ جی اور ولبھ بھائی پٹیل کو کٹر ہندو، مولانا آزاد کو علم کا بحر بیکراں، جواہر لال نہرو کو ایک سیاسی انسان، مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کو تقویٰ و طہارت کا مجسمہ، مولانا مفتی کفایت اللہ کو وقت کا ابو حنیفہ سمجھتے تھے۔

شاہ اسماعیل شہید رحمتہ اللہ کو برا کہنے والوں کے متعلق فرماتے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے تاکہ وہ شاہ اسماعیل شہید کے مقام کو پہچان سکیں۔ صاحب زادہ طاہر محمود صاحب کوریجہ جو طبقہ بریلویت سے مانوس ہیں ملتان میں حضرت امیر شریعت سے اس ارادے کے ساتھ ملنے گئے کہ اسماعیل شہید اور تقویتہ الایمان کے بارے میں ان سے استفسار کیا جائے۔ چنانچہ جب امیر شریعت کے ہاں پہنچے تو آپ نے حسب معمول مزاج پرسی فرمائی۔ صاحبزادہ طاہر محمود صاحب سے نہایت ہی محبت سے پیش آئے اور فرماتے رہے کہ آپ خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ چاچڑوی کی نسل سے ہیں اس لئے مجھ پر احترام کرنا واجب ہے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں بات چھڑ گئی تو الماری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس سے کتاب منصب امامت نکال لاؤ کتاب لائی گئی آپ نے اس کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی جو

انبیاء نوع دیگراند کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر فرمایا۔ صاحبزادہ صاحب منصب امامت کی زبان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقویتہ الایمان کی عبارت شاہ اسمٰعیل شہید کے قلم کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ منصب امامت اور تقویتہ الایمان کی زبان میں بیان وانداز کا تضاد ہے۔ حضرت امیر شریعت کے اس نظریہ نے صاحبزادہ موصوف کے دل میں ایسا گھر کیا کہ وہ آج تک شاہ اسمٰعیل شہید کے بارے میں رطب اللسان ہیں اور حضرت بخاری کے مدح خواں۔

اسلام پور تحصیل لیاقت پور میں اہل سنت و شیعہ حضرات کی ہمیشہ سے مذہبی چپقلش رہی تھی۔ جانبین سے مناظرہ مباحثہ اور مجادلہ کی سال بہ سال تیاری ہوتی رہتی۔ جلسہ منعقد ہوتا تو دونوں طرف کے علماء اپنے اپنے پنڈال میں ایک دوسرے کی تردید کرتے اور زور خطابت سے اپنے دعویٰ کو سچا دکھانے کی کوش کرتے۔ حضرت امیر شریعت اہل سنت کے جلسہ میں تشریف لائے تو منتظمین جلسہ سے کہا میاں اس طرح سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی پر حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ بلکہ ضد اور مخالفت کو راہ ملتی ہے۔ آپ کی تقریر کے وقت کا اعلان ہوا تو سنی اور شیعہ دونوں جلسہ گاہ میں آموجود ہوئے۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔ میں جنگ لڑنے نہیں آیا اور نہ ہی مناظرہ و مباحثہ کا قائل ہوں۔ میں برہان و دلائل کے زور سے کسی کو کوئی بات منوانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ شیعہ حضرات سے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ چار آدمی اپنی طرف سے ایسے تیار کریں جو صالح فطرت ہوں۔ میں ان کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کو تیار ہوں۔ وہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آستان مقدس پر عرض کیا جائے گا کہ حضور اصحاب ثلاثہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرما دیں۔ اگر حضور نے جواباً فرمایا کہ یہ میرے ہیں تو پھر تمہیں بھی ان پر ایمان لانا پڑے گا۔ اور اگر حضور نے کوئی جواب مرحمت نہ فرمایا تو پھر میں تمہارا ہی عقیدہ و مسلک اختیار کر لوں گا۔ حضرت امیر شریعت کا یہ فرمانا تھا کہ جلسہ گاہ کی فضا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی اور اس کا یہ اثر مرتب ہوا کہ پھر کبھی مناظرانہ انداز میں وہاں پر جلسے و جلوس منعقد نہ ہوئے۔ حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی اس تقریر نے ان کے عقیدہ کو بھی صاف کر دیا جو کہ بعض لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہا تھا شاہ جی حیات انبیاء کے قائل تھے یا نہیں بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ جن لوگوں کو اسلاف دیوبند سے گہرا اور قریب کا واسطہ ہے وہ حیات انبیاء کے منکر ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ علمائے دیوبند کا ہر فرد گرامی حیات انبیاء کا قائل ہے اور یہ عقیدہ حضرات دیوبند کے نزدیک اصول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بانئ دارالعلوم دیوبند سے لیکر مہتمم دارالعلوم قاری محمد طیب کی ذات تک اس بات کے قائل ہیں کہ حضور پر نور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم روضہ اطہر میں حیات حسنی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ نے تو ایک مکتوب میں زیارت قبر نبوی کے متعلق حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک کو مرجوع قرار دیتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے۔ کہ مدینہ منورہ کی حاضری محض سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہیئے۔ آپ کی حیات مطہرہ نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام مومنین اور شہداء کو حاصل ہے بلکہ بہت سے وجوہ سے اس سے بھی قوی۔ آپ

سے توسل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا بلکہ اس سے برزخی زمانہ میں بھی کیا جانا چاہیئے۔
یہی بات تھی کہ حضرت امیر شریعت وثوق کامل کے ساتھ یہ اعلان فرما رہے تھے کہ اصحاب ثلاثہ کے متعلقین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ استفسار کرلینا چاہیئے تاکہ حقیقت کا اصلی پہلو واضح ہوسکے۔
چونکہ حیات انبیاء کے عقیدہ کا اجمالاً ذکر چھڑ گیا تھا اس لئے اس کی تفصیل پر چند سطور لکھنے پڑے ورنہ ہمارا موضوع صرف حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے صفات و کردار کا ذکر کرنا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصیت کے ساتھ نوازا تھا۔

یوں تو اس دنیا میں بہت سے مقرر و خطیب نامور حیثیت سے رونما ہوئے۔ لیکن امیر شریعت کا مقام کچھ اور نوعیت کا تھا۔ وہ خطابت کے وقت موافق و مخالف کو انگشت بدنداں کر دیتے اور دلوں کی بازی اس طرح سے جیت لیتے کہ کسی کو مجال اعراض و انکار نہ ہوتی۔ انگریزی سامراج کے خلاف ان کی خطابت زوروں پر تھی۔ سکھر میں احرار کانفرنس کے موقع پر رات کے دس بجے تقریر کا آغاز ہوا۔ حکومت کا ٹوڈی طبقہ اس تاک میں بیٹھا تھا۔ کہ شاہ جی کوئی نامناسب جملہ استعمال کریں تو حشر بپا کیا جائے۔ آپ نے لہجہ کو ذرا تلخ کرتے ہوئے فرمایا جو استخلاص وطن کا حامی نہیں وہ پلید و ناپاک جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ مخالف طبقہ نے پنڈال کو سر پر اٹھا لیا۔ لیکن اس باوقار خطیب نے نہایت جلال کے ساتھ لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر جمالیا۔ کانفرنس کی فضا میں کوئی تغیر نہ آنے دیا۔ آواز میں اس وقت بجلی کی سی کڑک تھی۔ للکار کر فرمایا "برطانیہ کے سگان دم بریدہ غور سے سنو۔ تمہارے آقا کو یہاں سے بستر گول کرنا پڑے گا۔ اور میں پھر کہتا ہوں کہ جو وطن کی آزادی کا علمبردار نہیں وہ پلید و ناپاک جانور سے بھی بدتر ہے۔"
سبحان اللہ یہ آواز ایک ہادی کی گرج سے کم نہیں تھی۔ سارے پنڈال پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور امیر شریعت کی صداقت آفرین اور بیباک صدا دلوں کے قلعے فتح کر رہی تھی۔ کلام اللہ کی آیت یہ آیت استدلال کے طور پیش فرما رہے تھے۔ رات گزرتے کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ صبح پانچ بجے جب مؤذن نے اذان دی تو حضرت امیر شریعت نے یہ فرماتے ہوئے تقریر ختم کی افسوس کہ

مؤذن اذان بے ہنگام برداشت

امیر شریعت کی خطابت میں مفہوم قرآن کا بڑا دخل تھا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے تدبر فی القرآن کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ کلام اللہ سے دین و دنیا کی ہر شے تلاش کرلیا کرتے تھے۔
پچھلے اوراق میں بیان کیا گیا ہے کہ امیر شریعت کو میدان سیاست میں لانے والے مولانا داؤد غزنوی تھے۔ انہوں نے حضرت امیر شریعت کی انقلاب آفرین فطرت کو خوب ابھرنے کا موقعہ دیا۔ آپ کا طوطی بولنے لگا۔ مولانا ظفر علی خان، مولانا داؤد غزنوی، چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، خواجہ عبدالرحمن غازی اور مولانا مظہر علی اظہر رحمہم اللہ نے ۱۹۲۹ء کو جماعت احرار کی بنیاد ڈال کر پنجاب کی سیاسی زندگی کو بیدار کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ اور حضرت امیر شریعت کو احرار کا پہلا صدر منتخب کیا۔
احرار ذہناً کانگریس کے ساتھ تھے۔ اس لئے سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عرصہ میں

انہوں نے ہندو ذہنیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس لئے احرار نے جولائی ۱۹۳۱ء کو پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی صدارت میں منعقد کی اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ اسپر ہندو پریس آتش زیرپا ہو گیا۔ اور احرار پر کانگریس سے باغی ہونے کا الزام تراشنا شروع کر دیا۔ چونکہ احرار ہندو ذہنیت سے باخبر ہو گئے تھے۔ اس لئے دوبارہ ان کے ساتھ شریک کار نہ ہوسکے۔ جماعت احرار پورے اخلاص سے کام کرتی رہی اور ملک کے مشکلات کے حل کی تدبیریں سوچتی رہی۔ امیر شریعت کا وجود سراپا احرار تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔ اللہ کا نام لے کر میدان عمل میں کود پڑتے۔ پنجاب کے رگ و پے میں طلب آزادی کا خون دوڑ گیا۔ امیر شریعت جہاں بھی جاتے لوگ ان کی راہوں پر پلکیں بچھاتے۔ وہ قرآنی مغز کے ساتھ عوام کو دین و سیاست کی پرپیچ راہوں سے آشنا فرماتے۔ مسلمان کو ان کے مقام سے باخبر کرتے۔ اور بدعات و رسومات کے جادو کو توڑنے کے لئے قرآن حکیم کے مجرب نسخے بتاتے۔ آپ کے اس طرزِ تبلیغ نے علماء کے دلوں میں آپ کا احترام پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ اس بات کے معترف تھے کہ جو کام ہم سے نہ ہوسکا اس کو حضرت بخاری کی مجاہدانہ روش اور مخلصانہ کاوش نے بدرجہ احسن انجام دیا ہے۔ یہی تاثر تھا کہ محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے برصغیر ہندوستان کے پانچ سو جید علماء و صلحاء کی معیت میں حضرت امیر شریعت کے ہاتھ پر سیاسی و دینی امارت کے لئے بیعت جہاد کی۔ اس طرح سے آپ علماء ربانیین اور صلحائے کاملین کی نظر میں امیر دین و محبوبیت کے درجہ میں آگئے۔ اور مسلم قوم کا درد پہلو میں لیکر قریہ قریہ اور بستی بستی پھرتے رہے۔ بے علم مسلمانوں کو صرف السلام علیکم سکھانے میں کئی برس لگا دیئے۔ تاکہ اسلامی معاشرہ اصول دین سے واقف ہوسکے۔ قوم کو عریانی و بے حیائی میں مبتلا پایا تو صرف اس موضوع پر مہینوں بولتے رہے حتیٰ کہ بیت الخلاء تک کے آداب سکھا دیئے۔ حسن اخلاق اور مواخات کے رشتوں کو جوڑنے کے لئے پند و نصائح کے باب کھول دیتے تو سخت سے سخت دل انسان بھی موم کی طرح پگھل جاتا۔ جاہلانہ رسوم و رواج کو نیست و نابود کیا اور عقائد باطلہ کے شجر خبیث کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔ لوگوں کی گالیوں کا جواب ہمیشہ دعا اور طلب ہدایت کے رنگ میں دیا۔ اپنوں کو گود میں بٹھایا تو غیروں کو گلے لگایا۔ ہر ایک کے حق میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی چاہی۔ اور ہر کسی سے بے لوث محبت کی۔ بہت سی ماؤں کے بیٹے، بہنوں کے بھائی، چھوٹوں کے ابا اور بڑوں کے رازداں تھے۔

اپنے ساتھیوں کی ہمیشہ عزت کرتے اور عوام کے سامنے انہیں اونچا دکھاتے۔ جن جن گھرانوں سے انہیں خصوصی تعلق ہو گیا تھا۔ ان کے حالات سے باخبر ہونے کی کوشش کرتے اور ان کے اعزاز و تکریم کا پورا خیال رکھتے۔

سرائیکی علاقے کا عمومی ذہن بدعات و رسومات کا دل دادہ اور غلط طریق پر تصوف کے استعمال کا عادی ہے۔ حضرت امیر شریعت نے قرآن و سنت کی روشنی میں جب یہاں تبلیغی دورہ کیا تو ایک طبقہ نے ان کے خلاف وہابیت کا طومار کھڑا کر دیا۔ یہ بات ان کے کانوں میں پہنچی تو فرمایا۔ "میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور نہ کوئی نیا الزام ہے۔ قوم کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ہمارے واعظ اور مقرر ہی کچھ اس طرح کے

واقع ہوئے ہیں کہ وہ قوم میں رسومات بد پھیلا کر اپنی من مانی کرانا چاہتے ہیں۔ اور مجھ سے اسے دور رکھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ناامید نہیں ہوں۔ قوم میں اب بھی صلاحیت باقی ہے"۔
پھر اس طغیانی کے ساتھ اس علاقے کا دورہ کیا کہ ہر ہر گھر میں امیر شریعت کی آواز پہنچی۔ اور لوگوں نے دین کی سچی و صحیح معرفت حاصل کر لی۔

خانپور شہر میں میراث پر تبلیغ کی تو رات ہی رات میں ایسے ایسے گھرانوں نے اپنے مال کو شرعی طور پر تقسیم کر ڈالا۔ جن کے خاندانی روایات میں اس طرح کی تقسیم ورثہ کا ذہن ہی نہیں تھا۔

وہ جس موضوع کو اپنی خطابت میں چن لیتے اس پر اس قدرت کے ساتھ براہین و دلائل لاتے کہ سامعین کو بجز تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہ ہوتا۔ اور نہ ہی کسی کو مزید سوچنے کی توفیق ملتی۔ ان کی خطابت میں آواز خوش سونے پر سہاگے کا کام کرتی جو ذہن کے بالاخانوں سے نکل کر دل کی گہرائیوں تک جا پہنچتی۔

انگریز دشمنی ان کا ایمان تھا۔ وہ کسی ایسی طاقت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس نے چراغ مصطفوی کے گل کرنے کی جدوجہد کر رکھی ہو۔ وہ ہمیشہ دشمنان دین سے نبرد آزما رہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک کی دوڑ لگائی کوئی ایسا گاؤں اور شہر نہ تھا جس نے امیر شریعت کی درد بھری پکار نہ سنی ہو۔ اور ان کی ایمان افروز تقریر سے بہرہ اندوز نہ ہوا ہو۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی و شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہا اللہ نے ایک راستہ دکھایا تھا میں اس پر چل کر اپنی آخرت کا سامان بنا رہا ہوں۔

بہاول پور جب نواب صاحب بہاول پور کے زیر نگیں تھا تو وہاں پر سیاسی مقررین کے خطاب کرنے کا کم موقع ملتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے قوانین ہی کچھ ایسے تھے۔ لوگوں نے دوڑ دھوپ کر کے حضرت امیر شریعت کے داخلہ کی اجازت لی۔ آپ تشریف لائے۔ عید گاہ میں جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ حد نظر تک لوگوں کا ہجوم تھا تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ آپ کلہاڑی ہاتھ میں لئے سٹیج پر تشریف لائے۔ لوگوں نے دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ استقبال کیا۔ نعرہ تکبیر سے فضا گونج اٹھی۔ خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔ میں یہاں سیاسی تقریر کرنے نہیں آیا میں نواب بہاول پور اور ان کے خاندان کا احترام کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ریاست بہاول پور کو سرسبز و شاداب رکھے۔ مجھے یہاں پر دین کی خوشبو آتی ہے۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ میرے داخلہ پر پابندی صرف اس جرم کے عوض ہے کہ میں ۱۸۵۷ء کے خونی واقعات پر پردہ ڈالنے والوں کو صرف اس لئے غدار کہتا ہوں کہ وہ اسے غدر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی شہزادوں کا خونی کھلی پولی کے مقام پر دروازہ پر لٹکایا جانا۔ کھلی پولی کے مقام پر ٹوانوں اور نونوں وغیرہ کی مصطفیٰ کمال کے خلاف نبرد آزمائی کرنا۔ قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کو گھسیٹنا، سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بغداد پر گولہ باری کرنا اور غلاف کعبہ کا جلانا۔ حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا۔ مہدی سوڈانی کا خرطوم میں سولی پانا وغیرہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ اور انگریز کی ریشہ دوانیوں سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرتا ہوں۔ اگر واقعی تمہارے نزدیک میرا یہ جرم باعث گرفت ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ایسے جرم کے ارتکاب میں

ایمان کی سلامتی اور دین کا استحکام پاتا ہوں۔ پھر کیا تھا۔ بخاری زندہ باد کے نعروں سے بہاول پور کا طول و عرض گونج اٹھا۔ اور پیر و جوان کے دل ان کی صداقت پر ریجھ گئے۔ حضرت امیر شریعت کی بے لوث خدمت اور دین کی دردمندی کا علم نواب صاحب بہاول پور کے چچا حاجی بلخ شیر کو ہوا تو انہوں نے اس بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہ نواب صاحب پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ آپ کو اپنے یہاں تبلیغ کے لئے دعوت دی۔ جو منظور کر لی گئی۔ حاجی بلخ شیر مرحوم کے مکان کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ جہاں ان دنوں بغیر اجازت داخلہ ممنوع ہوا کرتا تھا۔ لیکن حضرت امیر شریعت کی تشریف آوری پر یہ پابندی اٹھا دی گئی۔ لوگوں نے نہایت خلوص و محبت کے ساتھ یہاں پر بھی اپنے خطیب کا استقبال کیا۔ رات کے سناٹے میں جب امیر شریعت کی قرأت قرآن نے پھول بکھیرنے شروع کئے اور لحن داؤدی اپنی پوری جولانی پر آیا تو ستاروں نے بھی جھک جھک کر سلام کیا۔ فضائے آسماں کا ذرہ ذرہ رقص کرتا ہوا نظر آنے لگا۔ آپ نے نہایت جرأت مندانہ انداز کے ساتھ امراء کے عیش پسندانہ ٹھاٹھ و رویہ پر تنقید کی اور غرباء پر ان کے ظلم و ستم کا شکوہ کرتے ہوئے اس زندگی کا خاکہ کھینچا جو اس دنیا کے چھوڑ جاتے ہی ہر انسان پر وارد ہوتی ہے۔ پھر کیا تھا ہر کسی کے چہرے پر ندامت و تاسف کے آنسو جاری تھے اور بے ثباتی دنیا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا تھا۔ دلوں پر ایسی کاری ضرب لگ چکی تھی کہ ہائے اور وائے کے سوا کوئی جملہ زبان پر آتا ہی نہ تھا۔ اس تقریر میں توحید باری تعالیٰ، توصیف رسالت و ختم نبوت اور اصلاح معاشرہ پر بہت زور دیا گیا۔ حقوق العباد کا لحاظ اور اس کی تلفی پر نقصان و گرفت کا اندیشہ راعی و رعایا کے تعلقات پر سیر حاصل تبصرہ غرض کہ تبلیغ حقہ کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ رات کے آخری حصہ تک تقریر جاری رہی لیکن کسی کی آنکھ پر نیند کے خمار کا اثر نہ پایا گیا۔

جن لوگوں نے امیر شریعت کے جمال صورت کو دیکھا اور ان کی تقاریر کو سنا ہے وہ اس سے متفق ہوں گے کہ جب وہ سٹیج پر جلوہ فرما ہوتے اور خطابت اختیار کرتے تو ہزاروں کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوتا جو اپنے دل و دماغ کو کسی دوسری طرف منعطف کر سکتا۔ خطابت کے دوران وہ جلال و جمال کا مرقع بن جاتے ان کا چہرہ آفتاب کی مانند چمک اٹھتا۔ جو ہزاروں انسانوں پر اپنی دلربائی کی کمند ڈال دیا کرتا تھا۔

ان کی مسکراہٹ محزون و غمناک دلوں کے لئے مسرتوں کا پیغام بن جاتی اور وہ جس طرف نگاہ پر لطف اٹھا کر دیکھ لیتے وہاں بہاروں کے سامان جمع ہو جاتے۔

وہ مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
دیکھا نظر اٹھا کے تو گلشن بنا دیا

بقول مولانا ابوالکلام آزاد کہ "کمال مرتبہ حسن اور خوبروئی یہ ہے کہ صرف دوستوں ہی کی نظریں نہ اٹھتی ہوں بلکہ ایک عیب چیں دشمن بھی دیکھے تو بے اختیار ہو کر پکار اٹھے کہ دل ستاں صورتیں اور صبر آزما چتونیں ایسی ہوتی ہیں۔" چنانچہ ہمارے دلربا خطیب کی شخصیت میں بھی دل ستانی کے تمام سلیقے موجود تھے۔ سکندر وزارت کے عہد میں آپ راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں قید کر دیئے گئے۔ جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ کرنل ہاورڈ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ باوجودیکہ اسے یہ علم تھا کہ امیر شریعت ہمارا کٹر دشمن ہے۔ لیکن وہ آپ

کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ کو بیڈمنٹن کھیلنے پر آمادہ کیا اور جب تک آپ جیل میں رہے اس کے ساتھ ہر شام بیڈمنٹن کھیلتے رہے۔ اس انگریز نے ایک کتاب "ہندوستان کی یاد میں" مرتب کی ہے جس میں وہ امیر شریعت کے بارے میں قلم طراز ہے۔

"جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا ان میں عطا اللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دلفریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنہیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں۔

میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں اس کا بڑا سبب غالباً یہ

تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اس اینٹی برٹش ذہن کی باقیات میں سے تھا جنہیں ہمارے پیشروؤں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا"

کسی کی دلفریب اداؤں کا جائزہ لیا ہو تو ان سے پوچھیئے جو ہمیشہ تنقیدی نگاہ سے دیکھتے رہے ہوں۔ اور اس کی خوبیوں اور محاسن کا اپنی تہذیب و تمدن کے ساتھ مقابلہ کرتے گزر گئی ہو۔ انگریز کی تنگ نظری او ربے انصافی کو کون نہیں جانتا کہ ہوس سلطنت کی خاطر وہ ہر اچھائی سے منہ پھیر لیتا رہا۔ لیکن حضرت امیر شریعت کے محاسن سیرت و صورت کے سامنے وہ بھی تسلیم و رضا کے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور اور آپ کے حسن کا گھائل ہو گیا تھا۔

صحن چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے۔

حضرت امیر شریعت کی طبیعت کا یہ

خاصہ تھا کہ جب بھی آپ جیل کی چار دیواری سے باہر قدم رکھتے تو ان کا جذبہ حریت اور چمک اٹھتا وہ احباب کے جھرمٹ میں نہایت خندہ جبیں نظر آتے اور اپنے ارادوں کی تکمیل کو پھر کمر باندھ لیتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مایوسی گناہ تھی اور بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا خوف و ہراس محرومی ایمان کا سبب تھا۔ وہ باطل کے خلاف ہر طرح کی جنگ لڑنے کو اسلامی شعار بتلاتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے کہ مومن وارث کائنات ہوا کرتا ہے۔ [1]

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

مملکت پاکستان کے قیام کے بعد مرزائیت نے اپنی تبلیغی کارروائیاں تیز کر دی تھیں۔ امیر شریعت اور ان کے رفقاء نے اس پر محاسبہ کیا تو تحریک ختم تحفظ نبوت کی پاداش میں ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں گرفتار کر لئے گئے۔ ایک سال بعد لاہور ہائیکورٹ نے مرافعہ دائر کرنے پر چھوڑ دیا۔ مئی ۱۹۵۶ء میں آپ کو ملتان کے حدود میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ عمر کے اس آخری حصہ میں امیر شریعت کی قید و

ہند مسلمان حکومت کے دور کی پیداوار تھی۔ جس پر ان کے تاثرات کی ترجمانی اس شعر سے ہو سکتی ہے۔

دوستوں سے اسقدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کے ساتھ اگر مرزائیت کے چہرے پر سے پردہ نہ اٹھایا جائے تو بہت سی ایسی حقیقتیں واضح نہ ہو سکیں گی جن کا تعلق دین کے اصول سے ہے۔ اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے کہ جماعت احرار دیگر مسلمان مرزائیت کے خلاف کن وجوہات کی بناء پر تھے۔

مسلمانوں اور مرزائیوں کا باہمی نزاع اس وقت شروع ہوا جب ۱۸۸۰ء میں مرزا غلام احمد نے ملہم من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور پھر یکم دسمبر ۱۸۸۸ء کو یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ اس پر بھی انہیں اپنی تکمیل کار نظر نہ آئی تو پھر ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا نعرہ بلند کیا اور ظلی نبی کی اصطلاح ایجاد کی۔ اس دعویٰ کے باوجود بھی تسکین خاطر نہ ہوئی تو نومبر ۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں انہیں یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں مثیل کرشن بھی ہوں۔ اور ہر مذہب کے لئے اوتار بھی۔ دعویٰ نبوت سے پہلے مرزا صاحب عیسائی مشنریوں سے مناظرہ کرنے کے لئے جاتے تو ان کے ساتھ مولوی محمد حسین بٹالوی بھی ہوتے گویا مرزا صاحب سے پہلے کسی کو کوئی تعرض نہ تھا۔ جب انہوں نے خاتم النبیین کی نبوت پر ہاتھ صاف کرنے کی ٹھانی اور اپنے ملہم من اللہ ہونے کے زعم میں مبتلا ہوئے تو وہ لوگ بھی ان سے علیحدہ ہو گئے جو پہلے ان کے ساتھ شریک مناظرہ عیسائیت وغیرہ ہوتے تھے۔ اور مسلمانوں میں ان کے اس دعویٰ نے ہیجان کا عالم پیدا کر دیا۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن خاتم النبیین کی مہر کے توڑنے والے کو کیونکر گوارا کرتے۔ مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت مسلمانوں کے ایمان پر پتھر کے مترادف تھا۔ ہر طبقہ کا مسلمان برا فروختہ ہو گیا۔ جوابی کارروائی میں علماء کے فتوے چھپنے لگے۔ سب سے پہلے ۱۸۹۰ء میں لدھیانہ کے علماء نے فتویٰ دیا جن میں مولانا محمد عبداللہ اور مولانا عبدالعزیز مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی پیش پیش تھے۔ پھر آگرہ حیدر آباد اور بنگال کے علماء نے بھی مرزا صاحب کے خلاف فتوے صادر کئے۔ اس طرح سے مرزا صاحب کی نبوت و مہدویت نزاع کا باعث بن گئی۔ لیکن یہ نزاع ابھی تک عام سطح پر نہیں آیا تھا کہ عوام بھی اس سے باخبر ہوشیار ہو جاتے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم مدیر زمیندار اخبار نے اس ضمن میں زور دار مقالے اور نظمیں لکھیں۔ گویا تقریر و تحریر کا کوئی ایسا پہلو نہ تھا جو انہوں نے مرزائیت کو بے نقاب کرنے میں استعمال نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ "ارمغان قادیان" کتاب لکھ کر انہوں نے مرزائیت کے خلاف مستقل مواد چھوڑا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کی پیدا کی ہوئی عوامی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ سیاسی و دینی حلقوں نے بھی مرزائیت کے خلاف جدوجہد کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ چودھری افضل حق مرحوم جو جماعت احرار کے روح رواں اور مخلص ترین رکن تھے۔ نے اپنے احرار رفقاء کو مرزائیت کے خلاف آمادہ پیکار کیا۔ حضرت امیر شریعت پہلے ہی سے شان رسالت پر جان نچھاور کرنا جانتے تھے۔ اور ان کا خلاصۂ ایمان بھی یہی تھا کہ عصمت نبی کے تحفظ پر جان کی بازی لگا دینا ہزار سالہ عبادت سے افضل ہے۔ میدان محاربہ میں نکل آئے اور مرزائیت کے تار و پود بکھیرنے لگے۔ ملک کے

چپہ چپہ میں پھرے اور مرزائیت کی اس حقیقت کو بے نقاب کیا۔ جو اصول اسلام کے منافی اور تضاد میں تھی۔ اور یہ بھی ثابت کیا کہ مرزا صاحب کی نبوت حکومت برطانیہ کی مرہون منت ہے۔ اور مرزائی برٹش امپریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔ کیونکہ مرزا غلام احمد کتاب ابریہ کے حاشیہ میں خود لکھتے ہیں۔

"میرے والد کو انگریزی حکام نے خوشنودی مزاج کی چٹھیاں دی تھیں۔ سر لیپل گریفن نے اپنی کتاب رئیسان پنجاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے"

ملاحظہ ہو ریویو آف ریلیجز صفحہ نمبر ۲۱۹ بابت جون جلد ۵ نمبر ۶

امیر شریعت اکثر فرمایا کرتے کہ نبوت کا صحیح معیار معلوم کرنا ہو تو اس کے خاندان کے کوائف پر غور کر لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ نبوت کے لے جو گھرانا چنا جاتا ہے وہ بھی اسی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جن سے اس کی امتیازی حیثیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ تملق اور غلامانہ ذہنیت سے بالکل مبرا ہوتا ہے۔ لیکن مرزا صاحب کے خاندانی حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کے بزرگوں نے ہمیشہ حکومت وقت کی اطاعت و غلامی میں اپنی زندگیاں بسر کیں۔ عطا محمد مرزا صاحب کے دادا اور ان کا والد گل محمد رام گڑھیہ اور کھنیا سکھ جماعتوں سے لڑتے رہے عطا محمد اپنی جائید اد کھو کر سردار فتح سنگھ اہلووالیاں کی پناہ میں بیگووال چلا گیا جہاں بارہ سال تک مقیم رہا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا محمد کی وفات پر اس کے بیٹے غلام مرتضیٰ اور مرزا غلام احمد کو واپس بلا کر جدی جاگیر کا بہت حصہ واپس دے دیا۔ جب پنجاب کا انگریزوں سے الحاق ہو گیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ لیکن غلام مرتضی اور اس کے بھائیوں کو سات سو روپے بطور پنشن ملتے رہے۔

جب انگریز ملک پر مسلط ہو گیا تو مرزا صاحب کے خاندان نے ان سے بھی اطاعت کا رشتہ قائم کر لیا اور ۱۸۵۷ء کے دوران نہایت وفادارانہ خدمات انجام دیں۔ مرزا غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کئے۔ اس کا بیٹا غلام قادر جو مرزا غلام احمد کا بھائی تھا اس وقت جنرل نکلسن کی فوج میں تھا۔ اس نے ۴۶ نیو انفنٹری سیالکوٹ کے باغیوں کو تہہ تیغ کیا۔ جنرل نکلسن نے غلام قادر کو ایک سند عطا کی جس میں یہ لکھا تھا کہ "ان کا خاندان قادیان ضلع گورداسپور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا ہے" یہ سب واقعات سر لیپل گریفین نے اپنی کتاب رئیسان پنجاب میں لکھے ہیں۔

امیر شریعت ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میں ان حالات کی روشنی میں کہتا ہوں کہ مرزا صاحب کی نبوت انگریز کی مرہون کرم ہے۔ اور یہ اس کا خود کاشتہ پودا ہے۔ جو مسلمانوں میں تفریق پیدا کرانے کے لئے کاشت کیا گیا تھا۔ تاکہ ملک کی وحدت فکر پارہ پارہ ہو کر مفلوج بن جائے۔ اس لئے ہم یہ عزم لے کر اٹھے ہیں کہ ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ لیکن کسی باطل مدعی نبوت کے افکار کو ملک میں نہ پھیلنے دیں گے۔ اور ہم ہر اس حکومت کا مقابلہ کرنے کو بھی تیار رہیں گے جو مرزائیت کے نظریات کو پھیلانے کی روادار ہو گی۔

امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ نے ہمیشہ اس ایمان افروز جذبے کے ساتھ مرزائیت کے استیصال پر کمر

باندھ رکھی تھی۔ وہ ہر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لیکن مرزائیت کے خلاف ان کی جدوجہد اس وقت بھی قائم رہی جبکہ وہ ذیابیطس و فالج جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ علالت کے ایام میں جن حضرات کو شرف دیدار میسر آیا اُن سے فرماتے کہ "اعضاء جواب دے رہے ہیں تمام وجود باغی بن گیا ہے میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں۔ اب یہ انتقام پر اتر آیا ہے۔ کچھ توشہ آخرت پاس نہیں البتہ ایک چیز پر فلاح آخرت کی امید رکھتا ہوں وہ یہ کہ تمام عمر عصمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ پر صرف کر دی ہے۔ وہ یقیناً موجب نجات اور وجہ عافیت دارین ثابت ہو گی۔

امیر شریعت کی پذیرائی بارگاہ نبوت میں یقینی ہے۔ کیونکہ امیر شریعت کی زندگی کا ہر پہلو احیائے دین و سنت کا آئینہ دار تھا ان کے افعال و اقوال کا کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جو اسلام کے جذبہ سے بھرپور نہ ہو۔ وہ کفر کی طاغوتی طاقت سے نبرد آزما رہا تو دین کی خاطر اور حکومت وقت کا باغی کہلایا تو دین کے لئے۔ اس نے اپنی تمام عمر کو مشکلات کے حوالے کیا تو دین ہی کی غرض سے۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بوجھل بیڑیاں گوارا کیں تو دین ہی کی عظمت کے لئے۔ باطل سے لڑا اور اپنوں سے بگڑا تو صرف دین کی خاطر اس نے راحت و آسائش کے تمام شعبے موقوف کر دیئے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر قربان ہوتا رہا۔ اور وہ آخر دم تک عشق کی اس گرمی میں مست و بیخود رہا۔ تو کیا اس ایثار و قربانی کو اس کے حضور پذیرائی کا کوئی درجہ نہیں ہو گا۔ کیا اس کی رحمت اپنے والہ و شیدا کے لئے مقرر نہ ہو گی۔ کیا اس کی مخلصانہ جدوجہد کا کوئی صلہ نہیں ہو گا۔

یقیناً ہو گا وہاں بے انصافی کو راہ نہیں ہے۔ وہاں وابستگان پر رحمت و کرم کی نظر فرمائی جاتی ہے۔ اور خلقت قرب کی نعمتوں سے سرفراز فرما کر اس کے ذکر کو یہ عظمت دی جاتی ہے کہ دوست و دشمن اس کے محاسن کے قائل اور اس کے کردار کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ بہت سی یادیں ایسی ہیں جو موت کے ساتھ دفن ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر جنہیں اس کی مشیت میں زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ مرور زمانہ کے باوجود بھی زندہ رہتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرنے کے باوجود بھی مرنے والا زندہ ہے۔ بظاہر اس وقت امیر شریعت ہم میں نہیں ہیں۔ اور عرصہ ہوا ان کی آواز کے رسیلا پن سے ہمارے کان محروم ہیں۔ اور نگاہ جستجو بہزار سعی و تردد کے انہیں تلاش نہیں کر سکتی۔ لیکن دل کی گہرائیوں اور دماغ کے بالا خانوں پر ان کا قیام ابھی تک ہے۔ وہ نظر نہیں آتے لیکن ان کی رنگینی طبیعت اور پاکیزگی فطرت آج بھی ہماری محافل کو رنگین بنا رہی ہے۔

شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

بزرگان دین کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں دین میں مقبولیت کا درجہ دیا جاتا ہے اور ان کے ذریعہ سے توحید و رسالت کی تبلیغ کا کام لیا جاتا ہے تو وہ حب مال اور منصب وجاہت کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہیں۔ وہ بظاہر دنیا کے مشہور ترین انسانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کی اندرونی زندگی فقر و غنا سے اس قدر مملو ہوتی ۔ ہے کہ کوئی اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔

امیر شریعت کی زندگی پر جب غور کیا جاتا ہے اور حالات کے خاکے مرتب ہوتے ہیں تو ہمیں ان میں بھی فقر کی شان اور غنا کی آن معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے سامان دنیا کو کبھی اپنی راحت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کسی سے کچھ لینے کے روادار نہ ہوئے۔ کسی کے ہاں دست سوال دراز نہ کیا۔ فاقوں پہ فاقے ہوئے تو چہرے کی مسکراہٹ اور پیشانی کی تابانی میں فرق نہ آیا۔

متعلقین سے مروت کا ہاتھ کبھی نہ کھینچا۔ جو کچھ موجود ہوتا آگے رکھ دیتے ہمارے دوست اختر الہ آبادی بتلاتے ہیں کہ "میری ہمیشہ چائے سے

ضیافت فرماتے۔ ایک دفعہ چائے لائی گئی تو بجائے شکر کے نمک استعمال ہوا۔ میں نے ظرافتاً کہا شاہ جی میں تو پہلے ہی نمک خوار ہوں۔ فرمایا۔ بابو یہ بات نہیں۔ ہفتہ بھر سے گھر میں شکر نہیں ہے۔ اس لئے بلاتکلف نمک استعمال کر رہا ہوں۔ اور دوستوں کو بھی نمکین مزہ سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ پھر نمکینی اور حلاوت پر بات چھڑ گئی تو فارسی اور اردو کے اشعار کے دفتر کے دفتر لگ گئے۔ اور چائے کا ہر گھونٹ نمکینیت میں حلاوت کا ایسا مزہ بن گیا کہ اس کے سرور سے آج بھی روح کو کیف و خمار کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔ اور ساقی کے چل دینے پر بھی وہ تمام لذتیں باقی ہیں جو ان کے ہوتے ملتی تھیں۔"

اگرچہ میکدے سے اٹھ کر چل دیا ساقی
وہ مے وہ خم وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اللہ اللہ شہرت کا یہ عالم کہ چار دانگ عالم میں دھاک بیٹھ گئی ہو۔ لوگ راہوں پر یوں منتظر کھڑے ہیں جیسے ان کا محبوب ان کے خراب آباد کو اپنی تشریف آرزانی سے آباد کر رہا ہو۔ اور ہر دل سے یہ صدا آرہی ہو۔

بہ تشریف قدوم خود زمانے
مشرف کن خراب آباد مارا

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ امارت کی سب راہیں مسدود دولت کے سب دروازے بند تقلید اسلاف میں نان جویں پر گزارا۔ اس پر طرفہ فضیلت یہ کہ ہر سانس میں اطمینان و سکون کی بشارت اصل بات اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن نفوس قدسیہ کو اپنی مودت میں چن لیتے ہیں۔ انہیں طمانیت قلب عطا فرما کر رغبت دنیا سے بے نیاز کر دیا کرتے ہیں۔ اور اس کی توقیر میں لوگوں کے قلوب کو مسخر کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی عظمت اور وجاہت کے سامنے کسی کو مجال انکار نہ ہو۔ دیکھنے والے حضرات ابھی اس دنیا میں باقی ہیں کہ انھوں نے امیر شریعت کے سامنے دوست دشمن کو سرنگوں ہوتے دیکھا ہے۔ اور ان کی دلبری کے گیت گاتے سنا ہے۔

عامتہ الناس سے لیکر عارفین و کاملین تک امیر شریعت کو مقبولیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ ہر ایک کے عزیز اور محبوب تھے۔ اور ہر انسان کے دل میں ان کی محبت تھی۔ لوگ ان کی راہوں پر آنکھیں بچھاتے اور ان کی اداؤں پر دل نچھاور کرتے تھے۔

بیسیوں حضرات کا مشاہدہ ہے کہ سراج السالکین حضرت خلیفہ غلام محمد قدس سرہ العزیز دین پوری کی

خدمت میں جب حضرت امیر شریعت نے حاضری دی تو حضرت خلیفہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی تعظیم میں باوجود ضعف پیری کے بھی سروقد کھڑے ہوگئے اور امیر شریعت کو اپنی دعاؤں و نوازشات خصوصی کا مستحق جانا۔ ایک صاحب ولایت و منبع روحانیت کا امیر شریعت سے اس طرح کا سلوک کرنا اور ان کو دل سے چاہنے کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نظر نہیں آتا کہ حضرت دین پوری رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ معرفت نے ان کی خصوصیات خفی و جلی کو پہچان لیا تھا۔ جس انسان پر عارفین و کاملین کی نظر انتخاب پڑ گئی ہو وہ لاریب امتیازی حیثیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ یہی بات تھی کہ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کامل یقین کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا فضل ہے کہ میری آنکھ کبھی میلی نہیں ہوئی۔ دنیا بھر کی بہو بیٹیاں میری بیٹیاں ہیں۔ میری فطرت سے کسی کی عصمت کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اور نہ ہی مجھ سے خیانت کا ارتکاب ہوا اور نہ ہی میرے ہاتھ سے کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہے۔

امیر شریعت کے اس بیان کی صداقت محقق ہے کیونکہ آج تک موافق و مخالف نے ان کے اس دعویٰ کی تکذیب نہیں کی۔ اور نہ ہی کوئی کر سکتا ہے۔ جس کا دامن طہارت و پاکی کے پانی سے دھلا ہوا ہو اس پر اتہام و الزام کے دھبے کیونکر ہوں اور کسی کو یہ جرأت کیوں ملے کہ وہ آب زمزم کو بدذائقہ اور بدبودار پانی سے تشبیہ دے۔

امیر شریعت کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر قرینہ ان کی پاکیزگی فطرت کا آئینہ دار ہے۔ وہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں ایک پاکباز اور پاک نفس انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی ہمہ گیری اور دلجوئی کا یہ عالم تھا کہ آج تک ہر مقرر و خطیب انہیں کے طرز خطابت کے نقوش کو اجاگر کئے پھرتا ہے۔ اور اپنے تعلق کو ان کے آستان سے وابستہ کرنا اپنی عزت سمجھتا ہے۔ آج کی انجمنیں ان ہی کے سوز عمل کا پر تو اور انہی کے کارہائے نمایاں کا عکسِ جمیل ہیں۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہرکجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

ہم اس موقعہ پر اس حقیقت کے اظہار سے بھی خاموش نہیں رہ سکتے کہ امیر شریعت کے ساتھ جن لوگوں کو خصوصی تعلق تھا اور وہ ان ہی کی بدولت پھلے پھولے اور مشہور عالم ہوئے افسوس کہ آج ان میں سے بعض کا مزاج انکسار و اخوت کے جذبہ سے محروم ہو کر رہ گیا ہے وہ امیر شریعت کی ساری تعلیم بھول گئے ہیں اور ان کے اطوار مخلصانہ کو انہوں نے گلدستہ طاق نسیاں بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ حضرت امیر شریعت کے باقیات صالحات اولاد سے بھی کنارہ کشی اختیار فرماتے ہیں۔ حالانکہ وہی اولاد ہے جن سے بخاری کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کا احسان یہ ہے کہ ان کی اولاد میں اپنے اسلاف کے مقام کو محفوظ رکھنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا احساس ہے۔ ہم دلیل کے طور پر ان کے فرزند جلیل فاضل روزگار حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ کو پیش کرنے میں کسی طرح کا تردد محسوس نہیں کرتے وہ اپنے والد محترم کی روایات کو زندہ رکھنے اور ان پر عمل پیرا رہنے کی سعی میں رہتے ہیں۔ اللہ کرے ریاض امیر شریعت کے یہ پھول ہمیشہ

شگفتہ رہیں۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حضرت امیر شریعت کی خطابت شخصیت اخلاق و عادات سے متعلق تھا اور ان کی مجاہدانہ زندگی کے چند ایسے خاکے تھے جو برعظیم پاک و ہند کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب ہم ان کے اس پاکیزہ فکر اور ذوق طبیعت کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے نہاں خانۂ دل سے نکل کر شاعری کے روپ میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا:

ان من الشعر لحکمۃً وان من البیان لسحراً

بعض اشعار حکمت سے مملو ہوتے ہیں اور بعض خطابت جادوگری کا کام کرتی ہے۔

حضرت امیر شریعت کی خطابت کی جادوگری تو مسلمہ ہے۔ لیکن جب ہم ان کی شاعری پر غور کرتے ہیں تو وہ بھی حکمت کے موتی بکھیرنے میں کسی سے کم نہیں ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہیں خطابت کاملہ کے ساتھ شاعری کا ملکہ بھی ودیت کیا گیا ہو۔ اور یہ دونوں چیزیں یکجا جمع ہوئی ہوں۔ امیر شریعت کی سخن فہمی اور رغبت ادب کا علم تو ہر کسی کو تھا۔ لیکن بحیثیت ایک شاعر کے انہیں بہت کم لوگ جانتے تھے حتیٰ کہ یہ راز بعض مقربین سے بھی مخفی تھا۔

جب ان کے فاضل فرزند و جانشین سید ابوذر بخاری مدظلہ نے انکا مجموعہ کلام سواطع الالہام کے نام سے شائع کیا تو معلوم ہوا کہ امیر شریعت کی زندگی ابتداً اس طرف راغب تھی گھریلو تعلیم کے ادبی ماحول نے انہیں مجبورِ سخن گوئی کر دیا تھا انہوں نے اصلاح کلام کی خاطر میر سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم سے رجوع کیا اور مشقِ سخن جاری رکھی۔ موزونیٔ طبع نے شاعری کے ملکہ پر گل بوٹے لگائے۔ آپ کے دل کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن کر نکلیں۔ جنہیں مولانا محمد دین غریب مرحوم امرتسری نے علم و ادب کے صحیح زاویہ کے مطابق ترتیب دیا۔ یعنی بحیثیت استاد فن کے انہیں دیکھا اور پرکھا۔ لیکن امیر شریعت کا یہ ذوق جلوہ آرائیوں سے اس لئے محروم رہا کہ قدرت نے انہیں درحقیقت خطابت قوم کے لئے تیار کیا تھا۔ شاعری کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ البتہ بعض دفعہ شاعری کو یہ عزت ضرور ملی ہے کہ اسے کسی کے اچھے دامن سے وابستہ ہونے کا موقعہ میسر آیا ہے۔ یہی حال امیر شریعت کی شاعری کا بھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے شاعری کو نہیں چنا بلکہ شاعری نے انہیں اپنے لئے منتخب کیا ہے کیونکہ کلام کی بلندی، پاکیزگی اور ترکیب محاورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری ہی کو معراج ترقی کی عزت بخشی ہے کسی کے کلام سے اس کے عقیدہ و حالات اور کوائف کا پتہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے نظریات فطرت کا علم ہوتا ہے اور اس کی طبنت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

امیر شریعت کے کلام سے بھی ہم ان کے حالات عقائد اور گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیں گے۔ تا کہ ان کی شخصیت کے بعض پنہاں پہلو بھی واضح ہو سکیں۔

تصوف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کسی کا کمال تسلیم کرنے میں اس کے عقیدہ و تصرف پر غور

کرتے ہیں کہ وہ اس منزل میں کس حد تک تحقیقی راستہ طے کر چکا ہے۔ امیر شریعت کا حال ان کے تصوف میں ان کے اِس شعر سے معلوم کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ انہوں نے وحدت وجود جیسے مشکل مسئلہ کو نہایت صاف ستھرے انداز میں واضح کیا ہے۔

وحدت بوجد و حالت کثرت در آمدہ
حرکت بجلوہ۔ جلوہ بحرکت در آمدہ

اسی مفہوم کو اور زیادہ صاف کر کے فرمایا

ذروں سے تا بہ مہر ستاروں سے تا چمن
عکس جمال یار کی تابندگی ہے دوست

وحدت وجود کا نظریہ بیان کرتے ہوئے امیر شریعت نے نہ تو روش منصور رحمتہ اللہ علیہ اختیار فرمائی ہے اور نہ ہی جاہلانہ وحدت وجود کی بنیاد رکھی ہے۔ بلکہ اس نازک ترین مسئلہ کو ہر طرح کی منطقی و لفظی آلائش سے پاک رکھا ہے تاکہ طریقت و شریعت میں ٹکراؤ نہ پیدا ہو اور مفاد و منفعت کے بجائے خسارہ و نقصان کا شکار نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ اس راہ کی دشواریاں بڑے بڑے صاحب عظمت بزرگوں کے پائے ہمت کے لئے تزلزل کا باعث بنی ہیں۔

درحقیقت یہ مسئلہ اظہار و بیان کا نہیں بلکہ عمل و محنت کا ہے اور وہ بھی کسی کامل کی دستگیری کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ یہاں ہوش و خرد کی دنیا سے بات نہیں ہوتی بلکہ وارفتگی اور ذوق کا عمل و مخلصانہ جذبات کام آتے ہیں اور عشق کی جولانیاں راہ نورد منزل بن جایا کرتی ہیں۔

حضرت امیر شریعت چونکہ ان کٹھن منازل کو طے کر چکے تھے اس لئے اس موضوع پر انہوں نے جو کچھ کہا وہ ان کے مشاہدہ کی بات ہے اور وہ صحیح طور رخ جاناں کی تصویر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مسلمان کی عقیدت و ارادت کا اگر کوئی گوشہ یا وجود اس دنیا میں باقی ہے تو وہ صرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس و مطہر ہے جس کے ذریعہ سے انسان کو اپنی حقیقت کا علم ہوا اور مقام ربوبیّت کی شناسائی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس وجود گرامی کی تشریف آوری ان ہی تقاضوں کے سبب تھی۔ اسے تزکیہ نفوس کی ایسی قدرت ملی کہ انسان کی ضلالتیں رفع ہو کر رہ گئیں۔ اور راہ حق کی راہنمائی ہونے لگی۔ اس لئے ایسی ذات مقدس سے نسبت ارادت قائم کرنے اور وابستگی رکھنے کے لئے بھی ادب جمیل اور ہوش کامل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہاں پر تھوڑی سی لغزش گرفت و عتاب کا سبب بن جاتی ہے اور پھر عمر بھر کے لئے رسوائی و ذلت نامرادی و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے عارف رومی نے فرمایا تھا

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

اس ادب کو یوں تو ہر مسلمان ملحوظ رکھتا ہے لیکن جن لوگوں کو عشق کی خصوصی گرمی اور نعمت ملی ہے وہ اس منزل میں رہنے پہ اس قدر محاسبہ کرتے ہیں کہ حضور رسالت میں انہیں حواس کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ عقل و خرد کی تمام قوتیں مسلوب و عاجز ہو کر رہ جاتی ہیں ان کے قلوب کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی

ہیں اور ان کے رگ و پے میں احساس کی یہ آواز آنے لگتی ہے۔

عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ

ہم جب امیر شریعت کی ان نعتوں پر غور کرتے ہیں جو انہوں نے بارگاہ رسالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے تو ہمارا ذہن ان نفوس قدسیہ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ امیر شریعت بھی جناب رسالت میں اسی ادب و احترام کے پابند ہیں جو عارفین و کاملین کی زندگی کا خاصہ ہے اور جس کی بناء پر وہ بارگاہ نبوت میں شرف پذیرائی کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ آپ کی نعتوں کا انداز متقدمین کے انداز بیان و عقیدت سے اس قدر ملتا ہے کہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نعت پر غور کیجئے کہ کس قدر متقدمین کے طرز کلام سے ملتی جلتی ہے۔

لولاک ذرۂ زجہان محمد است
سبحان من براہ چہ شان محمد است

جب دل کی گہرائیوں میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نقش دوام کی حیثیت اختیار کرتی ہے تو پھر روحانیت کی جلوہ پاشیاں بھی اسے اپنا مسکن بناتی ہیں۔ اس عالم میں جب کوئی وارفتہ محبت اپنے محبوب اور مقصود حیات کے اوصاف میں کچھ کہتا ہے تو اس کا بیان مشاہدۂ جمال یار سے خالی نہیں ہوتا۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے دید کی لذتوں سے سرشار ہو کر کہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں امیر شریعت کی ایک نظم جہاں ان کی الوہیت و عقیدت کے مقام کو نمایاں کرتی ہے وہاں ان کے اپنے مرتبہ کا بھی پتہ دے جاتی ہے۔ جس کا مطلع ہے کہ

ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش
جنوں ز سایہ زلف سیاہ می چکدش

امیر شریعت کی اس نعت سے ان کے ظرف بلند کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کس قدر جمال رسالت کے فریفتہ تھے۔

پچھلے اوراق میں ان کی پاک دامنی پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے نہ کہ افسانہ لیکن انہوں نے ذیل کے اشعار میں اپنی تر دامنی کا جس طرح سے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بندگی کو متاع حقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن کسی کے کرشمہ ناز اور نوازشہائے بے پایاں پر اس قدر بھروسہ ہے کہ یقین کامل کے ساتھ یہ پکار اٹھتے ہیں۔

نازنینان جہاں ناز فراموش شدند
کہ گدائے تو باانداز دگر می نازد
ناز دارد بہ در افشانیٔ خود ابر بہار
دردمند تو بنا سوزِ جگر می نازد
پارسایان ہمہ نازند بہ زہد و طاعت
یک ندیم است کہ بر دامن تر می نازد

مقطع کے شعر میں بَرَدامنِ تمنّا نازد سے حضرت ندیم کے اعتماد و یقین کی کئی داستانیں مرتب ہو سکتی ہیں اور بلا کسی خوف تردید کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی تر دامنی ہی کو مایہ پذیرائی بنایا ہے۔ تاکہ غرور زہد و نخوت اتقا کے حملہ و غلبہ سے صلاحیت فطرت غارت نہ ہو سکے۔ ایسی تر دامنی پر ہزار ہا تقویٰ و طہارت قربان ہوں جس کے ہوتے ہوئے منزل مراد حاصل ہو۔ کسی بدمست نے کیا خوب کہا ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اسی تر دامن مرد کامل کی بے نیازی کا عالم ملاحظہ کیجئے۔ کہ خوان شاہی کے مقابلہ میں اپنی نان جویں پر کس قدر نازاں ہیں اور سایہ قد یار میں لمحہ بھر کی زندگی کو چتر شاہی سے ترجیح دیکر کس قدر فخر محسوس کرتے ہیں۔ انکا یار محبوب اور مقصود حیات کیسا حسن و خوبی کا سراپا ہو گا کہ حضرت ندیم دنیا کی ہر آسائش و راحت اور اعزاز کو اس کے مقابل ہیچ جانتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواز شہائے جاناں نے امیر شریعت کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس لئے وہ منت کش غیر نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی کا وقار و دبدبہ انہیں مرعوب کر سکتا ہے۔ فرمایا۔

یک نان جویں ز خوان شاہی خوشتر
از چنگ و رباب آہ صبحگاہی خوشتر
از تیر نگاہ زخم کاری دارم
خون جگرم زمرغ و ماہی خوشتر
یک لحظہ بزیر سایہ قد یار
واللہ۔ زہزار چتر شاہی خوشتر

دیکھا شیخ تر دامن جب مستی میں آئے تو دعوی تر دامنی بھول گئے اور اپنی آہ صبحگاہی کا اقرار و اعتراف کرنے لگے۔ جو ان کی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔ مقام پارسائی چھپانے سے نہیں چھپتا۔ عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید لوگ الزام تراشی کے دلدادہ ہیں وہ کسی کو رسوا اور بدنام کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے نفس میں بد اطور کو تسکین اسی عمل سے ملتی ہے۔ ایک دور ایسا آیا کہ امیر شریعت کو وہابی، گستاخ، اور منکر ولایت کے الزام کا ہدف بنایا گیا اور ہمہوں قسم ایسے ایسے الزام تراشے گئے کہ جن کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ آپ ظلالت کے اس دور میں بھی نہایت پامردی کے ساتھ خدمت دین انجام دیتے رہے۔ ہر صاحب و ولایت ان کے نزدیک واجب احترام اور لائق پیروی رہا۔ انہوں نے ہر سلسلہ کے بزرگ سے ارادت و عقیدت کے راستے تلاش کئے اور ان کے کمال عرفان کے گیت گانے لگے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم ان کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو انہوں نے چشتیہ سلسلہ کے ایک کامل بزرگ صاحب ولایت حضرت خواجہ غلام فرید چاچڑوی رحمتہ اللہ علیہ کی منقبت میں کہے ہیں۔ ان اشعار سے امیر شریعت کے عقیدہ ولایت پر واضح طور پر روشنی پڑتی ہے۔

گلشن عشق چشتیاں بہ طپید
شعلہ اش خواجہ غلام فرید
ہر کہ از عشق جرعہ نہ چشید
اُو چہ داند کہ چیست خواجہ فرید
مرغ فکرم زآشیاں بہ پرید
نالہائے فرید چوں بہ شنید
سرمہ چشم شد بخاری را
خاک پائے غلام خواجہ فرید
حسرتے از دل ندیم نہ رخت
کہ نصیبش نہ شد نگاہ فرید

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد اب بھی کوئی یہ کہے کہ امیر شریعت بزرگان دین اور اہل روحانیت کے منکر تھے تو یہ معترض کی بے بصری ہو گی۔ اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جن لوگوں نے عادتاً تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھ رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمیشہ کے لئے حقائق بینی سے محروم کر دیا ہے۔ اور ان کی فطرت بد نے انہیں گمراہی و ضلالت کے غار عمیق میں ایسا گرایا ہے کہ وہ سنبھل ہی نہیں سکتے۔ اور ان کی عقل اس قدر ماؤف ہو جاتی ہے۔ کہ وہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی صحیح فیصلہ کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ جو در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی گرفت ہے۔ عقل کا ماؤف ہو جانا یا حقائق کی تہہ تک نہ پہنچنا ایک ایسی نعمت سے محروم ہو جانا ہے جس کے بغیر تکمیل انسانیت قطعی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کوئی صاحب فہم اسے معقول تصور کر سکتا ہے۔

جنہیں اللہ تعالیٰ نے دولت عقل سے سرفراز کیا ہے وہ اختلاف اور معاندت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے حریف کے محاسن و خوبیوں کا اعتراف کیا کرتے ہیں اور یہی در حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے راست بازی کی علامت ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے انسان بہت سی لغزشوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد امیر شریعت اور ان کے ساتھیوں نے سیاست سے تو کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لیکن مرزائیت کے خلاف اپنی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ مذہباً اس کے خلاف تھے۔ کہ ایک اسلامی مملکت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل کسی کے دعوی نبوت کا پرچار ہو۔ جبکہ دنیائے اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔ کیونکہ حضور کی ذات مقدس خاتم النبیین ہے۔ چونکہ مرزا غلام قادیانی نے اس اصول دین کے برعکس دعویٰ نبوت کیا تھا اس لئے علمائے ربانی کو ان کے خلاف مذہبی جنگ لڑنی پڑ گئی ورنہ انہیں مرزا سے کوئی ذاتی کد و دشمنی قطعی نہ تھی۔ اس میدان کارزار میں امیر شریعت کی حیثیت قافلہ سالار کی تھی۔ انہوں نے مرزائیت کے خلاف آخر دم تک جنگ لڑی اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ شمع رسالت کے پروانے اور دین مصطفیٰ کے دیوانے اب بھی باقی ہیں جو عظمت دین اور عصمت رسول پر جان نچھاور کرنا جانتے ہیں۔

ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ امیر شریعت نے درد
دین اور عشق رسالت میں ناموس نبوت پر اپنی متاع حیات قربان کر دی اور برصغیر پاک و ہند کو مرزائیت کے خطرہ سے خبردار کیا۔ ان کے اعضاء پر کہولت غالب آچکی تھی۔ عناصر میں اب وہ اعتدال کہاں کا رنگ نمایاں تھا۔ ذیابیطس جیسے موذی مرض نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن بایں ضعف و نقاہت بھی وہ مرزائیت کے خلاف خواجہ ناظم الدین کے دور حکومت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ پاکستان کا کونا کونا چھان مارا۔ اور اس جرم کی پاداش میں گرفتار ہو کر سکھر جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں صعوبت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ ان کا عشق رسول تھا اور یہ احساس دین کہ وہ حق کی خاطر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لے لیا کرتے تھے۔ ان کی سیاست ان کے دینی معاملات و امور کے تابع ہوا کرتی تھی۔ اور ان کی نظر میں محاسن دین کے علاوہ اور کوئی خوبی جچتی ہی نہ تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے میاں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔نے جس دین کی راہنمائی فرمائی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی ہر طرح سے فلاح و بہبود موجود ہے۔ اس میں سیاست بھی ہے اور معاشرت کی مشکلات کا حل بھی۔ صرف میاں سے وابستگی چاہیئے۔

ترے نقش قدم کا ذرہ ذرہ
عبادت گاہ جان عاشقاں ہے

بعض شخصیتیں ایسی صفات خصوصیہ کا مجموعہ ہوتی ہیں کہ جن کی جاذبیت موافق و مخالف کو گرویدہ کئے رکھتی ہے۔ چنانچہ امیر شریعت کی شخصیت بھی انہی صفات کا خلاصہ تھی۔ ان کے حلقہ میں ہر طرح کے فکر و نظر کے لوگ جمع رہتے تھے۔ اور ارادت کا دم بھرتے حتیٰ کہ نیازمندوں میں مسلمان ہندو کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی شامل تھے۔ گرچہ ہر ایک کی سیاسی و مذہبی راہ الگ الگ تھی لیکن وہ امیر شریعت کی محفل میں اس طرح سے جمے رہتے کہ ان کے چہرے بھی ان کے باہمی نظریاتی اختلاف کی غمازی نہ کرتے۔ امیر شریعت یوں تو ہر اختلاف کو گوارا کر لیا کرتے تھے لیکن کمیونزم کے بارے میں وہ بڑے شدید تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اسلام کے خلاف ایک نہایت ہی خطرناک اور لامتناہی سازش ہے۔ کیونکہ اس کا موجد کارل مارکس یہودی تھا۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ یہودیت نے اسلام کے خلاف ہمیشہ سازشوں کا جال بچھایا ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امیر شریعت نرے سیاسی نہ تھے بلکہ وہ ایک پکے مسلمان اور اسلامی روایات کے تابع انقلاب آفریں انسان تھے۔ اس لئے وہ کسی ایسی تحریک کو برداشت نہ کرتے تھے جس سے اسلام کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ حضرت امیر شریعت کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے حضرات سے یہ مخفی نہیں کہ انہوں نے پاکستان میں بھی مرزائیت کی پُر زور مخالفت کی چنانچہ تحریک تحفظ ختم نبوت نے زور پکڑا۔ ملک کے طول و عرض میں شیدایان رسالت ناموس نبوت پر جان کی بازی لڑانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ لاہور میں گولی چلی۔ لیکن اس پر بھی جذبہ عشق رسالت نہ دب سکا۔ ہر طرف سے مرزائیت کے خلاف احتجاجی جلوس نکلے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں آئی تو ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں حضرت امیر شریعت کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سال بعد رہائی ہوئی تو آپ کی صحت بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ خود

فرمایا کرتے تھے کہ سکھر جیل میں ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑا ہے۔۔ ادھر عمر بھی ستر کے قریب پہنچ گئی تھی اور ذیابیطس کی تکلیف ایک عرصہ سے بلائے جان بنی ہوئی تھی۔ باہر آنا جانا تقریباً معطل ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی متعلقین کے پیہم اصرار پر کسی نہ کسی جلسہ میں تشریف لاتے اور پرتاثیر خطابت سے عروق مردہ میں روح پھونک دیا کرتے کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ کیونکہ اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ سفر کی کوفت برداشت کرتے۔ البتہ ان کے مکان پر ہر وقت محفل جمی رہتی اور ان کا چہرہ سدا بہار پھول کی طرح شگفتہ و تابندہ رہتا۔ یہ ان کی فطرتی خصوصیت تھی کہ وہ بہزار رنج و محن بھی محفل احباب و ارادتمنداں میں ہنس مکھ نظر آتے تھے۔

ضعف نے پہلے ہی سے وجود گرامی پر تسلط جما رکھا تھا۔ ہر چند ڈاکٹروں اور یونانی حکماء نے تدبیر علاج کی۔ مرض بڑھتا چلا گیا آخر ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء بروز دو شنبہ کو غروب آفتاب کے وقت آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ریڈیو پاکستان نے آپ کے وصال کی خبر نشر کی تو ملک کے طول و عرض میں غم و یاس کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے روز جنازہ اٹھا تو حد نگاہ تک لوگوں کا ہجوم سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لوگوں کی نواسنجیوں اور گریہ و زاری نے ملتان کے در و دیوار سے اظہار تعزیت کی۔ اخبارات نے ہائے اور وائے کی سرخیوں سے اپنے محبوب خطیب کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا جنازہ تھا جو اتنے ہجوم کے درمیان سے اٹھا اور لوگوں نے بصد خلوص خاطر کندھا دیا۔ حضرت سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے جو بات کہی تھی اور درس زندگی دیا تھا وہ حضرت امیر شریعت نے عملاً کر کے دکھا دیا۔

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خنداں بودند و تو گریاں
ہمچناں زی کہ بعد مُردن تو
ہمہ گریاں بودند و تو خنداں

*

یہ کہہ رہے ہیں تجھ سے شہیدانِ راہِ عشق
تو دل کا خون کر لے محبت کا خوں نہ کر

شاہ جی کا آٹو گراف........(شورش کاشمیری کے لئے)

قیصر مصطفیٰ قیصر

جہاں سے ہائے وہ شعلہ نوا خطیب گیا

فدا تھے اہلِ چمن جس پہ وہ خطیب گیا — جو نالہ زن تھا شبِ غم وہ عندلیب گیا

زمانہ کہتا تھا جس کو معالجِ ملت — وہ قوم کے دلِ پردرد کا طبیب گیا

چراغِ عشقِ محمد کی لو لگی تھی جسے — ارم کا جلتے ہی پروانہ خوش نصیب گیا

زبس حبیبِ خدا پر تھا وہ ازل سے فدا — بشوقِ دید سوئے محفل حبیب گیا

سخن طراز جسے جانتے تھے اپنا رقیب — وہ کہہ کے روتے ہیں اب ہائے وہ رقیب گیا

یہ غل محافظِ نو ملت کی مرگ پر ہے بپا — جگر پہ داغِ الم لے کے غم نصیب گیا

وہ کہتا تھا کہ اگر پیشِ داورِ محشر — ہلے گا عرش جو روتا ہوا غریب گیا

جو دم میں کرتا تھا مردہ دلوں کو گرم عمل — جہاں سے ہائے وہ شعلہ نوا خطیب گیا

فرنگی جس کی صداؤں سے کانپ اٹھتا تھا — وہ دینِ پاک کا سحر آفریں نقیب گیا

وہ دور جوش پہ تھا جس میں ذوقِ دار و رسن — پلک جھپکتے ہی کیا دور وہ عجیب گیا

نہیں ہے شعر و ادب میں مزا کہ محفل سے — سخن شناس گیا، شاعر و ادیب گیا

وہ راہِ قربِ بنی جو تھی زندگی میں بعید — ہوئی جو قطع تو محبوب کے قریب گیا

ستارے عرش سے قیصر جو توڑ لاتا تھا
ارم کو آج وہ واعظ گیا خطیب گیا

منظور احمد بھٹی مرحوم

شاہ جی کی باتیں

غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے میں ابھی چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ ملک میں انقلابی نعرے بلند ہو رہے تھے۔ میں بھی ان نعروں کے مطالب سے بالکل بے خبر اپنے ہم جولیوں کے ساتھ مل کر انقلاب زندہ باد اور انگریز مردہ باد کے نعرے بلند کرتا رہتا۔ انہیں دنوں سہ روزہ احرار کانفرنس کا اعلان ہوا۔ اور کانفرنس سے ایک روز پیشتر پتہ چلا کہ "بابا ڈنڈے والا" سیالکوٹ پہنچ گئے ہیں۔ اور عبدالرحیم کے مکان پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔

شوقِ زیارت ہمیں کشاں کشاں دربار کی جانب لے گیا وہاں جا کر ایک وجیہ و شکیل انسان دنیا بھر کا جاہ و جلال اور حسن و جمال سمیٹے، لہراتی ہوئی زلفوں، گھنی اور خوبصورت ڈاڑھی کے ساتھ اور چہرۂ روشن پر برکات الٰہی کا نور لئے نظر آیا۔

دریافت پر معلوم ہوا کہ یہی شاہ جی ہیں۔ شاہ جی اس وقت نہا رہے تھے۔ جب غسل سے فارغ ہوئے تو آپ نے سفید قمیض اور ایک سیاہ تہبند زیب جسم کر لیا۔ پاس ہی قبلہ شیخ حسام الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ مسکرا کر پوچھا۔

شاہ جی! یہ دورنگی کیسی؟

شاہ جی نے برجستہ جواب دیا۔ ارے بھائی دن کی سیاہی نیچے اتر گئی اور ایک زوردار قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔

تشکیلِ پاکستان سے پیشتر چونڈہ ضلع سیالکوٹ کی انجمن تبلیغ الاسلام کے سالانہ جلسے تاریخی نوعیت کے ہوا کرتے تھے ہندوستان بھر کے جید علمائے کرام ان جلسوں سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ اور ہمارا جنون بھی ہمیں اپنی پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر چونڈہ جانے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں بھی حسب معمول سالانہ کانفرنس بڑے ٹھاٹھ باٹھ اور دھوم دھام سے ہوئی۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں شاہ جی کی تقریر تھی۔ تقریر سے پیشتر اسٹیج پر چونڈہ کا ایک متمول سکھ وزیر سنگھ مع اپنے دس خاندان کے افراد کے شاہ جی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور عرض کیا گیا۔

شاہ جی وزیر سنگھ اور اس کے اہل و عیال آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہونا چاہتے ہیں۔

شاہ جی نے آہ بھر کر کہا بھائی مجھے تو اتنا پتہ نہیں کہ میں بھی مسلمان ہوں یا نہیں آئیے پہلے دیکھیں کہ مسلمان ہوتا کیا ہے؟ اس کے بعد خطبہ مسنونہ پڑھا اور پھر صبح کے تین بجے تک مسلمان کیا ہے؟ کے عنوان پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

تقریر کے بعد وزیر سنگھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اب بتاؤ مسلمان ہونا چاہتے ہو؟

وزیر سنگھ جس کے دل و دماغ میں اسلام کی حقانیت کی شمع روشن ہو چکی تھی آنسوؤں کے دیئے روشن کر کے بولا۔ ہاں شاہ جی اب میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ شاہ جی نے وزیر سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کلمہ شہادت پڑھایا اور عبداللہ نام تجویز کیا۔ اسی وقت اس کے خاندان کے دس افراد بھی مسلمان ہوئے۔ اور جلسہ نو مسلمین کے لئے دعائے استقامت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ دوسری صبح چونڈہ کے دیگر ۵۴ افراد بھی شاہ جی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

ایک دفعہ دفتر احرار میں بیٹھے تھے، کھانے کا وقت آگیا۔ اسی وقت بھنگی بھی کہیں سے آٹپکا۔ شاہ جی نے کہا میاں کھانا کھالو۔ خدا آپ کو زیادہ دے، یہ بھنگی کا جواب تھا۔ شاہ جی اٹھے بھنگی کو غسل خانے میں لے گئے، اس کا ہاتھ منہ دھلایا۔ اور پھر اپنے ساتھ ہی بٹھا کر کھانا کھلایا۔
آہ کتنے عظیم انسان تھے!

ایک زمانے میں مجھے بڑے لوگوں سے ان کے دستخطوں کے ساتھ کوئی پیغام لینے کا بڑا شوق تھا۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی بنا رکھی تھی۔
شاہ جی دفتر احرار میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کاپی ان کے آگے بڑھا دی۔ دیر تک کاپی کی تعریف کرتے رہے اور مسکرا کر فرمایا: کیوں میاں، یہ مجھے تحفہ دے رہے ہو۔؟
عرض کیا: شاہ جی اس پر آپ اپنے قلم سے کچھ لکھ دیں۔
فرمایا: نہ بھئی، اتنی خوبصورت کاپی میں کیوں خراب کروں۔
شاہ جی! یہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ آٹو گراف بک ہے۔
شاہ جی ذرا غصے میں آگئے۔ فرمایا، وہی انگریزی بدعت اور اس کے ساتھ ہی کاپی مجھے واپس لوٹانے لگے۔
دوبارہ عرض کیا: شاہ جی اس پر اپنی طرف سے کوئی پیغام لکھ دیجئے۔
فرمانے لگے نہیں کیا اور میرا پیغام کیا، پیغام لانے والا تیرہ سو برس پیشتر جو پیغام لایا تھا اس پر تم لوگ کیا عمل کر رہے ہو، اسی پیغام کو سمجھو اور اسی پر عمل کرو۔ دنیا و عقبیٰ سنوارنے کے لئے وہی کافی ہے۔

کراچی ختم نبوت کے دفتر میں شاہ جی صبح کی نماز کے بعد وظیفے میں مصروف تھے کہ اتنے میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم اور مجید لاہوری مرحوم تشریف لائے۔ سالک صاحب نے آتے ہی حملہ کیا:

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر!

شاہ جی نے وظیفہ ختم کرنے کے بعد فرمایا:

سالک صاحب آپ نے بڑے موقع کا مصرع پڑھا ہے اس وقت میرے دل میں آپ دونوں ہی کا تصور تھا۔

....

ایک دفعہ شاہ جی سیالکوٹ میں ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ عقیدت مند پروانوں کی طرح جمع تھے۔ بات حقوق اللہ اور حقوق العباد پر چل نکلی۔ اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے۔

یاد رکھو اگر میں حقوق اللہ میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہوں تو کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی طرف سے مجھے معاف کر دے۔ اسی طرح اگر میں کسی انسان کو دکھ دوں تو خدا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ میری یہ غلطی معاف کر دے جب تک وہ انسان جس کے ہاتھوں مجھے یہ دکھ پہنچا ہے وہی معاف نہ کر دے!

....

ایک دفعہ شاہ جی سیالکوٹ تشریف لائے۔ ہر عقیدت مند کی خواہش تھی کہ شاہ جی میرے ہاں قیام کریں۔ شاہ جی نے دفتر ہی پسند کیا۔ دن بھر محفل جمی رہی۔ رات کو دفتر ہی میں بستر لگا دیا گیا۔ شاہ جی نے چارپائی پر بستر لگا دیکھا تو اٹھا دیا۔

عرض کیا: شاہ جی بستر ہی پر سو رہیئے۔

فرمایا: کل جیل میں یہ نرم و گرم بستر پہنچا دو گے؟

عرض کیا گیا: اگر آپ حکم دیں گے تو وہاں بھی پہنچا دیں گے۔

فرمایا: پھر قبر میں بھی پہنچا دو گے؟

اللہ اللہ یہ تھے شاہ جی!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

> موم ہو جاتے ہیں اس کے وعظ سے پتھر کے دل
> کی ہے وہ طاقت بخاری کو عطا، اللہ نے
> (اسد ملتانی)

گلستانِ نبوی کی بادِ بہاری

حافظ امرتسری

خطابت تھی تجھ کو خدا سے ودیعت — ہوا ہم سے رخصت وہ میرِ شریعت
وہ میداں کا غازی وہ مردِ قلندر — شجاعت کا پتلا شرافت کا پیکر
مصائب کا خوگر مجسم صداقت — مجاہد، نڈر، پارسا، پاک طینت
وہ عابد وہ زاہد، وہ بندہ خدا کا — جواں فکر، معجز بیاں تھا بلا کا
بلی جس کے ہاتھوں میں شعلہ نوائی — ہوئی جس کی گرویدہ ساری خدائی
خلوص و محبت رہا جس کا زیور — عطا تھے جسے خسرویت کے زیور
وہ شاعر، مبلغ، مبصر، مقرر — شریعت کا پیرو، طریقت کا رہبر
فصاحت، بلاغت کا سیلِ رواں تھا — وہ الفاظ و معنی کا بحرِ جواں تھا
سیاست فراست میں تھا وہ یگانہ — رہا جس کا زنداں میں برسوں ٹھکانہ
وہ حق گو وہ بے باک ساحر بخاری — گلستانِ نبوی، کی بادِ بہاری

خطابت تھی جس کو خدا سے ودیعت
ہوا ہم سے رخصت وہ میرِ شریعت

حکیم مختار احمد الحسینی

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور تحریک آزادیٔ کشمیر

وادی کشمیر میں ڈوگرہ سامراج مسلمانوں پر جبر و تشدد اور جور و ستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا اور خون مسلم سے وادی کے ذرہ ذرہ کو رنگین بنا چکا تھا۔ ادھر شاطر فرنگی کشمیر کو قادیانی سٹیٹ بنانے کے منصوبے بنانے میں مصروف تھا۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے خواجہ کمال الدین لاہوری مرزائی کے بھائی خواجہ جمال الدین جو ان دنوں ریاست میں انسپکٹر تعلیمات تھا۔ اس کے اثر و رسوخ اور منصب سے فائدہ اٹھا کر تمام تعلیمی اداروں میں لاہوری اور قادیانی مرزائی بھرتی کر لئے گئے مزید بر آں ۲۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں انگریز کے ایماء پر سرکاری اور درباری لوگوں کا اجتماع ہوا جس میں کشمیر کمیٹی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ مرتبہ پروگرام کے مطابق مرزا بشیر الدین محمود آنجہانی (خلیفہ قادیاں) کو صدر اور مسٹر عبدالرحیم درد خلیفہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ شملہ ہی سے مرزا بشیر الدین نے ایک اعلان کے ذریعہ کہا کہ مجھے تمام مسلمانوں نے اپنا رہنما تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب آنجہانی نے ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو تمام ہندوستان میں یوم کشمیر منانے کا اعلان کر دیا۔ خلیفہ کے پرائیوٹ سیکرٹری نے ملک کے مشہور لوگوں کو خطوط لکھ کر اطلاع دی کہ انہیں کشمیر کمیٹی کا ممبر بنالیا گیا ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان فرنگی کی اس سیاسی سازش سے بے خبر تھے۔ چنانچہ مجلس احرار کے عظیم دماغوں نے فوراً انگریز کی سیاسی سازش کو تاڑ لیا۔

تحریک آزادیٔ کشمیر اور احرار

آخر مجلس احرار نے مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور احرار کے پلیٹ فارم سے تمام سیاسی جماعتوں کو دعوت دی کہ ہم سب کو مل کر کشمیر کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنا چاہیئے۔ ورنہ کشمیر کمیٹی ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کو اور خطرناک بنا دے گی۔

احرار کا اس میدان میں آنا تھا کہ فرنگی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔ کشمیر کمیٹی کے تار و پود بکھر گئے۔ اور علامہ اقبال نے نائب صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔۔۔۔۔۔۔۔

دوبارہ سر کردہ مسلمانوں نے جو کمیٹی تشکیل دی اس کے صدر علامہ اقبال چنے گئے۔

کشمیر چلو کی تحریک

مجلس احرار اسلام میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے اور قابل ترین افراد موجود تھے۔ شاہ جی نے اپنی ساحرانہ خطابت اور مجاہدانہ عزم سے ڈوگرہ سامراج کے خلاف صور پھونکا اور کشمیر چلو کی صدا بلند کی۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے اس آواز پر لبیک کہا گیا۔ فرزندان اسلام نے سر بکف ہو کر کشمیر کی سرحدات میں داخل ہونا

شروع کر دیا۔ شہادت، قید و بند اور مارپیٹ کے مصائب و آلام کے طوفان سے کھیلنے لگے۔ لیکن یہ سختیاں ان کے مجاہدانہ عزم اور شوقِ شہادت و آزادی کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ بلکہ ذوق و شوق بڑھتا گیا۔ چالیس ہزار احرار مجاہدوں نے کشمیر کی آزادی کی خاطر جیلوں کو بھر دیا۔ یوں تو اس جہاد میں پورے ملک نے حصہ لیا لیکن تنہا سیالکوٹ کے دس ہزار فرزندان اسلام نے قربانی پیش کی۔ شاہ جی کے رفیق کار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی جو دراصل امیر احرار تھے۔ ہندوستان بھر کے اخبارات کی فہرست بنا کر رابطہ قائم کیا نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ کشمیر مشترکہ مسئلہ بن گیا۔ اور مدراس تک کے جیالے رضا کاروں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔

مہاراجہ کشمیر نے شکست تسلیم کرلی

شہیدوں کا خون رنگ لاتا ہے تو نوجوانوں کی قربانیوں سے قومی اور ملی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں اور ان کے مقدس خون کے جہاں چھینٹے پڑتے ہیں وہاں آزادی کے تن آور درخت پیدا ہوتے ہیں۔ مہاراجہ کو سرفروشوں کے عزم کے آگے جھکنا پڑا۔ اور اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور خود اختیاری کی اساس پر کشمیر میں جمہوری حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسمبلی کے قیام کی تجویز کی گئی۔

اس وقت اگر کشمیری لیڈر عجلت پسندی سے کام نہ لیتے نرخ بالا کن آرزانی ہنوز کے فارمولا پر عمل پیرا ہوتے اور مفکر ایشیا چودھری افضل حق مرحوم کی اس تجویز پر اڑ جاتے کہ ہم ذمہ دار نمائندہ حکومت سے کم پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے تو حالات مختلف ہوتے۔ اور مہاراجہ کی اتنی بھی حیثیت باقی نہ رہتی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا اعلان کرنے کی جرأت کر سکتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

تحریک کے گہرے اثرات

تحریک سے پہلے عوام میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ کشمیری مسلمان بزدل ہیں۔ ان میں صلابت و استقامت اور شجاعت و بسالت عنقاء ہے اس موقع پر پہلی بار اس نظریہ کے تار پود بکھر گئے اور کشمیری مسلمانوں نے اس کا جواب اپنے عمل سے دیا۔ اور میر واعظ یوسف کی پکار پر پروانہ وار گولیاں کھاتے تھے۔ اس تحریک کا دوسرا اثر یہ پڑا کہ کشمیریوں میں آزادی کی لہر دوڑ گئی جس کی صدائے باز گشت آج بھی سنائی دے رہی ہیں۔

تیسرا گہرا اثر یہ ہوا کہ فرنگی اور قادیانیوں کی سازش تباہ کر کے رکھ دی گئی۔ اور کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کا تصور ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر رہ گیا۔

گو بعد میں اس تحریک کی قیمت مجلس احرار کو بھاری ادا کرنی پڑی۔ اور سر فضل حسین نے ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا قصہ کھڑا کر کے احرار سے دل کھول کر انتقام لیا۔ مگر احرار شاہ جی کی قیادت میں اس تحریک سے جو عظیم مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اتنی بڑی قربنی دیکر انہوں نے حاصل کر لئے۔

اقبال اسد

یزداں کی اک نشانی

حضرت امیر شریعت عالم باعمل اور صوفی رمز شناس تھے۔ ہزاروں افراد نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنے نفس کی اصلاح کا اہتمام کیا۔ ان کی زندگی کے اس پہلو پر بہت کم حضرات کی نظر گئی ہے۔ اصلاح باطن میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ جی کو شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ سے فیض تھا۔ جادۂ تصوف کے راہرو اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اس جہان میں حضرت رائے پوری کی نسبت سے بلامبالغہ لاکھوں طالبان صادق نے روحانی منازل طے کیں "رائے پور" کی خانقاہ سے برسوں تصوف کا نورانی چشمہ رواں دواں رہا۔ یہ خانقاہ منازل سلوک میں اپنے وقت کی سب سے بڑی تربیت گاہ رہی ہے۔

آنکس ست اہل بشارت کہ اشارت داند
نکتہا ست بسی محرم اسرار کجا است

شاہ جی نے پیری اور سجادگی کی دکان کبھی نہ سجائی۔ پیری مریدی کو کاروبار کا درجہ نہ دیا۔ ان کی غیرت مند طبیعت کبھی کسی مرید سے ایک پائی کی روادار نہ ہوئی۔ ان کے ارادت مندوں نے بھولے سے بھی کبھی ان کی پیشوائی و اولیائی کا ڈھونڈرہ نہیں پیٹا۔ شاہ جی دلق اویس اور گلیم بوذر کے امین تھے۔ انہوں نے بادلوں کا کفن نہیں بیچا اور آباء کی قبروں کی اینٹوں کو فروخت نہیں کیا۔ کیونکہ وہ دھن دولت کے بندے نہ تھے۔ وہ تو بطل حریت تھے۔ انہوں نے وادیٔ سیاست کے خارزار کی عمر بھر جادہ پیمائی کی۔ اپنے عقیدت مندوں کو بھی ساتھ لے کر چلے۔ انہوں نے مریدوں کے ہاتھ میں تسبیح کے بجائے کلہاڑی پکڑائی۔ غلامی کی زنجیروں سے نبرد آزما رہے۔ وہ قافلہ احرار کے سرخیل تھے۔ تو چودھری افضل حق مرحوم دماغ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی سالار میمنہ تھے تو قاضی احسان احمد سالار میسرہ۔ شاہ جی کے رفقاء کار میں شیخ حسام الدین، تاج الدین انصاری، مولانا مظہر علی اظہر اور شورش کاشمیری ابھی زندہ ہیں۔ یہ حضرات کسی بھی سٹیج سے تقریر کریں۔ مگر ان کی تقاریر احراری خطابت کی دھندلی یادیں تازہ کر دیتی ہیں۔

جنوں تو کہہ ہی دیتا ہے بات ساری
خرد نے سوچ کر تحریف کی ہے

مجلس احرار اسلام کے سیاسی نظریئے سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن تحریک آزادی میں جوان کا حصہ ہے اس سے انکار کرنا تاریخ پر ستم توڑنا ہے۔ "احرار" کو کانگریس کا پٹھو کہنا دھاندلی ہے۔ جبکہ ۱۹۳۱ء میں احرار کانگریس سے الگ ہوگئے تھے۔ کانگریس سے علیحدگی چودھری افضل حق مرحوم کے نظریات کی بناء پر ہوئی تھی۔ اور یہ بات بہانگ دہل کہی جاسکتی ہے کہ چودھری صاحب مرحوم کانگریس کو ہندو امپریلزم کا ایشم خیال کرتے تھے اور ان کی درویشانہ سرشت میں ہندو سرمایہ داری کے خلاف سخت نفرت موجود تھی۔ چوہدری

صاحب کو ان کے ناقد احرار کا "مارکس" کہتے ہیں۔ یہ قطعی غلط ہے کہ میرے نزدیک ان کا ذہن توحید و رسالت میں سے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے نزدیک تھا۔ چودھری صاحب کو جاگیرداری اور سرمایہ داری سے بغض کی حد تک چڑ تھی۔ ان کا نظریہ حیات اس شعر کے قریب قریب ہے۔

دولت ہو جس نظام میں انسانیت کا نام
دنیا کا وہ نظام بدلنے کی فکر ہے

یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ اسلام پر دل و جان سے قربان ہونے کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی "مجلس احرار" تحریک پاکستان میں شامل نہ ہوئی اس کی واحد وجہ جو تاریخی تجزیہ کے بعد مجھے نظر آئی ہے وہ مسلم لیگ میں نوابوں کی موجودگی تھی۔ دوسرے پنجاب کے جاگیرداروں کو "احراری دماغ" نے ہمیشہ بخیل اور کوتاہ فکر گردانا۔ بہرحال یہ دوسرا المیہ ہے کہ ایک فعال جماعت نے تحریک پاکستان کی مخالفت کر کے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک لی۔ بہرحال ذکر تھا شاہ جی کا تو وہ بقول عبدالحمید عدم یزداں کی نشانی اور احرار کی جوانی تھے۔ شعر سن لیجئے

تو آدمی نہیں یزداں کی اک نشانی ہے
تیرے بڑھاپے میں احرار کی جوانی ہے

آخری ایام میں شاہ جی کا حلیہ کچھ اس طرح تھا۔ درمیانہ قد، دہرا جسم، گندمی رنگ، چہرے پر بھری بھری سفید داڑھی، سر پر پٹے، اُن پر اوڑھی ہوئی انوار کیپ، کشادہ پیشانی، بھرا ہوا روشن کتابی چہرہ، عقابی آنکھیں جن میں غیرت اور خودداری کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں۔ طبیعت میں جلال و جمال کا حسین امتزاج تھا۔

قلندرانہ ادائیں
سکندرانہ جلال

آواز میں شیرینی سے بڑھ کر جادو، تلاوت قرآن پاک کے وقت ان کے گلے سے ایسی دل سوز آواز نکلتی تھی کہ سامعین جھوم جھوم جاتے تھے۔ دیہاتی سامعین کو کبھی کبھار ہیر وارث شاہ کے جادو بھرے اشعار سنا کر موہ لیتے تھے۔ تقریر فرماتے تھے تو مجمع پر سناٹا چھا جاتا۔ موافق مخالف واہ واہ کے ڈونگرے برساتے اور مسحور ہو جاتے۔ ان کی شعلہ نوائی سے پنجاب کے دریاؤں میں بارہا تموج آیا۔ جمنا اور گومتی بھی کناروں سے باہر ہو گئے۔ منبر سے ان کی گونج سنائی دی۔ سٹیج سے انہوں نے للکارا۔ ہمالیہ کی چوٹیاں دہل گئیں۔ انگریز کا تخت ڈانواڈول ہوا۔ قادیانی نبوت لرز گئی۔ چالیس برس تک ان کی پاٹ دار آواز نے تہلکہ مچائے رکھا۔ مگر آخری ایام میں ان کی مجبوری اور لاچاری کا یہ عالم تھا کہ گویائی کے لئے ہلکی سی چنگاری کے محتاج تھے۔ نشتر میڈیکل کالج ملتان میں ان کی بے زبانی اور کرب دیکھ کر رونا آتا ہے کہ ہائے یہ وہ خطیب آتش نوا ہے کہ جس کی شعلہ نوائی اور آتش بیانی خرمن استعمار پر بجلی بن کر گرا کرتی تھی۔ ان کی آخری جھلک دیکھ کر راقم الحروف کے ذہن میں ان کے ہم وطن شاعر حضرت شاد عظیم آبادی کی غزل کا یہ مطلع یاد آگیا تھا۔ یہ شعر گویا جناب شاد نے پیر بخاری کے لئے کہا تھا۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے "ہم نفسو" وہ خواب ہیں ہم

آپ کی پرورش کچھ ایسے ماحول میں ہوئی کہ مذہبی مطالعہ کے ساتھ ساتھ آپ کو اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق بھی میسر آیا۔ آپکا بچپن شاد عظیم آبادی کے عروج کا زمانہ تھا۔ شاہ جی نے اپنے بچپن میں شاد کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اسی لئے تو شعر و شاعری کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔ انہیں فارسی اور اردو اساتذہ کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ مولانا روم، حافظ شیرازی، عمر خیام، مرزا غالب اور ڈاکٹر اقبال ان کے محبوب شعراء تھے۔ شاہ جی خود بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا تخلص ندیم تھا۔ ان کا مجموعہ کلام سواطع الالہلام کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بقیہ کلام میں شعری بانکپن کی جھلک نظر آتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں شاعری کو اضافی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا اصل میدان خطابت تھا۔

قلم را آں زبان بنود کہ سر عشق گوید باز!
بیروں از حد تقریر است شرح آرزو مندی

انہوں نے اردو کی عوامی خطابت کو عمر بھر چار چاند لگائے ہیں۔ وہ اس میدان کے اتنے بڑے شہ سوار تھے کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ خطابت کے میدان میں اردو نے آج تک اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا۔ شاہ جی کی سیاسی زندگی اور خطابت کا آغاز ۱۹۲۰ء کے ہنگامہ خیز دور میں ہوا۔ انکی شخصیت کے حسن و رعب اور شعلہ نوائی نے برصغیر پاک و ہند میں آگ لگا دی انہوں نے اپنی اچھوتی طرز خطابت سے اس وقت اپنا لوہا منوایا جب مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت کا طوطی بول رہا تھا۔ جب مولانا محمد علی جوہر کی خطابت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ تحریک خلافت کا زمانہ تھا۔ آپ کی آتش بیانی سے مسلمان قوم بیدار ہوئی۔ ورنہ پوری کی پوری قوم ماضی کی شاندار روایات کے تصور میں گم تھی۔ یا حال کی شکست اور پس ماندگی میں مبتلا ان کی شعلہ بیانی محض ان کی ذات کی نمود نہ تھی۔ ان کی تقریر میں شاعرانہ دلفریبیاں بھی ہوتی تھیں اور ناصحانہ نکات بھی عبرت کی داستان کے ساتھ ساتھ لطیفے اور چٹکلے بھی بیان ہوا کرتے تھے۔ تقریر میں محاوروں کی پابندی اور عام فہم مثالیں اس طرح بیان فرماتے گویا انگوٹھی میں نگینے جڑ رہے ہوں۔ وہ گھنٹوں بے تکان بولنے کے عادی تھے۔ ان کے سامعین بارش میں بھیگنا گوارہ کر لیتے تھے۔ لیکن تقریر چھوڑ کر نہ جاتے تھے۔ تقریر کی طوالت کبھی سامعین کی تھکاوٹ کا باعث نہ ہوئی۔ ان کی گفتار میں جادو کی کیفیت اور سحر کا عالم ہوتا تھا۔ ان کے بد ترین مخالف بھی ان کی تقریر کی گلریزیاں اور آتش بیانیاں سنتے پائے گئے ہیں بلکہ مخالفوں کو سر دھنتے دیکھا ہے۔ سی آئی ڈی والے لکھتے لکھتے اکتا جاتے ان کی انگلیاں تھک جاتیں۔ اخبار نویس ان کی گرما گرم تقریر کی رپورٹنگ سے عمر بھر عاجز رہے۔ شاہ جی ایک منٹ میں ایک سو سے زیادہ الفاظ بولنے پر قادر تھے۔ ان کی خطابت کے چرچے برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں رہے ہیں۔ اپنی مصروفیات زندگی کو انہوں نے ایک موقعہ پر یوں فرمایا:

"زندگی ہی کیا ہے تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی۔ ایک چوتھائی جیل میں جتنے دنوں جیل سے باہر رہا

لوگ گلے کا ہار بنتے رہے۔ آج کلکتہ کل لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی، سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں ۳۶۶ تقریریں کی ہوں گی۔ میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا "واہ شاہ جی واہ" میں قید ہو گیا۔ لوگوں نے کہا "آہ شاہ جی آہ" اور "واہ اور آہ" میں ہم ہو گئے تباہ"

گزر گیا کہ درماندہ راہ یہ کہتا
اب اس فضا میں کوئی قافلہ نہ ٹھہرائیے

انجمن خدام الدین لاہور کے ۱۹۳۰ء کے تاریخی اجلاس (جس میں ہندوستان بھر کے جید علماء شریک تھے) کی صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری نے فرمائی تھی۔ مولانا انور شاہ کا رتبہ علمائے دیو بند میں اور اس سے باہر بھی بہت بلند تھا۔ ہر مکتب خیال کے علماء ان کا احترام کرتے تھے۔ مولانا انور شاہ کے پائے کا محدث ان کی وفات کے بعد بلاد ہند میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت انور شاہ پہلوی (قدیم فارسی) کے بہت بڑے عالم تھے۔ علامہ اقبال نے جب ایران کا سفر کیا تو وہاں زرتشتی مذہب کے پیرو کاروں نے ان سے اپنی قدیم کتاب "پاژند" کے سلیس فارسی ترجمہ کی درخواست کی۔ حضرت علامہ نے جواباً کہا کہ اس کا ترجمہ مجھ سے تو ممکن نہیں البتہ میرے ملک میں ایک ہستی ایسی ہے جو اس کام کو بحسن خوبی سر انجام دے سکتی ہے۔ زرتشیوں نے ایک لاکھ ایرانی سکے کی پیش کش کی۔ حضرت علامہ نے ہندوستان لوٹ کر حضرت انور شاہ صاحب سے ذکر کیا۔ حضرت انور شاہ صاحب نے جانتے ہو کیا کہا "لاکھ روپے کے بدلے میں کفر کی اشاعت کیوں کروں۔ انور شاہ اسلام کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اشاعت کفر کے لئے نہیں" بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر تھا۔ انور شاہ صاحب کی صدارت کا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کے لئے کھڑے ہوئے ایسے لولوئے لالہ بکھیرے کہ مجمع کا مجمع جھوم گیا۔ تقریر دلپذیر کے اختتام پر مولانا انور شاہ نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا۔ "عطاء اللہ شاہ بخاری صحیح معنوں میں امیر شریعت کہلانے کے مستحق ہیں۔" اتنا فرمایا اور اپنا ہاتھ بیعت کے لئے بڑھا دیا۔ شاہ جی پر تو رقت طاری ہو گئی اور عرض کیا نہیں مجھے اپنے ہاتھ پر بیعت ہونے کی اجازت دیں۔ مگر انور شاہ صاحب نے اپنا ہاتھ شاہ جی کے ہاتھ میں دے دیا بس پھر کیا تھا پورا مجمع حضرت امیر شریعت کے نعروں سے گونج گیا۔

نصرت قریشی

رخصت ہوئے دنیا سے بخاری کے جلو میں
انداز بیاں، سحر بیاں، لذت گفتار
نصرت! پئے تاریخ یہ ہاتف نے ندا دی
اب ختم ہوئی رونقِ ہنگامہ احرار

۱۹۶۱ء

بیرسٹر کے ایل گابا ترجمہ: پروفیسر تاثیر وجدان

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا مقدمہ عدالت

آج فصیح البیان مقررین کا زمانہ بیت چکا ہے۔ سر سندر ناتھ بنیرجی، فیروز شاہ مہتہ۔ محمد علی جناح، اینی بسنت، سری نواس شاستری، لالہ لاجپت رائے اور بہت سے دوسرے شعلہ نوا مقررین کا دور کہ جنھوں نے لاکھوں انسانوں کے اندر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے بیداری پیدا کی اور (انقلاب عام سے) برطانوی سلطنت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ انسانوں کا یہ قبیلہ آج فی الواقع معدوم ہو چکا ہے۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کئی نقطہ نظر سے اپنے دور میں ہندوستان کے ممتاز ترین اور خوفناک ترین مقرر تھے۔ ان کے دور عروج و ترقی میں اگر بالفرض ان کی ٹکر کے کوئی مقرر تھے بھی تو وہ تعداد میں برائے نام تھے۔ تین سے پانچ گھنٹوں کی تقریر ان کے لئے ایک عام سی بات تھی۔ سامعین کا جم غفیر، جو بعض اوقات ساٹھ ساٹھ ہزار انسانوں پر مشتمل ہوتا تھا ان کو سننے کے لئے نہایت صبر و تحمل سے انتظار میں رہتا۔ وہ عشاء کے بعد گیارہ بجے کے قریب سٹیج پر آتے تھے۔ اور پو پھٹنے پر سامعین کو چھوڑتے۔ جو پھر بھی گھروں کو بادلِ نخواستہ ہی جاتے ساری رات تقریر سن کر ان کا بالآخر گھروں کو جانا کسی شکم سیری یا بیزاری کے باعث نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ شاہ جی خود اس خیال سے انہیں چھوڑ دیتے تھے کہ (رات کا یہ وقت آخر) ان کے آرام و استراحت کے لئے ضروری ہے۔ وہ سامعین کو ہنسانے اور رلانے پر قادر تھے۔ وہ ان کے اندر جتنی آسانی سے تضحیک اور تنفر کے جذبات مشتعل کرنے کی قوت رکھتے تھے، اتنی ہی آسانی سے محبت، نرم دلی اور رحم کے جذبات ابھارنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

شاہ جی اصل و نسل کے اعتبار سے عرب تھے۔ وہ بول چال میں عربی فارسی اور اردو کو استعمال کرتے تھے۔ وہ انگریز سے نفرت و عداوت رکھتے تھے۔ اور مرزائیوں کو بے حد ذلت و حقارت سے دیکھتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی زمامِ قیادت کئی سال تک ان کے ہاتھوں میں رہی۔ اور کئی موقعوں پر قید و بند کی صعوبتوں کو مردانہ وار جھیلا۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنی خداداد قابلیت، اپنے نظریات اور اپنی قربانیوں کو کسی ناجائز نفع کے لئے داؤ پر نہیں لگایا۔

شاہ جی ہمیشہ سیاست کے موضوع کے مقابلے میں مذہب پر بحث و گفتگو کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ کانگریس اور ملک کی پکار پر سرکار دربار کی قدس گاہ کو خیر باد کہہ کر ستیہ گرہ کی تحریکوں کے حق میں، کبھی دوسروں کو انتخابات میں کامیاب کرانے، کبھی اپنی آتش بیانی سے سامعین کو (حق و صداقت کے لئے) شعلہ زن کرنے، کبھی عوام کو سیاسی جمود و خمود سے چھٹکارا دلانے اور کبھی ملک و قوم کے نام پر ایثار و قربانی کے الاؤ بھڑکانے کے لئے میدانِ عمل میں اترتے تھے۔

جب ہندوستان بھی جنگ عظیم دوم میں شامل ہو گیا تو شاہ جی بہت جلد حکومت برطانیہ کی پالیسیوں کے ایک مخالف کی حیثیت سے نمایاں ہو کر ابھرے۔ اس وقت حکومت پنجاب کا سربراہ بحثیت وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں مرحوم تھا۔ وہ برطانوی حکومت کے مقصد اور مشن کے انتہائی وفادار حامیوں میں سے تھا۔ شاہ جی نے ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں بہت سی تقاریر کیں۔ جن میں سے ایک تقریر، کو جو راولپنڈی میں کی گئی، عدالتی مقدمے کی بنیاد بنانا حکومت کے لئے ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن شاہ جی بھی معمولی آدمی نہ تھے۔ اور اس لئے (جیسا کہ اس زمانے میں یہ بات عام ہو گئی تھی) عوام کو جوشِ عمل پر اکسانے والے اور اپنی پوشیدہ قوت کے لحاظ سے اس خطرناک ترین مقرر سے ملک کو نجات دلانے کی خاطر سیکرٹریٹ میں ایک انتہائی شیطانی سازش کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

ان پر شاہ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ یا دوسرے الفاظ میں انہیں غدار قرار دیا گیا۔ جو قانونِ فوجداری کی روسے ایک سنگین ترین جرم تھا۔ اور جس کی سزا پھانسی تھی یا عمر قید بہ عبور دریائے شور۔

چنانچہ آغاز جنگ کے فوراً بعد شاہ جی ضابطہ، تعزیرات ہند کی دفعہ نمبر ۱۲۱ الف کے تحت جاری ہونے والے ایک وارنٹ کے ذریعے گرفتار کئے گئے۔ شاہ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا یہ مقدمہ حکومت پنجاب کے خاص حکم سے قائم ہوا۔ اور کئی مہینوں تک انہیں ایک حوالاتی ملزم کی حیثیت سے زیر حراست رکھا گیا۔ کیونکہ اتنے سنگین جرم کے لئے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔ الزام کا لب لباب یہ تھا کہ شاہ جی نے ۳ جون ۱۹۳۹ء کی رات راولپنڈی کے مقام پر ایک ایسی تقریر کی تھی جس میں کئی دوسری باتوں کے علاوہ اس امر کا حوالہ بھی تھا کہ حکومت برطانیہ نے شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو ناحق قتل کیا اور یہ بھی کہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور یہ کہ ہندوستان اپنا قابل قدر حصہ آزادی پہلے ہی حاصل کر چکا ہے۔ اور اب ان غیر ملکی استحصالیوں اور قصابوں کو پوری طرح ملک بدر کرنے کے لئے عوام کو صرف ایک پُر عزم جذبۂ عمل کی ضرورت ہے۔ یہ الزام بھی تھا کہ (انہوں نے کہا) مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ قابلِ نفرت سامراج کو ملک سے باہر نکال پھینکنے کو جہاد (یعنی ایک مقدس جنگ) سمجھیں۔ نیز انہوں نے اپنے سامعین کو یہ کہہ کر بھی اشتعال دلایا کہ اب یہ کام صرف ایک ہی طریقے سے ممکن ہے کہ "یا مرو یا مارو" قانونی سزا کی رو سے تقریر بغاوت پر اکسانے والی بھی تھی۔ (جو دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت لائق تعزیر تھی) اور ساتھ ہی شاہ برطانیہ کے خلاف جنگ آزما ہونے کے مترادف بھی تھی۔ (جو ضابطہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت قابلِ سزا تھی)

یہ مقدمہ بہت زیادہ سیاسی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ عوام میں اس امر کی پیش گوئی پائی جاتی تھی کہ حکومت سزا کے سلسلے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔ اس لئے میں شاہ جی کے قانونی دفاع کے معاہدے کو اپنے لئے ایک طرح کا اعزاز خیال کرتا تھا۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کافی ذمہ داری کا ایک معاملہ بھی ہے۔ کیونکہ

عامتہ الناس کو اس مقدمہ میں بڑی دلچسپی تھی۔ اور شاہ جی کی ہر دلعزیزی اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اور عصری خلفشار اور جوش و جذبہ کی وجہ سے اس مقدمے کو ایک بڑی جنگ سمجھا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق دو مضبوط شخصیتوں سر سکندر حیات وزیر اعظم حکومت پنجاب اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے درمیان باہمی ٹکراؤ سے تھا۔ جن میں سے ایک خوشگوار لیکن بے رحم منتظم تھا۔ اور دوسرا نتائج سے بے پرواہ آتش بیان خطیب جسے مسلم عوام بت کی طرح پوجتے تھے۔ راولپنڈی کے ایک مجسٹریٹ نے ابتدائی تحقیقات کی اور بادی النظر میں مقدمہ کو اہم خیال کرتے ہوئے بغاوت کے اکسانے اور شاہ برطانیہ کے خلاف جنگ آزمائی کی ترغیب دینے کے الزام میں آئندہ تجویز مقدمہ کے لئے اسے سیشن کے سپرد کر دیا۔

مقدمے کی اہمیت کے پیش نظر لاہور ہائی کورٹ نے کارروائی لاہور منتقل کر دی۔ اور ہدایت کی کہ لاہور کا سیشن جج مقدمہ کی سماعت کرے۔ اس وقت یہ سیشن جج انڈین سول سروس کا ایک شخص مسٹر ڈبی فالشا تھا۔ جو آج کل شملہ ہائی کورٹ کا مسٹر جسٹس فالشا کہلاتا ہے۔ فالشا ہمیشہ ہی ایک سخت گیر جج رہا۔ جس کے سامنے کسی مقدمے کی پیروی کرنا یا اس پر بحث و استدلال کرنا آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ زود رنج تھا۔ اور طبیعت میں غصے کا میلان رکھتا تھا۔ لیکن ایک ایسا وکیل جو اس کی زود رنجی اور سختی کو نرم کرنے اور طبیعت کے اشتعال کو اعتدال پر لانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کے لئے فالشا ایک نہایت اعلیٰ جج تھا۔ جو با اصول، منصف مزاج، اور ہر قسم کے تعصب سے آزاد ہوتا تھا۔ فوجداری کے کسی مقدمہ میں جب تنقیحات مقدمہ پر ان کی توجہ مبذول کرائی جاتی تو کسی بھی ملزم کو عدالتی دیانتداری کے اعلیٰ ترین معیار کی توقع فالشا سے زیادہ (کسی اور) جج سے نہیں ہوتی تھی۔ مقدمے کی سماعت، لاہور کی سیشن عدالت کے ایک بڑے کمرے میں ہوئی جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ فالشا چار رائے دہندگان کے ہمراہ اپنی عدالت کی نشست پر براجمان تھا۔ عبدالعزیز کو (جو کہ اب لاہور ہائی کورٹ کا مسٹر جسٹس ہے) شاہ برطانیہ کی نمائندگی کے لئے خصوصی وکیل سرکار مقرر کیا گیا تھا۔ ملزم (عطاء اللہ شاہ بخاری) کی طرف سے وکیل صفائی کے فرائض میں نے سرانجام دیئے۔ (چودھری مراد علی راولپنڈی کے وکیل میرے ساتھ تھے) چودھری صاحب میرے ایک نہایت ہی معتمد اور کار آمد جونیئر ثابت ہوئے۔ انہیں اس کیس کی بہت سی باتوں کا ذاتی علم اتنا تھا کہ میں نے ان سے بطور گواہ صفائی کام لینے کے غیر معمولی خطرہ کا فیصلہ کر لیا۔ خوش قسمتی سے یہ خطرہ مول لینا مفید ثابت ہوا۔ اور مراد علی کی گواہی نے جج اور رائے دہندگان کو بہت متاثر کیا۔ لیکن اس کے آنے سے قبل سرکار کی جانب سے اس مقدمہ کی تائید میں متعدد گواہ پیش ہوئے۔

عدالت کی کارروائی کے درج ذیل اقتباسات ان رپورٹوں پر مبنی ہیں جو لاہور کے انگریزی روزنامہ "ٹری بیون" میں شائع ہوتی رہیں سرکار کی جانب سے مقدمہ کا آغاز کرتے ہوئے وکیل سرکار نے کہا کہ ملزم نے ۳ جون ۱۹۳۹ء کو راولپنڈی میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر استغاثہ کے موقف کے مطابق ایسے ٹکڑوں پر مشتمل تھی جو تعزیرات ہند کے جرم زیر دفعہ ۱۲۱ الف (شاہ برطانیہ کے خلاف جنگ آزمائی) اور جرم زیر دفعہ

۱۲۴ الف (حکومت برطانیہ کے خلاف ترغیب بغاوت) کی زد میں آتے ہیں۔ ملزم کی تقریر جسے پولیس رپورٹر ضبط تحریر میں لایا تھا۔ نیز ملزم پر جو الزام عائد کئے گئے تھے، عدالت میں پڑھ کر سنائے گئے۔ وکیل صفائی نے روزنامہ "ٹری بیون" مورخہ ۶ جون کا ایک شمارہ عدالت میں پیش کیا جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی متعلقہ تقریر کی رپورٹنگ کی گئی تھی۔ اور عدالت سے درخواست کی کہ ٹری بیون کے نامہ نگار رام لال چڈھا کو بطور گواہ پیش ہونے کے لئے سمن جاری کئے جائیں۔ زیر بحث رپورٹ استغاثہ کے الزام کا ایک پورا پورا مسکت جواب تھی۔ عدالت نے درخواست سے اتفاق کیا اور رام لال چڈھا کو سمن جاری کرتے ہوئے پابند کیا کہ وہ تقریر کے اپنے قلمی نوٹس پیش کرے۔ تب عدالت نے استغاثہ کی شہادت قلمبند کی۔

سرداری لال انسپکٹر استغاثہ راولپنڈی نے بیان دیا کہ اس نے حکومت پنجاب کے زیر حکم اس مقدمے کے سلسلے میں ایک شکایت دائر کی ہے۔ متعلقہ کاغذات اس وقت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ راولپنڈی ایف سی بورن نے اسے ارسال کئے تھے۔ گواہ نے جرح پر کہا کہ یاد نہیں کہ تقریر کی نقل حکومت پنجاب کو کب بھیجی گئی تھی۔ میں نے تو نقل صرف اس وقت دیکھی تھی جب مجھے متعلقہ کاغذات موصول ہوئے۔ آغا سعادت علی ڈی ایس پی راولپنڈی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں جون ۱۹۳۹ء میں راولپنڈی میں سٹی انسپکٹر پولیس تھا۔ مجلس احرار کے زیر سرپرستی راولپنڈی میں ۳ جون کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کی مشتہری بذریعہ منادی کرائی گئی۔ میں نے محمد یار ہیڈ کنسٹیبل کو کارروائی کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کا کام سونپا۔ اس نے اپنی نوٹ بک اگلے روز واپس کر دی۔ یہ نوٹ بک میرے قبضہ میں رہی۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لائی گئی۔ گواہ نے جرح میں کہا کہ کانگریس، مجلس احرار اور دوسری تنظیموں کے جلسوں کی رپورٹنگ کا انتظام میرے ذمے تھا۔ میں عام طور پر تقاریر کی مختصر نویسی کی خدمت پر محمد یار ہیڈ کنسٹیبل کو مامور کرتا تھا۔ محمد یار ہیڈ کنسٹیبل پھلور نے کہا کہ میں تقاریر کو مختصر نویسی کی صورت میں نقل کرتا تھا، اور پھر ان کی نقل تیار کر کے اگلے روز نوٹ بک انسپکٹر استغاثہ کے حوالے کر دیتا تھا،

سرکاری وکیل نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا کیا تم انہیں جانتے ہو؟

گواہ نے کہا، ہاں میں انہیں پہچانتا ہوں۔

شاہ جی نے رائے دی کہ یہ ملزم شناخت کروانے کا بڑا عمدہ طریقہ ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا یہ شناخت ہے یا میرا تعارف ہے؟ (حاضرین میں قہقہہ بلند ہوا) سرکاری وکیل نے کہا کہ تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ عطاء اللہ شاہ بخاری کو ساری دنیا جانتی ہے۔ (مزید قہقہہ بلند ہوا) پھر گواہ نے ملزم کی تقریر کے ان اقتباسات کا حوالہ دیا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ برطانوی راج کا تمام ممکن ذرائع سے خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ خواہ مرنے اور مارنے تک کی نوبت آجائے۔ ملزم پر مزید الزام یہ بھی تھا کہ اس نے یہ کہا کہ انگریزوں نے اُس بغاوت کے دوران جسے وہ عام طور پر "غدر" کہتے تھے علماء کی ایک کثیر تعداد کو موت کے

گھاٹ اتارا۔ یہ دراصل جنگِ آزادی تھی۔ گواہ نے کہا کہ میں نے ملزم کی تقریر کے ان حصوں کو چھوڑا ہے جن کا تعلق مذہب یا قرآن سے تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اس کے نوٹس غلطی سے مبرا تھے۔ ان نوٹس کو صاف کرنے پر ایک گھنٹہ صرف ہوا تھا۔ گواہ نے جرح میں کہا کہ شاہ جی نے اوسطاً ۹۰ الفاظ فی منٹ کی تیز رفتار کے ساتھ تقریر کی۔ اور انہوں نے جو کچھ کہا اسے وہ مکمل طور پر ضبط تحریر میں نہیں لاسکا۔ گواہ نے کہا کہ شاہ جی نے سکندر حیات خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وزیر اعظم نے جنگ میں اہل برطانیہ کی مدد کا وعدہ کر رکھا تھا۔ جب گواہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے تقریر کا یہ حصہ اپنی ڈائری میں تحریر کیا تھا تو گواہ نے اثبات میں جواب دیا لیکن وہ یہ الفاظ اپنی ڈائری کے اندر دکھانے سے قاصر رہا۔ مزید سوالات پوچھے جانے پر گواہ نے تسلیم کیا کہ صوفی عنایت محمد (پسروری، مشہور احرار رہنماء) پر بھی جو اجلاس کی صدارت کر رہے تھے قانونِ تحفظ امن ہند کے تحت مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس نے مزید یہ بات بھی تسلیم کی کہ بہت سے لوگوں نے اجلاس میں نظمیں گا کر پڑھیں اور شاہ جی کی تقریر کے دوران ان لوگوں کی موجودگی کا اقرار کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ شاہ جی کی تقریر کے متعلق شہادت دے سکیں۔ فضل کریم نے جو راولپنڈی کے ایک وکیل کا منشی تھا۔ بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں اس اجلاس میں حاضر تھا جس سے ملزم نے خطاب کیا تھا۔ اجلاس کے فوراً بعد محمد یار نے مجھے پوری تقریر پڑھ کر سنائی تھی۔ اور میں نے نوٹس کی صحت کی نشانی کے طور پر ان پر اپنے دستخط بھی کئے تھے۔ میں نے تصدیق کی کہ رپورٹ میں جو الفاظ درج کئے گئے ہیں وہ ملزم نے کہے تھے۔ تقریر جو مجھے یاد تھی دو گھنٹے جاری رہی۔ اس نے کہا تاہم میرے لئے تقریر کی باز آفرینی مشکل کام ہے کیونکہ تقریر کو ایک سال گذر چکا ہے۔ تاہم اتنی بات ضرور یاد ہے کہ ملزم نے کہا تھا کہ میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔ میری جرح کرنے پر گواہ نے تسلیم کیا کہ پولیس کی امداد کرنے پر میں نے کئی اعزازی سرٹیفکیٹ حاصل کئے ہیں۔ میں نے جلسے میں شمولیت اس لئے کی کہ یہ جلسہ میرے محلے کے بالکل قریب منعقد ہوا تھا۔ اور پولیس رپوٹر محمد یار نے مجھے اپنے ساتھ جلسے میں چلنے کے لئے کہا تھا۔ میں مولانا مظہر علی اظہر سے واقف نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مولانا مذکور جلسہ میں موجود تھے یا نہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ آیا شاہ جی نے کانگریس یا احرار کی طرف اشارہ کیا تھا یا نہیں۔

سوال: کیا شاہ جی نے یہ کہا تھا کہ کانگریس نے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔

جواب: نہیں لیکن انہوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ اہلِ ہند نے روپے میں سے دس آنے کامیابی حاصل کر لی ہے۔

اگلے گواہ سربراہ ذیل دار، جہانداد خاں نے اپنے گواہ کی تائید کی۔ جرح کرنے پر گواہ نے یہ بات تسلیم کی کہ مجھے پستول کا لائسنس دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی پولیس کی سفارش پر مجھے رقم کی صورت میں معاوضہ بھی۔

میں نے ایک اچھے مقدمے میں تعاون اور کامیابی کے صلہ میں پولیس کی سفارش پر امتیازی سندات حاصل کیں۔ راولپنڈی کے ایک ٹھیکیدار مولوی فضل الہی نے بھی بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں جلسہ میں موجود تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت ملزم اپنی تقریر کا کچھ حصہ ختم کر چکا تھا۔ مجھے تقریر یاد نہیں لیکن تقریر کے وہ حصے جو محمد یار نے یہاں پڑھ کر سنائے ہیں وہ ملزم نے اپنی تقریر کے دوران کہے تھے۔ جرح ہونے پر گواہ نے کہا کہ مختصر نویسی کی نوٹ بک پر میرے دستخط کرنے سے پہلے محمد یار نے قرآن پاک اور دوسرے مذھبی موضوعات کو چھوڑ کر پوری تقریر کی نقل کو دہرانے میں پانچ منٹ صرف کئے تھے۔ میں مسلم لیگ سے ہمدردی نہیں رکھتا نہ ہی میں نے کبھی مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کی مجھے مسلم لیگ یا کانگریس کے نصب العین کا علم نہیں۔ میں نے کبھی اخبار کا مطالعہ نہیں کیا۔ میں اس سلسلہ میں بالکل ناخواندہ ہوں۔ اس مرحلے پر عدالت کے پوچھنے پر میں نے (شاہ جی کے وکیل صفائی کے ایل گابا نے) کہا کہ ان اُنیس گواہوں میں سے جو صفائی میں طلب کئے گئے ہیں۔ ہم مسٹر محمد علی جناح، صدر مسلم لیگ کو چھوڑ رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے تعاون کا امکان نہیں اور اسی طرح تین دوسرے گواہوں کو بھی باقی ماندہ پندرہ گواہوں پر بہ شمول سابق وزیر اعظم صوبہ سرحد، صفائی کے لئے جرح بعد میں ہوگی۔ کیونکہ مقدمے کا اصل سوال یہ ہے کہ شاہ جی نے جلسہ میں اپنی تقریر کے دوران در حقیقت کیا کہا تھا؟

مولانا مظہر علی اظہر ایم ایل اے جنرل سیکرٹری آل انڈیا مجلس احرار صفائی میں بھگتنے والے پہلے گواہ تھے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ملزم مجلس احرار ہند کے صدر اور نائب صدر کے طور پر کئی بار منتخب ہوئے۔ مجلس احرار کا نصب العین یہ تھا کہ عدم تشدد پر مبنی ذرائع کے بل پر (برطانوی سامراج سے) کامل آزادی حاصل کی جائے۔ گواہ نے مزید کہا کہ ملزم اور میں نے یکم اور تین جون کو پنڈی گھیپ (ضلع اٹک) کانفرنس میں تقریریں کی تھیں۔ ۳ جون کو ہم راولپنڈی میں آگئے۔ جہاں ملزم نے تقریر کی۔ جس کا موضوعاتی مواد یہ تھا کہ انہیں آزادئ ہند کے لئے عدم تشدد پر مبنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے اور مسلمانوں کو اس جدوجہد میں حصہ لینا چاہیئے۔ انہوں نے مجلس احرار پر لگائے گئے الزامات کی تردید کی۔ مثلاً یہ کہ مجلس احرار کانگریس کا بغلی بچہ ہے۔ ملزم نے حکومت برطانیہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ یا یہ الزام کہ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کا خون بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا۔ نہ ہی ملزم نے "مرو یا مارو" کا نعرہ لگایا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ عوام کو برطانوی وقار کا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ اور سکھر کے مقام پر بھی ملزم نے عدم تشدد کی ہی حمایت کی۔

وکیل سرکار کی جرح پر گواہ نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں نے ملزم کی تقریر قلمبند نہیں کی۔ میرے علم کے مطابق کسی احرار کارکن کو آج تک تشدد کی تبلیغ پر سزا نہیں ہوئی۔ تشدد کا پرچار کرنے پر خود پارٹی ضابطے کے خلاف ورزی کی بنا پر اس کے خلاف کارروائی عمل میں لاسکتی تھی۔ گواہ نے بتایا کہ اس سے حفظِ امن عامہ کے سلسلہ میں سیالکوٹ کی ایک تقریر پر ضمانت لی گئی تھی۔ نیز یہ کہ اس نے کسی پولیس

رپورٹر کو نہیں دیکھا تاہم وہاں چند اخباری رپورٹر موجود تھے۔

سوال: جہاد کا مفہوم کیا ہے؟

جواب: اس کا مطلب جُہد، کوشش ہے جس میں تشدد بھی ہوسکتا ہے اور عدم تشدد بھی۔

سوال: کیا عام طور پر اس کا مطلب ایک مقدس جنگ نہیں لیا جاتا۔

جواب: ہاں ایسا ہی ہے۔

راولپنڈی کے ایک تاجر بخشی ابناشی رام نے اپنے بیان میں کہا کہ ملزم نے ۳ جون ۱۹۳۹ء کو ایک تقریر کی، میں جلسے میں موجود تھا۔ ملزم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان میں بسنے والے نو کروڑ مسلمانوں میں سے جو یہ سوچتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کرنے کا کوئی جواز نہیں وہ فریب میں مبتلا ہیں۔ لوگوں کو جیلوں میں جانے اور سول نافرمانی کی مہم چلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف ووٹوں کے صحیح استعمال کی ہے۔ اگر وہ احرار کو ووٹ دے دیں تو نو کانگریسی صوبوں کی طرح انہیں بھی حکومت مل سکتی ہے۔ گواہ نے بیان میں کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ ملزم نے مرو یا مارو کے الفاظ استعمال کئے۔ عوام سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ عدم تشدد پر سختی سے کار بند رہیں۔ اور برطانوی وقار کا خاتمہ کر دیں۔ سرکاری وکیل کی جرح پر گواہ نے بیان میں کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ مسلمان عام طور پر خیال کرتے ہیں کہ مجلس احرار تو صرف کانگریس کے بھاڑے کا ٹٹو ہے۔ میں گذشتہ تین عام جلسوں میں شریک ہوا اگرچہ میں نے تقریر کے کوئی حصے قلم بند نہیں کئے۔ تاہم تقریر کا خلاصہ میرے علم میں ہے۔ صفائی کے ایک اور گواہ چودھری مراد علی وکیل راولپنڈی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ۳ جون ۱۹۳۹ء کے جلسۂ عام میں موجود تھا۔ مولانا نے جلسے میں عدم تشدد کی تبلیغ کی۔ اور اپنی تقریر میں جہاد کا حوالہ دیا۔ لیکن اس انداز سے نہیں جیسے پولیس رپورٹر کی رپورٹ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ملزم نے صرف یہ کہا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں علماء نے آزادیٔ ہند کے لئے جہاد کا مطالبہ کیا تو نتیجہ قتل و غارت گری کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس لئے اب علماء نے فیصلہ کیا ہے کہ تشدد آزادی ہند کے لئے صحیح راستہ نہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ آزادی عدم تشدد کے ذریعے حاصل کریں۔ ملزم نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان پر برطانوی وقار کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اس نے ''مرو یا مارو'' کے الفاظ استعمال نہیں کئے۔ یہ گواہ نچلی عدالت میں ملزم کا وکیل بھی تھا۔ جس پر گواہ نے تسلیم کیا کہ مسٹر گابا نے نچلی عدالت میں مقدمے کے حق میں استدلال کیا تھا۔ مولوی شمس الدین خطیب مسجد پنڈی گھیب ایک اور گواہ تھا جس پر جرح ہوئی۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ پنڈی گھیب میں یکم تا ۳ جون مجلس احرار کی دعوت پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی اور ملزم نے دو یا تین تقریریں کیں۔ ملزم کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمیں آزادی صرف عدم تشدد کے ذریعے حاصل کرنی چاہیئے۔ ملزم نے پولیس کی تنخواہ میں اضافے کی ضرورت کی بھی حمایت کی۔ (قہقہہ) ڈاکٹر محمد عمر فزیشن سرجن نے کہا کہ میں ملزم سے واقف ہوں۔ میں نے ۸، ۹، ۱۰ جون کو سکھر کا دورہ کیا تھا اور سکھر کی مجلس احرار کی دعوت پر ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ ملزم نے کئی

تقاریر کیں جن میں اس نے عدم تشدد کا پرچار کیا تھا۔ صوبہ سرحد کے سابق وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے بھی مدعا علیہ کے حق میں شہادت دیتے ہوئے کہا کہ احرار عدم تشدد پر پوری مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ روزنامہ "ٹری بیون" کے رپورٹر رام لال چڈھا نے کہا کہ اس نے ۳ جون کی تقریر اپنے روزنامہ کے لئے قلمبند کی تھی۔ اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ تقریر کے سرکاری ترجمے میں ملزم پر جن الفاظ کے استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا ہے وہ اس نے نہیں کہے۔ چونکہ ملزم کو اپنی صفائی میں بھگتنے والے گواہوں کی سربراہی حاصل تھی۔ اس لئے آخری بیان حکومت کے ذمے تھا۔ جب اس کی صفائی میں دلائل شروع ہوئے تو مجھے (کے ایل گابا کو) چند لمحوں کے لئے (دلائل دینے میں) دقت محسوس ہوئی کیونکہ جج کے رائے دہندگان میں سے کوئی بھی زیادہ انگریزی سے واقف نہ تھا۔ اور فالشا نے اردو کے علاوہ کسی اور ذریعہ اظہار میں دلائل سننے سے انکار کر دیا۔ بغاوت اور اغوا کے مقدمے کو اردو زبان میں زیر بحث لانا آسان کام نہ تھا۔ لیکن میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں یہ بات بھول جاؤں کہ کمرہ عدالت میں کھڑا ہوں۔ اور اپنی بات کو اس انداز میں بڑھایا جیسے یہ کوئی عوامی پلیٹ فارم اور اس کی سیاست ہو۔ اور جس کے لئے کسی قانون قاعدے کی چنداں ضرورت نہ ہو۔ اس کا اثر اور نتیجہ حیران کن رہا۔ میرا استدلال ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ اور بعض ناظرین کے خیال کے مطابق ملزم نے جس طرح راولپنڈی میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر تقریر کی تھی میں نے اس سے بھی زیادہ بے پرواہ ہو کر خطاب کیا۔ ایک مرحلے پر عبدالعزیز نے میری قطع کلامی کرنا چاہی توجج نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ اور عبدالعزیز سہم کر خاموش ہو گیا۔ اور جب عبدالعزیز کی باری آئی تو بلاشبہ اس نے میرے پیش کردہ دلائل کو رد کرنے کی سخت کوشش کی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک ساری کھیل ہار چکا ہے۔ قانونی تشخیص کنندگان نے بہ یک زبان یہ اعلان کیا کہ ملزم مجرم نہیں اور جج فالشا نے اس فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے ملزم کو ہر دو الزامات سے بری کر دیا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ میرے پاس پہنچے اور مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔ انہوں نے میرے دونوں رُخساروں پر بوسہ دیا۔ لوگوں کا ایک پُر جوش و خروش ہجوم امڈ آیا جو مجھے بھی ہمراہ لیکر جلوس کی شکل میں شہر میں گشت لگانا چاہتا تھا۔ شام کو سٹی گارڈ نز میں حکومت اور قادیانیوں کے خلاف ۴ گھنٹے تک زور خطابت صرف کر کے شاہ جی نے پچھلے بقائے کا سارا حساب چکا دیا۔ تاہم یہ تقریر ایسی کسی مشکل میں پھنسانے کا باعث نہ بن سکی۔ میں اگلے روز کے مقدمے پر ایک نظر ڈالنے کے لئے عدالت سے واپس چلا گیا۔ اُس مقدمے میں میری بہترین کوشش کے باوجود جج نے شاید میرے خلاف ہی فیصلہ دیا۔ لیکن یہ تو ہر وکیل کا روزمرہ کا نصیب ہے۔

FROM "BATTLES" AT THE "BAR"

"THE TRIALOFATTAULLAHSHAH P:۱—۹

BY K L GAUBA ,BOMBAY

از حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

عَلَمُ الْعِلْمِ وَالْاَعْمَالِ عَظِیْمُ الشِّیَمْ

قطعہ تاریخیہ بوفاۃ الشاہ عطاء اللہ البخاری رحمۃ اللہ علیہ

جَیِّلُ الْفَضْلِ خَطِیْبُ النَّادِرَاتِ الْحِکَمْ
(کوہ فضل نادر حکمتوں کے خطیب)

عَلَمُ الْعِلْمِ وَالْاَعْمَالِ عَظِیْمُ الشِّیَمْ
(علم وعمل کے پرچم کمال کی عادات والے)

نُکَتٌ بَادِرَۃٌ خُطْبَتُہٗ مُرْتَجَلًا
(جن کی فی البدیہ تقریر بے ساختہ نکتے ہوتے تھے)

حَیْرَانٌ لِتَعَالِیْہِ شَدِیْدُ النِّقَمْ
(کہ سخت سخت نکتہ چین ان کی بلند پروازی سے حیران تھے)

عَرَبٌ عَارِبَۃٌ لَوْ سَمِعُوْا خُطْبَتَہٗ
(خالص عرب لوگ اگر ان کی تقریر سن لیتے)

رَجَعُوْا عَنْ کَلِمَاتٍ رَضَخُوْا لِلْعَجَمْ
(تو ان سب باتوں سے رجوع کر لیتے جو عجمیوں کے سر پر پھینک ماری ہے)

عَجَمٌ قِیْلَ لَھُمْ لَیْسَ فَصِیْحٌ فِیْھِمْ
(وہ عجمی قوم جن کے بارہ میں یہ کہا گیا ہے کہ ان میں فصیح و پُرگو نہیں سکتا)

بِتَلَاقِیْہِ لِصَاحُوْا بِبَلٰی اَوْ نَعَمْ
(ان کی ملاقات پر وہ لوگ چیخ اٹھتے کہ ضرور ضرور بلٰی یا ہاں ہاں ہوتا ہے)

بَطَلٌ مُبْطِلُ مَا اَبْدَعَهُ مُبْتَدِعٌ

(وہ بہادر جو بدعتیوں کی سب بدعتوں کو باطل کر رہا تھا)

هَزَمَتْ جَيْشَ اَبَاطِلِ لَهُ بِنْتُ فَمِ

(ان کی باطل دلیلوں کے لشکر کو جس کے منہ ایک لونڈی نے شکست دیدی)

سَنَنُ السِّحْرِ لَهُ بَيَّنَ فِيْنَا سُنَنًا

(ان کی سحر بیانی نے وہ وہ سنتیں بیان کرکے رکھدی ہیں)

رُئِيَ الْبَعْضُ عَنِ السَّرْدِ لَهَا مِثْلَ عَمِ

(کہ بعض لوگ ان کے ذکر سے مثل اندھے کے بنے ہوئے تھے)

اُخِذَ الشَّاهُ وَقَدْ كَانَ عَطَاءً اِذْ لَا

(شاہ صاحب لیلئے گئے اور وہ عطا تھے تو رنج نہ کرو کیونکہ)

عَجَبُ الْاَخْذِ لِمَنْ مِنْهُ عَطَاءُ النِّعَمِ

(اس کا تعجب نہیں ہو سکتا جس کی طرف سے عطاء نعمت ہوا)

فَقَدِ الْمِصْقَعُ فَاللّٰهُ اِلَيْهِ الشَّكْوٰى

(زبردست خطیب گم ہوگیا تو اللہ تعالےٰ سے ہی اپنی مصیبت کا شکوہ ہے)

غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ اِذْ رَحِلَ الْعَدَمِ

---

۸۱ ۱۳ ھ

(اللہ ان کی بخشش فرماویں - سفر عدم کی تاریخ ہے)

حضرت مفتی جمیل احمد تھانویؒ

نکتہ سنج و لطفِ بزم و دیں شعار

(قطعہ تاریخ وفات)

رفت از دنیا عطا اللہ شاہ
اہل حق را رنج و غمہا پیہم است

گو عطا اللہ را معمول ہست
واپسی از عاصیاں عادت ہم است

سید آں سید بود کو ہر دمے
پیرو آں سید کل عالم است

در خطابت مایۂ نازے نماند
عالم تقریر ویراں عالم است

ممبراں خاموش نوحہ میکنند
کو؟ بشکل خطبہ صد جام جم است

بر سر منبر خطیباں پے بہ پے
لیک می بینی کہ کے ایں دم خم است

غزوہ ہا دیدی کہ باتیغ و [illegible] است
لیکن آں خطبہ کجا؟ کو یک [illegible] است

لفظ لفظے کز زبانش می چکید!
بر سر اعدائش تیغ دودم است

نکتہ سنج و لطف بزم و دیں شعار
گر میسر آبدت ہم کم کم است

چشم جویائے جمال گفتگو
بر قدم می افتد و پیہم نم است

رحمتِ خاصِ الٰہ العالمین
تا قیامت متقی را محرم است
سالِ رحلت آنکہ عالم می شنید
نوحہ مرگِ خطیبِ اعظم است

۱۹۶۱

مجاہدِ ملت رح

قطعۂ تاریخ

از بزم دہر شاہ بخاری کہ بودہ است
معروف با امیر شریعت، گزشت حیف
تاریخ سال رحلت او از سر جہاد
گفتیم، یک مجاہد ملت گزشت حیف

۱۳۸۴ − ۳

۱۳۸۱

میر اُفق کاظمی امروہوی

اثرِ خامہ : میر سید حبیب احمد اُفق کاظمی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ (عمِ مکرم مولانا سید احمد سعید کاظمی مرحوم)

ضیاء محمد ضیاء

بلاغت کے چمن کا نغمہ پرداز

بُخاری بھی ہوئے رُخصت جہاں سے
فضا معمور ہے آہ و فغاں سے

دلوں پر کوہِ غم اِک اور ٹوٹا
گری اِک اور بجلی آسماں سے

نظر آتا ہے ویرانی کا عالم
یہ کون آج اُٹھ گیا ہے درمیاں سے

یہ کون اُٹھا کہ فریاد اُٹھ رہی ہے
دلِ مرد و زن و پیر و جواں سے

دریغا ملتِ اسلامیہ آج
ہوئی محروم مردِ راہ داں سے

اسیرِ کاروانِ اہلِ ایماں
بچھڑ کر جا رہا ہے کارواں سے

وہ ساقی جس سے میخانہ تھا آباد
اُٹھا ہے آج بزمِ میکشاں سے

تہی ہے اب فضا اپنے چمن کی
نوائے عندلیبِ نغمہ خواں سے

درخشاں تھی جبیں جس سے وطن کی
وہ ماہِ ضوفشاں لائیں کہاں سے

بھڑک اُٹھا ہے دل میں شعلۂ غم
ہے جاری جُوئے خوں چشمِ رواں سے

بہر سُو نالہ و آہ و بکا ہے
بہر سُو محشرِ شیون بپا ہے

ہوا رُخصت امیرِ جیشِ احرار
گروہِ اہلِ حُریت کا سالار

وہ افرنگی ملوکیت کا دشمن
وہ آزادی کی عظمت کا پرستار

فلک کو چیرتی تھی جس کی تکبیر
فضا میں گونجتی تھی جس کی للکار

وہ تقدیس شریعت کا محافظ
وہ ناموسِ رسالت کا نگہدار

نگہ اس کی جمالِ حق سے روشن
دل اس کا عشقِ پیغمبر سے سرشار

وہ مردِ حق، وہ درویشِ خدا مست
رہا دل ماسوا سے جس کا بیزار

عطا جس کو ہوئی تھی چشمِ بینا
جسے بخشا گیا تھا قلبِ بیدار

توکل اور قناعت کا نمونہ
حمیت اور خود داری کا معیار

فقیرِ بے سرو ساماں کہ جس نے
نہ رکھا میر و سُلطاں سے سروکار

رہا اس رزمگاہِ زندگی میں
حوادث سے ہمیشہ گرمِ پیکار

وہ غازی، وہ مجاہد، وہ قلندر
وہ درویشی و استغنا کا پیکر

رہا باطل سے دائم برسرِ جنگ
تھی اُس کے حوصلوں پر یہ فضا تنگ

بتاتا تھا ہمیں اپنے عمل سے
کہ رُوباہی ہے شیروں کے لئے ننگ

زمیں تھی اس کی بے باکی پہ ششدر
تھا حق گوئی پہ اُس کی آسماں دنگ

غنا و فقر کا وہ نقشِ سادہ
وہ ذوق و شوق کی تصویر صد رنگ

وہ اُس کے شعلۂ تقریر کی آنچ — پگھل جاتے تھے جس سے آہن و سنگ
وہ اُس کا نعرۂ ھل من مبارز — لرز جاتی تھی جس سے رُوحِ افرنگ
وہ اُس کی رس بھری باتوں کا انداز — وہ اس کی پُرفسوں گفتار کا ڈھنگ
نوا پرداز تھا یُوں محفلوں میں — چمن میں جیسے اک مُرغ خوش آہنگ
صدا اُس کی جوابِ صوتِ بُلبُل — نوا اس کی حریفِ نغمۂ چنگ
نہ بُھولے گا کبھی اس کو زمانہ — رہے گا دہر میں اس کا فسانہ
وہ میدانِ خطابت کا سبک تاز — وہ بزم شعر کا طاؤسِ طناز
گلستان فصاحت کا نوا سنج — بلاغت کے چمن کا نغمہ پرداز
تخیل میں ہمائے آسماں سیر — تفکر میں عقابِ چرخ پرواز
وہ اس کی زمزمہ خوانی کا اسلوب — وہ اس کی شعلہ گفتاری کا انداز
وہ اس کے نالۂ پُردرد کا سوز — وہ اس کے نغمۂ پُرکیف کا ساز
سخن میں لحنِ داؤدی کی تاثیر — تکلم میں دم عیسیٰ کا اعجاز
خطیب بے مثالِ عصرِ حاضر — جو تھا اپنے حریفوں میں سر افراز
جو اربابِ شریعت کا تھا ہمدم — جو اصحاب طریقت کا تھا ہمراز
وہ ملت کے لئے سرمایۂ فر — تھا جس کی ذات پر اسلام کو ناز
سُنیں گے اب کہاں ہم اس کی باتیں — سُنیں گے اب کہاں ہم اس کی آواز
ہوئی دورِ سلف کی داستاں بس — ضیاء تم بھی کرو اپنا بیاں بس

سر شیخ عبدالقادر، کی جان پہچان اور تعلقات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ سر سید احمد خاں سے لے کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور داغ سے لے کر حفیظ جالندھری تک، ہر شخص سے ان کے یکساں مراسم تھے۔ باتیں کرنے پر آتے یا گزری ہوئی صحبتوں کا حال بیان کرتے تو سماں باندھ دیتے تھے۔ حافظے کی یہ کیفیت تھی کہ نصف صدی قبل کے واقعات ان کے ذہن میں یوں محفوظ تھے گویا کل کی بات ہے۔ تفصیلات و جزئیات تک یاد تھیں۔ ایک روز فن خطابت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ محفل میں کسی شخص نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر کلامی کی بہت تعریف کی۔ شیخ صاحب کہنے لگے۔ ہاں بھائی، عطاء اللہ شاہ بخاری خوب بولتے ہیں۔ لیکن محسن الملک مرحوم بھی کسی سے کم نہ تھے۔

(عاشق حسین بٹالوی۔ چند یادیں چند تاثرات ص ۳۵)

ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ مرحوم

بخاری کی یادیں

وہ ہستیاں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

تقسیم ملک سے پہلے ایک دن شاہ جی کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے اچانک لحن داؤدی میں بلند آواز سے یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

مغاں مجھ مست بن خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مۓ گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

حاضرین جھوم اٹھے اور اس تصور میں کھو گئے کہ واقعی جب شاہ جی داغ مفارقت دے جائیں گے تو دنیا کی رنگینیوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اب جب کہ تصور حقیقت میں ڈھل گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ جی کا دنیا سے اٹھ جانا کچھ عجب سا سانحہ ہو گیا ہے۔

وہ مرد درویش جن کی ایک کڑک نے بڑے بڑے سرکشوں کو جھکا دیا جن کی حق گوئی اور بے باکی کے آگے سلطنت برطانیہ کی طاغوتی طاقت نہ ٹھہر سکی۔ جس کے زمزمے فضاؤں میں تیزی سے گونجے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس پر ہر مکتبۂ خیال نے آنسو بہائے۔

والٹیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے بستر پر چھینکتا تھا تو یورپ کے تخت لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ یہی شاہ جی کا حال تھا۔ کہ ان کے نام سے برطانوی سامراج لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

شاہ جی کی خدمت میں جو کوئی ایک دفعہ حاضر ہوا۔ وہ ہمیشہ کے لئے انہی کا ہو گیا۔ میں جب پہلی دفعہ شاہ جی سے ملا تو ایسا معلوم ہوا کہ شاہ جی سے میری بڑی پرانی جان پہچان ہے۔ کوئی بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک اور دوست نے شاہ جی سے پہلی ملاقات کے بعد بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

تجھ سے اب مل کر تعجب ہے کہ عرصہ اتنا
آج تک تیری جدائی میں کیوں کر گزرا

انسان خواہ کتنا ہی بہادر ہو۔ کتنا ہی شہ زور ہو، موت کا سرد اور بے رحم ہاتھ اسے وقت موعود پر آ دبوچتا ہے۔

وہ ہستی جس نے سر سے لے کر پیر تک زندگی کی ساری عمارت اپنے ہاتھ سے کھڑی کی،
جس نے اس عمارت کی ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے چنی ہو،
جس نے بادشاہوں کو دعوت مبارزت دی تھی،
جس نے وقت کے فرعونوں کو للکارا،
جو باطل کے خلاف صف آرا رہا،

جب موت اس کے پاس آئی تو وہ اس کے سامنے جھک گیا۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

شاہ جی کی بیماری کی خبریں کئی ماہ سے سن رہے تھے۔ آخر وہ گھڑی آگئی جب وہ عظیم شخصیت ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔

اب اس کی یاد باقی ہے۔ اس کے معرکوں کی گونج تاریخ کے صفحات میں سنی جائے گی۔ اس کی عظیم خطابت کے قصے لوگوں کی زبانوں پر رہیں گے۔ اس کی بہادری کی داستان ضرب الامثال بنے گی۔ مگر جس نے دنیا کو اتنا کچھ دیا اس کی زندگی ہمیشہ دکھی رہی۔ وہ جن کے لئے لٹتا رہا انہوں نے وقت کی مصلحتوں کا ساتھ دیا۔ اور اس کے نقش قدم پر چلنے سے انکار کر دیا۔ مگر ایک دن آئے گا جب مورخ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے گا اور پھر معلوم ہو گا کہ بخاری کے دل میں قوم کے لئے کتنا درد تھا۔ اور وہ جو کچھ کہتا تھا اس میں کتنا خلوص تھا۔

حضرت شاہ جی کو خداوند کریم اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ ان کے مزار مقدس پر اپنے انوار برسائے کہ انہوں نے اپنی زندگی قوم پر نثار کی۔ (یہ مضمون شاہ جی کی وفات کے چار روز بعد لکھا گیا)

محمد احسان الحق (سول جج) گوجرانوالہ

امیر شریعت

امیر شریعت ملک البیان
امیر شریعت رئیس خطابت کو

لہ فی جنۃ اعلی المکان
جنت میں بلند درجات نصیب ہوں

فمات ولم تمت نغمات صوت
وہ فوت ہو گئے مگر

لما یتلو من السبع المثانی
ان کی تلاوتِ قرآن کی آواز زندہ ہے

وقد رجع العطاء الی الہ
اللہ کی عطا، اللہ کی طرف لوٹ گئی

ہو القیوم والمخلوق فانی
وہ ہمیشہ سے قائم ہے اور مخلوق فانی

ملک امجد حسین ایڈووکیٹ

مرد حق پرست

گزری ہوئی یاد کے دریچوں سے جھانکتا ہوں تو امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری مرحوم و مغفور کو اپنے غریب خانہ (بٹالہ ضلع گورداسپور) کے ایک کمرہ میں بڑے بے تکلف انداز میں مصروف گفتگو پاتا ہوں ملنے والوں کا جم غفیر اور شیدائیوں کا ایک گروہ ان کے ارد گرد حلقہ کئے بیٹھا ہے۔ کسی سے چھیڑ خانی، کسی سے لطیفہ گوئی اور کسی سے سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ الغرض ان کی محفل رنگا رنگ کی خوبیوں کا مرقع ہوتی تھی۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ سرزمین بٹالہ نے احرار کی اٹھان و مضبوطی میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بچپن کے زمانے کے تاثرات زیادہ اجاگر ہو کر تو نہیں ابھر رہے۔ لیکن اتنا یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں احرار کے امیدوار ایک شخص محمد خان تھے۔ اور ان کا حلقہ نیابت تحصیل بٹالہ تھا۔ الیکشن کا مرکزی دفتر چونکہ بٹالہ میں تھا اس لئے شاہ جی کا قیام بھی وہیں تھا۔ الیکشن مہم پر ان کے ساتھ ایک دفعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک گاؤں (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) میں جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ جب شاہ جی مرحوم اسٹیج پر تقریر کے لئے تشریف لائے تو ان کے سامنے ایک چھوٹا سا بچہ ہاتھ میں جلتی بیٹری لئے بیٹھا تھا۔ چونکہ روشنی ان کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس بچہ کو بیٹری گل کرنے کے لیے کہا۔ نامعلوم کیوں! انتہائی کوشش کے باوجود بچہ بیٹری بجھانے میں کامیاب نہ ہوا۔ شاہ جی مرحوم اس کو دیکھ کر ہنسے اور پھر یقین جانیے اسی غیر اہم واقعہ سے اپنی بے مثال تقریر کا موضوع تیار کر لیا۔ جب آخری بار بھی بیٹری بجھ نہ سکی تو انہوں نے فوراً کہا۔ او منڈیا توں بیٹری بالی اے تے بجھ دی نئیں۔ مرزے نے وی نبوت چرائی اے تے نبھ دی نئیں (او بچے تو نے بیٹری چلائی ہے لیکن اب بجھ نہیں رہی۔ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے اور اس سے نبھایا نہیں جائے گا) شاہ جی کا دلنشیں طرز بیان الفاظ کی روانی، زبان کا جادو اور خیالات کا تسلسل فضاء میں ایک ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ سامعین کبھی قہقہوں کی دنیاء میں آباد ہوتے اور کبھی آنسوؤں کی لڑیاں ان کے رخساروں پر نظر آ جاتیں۔ میری آنکھوں سے وہ منظر اور دماغ سے وہ خیال آج تک اوجھل نہیں ہو سکا کہ برصغیر ہندو پاک کا یہ بے مثل خطیب کس طرح بے مطلب باتوں سے بے مثال تقریروں کے عنوان تیار کرتا پھر ان کو جادو و تاثر کے الفاظ میں لپیٹ کر سننے والوں کی طرف اس اچھوتے انداز میں پھونک دیتا کہ ہر شخص استعجاب و قبولیت کی مکمل تصویر بن جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ عظیم الشان اگر چاہے تو انسانوں کے جم غفیر کو آگ کی لپیٹوں میں دھکیل دے۔ تو پھر بھی شکوہ و شکایت کی کوئی آواز بلند نہ ہو گی۔

میری عقل و سمجھ کی پرواز اس زمانہ میں بالکل محدود تھی۔ اور سیاسیات کے پیچ و خم کو سمجھنا میری ادراک سے باہر، لیکن پھر بھی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے جو بے مثال صلاحیتیں اس مرد حق

کو دے رکھی تھیں۔ کسی میں نہ ہوں گی۔ اگر میں اس کو اس براعظم کا "مارک انتھنی" سمجھ دوں تو شاید پھر بھی ان کی خطابت و تقریر کی خوبیوں کا پورا پورا خاکہ پیش نہ ہو۔ ایسے انسان یقیناً قوموں کی قسمت بدلتے ہیں۔ اور ان کے عمل و کردار کی قوتوں سے تاریخ اپنے صفحات کی رنگینیوں کو دوبالا کرتی ہے۔ لیکن کیا مسلمان قوم نے اس مردِ حق کو اپنی صفوں میں مناسب مقام دیا ہے؟

پاکستان کی تخلیق کے بعد وہ عملاً سیاست سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اور اپنی تمام ذہنی و عملی قوتوں کو دفاعِ پاکستان کے لئے صرف کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ لیکن بڑے دکھ اور درد کے ساتھ اس خیال کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان اسلام کے مقدس نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے اس لئے تم کو دینِ حق کی سربلندی کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔ اور ہمارے اعمال و کردار کے کسی پہلو سے اسلام کے مقدس دامن پر کوئی دھبہ نہیں آنا چاہیئے۔ نہ معلوم! جو کچھ اس مردِ حق نے کہا تھا وہ کس حد تک قابلِ عمل سمجھا گیا ہے۔ اور دینِ حق کی اشاعت و ترویج کے لئے ہم نے کیا کیا ہے۔ مملکت خداداد پاکستان میں آنکھوں دیکھتے لوگ ترقی و کامرانی کے زینوں تک پہنچ گئے۔ سیم و زر کی جھلک نے اکثر آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ مستحق اور غیر مستحق انسانوں نے دولت کے انبار لگالئے ہیں صحیح اور جعلی کلیموں کا کاروبار کر کے چشم زدن میں لاکھ پتی ہو گئے ہیں اور اپنی فکر و ضمیر کی تمام روشنیوں کو معدوم کر دیا۔ وہاں اس مردِ درویش نے اپنے آپ کو ان الائشوں سے بالکل مبرا رکھا۔ اور حکومت وقت کی کسی مراعت کو قابلِ قبول نہیں سمجھا۔ جب عظمت و جلالت کا یہ پیکر موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا تو حکومت نے یہ تجویز دی کہ ان کی آخری آرامگاہ ملتان کے مشہور مقام قلعہ قاسم باغ پر بنائی جائے۔ لیکن ان کے وارثوں نے ان کی وصیت کے مطابق اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کیا۔ اور برصغیر کے اس بطلِ جلیل کو جو آزادی و حریت کے لئے قید و بند کی تکالیف سے نہ گھبرایا اور کلمۂ حق تختہ دار پر بھی کہنے سے گریز نہ کیا عوام کی آغوش میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ کیونکہ قولاً و فعلاً وہ عوام کا بندہ تھا۔ اور اس رسول کا نواسہ جس نے امیری پر غریبی کو، نخوت پر حلیمی کو، جلالت و تمکنت پر انکسار و عجز کو، بادشاہت پر فقیری کو اور انسانیت کو فرقہ بندی پر ترجیح دی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

وہ ایک طوفاں، کہ عزم جولاں بھی جسکے قدموں پہ سر جھکائے

بہار کاشمیری

وہ ایک درویش آہنی جو بنام آزادی گلستاں
دیار مغرب کے رہنے والوں کے ذوق جور و ستم سے الجھا
وہ ایک درویش شمع عزم و عمل جلا کر وطن میں جس نے
غرور افرنگ کو صدا دی طلسم جاہ وحشم سے الجھا!

خطیب اعظم کہ جس نے منبر پہ خواجگی کو ہدف بنا یا
وہ ایک شعلہ کہ قصر پرویز جس کو دیکھے تو زلزلائے
خطیب اعظم کہ جس نے منبر پہ حق پرستی کا گیت گایا
وہ ایک طوفاں کہ عزم جولاں بھی جس کے قدموں پہ سر جھکائے

وہ اک شگفتہ مزاج انساں وہ ایک شعر و ادب کا رسیا
وہ اک سخنور جو بزم شعروسخن میں آیا تو گل بکھیرے
وہ ایک حافظ وہ ایک عرفی وہ ایک خیام ایک غالب
وہ ایک دانائے راز جو انجمن میں آیا تو گل بکھیرے

دیار ملتاں کے رہنے والو دیار ملتاں کے بدنصیبو
سنا ہے درس حیات دے کر انساں سو گیا ہے
سنا ہے پھر شہر زندگی میں چراغ اشکوں کے جل رہے ہیں
سنا ہے پھر شہر زندگی میں حسین مہتاب کھو گیا ہے

گرمی سے حریت کی اک آتش کدہ تھا دل

باطل پسند ہونا بڑا سود مند تھا — وہ مرد باخدا! تو مگر حق پسند تھا
بے لوث بے ہراس گزاری تمام عمر — تھی حرص عز و جاہ نہ خوف گزند تھا
اٹھی نہ سوئے دولتِ دنیا کبھی نظر — کس درجہ بے۔ نیاز دل مستمند تھا
چلتا فریب دانہ و دام اس پہ کس طرح — سدرہ نشیں بلند زکید و کمند تھا
تھا درد ملک وملت اسے جان سے عزیز — درماں سے بے نیاز دل درد مند تھا
گرمی سے حریت کی اک آتشکدہ تھا دل — اور دل میں جو خیال تھا گویا سپند تھا
اس ساحرِ کلام کے ایک ایک لفظ میں — اک قلزمِ معانی و مفہوم بند تھا
دار و رسن کے پنجۂ خونیں سے بے نیاز — محبوب اس کو سلسلۂ قید و بند تھا
ہم اور اس کی موت کے شایان شان غم
اس کا مقام و مرتبہ بسمل بلند تھا — بسمل سعیدی۔ دہلی

وہ پیکرِ حمیت و غیرت نہیں رہا

سرمایہ دار حسنِ خطابت نہیں رہا — آئینہ دار شوکت ملت نہیں رہا
پروانۂ چراغ رسالت نہیں رہا — اور رازدارِ ختم نبوت نہیں رہا
افسوس وہ شہید نبوت نہیں رہا — واحسرتا! امیرِ شریعت نہیں رہا
اک برق بے اماں تھا جو باطل کے واسطے — وہ شعلۂ نوائے صداقت نہیں رہا
افسوس بزمِ عشق پر طاری ہے اک سکوت — لذت شناسِ دردِ محبت نہیں رہا
ملتان جس کے فقر سے شاہی کا ہمنشیں — وہ پیکر حمیت و غیرت نہیں رہا
جس نے کلی کلی کو کیا آشنائے درد — نغمہ طرازِ گلشن وحدت نہیں رہا
رنگیں ہے جس سے قصۂ آزادیٔ وطن — صد حیف وہ مجاہد ملت نہیں رہا
تھا عالم شباب کو پیری پہ جس کی ناز — وہ امتزاج دین و سیاست نہیں رہا
انگریز جس کے نام سے لرزاں تھا آج تک — وہ امتزاج دین و سیاست نہیں رہا
حیرت لحد پہ اس کی ہوں رحمت کی بارشیں
صد نازشِ تلاوتِ قرآں نہیں رہا — حیرت جالندھری

سید بدر الدین مرحوم

پٹنہ کی یادیں، بچپن کی باتیں

غالباً ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ ایک بزرگ تجارت کے سلسلہ میں صوبہ پنجاب کے ضلع گجرات سے پٹنہ آئے۔ یہ ضلع گجرات کے ایک باعظمت خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو سیادت و وجاہت اور سلسلہ بیعت کے لئے مشہور تھا۔ یہ خود بھی بہت ہی متدین اور متشرع اخلاق و عادات میں بہت ہی منکسر المزاج اور ملنسار تھے۔ محلہ جھاؤ گنج میں جو خواجہ عنبر کی مسجد ہے اسی کے حواشی مکانوں سے ایک میں ٹھہرے۔ ان کی تجارت کاشمیری شال اور جامہ وار (اعلیٰ قیمتی کپڑا) کے علاوہ مشک و زعفران کی تھی۔ جلد ہی انکی وجاہت، پیشہ میں ایمانداری اور اعلیٰ درجے کی چیزوں کی بکری کے باعث انکی رسائی پٹنہ کے بڑے بڑے گھروں میں ہونے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے خواجہ عنبر کی مسجد کے قریب ایک مکان کرائے پر لیا۔ اور اس میں جا رہے اور دو چار برس بعد اپنے بچوں اور ایک بھتیجے کو بھی پنجاب سے لے آئے جو ان کی نگرانی میں مکتب اور اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے بھتیجے سید ضیاء الدین جو حافظ قرآن تھے اور وہ تجارت میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ اپنے چچا ہی کی طرح بڑے متدین اور متشرع بھی تھے۔ دونوں چچا بھتیجا ساتھ ہی رہتے تھے، کبھی مال کی بکری میں ساتھ جاتے اور کبھی الگ الگ، پنجاب سے جو اشخاص آتے وہ ان دونوں سے ملنے کو ضرور ان کے پاس جاتے آس پاس کے سکھ حضرات بھی ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے۔

انہی دنوں محلہ خانہ باغ پٹنہ میں ایک بزرگ رئیس سید احمد شاہ رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی خانہ باغ کہلاتا تھا اور اسی مکان کے نام پر یہ محلہ بھی خانہ باغ کہلانے لگا۔ سید احمد شاہ صاحب نجیب الطرفین سید تھے۔ انکو تلاش تھی کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا لڑکا مل جائے تو اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دیں۔ جب سید ضیاء الدین صاحب اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں پٹنہ آئے تو ان کو بہت جچے۔ انکے یہاں دونوں چچا بھتیجا کا آنا جانا بڑھا تو سید احمد شاہ نے حافظ سید ضیاء الدین صاحب کو بہت زیادہ نزدیک سے دیکھا۔ لوگوں سے انکے خاندانی حالات معلوم ہو ہی چکے تھے۔ اب نسبت کا سلسلہ چلا تو بات پکی ہوتے دیر نہیں لگی۔ غرض سید ضیاء الدین سید احمد شاہ کے داماد بن گئے۔ سید ضیاء الدین صاحب کے ہاں کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام تو سید شرف الدین احمد رکھا گیا مگر حافظ سید ضیاء الدین اس کو عطاء اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہی نام آخر میں انکا نام پڑ گیا۔ سید ضیاء الدین صاحب کے چچا آخر عمر میں ضلع گجرات چلے گئے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹوں میں ایک صاحب پٹنہ میں ہی رہ گئے اور پولیس میں سب انسپکٹری کی ملازمت کر لی انکا نام سید محمد اسحٰق تھا۔ (۱) کچھ دنوں کے بعد حافظ سید ضیاء صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت عطاء اللہ شاہ کمسن تھے مگر انکے والد صاحب نے خود انکی دیکھ بھال شروع کی۔ اپنی اہلیہ کی زندگی میں بھی محلہ خانہ باغ کے قریب محلہ

لنگر گلی میں ایک مکان خرید لیا تھا وہیں رہتے اور شال دو شالہ جامہ وار اور مشک و زعفران کی تجارت کرتے تھے۔ سال دو سال میں پنجاب بھی چلے جاتے۔ کچھ دنوں کے بعد سید ضیاء الدین صاحب نے دوسری شادی پنجاب میں کی مگر پٹنہ کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ اب سید عطاء اللہ شاہ عنفوان شباب کی سرحد میں پہنچ چکے تھے۔ اسی زمانے میں میرے والد مرحوم سید ضمیر الدین احمد صاحب نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے یہاں ان کے اجلاس کامل کے نائب صدر اور ان کے چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو کر جانے لگے تو یہ فکر ہوئی کہ میری دیکھ بھال کے لئے کوئی اچھا آدمی مل جائے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں سید ضیاء الدین صاحب تھے یہ والد مرحوم کے دوست بھی تھے، دیانتدار اور بڑے ہمدرد بھی۔ رہ رہ کر میرے والد مرحوم کی نظر انتخاب حافظ سید ضیاء الدین صاحب ہی پر ٹھہرتی تھی مگر ہچکچاتے تھے کہ ان سے میری تعلیم اور نگہداشت صدر گلی میں رہ کر کرنے کی بات کہیں یا نہیں۔ آخر ایک دن جب حافظ صاحب مرحوم تشریف لائے تو والد مرحوم نے اپنی مشکل ان کے آگے پیش کی، جس میں یہ استدعاء بھی تھی کہ بھوپال جب والد مرحوم جائیں تو پٹنہ میں میری تعلیم و تربیت اور نگہداشت کا کام حافظ صاحب انجام دیں۔ حافظ سید ضیاء الدین صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ یہ بات منظور کر لی مگر شرط یہ رکھی کہ باورچی خانہ انکا اپنا رہے گا۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب اس پر سختی سے مصر تھے۔ آخر انہیں کی بات رہی۔ جناب حافظ صاحب کو والد مرحوم صرف میری تربیت تعلیم و نگہداشت کا کام نہیں سپرد کر گئے بلکہ گھر کا مختار کل بھی انکو بنا کر گئے۔ اب حافظ سید ضیاء الدین صاحب اپنے مکان لنگر گلی سے میرے مکان محلہ صدر گلی میں اٹھ آئے۔ ان کے فرزند سید عطاء اللہ بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ جن کو میں عطاء اللہ بھائی کہتا تھا۔ سید عطاء اللہ کی عمر اس وقت اٹھارہ انیس سال کی ہو گی۔ یہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑے ہوں گے۔ انہوں نے بھی قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی کچے تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت اور گردان میں بڑی تساہلی کرتے اور اس کے لئے جناب حافظ صاحب کی ڈانٹ بھی سنتے۔ سید عطاء اللہ نے ابتدائی عربی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ صدر گلی آئے تو ہمارا گھر بھرا ہوا ملا۔ ہم سبھوں کا مکان بہت بڑا تھا۔ ایک محلہ ہی کہیئے۔ میرا مکان، میرے ماموں صاحبان کے مکانات زنانے اور مردانے حصے سب ایک ہی حلقے میں تھے۔ سید عطاء اللہ ایک تو یہ یونہی کھلنڈرے اور ہنسوڑ طبیعت کے نوجوان تھے۔ یہاں ان کو ساتھی بھی مل گئے۔ کچھ یہاں کے اقامت پذیر طلباء اور دو تین نوجوان میرے ماموں صاحبان یہ سب انکے ساتھی اور دوست تھے۔ عطاء اللہ شاہ بچپن سے ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی کے آدمی تھے۔ یہاں ان کا خوب جی لگا۔ صبح اور شام حافظ صاحب مجھے قرآن شریف اور دوسری کتابیں پڑھاتے۔ ان وقتوں میں پڑھنے کے لئے سید عطاء اللہ بھی پکڑے جاتے اکثر ان کے ساتھ یہ ہوتا کہ تھوڑا سا پڑھ کر جناب حافظ صاحب سے کہتے کہ اب نہیں پڑھوں گا اور حافظ صاحب فرماتے کہ اچھا کتابیں اٹھا لو اور جاؤ۔ میں نے دیکھا کہ یہ پڑھنے سے چھٹکارا پانے کی اچھی ترکیب ہے چنانچہ ایک دفعہ یہی داؤ میں نے بھی استعمال کیا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے بھی حافظ صاحب سے کہا کہ اب نہ پڑھوں گا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ گلو خلاصی ہو جائے گی مگر میرے اس

کہنے پر ایک زلزلہ آیا۔ جناب حافظ صاحب گرج کر بولے تو نہیں پڑھے گا تو تیرا کچومر نکال دوں گا۔ عطاء اللہ کی پیروی کرنے چلا ہے۔ تو اس کی ریس نہ کر۔ حقیقت یہ تھی کہ سید عطاء اللہ اگرچہ ان کے بیٹے تھے مگر جناب حافظ صاحب مجھے بھی ان سے کم نہ سمجھتے تھے اور بڑی محبت کرتے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ سید عطاء اللہ بچپن ہی سے آزاد منش اور ایک حد تک سرکش بھی تھے۔ اور اسی لئے جناب حافظ ان پر زیادہ سختی بھی نہیں کرتے تھے۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے دل جوئی بھی کرتے تھے۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین کی تجارت یہاں بھی جاری تھی۔ کبھی خود معزز خریدار آپ کے پاس آجاتے کبھی یہ ایسے لوگوں کے یہاں جاتے تو انکے حسب فرمائش شال دو شالے خریدنا چاہتے اگر پسند کی چیزیں نہ ہوتیں تو کشمیر سے خط لکھ کر منگواتے اور ان کو دیتے۔

جناب حافظ صاحب تقریباً ساڑھے چار سال میرے یہاں مستقل طور پر رہے اور عطاء اللہ شاہ صاحب بھی ان کے ساتھ یہاں رہے۔ آخر میں عطاء اللہ شاہ صاحب میرے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے۔ ایک دفعہ میرے ایک ماموں عبدالحفیظ صاحب جو دیہات میں رہتے تھے انکو اپنے ساتھ دیہات لے گئے وہاں یہ پانچ چھے مہینے رہ گئے ان کا خوب جی لگا دیہات کے لہلہاتے کھیت ان کو خوب پسند آئے۔ دیہات کی ندیوں میں مچھلی کا شکار ان کو خوب پسند آیا۔ بڑے بڑے جال، جسے زمین پر بچھا کر تیتر اور بٹیر کا شکار کرتے ہیں یہ خوب مشاق ہوگئے۔ انہیں دنوں جب میرے والد مرحوم بھوپال سے کچھ دنوں کی رخصت لیکر آئے تو وہ عطاء اللہ شاہ صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ انکو اپنے ساتھ لے گئے۔ بھوپال میں یہ آٹھ نو مہینے رہے۔ وہاں کی روداد یہ بڑے مزے میں بیان کرتے تھے۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب صدر گلی میں تھے تو ایک دو دفعہ چند ہفتوں کے لئے اپنے گھر گجرات پنجاب بھی ہو آئے یہاں انہوں نے عطاء اللہ شاہ کی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی برادری میں دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ محترمہ بڑی خدا ترس، عبادت گزار اور حافظہ بھی تھیں۔ آن سے جناب حافظ صاحب کو ایک لڑکا بھی تھا۔ حافظ سید عطاء الرحمن شاہ صاحب مرحوم جن کا گزشتہ برس انتقال ہو گیا: مرتب) جب والد صاحب مرحوم ۱۹۱۱ میں بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس آگئے تو جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب پھر واپس اپنے گھر واقع محلہ لنگر گلی چلے گئے مگر ہفتہ میں دو تین دفعہ صدر گلی ضرور آجاتے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد حافظ سید ضیاء الدین صاحب مستقلاً اپنے گھر گجرات پنجاب چلے گئے۔ اور ان کے ساتھ عطاء اللہ شاہ بھی گئے۔ پنجاب ہی میں (امرتسر شہر میں) عطاء اللہ شاہ نے اپنی عربی تعلیم مکمل کی اور مدرسہ سے نکلے تو اپنے ساتھ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت اپنے جلو میں لیکر نکلے۔

تقریباً عطاء اللہ شاہ صاحب کو پٹنہ سے گئے ہوئے تو دس سال ہوئے ہوں گے کہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں اور ان کی بصیرت افروز تقریر دو ایک جگہ ہوئی جس میں لوگوں کا بڑا مجمع تھا اور ایک تقریر اسی دن پٹنہ سٹی کی جامع مسجد مدرسہ پر رات میں ہوئی یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا جبکہ عدم تعاون کا ہر

طرف پر چار تھا۔ اور اسکول و کالج کی تعلیم کا طلباء بائیکاٹ کر رہے تھے۔ اس خبر کو کہ مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں کچھ ہی دیر گزری تھی کہ والد صاحب مرحوم کا ملازم خاص مجھے ان کے کمرے میں بلانے کے لئے آیا۔ جب میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک مولانا نما لحیم شحیم بزرگ بیٹھے ہیں، چہرے پر درمیانی درجہ کی داڑھی ہے، کھادی کا کرتہ اور اسی کا پائجامہ ہے اور سر پر چپکی ہوئی کھادی کی گول ٹوپی۔ مجھے دیکھ کر والد مرحوم نے ان حضرت سے کہا کہ لو میاں بدر الدین آ گئے۔ اب مولانا میری طرف پلٹے تو بڑی حد تک چہرہ جانا پہچانا نظر آیا۔ وہ لپک کر اٹھے اور مجھے بغل میں داب کر تقریباً زمین سے ایک فٹ اٹھا لیا اور میرا بھائی میرا بھائی کہتے ہوئے میری ہڈیاں اور پسلیاں چور کرنے لگے۔ بعد میں جب ان کو خود احساس ہوا کہ مجھے زور سے بھینچے ہوئے ہیں تو ہنس کر مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے بغور دیکھا تو عطاء اللہ تو غائب تھے یہاں مولانا سید عطاء اللہ بخاری بیٹھے ہیں۔ چہرے کا کھلنڈرا پن صاف ہو چکا تھا، پیشانی پر سنجیدگی کی شکنیں تھیں، داڑھی شرعی حد میں تھی مگر ہونٹوں میں مسکراہٹ اور آنکھ کی چمک یہ کہہ رہی تھی کہ ہم وہی عطاء اللہ ہیں جو پہلے تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھ سے میرے پڑھنے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا کہ بی، اے میں پڑھتا ہوں پھر میرے بچپن کے قصے سنانے لگے۔ یہ والد مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم سرکاری گروپ کے آدمی تھے کیونکہ خان بہادر بھی تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کانگریس کے بڑے سرگرم رکن اور پنجاب کی احرار جماعت کے روح رواں بھی تھے۔ مگر ذرہ برابر بھی میرے گھر میں انہوں نے سیاست کا تذکرہ نہ چھیڑا۔ یہ عدم تعاون اور اسکول و کالج کے طلباء سے تعلیم کی بائیکاٹ کا مطالبہ اپنی گفتگو اور تقریروں میں کرتے پھرتے مگر میرے یہاں سوائے نجی حالات پر گفتگو کے سیاست کا ذکر نہ آنے دیا۔ دن بھر میرے یہاں رہے ان کے رفقاء پٹنہ میں ایک دوسری جگہ مقیم تھے اور یہ انہیں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے برس والد مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ انکا لاہور سے تعزیت کا خط آیا پانچ چھے برس کے بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پٹنہ پھر اپنے دورے پر آئے اس وقت ملک کی آزادی کی پکار اور بڑھ گئی تھی۔ اور سیاست اب عوام میں رچ بس رہی تھی۔ اس دفعہ پٹنہ میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا استقبال بڑی شدومد سے ہوا۔ جوق کے جوق لوگ ان سے ملاقات کرنے کو اور انکی تقریر سننے کو امڈے پڑتے تھے۔ تقریریں ایسی ہوتی تھیں کہ گھنٹوں سنتے رہے مگر سیری نہ ہو۔ روتوں کو ہنسا دیں، ہنستوں کو رلا دیں اور چاہیں تو پانی میں آگ لگا دیں۔ تقریر کرتے وقت عوام کے جذبات کی باگ ڈور انکے ہاتھ میں ہوتی۔ جس طرف اور جس طرح چاہیں موڑ دیں۔ انکی تقریریں صرف ہیجانی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ تاریخی اور سیاسی مواد کے ساتھ ساتھ مذہبی ہدایات کے سلسلے بھی ان کی تقریریں میں جاری رہتے تھے۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی پر مغز اور پروقار تقریریں بھی سنی ہیں، حیدر آباد کے بہادر یار جنگ کو بھی بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرتے دیکھا ہے مگر انکی وہ معجز بیانی جو دل و دماغ کو سرشار کرتی تھی۔ اسے خدا نے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کے حصہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پٹنہ سے ان کو بے پناہ محبت تھی

اور کیوں نہ ہوتی۔ پٹنہ ہی میں وہ پیدا ہوئے، ماں کا بے حد و بے پایاں پیار ان کو یہاں ملا، انکا بچپن اور ان کا عنفوان شباب یہاں کی فضاء میں پروان چڑھا، لنکے ابھرتے ہوئے شعور نے یہاں کے ماحول میں انگڑائی لی اور ان کی صلاحیتوں کی پہلی تربیت یہیں کی آب و ہوا میں ہوئی۔ یہ جب بھی پٹنہ آتے تو یہاں کی ہر تقریر میں اپنے پیارے پٹنہ کی روداد سناتے یہاں کے لوگوں کا ہر تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ پٹنہ بھی ان کا ویسا ہی وطن ہے جیسا پنجاب ہے۔ وہ اجنبی نہیں ہیں ان کا خمیر بھی پٹنہ ہی کے خمیر سے بنا ہے۔ میرے ایک عزیز ماموں زاد بھائی سید حسین احمد مرحوم پنجاب گئے۔ یہ ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر آگے جانے کو گاڑی لگی ہوئی تھی۔ انکو کراچی جانا تھا۔ ابھی ٹرین کے کھلنے میں دیر تھی۔ یہ کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جماعت چالیس پچاس آدمیوں کی آتی دکھائی دی جس میں ایک شخص بہت نمایاں تھے، ادھیڑ عمر کے، اچھے ہاتھ پاؤں کے، یہ مولانا اپنی گفتگو سے سبھوں کو محظوظ کرتے ہوئے مجمع میں سبھوں کے لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ حسین احمد کا کمپارٹمنٹ سامنے ہی پڑتا تھا مولانا صاحب نے سیدھے اسی کا رخ کیا اور آ کر اسی کے ایک خالی برتھ پر بیٹھے۔ جو پلیٹ فارم سے لگا ہوا تھا۔ ساتھیوں میں کچھ تو لنکے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ میں آ کر بیٹھے مگر زیادہ تعداد لنکے ساتھیوں کی پلیٹ فارم ہی پر رہی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین نے چلنے کی سیٹی دی۔ اور ٹرین چل پڑی۔ اب مولانا نے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا تو ایک طرف حسین احمد مرحوم پر نظر پڑی۔ انکی وضع قطع پٹنہ والوں جیسی نمایاں تھی۔ مولانا اپنی نشست سے اٹھ کر ان کے برتھ پر آگئے۔ اور پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ پٹنہ وطن ہے وہیں سے آ رہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ غریب خانہ پٹنہ کے ایک محلہ صدر گلی میں ہے۔ یہ سن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کیا تم "حسنو" ہو؟ انہوں نے کہا ہاں میں حسنو ہی ہوں مگر آپ نے کس طرح سمجھا مولانا نے حسین احمد مرحوم کو بھینچتے ہوئے کہا کہ جسے گود میں کھلایا، جس کے والد صاحب کے ساتھ مہینوں ان کے دیہات پر جا کر لنکے ساتھ رہا، پھر پٹنہ میں ان کے ساتھ رہا اس کو کیوں نہ پہچانتا۔ حسین احمد مرحوم سمجھ گئے کہ یہی عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ نے پٹنہ کے جانے پہچانے لوگوں کا نام لیکر خیریت پوچھی گھر کے ہر فرد نوکر چاکر دائی ماماسب کا حال فرداً فرداً دریافت کیا۔ پھر پوچھا میرا بھائی بدر الدین کس حال میں ہے۔ مراد مجھ سے تھی۔ حسین احمد نے کہا کہ آج کل وہ بھی لیڈر ہیں۔ اس پر مولانا عطاء اللہ شاہ خوب ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہونا ہی تھا ایک بھائی لیڈر تو دوسرا کیوں نہیں ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں تو جماعت احرار میں ہوں اس لئے بدر الدین ضرور مسلم لیگ میں ہوں گے۔ حسین احمد مرحوم نے کہا کہ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے....... پھر حسین احمد مرحوم پر زور دینے لگے کہ وہ دو ایک دن ان کے ساتھ رہیں مگر اپنا ضروری کام بتا کر حسین احمد مرحوم نے معذرت کر لی۔ اور کہاں کہ بعد میں وہ آپ سے ملیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا جب حسین احمد مرحوم واپس آئے تو مجھے یہ قصہ سنایا۔

غالباً ۱۹۳۷ء میں رہتک جیل میں سے ایک خط میرے نام آیا مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ رہتک جیل سے

مجھے خط بھیجنے والا کون ہے۔ لفافہ چاک کیا تو اندر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خط تھا۔ مجھے آج تک اس خط کا مضمون یاد ہے۔ لکھا تھا "میرے پیارے بھائی بدرالدین آج کل جیل کی تنہائی میں تم مجھے یاد آتے ہو، زمانہ دراز سے تمہیں نہیں دیکھا غالباً اس کی کسر بار بار تمہارے یاد آنے سے نکل رہی ہے، قوم کی خدمت کرنے کی سزا مجھے تو قید تنہائی سے ملتی ہے، آج کل بھی وہی سزا ہے۔ تنہائی کو دور کرنے کے لئے میں نے کھادی کے کپڑے کے تھان کو اپنے ہاتھوں سے پیک کر کے تمہارا نام اور پتہ لکھا اور جیل والوں سے کہا کہ تمہارے پاس بھیج دیں۔ اس کو میری یادگار سمجھ کر قبول کر لینا۔ برسوں گزر گئے مگر کھادی کا تھان مجھے نہ ملا۔ غالباً جیل والوں نے اپنے مصرف میں لے لیا ہوگا۔

۱۹۴۰ء میں میں لاہور گیا تو یہ خواہش لیکر گیا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اس وقت مسلم لیگ کا پنجاب میں بڑا زور تھا۔ دوسری مسلم سیاسی پارٹیاں جن میں جماعت احرار بھی تھی ماند ہو کر رہ گئیں تھی۔ اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، سارے پنجاب میں امیر شریعت اور جماعت احرار کے سب سے اونچے لیڈر ہونے کے باوجود بھی پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔ بہر حال میں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو جیل میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے بال بچوں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ امرتسر میں رہتے ہیں۔ لاہور سے پٹنہ آنے کے راستہ امرتسر پڑتا تھا۔ مجھے گولڈن ٹمپل، جو سکھوں کی مشہور زمانہ عبادت گاہ ہے، اس کے دیکھنے کی بھی تمنا تھی۔ میں اور میرے دو ساتھی دن بھر کے لئے امرتسر اتر گئے، اسباب اسٹیشن ہی پر کلاک روم میں رکھا اور اسٹیشن پر ہوٹل میں کھا پی لیا، پھر گولڈن ٹمپل دیکھنے کو چلے گئے۔ ایک بڑے حلقہ میں گولڈن ٹمپل واقع ہے، بیچ میں بہت بڑا تالاب ہے، اس کے چاروں طرف خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں تالاب کے بیچ میں بھی سنگ مرمر کی عمارتیں ہیں۔ ایسی دلکش اور پر کشش کہ دیکھا کیجیئے۔ کئی عمارتوں میں مقدس صورت مہنت بیٹھے گرنتھ صاحب پڑھ رہے تھے۔ گولڈن ٹمپل پہنچتے ہی ایک سن رسیدہ مہنت میرے ساتھ ہو گئے تھے اور ہر جگہ ہماری رہبری کر رہے تھے آخر میں سبھوں کو ایک بڑی خوبصورت سبک پل کے ذریعہ سے اس عمارت میں پہنچنا ہوتا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو ہمارے راہبر نے کہاں کہ یہاں کے جو سب سے بڑے مہنت ہیں انہی کے پاس آپ کو لئے چلتا ہوں۔ اندر ایک سنگ مرمر کے تخت پر ایک بڑے باوقار سفید ریش بزرگ کو دیکھا جو گرنتھ صاحب پڑھنے میں مشغول تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کو دیکھا تو کتاب بند کر دی۔ ہم نے مودبانہ ان کو سلام کیا انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے کہاں کہ پٹنہ سے۔ یہ سننا تھا کہ جھٹ اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا میرے ساتھیوں کو باری باری سے اور بڑی محبت سے کہنے لگے کہ آپ پٹنہ شریف سے آئے ہیں اس لئے ہم سبھوں کو سر آنکھوں پر آپ کا آنا ہے، آپ تو میرے معزز اور بڑے محبوب مہمان ہیں۔ پھر پوچھا کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں اور ہمارے راہبر سے کہا کہ بھائی ان کے اسباب لیجا کر مہمان خانہ میں ٹھیک ٹھاک کر کے رکھو۔ میں نے عرض کیا کہ ہم سب تو سر راہ ہیں، صرف گولڈن ٹیمپل کی زیارت کی تمنا کھینچ کر

لے آئی ہے۔ اور آج ہی شام کے وقت پٹنہ روانہ ہو جائیں گے مگر بڑے مہنت صاحب ہم سبھوں کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر ہم سبھوں نے وعدہ کیا کہ دوبارہ آئیں گے تو انکی خدمت میں دو چار دن ضرور رہیں گے۔ پھر ہم سب وہاں سے رخصت ہوئے۔ آج تک گولڈن ٹیمپل کے لوگوں کی محبت کا برتاؤ اور پٹنہ سے ان کی عقیدت اور پٹنہ والوں کے ساتھ انکا برادرانہ خلوص میرے دل پر نقش ہے۔

گولڈن ٹمپل سے چلے تو دو بج رہے تھے مولانا عطاء اللہ شاہ کا مکان کس محلہ میں واقع تھا یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا تھا۔ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آخر منزلِ مقصود تک پہنچ ہی گیا۔ ایک کشادہ گلی سے کچھ آگے بڑھ کر ایک کشادہ جگہ پر ایک نئی عمارت کھڑی تھی۔ سامنے ہی مردانہ نشست کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ جو بند تھا۔ اس کے بغل سے لگا ہوا۔ ایک دروازہ تھا جو زنانہ حصہ میں جانے کا راستہ تھا۔ وہیں پر جا کر میں نے پکارا کہ کوئی صاحب ہیں؟ باہر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پہلی ہی آواز پر ایک صاحب باہر آئے، تیس، پینتیس سال کی عمر ہو گی، متوسط قد کے خوش رو آدمی تھے، چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔

صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں میں نے کہا کہ پہلے یہ تو بتائیے کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا یہی مکان ہے کہ نہیں؟ جواب ملا کہ مکان تو یہی ہے اور ان کی اہلیہ اور بچے اسی مکان میں ہیں مگر مولانا جیل میں ہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا کا جیل جانا معلوم ہے۔ آپ انکی اہلیہ سے یہ کہہ دیں کہ بدرالدین پٹنہ سے آیا ہے۔ وہ صاحب یہ سن کر اندر گئے پانچ منٹ بعد باہر کی نشست گاہ کھلی، اچھا خاصہ کمرہ تھا۔ ہم سب کمرے میں پہنچے تو تین بچیاں میرے سامنے کھڑی تھیں، بڑی کی عمر نو سال ہو گی، دوسری تقریباً سات سال اور چھوٹی پانچ چھے سال کی۔ (شاہ جی کی صرف ایک بیٹی ہیں دوسری گھر میں پڑھنے والی بچیاں تھیں) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (مدیر)

سب آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر ان سبھوں نے مجھے کس طرح پہچانا۔ میں نے سبھی کو پیار کے بعد ان کے نام پوچھے۔ اتنے میں بڑی لڑکی لپک کر اندر گئی اور پھر دو تین منٹ میں باہر آئی اور کہنے لگی کہ امی جان آپ کو سلام کہتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں آپ کو چار پانچ دن یہاں رہنا ہے۔ میں نے کہا کہ تم اپنی امی جان کو میرا اسلام کہو، میں تو صرف تم سبھوں کو دیکھنے کے لئے آگیا تھا۔ بھائی جان جیل میں ہیں، اس لئے رہ کر کیا کروں گا۔ بڑی لڑکی نے جواب دیا کہ امی جان اور ہم سب تو ہیں۔ ابا جان ہمیشہ آپ کا ذکر ہم سبھوں سے کرتے رہتے ہیں کہ میرا ایک بھائی بدرالدین پٹنہ میں ہے۔ اللہ اللہ، مولانا عطاء اللہ شاہ کی محبت کہ طویل زمانہ گزرنے پر بھی انکی محبت میرے ساتھ کم نہ ہوئی۔ بچیوں کا اصرار کہ میں دو چار روز قیام کروں میرا یہ عالم کہ بچیوں سے گفتگو کے درمیان سارے گزشتہ واقعات کی تصویر نظر کے سامنے کھڑی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بچیوں کو سمجھا رہا ہوں مگر وہ بہ ضد ہیں کہ میں قیام کروں۔ اتنے میں مولانا کی اہلیہ نے بڑا پر تکلف ناشتہ ہم سبھوں کے لئے بھیجا۔ وہ صاحب جو پہلے آکر ہم سبھوں سے ملے تھے ان کے متعلق ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا کے سالے ہیں۔ وہ میزبانی میں بچھے جا

رہے تھے۔ ناشتہ کر کے میں نے مولانا کی اہلیہ سے اپنی مجبوری کہلا بھیجی کہ آج میرا پٹنہ روانہ ہو جانا بہت ضروری ہے۔ ہم سب سیدھے اسٹیشن روانہ ہوگئے مگر وہ دن اور آج کا دن، میں نے پھر ان کو دیکھا نہیں۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ جذبات بدل گئے۔ لہلہاتے درخت خشک ہو کر پیوند زمین ہوگئے، ان کی جگہ پر نئے پودے نکل کر تناور درخت بن گئے مگر پرانی یادیں پہلے ہی کی طرح آج بھی دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی گزر گئے۔ میں نے ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انہیں نہیں دیکھا مگر آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے قومی خدمات کا ایک طویل اور شاندار ریکارڈ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ جمیعتہ العلماء کو انہوں نے پروان چڑھایا، مجلس احرار کو انہوں نے قوت اور روشنی بخشی، پنجاب میں ملکی سیاست کو اونچی سیڑھیوں پر وہی لائے، انہی کی معجز بیانی سے ہندوستانی سپوت ملک پر نثار ہونے کے لئے تیار ہو کر سینوں پر انگریزوں کی گولیاں کھاتے تھے۔ انگریزوں کے لئے توپ اور رائفل سے زیادہ خطرناک مولانا عطاء اللہ شاہ کی آتش نوائی تھی جو دم کے دم میں نہتے لوگوں کو انگریزوں سے ٹکر لینے کے لئے ان کے رائفل کے مقابل بھیج دیتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ حکومت کے قید و بند کی برابر زینت بنے رہے۔ آج مولانا نہیں ہیں مگر ان کی عظیم المرتبت داستان حیات باقی ہے۔

"عقیدت" ..... اور ..... "ارادت"!

گذشتہ روز کا واقعہ ہے کہ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ "امروز" کا پرچہ پاس پڑا تھا جس پر حضرت شاہ جی کا فوٹو چھپا ہوا تھا۔ محلہ کی ایک چھوٹی بچی کھیلتی ہوئی آئی اور شاہ جی کا فوٹو دیکھ کر بولی یہ شاہ جی کا اخبار ہے؟ کسی جواب کا انتظار کئے بغیر واپس دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد آئی اور بڑے منت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ کہ میری نانی اماں بہت ہی بوڑھی ہیں۔ وہ شاہ جی کے جنازہ پر نہیں جاسکیں آپ ہمیں یہ اخبار دیدیں گے؟ ہم تصویر دیکھ کر جلد واپس کر دیں گے۔ اخبار لے گئی۔ واپس آکر بولی اگر آپ کے پاس شاہ جی کی کوئی اور اچھی سی تصویر ہو تو ہمیں دے دو، ہم زیارت کر کے واپس کر دیں گے۔

اس بات سے جہاں عوام الناس میں شاہ جی کی بے پناہ مقبولیت اور لوگوں کی انکے ساتھ عقیدت اور ارادت کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں یہ اندیشہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ شاہ جی ساری عمر جن خلاف شرع افعال (مثلاً قبر پرستی، تصویری پوجا، نذر نیاز اور اندھی عقیدت وغیرہ) سے منع فرماتے رہے ہیں۔ ہم لوگ ان افعال کی ابھی سے خود شاہ جی کی تصاویر اور شاہ جی کے مزار سے ابتدا نہ کر بیٹھیں۔

(شذرہ / ماہنامہ "الصدیق" ملتان۔ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ)

حاشیہ برائے صفحہ ۲۵۱

اور اسی انداز میں

(۱) سید محمد اسحق، سید عبدالغنی کے فرزند تھے۔ حافظ ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ کے دیگر چچا سید حیدر شاہ صاحب سید حسام الدین اور سید پیر شاہ صاحب بھی تجارت کی غرض سے پٹنہ جایا کرتے تھے (مرتب)

بنت امیر شریعت مدظلہا

کچھ پریشاں تذکرے

ابا جی جب ناگڑیاں سے امرتسر حصول تعلیم کے لئے آنے لگے تو بزرگ خاندان حضرت مولانا سید محمد یوسف رحمہ اللہ سے ملنے گئے وہ دادا جی کے چچیرے چچا تھے اور اماں جی کے حقیقی تایا- مسلکاً ہمارے خاندان کے واحد اہلحدیث بزرگ اور حضرت مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد- پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری بھی کچھ عرصہ انکے ہم سبق رہے تھے- گاؤں میں اس زمانہ میں وزیر آباد سے مستری بلوا کر شاندار مسجد تعمیر کرائی تھی جو اب تک موجود ہے- اسی مسجد میں تشریف رکھتے تھے- ابا جی فرماتے ہیں مسجد میں حاضر ہوا اور عرض کیا بابا جی پڑھنے جا رہا ہوں نصیحت فرمائیے انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور سورہ لقمن کی یہ آیت تلاوت فرمائی-

یا بُنی اَقِم الصّلوٰۃَ وَاْمر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علیٰ ما اصابک ان ذالک من عزم الامور-

میں نے سلام و مصافحہ کیا اور اٹھ کر آ گیا اس سے بڑی نصیحت اور کیا ہوتی؟ بابا جی کا مزار اب بھی گاؤں میں مرجع عوام ہے- انکی بنائی ہوئی مسجد میں قریباً چالیس سال ہمارے دادا جی حضرت حافظ ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ نے امامت کی اور تراویح میں کلام پاک بھی سنایا ان کے بعد خاندان کے ایک دو افراد نے امامت کی- آجکل بھائی عطاء المحسن سلمہ اللہ نے وہاں قرآن پاک حفظ و ناظرہ کا مدرسہ قائم کر رکھا ہے- اللہ تعالیٰ قائم رکھیں اور ترقی عطاء فرمائیں آمین- ننھیالی گھر اور مسجد کی دیوار ایک تھی- ہماری نانی جی صاحبہ رحمہ اللہ علیہا کو تلاوت کا بہت ذوق تھا، سینکڑوں لڑکوں لڑکیوں کو قرآن پاک پڑھایا- اباجی کا امرتسر آنے سے پہلے مسجد میں روزانہ ختم قرآن کا معمول تھا- نانی جی پیڑھی بچھا کر مسجد کی دیوار کے ساتھ بیٹھ جاتیں اور قرآن پاک سنتی رہتیں- اللہ پاک سب کی ارواح پر رحمت نازل فرمائیں، آمین ثم آمین-

---

آخری بیماری میں عصر و مغرب کے درمیان کچھ طبیعت بحال ہوتی تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہم اباجی کو کرسی پر کچھ دیر کے لئے بٹھا دیتے اکثر مغرب کی اذان تک بیٹھتے ورنہ ٹانگیں تھک جاتیں تو جب کبھی زبانی اور کبھی ہاتھ کے اشارہ سے کہتے تھک گیا ہوں تو پھر ہم لٹا دیتے- ایک روز ایسے ہی بٹھایا تھا اتفاق کی بات کہ اسوقت بھائی کوئی گھر نہ تھا- دروازہ پر دستک ہوئی پڑھنے والے ایک دو بچے موجود تھے انہوں نے کہا ایک بابا کہتا ہے شاہ جی سے ملنا ہے- بڑا تنگ وقت تھا- میں صحن کے کونے میں چولھے پر روٹی پکا رہی تھی اور مغرب کا وقت ہونے والا تھا میں نے کہا اماں جی میں چارپائی کھڑی کر لیتی ہوں، بے چارا پتا نہیں کہاں سے

آیا ہو گا۔ چنانچہ میں نے چار پائی پر چادر ڈال لی اماں جی کمرے میں چلی گئیں اور بچہ اس بوڑھے دیہاتی کو لے آیا۔ ملگجے کپڑوں والاوہ بوڑھا برآمدے میں بیٹھے اباجی کی کرسی کے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا اور سلام کر کے انکی دونوں پنڈلیوں کو پکڑ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے سنا..... اباجی نے دو دفعہ کہا، "نہ رو آخر ایہو انجام اے" میں نہیں جانتی وہ کون تھا؟ چند منٹ بعد وہ اٹھا اور سلام کر کے پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ تھی وہ محبوبیت جو اللہ تعالیٰ نے انکے لئے لوگوں کے دلوں میں القاء کر دی تھی اور جس کے مظاہر بارہا مشاہدہ میں آئے۔

✥

ایک روز عصر کے وقت صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ برادر محترم جناب ملک عبدالغفور صاحب انوری مرحوم و مغفور ملنے آئے۔ بیٹھک کھلی تھی کوئی صاحب بیٹھے تھے۔ انوری صاحب نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا السلام علیکم۔ اباجی نے جواب دیا۔ ممکن ہے پیالی کی کھنک انہوں نے سنی ہو یا ویسے ہی کہا "چاہ پئے پیندے او" (چائے پی رہے ہو) اباجی نے مسکرا کر کہا "اوے ہر کھڑاک نوں پیالی دا نہ سمجھ لئیں مار یا جاویں گا" مرحوم انوری صاحب ۹-۱۰ برس کی عمر سے وفات تک احرار اور ہمارے خاندان سے وابستہ رہے انکے والد ماجد سے لیکر نواسوں تک تین نسلوں کا تعلق ابھی تک الحمدللہ نبھ رہا ہے۔ جب انہوں نے چائے پینی ہوتی بے تکلف پی لیا کرتے اس وقت نہیں یاد اس دن پی یا نہیں۔ ان کے والد صاحب کے متعلق اباجی نے فرمایا کہ جب ملتان میں ہر رات میرے قتل کی رات ہوتی (مخالف منصوبے بناتے تھے) تو مولوی برخوردار میرا پہریدار ہوتا تھا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

✥

ایک دن اباجی نے لطیفہ سنایا۔ مولوی مظہر علی اظہر صاحب کے ساتھ لاری میں سفر کر رہے تھے۔ چھوٹی سی ٹوکری میں پان کا سامان ساتھ ہوتا تھا۔ سیٹ پر ٹوکری رکھنے کی جگہ نہ تھی پان لگانا تھا اس لئے پان کا ٹکڑا تو خود ہاتھ میں پکڑا اور ڈبا نما پاندان مولوی صاحب کو تھماتے ہوئے کہا بھائی مظہر!

تعاونو علی البر والتقویٰ

مولوی صاحب نے ڈبا پکڑا اور چونے کتھے کے خانوں کی طرف انگلی کر کے کہنے لگے "اینہاں وچوں بر کیہڑا اے تے تقویٰ کیہڑا؟"

ایک روز فرمانے لگے امرتسر بیٹھک میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک پر سے چار پائیاں ٹھونکنے والا گزرا اور اس نے آواز لگائی "منجی پیڑھی ٹھکالو" ! معاً مجھے خیال آیا یہی حال برطانوی فوج میں شامل ہمارے مسلمان بھائیوں کا ہے۔ یہ ترکھان توروزی کمانے کے لئے کندھے پر اپنے ہتھیار اٹھائے پھرتا ہے اور فوجی کندھے پر بندوق رکھے کہتا ہے مصری مروالو۔ حجازی مروالو۔ ترکی مروالو۔ شامی مروالو۔ ۱۵ روپے دو اور جس کو چاہو مروالو۔ تب ۱۵-۱۶ روپے ہی تنخواہ ہوتی تھی۔ ایک روز ایک پٹھان چھریاں چاقو تیز کرنے والے سے فرمایا

کہ تم لوگ اتنی محنت کرتے ہو لیکن مسلمان بھائیوں کو قرض سود پر دیتے ہو یہ تو حرام ہے۔ فرماتے وہ کہنے لگا یہ لوگ یہاں سے جاتے ہیں ہم آزاد قبائل پر بم اور گولیاں برساتے ہیں۔ ہمارے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بناتے ہیں ہم نے انکا کیا بگاڑا ہے؟ کون کاپر کا بچہ (کافر کا بچہ) انکو مسلمان سمجھتا ہے۔؟

❖

سر سکندر والے کیس میں خانقاہ سراجیہ کندیاں والے حضرت مولانا احمد خاں صاحب کو جب اباجی نے دعاء کے لئے پیغام بھیجا تو انہوں نے وظیفہ پڑھنے کے لئے بتایا اور ساتھ فرمایا تھا " جے میں ول ہوندا تے میرا اک رات دا کم سی ہن شاہ نوں آٹھو تن راتاں پڑھے تے ہوئے گا تماشا۔" پھر رپورٹر نے ہی جعلی تقریر کا بھانڈا بر سر عدالت پھوڑ دیا۔ اباجی فرمایا کرتے تھے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا، آنکھیں بند کیں تو تلوار چلتی دیکھی۔ حضرت مولانا احمد خان صاحب رحمہ اللہ نے ایک بڑا عجیب تحفہ بھی عنایت فرمایا تھا۔ جب رہائی کے بعد ملنے گئے۔ لکڑی کی ایک چوکور صندوقچی، جس پر سنہرے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اسکے اندر نمدا لگا کر چائے دانی اور دودھ دان وغیرہ رکھنے کے خانے بنے ہوئے تھے چائے بنا کر اس میں رکھ لی جائے تو کئی گھنٹے گرم رہے۔ اباجی نے تبرکاً رکھ دی تھی ۷۴ء میں جہاں سب کچھ گیا ساتھ وہ بھی گئی ایک اور بڑا عجیب قصہ بیان فرماتے کہ حضرت کے ایک صاحبزادے جواں سال فوت ہو گئے تھے۔ میں جب ملنے گیا تو حضرت کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے دل میں خیال آیا کہ جوان بیوہ بے چاری کیسے زندگی گزارے گی۔ جب نماز ختم ہو گئی تو حضرت رحمہ اللہ نے کسی خادم سے فرمایا کتب خانہ میں جاؤ اور فلاں کتاب نکال لاؤ۔ خادم گیا اور مطلوبہ کتاب حاضر کر دی۔ اس خلاف معمول عمل پر سب حیران تھے۔ مجلس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (سرگودہا والے) اور ان کے چچا حضرت مولانا احمد الدین صاحب گنجیالوی بھی شریک تھے۔ حضرت نے کسی سے فرمایا کہ فلاں صفحہ سے پڑھو۔

" قصہ یہ تھا کہ کسی جہاد میں ایک مجاہد شہید ہو گیا بیوہ جوان تھی بچے بھی تھے محنت مشقت کر کے گزارا کرتی تھی پھر اسکے متعلق یہ مشہور ہوا کہ وہ کھاتی پیتی کچھ نہیں، ہوتے ہوتے یہ بات خلیفۂ وقت تک پہنچی تو اسے دربارِ شاہی میں طلب کیا گیا اور سوال کیا گیا کہ کیا واقعی تم غذا نہیں کھاتیں

اسنے کہا خاوند کی شہادت کے بعد اکثر روتی تھی ایک رات خواب دیکھا کہ بہت خوبصورت باغ ہے اسکے اندر سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے خاوند کی آواز بھی تھی۔ میں سن کر اندر چلی گئی تو میرا خاوند کچھ کھا رہا تھا اسنے اپنے رفیقوں سے کہا اگر تم اجازت دو تو یہ میری بیوی ہے اس کھانے میں سے میں اسے کچھ دیدوں۔ انہوں نے اجازت دیدی تو میرے خاوند نے ایک ٹکڑا میرے ہاتھ پر رکھ دیا، وہ میں نے کھایا شہد سے زیادہ میٹھا اور دودھ سے زیادہ سفید تھا جب میری آنکھ کھلی تو اس کھانے کا ذائقہ میرے منہ میں تھا اسکے بعد سے نہ مجھے بھوک ہے نہ پیاس بیٹ کمر کے ساتھ لگ چکا ہے اور سہارے کے لئے کمر پر کپڑا باندھے رکھتی ہوں!"

ابا جی فرماتے میں سمجھ گیا کہ یہ میری اصلاح ہو رہی ہے۔ میرے دل میں جو انکے گھر کے متعلق خیال آیا۔ قصہ ختم ہوا تو میں نے کہا حضرت ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ حیات مسیح کا۔ کئی لوگوں کو بہت فکر ہے کہ وہ آسمانوں پر کھاتے کیا ہیں۔ حاضرین حیران تھے کہ پہلے کونسا مسئلہ تھا کہ اب دوسرا حل ہو گیا۔ مولانا احمد الدین حیاتِ مسیح کی بات سنکر بے اختیار کہہ اٹھے "شاہ ایہہ تیرا فیض اے۔" فرماتے تھے بعد میں میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کو بتایا کہ میرے دل میں بس اتنا خیال گزرا تھا کہ بے چاری بیوہ کیسے گزارا کرے گی۔ مولٰینا احمد الدین صاحب شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔ ابا جی فرماتے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتے، چائے کا انکار "متفق علیہ کفر ہے" مطلب تھا ابا جی اور مولانا خود!

✥

جب سردار عبدالرب نشتر گورنر پنجاب تھے، ملتان دورہ پر آئے اور چلے گئے۔ ابا جی کا قیامِ ملتان انکے علم میں تھا۔ بیماری کا یہاں پتا چلا ہو گا۔ بہر حال عیادت کا خط انہوں نے حیدر آباد (سندھ) سے لکھا مجھے یاد ہے ۴۲ء یا ۴۳ء میں ابا جی نے سرحد کا دورہ کیا تو آ کر بتایا تھا کہ نشتر صاحب نے بھی دعوت کی تھی۔ کیا دور تھا۔ علی گل خان صاحب سرحد کے کانگریسی لیڈر، سردار اورنگزیب خاں لیگی لیڈر، سب نے دعوتیں کیں۔ بہر حال نشتر صاحب کے ملاقات نہ کرنے اور خط لکھنے پر ابا جی نے ارتجالاً یہ شعر کہا اور یہی خط کے جواب میں لکھ بھیجا۔

نوشتی نامۂ از حیدر آباد　　　بملتاں جانِ زامِ راندیدی

پھر نہ تو جواب آیا۔ نہ کبھی اور خط!

✥

قبل از تقسیم ایک دفعہ ضلع ملتان ہی کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں گئے (بھائی عطاء المؤمن سلمہ نے یاد دلایا وہ گاؤں محبت پور تحصیل میلسی تھا اور داعی تھے قاضی عبیداللہ صاحب مرحوم، جنکو کسی شقی القلب نے کچھ عرصہ ہوا شہید کر دیا) داعی نے اپنے مکان کے صحن میں ہی بستر بچھا دیا۔ فرمانے لگے میں نے اسے کہا کہ میرا بستر گھر سے باہر کھلی جگہ بچھا دو۔ بہنوں بچیوں کو تنگی نہ ہو۔ فرماتے میں باہر سو گیا آدھی رات کا عمل ہو گا کہ ایک بڑے زور دار دھماکہ سے میری آنکھ کھل گئی چاروں طرف دیکھا کوئی آدم نہ آدم زاد لیکن بارود کی سی بو پھیلی ہوئی تھی میں نے تھوڑی دیر سوچا پھر صاحب خانہ کو جگایا اور چارپائی وہاں سے اٹھا کر گھر میں ایک طرف بچھانے کو کہا تو وہ حیران تو ہوا کہ پہلے منتوں کے باوجود شاہ جی اندر نہیں سوئے اب کیا بات ہوئی۔ میں نے پوچھا ابا جی پھر یہ کیا تھا۔ فرمانے لگے "مجھے وہاں سے اٹھانا مقصود تھا" اور وہ بو فالج کے پہلے حملہ تک میرے دماغ میں تھی اب نہیں ہے!۔

✥

میرے سسر حضرت الحاج سید محمد شفیع شاہ صاحب مرحوم و مغفور نے ابا جی کی وفات کے بعد بتایا کہ

جس دن بخاری صاحب فوت ہوئے ہیں میں آیا تو اسٹیشن ملتان چھاؤنی پر ایک آدمی بنچ پر بیٹھا تھا۔ اسکے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ وہ اخبار کھولتا خبر پڑھتا اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتا۔ کئی بار اسنے ایسا ہی کیا۔ میں اسے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ اس شخص کا خاندانی تعلق تو کوئی نہیں محض لوجہ اللہ محبت سے اسکا یہ حال ہے۔ ابا جی کی زندگی میں انہوں نے مجھے ایک دفعہ سنایا کہ ہم (کوئی اور صاحب بھی ساتھ تھے) ملتان آئے، تانگہ میں بیٹھے تو ایک پولیس کا سپاہی بھی سوار ہو گیا اور پھر بغیر کرایہ دئے اپنی منزل مقصود پر اتر گیا جب وہ اتر گیا تو تانگے والے نے اسے خوب صلواتیں سنائیں چچا جان کہتے کہ جب ہم قاسم العلوم کے سامنے تانگہ سے اتر کر میدان کی طرف چلے تو دو آدمی شاہ جی سے مل کر واپس جا رہے تھے اور آپس میں بات کر رہے تھے کہ اللہ کا شکر ہے ہم نے جو ہدیہ پیش کیا شاہ جی نے قبول فرمالیا تو میں نے سوچا یہ ہیں تصویر کے دو رخ ایک نے از خود حق جتلایا اور تانگے والے نے پس پشت گالیاں دیں۔ ایک یہ ہیں کہ دیگر شکر گزار ہیں کہ ہدیہ قبول ہوا۔

❋

ایک اور واقعہ سنایا کہ کوٹ "ملانہ" عبدالحکیم (تحصیل کبیروالہ) کے نواح میں گاؤں ہے ابا جی نے پاکستان بننے سے قبل وہاں تقریر کی اور دیہاتیوں کو گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کر کے داخل ہونیکی تلقین کی۔ فرماتے ایک اجڈ دیہاتی دوسرے سے کہنے لگا بڑی تعریف سنی تھی۔

" پیر عطاء اللہ شاہ بڑے وعظ کریندا اے، ایہو وعظ کریندا اے؟ جو گھر ونبو تے دھی مائی بیٹھی ہووے تاں آکھو "السلام علیکم"۔ بڈّای نہ مریوے "

یعنی پیر عطاء اللہ شاہ کی بڑی تعریف سنی تھی یہی وعظ کرتا ہے؟ کہ گھر جاؤ اور بیٹی بھی بیٹھی ہو تو کہو السلام علیکم۔ ڈوب کر نہ مرجائیں! جہالت کا اندازہ لگائیں کہ سلام کرنا ڈوب مرنے کا مقام تھا وہ سچ ہی تو کہتے تھے میں نے بنجر زمینوں میں ہل چلائے ہیں۔ بے شمار دیہاتوں میں کئی کئی گھنٹے صرف السلام علیکم کے موضوع پر تقریریں کیں۔

❋

ابا جی نے ایک دفعہ سنایا کہ ضلع مظفر گڑھ میں کسی جگہ جلسہ تھا دو اڑھائی گھنٹے وعظ کے بعد پوچھا کہ اب تو آپکو مسائل کی سمجھ آگئی ہو گی تو جلسہ میں سے متفقہ آواز آئی "سائیں" کو، "یعنی نہیں جناب! فرماتے تھے پھر دوبارا گھنٹہ دو لگا کر انکو مسائل ضرور یہ ذہن نشین کرائے۔ پھر پوچھا کہ اب سمجھ آگئی ہے؟ تو حاضرین نے جواب دیا کہ اب سمجھ آگئی ہے۔

❋

سید محمد شفیع شاہ صاحب چچا جان رحمہ اللہ ایک اور قصہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے۔ عبدالحکیم کے معروف بزرگ حضرت پیر سید خورشید احمد شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بھی ابا جی کا بہت تعلق تھا وہ اپنے چک میں جلسہ کراتے اور ابا جی کو تقریر کے لئے بلاتے۔ ایک دفعہ پیر صاحب کا ایک بچہ حادثاتی طور پر فوت ہو گیا

کہیں سے ماچس ہاتھ آ گئی تیلیاں جلا جلا کر پھونکتا رہا آخر قمیض کو آگ لگ گئی اور وہ بے چارا جھلس گیا اور انتقال کر گیا۔ اباجی جلسہ پر عبدالحکیم آئے تو اس حادثہ کا پتا چلا تو انہوں نے تعزیت کے لئے چک میں جانے کا ارادہ کیا چنانچہ پیر مبارک شاہ صاحب بغدادی مرحوم، میرے سسر اور غالباً حافظ محمد حسین صاحب مرحوم بھی جو پیر صاحب کے بڑے چہیتے شاگرد اور مرید تھے ساتھ گئے وہاں پہنچ کر تعزیت کی۔ چچا جان فرمایا کرتے کہ تب تک میں صرف بخاری صاحب کی تقریروں کا سامع تھا سلام و مصافحہ ہوتا اور بس! نماز ظہر کے بعد مسجد میں سب بزرگ جمع تھے کہ بخاری صاحب نے کہا مبارک شاہ اسوقت ہم تین سید یہاں اکٹھے ہیں آؤ دعاء کریں آج اللہ تعالیٰ سے پیر خورشید شاہ کو تین بیٹے لے کر دیتے ہیں۔ اس اثنا میں پیر صاحب کے ہاں سے کھانا آیا تو فرمانے لگے کھانا بعد میں کھائیں گے پہلے دعاء کریں گے۔ چچا جان کہتے میں مسجد کے دالان میں ایک طرف بیٹھا ہوا دل میں سوچ رہا تھا کہ انکو اللہ تعالیٰ پر اتنا اعتماد ہے؟ کہ بڑے زور سے کہہ رہے ہیں ۳ بیٹے لیکر دینے ہیں فرماتے تینوں بڑی دیر تک دعاء میں مصروف رہے اور دعاء بخاری صاحب نے ہی کرائی۔ چچا جان مرحوم روائیتی کرامات کے کچھ زیادہ معترف بزرگ نہ تھے مگر یہ قصہ جب انکو یاد آجاتا بڑے انبساط سے سناتے اور کہتے کہ اس روز کی دعاء کی قبولیت دیکھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تین ہی بیٹے پیر صاحب کو عطاء کئے۔

*

جیٹھ بھٹہ کے ایک مولوی صاحب (غالباً اللہ بخش نام)

بھائی جان سے رحیم یار خاں جیل میں ملے تو یہ واقعہ سنایا کہ: "اباجی سے ملنے ملتان آئے تو انہوں نے حافظ کے یہ اشعار سنائے۔

باغباں گر پنجروزہ صحبتِ گل بایدش
بر جفائے خارِ ہجراں صبرِ بلبل بایدش
اے دل اندر بندِ زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام اُفتد تحمل بایدش

اباجی فرماتے تھے۔ ہر شاعر کا ہر شعر اچھا نہیں ہوتا حافظ کا کمال یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اچھا ہے۔ حضرت تھانوی نے کہیں فرمایا کہ: "مشہور ہے تفسیر کشاف کا حاشیہ حافظ شیرازی نے لکھا ہے (اللہ تعالیٰ ایسے کام کسی بُرے آدمی سے نہیں لیتا۔)

جامعہ عباسیہ کے ایک متعلم مولوی صاحب مدینہ طیبہ میں پیر جی عطاء المھیمن سلمہ سے ملے اور سنایا کہ انکے دور طالبعلمی میں اباجی جامعہ عباسیہ آئے اور ہم طلباء کے درمیان بیٹھے تھے کہ شیخ الجامعہ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی تشریف لائے اور دیکھ کر فرمایا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

تو اباجی نے کہا مولانا یہ تو بہت پرانا ہے اسے چھوڑئے

دلم بازلفِ جاناں می نشیند
پریشاں با پریشاں می نشیند

تقسیم ہند کے بعد انور صابری مرحوم اباجی سے ملنے پاکستان آئے تو دیکھ کر روئے کہ شاہ جی یہ کیا ہو گیا۔ تو فرمایا بس کسی دن سن لو گے "بخاری نہیں رہا۔"

وجل السیول عن الطلول کانہا -- زبر تجد متونہا اقلامہا
سیلاب نے کھنڈرات کو ایسے نمایاں کردیا جیسے پرانی تحریروں کو انکے قلم نے کردیا

✣

موضع باگڑ سرگانہ میں قبل از تقسیم بھی بہت مضبوط جماعت قائم تھی مجھے مہر شوق محمد سرگانہ کا نام بچپن سے یاد ہے کہ ان کی اباجی سے خط و کتابت رہتی تھی ایک بار وہاں کانفرنس ہوئی اباجی، مولانا حبیب الرحمن صاحب، قاضی صاحب، شیخ صاحب، سبھی حضرات موجود تھے اباجی فرمانے لگے ایک روز بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا مجھے بیعت کر لیجئے۔ میں نے کہا بھائی جا کسی نیک آدمی کی بیعت کر لے۔ وہ چلا گیا۔ دوسری بار پھر آیا میں نے پھر کہا کسی اور بزرگ کی بیعت کر لیجئے۔ تیسری بار وہ پھر آیا۔ ہم سب ساتھی صبح کی نماز سے فارغ ہو کر چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور میں پاؤں لٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسنے آکر پھر بیعت کرنے کو کہا میں نے زچ ہو کر کہا آ چڑھ میرے کندھوں پر تجھے بیعت کروں وہ اتنا سادہ آدمی تھا فوراً میرے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے، اٹھ کر کھڑے ہو گئے تالیاں بجاتے اور کہتے اب بھی نہ کرو بیعت! میں نے کہا بھائی میں نے بیعت کیا، میرے پیر نے تجھے بیعت کیا، تو نیچے اتر! اس بیچارے نے سمجھا شاہ جی کا طریقۂ بیعت یہی ہے! خیر بعد میں اسے بیعت کر لیا یہ قصہ یوں سنایا! کہ تذکرہ مولانا آزاد کا ہو رہا تھا کہنے لگے مولانا علامہ حسین میر کاشمیری کو جب دیکھتے تو مسکرانے لگتے خصوصاً انکی گردن کے دائمی انحنا پر۔ تو میں نے کہا اباجی کوئی ایسا بھی ہے جسے دیکھتے ہی آپ کو ہنسی آئے تو یہ باگڑ میں بیعت والا قصہ سنایا۔ ملتان میں ایک روز مسکراتے ہوئے بیٹھک سے اندر آئے اور کہا وہی باگڑ والا مرید آیا ہے پھر تواضع کے لئے خور و نوش کی اشیاء خود اٹھا کر لے گئے۔

میر کارواں

الوداع اے حضرت میر شریعت الوداع
الوداع اے صاحب علم و فضیلت الوداع
الوداع اے ماحیِ کفر و ضلالت الوداع
الوداع اے باعث صد فخر ملت الوداع
رحمتوں کے پھول برسیں تیری تربت پر سدا
تجھ کو جنت دے خدا بہر محمد مصطفیٰ

ذات تیری سید والا گہر تھی بے مثال
تو نے علم و فضل کے موتی بکھیرے باکمال
تیرے دم سے ہوگئی بدعت کی دنیا پائمال
خدمت اسلام و دیں کا تھا تجھے ہر دم خیال
تھا حقیقت میں تو اس ملت کا میر کارواں
اور ناموس نبوت کا حقیقی پاسباں ...!

عہد حاضر میں تھا بیشک تو خطیب بے مثیل
پیکر انسانیت تھا، ملک و ملت کا خلیل
مرتبہ زعمائے ملت میں تھا کیا تیرا جلیل
پیش باطل تو نے ہر جا حق کی روشن کی دلیل
آفتاب علم دیں تھا تو جہاں میں بالیقیں
تھا دل و جاں سے تو واللہ! عاشق دین متیں

دین قیم کے لئے تونے سہے ظلم و ستم
زندگی بھر دین حق پر تو رہا ثابت قدم
تیری فطرت سے عیاں تھی الفت شاہ امم
تونے اونچا کر دیا حق و صداقت کا علم
فقر و درویشی میں انور جس کی گزری ہے حیات
سرخرو ہو کر ہوا پیش رب کائنات!

نور محمد انور (کالا باغ)

سید محمد وکیل شاہ

شاہ جی، ابراہم لنکن اور پاکستان

ملتان میں حضرت امیر شریعت تادم واپسیں جس مکان میں رونق افروز رہے آپ کا معمول یہی رہا کہ بیشتر وقت "بیٹھک" میں گزارتے۔ بیٹھک کے مقابل کے مکان میں ایک عرصہ کوئی نائب تحصیلدار صاحب مقیم رہے اور ان کے ہاں بھی آنے جانے والے کچھ کم نہ تھے۔ سخت گرمیوں میں ایک روز دوپہر کے وقت افسر موصوف کے ایک ملاقاتی ان کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے تھک ہار گئے مگر جواب ندارد! شاہ جی نے دیکھا تو بیٹھک میں بلالیا۔ پنکھے کی ہوا میں کچھ دیر بیٹھے رہنے سے اس کے اوسان بحال ہوئے تو اب اس نے نظریں گھما گھما کے بیٹھک کے خستہ و شکستہ درودیوار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ شاہ جی اس کے محسوسات بھانپ گئے اور فرمایا" بھئی تم دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے کہ حکومت نے کیسا عالیشان مکان الاٹ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکان کرائے پر حاصل کیا گیا ہے" مخاطب شاہ جی کے لطیف طنز کو پا گیا۔ اور فوراً بولا، ویسے اگر آپ محسوس نہ فرمائیں تو میں ایک بات عرض کروں، اور ادھر سے خوشدلانہ اجازت پا کر کہنے لگا کہ "میرا خیال ہے آپ کے ساتھ ہونا بھی ایسے ہی چاہئیے تھا"

شاہ جی "پھڑک اُٹھے، مخاطب کو گلے لگالیا اور فرمایا" بھئی بہت خوب! سچ تو یہی ہے کہ جب ہم نے ساری زندگی فریقِ مخالف سے کوئی ادھار نہیں رکھا بلکہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تو اب اُدھر سے التفات اور عنایات کی توقع۔ چہ معنیٰ دارد؟" اس ساری مکالماتی کارروائی سے ماحول میں بے تکلفی سی پیدا ہو گئی تو بات پاکستان کے سماج اور سرکار کے محاسن اور معائب تک پھیل گئی۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ "شاہ جی"! مجھے پاکستان کی صورت حال دیکھ کر ابراہم لنکن یاد آجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی عادت کچھ ایسی تھی کہ وہ سفارشی حضرات کی دو ٹوک انداز میں حوصلہ شکنی سے بہت کتراتا تھا۔ بلکہ اس کی بجائے سفارشی حضرات کو کسی تمثیلی پیرائے میں ان کا ناجائز موقف باور کرانے کی کوشش کرتا۔ مثلاً ایک دفعہ ابراہم لنکن کو اس کا ایک دوست آکر ملا، اور اپنے ایک دوست کا تعارف کراتے ہوئے ابراہم سے پرزور سفارش کی کہ یار! اسے وزیر بنادو، اس پر ابراہم نے حسبِ معمول اپنے دوست سے کہا کہ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے اور وہ کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے شکار کا پروگرام بنایا اور وزیراعظم سے کہا کہ نجومی سے زائچہ تیار کراکے بتلاؤ کہ موسم شکار کے لئے سازگار ہے یا نہیں؟ وزیراعظم نے تعمیل ارشاد کی اور اطلاع دی کہ حضور موسم بہت سازگار ہے۔ اب بادشاہ نے مقربین اور مصاحبین کا لاؤ لشکر ترتیب دیا اور سینکڑوں امراء کا یہ قافلہ جنگل کو چل پڑا۔ موسم واقعی خوب تھا۔ مطلع صاف، دھوپ کی تمازت اور تروتازہ سبزہ! اچانک بادشاہ کی نظر ایک دیہاتی پر پڑی جو اپنے گدھے کو بُری طرح پیٹتے ہوئے شہر کو بھگائے لے جارہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی اس حرکت پر ناگواری کا اظہار کیا تو ایک وزیر نے لپک کر دیہاتی کو جالیا کہ کیوں بے زبان پر ظلم ڈھاتے ہو۔ دیہاتی نے تنک کر جواب دیا ارے

صاحب! زوروں کی بارش آنے والی ہے اور مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ آپ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کرتے ہیں، بادشاہ نے اسے دیہاتی کی دیوانگی پر محمول کیا مگر ہوا یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں آناً فاناً گھٹا چھا گئی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بادشاہ کو وزیر اعظم پر بے حد و حساب غصہ آیا اور وزیر اعظم صاحب برطرف کردیے گئے۔ دوسری طرف دیہاتی کی ڈھنڈیا مچ گئی کہ بادشاہ سلامت اس کی فہم و دانش کے قائل بلکہ گھائل ہو چکے تھے۔ دیہاتی کو حاضر دربار کیا گیا۔ اس نے وزارت عظمیٰ کا پروانہ پایا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھگھیا کر بولا کہ بادشاہ سلامت، یہ کس گناہ کی سزا ہے؟ بادشاہ سلامت فرمانے لگے کہ ہم تمہیں اس کا اہل سمجھتے ہیں اور تمہاری بارش کی پیشگوئی، تمہاری قابلیت کا بیّن ثبوت ہے۔ دیہاتی بولا! حضور! اگر یہ بات ہے تو وزارت عظمیٰ کا حقدار میرا گدھا ٹھہرتا ہے کیونکہ جب بھی بارش قریب ہوتی ہے تو گدھا غیر معمولی اچھل کود کا مظاہرہ کرتا ہے اور میں بارش کے امکان سے مطلع ہوجاتا ہوں۔ یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے آج سے ہمارا وزیر اعظم یہ گدھا ہی ہوگا۔ یہ واقعہ سنا کے ابراہم لنکن نے اپنے دوست کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر وہ مسٹر کہانی کی دلچسپی میں اس بری طرح کھو چکے تھے کہ فوراً بولے پھر آگے کیا ہوا؟ اور ابراہم نے بڑی متانت سے کہا کہ پھر یہ ہوا کہ اس کے بعد سے دنیا کے ہر گدھے نے وزارت اپنا موروثی حق سمجھنا شروع کردیا۔ شاہ جی نے حکایت سُنی اور کھلکھلا کر ہنس دیے۔ مخاطب کو بہت داد دی۔ کہ پاکستان کی سیاسی صورت حال پر یہ بڑا بلیغ تبصرہ تھا۔ افسوس اس ملاقاتی کا نام حافظہ میں محفوظ نہیں رہا۔

***

تُو ایک طرف ایک طرف نسل ہلاکو!

چھایا ہے زمانے میں جدھر دیکھئے ہر سو
اے مردِ قلندر تیرے الفاظ کا جادو
کیسے میں کہوں اِن میں ترا خون نہیں ہے
مہکے ہیں جو محبوبۂ ایام کے گیسو
اصنام فرنگی کا نشاں بھی نہیں باقی
گونجا ہے فضاؤں میں ترا نعرۂ یاہُو
ہر معرکۂ دار و رسن یاد ہے تیرا
تُو ایک طرف، ایک طرف نسل ہلاکو
عظمت کو تری آج بھی دنیا نہیں سمجھی
دنیا جو سراپا ہے بدطینت و بدخُو
مدت سے ترستے ہیں جو آواز کو تیری
سمجھائے انہیں کون کہ خاموش ہے کیوں تُو

اشرف قدسی

سید ماجد علی شاہ

مجھے یاد ہے ذرا ذرا

سید ماجد علی شاہ صاحب، حضرت امیر شریعت کی اہلیہ مرحومہ کے سگے تایازاد ہیں۔ اسی ناطے وہ انہیں آپا جی کہہ کر پکارتے اسی طرح حضرت امیر شریعت کو بھائی جان کہتے۔ قیام پاکستان کے وقت امرتسر سے اجڑ کر لاہور آئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ آج کل لاہور میں سرکاری ملازم ہیں ذیل کی تحریر اُن کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے حوالے سے ایک تاثراتی کہانی ہے۔ (مدیر)

جب بھی میں اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں تو ایک تصویر ہمیشہ مجھے صاف دکھائی دیتی ہے۔ تصویر کیا ہے۔ میری بپتا ہے۔ آپ بیتی ہے۔ میرے بچپن کی کہانی ہے۔ ایک حقیقت ہے جو میرے دل پر نقش ہے۔

ایک بیوہ خاتون کے اوپر تلے کے پانچ بچے ہیں۔ غربت اور کسمپرسی میں لپٹے ہوئے۔۔۔۔ انکے ارد گرد کے لوگ اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔ بیوہ خاتون اپنے ماں باپ کے جدی گھر (امرتسر) میں اپنے بچوں کو چھپا کر بیٹھی ہے۔ اس بے سہارا خاندان پر کیا گزرتی ہے؟ کس طرح اس معاشرہ میں وہ گذر بسر کرتا ہے؟ کن کن کرداروں کے ساتھ اس کا واسطہ پڑتا ہے؟ یہ اور اس قسم کے بے شمار سوالات جب میرے ذہن میں ابھرتے ہیں تو اس وقت مجھے امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ جو رشتے میں میرے بہنوئی ہیں۔ بہت یاد آتے ہیں۔ ان کے عظیم کردار، انکی بے لوث اور بے غرض محبت کو میں عمر کے اس حصے میں بھی نہیں بھلا سکتا اور آخر دم تک نہ بھلا سکوں گا۔

ایک بے رحم معاشرہ میں عمومی رویہ یہی ہوتا ہے کہ جو شخص اس قسم کے حالات سے دوچار ہو۔ اسکے دولت مند رشتہ دار افلاس کی اس کیفیت پر ہنستے ہیں۔ یہی صورت حال اس بیوہ خاتون (میری والدہ ماجدہ مرحومہ) کو پیش آئی۔ خاندان نے کھاتے پیتے لوگ انکی اس مفلوک الحالی پر نہ صرف ہنسے بلکہ انہیں اپنا عزیز کہنا بھی چھوڑ دیا۔

اس ماحول میں خاندان کے جس شخص نے ہمارا ہاتھ پکڑا وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ یہ منظر آج بھی میرے ذہن میں گھوم رہا ہے۔ شاہ جی کے امرتسر والے مکان میں بیٹھا میں قرآن شریف کا سبق یاد کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ آپا جی کی طرف سے خوفزدہ ہوں کہ سبق یاد نہ ہوا تو سزا ملے گی۔ اسی دوران پیر جی (شاہ جی کے سب سے چھوٹے فرزند سید عطاء المہیمن جنہیں پیار سے سب گھر والے پیر جی کہتے ہیں) کو میں نے گود میں لیا ہوا ہے اور سلانے کیلئے لوریاں بھی دے رہا ہوں۔ آپا جی مرحومہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ میری بھابھی (بنت امیر شریعت جنہیں ہم آپی کہہ کر پکارتے) بچیوں اور بچوں کو قرآن کریم پڑھا رہی ہیں۔ میں پیر جی کو کھلاتے کھلاتے اپنا سبق بھی یاد کر رہا ہوں لیکن سبق ہے کہ یاد ہی نہیں ہو رہا۔ اور اس بات کی فکر بھی ہے کہ اگر سبق یاد نہ ہوا تو آپی تو شاید کچھ رعایت کر دیں مگر آپا جی مرحومہ پٹائی کر دیں گی۔ بھائی جان مرحوم (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) حسب معمول اللہ کے دین کی تبلیغ کیلئے گھر سے باہر ہیں۔ اس موقع پر لالہ جی (شاہ جی کے دوسرے فرزند سید عطاء المحسن

بخاری جنہیں پیار سے ہم للہ جی کہتے ہیں) سے میری ایک آدھ چونچ بھی ہو جاتی ہے۔ پھر اچانک محلہ سے ایک شور بپا ہوتا ہے۔ پکڑو پکڑو! یہ کوئی پتنگ کٹ کر جا رہی تھی اور بچے اس کے تعاقب میں تھے۔ میں بھی پیر جی کو تقریباً پھینک کر "گڈی" لوٹنے چھت پر چلا جاتا ہوں۔ گڈی تو لوٹنے والے لوٹ گئے مگر میں خالی ہاتھ نیچے آکر آپا جی کے حکم پر کان پکڑ لیتا ہوں۔ بعد میں آپی جی کی سفارش پر مجھے معاف کر دیا جاتا ہے۔ پھر میں نے سبق یاد کر کے سنایا تو آپا جی بہت خوش ہوئیں۔ سبق سننے کے بعد انہوں نے مجھے چاول اور ثابت مونگی کھلائے۔ یہ ہمارے پنجابی اور کشمیری لوگوں کی پسندیدہ غذا ہے۔ دال چاول بہت مزیدار ہیں۔ اور میں مزے لے لے کر کھا رہا ہوں اس دوران آپا جی مجھے کھانے کے آداب بھی سکھا رہی ہیں۔ "منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز مت نکالو" میں کھانا کھا چکا تو آپا جی میرے باقی بھائیوں اور والدہ کیلئے کھانا باندھ کر دیتی ہیں۔ "بیٹے جاؤ گھر لے جاؤ"

یہ وہ احساس ہے جو خالصتاً اللہ کی عطاء ہے

آپا جی جانتی تھیں کہ میری ایک عزیزہ بیوہ ہے۔ اور غریب ہے اسلئے ہر طریقے سے ان کی مدد کرتی تھیں۔

بھائی جان مرحوم تحریک آزادی کے عظیم رہنما تھے۔ تمام ہندوستان میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ لوگ انکی باتوں اور صحبت کو ترستے تھے۔ بڑے بڑے سیاسی رہنما اور ادیب و شاعر ان سے ملنے آتے۔ مگر دوسری طرف میں ---- ایک یتیم اور غریب بچہ، میلا لباس بڑے بڑے بال اور سر جوؤں سے بھرا ہوا لیکن وہ مجھے اپنی پاکیزہ گود میں بٹھا کر احباب سے میرا تعارف یوں کراتے "ان سے ملئیے یہ میرے سالے ہیں" یہ تعارف، یہ محبت اور یہ اپنائیت میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے رویے سے میرے اندر احساس کمتری پیدا نہ ہونے دیا۔ بے شک وہ ہم سب کیلئے روشنی کا ایک مینار تھے۔ جن سے ہم سب حسب توفیق روشنی حاصل کرتے تھے۔ وہ ایک مثالی کردار کی حامل شخصیت تھے۔ اللہ اللہ! کیا لوگ تھے۔ اللہ کی رحمت کے خزانے ان پر نچھاور تھے۔ وہ سوائے انگریز کے کسی کے دشمن نہ تھے۔

یہ انکے عظیم اور بلند کردار کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ میں نے ان کا یہ رویہ شعور کے آنے سے پہلے کا جذب کیا ہوا ہے۔ جس کا اظہار میں کبھی کبھار اپنے مرحوم بھائی سید سعید شاہ صاحب سے کیا کرتا تھا پھر آج صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے تاریخ کے حوالے کر رہا ہوں۔

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

سید عطاء المحسن بخاری

سید الاحرار کی قرآن فہمی

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مختلف طریقوں سے مختلف ادوار میں اظہار فرمایا ہے کبھی کسی خطہ میں کبھی کسی قسم میں اور کبھی کسی فرد کی شخصیت کے روپ میں حضر سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت عظیمہ اور قدرت کاملہ کے مظہر تھے شاہ صاحب مغفور جامع صفات تھے آپ ایک عظیم خطیب تھے۔ مبلغ اسلام تھے۔ آپ کے تبلیغی انداز انوکھے اور نرالے تھے آپ اس وصف میں برصغیر میں یکتا تھے۔ آپ ایک بہترین سیاست دان تھے۔ آپ کی رائے پیش آئندہ حالات کا آئینہ ہوتی اس کے باوجود آپ اپنی رائے پیش فرما کر اصرار نہ فرماتے آپ صوفی کامل تھے آپ مربی تھے آپ کے تربیتی خطوط حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ نقوش پر مبنی تھے اور یہ نابغہ روزگار ذات گرامی مذکورہ بالا اوصاف کے ساتھ تفسیری اقدار کی حامل تھی۔ بہت سی آیات ایسی ہیں۔ کہ ان کا مفہوم سلف کی کتابوں میں خال خال ہی نظر آتا ہے آپ کی ایک امتیازی شان یہ تھی کہ ہمیشہ قرآنی مضامین کی تہہ تک پہونچنے کی سعی فرماتے اور تمام مفسرین کے طریق سے ہٹ کر سوچتے پھر اسے علماء عصر علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی کی محفلوں میں بیان کرتے اور ان سے داد تحسین وصول کرتے۔ اس سلسلہ میں ایک بات واضح کردینا ضرور سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کو دو جگہ سے روشنی ملی۔ دوران تعلیم حضرت مولانا نور احمد امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ سے، دوسرے دور میں حضرت شاہ عبد القادر دہلوی مرحوم کے شہرہ آفاق ترجمے سے جسے آپ نے مدت العمر ساتھ رکھا اور جیل کی زندگی میں بھی اس سے مکمل استفادہ کرتے رہے۔

ایک دفعہ خود فرمایا کہ اللہ الصمد کے معنی میں مجھے ہمیشہ تردد رہا کہ "اللہ بے نیاز ہے" بس یوں ہی دل کو تسکین نہ ہوتی جیل ہی کا واقعہ ہے کہ شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کا مترجم قرآن پاک دیکھ رہے تھے کہ اچانک اس کا خیال آیا کہ دیکھیں شاہ صاحب کیا لکھتے ہیں۔ جب وہ جگہ نکالی تو حضرت نے ترجمہ فرمایا "اللہ نرادھار ہے" شاہ جی فرماتے ہیں کہ میں کبھی اسے نرُدھار پڑھوں کبھی کچھ کبھی کچھ بالآخر اپنے جیل ہی کے ایک ساتھی پنڈت نیکی رام شرما کے پاس گیا جو بہت فاضل تھا اس سے پوچھا کہ یہ لفظ کیا ہے وہ دیکھتے ہی جھومنے لگا اور واہ واہ کے نعرے بلند کرنے شروع کردیئے میں نے چند لمحے انتظار کے بعد کہا کیا عجب آدمی ہیں۔ میں انتظار میں ہوں اور آپ اپنے ہی آپ لطف لے رہے ہیں مجھے بھی تو علم ہو کہ کیا معنی ہیں اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے "نردھار" اور یہ اس ذات پر بولا جاتا ہے کہ جس کا کام کسی بن نہ اڑے اور جس بن کسی کا کام نہ بنے فرمایا تب مجھے تسکین ہوئی۔ اور یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گمشدہ متاع مل گئی ہو پھر میں نے اسی پر کئی کئی گھنٹے بیان کیا۔ ایسے ہی فرمایا کہ اھدنا الصراط المستقیم تا ولا الضالین کے معنی میں بھی مجھے تسکین نہ ملتی کیونکہ عام معنی میں دکھا ہم کو سیدھی راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا نہ ان کی جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوئے لیکن جب حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھا تو بالکل وضاحت ہوگئی اور وہی عین مطابق معنی ہیں وہ فرماتے ہیں

چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان کی جن پہ تیرا انعام ہوا (اور) نہ ان پر تیرا غضب اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

ظاہر ہے کہ جو بات اس میں ہے وہ اس عام ترجمہ میں نہیں یہ دونوں ترجمے ایک دوسرے کا عکس ہیں اس میں ایک تو اھدنا کے معنیٰ دکھائے گئے ہیں جو اس کی ذات وحدہ لاشریک لہ کے منافی ہے جہاں کانٹے ہی کانٹے ہوں وہاں اکیلا چھوڑ دینا؟ اور ساتھ چلانا ایسا ہے کہ جیسے باپ بچے کو انگلی پکڑ کر ساتھ چلاتا ہے اور راستہ کی دشواریاں سہل کر دیتا ہے اپنی توفیق و حفاظت میں چلانا یہ اس بارگاہ کی عین شان ہے۔

ایک دفعہ حضرت شاہ جی کے یہاں گھر پر بہت سے علماء جمع تھے ان میں سے بے تکلف ساتھی صرف استاذی مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ تھے شاہ جی نے حسب عادت اکابر کا ذکر چھیڑ دیا جو بہت دیر تک جاری رہا۔ آخر میں شاہ جی نے کہا سبحان اللہ کیسا اچھا وقت گزرا کیسے اچھے تذکرے تھے کہ مصیبت کا خیال تک نہیں گزرا جن کا تذکرہ ہوتا رہا ہے اللہ تعالی انہیں کے ساتھ محشر میں اٹھائے (امین) اور یہ "آیت" وتوفنا مع الابرار پڑھ کر سب سے اس کے معنی پوچھے سب نے عام معنی کئے کہ "موت دے ہمیں نیکیوں کے ساتھ" شاہ جی نے فرمایا کچھ اور سب نے سکوت اختیار کیا آپ نے فرمایا کہ (پنجابی میں) "تے پوری پا ساڈی نال نیکاں دے" ہر طرف سبحان اللہ سبحان اللہ کے آوازے آنے لگے مولانا خیر محمد صاحب نے فرمایا ماشاء اللہ شاہ جی یہ آپ ہی کا حصہ ہے اور آپ نے بالکل لفظی و لغوی اور اس میں مطابقی معنی بیان فرمائے ہیں پھر دیر تک تمام حظ اندوز ہوتے رہے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کا ذکر قرآن شریف کے سولھویں پارے میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے وہاں آپ کی مہدی زندگی میں آپ کی معجزانہ زندگی کا ذکر ہے اس گفتگو میں حضرت عیسی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ

و جعلنی نبیا و جعلنی مبارکاً این ما کنت و اوصٰنی بالصلوۃ

شاہ جی نے ایک دن اپنے ایک متوسل مولوی یسین صاحب سے پوچھا کہ جانتے ہو "این ما کنت" کیوں فرمایا انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

کیا یہ بھی جانتے ہو کہ سارے قرآن میں کسی اور نبی کے ذکر میں بھی یہ ہے اس پر بھی انہوں نے نفی کا اظہار کیا پھر آپ نے فرمایا: یہ صرف حضرت عیسی کے ذکر میں ہے اور علت اس تخصیص کی یہ ہے کہ ایک ہی نبی ہے جو زمین پر بھی تھا اور آسمان پر بھی ہے اور پھر زمین پر بھی نزول ہوگا۔ ورنہ این ما کنت کا معنوی مقصد فوت ہو جاتا ہے اگر انہیں مردہ تسلیم کر لیا جائے اور سرینگر میں دفن بھی مان لیا جائے جیسا کہ نصرانی وغیرہم کہتے ہیں اور بڑی دلیل یہ ہے کہ جو آگے آیت کے آخر میں ہے "مادمت حیا" جب تک میں زندہ رہوں یہ مسیح علیہ السلام کی حیات کی قوی ترین دلیل ہے۔

شاہ جی رحمہ اللہ تعالی کو اللہ تعالی نے ایسی مقبولیت عامہ عطا فرمائی تھی کہ اس کی نظیر پچھلی چند صدیوں میں کم از کم نہیں ملتی آپ کے ملنے والوں میں ہمہ قسم لوگ تھے۔ ہر مکتب فکر کے لوگوں کو شاہ جی سے عقیدت تھی اور شاہ جی بھی ان سے مل کر خوشی کا اظہار فرماتے! وہ لوگ شاہ جی کے خلوص اور سادہ عظمت کا اعتراف کر کے حاضر خدمت ہوتے اور خلوص و محبت کے جوہر رولتے اور جھولیاں بھر بھر لے جاتے! شاہ جی کے شیعوں کی ایک مستقل کھیپ

سے سماجی ومجلسی مراسم رہے، ہیں ملتان کے قیام میں ایک معتدل شیعہ دوست کی آمد و رفت کثرت سے ہونے لگی۔ دن بہ دن راہ و رسم بڑھتے ہی گئے وہ آتے اور بہانے سے اہل بیت اور اپنے آئمہ کا ذکر چھیڑ دیتے اور شاہ جی کو کریدنے کی کوشش کرتے لیکن حضرت شاہ جی ہمیشہ طرح دے جاتے اور گفتگو کا موضوع ہی بدل دیتے ایک روز وہ محترم حاضر ہوئے اور حسب عادت پھر وہی تذکرہ شروع کر دیا۔ اور اس دن انہوں نے کچھ تیکھے انداز سے آیت تطہیر کا سوال کر کے بحث شروع کر دی۔ اور کہا کہ یہ آیت نزولاً اور حکماً اہل بیت کے بارہ میں ہے اور وہ اس کے حکم سے معصوم و منزہ ہیں حضرت شاہ جی نے اس گتھی کو ضروری خیال کرتے ہوئے یوں حل فرمایا کہ یہ آیت کریمہ ہر نوعیت سے ازواج مطہرات کے حق میں ہے اور سبب نزول بھی صرف انہی کی ذات ہے اور یہ بات ایسے ہی نہیں کہتا۔ اس کا سیاق و سباق اس کی بڑی اہم دلیل کہ یہ آیات صرف امہات المؤمنین کے بارہ میں نازل ہوئیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اہل بیت مراد لئے جائیں تو آپ حضرات کا آئمہ کے متعلق معصومیت کا دعوی باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ آیت کے الفاظ ناطق ہیں کہ پہلے ان میں "رجس" تھا بعد میں "تطہیر رجس" کا پایا جانا پھر طہارت کا ہونا یہ تو شان معصومیت کے منافی ہے۔

بچہ کو معصوم کہنے کی علت اتنی ہے کہ وہ ایک حد تک گناہ کے تصور سے ہی طاہر و منزہ ہوتا ہے پھر انبیاء کرام کو جو معصوم کہا جاتا ہے تو وہاں بھی یہ حکمت ہے ان کی ذات گرامی پیدائشی طور پر اس استعداد سے ہی پاک ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بات نہ پائی جائے بلکہ رجس کا وجود مان کر پھر تطہیر کا ڈھنڈورہ پیٹا جائے تو یہ میرے نزدیک کفر ہے کیونکہ انبیاء کے بارے میں تو تصور معصیت ہی باعث دخول نار ہے جب کہ آپ میں سے بعض عنادی لوگ اس بات کے خود معترف ہیں اور یہ اعتراض کہ انبیاء میں استعداد ہوتی ہے اور دلیل میں حضور نبی کریم ﷺ کے بچپنے کے سینہ چاک کئے جانے والے واقعہ کو پیش کرتے ہیں اور یہ عصمت انبیاء کی تضحیک ہے یہ سینہ چاکی تو نور معرفت کا سبب بنی جو ایام طفولیت میں ہی ظہور پذیر ہو گیا تھا۔ اس پر ان صاحب نے اعتراض کیا کہ اگر یہ ازواج مطہرات کے حق میں ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں رجس تھا۔ شاہ جی نے فرمایا بالکل واضح ہے وہ اور چونکا اور حیران ہوا کہ نبی کی اہلیہ اور رجس؟ شاہ جی نے پھر تفصیلاً فرمایا کہ ازواج مطہرات اکثر امراء عرب کی لڑکیاں تھیں جو ناز و نعم کی پروردہ تھیں ان کے دلوں میں مال کی محبت تھی اور مال کی محبت ہی سب سے بڑا رجس ہے اور پھر نبی کی بیوی میں رجس باقی رہنے دیا جائے کیوں کر ہو سکتا ہے؟ نبی کا تو مشن ہی مال کی محبت دلوں سے نکالنا اور خدا کی محبت سے دلوں کو روشن اور معمور کرنا ہے پھر اللہ تعالی نے ازواج مطہرات کے دلوں سے یہ رجس ایسا خارج کیا کہ پھر آٹھ آٹھ روز تک چولہوں میں روشنی نہ ہوتی! مال کی محبت کو دلوں سے نکالنے کو ہی تطہیر ثابت کرنے کے لئے پھر شاہ جی نے سنداً دوسری آیت تلاوت فرمائی۔

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها

لیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تطہیر کیجئے ان کی اور تزکیہ کیجئے ان کا اس کے ساتھ (مال لے کر) معلوم ہوا کہ جب مال کا لینا تزکیہ و تطہیر کا باعث ہو سکتا ہے تو جہاں سرے سے محبت ہی ختم کر دی جائے! اور لفظ اہل بیت کی مراد کو

واضح کرنے کی غرض سے حضرت ابراہیم کے تذکرہ میں ان کی اہلیہ کو خطاب کے وقت کے قرآنی الفاظ سند اً پیش فرمائے

قالوا اتعجبین من امر الله رحمت الله و برکاته علیکم اهل البیت

کہا انہوں نے (فرشتوں نے) تعجب کرتی ہیں آپ اللہ کے کام پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں تم پر (اے) گھر والی۔

اہل بیت سے مراد زوجہ ابراہیم علیہ السلام ہے نہ کہ میرا خاندان ابراہیم۔ وہ شیعہ دوست جھوم جھوم گیا۔ اور پھر جذبات کے وفور میں کہا شاہ جی میں قیامت کے روز اللہ کے سامنے آپ کا دامن پکڑ کر کہوں گا کہ اے اللہ انہوں نے ہماری برادری کو سیدھی راہ نہ دکھائی ورنہ یہ سب کچھ کرسکتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کسی کے بس کا روگ ہی نہیں جبکہ باری عزاسمہ نے خود حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات گرامی کو ارشاد فرمایا

نک لاتهدی من احببت و لکن الله یهدی من یشاء

پروفیسر شاہد محمود کاشمیری

ہے نگاہوں میں روئے نورانی

شاہ صاحب کی ذات کیا کہیے — تھی بہارِ صفات کیا کہیے
وہ گئے، دل کا بوستاں اجڑا — دل کی اب واردات کیا کہیے
ہجر کی رات آگئی ایسے — بن گیا دن بھی رات کیا کہیے
ہے نگاہوں میں روئے نورانی — لب پہ ہے ان کی بات کیا کہیے
اے جہانگیرِ گردشِ حالات! — میری تیغِ ممات کیا کہیے
بعد تیرے وطن پہ کیا بیتی — تجھ سے جانِ حیات کیا کہیے
راہبر، راہزن ہوئے ثابت — لُٹ گئی کائنات کیا کہیے
اپنے اہل وطن کی سازش سے — ہو گئی ہم کو مات کیا کہیے
غیر ممکن ہے غم کے ماروں کی — درد غم سے نجات کیا کہیے
ملک میں انتشار ہے ہر سو — اور دشمن کی گھات کیا کہیے

شاہ صاحب کو دے کوئی آواز
جل اٹھے شش جہات کیا کہیے

ابو طاہر فدا حسین (مدیر مہر ماہ)

باطل کا رنگ اُس کے حقائق سے زرد تھا

رخصت ہوا جو ہم سے حق آگاہ مرد تھا
سینے میں جس کے عشق حقیقی کا درد تھا
پھونکی جو حق نے روح حیات دوام کی
سرگرم عشق دیں وہیں پل بھر میں سرد تھا
حاصل اسے تھیں قرب حضوری کی نعمتیں!
عشق رسول میں وہ جو صحرا نورد تھا
اللہ رے اس کا زور خطابت رجز صفت
اک جذبۂ جہاد کہ جوش نبرد تھا
لرزاں دل حریف ' رگ و پے میں کپکپی!
باطل کا رنگ اس کے حقائق سے زرد تھا
کہتا جسے امیر شریعت ہے اک جہاں
اس کے حضور جھکتا ہر اک یزد جرد تھا
مرقد پہ اس کے رحمت باری کا ہونزول
عشاق ملک و قوم میں محبوب فرد تھا
کیا اس کی رزم و بزم کی توصیف ہو فدا
" حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا "

اے کاش! کوئی اللہ کا بندہ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس جمع کرتا تو ہزاروں کتابوں پر بھاری کتاب بنتی (اللہ پاک اپنے کسی بندے کو توفیق دے آمین) یہاں ایک واقعہ نقل کرنا مقصود ہے۔ جس سے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا منفرد انداز تبلیغ حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی عجیب مثال سامنے آتی ہے۔ حضرت نے اپنی بیٹھک میں کئی مرتبہ دوران گفتگو فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک آریہ سماجی نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شاہ جی آپ جو یہ کلمہ پڑھتے ہیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یہ کلمۂ توحید تو نہیں ہے بلکہ یہ تو کلمۂ شرک ہے۔ (عیاذاً باللہ) ہاں اگر صرف لا الہ الا اللہ ہوتا تو کلمۂ توحید تھا۔ لیکن جب محمد رسول اللہ اس میں آگیا تو یہ کلمۂ توحید نہ رہا۔

میں نے برجستہ جواب دیا یہ تو تمہارے لئے ہے۔ تم لوگ چونکہ بڑے لوگوں کی پوجا پاٹ شروع کر دیتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ بزرگ لوگ بھی الٰہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے وضاحت کر دی کہ محمد ﷺ الٰہ نہیں ہیں بلکہ صرف رسول اللہ ہیں کہیں تم بھی ان کی پوجا نہ شروع کر دو فبھت الذی کفر یں کافر مبہوت ہو گیا

مولانا محمد یٰسین جھنگوی

نور محمد انور ۔ کالاباغ

"تیری رحلت سے ہوا علم وادب کا گل چراغ"

اے خطیب ملک وملت اے امیر باکمال
کر گیا ہے آج کیوں ملت کو تو وقف ملال
ہو گیا وقفِ خزاں اب سارا عالم بے گماں
مضمحل فرقت میں تیری ہو گیا سارا جہاں
اس جہانِ سے ایک دن سب نے ہوناہے فنا
خالقِ کونین کا ارشاد بے شک ہے بجا
ملک و ملت کو ہے تیری موت پہ صدمہ عظیم
خادمِ اسلام تھا، تو ملک وملت کا زعیم
یاد کرتی ہی رہے گی تجھ کو اے والا صفات
ملت اسلامیہ خدمت تری ساری حیات
روشنی بن کر رہا دنیا میں تو روشن دماغ
تیری رحلت سے ہوا علم وادب کا گل چراغ
شرع نبوی کی اطاعت میں تری گزری حیات
عالمانِ دین میں مشہور تھا تو ذی صفات
رہنمائے قوم تھا تو سید الاحرار تھا
جان و دل سے تُو فدائے احمد مختار تھا
یک زباں ہو کر رہا ہر بات میں ثابت قدم
تُونے ہر آلام میں اونچا کیا دیں کا علم
عالمِ اسلام میں زندہ رہے گا تیرا نام
خُلد میں تجھ کو ملے گا بایقیں اونچا مقام
تیری تربت پر سدا ہو رحمت حق کا نزول
یا خدا یہ التجا انور کی ہو جائے قبول

ابنِ امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری

مجلس احرار اسلام اور مجلس تحفظ ختم نبوت

۱......۴۸ء میں مجلس احرار اسلام کے اکابر نے غیر سیاسی ہونے کا فیصلہ کیا۔
ان اکابر مرحومین کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ضیغم احرار جناب شیخ حسام الدین صاحب امرتسری۔ مدبر احرار جناب ماسٹر تاج الدین صاحب لدھیانوی۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

۲......۴۹ء میں مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام ملتان میں دارالمبلغین قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چونکہ مجلس احرار اسلام کا شعبہ تبلیغ پہلے قادیان میں تھا۔ اور پاکستان بننے کے بعد جماعت کے اکابر بھی تقسیم ہند کی اشاعت کا شکار ہوئے تھے حالات سازگار نہ تھے۔ اپنی پونجی سنبھالنے میں دو سال لگ گئے۔ ادھر مرزائیوں نے ربوہ میں فرنگی اور مسلم لیگ کی سرپرستی میں کئی سو بیگھہ زمین حاصل کر کے مرزائیت کا ایک بڑا مرکز قائم کر لیا تھا۔ اس لئے بزرگوں نے رد مرزائیت کے لئے ربوہ میں یا ربوہ کے آس پاس جگہ حاصل کرنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر مرزائی نواز مسلم لیگی حکومت نے مجلس احرار کی ایک نہ چلنے دی۔ تب حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی اپنی نگرانی میں ملتان میں ہی شعبہ تبلیغ کی ابتداء کی گئی یوں دار المبلغین قائم ہوا جس میں حضرت مولانا محمد حیات صاحب اور حضرت مولانا لال حسین اختر صاحب مجلس احرار کی نظامت میں تعینات کئے گئے کہ یہی بزرگ ختم نبوت، حیات عیسیٰ علیہ السلام، رد مرزائیت کے موضوعات پر احرار کے مستند اور ماہر مناظر تھے۔ اور انہیں ان موضوعات پر زبردست کمانڈ حاصل تھی۔

۳......ربوہ میں مرزائیوں نے مرکز بنانے کے بعد انگریز اور مسلم لیگ سے حاصل کئے گئے سرمائے کے بل بوتے پر پاکستان کے گوشے گوشے میں تبلیغ مرزائیت کا جال پھیلا دیا تو مجلس احرار اسلام نے اپنی خداوند جرأت و بہادری شجاعت و بسالت اور ہمت و سرفروشی کی روداد رقم کرتے ہوئے ۵۰ء، ۵۱ء، ۵۲ء میں مرزائیوں کے خلاف بھرپور کام کیا اور ان کے تعاقب میں سندھ اور بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں بھی گئے جس کے نتیجے میں ۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک چلی تحریک نے جہاں مرزائیت کی کمر توڑ دی وہاں مسلم لیگی حکومت بھی زیروزبر ہو گئی۔ جسکی پاداش میں مجلس احرار اسلام کو خلاف قانون جماعت قرار دیدیا گیا۔ دفاتر بند، اثاثہ و ریکارڈ ضبط اور اکابر احرار جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند۔

ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

۴......ایک سال بعد اکابر احرار رہا ہوئے تو پھر آشیانے کے تنکے چننے لگے مگر وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ کالعدم مجلس احرار اسلام کے اکابر جمع ہوئے اور باہمی طویل مشاورت سے طے پایا کہ مجلس احرار اسلام کا شعبہ تبلیغ تحفظ ختم نبوت تو موجود ہے اسکو نئے سرے سے منظم کیا جائے۔ اور حضرت امیر شریعت کی نگرانی میں احرار کے کاز اور رد مرزائیت کا کام وسیع پیمانے پر کیا جائے چنانچہ اس فیصلہ کے بعد شعبہ تبلیغ، تحفظ ختم نبوت

کے نام سے سرگرم ہو گیا۔

۵......حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ مجلس احرار اسلام صوبہ پنجاب کے صدر تھے۔ انہیں اس شعبہ تبلیغ کے حساب کتاب کی نگرانی سپرد کی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت مولانا مرحوم ایک دستور مرتب فرما کے لے آئے۔ جس میں اس شعبہ کو مستقل جماعت کی حیثیت دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ گھڑی احرار ساتھیوں کے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ مگر ان کے پر کٹے ہوئے تھے۔ احرار خلاف قانون تھی۔ ساتھی کچھ نہ کر سکتے تھے۔ احرار دوہری پالیسی کی زد میں تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی رہائش گاہ پر پانچ روز کی مسلسل کشمکش کے بعد شیخ حسام الدین صاحب، ماسٹر تاج الدین انصاری صاحب اور نواب زادہ نصراللہ خان صاحب حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ کی احرار سے عدم موافقت اور عدم موانست سے تنگ آ کر الگ ہو گئے اور احرار کے آزاد ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

۱۹۵۷ء میں سکندر مرزا......سازش اور برطانوی و امریکی آقاؤں کی اشیر واد سے برسراقتدار آیا تو کچھ ماہ کے لئے مجلس احرار اسلام واگزار ہو گئی۔ احرار کے اکابر نے جماعت کا باقاعدہ اجلاس طلب کیا جس میں تمام اکابر و اصاغر شریک ہوئے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور بھی اس موقع پر الگ نہ رہ سکے۔ یاد ماضی اور سنگت کا لطف انہیں ستانے لگا اور وہ پھر انہیں ایثار پیشہ سرفروشان احرار سے آملے۔ لیکن اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے، کے مصداق ۱۹۵۸ء میں ایوب خان مرحوم نے رافضی سکندر مرزا کا ایسا ٹیٹوا دبایا کہ اس غدار ابن غدار کی ناؤ ہی ڈوب گئی اور پھر کبھی نہ ابھر سکی۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب رحمہ اللہ چین سے بیٹھنے والے بزرگ نہ تھے۔ جب مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفاتر بھی سیل کر دیئے گئے۔ اور حکومت نے یہ کہ کر سیل کئے کہ یہ تو مجلس احرار کا ذیلی ادارہ ہے۔ تو مولانا مرحوم نے اس کی بحالی کے لئے صوبائی انتظامیہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا جس کے نتیجہ میں طے پایا کہ آپ "تعلیم القرآن" کے نام سے کام کریں اور اپنے "غیر احراری" ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ آپ کے "کردار" کو دیکھا اور آپ سے "حسن سلوک" کیا جائیگا۔ حضرت مولانا مرحوم نے یہ بات ملتان لوہاری گیٹ والے دفتر کے ایک کھلے کمرے میں باقاعدہ ایک اجلاس میں کھلے بندوں میں سنائی (لیکن حضرت امیر شریعت کو کبھی نہ سنائی) ایک احرار ورکر (جو بقید حیات ہیں اور آج جمعیت علماء اسلام فضل الرحمن گروپ کے سرگرم رہنما ہیں) کے اعتراض پر حضرت مولانا برہم ہو گئے اور فرمایا اگر اسلام میں قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت مجلس احرار اسلام کے شعبہ تبلیغ ہونے کی وجہ سے ہی سیل رہا۔

۱۹۶۲ء میں جب تمام جماعتیں آزاد ہوئیں تو مجلس احرار اسلام بھی آزاد ہو گئی۔ پابندی اٹھنے کے بعد حضرت قبلہ شیخ حسام الدین صاحب نے ملتان کے اسی دفتر (تحفظ ختم نبوت) کے ایک کمرے میں مجلس احرار اسلام کی تنظیم نو کا اعلان فرمایا۔

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو؟

مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا!

۶...... یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ نے ۵۸ء کے بعد مسلسل یہ بات جلسہ عام میں فرمانی شروع کر دی کہ:۔

"میرا مجلس احرار اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے میں مجلس تحفظ ختم نبوت کا خادم ہوں۔"

انہیں ان خیالات کے اظہار سے روکا گیا۔ تو وہ برہم ہو گئے۔

گذشتہ کئی برس سے مسلسل بعض ناعاقبت اندیش اور ان پڑھ تاریخ نویس ریکارڈ خراب کر رہے ہیں۔ اور اپنی اس تاریخی غلطی پر مسرور بھی ہیں۔ میں نے یہ سطور صرف ریکارڈ کی اصلاح کے لئے لکھ دی ہیں۔ کسی شخص کی توہین ہر گز مطلوب نہیں۔ موضوع اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستقل کتاب کا مقتضی ہے اور انصاف چاہتا ہے۔ ہماری گزشتہ تیس برسوں کی خاموشی کو شرافت کی بجائے کمزوری پر محمول کیا گیا مگر اب پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ چشم دید حقائق پر مبنی مستقل کتاب عنقریب شائع کر دی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

ایماں کی صباحت سے چہرہ تھا درخشندہ

باطل کے مقابل تھا تو حق کا نمائندہ
شاید ہو کہیں پیدا تجھ سا کوئی آئندہ
دنیائے خطابت میں ہے گونج تری اب تک
دنیائے ولایت میں تو زندہ و پائندہ
اے سیدِ والا شاں، جینا تھا ترا جینا
جینا تو انہی کا ہے جو مر کے رہیں زندہ
خورشید کی صورت تھی، اے شاہِ تری ہستی
دنیا میں بھی تابندہ، عقبیٰ میں بھی تابندہ
روشن تھا ترا سینہ عرفانِ نبوت سے
ایماں کی صباحت سے چہرہ تھا درخشندہ
جرأت سے شجاعت سے، محبت سے فراست سے
باطل کو کیا تو نے ہر ڈھنگ سے شرمندہ
دنیا سے خفا ہو کر، دنیا سے جدا ہو کر
فردوس میں جا بیٹھا، فردوس کا باشندہ
تجھ سے جو تعلق ہے، تجھ سے جو محبت ہے
سلماں کے دل و دیدہ ہیں اس لئے رخشندہ

سید سلمان گیلانی

حافظ محمد یوسف (ہزارہ)

اُف، آفتاب زیرِ زمیں ہو گیا ہے آج

باطل پہ آج خوف سا طاری نہیں رہا
بولا کوئی مجاہد باری نہیں رہا
کیا حکم عرش فرش پہ جاری نہیں رہا
دنیا میں آج شاہ بخاری نہیں رہا
محبوب بزم گوشہ نشیں ہو گیا ہے آج
اُف آفتاب زیر زمیں ہو گیا ہے آج
درویش تجھ سا کوئی تہہ آسماں نہ تھا
تجھ سا بلا مبالغہ قرآن خواں نہیں
ایسی ادا نہیں ہے کسی کی زباں نہیں
واعظ تو بیشمار ہیں جادو بیاں نہیں
خوش دل تھے خوش مزاج تھے اور خوش خصال تھے
اسلاف کی مثال تھے خود بے مثال تھے
اے دلبر فصیح و بلیغ و حسین آ
نانا کے دین پاک کے وارث امین آ
آنکھوں کے نور دل کے سرور و مکین آ
تجھ کو تلاش کرتے ہیں اہلِ زمین آ
چرچا ترے فیوض کا ہے ہند و پاک میں
تو کس خیال سے شہا سویا ہے خاک میں
جنگل میں کوہسار میں تیری تلاش ہے
گلشن میں سبزہ زار میں تیری تلاش ہے
ندی میں آبشار میں تیری تلاش ہے
بستی میں رہگذار میں تیری تلاش ہے

اے نور چشم، چشم کے تم رُوبرو رہو
اس بزم کے چراغ رہو، گل کی بُو رہو
اے حضرت امیر شریعت بتایئے
اے رازدار سر حقیقت بتایئے
اے آشنائے راہِ طریقت بتایئے
اے پیشوائے اہل بصیرت بتایئے
تیرے بغیر، قوم کو آکر جگائے کون
اعلائے حق کے واسطے سب کچھ لٹائے کون
پاکیزہ بچپن اور جوانی بھی طے ہوئی
حق گوئی اور فیض رسانی بھی طے ہوئی
سیلاب غم کی تیز روانی بھی طے ہوئی
آخر بغیر منزل فانی بھی طے ہوئی
اب اس جہاں کی منزلیں آساں خدا کرے
جنت مقام صدقہ خیرالوریٰ کرے
اے بے شعور قوم کے معمار الوداع
اے شاہ اور شاہ کے کردار الوداع
اخلاق عالیشان کے معمار الوداع
عالی وقار قائدِ احرار الوداع
اے جانے والی ہستئ ممتاز السلام
اے حق کی گونجتی ہوئی آواز السلام

عاصی کرنالی

شریعتِ نبوی کا ظہور تھا جس سے

وہ اک ستارہ اندھیروں میں نور تھا جس سے
شریعتِ نبوی کا ظہور تھا جس سے

وہ ایک چاند جو شب کی جبیں کا جھومر تھا
وہ جس سے چہرۂ اہلِ وفا منوّر تھا

وہ آفتاب کہ جس میں بشارتیں تھیں بہت
جلو میں جس کے سحر کی سعادتیں تھیں بہت

ذرا بلند ہوئی تھی وہ ایک موجِ صدا
تمام اثاثۂ عہدِ فرنگ ڈوب گیا

ذرا سی تند چلی تھی وہ بادِ صرصرِ حق
بتانِ کفر کے دل پھٹ گئے جگر ہوئے شق

ذرا سی تیز ہوئی تھی چراغِ صدق کی لو
قبائے تیرہ شبی کو جلا گیا پرتو

ذرا جلال میں آیا تھا فقرِ آگاہی
ورق ورق ہوا سب دفترِ شہنشاہی

سکندری نے جو مانگا قلندری سے خراج
نہ وہ شکوہِ فرنگی رہا، نہ تخت نہ تاج

لڑی ہے قوم جو برسوں جہادِ آزادی
ہوا شکستہ بالآخر جو طوقِ صیادی

جو کھل گیا درِ زنداں، جو کٹ گئی زنجیر
ہمیں جو خوابِ تمنا کی مل گئی تعبیر

جو فکرِ قوم نے پہنا عمل کا جامہ بھی
ہے اس میں عزمِ بخاری کا کارنامہ بھی

کتابِ راہبری کا بیان مجمل ہے
ہنوز ناموں کی فہرست نا مکمل ہے

اٹھیں گے. چہرۂ ماضی سے پردہ ہائے دقیق
مورخوں کو دیانت کی گر ہوئی توفیق

ذرا تو لاؤ تصوّر میں عہدِ جبرِ فرنگ
اڑا اڑا سا وہ رخسارۂ حیات کا رنگ

وہ سہمی سہمی فضا، وہ دھواں دھواں ماحول
زباں پہ مُہرِ خموشی، دلوں پہ غلبۂ ہول
جبیں پہ داغِ غلامی، نظر میں جنبشِ خوف
ہمارے چاروں طرف خوں چکاں بلاؤں کا طوف
گھس آئے تھے جو لٹیرے ہماری سرحد میں
تمام قوم تھی انکے عتاب کی زد میں
ہمارا دین، ہماری شریعتِ اطہر
ہماری حکمت و دانش، ہمارے فکرو نظر
ہماری دولتِ کردار و سیرت و تہذیب
ہمارے علم و ثقافت، ہمارا ذہنِ نجیب
ہماری سوچ، ہمارا عمل، ہمارا ضمیر
ہمارے پورے تشخص کو کر لیا تھا اسیر
میں کیا بتاؤں غلامی کی زندگی کیا ہے
بس ایک مرگِ مسلسل ہے، بندگی کیا ہے
نظام جبر ہر اک آس چھین لیتا ہے
دلوں سے دولتِ احساس چھین لیتا ہے
یہ عہدِ جبر تھا یا دورِ ننگ و رسوائی
کہ دفعتاً اٹھے کچھ لوگ لے کے انگڑائی
یہ لوگ شعلہ بیاں تھے، یہ لوگ شعلہ بجاں
مثال موجۂ مضطر، مثالِ برقِ تپاں

سید محمد کفیل بخاری

کیا حضرت امیر شریعت نے مجلس احرار اسلام کو ختم کردیا تھا؟

تاریخ مسخ نہ کریں۔ ریکارڈ درست رکھیں

یہ مضمون دراصل ایک ہنگامی نوعیت کا تھا اور ایک ایسی تحریر کے جواب میں لکھا گیا جو اپنے اندر بہت سی غلط فہمیوں اور شبہات کو لیے ہوئے تھی۔ میں اسے اس تاریخی نمبر میں شائع نہ کرتا اگر ان تاریخی غلطیوں کو ایک مستقل کتاب میں شامل کرکے تاریخ کا حصہ نہ بنایا جاتا۔ چونکہ قارئین کا حلقہ ایک ہی ہے اس لئے تاریخ کا دوسرا پہلو بھی ان کے سامنے رکھنا ازبس ضروری ہوگیا۔ آئینہ رو برو ہے۔ (مدیر)

روزنامہ جنگ لاہور ۱۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کے "قانونِ امتناعِ قادیانیت" ایڈیشن میں ایک مضمون بعنوان "قادیانیت جھوٹے دعویٰ نبوت سے قومی اسمبلی کے تاریخی فیصلوں تک ایک جائزہ۔" شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار کا نام درج نہیں۔ معلوم نہیں یہ کن صاحب نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں بعض باتیں تاریخی طور پر غلط شائع ہوئی ہیں۔ جن سے قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار اسلام کی پالیسی کے بارے میں خاصے ابہام اور شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ مضمون نگار لکھتے ہیں۔

☆ "۱۹۴۹ء میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار اسلام کا اجلاس طلب کیا۔ مجلس احرار اسلام کی سیاسی حیثیت ختم کردی گئی اور قادیانیت کے سدِ باب کے لئے مجلس تحفظِ ختم نبوت کے نام پر مذہبی پلیٹ فارم تشکیل پایا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری حسبِ سابق اس جماعت کے امیر قرار پائے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر وغیرہ نے سیاست کو خیر باد کہہ کر تبلیغِ عقیدۂ ختم نبوت کے کام کو سنبھالا۔ بعض دیگر رہنما مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر سیاسی و عملی جدوجہد کے لئے شریکِ سفر ہو گئے۔ بعض احباب نے گوشہ نشینی اختیار کرلی"۔

۱۹۴۹ء کے اسی اجلاس میں امیرِ شریعت کی تقریر کا اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے کہ

☆ "ہم لوگ مجلس تحفظِ ختم نبوت کے پلیٹ فارم سے صرف قادیانی سرگرمیوں کو روکنے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کے لئے اپنی جدوجہد کو سیاسی مفادات سے بالائے طاق رکھ کر کام کریں گے۔"

مضمون نگار نے ۲۰، ۲۱ اپریل ۵۴ء کو حضرت امیر شریعت کے مکان ملتان میں قائدینِ احرار کے ایک اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

☆ "اس اجلاس میں فریقین نے دفاتر و غیرہ تقسیم کر لئے۔ اس طرح ۵۴ء میں اس تجویز کی عملی شکل ظہور میں آئی جس کا اعلان ۱۹۴۹ء میں کر دیا گیا تھا"

مندرجہ بالا اقتباسات میں حقیقت کو نظر انداز کر کے نہ صرف ابہام پیدا کیا گیا بلکہ حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر کے الفاظ میں تحریف بھی کی گئی ہے۔ جن سے دو شبہات واضح طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ۱۹۴۹ء میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار اسلام کو ختم کر دیا تھا۔
(۲) ۱۹۴۹ء میں ہی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے نئی مستقل جماعت تشکیل دے دی تھی۔
جس کا انہیں امیر منتخب کر لیا گیا تھا۔

علاوہ ازیں عام قاری کے ذہن میں یقینی طور پر چند سوالات بھی ابھرتے ہیں۔

۱۔ اگر مجلس احرار اسلام کی سیاسی حیثیت ختم کر دی گئی تھی تو پھر کونسی حیثیت باقی رکھی گئی تھی؟
۲۔ اگر کوئی دوسری حیثیت باقی نہیں رکھی گئی تھی تو پھر سرے سے جماعت کے خاتمے کا اعلان کیوں نہ کر دیا گیا؟
۳۔ اگر کوئی حیثیت باقی رکھی گئی تھی تو پھر مجلس تحفظِ ختم نبوت کے نام سے نئی جماعت بنانے کا کیا جواز تھا؟

اس مغالطہ و ابہام کی روح فرسا کیفیت سے باہر نکلنے اور اصل حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں کچھ تفصیل میں جانا ہوگا۔

(۱) ۱۲، ۱۳، ۱۴، جنوری ۱۹۴۹ء کو دہلی دروازہ لاہور میں "دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس" منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بھی ہوا۔ جس میں ملکی حالات کے تناظر میں مجلس کی آئندہ پالیسی اور حکمتِ عملی یہ طے کی گئی کہ "مجلس احرارِ اسلام ملک کی انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لے گی۔ مگر ملکی قومی امور میں اپنی رائے ضرور دے گی۔ چونکہ مرزائیوں نے پاکستان کے اقتدار پر شب خون مارنے کی سازشیں تیز کر دی ہیں۔ اس لئے تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کر کے زیادہ طاقت اسی محاذ پر صرف کی جائے گی۔ مجلس احرار کو قائم رکھا گیا۔ صرف دائرہ کار تبدیل کیا گیا اور مجلس کا شعبہ تبلیغ تحفظ ختم نبوت جو ۱۹۳۵ء میں قادیان میں قائم ہوا تھا اسے فعال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

صاحب مضمون کا تضاد ہی ہمارے موٴقف کی تائید ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

☆ "مجلس تحفظ ختم نبوت کا پہلا اجلاس ۴، ۵ ستمبر ۱۹۵۴ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوا جس میں جماعت کے دستور و غیرہ کی تیاری شروع ہوئی۔" (مضمونِ مذکور)

مزید تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

☆ "۱۳، دسمبر ۱۹۵۴ء کو مجلس تحفظِ ختم نبوت کا پہلا انتخاب ہوا۔ جس میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر، اور مولانا محمد علی جالندھری ناظمِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔" (مضمونِ مذکور)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ

(۱) ۱۹۴۹ء میں مجلس تحفظِ ختم نبوت کے نام سے کسی مستقل یا الگ جماعت کے قیام کا اعلان نہیں ہوا تھا اور نہ ہی حضرت امیر شریعت اس کے امیر چنے گئے تھے۔

(۲) اس اجلاس میں امیر شریعت نے اپنی تقریر میں "مجلس تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم، والا جملہ قطعاً ارشاد نہیں فرمایا یہ صریحاً تحریف ہے۔ امیر شریعت کی تقریر سے قبل محترم شیخ حسام الدین صاحب نے ورکنگ کمیٹی کی منظور کردہ قرار دادیں۔ اجتماع میں پڑھ کر سنائیں۔ جماعت کی پالیسی کے متعلق طویل قرارداد کا یہ حصہ اس ابہام کی وضاحت کرتا ہے۔

☆ "مجلس احرار اسلام کے مقاصد میں اسلام کی سربلندی کے ساتھ ساتھ وطن کی آزادی بھی شامل تھی۔ جو قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی طور پر اب پوری ہو چکی ہے۔ لہذا "دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس" کا یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دینا اپنا ملی فرض سمجھتا ہے۔ کہ آئندہ سے مجلس احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی عقائد و رسوم کو درست رکھنے کے لئے اور خصوصاً مسئلہ ختم نبوت کی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود رہے گی۔"

امیرِ شریعت نے اس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے فرمایا

☆ "بھائی حسام الدین نے آپ کے سامنے جو قرار داد پیش کی ہے وہ مجلس احرارِ اسلام کی آئندہ پالیسی کی آئینہ دار ہے" (حیات امیر شریعت، جانباز مرزا ص ۳۲۵)

اس جملہ میں کہیں بھی مجلس تحفظ ختم نبوت کا ذکر نہیں۔ ۱۹۴۹ء میں مجلس احرار اسلام کے خاتمہ اور مجلس تحفظِ ختم نبوت کے قیام کے دعویٰ کو خود مجلسِ تحفظ ختم نبوت کے پہلے ناظم اعلیٰ مولانا محمد علی جالندھری نے ردّ فرمایا ہے۔ ۴،۵ ستمبر ۱۹۵۴ء ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے پہلے اجلاس شوریٰ میں ارکان کے نام ہدایات میں لکھتے ہیں۔

☆ "مجلس احرار اسلام نے جب سیاسیات سے ۱۹۴۹ء میں علیحدگی اختیار کی تو مقصد الیکشن سے علیحدگی تھا۔ لیکن ملکی اور شہری حقوق سے دستبرداری یا حکومت پر جائز نکتہ چینی سے دستبرداری مراد نہ تھی۔" (تحریکِ ختم نبوت ۱۹۷۴ء جلد دوم صفحہ ۳۸۷) ترتیب مولانا اللہ وسایا۔

حضرت امیر شریعت کے ذہن میں مجلسِ احرارِ اسلام کے وجود کو ختم کر کے کسی نئی جماعت کی تشکیل کا کوئی پروگرام ہوتا تو وہ درج ذیل خط کبھی نہ لکھتے۔ جو ۲۴، دسمبر ۷۴ء کو خان گڑھ سے صدر مجلس

احرار اسلام، ماسٹر تاج الدین انصاری کے نام لکھا گیا۔ اس میں مجلس کی آئندہ پالیسی واضح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

☆ "ملتان میں آپ کے اجلاس کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ چند باتیں لکھ دیتا ہوں۔ اگر احباب کو پسند ہوں تو بہتر ہے۔

۱۔ لیگ سے ہماری سیاسی کشمکش ختم ہو چکی ہے۔ اور الیکشن کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت لیگ قوت حاکمہ ہے۔ مسلمانوں نے اسے بنایا اور قبول کیا ہے۔ پاکستان نہ صرف مسلم لیگ کا بلکہ کانگریس کا تقسیم پنجاب کے اضافے کے ساتھ تسلیم کردہ معاملہ ہے، جس پہ "حضورِ برطانیہ" کی مہر ثبت ہے۔ اس میں صرف مسلم لیگ کو ہدفِ ملامت بنانا آئینِ شرافت سے بعید ہے۔ اگر اچھا کیا تو کانگریس اور لیگ دونوں نے۔ اگر برا کیا تو دونوں نے۔ اب پاکستان بن چکا اور تقسیم پنجاب کو کانگریس نے پیش کر کے مسلمانوں سے پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کرائی اور کرا رہی ہے۔ ابھی نہ جانے مسلمانوں کو کب تک سود در سود ادا کرنا پڑے گا۔

میری آخری رائے اب بھی یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہیئیں اور اس کے لئے عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ مجلس احرار کو ہر نیک کام میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔ اور خلاف شرع کام سے اجتناب! اصلاحِ احوال کے لئے ایک دوسرے سے مل کر "الدین نصیحۃ" پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ یہ ارشاد ہے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا۔

۲۔ "مجلس کا قیام و بقا بہر حال ایک شرعی امر ہے"۔ تبلیغ اعتقادِ صحیحہ اور تنقید رسوماتِ قبیحہ، اعلائے کلمۃ الحق، اعلان و بیانِ ختمِ نبوت و اظہارِ فضائل صحابہ و اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین، مجلس کے فرائض میں سے ہیں۔ خصوصاً اس دورِ لادینی میں جنسِ انسانی کی تمام مشکلات کے لئے شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام کو ہی بطورِ حل پیش کرنا ہمارا وہ فریضہ ہے کہ ہمیں اگر دار و رسن تک بھی رسائی ہو جائے تو الحمد للہ! اس لئے مجلس کے قیام و بقا کی بہر حال کوشش رہنی چاہیئے۔

اگر دوستوں کو یہ باتیں معقول و مدلل نظر آئیں تو ان بنیادوں پر آئندہ زندگی کی عمارت استوار کریں۔ ورنہ جیسے ان کی مرضی، میں کسی کی راہ میں حائل نہیں، اب تھک گیا ہوں ورنہ مفصل بھی لکھ سکتا تھا۔ غریب الدیار سید عطاء اللہ بخاری۔

(حیاتِ امیرِ شریعت، جانباز مرزا ص ۳۱۲۔ ۳۱۳۔

یہی وہ خط ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد حضرت امیرِ شریعت کی وفات تک اور تاحال مجلس احرار اسلام کی پالیسی کی بنیاد ہے۔ جس جماعت کے قیام و بقا کو وہ خود ایک "شرعی امر" قرار دے رہے ہوں اسے کیسے ختم کر سکتے تھے؟

حضرت امیر شریعت کا ایک اور خط جو انہوں نے مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم (ساکن پنوں عاقل، سندھ) کے خط کے جواب میں ۲۵ جون ۱۹۵۱ء کو تحریر کیا، مجلس احرار کی موجودگی اور اس کی پالیسی کا آئینہ دار ہے۔

مولوی صاحب اپنے خط میں حضرت امیر شریعت سے استفسار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

✩ "جمیعت علماء اپنے خدوخال سے پاکستان میں گویا کالعدم ہو گئی ہے۔ (۱)" جبکہ احرار ہر جگہ ماشاء اللہ مشغول کار ہے"۔ ایک سوال جو ہر وقت دل میں چبھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لیگ سے زیادہ احرار کی نظر میں کوئی بری جماعت نہ تھی۔ اور اب اس جماعت کے متعلق باوجود اس کے کہ ان کے خیالات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں ہوئی، احرار نے اپنی پالیسی اتنی نرم کر دی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ افہام و تفہیم اور تشفی مقصود ہے نہ کہ اعتراض۔ اب جو کچھ احرار کی پالیسی ہے اس سے تفصیلاً متنبہ فرمائیں۔"

حضرت امیرِ شریعت نے اسی خط کی پشت پر درج ذیل مختصر جواب تحریر فرمایا۔ (۲)

۲۰ رمضان المبارک، شہر ملتان۔

مکرمی و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یاد فرمائی کا شکر گزار ہوں۔

✩ رسالہ (۳) تو ان شا اللہ میرے خط سے پہلے پہنچ چکا ہو گا۔ باقی آپ کی کھٹک تو صحیح ہے، فکر صحیح نہیں۔ تقسیم سے پہلے لیگ کے ساتھ ہمارے بہت سے اختلافات تھے۔ ہم نے قوم کے سامنے اپنا نظریہ پیش کیا، لیگ نے اپنا، قوم نے لیگ سے اتفاق کیا اور لیگ قوت حاکمہ بن گئی۔ مدمقابل پارٹی نہ رہی۔ ہم بہر حال رعایا بن گئے۔ ہم لوگ شروع سے ملکی معاملات کے ساتھ ساتھ کچھ دینی مقاصد بھی رکھتے تھے اور اب تک بفضلہ تعالیٰ رکھتے ہیں۔ موجودہ صورت میں ان دینی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی اور صورت اگر ہو سکتی ہے تو ارشاد فرمائیں؟ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اور اب کسی صورت میں اس کو بدلنا قومی ہلاکت و تباہی ہے۔ اصلاح احوال سے انکار نہیں وہ بھی ہم کر رہے ہیں۔ مگر مخالف بن کر نہیں۔ موجودہ وقت میں اس فتنۂ مرزائیت کے مقابل میں جو کامیابی

---

(۱) پاکستان میں جمیعت علماء اسلام ۱۹۵۶ء میں مولانا غلام غوث ہزاروی نے قائم کی۔ ۴۷ء سے ۵۶ء تک مجلس احرار ہی ان لوگوں کی امیدوں کا سہارا تھی۔ مولوی نذیر حسین صاحب کا یہ جملہ "احرار ہر جگہ ماشاء اللہ مشغولِ کار ہے" کور بصرانِ سقف و محراب و منبر کے لئے سرمہ نور بصیرت ہے۔

(۲) اس خط کا اصل عکس نقیب ختم نبوت کے امیر شریعت نمبر حصہ اول ۱۹۹۲ء کے صفحہ ۷۵، ۷۶ پر شائع ہو چکا ہے۔

(۳) سہ ماہی مستقبل ملتان۔ ۱۹۵۱ء مدیر جانشین امیر شریعت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری۔ زیر اہتمام نادۃ الادب الاسلامی ملتان۔

ہم کو حاصل ہو رہی ہے وہ باہمی تعاون کا ہی نتیجہ ہے۔ بصورتِ دیگر "منکر مئے بودن و ہمرنگ مستان زیستن" مشکل ہے۔ روزہ میں یہ مختصر سا جواب عرض خدمت ہے اسے آپ خود ذرا پھیلا کر دیکھیں اور ہماری مشکلات کا اندازہ لگائیں۔ لیگ کی مخالفت فی نفسہ کوئی کار خیر نہ تھا نہ ہے۔ کسی مقصدِ عالی کے لئے مخالفت و موافقت معنی رکھتی ہے۔ عہد فرنگی میں اختلاف بامعنی تھا۔ اب اتفاق سے ہی اصلاحِ احوال کی توقع ہو سکتی ہے۔ ورنہ سرخ پوش، انجمنِ وطن اور دوسری جماعتیں کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ فافہم و تدبر۔ والسلام مع الاکرام

دعا گو غریب الدیار

سید عطاء اللہ بخاری

اسی طرح نومبر ۱۹۵۰ء میں کل پاکستان تحفظِ ختم نبوت احرار کانفرنس ملتان کے اجلاس میں حضرت امیر شریعت نے اپنے خطبہ صدارت میں مجلس احرار اسلام کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

☆ "بعض لوگ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجلس احرار اسلام چونکہ الیکشن بازی سے الگ ہو گئی ہے لہذا اب اسے ملکی معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں رہی۔

گویا ان کا مطلب ہے کہ ہم لوگ مر چکے ہیں۔ یا ہم نے ملک چھوڑ دیا ہے! نہیں اور ہرگز ایسا نہیں۔ یہ ان کی ناتمام خواہش تو ہو سکتی ہے حقیقت نہیں۔

احرار کا وجود اور کردار تاریخ کی بہت بڑی صداقت ہے۔ سیاستِ افرنگ کے فریب خوردہ اسیر سن لیں!

ہم نے اپنے ملک اور اپنے حقوق سے قطعاً کنارا کشی نہیں کی۔ کوئی شریف انسان ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے حقوق شہریت زائل کر دے۔ پاکستان ہمارا ملک ہے اور ہمیں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہنا ہے۔ بات کرنا ہے، صحیح راستہ دکھانا ہے اور غلط روی پر ٹوکنا ہے۔ گرد و پیش کے مسائل و حالات سے ہم چشم پوشی کر سکتے ہیں نہ لاتعلق رہ سکتے ہیں۔ اس ملک کی تعمیر میں ہمارا خون پسینہ ہے۔ ہمیں تمام ملکی معاملات پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرنا ہے۔ سیاست اور معیشت و تجارت میں حصہ لینا ہے اور ملازمتوں میں اپنا حق بھی وصول کرنا ہے۔ ہمارے بچوں نے یہیں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ اور تعلیم کے بعد ملازمت بھی ان کا بنیادی حق ہے۔ ملکی معاملات میں ہمارا بھی اتنا ہی دخل ہو گا جتنا اور کسی کو دعویٰ ہو سکتا ہے۔ ہم اپنا حق شہریت پورا پورا استعمال کریں گے اور کسی قیمت اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

قافلۂ احرار گم نہیں ہے۔ ہم نے صرف جدوجہد کا رخ بدلا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ سول نافرمانی، ڈائریکٹ ایکشن یا الیکشن کے ذریعے ہی اپنے حقوق حاصل کئے جائیں۔ اور بہت سے

معقول ذرائع سے بھی یہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ مجلس احرارِ اسلام کو اب ملکی سیاست میں نئی حکمتِ عملی کے ساتھ ایک فعال کردار ادا کرنا ہے۔"

مندرجہ بالا دونوں خطوط اور خطبۂ صدارت کے اقتباس سے یہ بات الم نشرح ہو جاتی ہے کہ حضرت امیر شریعت نے مجلس احرارِ اسلام کا وجود ختم نہیں کیا تھا بلکہ مجلس احرارِ اسلام کو ایک نئی حکمت عملی سے آشنا کر کے میدانِ کارزار میں رواں دواں کر دیا تھا۔

روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے اسی زیر بحث مضمون میں ۱۹۴۹ء کے بعد مجلس احرار اسلام کا وجود اور تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں اسکا کردار کہیں نظر نہیں آتا جو کہ تاریخ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بعض واقعات جن کا تعلق براہ راست مجلسِ احرار سے ہے۔ نہ معلوم وہ تمام کے تمام مضمون مذکور میں مجلس تحفظِ ختم نبوت سے کیسے منسوب ہو گئے۔

مثلاً!

۴۹ء میں قادیانیت کے خلاف جلسوں کا انعقاد

۵۰ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قادیانی امیدواروں کے خلاف جلسے اور ان کی عبرتناک شکست۔

لاہور اور سیالکوٹ میں قادیانیوں کی کانفرنسوں کو ناکام بنانا

پشاور یونیورسٹی میں قادیانیوں کے جلسے کو مسلمانوں کے جلسے میں تبدیل کرنا۔

۱۷-۱۸- مئی ۵۲ء کو کراچی میں سر ظفر اللہ کے جلسے کو درہم برہم کرنا۔

۲ جون ۵۲ء کے اجلاس کراچی میں تشکیل پانے والے علماء کے بورڈ کی طرف سے آل مسلم پارٹیز کنونشن کی ذمہ داری قبول کرنے اور ۱۳ جولائی ۵۲ کو بورڈ کی طرف سے کنونشن کا فیصلہ کرنے کے بعد جماعتوں کو دعوت نامے جاری کرنا۔

۳۱ دسمبر ۵۲ء کی رات چنیوٹ کا جلسہ اور اسمیں حضرت امیر شریعت کی تقریر، مرزا محمود احمد کی دھمکی کہ ۵۲ احمدیوں کا سال ہے ۳۱ دسمبر کو چنیوٹ کے اسی جلسے میں حضرت امیر شریعت کا جواب دینا کہ ۵۳ء شروع ہو گیا ہے۔ اور یہ مجلس تحفظِ ختم نبوت کا سال ہے۔

۵۳ء میں مجلس تحفظِ ختم نبوت کے دفاتر سیل ہونا؟

☆ حالانکہ اس دور کے تمام اخبارات اور دفتری دستاویزات (جو راقم کے پاس موجود ہیں) اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ یہ تمام کارروائیاں مجلس احرار اسلام نے کیں۔ یہاں بھی حضرت امیر شریعت کی تقریر کے جملے میں تحریف کی گئی ہے۔ "آپ نے فرمایا تھا" ۵۳ء مجلس احرارِ اسلام کا سال ہے۔" احرار کارکن ہی تحریک تحفظ ختم نبوت کے روح رواں تھے۔ مجلسِ احرار ہی اس تحریک میں داعی جماعت تھی۔ اور دفاتر بھی احرار کے ہی سیل ہوئے تھے۔ احرار کی دعوت پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے

تھے۔ اور آل پارٹنر مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی تشکیل ہوئی تھی۔

۱۳ جولائی ۵۲ء کو برکت علی ہال لاہور میں آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد ہوا۔ اس کا دعوت نامہ مولانا غلام غوث ہزاروی نے جاری کیا۔ تب وہ مجلس احرار اسلام میں ہی شامل تھے۔ اس دعوت نامہ پر تمام مکاتب فکر کے علماء کے دستخطوں کے علاوہ مولانا محمد علی جالندھری کے بحثیت ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام پنجاب دستخط ثبت تھے۔

۱۴ جون ۵۵ء کو لائل پور میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے اجلاس سے حضرت امیر شریعت نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

☆ "۱۹۳۵ء میں مجلس احرار کا شعبہ تبلیغ قائم ہوا۔ جس کا تعلق ملک کے سیاسی معاملات سے نہیں تھا۔

(حیات امیر شریعت، جانباز مرزا، صفحہ ۴۰۰)

یعنی اس شعبہ کا روز اول سے سیاسی معاملات کے ساتھ تعلق نہیں تھا۔ سیاسی معاملات کے لئے مجلس احرار اسلام کے سٹیج پر ہی کام ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں بھی اسی پالیسی کی تجدید اور اعادہ کیا گیا جو ۳۵ء میں طے ہوئی تھی۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کے ایک اور بانی رہنما مولانا تاج محمود نے ۲۸، ۲۹، اکتوبر ۱۹۶۳ء کو احرار کانفرنس لائل پور میں جو تقریر کی اسے بعض اخبارات نے اس سرخی کے ساتھ شائع کیا۔

"مجلس احرار اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں"

چنانچہ مولانا تاج محمود نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ بیان جاری کیا۔

"میں اس خبر کی تردید کرتا ہوں۔
میری تقریر کا اصل فقرہ یوں ہے۔

"موجودہ سیاسیات، جس سے ملکی تخریب کا پہلو نکلتا ہو، مجلس احرار اسلام کا اس سیاست سے کوئی تعلق نہیں" (ماہنامہ تبصرہ، لاہور دسمبر ۱۹۶۳ء)

۱۸ اگست ۵۸ء کو حکومت نے مجلس احرار سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا تو ان دنوں مجلس کے دو مرکزی رہنما شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین (جو ۵۶ء میں سہروردی کی عوامی لیگ میں چلے گئے تھے) واپس احرار میں آچکے تھے۔

چنانچہ ۵ ستمبر ۵۸ء کو ملتان میں مجلس احرار اسلام کے نئے دفتر (واقع چمڑا مارکیٹ گھنٹہ گھر) کا افتتاح ہوا۔ جماعت کی بحالی پر ہزاروں احرار کارکنوں نے سرخ وردیوں میں ملبوس ہو کر مارچ پاسٹ کیا اور حضرت امیر شریعت کو سلامی دی، ماسٹر تاج الدین انصاری بھی اس موقع پر موجود تھے۔ امیر شریعت سرخ قمیض پہن کر آئے تھے اور بازو پر جماعت کا بیج آویزاں تھا اس پر لکھا تھا "مجلس احرار اسلام" یہ قمیص اور بیج یادگار کے طور پر آج بھی راقم کے پاس محفوظ ہے۔

حضرت امیر شریعت کے ایک خادم خاص مولانا محمد یٰسین (موجودہ نائب مہتمم جامعہ قاسم العلوم ملتان) نے اس جلسے کے حوالے سے راقم کو بتایا کہ

"جماعت کی بحالی پر افتتاحِ دفتر، جلسہ و جلوس کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ میں حسبِ معمول حضرت امیرِ شریعت کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا

"مولوی یٰسین آپ نے بھی جلسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں کارکنوں کا ہاتھ بٹایا ہے؟

"میں نے عرض کی نہیں"!

فرمایا!

"خوب کام کرو اور اپنے زیادہ سے زیادہ دوستوں کو سرخ قمیص پہنا کر جلسہ میں لاؤ۔ تاکہ دشمن پر دھاک بیٹھ جائے کہ احرار زندہ ہیں۔ ختم نہیں ہوئے۔"

چنانچہ میں اور میرے دوست سرخ قمیصوں میں ملبوس ہو کر اس تقریب میں شریک ہوئے۔"

(اس جلسہ کی تصویر میں مولانا محمد یٰسین حضرت امیر شریعت کے ساتھ کھڑے ہیں) حضرت امیر شریعت نے پرچم کشائی کی اور احرار کارکنوں سے زندگی کا آخری اور مختصر خطاب فرمایا۔

☆ "مسلمانو! پرچم ختم نبوت گرنے نہ پائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

احرار رضا کارو! اس تحریک کو زندہ رکھنا، عقیدہ ختم نبوت پر آنچ نہ آئے۔ اس کی حفاظت ہم سب مسلمانوں کی اساس ہے۔

☆ میری دعائیں مجلس احرار اسلام کے ساتھ ہیں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میرا عزم جواں ہے، میری رگوں میں اب بھی جوانی کا لہو دوڑ رہا ہے۔ احرار کے سرخپوش جوانو! تمہیں دیکھ کر آج میں بہت طاقتور ہو گیا ہوں۔ میں مطمئن ہوں کہ جب تک احرار زندہ ہیں مرزائی کامیاب نہیں ہو سکتے اور جب تک احرار باقی ہیں نئی نبوت نہیں چلنے دیں گے۔ مسلمانو! متحد ہو کر احرار کی اس دینی جنگ میں شریک ہو جاؤ اور اپنی ایمانی قوت سے انگریزی نبوت کا ٹاٹ لپیٹ دو۔"

ان دنوں پورے ملک میں احرار کارکنوں نے جشن منایا۔ جلوس نکالے، جلسے کئے، دفاتر پر چراغاں ہوئے، سرخ پرچم لہرا دیئے گئے اور جناب شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا عبید اللہ احرار اور دیگر رہنماؤں نے مختلف مقامات پر ان اجتماعات میں شرکت کی، روزنامہ آزاد لاہور نے احرار نمبر شائع کیا، اور ملک بھر میں دفاتر کے افتتاح اور جلسوں جلوسوں کی تصاویر شائع کیں۔ تمام رہنما تنظیم نو کے سلسلہ میں سوچ بچار میں مصروف ہو گئے۔

۲۵ ستمبر ۵۸ کو ملتان میں حضرت امیر شریعت کے مکان پر ہی احرار کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور جماعت کی تنظیم نو کا فیصلہ ہوا۔ جماعت کی بحالی پر حضرت امیر شریعت نے درج ذیل اخباری بیان جاری کیا۔

☆ "قدرت نے میرے مرنے سے پہلے میری سب سے بڑی آرزو پوری کر دی ہے اور اب میرے مرنے کے بعد میری روح کو اطمینان رہے گا کہ احرار اکٹھے ہو گئے ہیں اور ملک و قوم کی

خدمت کے لئے متحد ہیں (روزنامہ آزاد لاہور یکم ستمبر ۵۸)

درج بالا تاریخی حقائق و شواہد کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔...... مجلس احرار اسلام نے ۴۹ء میں انتخابی سیاست سے دستبرداری اور تبلیغی سرگرمیوں خصوصاً مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے احرار کے شعبۂ تبلیغ کو مضبوط اور فعال کرنے کا فیصلہ کیا مجلس احرار کو ختم کرنے کا اعلان نہیں ہوا۔

۲۔...... اپریل ۵۰ء میں مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس مرکزی دفتر لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں مولانا محمد علی جالندھری بحثیت ناظم اعلی مجلس احرارِ اسلام پنجاب شریک ہوئے۔ اجلاس میں جماعت کی تنظیم اور تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا۔

۳۔...... ۵۰ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی طرف سے چھے قادیانی امیدواروں کو ٹکٹ دینے پر مجلس احرارِ اسلام نے مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ اور ۴۹ء کی پالیسی پر غور و خوض کے بعد درج ذیل پریس بیان جاری کیا۔

☆ مجلس احرار اسلام براہِ راست سیاسیات میں دخیل نہیں اور نہ ہی وہ الیکشن میں حصہ لینا پسند کرتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ نے مرزائیوں کو ٹکٹ دیئے ہیں اب مجلس احرارِ اسلام ان کا مقابلہ کرنا اپنا دینی فرض سمجھتی ہے۔ (حیاتِ امیر شریعت، جانباز مرزا صفحہ ۳۲۴)

۴۔ ...... ۵۰ء کے انتخابات میں تمام قادیانی لیگی امیدواروں کو مجلس احرار اسلام کی مہم کے نتیجہ میں ہی عبرتناک شکست ہوئی۔ مجلس احرار نے اپنی کامیابی پر لاہور میں یوم تشکر منایا۔ حضرت امیر شریعت نے اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے احرار کارکنوں کو خراجِ تحسین پیش کیا اور محاسبۂ مرزائیت کی مہم کو تیز تر کرنے کی ہدایت فرمائی۔

۵۔ ...... جولائی ۵۰ء میں مجلس عاملہ کا دوسرا اجلاس ملتان میں حضرت امیر شریعت کی اقامت گاہ پر منعقد ہوا اور تین ارکان پر مشتمل دستور کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۱۔ مولانا غلام غوث ہزاروی

۲۔ ماسٹر تاج الدین انصاری

۳۔ سید ابومعاویہ ابوذر بخاری

۶۔ ...... ۲۵ نومبر ۵۱ء کو اوکاڑہ میں مجلس عاملہ کا تیسرا اجلاس ہوا جس میں مولانا محمد علی جالندھری نے اپنا مرتبہ دستور مجلس احرار اسلام منظور کرایا۔ جبکہ جماعت کو انتشار سے بچانے کے لئے سید ابومعاویہ ابوذر بخاری مدظلہ نے اپنا مرتبہ مسودۂ دستور مولانا کی مخالفت کی وجہ سے رضا کارانہ طور پر واپس لے لیا۔

۷۔ ...... ۵۲ء میں کراچی میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا اجلاس مجلس احرار نے بلایا اور آل پارٹیز مجلس عمل تحفظِ ختم نبوت کی تشکیل ہوئی۔ مولانا محمد علی جالندھری مجلس احرارِ اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے اس اجلاس

میں شریک ہوئے اور اسی حیثیت میں دستخط کئے۔

۸۔ .... مولانا محمد علی جالندھری مجلس تحفظِ ختم نبوت کے قیام ۱۹۵۴ء تک مجلس احرار اسلام سے ہی وابستہ رہے۔

۹۔ .... ۵۲ء میں تمام مکاتب فکر کے نمائندہ ۳۳ علماء کے اجلاس منعقدہ کراچی میں بھی مولانا محمد علی جالندھری نے مجلس احرار اسلام کی نمائندگی کی۔ اس اجلاس میں علماء نے متفقہ طور پر ۲۳ نکات (اسلامی مملکت کے بنیادی اصول) مرتب کئے۔ ۲۳واں نکتہ جو مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے متعلق تھا، جانشینِ امیرِ شریعت مولانا سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری کی کوششوں سے مجلسِ احرار کی تجویز کے طور پر منظور ہوا۔ انہوں نے مولا بخش سومرو کی کوٹھی پر سید سلیمان ندوی مرحوم سے ملاقات کرکے اس نکتہ کی منظوری کے لئے انہیں قائل کیا۔ حضرت بخاری کے بقول مولانا ندوی نے فرمایا کہ "۲۲ نکات میں اقلیتوں سے متعلق بات تو آگئی ہے" اس پر میں نے عرض کیا کہ حضرت تمام لوگ سلیمان ندوی نہیں کہ بات سمجھ لیں۔ ۲۳واں نکتہ قرارداد اقلیت کے طور پر علیحدہ درج کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مولانا مان گئے۔ اس موقع پر مولانا محمد علی جالندھری احرار کے نمائندہ کی حیثیت سے بطور مشیر حضرت بخاری کے ہمراہ تھے۔

۱۰۔ .... مارچ ۵۳ء میں تحریک تحفظِ ختم نبوت کے سبب مجلس احرار خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔

۱۱۔ .... جسٹس منیر کے تحقیقاتی کمیشن میں مجلس احرار نے بھی اپنا بیان دیا۔ حضرت امیر شریعت کا الگ بیان احرار کے مرکزی رہنماء کی حیثیت میں عدالت کے ریکارڈ پر آیا۔

۱۲۔ .... ۱۸ اگست ۵۸ء کو مجلس احرار سے پابندی اٹھالی گئی۔

۱۳۔ .... ۲۵ ستمبر ۵۸ء کو ملتان میں مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں سیاسیات میں دوبارہ شرکت کی قرارداد منظور ہوئی۔

۱۴۔ .... ۲۸ ستمبر ۵۸ء کو دار العلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ لاہور کے وسیع ہال میں احرار ورکرز کنونشن ہوا اور ۲۵ ستمبر کی قرارداد کی عمومی تائید بھی حاصل کرلی گئی۔ شیخ حسام الدین صاحب کو مجلس احرار کا کنوینر منتخب کیا گیا مگر ایک ماہ اکیس دن بعد ۸ اکتوبر ۵۸ء کو ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کردیا اور جماعت پھر خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔

۱۵۔ .... ۱۶ جولائی ۶۲ء کو ایوب خان نے سیاسی پابندیاں ختم کیں تو جماعت پھر بحال ہوگئی۔

۱۶۔ .... ۲۳ جولائی ۶۲ء کو ملتان میں مجلسِ عاملہ کا اجلاس شیخ حسام الدین کنوینر مجلس احرار کی صدارت میں مجلس تحفظِ ختم نبوت کے دفتر میں ہوا اور تنظیم نو کا اعلان کیا گیا۔

۱۷۔ .... ۳۰ اگست ۶۲ء کو لاہور مرکزی دفتر میں مجلس مشاورت کے ذریعے نئے دستور کی منظوری تک عارضی طور پر نظم جماعت چلانے کے لئے سات رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس میں سید ابو معاویہ ابوذر بخاری اور

مولانا تاج محمود بھی شامل تھے۔

۱۸- ...... ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۲ء تک جماعت دو مرتبہ خلاف قانون ہوئی۔ اس پابندی کی مجموعی مدت تقریباً دس سال بنتی ہے۔ ظاہر ہے ان دس برسوں میں احرار جیسی فعال جماعت کے رہنما اور کارکن خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء کے فیصلہ کے مطابق شعبہ تبلیغ تحفظ ختم نبوت کے نام سے کام کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں اسی شعبہ کو مارشل لائی مجبوریوں کی بناء پر مجلس تحفظِ ختم نبوت کا نام دے دیا گیا۔ اور اسی عنوان سے احرار کارکن جدوجہد میں مصروف رہے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت اپنے باقاعدہ قیام کے بعد بھی احرار کا شعبہ تبلیغ ہی تھی۔ صرف نظام اور دفاتر علیحدہ کئے گئے تھے۔

۱۹- ...... ۶۲ء میں مجلس احرار اسلام کی قیادت جانشینِ امیر شریعت حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ کو سونپی گئی تو پھر مجلس تحفظ ختم نبوت احرار سے مستقل طور پر علیحدہ ہو گئی۔

مندرجہ بالا تاریخی حقائق کی روشنی میں فاضل مضمون نگار کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ تاریخ مسخ نہ کریں اور ریکارڈ درست رکھیں۔ ورنہ حقائق منظرِ عام پر آنے سے گڑے مردے اکھڑیں گے۔ جس کی ذمہ داری بہر حال انہیں پر ہو گی۔

مجلس احرار اسلام نے اپنے شاندار ماضی کی روایات کو برقرار رکھا ہے۔ اور ۱۹۷۴ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت سے لیکر ۱۹۸۴ء کے امتناع قادیانیت آرڈیننس کے اجراء تک اسکا کردار کسی جماعت سے کسی بھی حیثیت میں کم نہیں۔ جان کی شہادت بھی دی ہے اور وقت و مال کا ایثار بھی کیا ہے۔

اور پھر یہ شرف بھی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے مجلس احرارِ اسلام ہی کو بخشا کہ ۱۹۷۴ء میں فرزندانِ امیر شریعت نے ربوہ میں مسجد کے لئے زمین خریدی اور فروری ۱۹۷۶ء کو حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ نے ربوہ میں مسلمانوں کی پہلی جامع مسجد، "مسجد احرار" کا سنگِ بنیاد رکھ کر حضرت امیر شریعت کی آرزو کو پورا کر دیا اور ان کی روح کو تسکین پہنچائی۔

عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ کسی ایک ادارے کا نہیں بلکہ سب مسلمانوں کا مشترکہ فریضہ ہے۔ اس جہاد میں سب مسلمانوں اور دینی جماعتوں نے جب توفیق حصہ لیا۔ مگر مجلس احرار اسلام کا کردار محض اللہ کے فضل و کرم سے قائدانہ رہا۔ اللہ تعالیٰ سب کی محنت قبول و منظور فرمائے اور امت کو اتحاد و اتفاق کی نعمت سے سرفراز کرے (آمین) میں اس مضمون کو حضرت امیر شریعت کی تقریر کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں جو ان تمام تاریخی تحریفات اور مغالطہ آرائیوں پر برہانِ قاطع ہے،

"خواہ ساری دنیاء مجھے چھوڑ جائے، میں مجلس احرارِ اسلام کا علم بلند رکھوں گا۔ حتیٰ کہ جب میں مر جاؤں تو میری قبر پر بھی یہ سرخ پھریرا لہراتا رہے گا۔

(خطبہ صدارت، حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ، جلسہ بیاد حضرت امیر شریعت، ۳۰ اگست ۱۹۶۲ء لاہور)

*

کجلا گیا ماحول کا مہتاب بہاراں

رشید کامل

ناگاہ یہ کس نے خبر مرگ سنائی
سینے میں دھواں بن گیا سرمایۂ افکار

بے ساختہ آنکھوں سے ٹپکنے لگے آنسو
اور روح ہوئی صدمۂ جانکاہ سے افگار

گریاں ہے تیری مرگ پہ اک عالمِ اسلام
اس رنج پہ دل تفتہ نہیں چند کہ دوچار

محسوس ہوا چھن گئی ہم سے بڑی دولت
اجڑا ہے کچھ اس رنگ سے تہذیب کا دربار

کجلا گیا ماحول کا مہتاب بہاراں
ویران ہوا علم و فضیلت کا چمن زار

ہاں لٹ گیا گہوارۂ تقریر و خطابت
ہاں بجھ گیا اک مہر درخشندہ و ضو بار

تقریر تھی تیری کہ حریفان وفا پر
میدان وغا میں کوئی چلتی ہوئی تلوار

ٹھہری نہ ترے سامنے باطل کی حقیقت
توڑا ہے تدبر نے بڑے کفر کا پندار

تقریر تھی تیری کہ محبان وطن کو
اک جوش تھا اک ولولۂ تازہ و بیدار

چھیڑا کبھی توحید کا نغمہ سر منبر
گرجا ہے کبھی حق کی حمایت میں سردار

برسائی کبھی آگ کبھی پھول بکھیرے
لب بستہ مگر آج ہے وہ نطق فسوں کار

اک عرصہ اٹھائے ہیں دل و جاں پہ مصائب
اک عمر فرنگی سے رہا برسر پیکار!

رقصاں تھی لہو میں ترے ایماں کی حرارت
تھے بادۂ عرفاں سے دل وجاں ترے سرشار

تو ایسے مقاموں سے بھی گزرا ہے جنوں میں
دیوار کہیں تھی نہ کوئی سایۂ دیوار

سینے میں منور تھی تیرے شمعِ محبت
کہتی تھی تری چشمِ مروت کرم آثار

آئینۂ کردار تھے پاکیزہ خیالات
پاکیزہ خیالات تھے آئینۂ کردار

سب تیرے یہ عادات و خصائل کا اثر تھا
احباب ثنا خواں ترے دشمن تھے پرستار

اس بات کی شاہد تیری خندہ جبینی
آساں تھی ترے عزم کو ہر منزل دشوار

پہلو میں دھڑکتا تھا ترے درد بھرا دل
تھا عاجز و مجبور کا تو ہمدم و غم خوار

انسان کو انسان سمجھنا ہے بڑی بات
یہ بات سمجھتے ہیں کہاں خوار و زبوں کار

دم لینے نہیں دیتی مگر گردش دوراں
صد حیف کہ ہے تیز بہت وقت کی رفتار

اٹھتی ہیں یہ بھیگی ہوئی آنکھیں کسی جانب
آتے ہیں نظر روتے ہوئے کوچہ و بازار

ہر گوشۂ کونین پہ سکتہ سا ہے طاری — افسردہ ترے غم میں ہیں بام و در و دیوار
تاریخ میں ایسا نہ خطیب اور اٹھے گا — فطرت نے تراشا تھا فقط ایک ہی شہکار
اس پختہ حقیقت سے مگر کس کو مفر ہے — محفوظ نہیں دامِ اجل سے کوئی جاندار
ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ ہو، ولی ہو کہ پیمبر — اس رہ سے گزرنا ہے ہر اک شخص کو اکبار
دل دکھتا ہے لیکن تری رحلت کی خبر پر — محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہے زندہ و بیدار
کچھ آہوں میں شامل ہے کچھ اشکوں میں ترا غم — ہوتا نہیں الفاظ میں جذبات کا اظہار
آباد رہے گوشۂ فردوس میں تاحشر — اور سایہ فگن تجھ پہ رہے رحمتِ غفار

یکتائے روزگار بخاری بھی چل بسے

آنکھیں ہیں اشکبار بخاری بھی چل بسے — دنیا ہے سوگوار بخاری بھی چل بسے
جادو اثر خطیب و شعلہ نوا خطیب — یکتائے روزگار بخاری بھی چل بسے
بیباک حق پسند محب وطن خطیب — ملت کے جاں نثار بخاری بھی چل بسے
آزاد زیب صحن گلستانِ ایشیا — رنگِ گل و بہار بخاری بھی چل بسے
ظاہر پرست آنکھ نے شبنم سمجھ لیا — گریاں تھے برگ و بار بخاری بھی چل بسے
اے بوستانِ فکر و عمل بزمِ شاعری — اُجڑی تری بہار بخاری بھی چل بسے
وحشت فزائے آہوئے افرنگ جس کی ذات — وہ شیرِ مرغزار بخاری بھی چل بسے
جورِ فرنگ گردش ایام کے اسیر — خنداں تھے زیر دار بخاری بھی چل بسے
صدر نظام مجلس احرار بالخصوص — قائد و شہسوار بخاری بھی چل بسے
جن کا ضمیر فیض نبوت سے مستنیر — الفت کے رازدار بخاری بھی چل بسے
گریاں فلک، ملائکہ نوحہ کناں زمیں — قدرت کے شاہکار بخاری بھی چل بسے
جرأت شکن تھے زاویے جس کی نگاہ کے — ہائے وہ شعلہ باز بخاری بھی چل بسے

سالک زبان شعر میں کیسے ادا کروں
مذہب کے غمگسار بخاری بھی چل بسے

سالک ربانی (میاں چنوں)

سید محمد کفیل بخاری

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد الیاس دھلوی

بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ کا شمار برصغیر کی نامور دینی ہستیوں میں ہوتا ہے۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت محض اخلاص اور للھیت پر مبنی تھی۔ حضرت مولانا اور شاہ جی کی بہت سی ملاقاتیں ہیں۔ ان ملاقاتوں اور مجلسوں میں علم و عرفان کے کیا کیا موتی بکھیرے گئے اور کتنے لوگوں نے ان سے استفادہ کر کے اپنے قلوب و اذھان کو منور کیا، کاش انہیں کوئی محفوظ کرتا اور ان لعل و جواہر سے آج ہم اپنا دامن بھر لیتے۔ حضرت شاہ جی رحمہ اللہ کی تمام زندگی تبلیغ دین کے لئے سفر اور کافر و مشرک نصرانی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد اور اس کی پاداش میں قید و بند میں گزر گئی۔ انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اپنی یاداشتیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں کی کیفیت نماز سے بہت زیادہ متاثر ہوا ان میں تین شخصیتیں سرفہرست ہیں، مولانا محمد الیاس دہلوی ، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہم !

ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایسے اکابر کو اللہ تعالی نے قلم و قرطاس کی دولت سے مالامال کیا ہے۔ اور ہر دو حضرات ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہوں نے ان اکابر کو دیکھا اور ان کی مجالس میں شریک ہو کر کسب فیض کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ کی سوانح میں شاہ جی اور مولانا محمد الیاس کے تعلق کے حوالے سے "دعوت کا انہماک" کے زیر عنوان مولانا محمد منظور نعمانی کی جو روایت نقل کی ہے ذیل میں۔ وہ ہدیہ قارئین کی جارہی ہے۔ (مدیر)

دعوت کا انہماک

یہاں چند واقعات مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" کی روایت اور حوالہ سے نقل کئے جاتے جن سے اس شدت علالت میں بھی اپنے کام میں مولانا کی یکسوئی اور کامل انہماک و استغراق کا اندازہ ہو گا(۱)

"اپریل کے آخری ہفتہ میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری زیارت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ اس سے دو دن پہلے حضرت پر نہایت سخت دورہ پڑ چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف بے حد ہو گیا تھا کہ دو چار منٹ بھی بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ شاہ جی کی خبر سن کر اس ناچیز کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا مجھے ان سے باتیں ضروری کرنی ہیں لیکن صورت یہ ہو گی کہ تم اپنے کان میرے منہ کے قریب کر دینا اور میں جو کہوں وہ ان سے کہتے جانا۔ چنانچہ جب شاہ جی اندر بلائے گئے تو بات شروع تو مجھ ہی سے فرمائی لیکن دو تین ہی

منٹ کے بعد اتنی قوت آ گئی کہ خود مخاطب ہو گئے اور تقریباً آدھ گھنٹہ مسلسل تقریر فرماتے رہے۔ آپ نے فرمایا:

"شاہ جی! میں نے شروع میں مدرسہ پڑھایا (یعنی مدرسہ میں درس دیا) تو طلبہ کا ہجوم ہوا اور اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کثرت سے آنے لگے، میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ میری محنت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ جو لوگ عالم مولوی بننے ہی کے لئے مدرسہ میں آتے ہیں، مجھ سے پڑھنے کے بعد بھی وہ عالم مولوی ہی بن جائیں گے، اور پھر ان کے مشاغل وہی ہوں ... گے جو آج کل عام طور پر اختیار کئے جاتے ہیں۔ کوئی طب پڑھ کر مطب کرے گا، کوئی یونیورسٹی کا امتحان دیکر اسکول کالج میں نوکری کرے گا، کوئی مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہی رہے گا اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو گا۔ یہ سوچ کر مدرسہ میں پڑھانے سے میرا دل ہٹ گیا۔

اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ میرے حضرت نے مجھ کو اجازت دیدی تھی تو میں نے طالبین کو ذکر کی تلقین شروع کی اور ادھر میری توجہ زیادہ ہوئی۔ اللہ کا کرنا، آنے والوں پر اتنی جلدی کیفیات اور احوال کا ورود شروع ہوا اور اتنی تیزی کے ساتھ حالات میں ترقی ہوئی کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کام میں لگے رہنے کا نتیجہ کیا نکلے گا، زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہ کچھ اصحاب احوال اور ذاکر شاغل لوگ پیدا ہو جائیں۔ پھر لوگوں میں انکی شہرت ہو جائے تو کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کے لئے آئے، کوئی اولاد کے لئے تعویذ کی درخواست کرے، کوئی تجارت اور کاروبار میں ترقی کی دعا کرائے۔ اور زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعہ بھی آگے کو چند طالبین میں ذکر و تلقین کا سلسلہ چلے یہ سوچ کر ادھر سے بھی میری توجہ ہٹ گئی اور میں نے یہ طے کیا کہ اللہ نے ظاہر و باطن کی جو قوتیں بخشی ہیں ان کا صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کو اسی کام میں لگایا جائے جس میں حضور ﷺ نے اپنی قوتیں صرف فرمائیں، اور وہ کام ہے اللہ کے بندوں کو اور خاص طور سے غافلوں بے طلبوں کو اللہ کی طرف لانا اور اللہ کی باتوں کو فروغ دینے کے لئے جان کو بے قیمت کرنے کا رواج دینا، بس ہماری تحریک یہی ہے اور یہی ہم سب سے کہتے ہیں۔ یہ کام اگر ہونے لگے تو اب سے ہزاروں گنے زیادہ مدرسے اور ہزاروں گنی ہی زیادہ خانقاہیں قائم ہو جائیں۔ بلکہ ہر مسلمان مجسم مدرسہ اور خانقاہ ہو جائے اور حضور ﷺ کی لائی ہوئی نعمت اس عمومی انداز سے بٹنے لگے جو اس کے شایان شان ہے۔ (۲)

---

(۱) (حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی اور ان کی دعوت، از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صفحات ۱۷۰، ۱۷۱، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷۔)

(۲) بحولہ، رسالہ الفرقان ماہ رجب و شعبان ۱۳۶۳ھ

سید کفیل بخاری

احرار تبلیغ کانفرنس کادیان اور روزنامہ زمیندار کی ریکارڈ فروخت
اور خواجہ عبدالرحیم عاجز کی نظم

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں قادیان میں سہ روزہ احرار تبلیغ کانفرنس منعقد ہوئی تو قادیانیت کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا۔ آنجہانی موسیو مرزا بشیر الدین اور مسٹر ظفر اللہ آنجہانی وائسرائے ہند کے دربار میں حاضر ہوئے اور کورنش بجالائے۔ ان دونوں نے منتیں سماجتیں کر کے کانفرنس پر پابندی لگوانے کی بھرپور کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ انگریز حکومت نے قادیان میں مجوزہ جلسہ گاہ میں دفعہ ۱۴۴ کے تحت اجتماع منعقد کرنے پر پابندی عائد کردی۔ احرار رہنماؤں نے حدود قادیان سے باہر جلسہ گاہ تجویز کرلی اور ایک مقامی سکھ کی اس پیشکش کو قبول کرلیا کہ اس کی زمین پر کانفرنس کا پنڈال بنائیں۔ چنانچہ اسی جگہ کانفرنس منعقد ہوئی اور ہندوستان بھر سے لاکھوں مسلمان جوق در جوق کانفرنس میں شریک ہوئے۔

کانفرنس میں جن اہم رہنماؤں نے شرکت فرمائی ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالوفا شاہجہان پوری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جناب چودھری نذیر احمد صاحب (ساکن ساہیوال) کی روایت کے مطابق وہ کانفرنس میں شریک تھے۔ اور حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر عروج پر تھی۔ قادیانیت اور انگریزی اقتدار کے بخئے ادھیڑ رہے تھے۔ شاہ جی تقریر کے لئے مائیک پر تشریف لائے تو عجیب سماں تھا۔ لاکھوں مسلمانوں کے اجتماع میں نعرہ ہائے تکبیر اللہ اکبر اور تاج و تختِ ختم نبوت زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کی گونج نے فضا میں ایک ارتعاش پیدا کردیا تھا۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ پڑھا تو فضا ساکت ہوگئی اور ہو کا عالم تھا۔ لاکھوں انسان گوش بر آواز تھے۔ شاہ جی کے دائیں اور بائیں ان کے قد کے برابر روزنامہ زمیندار، لاہور کے پرچوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے اعلان کیا کہ شرکاء کانفرنس ان تمام پرچوں کو فوراً خرید لیں۔ چنانچہ آنِ واحد میں یہ تمام پرچے تین تین روپے میں فروخت ہوگئے۔ زمیندار نے کانفرنس کے حوالے سے خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں فی پرچہ تین روپے میں شاہ جی کے حکم پر فوراً نکل گیا۔ یہ ایک ریکارڈ سیل تھی۔

شاہ جی کی معرکتہ الارا تقریر کے بعد کانفرنس کے منتظمین اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا گیا تو پنڈال کے کناروں پر کھڑے ہوئے سکھ سامعین نے شکوہ کیا کہ آپ لوگوں نے سب کا شکریہ ادا کیا لیکن ہمارا شکریہ اداء نہیں کیا جبکہ کانفرنس کے لئے زمین بھی ہم نے فراہم کی۔ اس پر احرار کے معروف پنجابی شاعر عبدالرحیم عاجز مائیک پر تشریف لائے اور سکھ سامعین، کا شکریہ اداء کرنے کے بعد فی البدیہہ چند اشعار بھی ان کی نذر کر دیئے۔

نظم یہ تھی۔

آ گئی فوج اکالی، آ گئی فوج اکالی
گرو جی ساڈی آ گئی فوج اکالی
ایہہ ہے ساڈے گرودا فرمان
کچھا، کڑا، کنگا، رکھو کرپان
تے کیسوں نا رہنا خالی جی
ساڈی آ گئی فوج اکالی جی

سکھ سامعین خوشی سے اچھل پڑے اور "ست سری اکال" کے نعرے لگاتے رہے۔ احرار تبلیغ کانفرنس کا اس شان و شوکت کے ساتھ انعقاد محض اللہ کا کرم تھا جو حضرت امیر شریعت اور دیگر احرار رہنماؤں کے اخلاص کے نتیجہ میں حاصل ہوا۔ اگر ایک کافر (قادیانی) تبلیغ اسلام کے راستے میں حائل ہوا۔ تو اللہ تعالی نے دوسرے کافر (سکھوں) کو مسلمانوں کا مدد گار بنا دیا۔

کون ٹوکے گا ترے بعد جہاں بانوں کو

جانباز مرزا

آج ہم واقفِ اسرار گنوا بیٹھے ہیں
آج ہم دولتِ احرار گنوا بیٹھے ہیں

آج وہ ختمِ نبوت کا نگہدار گیا
دل کے بازار سے الفت کا خریدار گیا

روشنی ماند ہوئی اپنا ستارہ ڈوبا
جس کنارے پہ تھے ہم وہ ہی کنارہ ڈوبا

کارواں روئے گا منزل کا نشاں ڈھونڈے گا
تجھ کو چاہے گا مگر تجھ کو کہاں ڈھونڈے گا

چاہنے والوں سے یوں روٹھ کے جانے والے
شاخِ امید سے یوں ٹوٹ کے جانے والے

زندگی تیری ترے بعد بھی باقی ہو گی
اپنی حرکت پہ قضا دیکھنا شاکی ہو گی

کون قرآن سنائے گا مسلمانوں کو!
کون ٹوکے گا ترے بعد جہاں بانوں کو

آنکھ روئے گی، جگر روئے گا دل روئے گا
اپنے جانباز پہ ہر آنکھ کا تل روئے گا

سید کفیل بخاری

انگریز پہلی مرتبہ پکڑا گیا

غالباً ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں حضرت شاہ جی بیمار تھے۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے کرانے کا مشورہ دیا۔ میں انہیں لے کر سول ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹروں کو شاہ جی کی آمد کا علم ہوا تو وہ پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع ہوگئے۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر نے شاہ جی کو ایکسرے روم چلنے کے لیے کہا اور وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان دنوں موسم سرد تھا اور شاہ جی نے سبز رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ جونہی آپ ایکسرے مشین کے سامنے آئے تو ڈاکٹر نے کوٹ اتارنے کے لئے کہا۔ شاہ جی نے کوٹ اتارا تو ڈاکٹر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک خوبصورت پتھر بھی ڈوری سے باندھ کر شاہ جی نے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔ دراصل یہ عقیق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جو دل کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ کسی ارادت مند نے انہیں ہدیہ کیا تھا کہ آپ اس "عقیق دل" کو ڈوری سے باندھ کر دل کے محاذ پر لٹکائیں۔ چنانچہ شاہ جی نے اسے بھی اتار دیا ایک ڈاکٹر نے کہا کہ شاہ جی اب اور تو کوئی پتھر آپ کے پاس نہیں؟ تو شاہ جی نے بے اختیار ارتجالاً کہا ہاں! ایک ننھا سا دل ہے۔ کہو تو وہ بھی نکال کر سامنے رکھ دوں۔ اس مختصر مگر برمحل اور برجستہ جملے نے ماحول کو زعفران زار بنا دیا۔ اور سب حاضرین کے چہرے کھکھلا اٹھے۔ ایکسرے تو اتار لیا مگر ڈاکٹروں کا جی یہ چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ جی سے باتیں کریں اور ان کی شگفتہ گفتگو سے حظ اٹھائیں۔ نہر سویز کا مسئلہ تب زبان زد عام تھا اور ہر مجلس میں موضوعِ سخن۔ ناصر مرحوم نے انگریز کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ چنانچہ یہی مسئلہ موضوعِ مجلس بن گیا۔ مختلف احباب اپنی اپنی سوچ اور بصیرت کے مطابق اس پر اظہارِ خیال اور تجزیہ کر رہے تھے۔ اور شاہ جی ہمہ تن گوش۔ اسی دوران ایک ڈاکٹر نے سلسلہ کلام توڑتے ہوئے کہا۔ شاہ جی واقعی انگریز نے سویز کے مسئلہ میں زیادتی کی ہے۔ شاہ جی نے برجستہ فرمایا۔ میاں زیادتی تو انگریز ہمیشہ سے کرتا چلا آیا ہے۔ آپ یوں کہیئے کہ پکڑا پہلی مرتبہ گیا ہے۔ اس ایک جملے میں انہوں نے انگریز کے خلاف اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کر دیا۔ اور اس کے مظالم اور زیادتیوں کے بارے میں شک وشبہ کے تمام، امکانات ختم کر ڈالے۔ اسی پر گفتگو ختم ہوگئی اور ہم شاہ جی کو لے کر گھر لوٹ آیا۔

عزیز الرحمن بجنوری

ہو جسکی فقیری میں بوئے اسد اللٰھی

سیرت نگاری کوئی معمولی موضوع نہیں ہے۔ بلکہ ایک عظیم موضوع ہے۔ جس کے ذیل میں بے شمار عنوانات ہوتے ہیں اور ان میں کمی و بیشی شخصیت کے اعتبار سے ہوتی رہتی ہے جو شخصیت جتنی اہم اور بزرگ ترین ہو گی اتنے ہی عنوانات کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً ایک معمار کی سوانح اور سیرت کے لئے جہاں اسکے ملک، قوم، شہر، سن ولادت، سلسلہ نسب، ماحول وغیرہ کا ذکر ضروری ہے وہاں اسکی بنائی ہوئی عمارتوں کا مشاہدہ اور اس میں معمار کی فنکاری کے نمونوں کا اظہار بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کام کو وہی لوگ اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں جن کو اس معمار کی معاصرت کا شرف حاصل ہو اور ساتھ رہ کر کام کیا ہو۔ یہی وجہ ہے حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنھم) نے جتنے عمدہ اور احسن طریقہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بیان فرمائی ہے دوسرا بیان نہیں کر سکتا۔

بد قسمتی سے جن ایام میں شاہ جی کا گزر ہمارے دیار سے ہوا کرتا تھا اور ہمارے علاقہ میں ان کی مسحور کن تقاریر ہوا کرتی تھیں ان ایام میں مجھے شخصیتوں کے دیکھنے اور سمجھنے کا ہوش ہی نہیں تھا چہ جائیکہ شاہ جی کی معاصرت اور ان کے ساتھ کام کرنے کا شرف؟

یہ میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں ان جیسا خطیب اور مقرر نہ پچھلے سو سالوں میں پیدا ہوا اور نہ آج کوئی نظر آتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ پورے ایشیا میں فی زمانہ وہ اپنا مثیل اور عدیل نہیں رکھتے تھے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ نہ آلہ مکبر الصوت کا انتظام ہوتا تھا لیکن عشاء کی نماز کے بعد صبح کی اذان تک شاہ جی کی آواز کے علاوہ سانس کی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ اسی سکوت کے عالم میں آہستہ اور خاموش ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز سنائی پڑ جاتی تھی۔ ایک بھیڑ ہوتی تھی جو ٹکٹکی جمائے مبہوت اور ساکت بیٹھی ہوتی تھی۔ گویا کہ انسان نہیں تصویریں ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دلی میں پہلی تقریر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی ہوئی۔ موصوف نے ایک بجے تک تقریر فرمائی۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر کے بعد تقریر کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا وہ جماعت دیوبند میں تقریر کے میدان میں منفرد ہیں اور پھر تقریر بھی عالمانہ حضرت نانوتوی کی تقریر کا پورا پورا چربہ ہوتا تھا۔ آج موصوف کی دو نشانیاں (فتح الملھم اور تفسیر قرآن بر ترجمہ قرآن از حضرت شیخ الہند) دو علمی شاہکار ہیں۔ کہ جن کی ضرورت مرور ایام کے باوجود ہنوز باقی ہے۔

ایک بجے کے قریب حضرت شاہ جی کھڑے ہوئے، تقریر کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ معذرت پیش کرنے کےلئے اور صبح کی اذان کر دی۔ اب اندازہ لگائیے کہ جاڑوں کی راتیں پورے چھے گھنٹہ میں معذرت ختم ہوئی۔ معذرت جب اتنی طویل ہوتی تھی تو تقریر کتنی دراز ہوتی ہو گی؟

شاہ جی کی زندگی اور موت دونوں شاہی تھیں بلکہ بادشاہوں کو نہ وہ زندگی حاصل اور نہ موت۔ شاہ جی کی زندگی اور موت اقبال مرحوم کے اس شعر کے مصداق تھی

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللہی

اور واقعی آپ کی زندگی میں عجیب استغنا تھا اور آپ اس حدیث کے مفہوم کے عین مطابق تھے۔

نعم الرجل الفقیه ان اجتح الیه نفع وان استغنی عنه اغنی نفسه (اوکماقال)

ترجمہ۔ بہترین آدمی فقیہ ہوتا ہے اگر اس کے پاس حاجت لے کر جائیں تو نفع پہنچائے اور اگر اس سے کنارہ کریں تو وہ بھی بے پرواہ رہے۔

حضرت شاہ جی میں یہی بات تھی۔ ایک مخلوق دوڑی پھرتی تھی مگر ہر ایک کو دینی، دنیوی، حسب ظرف فائدہ پہنچتا رہتا تھا۔ لیکن حضرت شاہ جی ہمیشہ مستغنی رہے۔۔ اور انکے وصال نے اس چیز کو یقین کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔

انتقال کی خبر ہوا کی طرح پورے عالم اسلام میں پھیل گئی تھی۔ اور پورے پاکستان سے آدمی جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ راویوں اور اخبارات کا کہنا ہے کہ جنازہ میں ایک لاکھ سے زائد آدمی شریک تھے۔ یہ خصوصیت پاکستان میں کسی کے جنازہ کو حاصل نہ ہوئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

جب حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری قائد احرار کا انتقال ہوا تو مجلس احرار کے رہنماؤں نے مرحوم کے سوگ اور یاد میں باغ بیرون موچی دروازہ میں جلسہ عام منعقد کیا۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم اس جلسہ میں شریک نہ ہوسکے کیونکہ وہ ان دنوں حکومت وقت کے ساتھ کسی سیاسی چپقلش کے نتیجہ میں پس دیوار زنداں تھے۔ جلسہ شروع ہوا، سٹیج پر مجلس احرار کے شعلہ بیاں مقرر باری باری نمودار ہوئے سب نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی دینی اور ملی خدمات پر ان کو خراج تحسین ادا کیا۔ بعض حضرات نے بعض تجاویز پیش کیں مثلاً مولانا صاحب کی یادگار کے طور پر ان کا مقبرہ تعمیر کیا جائے، ان کی یاد میں شفاخانہ قائم کیا جائے، ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں لٹریچر جمع کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ بالآخر سٹیج سیکرٹری نے استاد دامن کو دعوت دی وہ سٹیج پر تشریف لائے اور یک برمحل نظم پیش کی جس کا ایک شعر یہ تھا

بابو ترس مویا سکے ٹکڑیاں نوں
پتر پوڑیاں دان کرواندے نیں

(وحید فاطمی۔ روزنامہ مشرق لاہور ۵ دسمبر ۱۹۹۵ء)

کہاں ڈھونڈیں گے؟

ایسا غم خوار مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے کھو گیا واقفِ قرآن کہاں ڈھونڈیں گے

بے خطر آتشِ نمرود میں جو کود پڑے ایسا ملت کا نگہبان کہاں ڈھونڈیں گے

فیصلے دل کے نگاہوں سے کئے ہوں جس نے ایسا درویش مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

جس کی للکار سے لرزاں تھے سگانِ باطل ختمِ مرسل کا وہ دربان کہاں ڈھونڈیں گے

کل ہمیں سنتِ یوسف کی ضرورت ہو گی ہائے وہ واقفِ زندان کہاں ڈھونڈیں گے

جذبۂ موت بھی ہے دار و رسن بھی لیکن جان منصور کی پہچان کہاں ڈھونڈیں گے

سطوتِ شاہ سے مرعوب نہ ہونے والا کتنا بیباک تھا انسان کہاں ڈھونڈیں گے

پاسباں ملک کا اور شریعت کا امیر

ایسا جانباز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

جانباز مرزا

مولانا عبدالحنان (راولپنڈی)

ہمہ صفت موصوف

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ پر کوئی مضمون لکھے تو کیا لکھے۔ اور لکھے تو کس پہلو پر۔ جدھر نگاہ اٹھتی ہے حیرت دامن پکڑلیتی ہے۔ ہر وصف اور کمال جو شاہ جی میں مبدء فیاض نے ودیعت کیا تھا۔ نگینہ بنا ہوا تھا۔ شاہ جی اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے جو کچھ تھے۔ ایک حقیقت تھے ایک معنون تھے۔ محکی عنہ تھے جو کچھ بھی بیان و تحریر میں آنے کا مجاز ہو گا۔ عنوان ہو گا، حکایت ہو گی۔ شاہ جی ان امور میں حقیقت مجسم ہوں گے معنون ثابت و متحرک ہوں گے۔ واقعی محکی عنہ ہوں گے۔

قوم کو ہزاروں سال اپنے اس دیدہ ور کے کھونے پر رونا پڑے گا۔ مگر بخاری جیسی تمنا کب بر آئے گی۔ واحسرتا واسفا۔ سب سے پہلی مرتبہ شاہ جی کو انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسہ پر لاہور شیرانوالہ دروازہ میں دیکھا۔ یہ جلسہ حضرت مولانا احمد علی رحمتہ اللہ علیہ امیر انجمن خدام الدین کی دعوت پر بلایا گیا تھا۔ جس میں اس مقدس دور کے تمام اکابر علماء اور اصاغر فضلاء دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ اجتماع کیا تھا چلتے پھرتے، بیٹھتے اٹھتے انوار کا اجتماع تھا۔ اس میں شاہ جی نے ایک برجستہ، پر معنی اور درد انگیز لہجہ میں سابق پنجاب کی خانقاہی، علمی، سیاسی، روحانی کیفیت کا اظہار کیا اور معرکہ کی تقریر فرمائی۔

جید اور جلیل القدر علماء کرام کے سامنے پورے ملک کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ اور ان سے رہنمائی کی استدعا کی۔

تقریر کا یہ عالم تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے باران رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔ زمین گونا گوں اور بوقلموں پھولوں کے گلدستے پیش کر رہی ہے علمائے کرام و محققین قوم اس نڈر و بے باک مقرر کے طرز خطابت و اظہار واقعات سے بے حد متاثر تھے۔ میرے جیسے تو اس بیان جادو اثر پر محو حیرت تھے۔ شاہ جی کی تقریر کی روشنی میں حضرات اکابر نے مختلف عنوانات سے قوم کو زندگی بخش خطاب سے نوازا۔ اس جلسہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ اور دنیا کی آنکھیں کھل گئیں کہ علماء دیوبند اور یہ مضامین بلند۔ غرض کہ شاہ جی پورے مجمع پر چھائے ہوئے تھے۔ حضرت امیر شریعت نے جہاد پر ایک مبسوط و مفصل تقریر فرمائی۔ جس کے اختتام پر مولانا حبیب الرحمن لودھیانوی نے لوگوں سے اپیل کی کہ اگر شاہ جی کی تقریر سے یہ تاثر صحیح اور سچا ہے۔ تو موت علی الجہاد پر ان کے ہاتھ پر بیعت کرو۔ لوگ والہانہ جذبہ کے ساتھ آگے بڑھے تو شاہ جی نے فرمایا۔ میں اس وقت تک ہرگز کسی کو بیعت نہ کروں گا جب تک خاتم المحدثین بقیتہ السلف و الخلف حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری مجھے بیعت نہ فرمالیں اور اجازت نہ دیدیں۔ چنانچہ حضرت محدث اعظم رحمتہ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے اور شاہ جی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا۔ اگر میں خدا کی طرف سے مجاز ہوں تو ان کو یعنی شاہ جی

کو اجازت دیتا ہوں کہ تمہیں بیعت کریں۔ بس اس کے بعد علماء اور عوام نے شاہ جی کے دست مبارک پر بیعت کی اور اسی جلسہ میں آپ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے دست مبارک میں ہاتھ دیا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور پورے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ اس کے بعد کچھ اور ہی کیف تھا جب کبھی حضرت شاہ جی سے میری ملاقات ہوتی تو وہ حضرت مرشد انور شاہ ہی کا ذکر فرماتے رہتے اور آب دیدہ ہو جاتے۔ اب دونوں پروردگار عالم کو پیارے ہو گئے

اللهم ادخلهما في الجنة وارحمهما رحمة واسعة۔ امین۔

جانباز مرزا

سرزمین ملتان سے

اے شہنشاہوں کی بستی، اولیاؤں کے دیار — ذرّے ذرّے پر ہے تیرے رحمتِ پروردگار
ہر خزاں کے دور میں قائم رہی تیری بہار — تیرے دامن میں ہیں اب بھی نیک بندوں کے مزار
تو شہیدوں کی ہے مٹی، تو امانت دار ہے — تیری اک تاریخ ہے اور تیرا اک کردار ہے
آج پھر پہلو میں تیرے ہے عطاء اللہ شاہ — جو امیر وقت تھا، ڈرتے تھے جس سے کجکلاہ
ہاں کہ وہ باغی رہا، برطانوی سرکار کا — وہ محافظ تھا وقارِ احمدِ مختار کا
ہے یہی دار و رسن نے آزمایا تھا جسے — آئینِ افرنگ نے باغی بنایا تھا جسے
یہ خزانہ دفن کرتے ہیں تمہاری خاک میں — تاکہ یہ محفوظ رہ جائے زمینِ پاک میں
یہ امانت قوم کی، اور سینۂ احرار ہے — حشر تک ہے تجھ میں یہ، تو اس کی چوکیدار ہے
دیکھنا ضائع نہ ہو جائے وطن کا بانکپن — داغ تک آنے نہ پائے اور نہ ہو میلا کفن
قبر کی مٹی سے کہہ دو، لحد کو آواز دو — با ادب آئیں فرشتے، روک دیں حشرات کو

پاک رہنا چاہیئے محشر تلک تیرا ضمیر
سو رہا ہے تیرے دامن میں شریعت کا امیر

مولانا محمد عثمان فارقلیط

بے لوث مجاہد

جنگ آزادی کے دلیر اور نڈر سپاہی حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی ساحرانہ تقریروں نے ہندوستان کو جنگ آزادی کے لئے تیار کیا اور ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے تک انگریزوں کے خلاف ایسی آگ لگائی کہ بالاخر انہیں ملک چھوڑ کر یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ بلاشبہ ہندوستان میں اتنا بڑا جادو بیان خطیب اور نہ جھکنے والا جانباز آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اگر تاریخ انصاف کرے گی تو آپ کی سیاسی اور قومی زندگی کو فراموش نہ ہونے دے گی۔ انہوں نے جنگ آزادی میں جو کردار ادا کیا اسے تاریخ حریت میں بے مثال قرار دیا جائے گا۔ وہ بارہا آزادی کے جرم میں ماخوذ ہوئے۔ قید و بند کی مصیبتیں ایک تہائی عمر تک جھیلیں اور آل انڈیا لیڈر کی حیثیت سے ہمیشہ انگریزوں کے معتوب رہے۔ جمعیت علمائے ہند نے سول نافرمانی میں کانگریس کا ساتھ دینے کے لئے جو قرار داد جمعیت علمائے ہند کے اجلاس امروہہ میں ۱۹۲۹ء میں منظور کی اس کی تائید و حمایت آپ ہی نے کی۔ اور اپنی معرکتہ الاراء تقریر کے ذریعہ مخالف عناصر کا منہ ایسا پھیرا کہ وہ پھر اس طرف کارخ نہ کرسکے۔ جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اس وقت ہوا جب گاندھی نے نمک کی تحریک شروع کی تھی۔ اس اجلاس میں جماعتی طور پر جمعیت علمائے ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ اجتماعی طور پر کانگریس میں شریک ہو کر ملک کی تحریک آزادی کو جوش وقوت کے ساتھ کامیاب بنایا جائے۔ اس کی تحریک مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی جنرل سیکرٹری جمعیت علمائے ہند نے کی اور اس کی تائید میں حضرت شاہ جی نے جان کی بازی لگائی۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ اجلاس کے موقع پر ہندوستان کے تمام ٹوڈی حضرات جو تحریک آزادی کے سخت مخالف تھے امروہہ میں آکر جمع ہو گئے تھے اور ان کا عزم یہ تھا کہ اصل قرار داد کو ہرگز منظور نہ ہونے دیں گے۔ لیکن جب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی قادر الکلامی اور زور خطابت کے ذریعہ قرار دادوں کی حمایت کی اور تین گھنٹہ تک تحریک آزادی پر بولے تو اجتماع کا سارا رنگ بدل گیا۔ اور مخالفوں کو خائب و خاسر ہو کر واپس جانا پڑا۔

شاہ جی نے امروہہ میں آکر خطابت کے جوہر اس وقت دکھائے جب ہر صوبہ سے آپ کی گرفتاری کے نو دس وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ اجلاس کے ختم ہوتے ہی آپ غائب ہو گئے۔ راقم الحروف جس ٹرین سے واپس ہو رہا تھا جب وہ گجروالہ اسٹیشن پر آکر ٹھہری تو شاہ جی وہیں سے ہمارے ڈبہ میں سوار ہو گئے۔ آپ کے ساتھ نہ کوئی سامان تھا اور نہ کپڑوں کا کوئی جوڑا صرف تہبند اور قمیض میں ملبوس تھے۔ ایک رومال ہاتھ میں تھا جسے سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گئے۔ اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ آپ دہلی واپس آرہے تھے لیکن جب ٹرین غازی آباد کے اسٹیشن پر ٹھہری تو ایک چیکر نے آکر صرف آپ کا ٹکٹ چیک کیا اور چلا گیا۔ آپ نے فوراً کہا۔ من خوب می شناسم۔ یہ کہہ کر اسٹیشن پر ہی اتر گئے۔ راقم الحروف کو بڑی تشویش ہوئی

اور گاڑی چل پڑی۔ دہلی اسٹیشن پر بھی دیکھا مگر کہیں نظر نہ آئے۔ آخر تین روز کے بعد پتہ چلا کہ آپ نے بمبئی کے ایک زبردست اجتماع میں تقریر کی اور عوام کو جمعیت علماء کے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ شاہ جی کی گرفتاری کے لئے تقریباً ہر صوبہ سے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ دہلی میں جمعیتہ علماء ہند کے دفتر میں قیام رہتا مگر فوراً ہی پانچ منٹ میں دہلی سے باہر کسی غیر معروف اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتے اور ان کے جاتے ہی پولیس دفتر پر چھاپہ مارتی اور انہیں تلاش کرتی۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ ایک دفعہ شاہ جی کے روانہ ہوتے ہی پولیس کا گارڈ آیا اور اس نے سارے دفتر کو چھان مارا۔ اور چند سپاہیوں نے چھت پر چڑھ کر دیکھا کہ کہیں یہاں تو چھپ کر نہیں بیٹھ گئے غرض نو دس وارنٹوں کی موجودگی میں بھی آپ نے پورے ملک کا گشت کیا اور ہزاروں کے اجتماعات میں مسلسل پانچ پانچ گھنٹہ تک تقریریں کی۔ بہار کے کسی مقام پر آپ تقریر کر رہے تھے کہ پولیس کی جمعیت نے پورے اجلاس کا محاصرہ کر لیا۔ آپ نے رضا کاروں سے کہا کہ تقریر ختم ہوتے ہی گیس کے ہنڈے گل کر دیئے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور آپ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر دوسرے شہر میں تقریر کی اتفاق سے کسی ایسے ہی مجمع میں پولیس کو موقع مل گیا اور آپ گرفتار کر لئے گئے۔

بالآخر تقسیم سے پہلے شاہ جی اپنے وطن امرتسر سے لاہور آئے۔ اور چند ماہ بعد خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ میں سکونت اختیار کی اور وہاں سے ملتان منتقل ہو گئے۔ اور وہیں جاں آفریں کے سپرد کی۔ موت سے کسی کو مفر نہیں اور وہی ہو کر رہا جس کا اندیشہ تھا۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ جن مجاہد شخصیتوں نے آزادی کے لئے پورے ملک کو گرمایا آج ان کا کہیں تذکرہ نہیں وہ بے حقیقت لیڈر جو باہر کا روپیہ کھاتے رہے آج تاریخ آزادی کا سرعنوان بنے ہوئے ہیں اور کانگریس کی تاریخ جو کئی ضخیم جلدوں میں ہے ان کے ناموں سے پر ہے۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو کچھ کیا اپنا اسلامی اور وطنی فرض سمجھ کر کیا جس کا اجر بھی خدا ہی کی جانب سے مل سکتا ہے یہ ظاہر ہے کہ مرحوم نے جو جگہ چھوڑی ہے وہ خالی رہے گی اور اُن جیسا بے لوث مجاہد اور جنگِ آزادی کا سپاہی ہندوستان اور پاکستان میں مشکل ہی سے پیدا ہو سکے گا۔

جس کی گفتار میں تھا نغمۂ پیکار حیات

قمر لدھیانوی

آج اس دور میں دشوار ہے تم کو جینا!
موت جس دور میں ہے سر گریباں یارو
آج اس دور میں شکوے ہیں خدا سے تم کو
جس میں شدت سے ہے احساس بہاراں یارو
تم ستم ہائے زمانہ کا گلہ کرتے ہو
جب کہ مائل بکرم وقت کا ہر لمحہ ہے
تم کو اس عہد میں حاصل ہے فقط ماتم زیست
یعنی جس عہد کا ہر سانس حسیں نغمہ ہے
تم نے دیکھا نہیں شائد وہ زیاں کار سماں
قابل دار تھے جس وقت تمام اہل وفا
جب کہ تقدیس حرم راہ میں لٹ جاتی تھی
چند قزاق بنے بیٹھے تھے جب راہ نما
تم نے دیکھے نہیں شائد وہ ستم کے منظر
جب کہ ہر لفظ پہ تعزیر تھی پابندی تھی
روشِ عام تھی گلچیں کے قصیدے لکھنا
غنچہ و گل کو مسلنا ہی چمن بندی تھی
ثبت تھی وقت کے ہونٹوں پہ جب اک مہر سکوت
کون اٹھا تھا مگر شعلۂ احساس لئے
ہاں یہی پیکر ایثار و جنوں تھا جس نے
قوم کو فکر و عمل کے نئے اسلوب دیئے
دیکھ اے گردش ایام یہی شخص ہے وہ
جس کے الفاظ میں تھے کتنے ہی پرسوز الاؤ
جس کی گفتار میں تھا نغمۂ پیکار حیات
جس کی تقریر میں تھا شعلہ و شبنم کا رچاؤ

وہ جس کی قوتِ کردار نے دنیا بدل ڈالی

عبدالغفور ریاض (فورتھ سنڈیمن)

اجل کا تلخ پیمانہ لئے پھر عزرائیل آیا
کہا میرِ شریعت سے چلیں وقت رحیل آیا
ہوا مرد مجاہد باندھ کر رحلت سفر رخصت
ہوئی محروم میر کارواں سے قوم بدقسمت
دماغ و دل ہوئے مفلوج اس جانکاہ صدمے پر
بصیرت ہو گئی مجروح اس ناگاہ صدمے پر
وہ منزل جس پہ ہر اک طالبِ دیدار جا پہنچا
وہاں ختم نبوت کا علم بردار جاپہنچا
لئے اعمال کے گوہر بڑی سرکار جا پہنچا
حقیقت میں حضور پاک کے دربار جا پہنچا
وہ جس کی قوت کردار نے دنیا بدل ڈالی
اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوا اس باغ کا مالی
نہ ہو گا پھر کوئی تجھ سا یہاں بالغ نظر پیدا
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
شرافت اور نجابت میں وہ تھا اک گوہر یکتا
خطابت اور قیادت علم و عرفاں میں وہ تھا تنہا
مجال اف نہیں ہے رب اکبر کی مشیت پر
نہیں ضبط فغاں ممکن مگر اس حال ابتر پر
تری فرقت غم و اندوہ کے نشتر چبھوتی ہے
مثالِ نرگس بے نور تجھ کو آنکھ روتی ہے
الٰہی رحمۃ اللعالمیں کے نام کے صدقے
تو اس کو دامنِ رحمت کے سائے میں جگہ دے دے

مولانا عبید اللہ انور

وہ زندۂ جاوید رہے گا

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور مرحوم کی ایک یادگار تقریر۔ جو انہوں نے ۲۱ اگست ۱۹۶۳ء کو احرار پارک دہلی دروازہ لاہور میں شاہ جی کی یاد میں منعقدہ ایک جلسہ میں کی۔

بزرگانِ محترم! آج عہد حاضر کے اس مرد جلیل کی یاد میں ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس مرد پاکباز کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس کی درویشی و فقیری بوئے اسد الٰہی سے معطر تھی۔ خوئے سلمانیؓ و بوذریؓ جس پر ناز کرتی تھی، غیرت شبیریؓ جس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور خاتم الرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت جس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔

جہاں تک سیدی و مولائی حضرت امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی یاد کا تعلق ہے میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ جب تک عشق رسول کی روح موجود ہے۔ کتاب و سنت کی عزت و پر کٹ مرنے والے حیات ہیں، صحابہ کی عظمت کا نقش باقی ہے اور مسلمانوں کی رگوں میں اسلامی غیرت و حمیت کا خون دوڑ رہا ہے۔ بخاری کبھی نہیں مرسکتا، وہ زندہ رہے گا، زندۂ جاوید رہے گا۔

وہ اگرچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اس کی صورت اگرچہ آنکھوں کے سامنے نہیں لیکن اس کے زمزمے آج بھی کانوں میں گونج گونج کر محبت رسول ﷺ اور عشق خداوندی کے سرمدی کیف سے قلب و روح کو تڑپانے میں مصروف ہیں۔ یہ احرار پارک کی فضا اور دہلی دروازے کے در و دیوار آج بھی اس کی داستان عشق رسول کے ورق الٹ رہے ہیں، یہ کوتوالی کے سامنے شہیدان ختم نبوت کے خون میں نہائے ہوئے ذرات آج بھی بخاری کی یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ وہ منتظر ہیں کہ بخاری کے نام لیوا خدا کا نام لے کر اٹھیں اور محمد مصطفی کے عشق سرمدی کا پھریرا فضائے آسمانی میں لہرا دیں سامنے وطن بلڈنگ اور احاطہ عبد الرحیم کے در و دیوار چشم تصور کو ۱۹۲۷ء کے ہنگامہ خیز دور کی طرف متوجہ کر رہے ہیں اور ماضی کی یادیں بادلوں کی طرح اُمڈ اُمڈ کر دل و دماغ پر چھا رہی ہیں۔ لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے مہاشہ "راج پال" ناشر "رنگیلا رسول" کو قانون کے اصطلاحی سقم پر رہا کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں ہیجان برپا ہے۔ ناموس و رسالت کے پروانے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ مسٹر اوگلوی نے دفعہ ۱۴۴ لگا کر مسلمانوں کی غیرت کا امتحان چاہا ہے۔ مدینے والے کی ختم الرسلینی کا پاسبان اپنے نانا کی عزت پر کٹ مرنے کا تہیہ کرکے میدان عمل میں آچکا ہے۔ بخاری کا عشق شباب پر ہے اور وہ شہادت کے راستہ میں سر ہتھیلی پر رکھ کر باطل کو للکار رہا ہے۔ مولانا احمد سعید اور مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ اسٹیج پر موجود ہیں۔ احاطے کے دروازہ پر پولیس کے مسلح دستے پہرہ دے رہے ہیں لیکن جذبۂ شوق شہادت سے سرشار، دین خداوندی کی تلوار بھی

حرکت میں ہے۔ وہ دیکھیے اسلام کی زبان بول رہی ہے۔

"آج آپ لوگ جناب فخر رسل محمد عربی ﷺ کے عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ آج جنس انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے۔ اس جلیل القدر ہستی کا ناموس معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔ " آج مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کے دروازے پر اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ اور اُم المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ آئیں اور فرمایا ہم تمہاری مائیں ہیں کیا تمہیں معلوم نہیں؟ کہ کفار نے ہمیں گالیاں دیں۔ ارے دیکھو! اُم المومنین دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں؟ تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ آج گنبدِ خضرا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تڑپ رہے ہیں خدیجہ و عائشہ پریشان ہیں تمہارے دلوں میں اُمہات المومنین کے لئے کوئی جگہ ہے؟

اُمہات المومنین تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ عائشہ پکارتی ہیں وہی جنہیں میرے میاں (رسول اللہ ﷺ) پیار سے حمیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں نے رسول ﷺ کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ ان کے ناموس پر قربان ہو جاؤ۔ سچے بیٹے ماں پر قربان ہو جایا کرتے ہیں"

آخر اس مجمع سے علم الدین اٹھا اور جنس ناموس کی حفاظت سے قانون قاصر تھا اس کی حفاظت علم الدین کے خنجر نے راجپال کی جان لیکر کی۔ اگرچہ اسے اپنی جان کی بازی بھی ہارنا پڑی مگر یہ بات دنیا پہ واضح ہوئی کہ مسلمان حضور سرور کائنات ﷺ کے ناموس کی حفاظت قانون سے نہیں بلکہ خون سے بھی کرتا ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت کی راہ میں جب قادیانی فرقے نے رخنے پیدا کرنے شروع کیے اور ایک اور تحریک نے سر اٹھایا تو اس وقت حق پرستوں کی جو صفیں اس کے مقابلے میں سینہ سپر ہوئیں۔ شاہ جی قائد کی حیثیت سے اس میں پیش پیش تھے۔ اور آخر تک پیش پیش رہے۔ ہر قدم پر مشکلات آڑے آئیں، مصائب سے سامنا ہوا۔ آفات کی گھٹائیں اٹھیں۔ فرنگی اقتدار نے قدم قدم پر روڑے اٹکائے۔ قید و بند سے گزر کر دار و رسن تک بات جا پہنچی مگر عشق رسول کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ شیر نیستان ایک طرف انگریز سامراج پر بھرپور وار کرتا رہا تو دوسری طرف انگریز کی ذریت جو قادیانیت کے نام سے نشوونما پا رہی تھی اس کا تیا پانچہ کرنے میں مصروف رہا۔ چنانچہ شاہ جی نے فرمایا تھا

> "ختم نبوت کی حفاظت میرا جزو ایمان ہے جو شخص بھی اس ردا کو چوری کرے گا جی نہیں۔۔۔ چوری کا حوصلہ بھی کرے گا میں اس کے گریبان کی دھجیاں اڑا دوں گا اور جو اس مقدس امانت کی طرف انگلی اٹھائے گا میں اس کا ہاتھ قطع کر دوں گا۔ میں میاں (رسول اللہ ﷺ) کے سوا کسی کا نہیں۔ نہ اپنا نہ پرایا۔ میں انہیں کا ہوں۔ وہی میرے ہیں جس کے حسن و جمال کو خود رب کعبہ نے قسمیں کھا کھا کر آراستہ کیا ہو۔ میں ان کے حسن و جمال پر نہ مرمٹوں تو لعنت ہے مجھ پر اور لعنت ہے ان پر جو ان کا نام تو لیتے ہیں لیکن سارقوں کی خیرہ چشمی کا تماشا دیکھتے ہیں"

آپ فرمایا کرتے تھے "مجھے ایک چیز سے محبت ہے اور وہ ہے قرآن۔ مجھے ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز"۔

اللہ کی کتاب کی بلاغت کے صدقے جائیے۔ خود بولتی ہے میں محمد پر اتاری گئی ہوں۔ بابو لوگو! اس کی قسمیں نہ کھایا کرو۔ اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح ہی پڑھ لیا کرو۔ دیکھا اس نے قرآن میں ڈوب کر پڑھا تو مغرب کی دانش پر ہلہ بول دیا۔ پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تمہارے بت کدوں میں اللہ اکبر کی صدا ہے"

خود شاہ جی قرآن پڑھتے تو نہ صرف یہ کہ وہ خود لطف اندوز ہوتے بلکہ سننے والوں پر بھی سحر ہوجاتا۔ یوں محسوس ہونے لگتا کہ قرآن کا نزول ہورہا ہے اور جذب و کیف میں انسان ہی نہیں فضا بھی جھوم رہی ہے۔ اثر کا یہ عالم تھا کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم ہندو اور سکھ بھی شاہ جی کا قرآن سننے کے لئے آتے۔ اکثر ہندوؤں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ "شاہ جی تو رشیوں کی زبان بولتے ہیں"۔ سر سٹیفورڈ کرپس کی آمد پر مجلس احرار اسلام کا جو جلسہ اردو پارک دہلی میں ہوا تھا اور اس جلسے میں احرار رہنماؤں کے علاوہ دیگر قائدین ملت بھی شریک تھے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ الفاظ کہے تھے "اوقات کار سے فرصت کہاں تھی میں تو محض تھوڑا سا وقت نکال کر شاہ جی کا قرآن سننے آگیا ہوں"

انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ برملا فرماتے۔ میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں۔ "میرا ایک ہی نصب العین ہے۔ برطانوی سامراج کو کفنانا یا دفنانا"۔ بحمد للہ خدا نے شاہ جی کی یہ آرزو پوری کی اور وہ انگریزی سامراج کو اپنا بستارہ اٹھا کر جاتے ہوئے دیکھ کر گئے اور انہوں نے مرزائیت کو بھی دم توڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ ان مردانِ حق کے گروہ میں سے ایک ایسے فرد تھے جن کا مقام بارگاہِ خداوندی میں بہت بلند تھا اور زمرۂ اولیاء میں وہ مقام محبوبیت پر فائز تھے۔ اس صدی کے محدثِ اعظم حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے آپ کو امیر شریعت کا خطاب دیا اور خود آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ آپ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا گل شیر رحمۃ اللہ علیہ اسی پاداش میں شہید ہوئے۔ خود ہمارے حضرت شیخ التفسیر سیدی و مولائی حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ تو آپ پر جی جان سے فدا تھے۔ گھنٹوں آپ کا ذکر خیر کرتے اور یوں محسوس ہوتا کوئی عاشق صادق اپنے محبوب کی اداؤں کا ذکر چھیڑ کر کیف و سرور کی وسعتوں میں کھو گیا ہے آپ فرمایا کرتے تھے حکمت کے موتی بکھیرتے تو شہپر جبریل کے کان کترتے قرآن کے معانی بیان فرماتے تو مضامین کے انبار لگا دیتے۔ چنانچہ اسی سے متاثر ہو کر حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا "شاہ جی کی باتیں عطاء اللہی ہوتی ہیں"

محترم حضرات! بے شک، اسلام اقوامِ غیر کی تقلید میں کسی کا دن منانے کی کوئی تلقین اپنے ماننے والوں کو نہیں کرتا لیکن انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین کی یاد تازہ رکھنے کا ہمہ وقتی پروگرام اس کے پاس

ضرور موجود ہے اور جس کا اعلان نماز کی ہر رکعت میں

صراط الذین انعمت علیهم

کی روح پرور دعا سے ایک مسلمان ہر روز کرتا ہے۔ خداوند قدوس کا راہِ ہدایت کو انعام یافتہ لوگوں کی تابعداری کے ساتھ مخصوص کر دینا اس بات کا بین اور واضح ثبوت ہے کہ وہ انبیاء و صلحاء کے کارناموں کو زندہ و تابندہ رکھنے کا سبق امت مسلمہ کو دینا چاہتا ہے اور اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ مسلمان نہ صرف بزرگانِ ملت کے تذکرے اور حرارتِ قلب و روح کا سامان مہیا کریں بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم بالجزم بھی اپنے اندر پیدا کریں۔ اصل میں اسلاف کی یاد منانے کا واحد اور بہترین طریق اسلام کے نزدیک ان کی راہ پر چلنا اور ان کے طریق کو زندہ رکھنا ہے۔ اس اعتبار سے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ شاہ جی کے نظریات، افکار اور خیالات کی نشر و اشاعت کی جائے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے وہ مشعل راہ بنیں۔ اور نشان منزل کا کام دیں اور خود مرحوم کے لئے اجر و ثواب کا موجب ہوں

من سن سنتہ حسنتہ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا

یاد رکھیے جو قومیں بزرگوں کے طریق کو چھوڑ دیتی ہیں بندگان الٰہی کے راستے سے منہ موڑ لیتی ہیں، اسلام کے نقوش قدم سے بے نیاز ہو جاتی ہیں اور بزرگوں کے کارہائے نمایاں کو دل و دماغ سے محو کر دیتی ہیں۔ وہ کبھی دیر تک زندہ نہیں رہ سکتیں اور صفحۂ ہستی سے یوں مٹ جایا کرتی ہیں جیسے کہ ان کا نشان ہی نہ تھا۔

''آخر میں احرار دوستوں سے میری گزارش ہے کہ وہ جماعت کو زندہ رکھیں۔ آخر اس کا ایک ماضی ہے اس کی ایک تاریخ ہے اور اس کے کارنامے ہیں۔ جماعت کا مرنا ایک تاریخ کا مرنا ہے، ایک عہد کی موت اور بزرگوں کے کارناموں کو موت کے سپرد کرنے کے مترادف ہے۔ میں نے کہیں دیکھا ہے کہ شاہ جی نے فرمایا تھا۔

''خواہ ساری دنیا مجھے چھوڑ جائے میں مجلس احرار کا علم بلند رکھوں گا۔ حتیٰ کہ جب میں مر جاؤں تو میری قبر پر بھی یہ سرخ پھریرا لہراتا رہے گا''

اللہ تعالیٰ شاہ جی کے مقامات بلند تر فرمائے۔ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ اور شاہ جی کی نسبی اولاد بھائی عطاء المنعم بخاری، عطاالمحسن اور دیگر فرزندوں کو ان کا صحیح جانشین بنائے (ثم آمین)

در خطابت بے نظیر و در عبادت بے ریا

رفت چوں میر شریعت ازفنا سوئے بقا
سوبسو آمد ندا، واحسرتا، واحسرتا
شرفِ دیں احمد عطاء اللہ آں ابن ضیا
شد غروب آں شمس ارضی قبل از شمسِ سماء
روز دیگر شمس گردوں گشت روشن برسماء
لیک شمس ارض وائے کرد دنیارارہا
بوالعطایا شاہ شاہاں، سید احرار بود
درخطابت بے نظیر و درعبادت بے ریا
ہیچ حاصل نیست نادم، آہ وزاری ترک کن
یا مجیب غفرلہ، تاریخ گوو ہم دعا

۱۳۸۱ھ

عبدالرحمن نادم جالندھری

ہمہ عمرش عزیمت خویش پنداشت

عطاء اللہ آں شاہ بخاری
رسیدہ بر مقام کامگاری
ہمہ عمرش عزیمت خویش پنداشت
جہادِ حق بعہد استواری
بکوشش در بلندی کلمۂ دین
قدم بنہاد در صف پختہ کاری
بتوفیق خدا کرد استقامت
بسنت صابراں برحق گزاری
لباس منزلت جاوید پوشید
بفرحت دید دولت پائداری
بحالے رفت و زیں دنیا کہ گوئی
نہ خوف و غم برد، نے انتظاری
بسالش انتقالش گفت ہاتف
کہ حسنِ انجمن شاہ بخاری

۱۳۸۱ھ

فرنگی سال ازغورِ بسیار
بگفتم "بحر رحمت فیض باری"

۱۹۶۱ء

(محمد علی بنوی)

قاضی محمد زاہد الحسینی

حضرت امیر شریعت کا نعرۂ رستاخیز

حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی مدظلہ کا نام دینی و علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں آج کل اٹک شہر میں دارالارشاد کے نام سے دینی و علمی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان دنوں وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی شخصیت پر ایک ضخیم کتاب کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ ذیل کی تحریر اس کتاب کا حصہ ہے جو مولانا نے نقیب ختم نبوت میں اشاعت کے لئے ارسال کیا ہے۔ ہم مولانا کے شکریہ کے ساتھ اسے نذر قارئین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

جمیعتہ العلماء ہند کا آخری اجلاس لاہور میں ہونا قرار پایا، اس وقت پنجاب میں سر سکندر حیات کی وزارت تھی، احقر اس اجلاس سے چند روز پہلے دارالعلوم دیو بند حضرت مدنی کی کفش بوسی کےلئے حاضر ہوا تھا، نماز ظہر کے بعد خانقاہ مدنی کے بڑے کمرہ میں حضرت مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ باہر تانگہ آ کر رکا جس میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اتر کراندر تشریف لائے، آپ لاہور جمیعت کے اسی جلسہ کے انعقاد کے لئے تشریف لے گئے تھے اور پنجاب ایکسپریس سے واپس تشریف لائے تھے، اندر آتے ہی علیک سلیک کے بعد حضرت مدنی نے اجلاس کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے عرض کیا کہ سکندر حیات اجازت نہیں دیتا، حضرت نے فرمایا کہ ''آپ پھر چوڑیاں پہن کر کیوں نہیں آ گئے۔'' بس یہ جملہ سنتے ہی مولانا حفظ الرحمن سیو ہاروی واپس لاہور پہنچے اور مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے مشورہ کے بعد اجلاس منعقد کرنے کا اہتمام کیا، مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم ناظم استقبالیہ مقرر ہوئے، چنانچہ مؤرخہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو اکابر تشریف لائے اور مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ میں قیام فرمایا یہاں اگرچہ مولانا عبید اللہ سندھی بھی مقیم تھے مگر جمیعتہ کی کسی میٹنگ میں شریک نہیں ہوئے جمعہ کا خطبہ عربی اور نماز حضرت مدنی نے پڑھائی مگر تقریر نہیں فرمائی۔ نماز جمعہ کے بعد جلوس بڑی شان سے جلسہ گاہ پہنچا اور ابتدائی کارروائی کے بعد نماز عشاء تک جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ چنانچہ نماز عشاء کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو حکومت نے بجلی کاٹ دی، لیمپوں کا انتظام کیا گیا اور لاؤڈ سپیکر کے لئے بیٹری لگائی گئی، تلاوت کلام پاک کے بعد حضرت مدنی نے خطبۂ صدارت شروع فرمایا، پنڈال سارا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا سٹیج پر علماء کرام خصوصاً مولانا حفظ الرحمن اور مولانا نافع گل مرحومین سٹیج کی نگرانی فرما رہے تھے، جلسہ کی پہلی صف میں بعض شر پسند بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت نے خطبہ پڑھنا شروع فرمایا، آپ نے آزادیٔ ہندوستان کے بعد ملکی نظم و نسق کے بارہ میں تین خیالات پیش کئے اور ان پر تبصرہ فرمایا، جب آپ نے تقسیم کے منصوبہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ فرمایا کہ ایک گروہ کا یہ خیال ہے۔ تو اچانک پنڈال اور سٹیج سے مختلف نعرے شروع کر دیئے گئے جن کا مقصد اجلاس کو ناکام کرنا تھا، حضرت نے خطاب بند فرما دیا۔ اور اسی طرح کھڑے رہے، پنڈال پر ایک

شر پسند کھڑا ہوا تو مولانا نافع گل نے اس کے سر پر اس طرح ڈنڈا مارا کہ وہیں دم بخود ایسا بیٹھا کہ پھر حرکت نہ کر سکا۔ چونکہ پولیس اسی انتظار میں تھی کہ کوئی بہانہ بنا کر جلسہ کو درہم برہم کر دے اس لئے پنڈال میں پولیس کے کافی آدمی آ گئے اور صورتحال خطرناک نظر آنے لگی، وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ امیر شریعت، بطلِ حریت، مجاہد ملت، سیّد عالی نسب عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاؤڈ سپیکر کے سامنے آ کر چند نعرے لگوائے اور پولیس کو للکار کر فرمایا کہ میرا اپنا جلسہ ہے فوراً باہر نکل جاؤ ورنہ تمام ذمہ داری تم پر ہو گی۔ چنانچہ پولیس باہر نکل گئی۔ آپ نے احرار رضا کاروں کو فرمایا کہ اپنی اپنی کلہاڑیاں فضاء میں لہرا دو، چنانچہ سارے پنڈال میں کلہاڑیوں کی چمک نے جہاں فدایانِ اسلام کو نورِ نبوت سے مشرف فرمایا وہاں بزدل مفسدوں کے لئے بجلی کی کڑک بن گئی، آپ نے فرمایا اگر کوئی مفسد سر اٹھائے تو اسے فوراً کچل دو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ بس پھر کیا تھا ان کو سانپ نے ایسا سونگھا کہ دم بخود ہو گئے، پھر حضرت مدنی سے درخواست کی کہ اب آپ ارشاد فرمائیں، چنانچہ حضرت مدنی نے جہاں سے خطاب چھوڑا تھا وہیں سے شروع فرمایا اور اجلاس پوری کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس اجلاس کے برخواست ہونے سے قبل حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے سر سکندر حیات کی اس حرکت کی مذمت کی اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کیا۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے خطاب فرمایا، انکا یہ تاریخی جملہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

"انگریز کے خلاف جو بھٹی جلے گی میں اس میں لکڑیاں ڈالتا رہوں گا۔"

اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا اور اکابر واپس تشریف لے گئے۔ اس کے بعد آنیوالے پہلے جمعہ کو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی نور اللہ مرقدہ نے سر سکندر حیات کی اس حرکت پر اسے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا "سکندر حیات! میں نے ابھی اپنا ہتھیار استعمال نہیں کیا اگر استعمال کیا تو برداشت نہ کر سکو گے۔" اس ہتھیار کی نمائش کرتے ہوئے اپنی تسبیح کو فضاء میں لہرایا۔ اللہ تعالیٰ کی شان کہ اس اجلاس کے تقریباً چند روز بعد سر سکندر حیات خان کی بڑی دختر صاحبہ کی رخصتی ہوئی اور اسی رات ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء، سکندر حیات کا انتقال ہو گیا۔

اباجی کے آخری دنوں کی بات ہے روزانہ کے معمول کے مطابق سلیمی دواخانہ جانے کے لئے اٹھے۔ پان بنانے لگے۔ اکڑوں بیٹھ کر ہتھیلی پر پان رکھا۔ لوازمات اوپر ڈالے اور پھر پان کو ہتھیلی پہ مروڑنے لگے۔ چُورا کر کے منہ میں ڈالتے تھے کہ دانت باقی نہیں رہے۔ اچانک پتہ نہیں کیا خیال آیا۔ پان کا چُورا کرتے کرتے غالب کا شعر گنگنانے لگے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

شعر پڑھتے پڑھتے پان کا چُورا ہاتھ سے نیچے گرا دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے پان کھانا ترک کر دیا۔

(روایت: ابن امیر شریعت سید عطاء المومن بخاری مدظلہ)

مولانا عنایت اللہ (بورے والا)

مقدس قافلے کی امانت

ہندوستان میں اسلام اور اس کی دعوت کے یکے بعد دیگرے کئی موڑ آئے۔ اسلامی دعوت کا قافلہ چلتا رہا اور رکتا رہا۔ تا آنکہ قدرت کی فیاضیوں نے اس ظلمت کدہ ہند کو نور ہدایت پوری وسعت کے ساتھ عطا کرنے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کو منتخب کیا اور حضرت خواجہ کی پر تاثیر شہادت حق سے روشنی کا مینار تعمیر ہوا۔ حضرت خواجہ اور آپ کے خلفا سے ہندوستان میں جس زور سے تحریک اسلامی کو تقویت پہنچی وہ ازہر من الشمس ہے۔ رفتہ رفتہ اکبری الحاد اور ہندوستانی دیدانت نے گہرا وار کیا اور اکثر صوفیاء بھی مسلک حق کی اسلامی دعوت کی بجائے روایات میں کھو گئے۔ رحمت الہیٰ پھر جوش میں آئی اور ہندوستان کو امام ربانی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ ایسا باکمال صاحب دعوت عطا کیا۔ امام ربانی کے مسلسل جذبہ اسلامی سے ایک طرف اکبری فتنہ ختم ہوا اور دوسری طرف مدرسہ اور خانقاہ کی آویزش فروتر ہوئی۔ تا آنکہ آنے والے پر آشوب دور سے کچھ پہلے آفتاب ہدایت امام ولی اللہ دہلوی کی ذات گرامی نے علم جہاد اور تصوف کی صحیح تعین تعمیر کے لئے ایک عظیم گروہ تیار کیا۔ اور حضرت شاہ عبدالعزیز نے ان خطوط میں رنگ بھرا اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسمٰعیل شہید نے ان خطوط کو جو شاہ ولی اللہ نے متعین کئے اور شاہ عبدالعزیز نے ان میں رنگ بھرا بالاکوٹ کے مقام پر اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کر کے ہندوستان کی سرزمین کو خطوط کے ان رنگوں سے رنگین کیا اور فرنگی استبداد کے لئے ایک قافلہ نئے سرے سے آیا اور بڑھا۔ اسی مقدس قافلے کی ایک کڑی حضرت امیر شریعت تھے۔ بالاکوٹ کی قربانیوں کے بعد فرنگی حکومت ملک پر قابض ہو گئی۔ جہاد ۱۸۵۷ء کی کوشش بظاہر ناکام ہوئی۔ فرنگی تلوار نے اسلام اور مسلمان کا ہر جہت سے خاتمہ شروع کر دیا۔ علماء حق پھانسی دے دیئے گئے۔ جلاوطن کئے گئے اور کچھ ہجرت کر گئے۔ بات ذرا تلخ ہے کچھ عاقبت نااندیش اور گمراہ مولوی اور پیروں نے انگریز کے قصیدے لکھنے شروع کر دیئے کچھ باایمان تو تھے مگر صاحب استقامت نہ تھے۔ گوشہ نشیں ہو گئے۔ انگریز کی دور رس نگاہ نے منصوبہ بنایا کہ اسلام مٹایا جائے۔ اور مسلمانوں سے کتاب کریم قرآن کو لفظاً بھی چھین لیا جائے۔ مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کے جینا مشکل نہیں۔ بلکہ ناممکن ہو گیا۔ مایوسی اور بد دلی نے مسلمانوں کا مستقبل تاریک بنا دیا۔ ۵۷ء کی جنگ ناکامی کے دو بقیتہ السیف مجاہد امام برحق قطب الارشاد ظاہر و باطن کے جامع چشتیہ نسبت کے حامل نقشبندیہ نسبت کے کامل حجتہ الاسلام امام محمد قاسم اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے علم اسلام ہاتھ میں لیا اور تحریک اسلامی کی بنیاد رکھی۔ اور اسلام کی ایک ایسی شمع روشن کی جس سے عرب و عجم میں ہزارہا چراغ روشن ہوئے۔ اور دعوت اسلام کے ایک ایک گوشے میں دعوت و اصلاح کی۔ صدا اس زور سے بلند ہوئی کہ بانگ خلیل نے کفر کے ہر ایوان میں زلزلہ برپا کر دیا۔ قاسم و رشید رحمہم اللہ تعالیٰ کے عظیم جانشین شیخ الہند

(محمود حسن) نے دنیا کے اس حصے سے لے کر اس حصے تک دعوت حق کو پھیلا دیا۔ علم فقہ، حدیث، تفسیر، خصوصی طور پر دعوت دین کا سر چشمہ قرار دیئے گئے۔ اصلاح باطن کے لئے اشتغال روحانی جو نسبتِ چشتیہ کا ورثہ تھے صحیح اسلامی شکل میں پیش کئے گئے۔ علم شریعت اور تصوف و احسان کے علمبردار قافلے نے جہاد حریت کی روح پھونکی۔ یہ مقدس گروہ آگے بڑھا فرنگی کا نام لینا ہی جب کپکپی پیدا کر دیتا تھا۔ اس مقدس قافلے نے فرنگی کو للکارا اور نور بصیرت سے جان گئے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو مرکز اسلام عرب فرنگی جور و استبداد سے آزاد نہیں ہو سکے گا۔ فرنگی نے ہندوستان خالی کیا۔ آج عرب ممالک کا حال دیکھ لیجئے کیا سے کیا ہو چکا ہے۔

آج بھی یہ، قافلہ تحریک دعوت اسلامی کے لئے سر بکف ہے۔

حضرت امیر شریعت اسی مقدس قافلے کی ایک امانت تھے۔ آپ کیا تھے، کیا کیا۔ آپ کی اسلامی خدمات وطنی حریت کس شکل میں ظاہر ہوئیں۔ اپنے اپنے دلوں سے پوچھیئے۔ اگر اب تک ہم امیر شریعت کو سمجھنے سے قاصر رہے یا جہل و نادانی نے راہ روکے رکھی تو رونے دھونے سے نہ کبھی کچھ ہوا اور نہ آئندہ کچھ ہو گا

اٹھو اور حضرت امیر شریعت کی پھیلائی ہوئی روشنی سے نشان منزل معلوم کرو۔ اور منزل کو پالو۔ ورنہ یاد رکھو قیامت قریب ہے اور اللہ حسیب ہے

امرتسر میں۔۔۔۔۔ شیخ عبدالواحد، چینی کے برتنوں کی دکان کرتے تھے۔ شاہ جی کے دوست تھے۔ ان دنوں شاہ جی کی رہائش ایک چوبارے پر تھی جہاں مہمانوں کے بٹھانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔ لہذا شیخ عبدالواحد جب کبھی شاہ جی سے ملنے آتے تو، نیچے کھڑے ہو کر بات چیت ہوتی یا قریب کی ایک دکان پر بیٹھ کر۔ ایک دن شیخ صاحب ملنے آئے تو شاہ جی نے اوپر سے کھڑکی میں سے جھانکا۔ چونکہ کسی کام میں مصروف تھے اس لئے نیچے نہ اترے اور وہیں سے بات چیت کر لی۔ شیخ صاحب اس وقت تو واپس چلے گئے۔ مگر انہیں یہ بات محسوس بہت ہوئی۔ حتیٰ کہ کچھ ہی دنوں میں دکان چھوڑ کر پشاور چلے گئے۔ اور پھر وہاں سے ایک خط لکھا خط میں صرف ایک شعر لکھا کہ

اس شوخ نے نگاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے
ہم نے بھی کوئی آہ نہ کی، ہم بھی چپ رہے۔

(روایت حرم امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہا!)

مولانا عبد الغفار حسن

شاہ جی کی صدارت میں مولانا آزاد کی ایک یادگار تقریر

شیخ محمد صدیق سیالکوٹی تقسیم ہند کے وقت تک کلکتہ میں عینکوں کے بڑے تاجر تھے۔ مولانا آزاد سے بہت زیادہ ذہنی لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جمعیت تبلیغ اہلحدیث کلکتہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ چنیوٹ کے سوداگران کلکتے میں بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو اس جلسہ میں ضرور بلایا جائے جلسہ کے صدر مولانا ابراہیم سیالکوٹی تھے۔ اس زمانہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ جلسے کے منتظمین میں سے جن کا میلان مسلم لیگ کی طرف تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد تقریر نہ کر سکیں لیکن جو لوگ مولانا آزاد کے عقیدت مند تھے ان کا اصرار تھا کہ مولانا کی تقریر لازماً ہو۔ چنانچہ ان کے نام کا اعلان ہو گیا کہ ہفتے کی شام کو چار بجے مولانا آزاد تبلیغ کے موضوع پر تقریر فرمائیں گے۔" مولانا آزاد بروقت جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ حاضری بے پناہ تھی کیونکہ ایک طویل عرصے کے بعد مولانا آزاد کی تقریر سننے کا موقع مل رہا تھا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ صدر جلسہ کو چائے پلانے کے بہانے راستے میں روک لیا گیا۔ اس طرح جلسہ بروقت شروع نہ ہو سکا۔ اس انتظار میں آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اس دوران کسی نے مولانا آزاد سے دریافت کیا کہ مولانا آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کچھ طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں میرے بھائی کوئی نہ کوئی تکلیف تو انسان کو رہتی ہے۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ آپ آج تقریر کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں۔ اس سوال کے جواب کے فوراً بعد اعلان کر دیا گیا کہ مولانا آج تقریر کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں اس لئے دوسرے مولانا صاحب تقریر فرمائیں گے۔ اس طرح وہ لوگ کامیاب ہو گئے۔ جو محض سیاسی اختلاف کی بنیاد پر، مولانا آزاد کی خالص دینی تقریر بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن اس اعلان کے فوراً بعد مولانا کے عقیدت مندوں میں سے ایک نے اعلان کیا کہ مولانا کی تقریر کل اتوار کے روز دو بجے ہو گی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اتوار کے دن عام تعطیل تھی۔ پہلے دن سے زیادہ مجمع ہو گیا۔ اور ہجوم بڑھتا ہی گیا۔ مولانا اپنی عادت کے مطابق بروقت پہنچ گئے۔ آج بھی مخالفین نے وہ کھیل کھیلنا شروع کیا اور صدر جلسہ کو کسی بہانے راستہ میں روک لیا۔ جب دس منٹ کی تاخیر ہو گئی تو مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جوش میں آ گئے اور انہوں نے اسٹیج پر آ کر حاضرین سے کہا کہ حضرات کل والا ڈرامہ آج پھر کھیلا جا رہا ہے۔ صدر جلسہ کو آج بھی روک لیا گیا ہے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لے آئے ہیں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ میں صدارت کے لئے کوئی دوسرا نام پیش کروں؟ چاروں طرف سے زور زور سے آوازیں آئیں ضرور ضرور۔ اس کے بعد شاہ جی نے فرمایا کہ صدارت کے لئے میں اپنا نام پیش کرتا ہوں۔ منظور ہے؟ لوگوں نے کہا۔ منظور ہے، منظور ہے۔" شاہ جی کرسی صدارت پر بیٹھ گئے اور کہا مولانا آزاد سے

گزارش ہے کہ تشریف لائیں اور تقریر فرمائیں۔

سامعین کا بیان ہے کہ مولانا کی تقریر دو گھنٹے جاری رہی۔ پورے مجمع پر سناٹا تھا اور علم کا سمندر بہ رہا تھا۔ مولانا آزاد نے تبلیغ کا مفہوم بیان کیا۔ اس کے مقاصد کی وضاحت کی اور پھر بتلایا کہ مختلف مذاہب میں تبلیغ کی نوعیت کیا ہے، اور پھر تقریر کے آخری حصہ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی تبلیغ کے آداب و خصائص بیان فرمائے۔ تقریر کیا تھی، معلومات کا ایک سمندر تھا جو دو گھنٹے کے اندر سیلاب کی صورت میں بہ گیا۔ پروگرام کے مطابق مولانا آزاد کے بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن مولانا بخاری مرحوم نے فرمایا سمندر کے بہ جانے کے بعد ندی نالے کی ضرورت نہیں۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کے بعد میری تقریر مناسب نہ ہوگی۔ یعنی یہ علمی لحاظ سے مولانا کی توہین ہوگی۔

(ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور ۵ رجب ۱۴۱۵ھ، ۹ دسمبر ۱۹۹۴ء)

جذباتِ غم

غلام قادر خاتم (کالا باغ)

یہ کیسی شام آئی ہے کہ رنگ بھی بدل گیا
جو آفتاب آندھیوں سے لڑ رہا تھا ڈھل گیا
جہاں میں تیرگی ہوئی، عدم میں روشنی ہوئی
ادھر چراغ گل ہوا، ادھر چراغ جل گیا
تڑپ تڑپ کے رہ گیا ہے گفتگو کا بانکپن؟
کہ ظلمتوں کا اژدہا متاع جاں نگل گیا
چلے ہیں ہم بھی باغباں چمن کو تو سنبھال لے
چمن میں اب رکھا ہے کیا جو رشک گل نکل گیا
لطف و کرم کی بارشیں مرقد پہ اس کے ہوں کہ جو
دنیا میں باعمل رہا، دنیا سے باعمل گیا
ملت کو جس امیر پر لاریب فخر و ناز تھا
دست اجل کا آج اس پہ آہ! وار چل گیا
آہ و فغاں کا شور ہے خاتم جہاں میں چار سو
فانی جہاں سے آج اک خطیب بے بدل گیا

مولانا سید احمد شاہ بخاری

امیر شریعت کی زندگی کے عملی پہلو

آج بتاریخ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء پورا ایک مہینہ گزر چکا ہے اور اپنا خیال تو یہی ہے کہ صدیاں گزر جانے پر بھی جاننے والے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی جدائی کا صدمہ محسوس کرتے رہیں گے۔ غیر منقسم یا متحدہ ہند کی تاریخ میں آپ جیسے عظیم الشان اور کثیر البیان انسان کا نشان نہیں ملتا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ تاریخ عالم آپ جیسی ہستی پیش کرنے سے قاصر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ جس نظریہ کو سامعین کے ذہن نشین کرانے کا ارادہ فرماتے اس کے دلائل سامعین ہی کے ذہنوں سے فراہم کر کے ان کے سامنے رکھ دیتے۔ اس لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے بیان کے اختتام پر ذہنوں میں انقلاب برپا ہو جاتا۔ اور جو لوگ قبل از تقریر پیکر عداوت اور مجسم نفرت دکھائی دیتے وہی بعد از اختتام جلسہ محبت کا دم بھرتے نظر آتے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ مخالفت کے علمبردار حمایت اور اطاعت اور محبت کے زندگی بھر کے لئے مبلغ بن گئے۔ شاہ جی محبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ جہاں پہنچنا ہر کسی کا کام نہیں

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کی مجلس میں تذکرۂ ختم نبوت چھڑتے ہی رنگ محفل ہی تبدیل ہو جاتا تھا۔ اسی حب رسول کے جذبہ کی بدولت آپ کو جدید و قدیم مدعیان نبوت و رسالت سے سخت عداوت تھی۔ حقیقت سے ناآشنا لوگ اس چیز کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری قرار دیتے ہیں مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ تعصب نہیں بلکہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت کی انتہا ہے جو امیر شریعت کے دل و دماغ پر جلوہ گر ہوئی اگر آواز کی بلندی کو دیکھا جائے تو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے زمانے کے ہاشمی یاد آجاتے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم سیدنا عباس بن عبدالمطلب کی آواز سے متعلق علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ تقریباً آٹھ میل تک پہنچتی تھی۔ (جمل حاشیہ تفسیر جلالین جلد دوم صفحہ ۲۷۳ آیت۔ ثم ولیتم مدبرین)

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بھی دو دو لاکھ کے کثیر مجمع سے خطاب فرمایا ہے جس زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت بھی حاضرین میں سے کسی نے تقریر کے عدم سماع کی شکایت نہیں کی۔ مسلسل بیان میں تو آپ کی گرد راہ کو بھی کوئی نہیں پہنچا آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے بولتے اور آواز میں کچھ فتور نہ آتا۔ اور ساتھ ہی حاضرین میں سے کسی کا اٹھ کر نہ جانا بلکہ عموماً سامعین کو وقت کی رفتار کا پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ یہ کرامت پر کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ دوران تقریر طبیعت کا رخ شعر و ادب کی طرف مڑتا تو جوش و جذبہ سے لبریز اشعار کی آمد شروع ہو جاتی۔ خصوصاً وہ اشعار جو آپ کی طبیعت کے فکر کا نتیجہ ہوتے۔

حاضرین کے قلوب و اذہان پر بے حد اثر چھوڑتے تھے۔

قرآن فہمی کی دولت سے بھی کامل حصہ پایا تھا۔ اگر آپ اہل قلم ہوتے اور قرآن کی تفسیر یا ترجمہ لکھ جاتے تو طویل عرصہ تک آپ ہی کی اس تالیف سے مسلم اور غیر مسلم فائدہ اٹھاتے۔ آپ کی تقریروں میں بعض آیات کے ترجمے جو آپ کی زبان سے صادر ہوئے ہیں وہ لوگوں کے ذہنوں سے اترنے والے نہیں ہیں۔

راقم الحروف بھی آپ کی اس تقریر میں موجود تھا۔ جس میں سورہ صافات پارہ نمبر ۲۳ کی آیت

فما ظنكم برب العلمين

کا ترجمہ یوں فرمایا۔

پس تم نے تمام مخلوقات کے مالک کے لئے کیا رکھا ہے؟ حضرت امیر شریعت نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو راہ راست پر لانے کے واسطے سعی فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے عبادت اور بندگی جب غیر اللہ کے لئے روا رکھی تو اللہ تعالیٰ کے لئے باقی کیا رہ گیا؟ عبادت ہی تو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص تھی جب وہ ہی

من دون الله

کے واسطے ثابت ہونے لگی تو بتلاؤ اب رب العالمین کے سامنے پیش کرنے کے لئے کون سا تحفہ باقی ہے؟ جو پیش کر کے اس کی خوشنودی کا تمغہ حاصل کیا جائے۔ اگر کوئی صاحب ایسے ہوں جنہوں نے آپ کی تمام تقریریں نوٹ کی ہوں تو وہ اس قسم کی آیات اور احادیث کے ترجمے کافی تعداد میں اہل اسلام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اخلاق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا زندگی بھر دنیا کی کوئی چیز نہیں بنائی یہاں تک کہ رہنے کے لئے ایک جھونپڑی تیار کرانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ چاہتے تو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے کافی مقدار میں جائیداد بنا سکتے تھے۔ مگر ملتان کے ایک کچے اور معمولی مکان میں زندگی گزار گئے جو کہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہ ہیں انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی عملی زندگی نے مسئلہ باغ فدک کے تنازعہ کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ جب پوتے کا یہ حال ہے تو دادا اور دادی کا حال کیا ہو گا؟ علم کلام کی کتابوں کے دفتر موجود ہیں جنکا مطالعہ کر کر کے ایک دنیا تھک گئی ہے صرف ایک مسئلہ فدک ہے جو حل ہونے کا نام نہیں لیتا۔ شبہات در شبہات اور شکوک در شکوک کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اگر آپ ان شبہات کے انبار سے گلو خلاصی چاہتے ہیں تو آیئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیرت اور عملی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

نور احمد خان فریدی (ملتان)

آفتابِ خطابت

عمرہا در کعبہ بت خانہ فی نالد
تاز بزم عیب دانائے راز آئید بروں

کچھ عرصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب بھی کوئی صاحب کمال اس دنیا سے عالم باقی کو رخصت ہوتا ہے ملک وملت کو اس کا بدل نصیب نہیں ہوتا۔ اقبال کے بعد پھر اقبال پیدا نہیں ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں گیا گئے۔ اپنی آتش بیانی ساتھ لے گئے۔ ابھی انکا صدمہ باقی تھا کہ ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو عصر کے وقت عظیم دینی اور سیاسی رہنما دنیا کے بہت بڑے خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری رفیق اعلیٰ کو لبیک کہہ گئے۔ مرحوم برصغیر کے آخری خطیب تھے۔ ان کے ارتحال سے ملک کی خطابت ہمیشہ کے لئے سوگوار ہو گئی۔ اب نہ شاہ جی پھر منظر عام پر آئیں گے اور نہ عوام کو ان کی رعد آسا تقریروں کے سننے کا موقع ملے گا

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں
فر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

خدا معلوم مولانا ابوالکلام کو ابوالکلامی لقب کس سخن شناس نے عطا کیا تھا مگر اس حقیقت سے مولانا کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں۔ کہ واقعی وہ ابوالکلام تھے۔ اسی طرح جس کسی نے پہلی بار حضرت شاہ جی کو خطیب اعظم کہہ کر پکارا۔ اس نے دنیا کی بہت بڑی صداقت کو آشکار کیا۔ حضرت شاہ جی پبلک تقریروں کے شہنشاہ تھے۔ چونکہ وہ ایسے دور میں منظر عام پر آئے تھے جبکہ ملک کو اتحاد کی بڑی ضرورت تھی۔ اس لئے وہ ایک عرصہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔ بلکہ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے تکرتے وہ فرقہ وارانہ اختلافات سے بہت اوپر چلے گئے تھے۔ وہ انگریز کے پیدائشی دشمن تھے۔ اور قادیانیوں سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ چونکہ قادیانی انگریز کے پروردہ اور مدح خواں تھے۔ اس لئے جب شاہ جی اپنی تقریروں میں ان پر چوٹیں کرتے تو نہ صرف مسلمان خوش ہوتے بلکہ ملک کی آزادی کے تمام طلب گار ان لطیفوں اور چٹکلوں کو مزے لے لے کر سنتے تھے۔ شیعوں کو لکار کر کہتے "ارے دشمن نبوت چھین لینے کی فکر میں ہے اور تم خلافت پر جھگڑ رہے ہو!" حضرت شاہ جی کو خدائے ذوالجلال نے بڑا وجیہہ چہرہ عنایت کیا تھا۔ قرآن پڑھتے تو خالص عربی معلوم ہوتے۔ اور یوں محسوس ہوتا گویا اس کا ابھی نزول ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کا تو متاثر ہونا لازمی تھا۔ مگر شاہ جی کی قرأت سے غیر مسلم بھی جھوم اٹھتے تھے۔ ان کا ایک ہندو نیازمند لکھتا ہے کہ۔

"جب وہ جیل خانے میں علی الصبح قرآن پاک پڑھا کرتے تھے تو فضا کتنی خوبصورت ہو جایا کرتی تھی۔ اور میں یہی سوچا کرتا تھا کہ کلام اللہ کتنا خوبصورت ہے۔ کتنا مقدس ہے کہ مجھ کافر کے دل پر بھی اپنے نقوش چھوڑ رہا ہے"

ایک دفعہ شاہ جی نے باغ لانگے خان (ملتان) میں تقریر کرتے ہوئے شاہنامے کے یہ شعر پڑھے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسانید کار
کہ تاج کیاں را کند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

شاہ جی کا لب و لہجہ اور انداز بیان کچھ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ خود شاہ ایران عرب ترجمہ سپہ سالار کے خط سے برہم ہو کر آسمان سے مخاطب ہے۔ تقریر کرتے وقت شاہ جی بالعموم عصا ہاتھ میں رکھتے تھے مگر اس امر کو آپ نے عادت میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ عرب کے زندہ جاوید مقرر اور خطیب سحبان سے متعلق تو اتنا مشہور ہے کہ وہ جب تک اپنا مخصوص عصا ہاتھ میں نہ لے لیتا تقریر نہ کر سکتا تھا۔ مشہور اموی خلیفہ عبدالملک کہا کرتا تھا کہ اگر میں ہاتھ سے اپنا عصا رکھ دوں تو میری تقریر کا آدھا زور ضائع ہو جائے لیکن شاہ جی تقریر کے لئے کسی سہارے کے محتاج نہ تھے۔ کئی دفعہ انہیں کاغذ کا ٹکڑا لئے تقریر کرتے دیکھا ہے۔

خطیب کے لئے ضروری ہے کہ اسے زبان پر پورا عبور ہو۔ اور جس موضوع پر وہ تقریر کرنا چاہتا ہے اس موضوع پر اسے گہرے اور وسیع علم کا مالک ہونا چاہیئے۔ حضرت شاہ جی اردو میں تقریر کرتے تھے۔ اور وہ اردو کے اہل زبان نظر آتے تھے۔

یوں تو ہندوستان کا چپہ چپہ ان کے قدوم میمنت لزوم سے فیض یاب ہو چکا تھا۔ مگر ملتان اور لاہور ان کے خاص مراکز تھے۔ ان شہروں میں جب بولنے کے لئے کھڑے ہوتے تو پنجابی اور سرائیکی میں بھی فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے۔ روزمرہ اور محاورے کا انہیں بڑا خیال رہتا تھا۔ گفتگو کے دوران بھی اگر کوئی شخص غلطی کر جاتا تو اس کی وہیں اصلاح فرما دیتے تھے۔

ایک دفعہ کسی صاحب نے اورنگ زیب علیہ الرحمتہ کا ایک فقرہ بول دیا۔ "سادات بار ہمہ عقل بیرزم معدانہ قابل سوختنی نہ زلائق فروختنی"۔ فوراً اسے ٹوکا اور فرمایا بھئی! اورنگ زیب جیسے ادیب پر یہ ظلم نہ کرو۔ یہ فقرہ یوں ہے نہ سوختنی نہ فروختنی۔

کسی نے کہا "آئی ٹم بم"۔ فرمایا ایٹم بم کہو۔

خطیب کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دانت مضبوط ہوں۔ اور حلق صاف ہو۔ اہل عرب تقریر اور خطابت میں ماہر تھے۔ اس لئے وہ ان چیزوں کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے خلیفہ عبدالملک کے جب دانت ہلنے لگے تو اس نے انہیں سونے کے تار سے جکڑوا لیا۔ شاہ جی کے دانت موتیوں کی طرح خوبصورت اور مضبوط تھے۔ حلق ہمیشہ صاف رہا۔ آخری عمر میں جب دانتوں نے دھوکہ دیا تو آپ نے تقریر کرنا ترک کر دی۔ چہرہ کی ادلتی بدلتی کیفیات تقریر کو مؤثر کرنے میں بڑا کام دیتی ہیں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"چہرہ کی کیفیات مقرر اور خطیب کے لئے ازحد اہم ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات، علامتیں مقرر اور خطیب کے

قدرتی حسن سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں"

شاہ جی کی خطابت کی کامیابی میں ان کے چہرہ کی ادلتی بدلتی کیفیات کو بھی دخل تھا۔ ان کے چہرے کا جلال ہی سارے مجمع کو مٹھی میں لے لیتا تھا۔ آلۂ جہیر الصوت کے وہ سخت مخالف تھے۔ فرماتے تھے "جب تک آنکھیں چار نہ ہوں۔ تقریر کا لطف ہی نہیں آتا۔ مگر جب سے یہ میاں مکبر الصوت (لاوڈ اسپیکر) آیا ہے۔ تقریر کا مزہ اٹھ گیا ہے"

خطیب کے لئے خلوص بے حد ضروری ہے۔ مقرر ہزار قابل کیوں نہ ہو۔ اگر اس میں اخلاص نہیں تو ایسا مقرر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس دل میں خلوص ہو اس کی بات اثر کئے بغیر نہیں رہتی اقبال کہتے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں۔ طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

حضرت شاہ جی اس مدرسۂ فکر سے متعلق تھے جس کے شیخ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمود حسن رحمہم اللہ رہے تھے۔ تمام عمر وہ اسی فکر میں رہے کہ انگریز کو اس ملک سے کیونکر نکالا جا سکتا ہے۔ اور انہوں نے نکال کر ہی دم لیا۔ انہیں اپنی قوم سے محبت تھی۔ اگر کوئی مسلمانوں پر حملہ کرتا تو سینہ تان کر آگے آجاتے تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں تارا سنگھ نے مسلمانوں کو خون کی ندیاں بہا دینے کی دھمکیاں دی تھیں تو شاہ جی نے للکار کر کہا۔

"ماسٹر جی! ہوش کے ناخن لو کیا کہتے ہو! جس قوم کے فرزند خون کے قلزم میں تیرتے رہے ہوں۔ تم انہیں اپنی ننھی منی ندیوں سے ڈراتے ہو!"

شاہ جی کا دوسرا اہم محاذ قادیانیت تھا۔ بلاشبہ قادیانیت پر وہ برق صاعقہ بن کر گرے۔ سر کے بال سیاہ تھے تو بھی اور جب سفید گالے سے ہو گئے تب بھی وہ قادیانیوں کے لئے بڑا خطرہ تھے۔ وہ عمر بھر اس خانہ ساز نبوت کے خلاف بولتے رہے جب ضعیفی نے شدت سے محصور کر لیا اور انہوں نے آخری تقریر فرمائی تو بھی قادیانیوں کو اپنے تبرکات سے محروم نہ رکھا۔ گویا تنگ ہار کر بطور اتمام حجت کے طنزاً فرمایا۔

"اے قادیانیو! اگر نیا نبی مانے بغیر تمہارا گزارہ نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر تم جی ہی نہیں سکتے تو مسٹر جناح کو ہی نبی مان لو۔ تمہارے مرزا صاحب تو تمام عمر حکومت برطانیہ کی چاپلوسی کرتے رہے۔ بلکہ اسی چاپلوسی کا معاوضہ بھی وصول کرتے رہے۔ مسٹر جناح مرد تو تھا جس بات پر ڈٹا کوہ کی طرح اڑ گیا۔ آہوں کے بادل اٹھے، اشکوں کی گھٹا چھائی، خون کی برکھا ہوئی۔ لاشوں کا سیلاب آیا مگر کوئی چیز مسٹر جناح کے عزم کو نہ ہلا سکی۔ اس نے تاریخ کے اوراق کو پلٹ دیا اور ملک کے جغرافیہ کو بدل کر رکھ دیا۔ ارے تمہاری جھوٹی نبوت کو بھی لٹ پٹ کر جگہ ملی تو اسی کے قدموں میں۔ تمام عمر گزار دی۔ انگریز کی نوکری نہیں کی۔ حکومت سے خطاب نہیں لیا۔ انگریز سے کوئی تمنا وابستہ نہیں کی۔ اور ایک تمہارا نبی ہے کہ حضور گورنمنٹ کے آگے عاجزانہ درخواستیں کرتے کرتے پچاس الماریاں سیاہ کر ڈالیں"۔

شاہ جی کی تقریر کا یہ مختصر سا اقتباس اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ شاہ جی کی طبیعت میں شوخی اور لطافت کی پاکیزہ روش تھی۔ نہ اتنی کہ طنز بن جائے اور نہ اتنی کھلی کہ متانت سے گر جائے۔

انہوں نے ساری عمر رضائے الٰہی میں بسر کی۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا سب خدا کے لئے تھا۔ وہ اپنے خدا کے پاس پہنچ گئے۔ انکی روح پر فتوح اعلیٰ علیین میں انعامات خداوندی سے شاد کام ہو رہی ہو گی۔

شاہ جی کی سب سے اہم یادگار ان کے خطبے ہیں۔ انہوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم پر جو تقریریں کی۔ جو احرار کانفرنسوں میں وجد آفریں خطبے دیئے وہ سب کے سب سی آئی ڈی کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاک و ہند کی دونوں حکومتیں شاہ جی کا احترام کرتی ہیں اور پھر یہ تاریخی ریکارڈ ہے۔ اس سے نہ صرف حضرت شاہ جی کے خطیبانہ جگر پارے پوری قوم کے سامنے آ جائیں گے بلکہ اس سے ہندوستان پاکستان کی تاریخ آزادی مدون کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو مے گویم
تو از سخنم پند گیر خواہ ملال

حبیب اللہ عظیمی

عقیدت کے پھول

سرتاج رأ عدم کو امیر ریعت
وہ مرد مجاہد وہ پیر طریقت
وہ شیدائے ملت وہ شاہ بخاری!
مؤثر تھی ہر ایک جس کی نصیحت!
خطیبوں کے قائد ادیبوں کے رہبر!
کہ تھی نظم و نثر آپ کی بیش قیمت!
وہ آزادیٔ ملک و ملت کے شیدا
اسیری کی جس نے اٹھائی صعوبت
وہ حق و صداقت کا عکس حسیں اک
وہ اک زندہ دل اور شگفتہ طبیعت
رفیقوں کو دے کر وہ داغ جدائی
گئے سوئے فردوس وہ پاک طینت
ہے پیشِ حضورِ امیرِ شریعت
عظیمی کی جانب سے نذر عقیدت

مولانا عبد الکریم (کلاچی)

شاہ جی کی پانچ باتیں

میں ان خوش نصیب طالب علموں میں ہوں جنھوں نے حضرت امیر شریعت کو امیر شریعت سمجھ کر دیکھا اور اسے میں فیما بینی بین و بین اللہ بڑی سعادت سمجھ رہا ہوں۔ والحمد للہ بے ہمتی اور بے عملی کے باعث اگرچہ حضرت سے استفادہ کا بے حد تھوڑا وقت ملا میں نہ تو آپ کی قیادت میں کوئی ملکی یا سیاسی کام کر سکا اور نہ ہی کوئی ملی اور مذہبی خدمت۔ چند ارشادات جو گوش ہوش سے سننے کی سعادت میسر ہوئی وہ پلے باندھ لیں اور جب بھی اور جہاں بھی تھوڑی بہت ملک و ملت کے لئے کوئی حرکت کی تو انہیں پیش نظر رکھا ان میں سے چند یہ ہیں۔

۳۵ء (۱) کے لگ بھگ کی بات ہے میں خیر المدارس جالندھر میں خیر الاساتذہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب رائے پوری سے مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف اور اس درجہ کی دوسری کتابیں پڑھ رہا تھا کہ حضرت امیر شریعت جالندھر تشریف لائے وہاں کسی بزرگ کی درگاہ ——— ——— کے سامنے بڑا میدان تھا وہیں حضرت کی تقریر تھی دوسرے طلباء کے ساتھ میں بھی جلسہ میں گیا فوجی بھرتی کے خلاف حضرت تقریر فرما رہے تھے۔ آیت کریمہ

ان الملوک اذا دخلوا قریہ افسد واھا الخ

کی اپنی ساحرانہ لہجہ سے تلاوت فرمائی تشریح اول سے آخر تک شیخ سعدی کے مشہور لطیفہ سے فرماتے رہے۔ شندیم گو پسندے را بزرگے الخ درمیان میں کوئی نوجوان اٹھا اس نے کہا شاہ جی اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو اہل ایمان کے ساتھ اقرب الی المودۃ قرار دیا ہے جبکہ آپ کا سارا زور خطاب ان کے خلاف ہے اور مشرکین سے ملے ہوئے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ حضرت نے فرمایا۔ عزیزا اگلی آیات کی تلاوت آپ کرتے ہیں یا میں ہی کر دوں وہ تو زمین بولے تو بولے میری کیا بساط کا مصداق رہا حضرت نے

ذالک بان منھم قسیسین و رھبانا الخ

آیات تلاوت فرمائیں ایسا معلوم ہونے لگا کہ سائنس جدید صحیح کہتی ہے کہ آسمان ساکن ہے اور زمین متحرک اسی دوران حضرت الاستاد مولانا محمد عبد اللہ صاحب جو اسٹیج پر تشریف فرماتے نے آیت کریمہ تھے۔

لاینھا کم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین

۱۔ مولانا کو سہو ہوا ہے یہ واقعہ ۱۹۳۹ء کا ہے۔ جب مجلس احرار اسلام نے فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک چلائی تھی۔ یاد رہے فوجی بھرتی کے خلاف اس تحریک میں کانگریس، لیگ اور جمعیت علمائے ہند کی مجرمانہ خاموشی تاریخ کا سوالیہ نشان ہے؟

۲۔ درگاہ امام ناصر رحمہ اللہ

کی طرف دبی زبان سے کچھ اشارہ فرمایا۔ شاہ جی نے بلند آواز سے فرمایا
"مولانا فکر نہ کریں میں جس دن احرار میں شامل ہوا اس رات سارا قرآن دیکھ لیا تھا"
یہی سنانا مقصود تھا میں اس سے یہ سمجھا کہ ملک و ملت کی کوئی خدمت بالخصوص اجتماعی طور پر کرنے کا ارادہ ہو تو پورے غور و خوض کے بعد علی وجدہ البصیرت اس میں شامل ہونا چاہیئے۔ یوں جوش میں آکر آج شامل ہو گئے اور کل کسی نے ادھر ادھر کی باتیں سنائیں تو ساری عقیدت ختم۔ اسی وجہ سے آج روزمرہ کے عہد و مواثیق کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے۔ انہوں نے حضرت شاہ جی کا یہ ارشاد یا تو سنا نہیں اور یا پھر سمجھا نہیں۔

۲۔ "آہ کہ دین اسی راستہ سے واپس جا رہا ہے"

ایک دفعہ ملتان میں غالباً وفاق المدارس کی کسی میٹنگ میں شریک ہو کر میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ساتھ حضرت شاہ جی کی زیارت کو حاضر ہوا۔ حضرت قاسم العلوم سے نکل کر اپنے دولت کدہ پر تشریف لے جا رہے تھے الوداعی مصافحہ کے وقت حضرت مولانا نے صرف بالخیر پانچ روپے کا نوٹ حضرت کے ہتھیلی میں چھپا کر رکھا۔ حضرت شاہ جی نے اسے سر پر رکھا اور فرمایا حضرت چھپاتے کیوں ہیں یہ تو میرے لئے بڑے فخر کی بات ہے کہ مجھے شیخ الحدیث ہدیہ دے رہے ہیں۔ اسی دوران کھڑے کھڑے کچھ لطائف اور ظرائف بھی سنائے سامعین کی جگہ صرف ہم دو تھے۔ اسی میں حضرت نے ایک درد بھری آہ کے ساتھ یہ بھی فرمایا حضرت ہمارے انہی مدارس کے ذریعہ دین ہند و پاک میں آیا اور اب اسی راستہ سے واپس جا رہا ہے۔

کچھ کچھ تو اس وقت بھی اپنی غفلتوں اور بد اعمالیوں کا اندازہ لگاتے ہوئے اس آہ کے مندرجات سمجھ میں آنے لگے۔ لیکن جب سے دشمنان صحابہ کرام سے گٹھ جوڑ شروع ہونے لگا ہے۔ اور جب سے ان اعداء دین۔ اعداء قرآن کو مسلمان کہلوانے پر زور دیا جا رہا ہے اور یہ سارا سکوت فی الحق دینی مدارس کے ذریعہ دینی خدمات کی فہرست میں گنوانے کا کاروبار شروع ہو چکا ہے تو حضرت شاہ جی کی فراست مومنانہ پر جان و دل سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔

۳۔ علماء امت کی پولیس ہے

دارالعلوم نعمانیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں کسی سالانہ اجتماع کے موقع پر طلباء کی ایک مجلس میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے فرمایا کہ "علماء کا کام تو قوانین اسلامیہ کی حفاظت ہے یہ اُمت کی پولیس ہے اور پولیس کی نمک حلالی یہ ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو پکڑے چاہے اس کا باپ ہو یا بیٹا۔ کوئی بڑا افسر بھی کیوں نہ ہو اسے بھی پکڑے ورنہ پولیس والا حرام خور ہو گا۔ جو کسی کی شخصیت کا تو خیال رکھے مگر قانون کی حفاظت کا خیال نہ رکھے۔ فرمایا یہی ڈیوٹی علماء کی ہے قانون شریعت کی جو بھی مخالفت کرے گا علماء کا فرض ہے کہ اسے پکڑیں کسی کا لحاظ کئے بغیر فرمایا کہ حکیم الاسلام نے فرمایا کہ بزرگوں نے اختلافی بات کہنی ہو تو دروازہ بند کر کے اندر کہیں باہر کہیں گے تو ہم کسی کا لحاظ کئے بغیر اسے پکڑ لیں گے چاہے عدالت میں پہنچ کر چھوٹ بھی جائیں۔

سوچتا ہوں کہ اب ہم میں کتنے ہیں جو یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ کسی بڑے دینی پیشوا کے مقابلے میں ہم حق گو بن سکتے ہیں۔ کسی بڑے عالم کی حق پرستی کے نام سے پگڑی اچھال سکتے ہیں کسی جابر حکومت کے خلاف کلمہ حق کہہ کر زندہ باد ہو سکتے ہیں لیکن کیا کسی گروپ یا کسی سیاسی رفیق کو قانون شریعت کے پرخچے اڑاتے ہوئے دیکھ کر ہم اسے ترچھی نگاہ سے دیکھنے کی توفیق بھی رکھتے ہیں۔ واقعات کی زبان سے اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ کاش کہ شاہ جی کا یہ ارشاد آج ہمارا رہنما بن سکتا اور ہر موڑ پر ہم اس پر عملدر آمد کر سکتے۔

علماء کا کام رہنمائی ہے نہ کہ نمائندگی

غالباً ڈیرہ ہی میں کسی نشست عام یا خاص میں حضرت شاہ جی کا یہ ملفوظ بھی سامعہ نواز ہوا کہ علماء کا کام قوم کی نمائندگی نہیں کہ قوم جو چاہے آگے نکل کر اور کچھ قربانی دیکر "یقدم قومہ" کا ہر حال میں مصداق بنے تاکہ قوم سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر سکیں چاہے وہ ہلاکت کے گڑھے کی طرف جارہی ہو۔ بلکہ علماء کا کام قوم کی رہنمائی ہے جو راستہ چاہے قوم اسے ہزار بار ناپسند کرے خدا تک پہنچانیوالا ہو وہی انہیں دکھلائے اسی پر چلنے کے لئے اس کو آمادہ کرے اور خود اسی پر چلنے کا نہ صرف عزم عہد کرے بلکہ عمل بھی کرے۔

اب ہم کیا کر رہے ہیں قوم کی رہنمائی یا نمائندگی

اعظکم بواحدة ان تقوموا الله مثنی و فرادی ثم تتفکرو

یہ فیصلہ "استفت قلبک" کے ارشاد نبوی علے نائلہ الصلوٰۃ میں مضمر ہے۔

ہماری نظر عوام پر رہتی ہے عوام جو چاہیں ہم ان کے منہ سے نکال کر اپنی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ زبان میری ہے بات ان کی ----- افغانی بارہ سال سے کفر کا مقابلہ کر رہے تھے۔ پندرہ لاکھ کے لگ بھگ افغان شہید ہوگئے ہزاروں علماء گرفتار ہوئے سینکڑوں خانقاہیں سینماؤں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہم نے ان کے لئے ایک جلوس بھی نہ نکالا۔ اور جب عوام نے چاہا تو ہم نے لاتعداد جلوس عراق کے صدر کے لئے نکالے یہ شوراشوری اور وہ خاموشی کس بات کی غماز ہے کہ ہم نمائندگی کر رہے ہیں یا رہنمائی۔ شاہ جی پر خدا کی ہزاروں رحمتیں کہ وہ آج ہم میں موجود نہیں مگر ان کی ہدایات اب بھی ہماری رہنمائی کر رہی ہیں۔ فرحمہ اللہ رحمتہ واسعتہ لیکن سننے والے کان کہاں؟ لهم آذان لایسمعون بها

۵۔ مزہ تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

غالباً ۴۲-۴۳ء کی بات ہوگی کہ شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ ڈیرہ اسماعیل خان سیرت کے ایک جلسہ میں تشریف لائے۔ حضرت امیر شریعت اور حضرت مولانا گل شیر مرحوم شہید بھی تشریف لائے تھے۔ عید گاہ کلاں میں نماز جمعہ کے بعد حضرت شیخ کا خطاب تھا جلسہ کی صدارت حضرت شاہ جی کو کرنی تھی۔ حضرت شاہ جی بجائے کرسی کے سٹیج پر بیٹھے حضرت مدنی نے دو چار بار اشارہ کیا کہ حضرت کرسی صدارت کو سنبھالیں حضرت شاہ جی معذرت فرمارہے تھے آخر میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمایا شاہ جی میں حکم دیتا ہوں کہ کرسی پر بیٹھیئے۔ شاہ جی نے فرمایا لاؤ بھائی کرسی لاؤ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ شاہ جی ایک

سیکنڈ میں کرسی پر بیٹھے اور کرسی کو سرکا دیا اور کہا حضرت حکم کی تعمیل کر دی مزید بیٹھنے کی ہمت نہیں۔

دوسرے دن جب حضرت شیخ رخصت ہو رہے تھے اور قیام گاہ سے موٹر تک بہت زیادہ ہجوم تھا حضرت شاہ جی کمرہ قیام سے باہر نکلے اور للکار کر فرمایا۔

راستہ چھوڑو ورنہ ہم ڈنڈا چلائیں گے۔ حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور لوگوں نے راستہ دیدیا جب حضرت شیخ کو کار میں بٹھلایا تو حضرت شاہ جی نے یہ شعر عجیب انداز سے پڑھا۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

مزا تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

ساقی کے لفظ پر جب شاہ جی نے حضرت شیخ کیطرف اشارہ کیا تو سینکڑوں آنکھیں بے اختیار نمناک ہو گئیں اور آنسو بہہ نکلے

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

تبلیغی جماعت کے دعوت کے چھ نمبر ہیں ان چھ باتوں میں سارے دین کا نچوڑ ہے۔ میرے خیال میں حضرت شاہ جی کی مندرجہ بالا پانچ باتوں میں دین و دنیا سمٹی ہوئی ہے۔ اللہ ان پر مجھے اور سب کو عمل کی توفیق اور ارزانی فرمادیں۔ آمین۔ ثم آمین یا رب العلمین ۔۔۔۔۔ بحرمت سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

مولانا حافظ ریاض الرحمان اشرفی مرحوم نے بیان فرمایا کہ میں ایک دفعہ غلام احمد پرویز کے درس میں چلا گیا اور متاثر ہو کر واپس آیا۔ پھر حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ سے ذکر کیا کہ پرویز صاحب دوران تقریر بہت رو رہے تھے تو امیر شریعت نے بے ساختہ فرمایا......

''جا حافظا! رون توں متاثر ہو گیا ایں؟''

(ارے حافظ! محض اس کے رونے سے متاثر ہو گئے ہو؟)

اور پھر لحن داؤدی سے قرآن مجید کی آیت پڑھی۔

وجاء واباھم عشاء یبکون

(ترجمہ) اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹے، عشاء کے وقت روتے ہوئے آئے۔ (آگے ذکر ہے کہ انہوں نے کہا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے)

حافظ صاحب فرماتے تھے کہ شاہ جی رحمہ اللہ کے اتنا فرمانے سے میرا سارا تاثر فوراً ختم ہو گیا۔

(مولانا عبد الرشید ارشد۔ ماہنامہ الرشید لاہور۔ مئی ۱۹۹۳ء ص۔۷۱)

مولانا محمد سعید الرحمن علوی مرحوم

شاہ جیؒ کے علمی امتیازات

اہلِ نظر کا کہنا ہے کہ متحدہ ہندوستان کے دورِ زوال میں ہر شعبۂ زندگی میں بڑے بڑے باکمال لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لے کر برطانوی سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ایک شعبہ خطابت کا بھی تھا جو ابلاغ کے لئے ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ابلاغ کے لئے بہت حد تک آج میڈیا سے کام لیا جا رہا ہے پھر بھی خطابت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور جس دور کے حوالہ سے ہم بات کر رہے ہیں۔ اس میں تو خطابت ہی خطابت تھی، ملت مسلمہ کی اس دور کی تاریخ میں ابوالکلام، سید سلیمان ندوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، نواب بہادر یار جنگ کے پہلو بہ پہلو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام اس شعبہ میں بڑا نمایاں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ شاہ جی بہت سے حوالوں سے ایک ممتاز شخصیت کے مالک ہوں۔ ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر خطہ و علاقہ کی زبان میں اس خطہ و علاقہ کے محاوروں کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک اس کا پیغام پہنچانا اور ہر زبان کے لاتعداد اشعار اور ضرب المثال کو موتیوں کی طرح جڑنا شاہ جی کا ہی کام تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ابوالکلام، سید سلیمان، علامہ عثمانی، مولانا جوہر اور نواب بہادر یار جنگ سبھی شاہ جی کی خطیبانہ عظمت کے معترف تھے۔ ان کی خطابت کو موہبت الٰہی قرار دیتے اور برملا یہ کہتے کہ ان کی خطابت کے مقابلہ میں ہماری خطابت ایسے ہی ہے جیسے قورمہ کے مقابلہ میں چٹنی۔ لیکن میں آج کی صحبت میں شاہ جی کی علمی حیثیت کے حوالہ سے بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ خطابت کی دنیا میں بہت سے نام ایسے بھی مل جائیں گے جہاں لمبا چوڑا علم نہیں ہوگا اور اب تو گستاخی معاف خطابت نام ہی جہالت کا بن گیا ہے۔ آج بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں خطابت کے ساتھ علم کی دولت میسر آئی ہے۔ اکثر نامور خطبا ایسے ہیں جن کا مبلغ علم چند قصص کی کتابیں ہیں اور بس۔ اس لئے آج کے دور میں کسی کی خطیبانہ عظمت کے ذکر کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بے چارا علم سے کورا تھا۔ شاہ جی کی علمی عظمت کا کھلے بندوں اظہار و اعتراف ایشیا کی سب سے بڑی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے خوب انداز میں کیا اور قاری محمد طیب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن مجید کی الہامی تفسیر میں شاہ جی کو کمال حاصل ہے بلکہ قاری صاحب کی خواہش تھی کہ جن اسرار و رموز قرآنی کا تذکرہ شاہ جی تقریروں اور نجی مجالس میں کرتے ہیں۔ اے کاش یہ صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جائیں۔ شاہ جی کی علمی عظمت کا اظہار علماء کے ایک بڑے مجمعے میں اس وقت ہوا جب ہمارے آبائی شہر بھیرہ کی شیر شاہی مسجد کے متولی کے حوالہ سے اختلاف پیدا ہوا، مجلس حزب الانصار کے بانی مولانا ظہور احمد بگوی اور ان کے برادر بزرگ مولانا محمد یحیٰ کے درمیان مسئلہ متنازعہ تھا۔ مولانا ظہور احمد نے اپنا ثالث شاہ جی کو تجویز کیا تو مولانا محمد یحیٰ نے

معروف چشتی خانقاہ سیال شریف کے سجادہ نشین خواجہ قمر الدین کو...... خواجہ قمر الدین اس وقت کے سجادہ نشینان پنجاب میں سب سے بڑے عالم تھے۔ جنہیں سلسلہ خیر آباد کے بزرگ عالم مولانا معین الدین اجمیری کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ویسے خواجہ صاحب اپنی علمی سند کے حوالہ سے بڑے فخر سے فرماتے کہ میری سند میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا اسم گرامی ہے جنہوں نے پیغمبر اسلام کی تعریف میں وہ نکات بیان کئے کہ مولانا کے بڑے بڑے نکتہ چینوں کی فکران کے گرد راہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

میرے والد گرامی مولانا محمد رمضان علوی کے بقول اس نزاع کے فیصلہ کے لئے سرگودھا شہر کی جامع مسجد میں اجلاس ہوا۔ ضلع شاہ پور (اب سرگودھا) کے علاوہ دوسرے مقامات کے جید علماء اور فریقین کے ہمدرد بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مسئلہ اس قسم کا تھا کہ فقہی سرمایہ پر گہرا عبور رکھنے والا شخص ہی اس پل کو عبور کر سکتا تھا۔ جبکہ شاہ جی کے متعلق ایک فقید المثال خطیب کی شہرت تھی لیکن مولانا ظہور احمد بگوی جیسے ذہین شخص نے اپنے شیخ طریقت مولانا احمد خان نقشبندی مجددی کے اشارہ سے شاہ جی کا جو انتخاب کیا تھا وہ بلاوجہ نہ تھا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی ایک بہت پختہ کار اور جید عالم تھے۔ لیکن یہ بات تاریخ میں محفوظ ہے کہ شاہ جی نے کتب فقہ وفتاویٰ کی روشنی میں اپنے مؤکل کا مقدمہ اتنی خوبصورتی سے لڑا کہ فیصلہ مولانا ظہور احمد کے حق میں ہوا اور پھر مولانا ظہور احمد اپنی ساری زندگی شیر شاہی مسجد بھیرہ کے متولی اور خطیب رہے۔ چونکہ وہ خود اولاد سے محروم تھے۔ اس لئے ان کے بعد ان کے برادر بزرگ مولانا نصیر الدین کے فرزند مولانا افتخار احمد جانشین ہوئے اور اب ان کے فرزند برادر عزیز ابرار احمد بگوی اس منصب پر فائز ہیں۔ اس فیصلہ کے نتیجہ میں شاہ جی کی علمی دھاک بیٹھ گئی اور بالخصوص شمالی پنجاب میں اس فیصلہ اور شاہ جی کے علمی دلائل کا زبردست چرچا ہوا۔

شاہ جی کے حوالہ سے اور ان کی علمی عظمت کے حوالہ سے ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک دنیا جانتی ہے کہ انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ جلسہ ۱۹۳۰ء میں انہیں امیر شریعت تجویز کیا گیا اور اس موقع پر پانصد علماء نے ان کی بیعت کی۔ اس تجویز کو پروان چڑھانے والے علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری تھے۔ جو علامہ اقبال کے علمی مرشد، دور آخر کے محدث جلیل اور فقید النفس بزرگ تھے، دہلی کے بزرگ عالم مولانا احمد سعید نے علامہ انور شاہ کی وفات پر کہا تھا کہ ہم نے ایک لائبریری دفنا دی۔ خانقاہ گولڑہ کے فیض یافتہ اور جامعہ عباسیہ بہاولپور کے علمی سربراہ مولانا غلام محمد نے انور شاہ کے آخری سفر کے موقعہ پر جب وہ شدید بیمار بھی تھے۔ اسّی سے زیادہ انتہائی مشکل سوالات مولانا انور شاہ کے سامنے رکھے۔ مولانا نے ایک ایک سوال کا جواب کتابوں کے صفحات اور سطور کی قید کے ساتھ لکھوا دیا۔ جس پر مولانا غلام محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کے بعد ہم جیسے لوگوں کی علمی پیاس کون بجھائے گا۔ اسی عظیم عالم انور شاہ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی امیر شریعت کی تجویز پیش کر کے خود ہی سب سے پہلے بیعت کی۔ اس منصب و اعزاز کا مقصد کیا تھا۔ اس کے لئے قارئین کے سامنے ایک حوالہ لانا ضروری ہے۔ قومی ادارہ

برائے تحقیق تاریخ و ثقافت کی پہلی جلد میں ضمیمہ جات کے حصہ میں دوسرا ضمیمہ صفحہ ۴۶۷ سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "مسودہ فرائض و اختیارات امیر الشریعت فی الہند" ہے۔ یہ مسودہ ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مرتب ہوا۔ اسے ترتیب دینے والے مولانا کفایت اللہ، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا محمد سجاد بہاری جیسے صاحب نظر علماء تھے۔ بعد میں سید سلیمان ندوی، حکیم اجمل خان جیسے حضرات بھی شامل کئے گئے۔ بیس جید علماء اور ذمہ دار زعما پر مشتمل اس کمیٹی نے جو مسودہ تیار کیا وہ متحدہ ہندوستان کی مسلمان قوم کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان قوم کی تنظیم، اس کے دینی، ملی، روحانی، علمی، مالی اور عدالتی مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کا نظم بنایا جائے تاکہ مسلمان قوم انگریزی قوانین کی دلدل سے نکل سکے، اس نظام کی تجویز و تحریک کے سلسلہ میں ابتدائی مشورے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سجاد بہاری کے تھے۔ مولانا ابوالکلام کی جیل کی وجہ سے مولانا سجاد نے ساری ذمہ داری اپنے سر لی اور یہ حیرت زا معاملہ ہے کہ انہیں کے صوبہ بہار میں یہ نظام بڑی کامیابی سے سب سے پہلے چلا اور پھر دھیرے دھیرے ہندوستان کے مختلف خطوں میں پھیلتا گیا اور تقسیم کے بعد بھی ہندوستان کے بڑے حصہ میں، یہ نظام کامیابی سے چل رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان بہت سے عدالتی جھگڑوں اور پیچیدگیوں سے بچ کر اپنا وقت و سرمایہ بچا رہے ہیں۔ یہ ساری کاوش جمیعتہ علماء ہند کے تحت ہوئی۔ علامہ انور شاہ اس نظام کا اہم حصہ تھے۔ پنجاب میں اسی نظام کی خاطر امیر شریعت کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا انتخاب ہوا لیکن ہمیں یہ اعتراف ہے کہ اس بد نصیب خطہ میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں برپا نہ ہو سکا۔ لکھنو کے معروف عالم مولانا محمد منظور نعمانی کے فرزند مولانا عتیق الرحمن نے چند ماہ قبل لندن سے ایک خط میں ان سطور کے راقم کو بطور خاص لکھا کہ پنجاب میں اس نظام کا کیا بنا؟ اور جمیعتہ علماء کی نگرانی میں ملک کے بڑے حصہ میں جو نظام کامیابی سے چلا پنجاب میں اس پر کیا گزری؟ میں مولانا عتیق الرحمن کو کیا بتاؤں کہ اس کا سبب کیا ہوا اور پنجاب میں اس نظام پر کیا گزری؟ سب سے پہلا مسئلہ تو خود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تھا جو اللہ تعالی کی طرف سے فقر غیور لے کر پیدا ہوئے، انہیں قدرت نے بے پناہ علم، جوشِ عمل، خطابت، معاملہ فہمی اور سب سے بڑھ کر بے کراں دولت اخلاص سے نوازا تھا۔ میری عقیدت مندانہ نہیں دیانت دارانہ رائے ہے کہ وہ قافلۂ صحابہ کی بچھڑی ہوئی شخصیت تھے۔ انہیں قدرت نے لحن حجازی ہی نہیں دل و دماغ بھی حجازی عطاء فرمائے تھے۔ وہ "حادثاتی سید" نہ تھے بلکہ فی الواقع حسنی سادات کے گل سر سبد تھے ان کو اللہ تعالی نے جن خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا ان کے پیش نظر وہ بہت سے طبقات بشمول طبقۂ اہل علم کی نظر میں محسود تھے۔ لوگ ان کے علم، جوش عمل، اور جذبۂ اخلاص کا مقابلہ نہ کر سکتے تو حسد کے مکروہ ہتھیاروں سے کام لیتے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ہر مسجد، ہر مدرسے ہر ادارہ اور اس کے منتظم کی عزت کو اپنی عزت سمجھا۔ ان اداروں کی آب یاری کے لئے جھولی پھیلا کر ملت سے بھیک مانگی اور وقت آنے پر اداروں کی ناموس کے لئے خود اور اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کو اس طرح کھڑا کیا کہ کوئی میلی نظر نہ اٹھ سکی۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اس مرد غیور کے جذبات کی قدر نہ کی گئی، بقول شاہ جی "میں محسود علماء

تھا" علامہ انور شاہ جیسی شخصیت نے جب اپنا ہاتھ بڑھا کر بیعت کی تو ان کے سامنے دم مارنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ پانصد بیعت کرنے والوں میں ہندوستان کے ہر خطہ کے لوگ تھے۔ پنجاب کے جو حضرات اس موقعہ پر شریک بیعت تھے۔ مثلاً مولانا احمد علی لاہوری جیسے حضرات، انہوں نے آخر وقت تک عہد وفا کو نبھایا لیکن انگریزی سطوت کی خاطر جعلی نبی، جعلی ولی اور اس ظالم سامراج کے تحفظ کے لئے فوجی جوان چننے والے خطہ کے اہل علم کی بڑی اکثریت نے اس مرد وفاشعار سے اپنے آپ کو دور رکھا، خطرہ یہ تھا کہ اس کے قرب کی وجہ سے کہیں انگریزی جیل کی ہوا نہ کھانی پڑے۔ ایسے ایسے المناک واقعات رونما ہوئے کہ بعض خطوں اور علاقوں کے اہل علم نے اپنے یہاں مہمان بنا کر ان کی سرگرمیوں سے خفیہ محکموں کو اطلاع دے کر نوازشیں حاصل کیں تو بعض مقامات کے یاران طریقت نے علاقہ کے جاگیرداروں اور وڈیروں کا اعتماد حاصل کر کے شاہ جی کے وعظ کے لئے مساجد و مدارس کے دروازے بند کر دیئے تو شاہ جی کے جی دار کارکنوں نے سکھوں اور ہندوؤں کے مذہبی مقامات پر ان کی تقریریں کرائیں۔ یوں صحیح معنوں میں بت کدے میں اذان کی بات سامنے آئی۔ ان حالات میں امارت شرعیہ کا نظام کیسے چل سکتا تھا؟ لہذا شاہ جی نے اپنی تمام سرگرمیوں کا رخ باطل قوتوں خصوصاً قادیانیت کے محاذ کی طرف موڑ دیا۔ کہ اگر حسد و رقابت اور بغض و کینہ کے ماحول میں امارتِ شرعیہ کا نظام نہیں چل سکا تو کم از کم تبلیغ و تحریک کے ذریعہ اقامت دین کا ماحول تو پیدا کر دیا جائے۔ بہر حال یہ بڑی تلخ داستاں ہے اور مجھے یقین ہے کہ جو لوگ "امارت شرعیہ" کے نظام سے واقف ہیں اور پنجاب میں اس نظام کی ناکامی کا سوال ان کے ذہن میں ہے وہ ان اشارات سے بہت کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہنا ضروری ہے کہ چونکہ پنجاب پر جعلی نبوت کا سایہ منحوس پڑ چکا تھا۔ اس لئے شاہ جی نے اپنے مرشد علمی مولانا انور شاہ کے حکم سے اپنی سرگرمیاں اسی پر مرکوز کر دیں۔ مولانا انور شاہ ہی تھے جن کی توجہ سے علامہ اقبال نے زندگی کے آخری ایام میں بالکل اچھوتے انداز سے قادیانیت کا تجزیہ کیا، مرحوم کے فرزند جاوید میاں خواہ کچھ کہیں، اقبال کی زندگی کی یہ وہ نیکی ہے جسے اس کی سوانح سے کھرچا نہیں جا سکتا۔

مدرار اللہ مدرار

شاہ جی اور تحریک پاکستان

امیر شریعت، سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ ایک بے مثل خطیب اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ آپ آزادیٔ وطن کے قافلہ سالار اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے روح رواں تھے۔ آپ نے مرزا قادیانی کی نبوت کاذبہ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں۔ اور نوجوانان ملت کے دلوں میں صحیح اسلامی جذبہ اور ولولہ پیدا کیا۔ آپ کی ذات میں وہ تمام خوبیاں جو ایک کامیاب خطیب کے لئے ضروری ہیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ شاہ جی موقع و محل کی مناسبت و موزونیت کے پیش نظر ظرافت و لطافت کا انداز بھی اختیار کرتے تھے۔ اور اپنے نمکدان ظرافت سے سامعین کو بہرہ ور کرتے۔ آج تک آپ کے نمکین اور مزاحیہ چٹکلے اور فقرے زبان زد خاص و عام ہیں۔

مردان کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۹۴۰ء میں مردان تشریف لا کر اہل مردان کو اپنی سحر انگریز خطابت اور ولولہ انگیز ارشادات سے نوازا۔ ان کی تشریف آوری کے موقع پر مال منڈی مردان میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے رد مرزائیت کے علاوہ اس وقت کے ملک کے حالات اور سیاسیات پر ایک دلنشیں تقریر فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بندہ کو شاہ جی سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور ان کی شگفتہ بیانی سے محظوظ ہوا۔

قیام پاکستان

اگرچہ شاہ جی اپنے سیاسی نظریہ کے تحت تحریک پاکستان کے ایک گونہ مخالف تھے۔ لیکن بایں ہمہ جب پاکستان بن گیا تو انہوں نے دل و جان سے اسکا خیر مقدم کیا اور فرمایا۔

"میری رائے ہار گئی اور مسٹر جناح جیت گئے"

نیز فرمایا "یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت کی لیکن جو کچھ صحیح سمجھا وہی کہا اور کیا ہمارا ضمیر اس وقت بھی مطمئن تھا اور آج بھی شرمندہ نہیں"

امیر شریعت نے یہ بھی فرمایا

"میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہیئں۔ اور اس کے لئے عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ مجلس احرار اسلام کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے اور خلافِ شرع کام میں مزاحمت!"

دفاعِ پاکستان

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان مرحوم نے جب بھارت سرکار کو جلسہ عام میں مکا دکھایا

اور اپنے جذبۂ جہاد کا اظہار کیا تو شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"اگر اعلان جنگ ہوا تو بوڑھا بخاری بھی میدان جنگ میں کود پڑے گا۔ مجھے افسوس ضروری ہے کہ میں جوان نہیں۔ لیکن دشمن کے مقابلے میں جوان ہوں۔ میری تمنا ہے کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے میدانِ جنگ میں جان دوں"

اپنے رفقاء کو مشورہ

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں جب امیر شریعت اپنی بیماری اور کمزوری اور دیگر عوارض کی بناء پر ملکی سیاسیات سے الگ تھلگ ہوئے تو انہوں نے اپنے سیاسی رفقاء کار و احباب کو بلایا اور فرمایا۔

"اگر تم میں سے کوئی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چاہے یا سیاسی مزاج کا مالک ہو تو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے" شاہ جی کے اس اعلان و مشورہ کے بعد سیاسی مزاج رکھنے والے بعض حضرات مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے شایان شان حوصلہ افزائی نہ کی گئی۔ اکثر ان میں سے مسلم لیگ کو چھوڑ کر واپس آ گئے اور پھر سے مجلس احرار کی سیاسی حیثیت بحال کر کے اپنے اصل اور سابقہ پلیٹ فارم سے استحکامِ پاکستان کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔

حضرت امیر شریعت علماء حق کی اس جماعت کے رکنِ رکین اور عظیم فرد تھے۔ جنہوں نے اسلام کی سربلندی اور آزادی وطن کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں۔ اور سال ہا سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس راہ میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہے بلکہ ہمیشہ صفِ اول ہی کے قائدین میں رہے۔ رد قادیانیت اور تحفظ ختم نبوت کے لئے تو وہ عظیم الشان خدمات سرانجام دیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ حق بات یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت نے تحفظ ختم نبوت اور رد مرزائیت میں جو کردار ادا کیا وہ بے مثل اور ہر لحاظ سے منفرد و ممتاز ہے۔ جس کے لئے رب ذوالجلال انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمیں اس پر فخر ہے کہ امیر شریعت کے لائق و فائق فرزند مولانا سید عطاء المحسن بخاری اپنے عظیم باپ کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔ ان کی بیش از بیش کامیابیوں کے لئے ہماری دلی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

عبدالستار نجم

یادوں کے نقوش

پاکستان بننے سے پہلے مدرسہ ریاض الاسلام (جھنگ) میں جلسہ تھا۔ بندہ اس وقت شاید چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ سٹیج پر سید مبارک شاہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ مع دیگر علماء تشریف فرما تھے۔ حضرت امیر شریعت تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ خطبۂ مسنونہ کے بعد ایک رکوع کی تلاوت فرمائی۔ مجمع سے اچانک ایک بوڑھا دیہاتی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ جی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ اے آلِ رسول ﷺ اولادِ علیؓ خدا کے لئے ایک رکوع اور تلاوت فرمائیں۔ حضرت شاہ جی نے سر کو ذرا جنبش دی۔ گھنگریالے بالوں نے ادھر سے اُدھر پھیل کر رعبِ حسن کو دوبالا کر دیا۔ مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ سن سکو گے؟ سارا مجمع پکار اٹھا۔ ضرور ضرور۔ مہربانی فرمایئے۔ حضرت شاہ جیؒ نے جھوم جھوم کر تلاوت شروع کی تو مجمع سے سسکیوں کی آواز چیخوں میں تبدیل ہو گئی۔ ایک ہندو نوجوان بھی کھڑا ہو کے تلاوت سننے لگ گیا۔ شاہ جیؒ نے چار رکوع تلاوت کئے۔ بوڑھا دیہاتی زار و قطار روتا ہوا بیٹھ گیا۔ اور اسی جگہ وہ ہندو نوجوان آ کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ اور عرض کیا شاہ جیؒ مجھے مسلمان کیجئے پھر اس کی آنکھوں سے ساون کی برسات لگ گئی۔ شاہ جیؒ نے پیار بھرے لہجہ سے قریب بلا کر فرمایا کہ مسلمان کرنے والا یہ پیچھے پیر بیٹھا ہے (حضرت پیر مبارک شاہ صاحب بغدادیؒ) اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے اس کا مرید بن جا۔ چنانچہ وہ پیر صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ سرصاحب اسے مسلمان کرنے کے بعد اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ یہ نومسلم جب گھر گیا تو بھائیوں نے قتل کرنے کے لئے بندوق کا فائر کیا یہ دوڑ پڑا۔ وہ فائر کرتے ہوئے پیچھے دوڑتے رہے۔ یہ زخمی ہونے کے باوجود بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہسپتال میں زیر علاج رہا تو سارا خرچہ وغیرہ پیر صاحبؒ نے برداشت کیا۔ تندرست ہو کر حضرت پیر صاحبؒ کے ساتھ آ ملا۔ ہم نے اس کے مندمل زخموں کے نشانات دیکھے۔ واللہ اعلم وہ اب کہیں زندہ ہے یا اس دنیا سے جا چکا ہے۔

باگڑ سرگانہ نزد عبدالحکیم میں جلسہ تھا۔ حضرت شاہ جیؒ جناب میل سے ایک بجے اسٹیشن عبدالحکیم پر اترے اور سیدھے حکیم حافظ غلام قادر صاحب (جو پیر مبارک شاہ بغدادیؒ کی مسجد کے حجرے میں اپنے دواخانہ میں موجود تھے) کے پاس تشریف لائے۔ میں اس وقت ان کے پاس طب پڑھ رہا تھا۔ تمام سے معانقہ ہوا۔ حضرت استاد صاحبؒ شاہ جیؒ سے اپنی علاقائی زبان میں مخاطب ہوئے۔ "حضرت جناب میل توں لتھے ہو"۔ شاہ جیؒ نے فوراً فرمایا کہ "ہاں جناب توں لتھے آں ستے جناب تے چڑھنا ہے"۔ یہ اشارہ تھا کہ بے وقت آئے ہیں کھانا بھی کھانا ہے۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی اور جب کبھی شاہ جی حکیم صاحبؒ کے پاس آتے تھے تو وہ ہدیۃً دواء المسک، خمیرہ مروارید ی اور خمیرہ عنبری کے تین ڈبے شاہ جی کی نذر کرتے تھے۔ یہ ساری کہانی صرف ایک جملے میں سما گئی تھی۔ ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

شاہ جیؒ کے ساتھ بندہ بھی باگڑ سر گانہ جلسے میں شرکت کے لئے جا پہنچا۔ شاہ جی ایک پلنگ پر تشریف فرما ہوئے۔ ارد گرد سب عقیدت مند بیٹھ گئے۔ ایک دیہاتی ملنے کے لئے آیا وہ چند قدم ابھی دور ہی تھا کہ جیب سے تسبیح نکال کر اللہ اللہ پکارتا ہوا مصافحہ کرنے لگا۔ شاہ جیؒ نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ پاس ہی حافظ محمد حسین صاحبؒ (خطیب مسجد پیر مبارکؒ عبدالحکیم) کی ایک تھیلی میں لمبی تسبیح رکھی ہوئی تھی۔ شاہ جیؒ نے تھیلی سے تسبیح بھی نکالنی شروع کی اور ساتھ ساتھ کہنا شروع کیا۔ "لوکاں دیا جپالیاں دے باسیئے دا جپال۔ ساری عمراں تسبیح ماری ہک نہ پٹیا وال۔ چھنا لج پھڑیندا یار چھنا لج پھڑیندا یار۔ مجمع سارا ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اور شاہ جیؒ بار بار۔ چھنا لج پھڑیندا یار۔۔۔۔۔۔۔ دراصل یہ اس ریاکاری پر نہایت لطیف انداز میں طنز تھا۔

سائیں محمد حیات پسروری

شاہ جی۔ سب دے پیارے

جو شاہ جی سب دے پیارے سن اللہ نوں پیارے ہوگئے نے
یا حال سنان رفیقاں دا حاضر دربارے ہوگئے نے

کوئی رڑھیا ماریا فرقت دا بہ کنڈھے ساہ لے لیندا سی
اج لماں بحر جدائیاں دا اج دور کنارے ہوگئے نے

جد چن اسمانی ڈب دا اے کل تارے دونے چمک پے سن
ایہہ چن دھرتی دا ڈب گیا مدھم سب تارے ہوگئے نے

کیوں رکیا ایس جہاز اندر پرواز سی ادب اڈاری دی
کیوں وگڑیا کیوں مکینک دے اوزار نکارے ہوگئے نے

کئی عاجز[۱]، جوہر[۲]، امین[۳] بنے کئی خادم[۴] ہیسن شاہ جی دے
لکھاں جانباز[۵] حیات[۶] جیئے غمگین وچارے ہوگئے نے

شعرائے احرار

۱۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز امرتسری
۲۔ عبدالرحیم جوہر جہلمی
۳۔ امین گیلانی
۴۔ ابراہیم خادم قصوری
۵۔ غلام نبی جانباز مرزا
۶۔ سائیں محمد حیات پسروری

علامہ شمس الحق افغانی

عزم آہن گداز اور قلب گریہ بار کا حامل

وما کان قیس هلکہ، هلک واحد۔ ولکنہ بنیان قوم تهدما

حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ سے میں تقریباً چالیس سال سے متعارف ہوں ہمارے شیخ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کی آپ پر خاص نظر عنایت تھی۔ خود حضرت امیر شریعت سے میں نے بارہا سنا کہ بھائی میں کچھ نہیں ہوں جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہے۔ وہ حضرت انور کی نگاہ کرم کا نتیجہ ہے اس نگاہ کرم کی فیض بخشی کا تو خود ہم اور صدہا دیگر حضرات نے بھی مشاہدہ کیا۔ کہ دین کا ایک پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے۔ ماہر الفن، مسلم اور مشہور علماء نے اس پر گھنٹوں تقریریں کیں لیکن پھر بھی وہ عوام کو پوری طرح ذہن نشین نہیں ہوا۔ لیکن جب حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ اس کو سٹیج پر سمجھانے کے لئے اٹھتے تو اپنی سحر آفریں خطابت کے ذریعے چند جملوں میں اس کو ایسا ذہن نشین کر دیتے تھے کہ تازیست وہ مسئلہ سامعین کے ذہن میں نقش ہو کر قائم رہتا۔ اس علمی کمال کے علاوہ آپ کی ذات دیگر بلند پایہ ممتاز ہستیوں کی طرح جامع اضداد تھی۔ فقر ظاہری غناء باطنی۔

اشد آء علی الکفار رحماء بینهم

باطل کے مقابلے میں عزم آہن گداز اور تائید حق کے لئے قلب گریہ بار کے حامل تھے۔ حافظ شیرازی کا یہ شعر آپ کی حالت کا ترجمان تھا۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بین
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

آپ فوت ہوئے لیکن آپ نے اپنی طوفانی اور تلاطم خیز جدوجہد کے ذریعہ مسلمانوں کے قلوب پر غیرت دین اور حمایت حق کے جو نقوش ثبت کئے ہیں۔ ان پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ یہ آپ کا زندہ جاوید کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ درجہ عالیہ اور خلعت صدیقیت سے آپ کو نوازے آمین باقی اپنا حال تو یہ ہے۔

ٹکڑے چُن چُن اُوہدی تقریر والے

اُستاد دامن

گل دی گل، بُخاری جی پیا جیوندا سی
جہدی اَج پئے برسی مناؤندے نیں
ٹکڑے چُن چُن اوہدی تقریر والے
جھوم جھوم کے سارے سناؤندے نیں
باپو سِہک مویا، باسی ٹکڑیاں توں
پُتر پُوڑیاں دان کراؤندے نیں
جیوندی جان رہیاں لیراں تَن اُتّے
مویاں بعد پئے چادر چڑھاؤندے نیں
جیوندی جان نہ کوٹھڑی رہن لئی سی،
مویاں بعد مقبرے بناؤندے نیں
جیوندی جان سُکھ چَین نہ لین دِتّا
مویاں بعد درود پڑھاؤندے نیں
دانش وراں نوں سدا خوار کر دے
بُھکھا مار دے سُولی چڑھاؤندے نیں
اپنے کیتے تے کدے نہ شرم آئی
ڈُب مرن، نئے نہ پچھتاؤندے نیں

تحریکِ خلافت و ترک موالات

(۱۹۱۹ء.....۱۹۲۳ء)

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ .....اور حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

قدم بہ قدم شانہ بشانہ

ایک تاریخی دستاویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لاتھنو اولا تحز نوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

مت بے دل ہو اور مت غم کھاؤ کیونکہ تم ہی تو دنیا میں بلند مرتبہ ہو اور تمہارا ہی بول بالا ہوگا۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم مومن بنو۔

نبیرہ حضرت خواجہ شمس الملۃ والدین رحمہ اللہ تعالیٰ

یعنی

جناب حضرت مولانا پیر محمد ضیاء الدین صاحب قبلہ ادام اللہ برکاتہم

سجادہ نشین سیال شریف

کا

اعلان واجب الاذعان

وابستگان حضرت خواجہ سیالوی رحمۃ اللہ علیہ اور تمام مسلمان بیدار ہوں۔

باہتمام شیخ رائے شوق محمد پرنٹر شوق الیکٹرک پریس لاہور۔

تحریک خلافت، تحریک ہجرت، تحریک ترک موالات، تحریک عدم تعاون وغیرہ۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے بہت اہم، بہت ہنگامہ خیز اور بہت فیصلہ کن...... واقعاتی تسلسل اور پیچ در پیچ سلسلے پر مبنی، ایک خاص دور کی نمائندہ تحریکات ہیں۔ ان تحریکات میں عشق بلاخیز کے قافلہ ہائے سخت جاں، کن مرحلوں اور کن منزلوں سے گزرے...... یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔ لیکن ...... تفصیلات سے قطع نظر، ایک بات بہت واضح ہے کہ مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ، جسے مذہبی پیشوائیت، مشیخت و روحانیت اور نیابت و خلافت رسول ﷺ کا دعویٰ رہا ہے...... اکثر و بیشتر اس قسم کی تحریکات سے دور دور ہی نہیں ناخوش و بیزار بھی رہا ہے۔ اس کا بڑا سبب، یقیناً عیش و راحت و آرام کے وہ اسباب ہیں جو دشمن اسلام و مسلمین...... سامراج کی جانب سے "تجویز" کیے جاتے رہے اور حضرات سجادہ نشینان و مشائخ عظام کی جانب سے "جائز" گردانے جاتے رہے ہیں۔

پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۱۴ء) کے دوران، ترکی کی خلافت اسلامیہ کے مقابلے میں برطانوی سامراج کی مسلم کش جارحیت کو مالی، افرادی اور روحانی طور پر "مضبوط" بنانے کی "سعادت" اسی طبقۂ سجادہ نشیناں کے حصے میں آئی۔ اور جب جنگ جیتنے کے بعد، فتح کے نشہ میں بدمست برطانیہ، ترکی کے مملکتی وجود و تشخص کو ختم کرنے کے درپے تھا تو فرنگی خانقاہ کے یہ سب درویش بصد عجز و نیاز ہندوستان کے لئے سلطنت برطانیہ کو "ابر رحمت" قرار دے رہے تھے اور ترکوں کی "کوتاہ اندیشی" پر اظہار تأسف کر رہے تھے سرمائیکل اڈوائر (گورنر پنجاب) کی خدمت میں پیش کیا گیا سپاسنامہ اس سلسلہ میں "مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری" کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ.... توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری۔ اسکے مصداق، تحریک خلافت کے انہی ایام میں پنجاب کے عظیم روحانی مرکز سیال شریف سے زیب سجادہ، حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمتہ اللہ علیہ کی صدائے حق بلند ہوئی۔ اور پنجاب کے طول و عرض میں صور اسرافیل بن کر گونجی۔ دنیا نے دیکھا کہ سیال شریف کی تائید بیک وقت گولڑہ شریف سے بھی ہوئی اور دارالعلوم دیوبند سے بھی۔ حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ...... ہر سہ علمی و روحانی مراکز سے ربط خاص رکھتے تھے۔ اور حضرت خواجہ سیالوی کے اس مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی ہر ہر قدم پر تائید و نصرت فرما رہے تھے۔ اسی دور میں حضرت امیر شریعت نے اپنے ذاتی اہتمام سے، یہ کتابچہ شائع فرمایا اور اس کا ابتدائیہ بھی بقلم خود رقم فرمایا۔ تاریخی اہمیت کا حامل یہ کتابچہ ہمیں مولانا سعید الرحمن علوی رحمتہ اللہ علیہ (م..... ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۴ء) کے توسط سے میسر آیا۔ مولانا نے لکھا تھا۔

مورخہ ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۴ مارچ ۱۹۹۳ء کو محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کے پاس جانا ہوا، انہوں نے ازراہ عنایت یہ تحریر عطا فرمائی جو ان کے پاس بشکل فوٹو تھی۔ احقر، اس سے ایک نقل لے کر برادر عزیز سید کفیل شاہ سلمہ کی نذر کر رہا ہے کہ وہ اس کے اصل حقدار ہیں...... احقر محمد سعید الرحمن علوی...... ۲۰ رمضان ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء۔ ۳۔ ۱۵

حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ

التماس

۱۹۲۰ء کی ایک یادگار تحریر

پہلی دوسری رجب المرجب ۳۹ھ کو سیال شریف ضلع شاہ پور حضرت خواجہ شمس الملت والدین رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر حسبِ دستور مجلس عرس منعقد ہونے والی تھی۔ مریدین و معتقدین دور دور سے حاضر ہونے والے تھے کہ یکایک میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس نازک وقت میں جبکہ مسلمان دنیا سے مٹائے جا رہے ہیں اور اسلام کی تذلیل کی جا رہی ہے۔ فراعنۂ یورپ اپنی مادی طاقتوں کے نشے میں بدمست ہو کر ننگ و ناموس اسلام کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ عراق، عرب، بصرہ و بغداد پر برٹش قبضہ ہو چکا ہے۔ بیت المقدس پر ہلالی علم کی جگہ پر صلیبی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ ایا صوفیہ کی مسجد کو گرا کر گرجا گھر بنانے کی تجویزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ خلیفتہ المسلمین قید فرنگ کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ ان کی بہو۔ مثلاً شہزادہ توفیق آفندی کی بانوئے محترم، گھر سے گھسیٹی جا چکی ہیں۔ سمرنا میں لاکھوں کلمہ توحید کے امانت دار بھوکے پیاسے مر رہے ہیں۔ سلیشا میں رسول اللہ ﷺ کی امت بہت بے عزت کی جا رہی ہے۔ اور وہ لوگ جنہیں اسلام اور فرزندانِ اسلام سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ایک خدا کے ماننے والوں کے ننگ و ناموس کو صرف اس جرم میں کہ وہ مسلمان ہیں برباد کر رہے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کا لائق فرزند جرنیل وینگیسٹ سابق کمشنر مصر اپنے دیگر برطانوی افسروں کی نصرت و اعانت سے اللہ اور اس کے رسول پاک کے گھروں یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ پر چڑھائی کر کے ان کو فتح کرنے کا فخر حاصل کر چکا ہے۔ بجائے اس کے کہ عامتہ الناس کو مخاطب کر کے اور ایک ایک دیہات میں دربدر ہو کر پنجاب کے ان غفلت شعار مسلمانوں کو جن کی کمائی برٹش گورنمنٹ کی نصرت و اعانت میں گولیاں بن کر مظلوم و بے گناہ ترکوں کے توحید پرست سینوں کو چھاڑ رہی ہے۔ اور جن کے ناپاک ہاتھ پیارے نبی کے سبز گنبد کے محافظوں کو ناحق ذبح کر کے برٹش گورنمنٹ کے صلیبی جھنڈوں کو بلند کرنے میں پوری قوت صرف کر کے اپنا ٹھکانا جہنم بنا رہے ہیں.........

بیدار کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ یہ کیا کر رہے ہو، خدا کے لئے جاگو اور پچھلے گناہوں سے توبہ کر کے سچے مسلمان بنو اور ترکِ موالات (نامل ورتن) پر عمل پیرا ہو کر برٹش گورنمنٹ سے ہر قسم کے نصرت و اعانت کے تعلقات قطع کر دو۔

مناسب یہ ہے کہ پنجاب کے ان مشایخ اور سجادہ نشینوں سے جن کے قبضہ میں لاکھوں انسانوں کے قلوب ہیں اور جنہیں نیابت و خلافت رسولِ علیہ السلام کا دعوی ہے۔ اور جن کی روحانیت سے سرمائیکل اوڈوائر نے مستفیض ہو کر پنجاب سے خراجِ تحسین وصول کیا، کہا جائے کہ حضرت! آپ کی نیابت و خلافت مسلمانوں کے کس دن کام آئے گی؟ خدارا! اٹھیئے اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کیجئے اسلام پکار رہا ہے۔

پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

الغرض اس خیال نے مجھے ۲ رجب المرجب کو سیال شریف پہنچا دیا اور آتے ہی مجھے جناب سجادہ نشین حضرت مولانا محمد ضیاء الدین صاحب متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ کی قدم بوسی نصیب ہوئی۔ آپ نہایت تواضع سے پیش آئے اور بڑی عزت افزائی فرمائی۔ اس کے بعد معاملات حاضرہ پر گفتگو شروع ہوئی۔ آپ کے خیالات کو سن کر ایمان تازہ ہوا۔ آپ اور حاضرین مجلس کی ایک عجیب حالت تھی۔ آپ نے عدم تعاون، ہجرت اور ترکِ موالات پر اس بے باکی اور جرأت ایمانی سے گفتگو فرمائی کہ بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی تھی کہ خداوند اس پیرِ جواں بخت و جواں سال کو مسلمانوں کے سروں پر بہت دیر تک سلامت رکھے۔ حتیٰ لیکون الدین کلہ للہ

پھر آپ نے اپنی اس تقریر کی نقل جو آپ نے پہلی رجب المرجب کو ایک غیر معمولی جلسہ میں کی تھی مجھے عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ میرے اس اعلان کو چھپوا کر تمام ملک میں پہنچا دو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے پہلے بھی علماء نے خطبوں اور رسالوں میں مسائل حاضرہ پر تحریریں شائع کی ہیں۔ لیکن یہ اعلان اپنے رنگ میں اپنا، آپ ہی جواب ہے۔ اس قدر مختصر اور اتنا مدلل ہے کہ سبحان اللہ! کلام الملوک ملوک الکلام۔ جناب نے اس سے پہلے ۱۹ مارچ ۲۰ء کو دوسرے یومِ خلافت کے دن بھی ایک ایسی ہی زبردست تقریر فرمائی تھی۔ جو کسی قدر اختصار کے ساتھ اخبار "المنیر" جھنگ میں شائع ہوئی تھی۔ حسنِ اتفاق سے وہ پرچہ بھی مجھ کو مل گیا چنانچہ پہلے ۱۹ مارچ ۲۰ء والی تقریر اور بعد میں یہ تازہ اعلان اور اس کے بعد جناب حضرت پیر حافظ عبداللہ صاحب برادرِ عزیز جناب سجادہ نشین صاحب قبلہ کی دو ایک نظمیں جو جناب حافظ صاحب نے مختلف مواقع پر پڑھیں، ہدیہ ناظرین کر کے خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ!

جو عدوئے باغ ہو برباد ہو
چاہے وہ گل چیں ہو یا صیاد ہو

خادم ملک و ملت
المتوکل باللہ الباری السید عطاء اللہ البخاری
متوطن موضع ناگڑیاں
ضلع گجرات (پنجاب)

قبلہ محمد ضیاء الدین صاحب سجّادہ نشین سیال شریف کی

خلافت پر زبردست تقریر (۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء)

۱۹ مارچ کو دوسرے یومِ خلافت کے دن حضرت سجادہ نشین صاحب سیال شریف نے دورانِ وعظ میں تحمید و صلٰوۃ کے بعد آن گنت حاضرین مسلمین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

اے حاضرین کرام! آج جمعہ کا دن ہے جس کو خداوند کریم نے مسلمانوں کے لئے عید کا دن مقرر کیا ہے۔ مگر آج کا جمعہ یوم التغابن ہے۔ اس کو مسلمانانِ ہند نے یوم خلافت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس لئے آج کا جمعہ ہمیشہ کے جمعہ سے نرالا ہے۔ اس میں مسئلہ خلافت پر تقریریں ہوں گی۔ اور جابجا جلسے ہوں گے۔ اور بقاء اسلام کے لئے بہ رگاہ رب العزت دعاء والتجا کی جائے گی۔ اور مسلم آبادی یک دل و زبان ہو کر اپنی مجازی حکومت کو ضروریات خلافت اسلامیہ و اتحاد اسلام سے بالدلائل مطلع کرے گی۔ اور یہ بات گوش گزار کرے گی کہ اسلام بجز بقائے خلیفۃ المسلمین کے قائم نہیں رہ سکتا۔ فقیر کے دل میں بھی یہ خیال آیا کہ آج کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں سامعین کی سمع خراشی کی جائے اور اس خیال فاسد کو حرف غلط کی طرح عوام کے صفحہ دل سے مٹا کر نسیاً منسیا کر دیا جائے کہ فقراء میں (جس سے بالعموم سجادہ نشین و متولیانِ خانقاہ مراد لئے جاتے ہیں) محبت اسلام کی نہیں ہے۔

یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے کہ وہ اخباری دنیا میں قدم نہیں رکھتے اس میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی ہیں کیونکہ وہ اشتہاری دوا فروشوں اور لیڈروں کی طرح اپنا نام پیدا کرنا نہیں چاہتے۔

مگر فی الاصل بقول حافظ

بزیر دلق مرقع کمند ہا دارند

دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بین

اس فرقہ کو ایک عضو معطل سمجھنا سخت غلطی اور نادانی ہے۔ انتظام عالم میں جتنا تصرف یہ گوشہ نشین رکھتے ہیں اتنا امور مملکت میں خسروانِ نامدار، شہنشاہانِ کامگار بھی نہیں رکھ سکتے۔ اسلام کی خدمت جس قدر اس زمرہ بے شور و شر و بے روو ریائے کی ہے۔ یار تو بجائے خود رہے اغیار کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ مگر اب خاموشی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ جب سے سابقہ لاٹ صاحب سر مائیکل اڈوائر نے وہ اڈریس حاصل کیا جس پر نمائندگان سجادہ نشیناں اور خود سجادہ نشینوں کے دستخط تھے۔ اس دن سے جو خیال عام مسلمانوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی نسبت پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ازالہ کے لئے کل سجادہ نشینوں کو چاہیئے کہ وہ گورنمنٹ کو مطلع کر دیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا پسند کرتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اور امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین نائب الرسول کی عزت و وقار میں ذرہ بھر بھی فرق آنے سے ہمارے دلوں پر سخت صدمہ ہو گا۔

پہلے ہم اس عالمگیر جنگ کو سیاسی اور ملکی قرار دیتے تھے مگر اب انخلائے دارالخلافہ قسطنطنیہ دانیال و باسفورس وغیرہ یعنی یورپی روم (جو جنگ میں غیر مفتوح رہا ہے) کے متعلق ایجی ٹیشن پادریان یورپ اور ان کے ہم خیالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ صلیبی اور مذہبی جنگ تھی کیونکہ فاتح بیت المقدس کو وزیر اعظم برطانیہ نے تمغہ پہناتے وقت فاتح کروسیڈ کا خطاب عطا کیا۔ اور جو بحث دارالعوام لندن میں ۲۶ فروری کو ترکی کے مستقبل کے متعلق ہوئی تو اس میں جو وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ترکوں کے اخراج قسطنطنیہ کی جو تحریک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ کسی حد تک مسیحیت کے قدیم احساسات پر مبنی ہے جو ہلال کے بر خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنی جماعت کو تسلی دیتے ہوئے یہ کہا کہ ترکوں کو یہ سزا دی جائے گی کہ ان کی نصف سے زیادہ سلطنت قطع کر دی جائے گی اور ان کا دارالسلطنت اتحادی اتواپ کی زد میں ہو گا۔ اسے فوج اور بیڑے اور عظمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ اور بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کا درمیانی راستہ جس سے ترکوں کو دنیا کی کونسلوں میں حقیقی اختیار سے محروم کر دیا جائے گا۔ اور وہ آئندہ عیسائیوں کے مقدمات طے کرتے ہوئے اتحادی توپوں کے دباؤ میں دستخط کریں گی۔

اور ایک دوسرے مہربان جو مزدور جماعت کے سرگروہ ہیں یعنی مسٹر ایڈمرن وہ ترکوں کو قسطنطنیہ میں رہنے کی سفارش تو کرتے ہیں مگر پاپائے روم سا بنا کر، وہ لکھتے ہیں۔

مذہبی مشکلات اس صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ خلیفۃ المسلمین کو پاپائے روم کی طرح تمام دنیاوی قوتوں سے محروم کر کے قسطنطنیہ میں رہنے کی اجازت دی جائے۔

الغرض جتنے منہ اتنی باتیں باستثنائے چند تمام ممبران پارلیمنٹ......... کیا مذہبی پیشوا اور کیا مدبرین مملکت سب ترکوں کے خلاف بول رہے ہیں اور جن لوگوں نے سبز باغ دکھا کر اور وعدہ تحفظ مقاماتِ مقدسہ دلا کر اور جنگ کو غیر ملک گیری جنگ بتلا کر مسلمانوں سے ہر طرح کی امداد لی۔ آج وہی وعدہ کنندگان اپنے وعدوں سے انحراف کر رہے ہیں۔ اور اپنے وعدوں کی بعید از خیال و فہم توجیہیں گھڑ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے گھروں کو اپنے ہاتھ سے تباہ کیا ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خدا جس قوم کی عقل سلب کر لیتا ہے اس سے ایسے ہی کام ہوا کرتے ہیں۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ کسی قوم کو تباہ و برباد نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی بربادی کے سامان خود مہیا نہ کرے۔ یعنی اعتقاد اور نیت جب تک نہ بدلے اللہ پاک کی دی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی۔

اب اس مطلب کو مسلمان اپنی گورنمنٹ کے گوش گزار کریں کہ ہمارا خلیفۃ المسلمین پاپائے روم کی طرح ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پاپائے روم ان کا جانشین ہے جن کی یہ تعلیم ہے۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم کو یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ تیری داہنی گال پر طمانچہ مارے تو دوسری بھی اس کی طرف پھیر دے۔"

(متی ۵- باب ۳۸، آیت ۳۹)

مگر جیسے کہ ہمارے نبی عربی فداہ امی وابی مثیل موسےٰ تھے ایسے ہی ان کے جانشین و خلیفہ مثل خلفاء و جانشیانِ موسےٰ سے باحشمت و باجبروت ہونے چاہیئیں۔ جیسا کہ موسے علیہ السلام شریروں اور مفسدوں کی گوشمالی کے لئے مامور من اللہ تھے۔ موسے علیہ السلام کے خلفاء کی طرح اللہ تعالی نے مسلمانوں کو خلافت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا اور جیسا کہ بنی اسرائیل کے خلیفہ بنائے گئے تھے وہ احکام شریعت موسوی جاری کیا کرتے تھے۔ مثلاً یوشع بن نون اور قاضی، اور ساؤل، اور داؤد اور سلیمان بن داؤد علیہم السلام وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی محمدی شریعت کے جاری کرنے والے مسلمانوں میں خلیفہ ہونے چاہیں اور بفضلِ خدا آج تک ایسے ہی خلفاء خود مختار باخیل و حشم اسلام میں ہوتے رہے ہیں۔ اور اس وقت امیر المؤمنین و خلیفۃ المسلمین نائب رسول الثقلین سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان سلطان البر والبحرین خادم الحرمین الشریفین سلطان وحید الدین خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ،........ مسند آرائے سریر خلافت میں اگر ان سے کوئی علاقہ جو جنگ سے پہلے ان کے ماتحت تھا اب چھینا جائے تو ہمارے دلوں کو سخت صدمہ ہوگا۔ اس واسطے ہم صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اپنی گورنمنٹ کے کانوں تک اس غم و رنج کو پہنچاتے ہیں کہ صلیبی جنگ لڑ کر اور آزادی کے خوش کن لفظ سنا کر ہم سے اسلامی ملک چھینے جا رہے ہیں۔ اور ہماری صدائے احتجاج کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ جیسا کہ کئی ایک مدبرین انگلستان کہہ رہے ہیں کہ ہندوستانیوں کو انخلائے قسطنطنیہ و تجزیہ ترکی کا کوئی صدمہ اور احساس نہیں۔

اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ یا ہم مسلمان بنیں اور مسلمانوں کی آواز گورنمنٹ کے کانوں تک پہنچائیں یا اسلام سے قطع تعلق کر کے علیحدگی قسطنطنیہ کا جشن منائیں جو شخص اس وقت اپنی صاف بیانی سے حکامِ وقت کی خدمت میں باوازِ بلند یہ نہ کہہ دے کہ اگر ہمارے اسلام پر حملہ کیا گیا، یا اسلامی جھنڈا کے خلاف صلیب بلند کی گئی۔ (جیسا کہ بعض کارٹونوں سے اس کا اظہار ہو چکا ہے) تو یا ہم مسلمان رہ سکیں گے یا وفادار........ تو وہ شخص یا منافق ہوگا یا دھوکہ باز۔ جس کی وجہ سے وہ پبلک اور گورنمنٹ کے لئے نہایت ہی خطرناک ہوگا۔ شارع صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم حجۃ الوداع کے دن اپنی امت کو یہ تھی کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہو کر رہیں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام آئیں خواہ کہیں بھی ہوں اور یک دوسرے کو اسلام پر ثابت قدم رہنے کی فہمائش کریں۔

اب مخلصاد عا بدرگاہ قاضی الحاجات یہ ہے کہ وہ اپنے اسلام اور خلیفۂ اسلام کا ہر حال میں حامی و ناصر ہو۔ آمین ثم آمین۔

منقول از اخبار ''المنیر'' جھنگ

۲۴ مارچ ۱۹۲۰ء

تقریر مولانا مولوی محمد ضیاء الدین صاحب ادام اللہ برکاتھم

جو انہوں نے بموقع عرس شریف بمقام سیال شریف مجمع کثیر کے سامنے پڑھی

الحمدللہ نحمده و نستعینہ و نستغفره ونؤمن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّأت اعمالنا من یہده اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحده لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا محمداً عبده ورسولہ الذی ارسلہ بالہدی ودین الحق لیظہره علی الدین کلہ وکفیٰ باللہ شہیداً۔ محمد رسول اللہ والذین معہ اشدّاء علی الکفار رحماء بینہم تراہم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً۔ سیما ہم فی وجوہہم من اثر السجود ذالک مثلہم فی التوراۃ و مثلہم فی الانجیل کزرع۔ اخرج شطأہ فازره فا ستغلظ فاستویٰ علی سوقہ یعجب الزراع لیغیض بہم الکفار وعداللہ الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت منہم مغفرۃ واجراً عظیماً۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم یا ایہا الذین آمنوالا تتخذوالیہود والنصاری اولیاء بعضہم اولیاء بعضؐ ومن یتولہم منکم فانہ منہم ان اللہ لایہدی القوم الظالمین۔ فتریٰ الذین فی قلوبہم مرض یسارعون فیہم یقولون نخشی ان تصیبنا دائره فعسی اللہ ان یاتی بالفتح اوامرمن عنده فیصبحوا علی ماا سروا فی انفسہم نادمین۔ ویقول الذین آمنو ہؤلاء الذین اقسموا باللہ جہد ایمانہم انہم لمعکم حبطت اعمالہم فاصجواخسرین۔ یا ایہاالذین آمنو من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبہم ویحبونہ اذلّۃ علی المؤمنیؔن اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لو مۃ لائم ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ واسع علیم انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنو الذین یقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکوۃ وہم راکعون۔ ومن یتول اللہ ورسولہ والذین آمنو فان حزب اللہ ہم الغالبون۔ (پ ٦ المائده ع ٨)

پوشیده نہ رہے کہ یہ کلام ربانی جو آپ لوگوں پر پڑھی گئی ہے سوره مائده کا آٹھواں رکوع ہے۔ خلاصہ مطلب اس کا یہ ہے کہ مومنوں کو حق تعالی نے یہود و نصاری کی محبت اور مودت اور نصرت اور اعانت سے منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا ہے جو ان کا دوست ہو وہ انہی میں سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو تہدید فرمائی ہے۔ پھر ان لوگوں کو تہدید فرمائی ہے جو تحریک ترک موالات کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ تحریک بار آور نہ ہوئی تو رہا سہا اعتبار بھی چلاجاوے گا۔

فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ غیب سے فتح و نصرت اور امداد اسلام کے اسباب مہیا کرے گا۔ اس وقت یہ لوگ نادم اور شرمسار ہوں گے۔

اور آگے چل کر ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ تمہاری راہ و رسم سے پھر کر کفار سے جا ملتے ہیں تم اس سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ عنقریب خدا ایک قوم کو لائے گا جو خدا سے عجز و نیاز رکھتے ہوں گے۔ اور خدا تعالیٰ ان سے محبت رکھے گا۔ ان کی نشانی بھی فرمادی ہے کہ وہ مومنوں سے نہایت ہی تواضع سے پیش آئیں گے اور کفار پر زبردست ہوں گے اور وہ کسی کی ملامت سے خوف بھی نہیں کھائیں گے۔ تمہارا دوست خدا ہے اور رسول اور وہ مومن جو کفار سے ترک موالات کرتے ہیں اور خدا کے کل احکام کی پابندی کرتے ہیں اور جو تم میں سے کفار کی موالات ترک کر کے خدا اور رسول کی دوستی اور مومنوں کی دوستی پسند کرے وہی غلبہ میں رہیں گے اور کامیاب رہیں گے کیونکہ خدا کا شکر ہمیشہ کامیاب اور غالب رہتا ہے۔

اس موقع پر میں آپ لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرانی چاہتا ہوں کہ ترک موالات کیا چیز ہے اور ترکِ معاملات کیا ہے اور اس وقت اس کی سخت ضرورت کیوں لاحق ہوئی ہے۔ یہ بات تو علماء ہند خصوصاً مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا غلام معین الدین اجمیری ادام اللہ برکاتہم کی تصانیف سے بخوبی واضح ہو چکی ہے۔ اس جگہ ان کی تشریح تحصیل حاصل ہے۔ میں تو اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو یہ جتا دینے کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ میں جمیعت علماء ہند کے فتوے کی حرف بحرف تصدیق کرتا ہوں اور اس پر کاربند ہوں اور آشناؤں کو بھی اس کی ترغیب دیتا ہوں اور اس فتوے سے شاید ہی کوئی فرد اسلام بے خبر ہو۔ مگر ہمارا ملک پنجاب خصوصاً شاہ پور عام طور پر اسلامی تحریکوں سے بے خبر رہتا ہے۔ ان کی آگاہی کے لئے مختصراً وہ فتوے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

"جمیعت علماءِ ہند کا یہ اجلاس کامل غور کے بعد مذہبی احکام کے مطابق اعلان کرتا ہے کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ کے ساتھ موالات اور نصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنے حرام ہیں۔ اس کے ماتحت حسبِ ذیل امور بھی واجب العمل ہیں۔

۱۔ خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑ دینا۔
۲۔ کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لئے رائے نہ دینا۔
۳۔ دشمنانِ دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانا۔
۴۔ کالجوں اور سکولوں میں سرکاری امداد قبول نہ کرنا اور سرکاری یونیورسٹیوں سے تعلق قائم نہ رکھنا۔
۵۔ دشمنانِ دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہنچانا۔
۶۔ عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانا اور وکیلوں کے لئے ان مقدمات کی پیروی نہ کرنا۔

صاحب! اس فتوے کو وہ شخص ناقابل برداشت کہہ سکتا ہے جس کے دل میں ایمان اور اسلام کی ذرا

بھی قدر نہ ہو۔ فقیر نے بارہا اپنے آشناؤں کو اسلامی اصول کے ماتحت اس فتوے کی طرف توجہ دلائی اور اب بصورت اعلان ہر ایک خاص وعام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جو شخص فوج اور پولیس میں ملازم ہو۔ تو اس سے فقیر کا کوئی تعلق نہیں اور نہ اس کو فقیر سے کوئی تعلق ہونا چاہیئے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ وہ ملازمت چھوڑیں یا نہ چھوڑیں۔ یہ ان کے ضمیر اور ایمان پر چھوڑا گیا ہے اور آئندہ کوئی فوجی اور پولیس مین کوئی نذرانہ کسی قسم کا فقیر کے پیش نہ کرے کیونکہ وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ بنا

علی قولہ تعالی...... ومن یتولهم منکم فانّہ منهم۔

ترجمہ:۔ اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا وہ انہیں میں سے ہوگا-------- اور چاہیئے کہ کوئی آدمی فوجی ہو یا پولیس کا فقیر سے بیعت نہ کرے۔ کیونکہ اس کو بیعت نہیں کیا جائے گا۔ بناء

علی قولہ تعالی........ ضرب الله مثلاً رجلاً فیہ شرکاء متشاکسون۔

اور نیز متابعت حضرت خواجہ بزرگ ہند الولی خواجہ شیخ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے اسرار اولیاء ملفوظ حضرت خواجہ فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ مؤلفہ حضرت خواجہ بدر الدین اسحاق رحمتہ اللہ علیہ ترجمہ فرمایا گنج شکر نے کہ!

ایک وقت ایک مسلمان ملازم معاندین اسلام کا، مرید ہونے کے لئے شیخ معین الدین علیہ الرحمتہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن خواجہ نے اسے بیعت نہ کیا۔ اس شخص نے جا کر اپنے آقا معاند اسلام کے پاس شکایت کی تو اس نے اپنے آدمی خواجہ صاحب کے پاس بھیجے کہ آپ اسے مرید کیوں نہیں بناتے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ یہ شخص تیرا ملازم ہے۔ اور جو شخص بے گانہ کے آگے سر جھکائے ہم اسے کلاہ نہیں دیتے اور مرید نہیں کرتے۔ اگرچہ اس قسم کے اعلانات اس جبر و استبداد کے زمانے میں تکلیف میں پڑنے کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ مگر....... واللہ احق ان تخشاہ....... اللہ تعالی زیادہ حقدار ہے کہ تو اس سے ڈرے۔ دنیوی چند روزہ عیش وارام کے بدلے عقبی کی لامتناہی وابدی نعمت کو کھو دینا حماقت اور ضلالت نہیں ہے تو اور کیا ہے بقول شیخ سعدی

مبادا دل آں فرو مایہ شاد
کہ از بہر دُنیا دہد دیں بباد

.... دوسرا اتمام حجت کے لئے ہر مرشد، پیر و سردار کو لازم ہے کہ اپنے مرید اور رعایا کو امر معروف و نہی عن المنکر کرے تاکہ فردا قیامت کو شرمسار نہ ہونا پڑے جب خدا کے رُو بُرو دوزخی کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی۔ انہوں نے ہم کو گمراہ کیا۔ پس کہیں گے اے اللہ! ان کو دگنا عذاب دے اور ان پر لعنت بھیج۔ تو اس دن کہہ سکیں کہ اے خدا ہم نے تیرے پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیے مگر انہوں نے نہیں مانا۔ وما علینا الا البلاغ

پیروں کو ایسا نہیں چاہیئے کہ مردہ خواہ بہشت میں جاوے یا دوزخ میں۔ ان کو حلوے مانڈے سے کام ہو۔ بلکہ امر معروف و نہی عن المنکر ہر وقت کریں۔ یہی اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ کنتم خیرامتہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی امتوں کے علماء اور مشائخ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ انہوں نے امر معروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

لولا ینھٰھُم الربا نیوّن والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحتَ لبئس ماکانوا یصنو عون۔

ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے کیوں نہیں منع کرتے۔ واقعی ان کی یہ عادت بری ہے۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا آگے آپ کا ایمان

مرادِ ما نصیحت بودو گفتیم
حوالت باخدا کردیم و رفتیم

فقیر محمد ضیاء الدین عفا اللہ عنہ (۲ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ)

عقیدت مندانِ دربار سیال شریف کے لئے ہدایت [1]

برادرانِ ملت و عزیزانِ طریقت! جو مظالم اس مظلم دور میں اسلام اور مسلمانوں پر ٹوٹ رہے ہیں ان کو سن کر ایک سچا مسلمان ہی نہیں بلکہ ہر انصاف پسند دل لرز جاتا ہے۔ خلافت اسلامیہ جس کا قیام و بقاء مذہبی نقطہ نظر سے ایسا ہی ضروری ہے جیسے جاندار کے لئے روح، پنجہ عیسائیت میں گرفتار ہے۔ جزیرۃ العرب جس کی نسبت ہمارے آقائے نامدار حضور اقدس ﷺ کی آخری وصیت تھی کہ

اخر جوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب۔

اعدائے اسلام کا لُعبَت گاہ بن گیا ہے۔ کلمہ حق کی آواز نکالنے والے فدایانِ ملت و قوم جیل خانوں کی کوٹھڑیوں میں دست و پا بہ زنجیر ہیں۔ سمرنا میں ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ بے کس بھوکوں جان دے رہے ہیں۔ جن کے مربی اور سرپرست حمایت حق پر نثار ہو گئے اور محض اس جرم میں کہ توحید حق کا نعرہ بلند کرنے والے تھے تیغ تثلیث کی نذر ہو گئے۔

وما نقموا منھم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید۔ (پ ۳۰ البروج آیت ۸)

ان واقعات کو سن کر کس مسلمان کا کلیجہ ہے کہ پانی نہ ہو جائے اور کون سی آنکھ ہے۔ جو آنسوؤں کے دریا نہ بہائے۔ حقیقت میں ان واقعات نے مسلمانوں کو اپنے بھولے ہوئے فرائض کا زریں سبق دیا

---

(۱) حضرت امیر شریعت کے شائع فرمودہ کتابچے میں یہ "ہدایت" شامل نہیں تھی۔ یہ الگ سے حضرت خواجہ سیالوی کی طرف شائع کی گئی تھی۔ تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

ہے۔ اور یہ خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کے لئے تازیانہ غیبی ہے۔ ہمیشہ سے اور اس نازک وقت میں ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اپنی ہر ممکن کوشش سے حمایت اسلام اور اپنے مظلوم بھائیوں کی دستگیری کرے۔ اس لئے فقیر اپنے عزیز آشناؤں کو خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاتا ہے کہ وہ مطالبات اسلامی پورا کرانے کی طرف اپنا گامِ عمل تیزی کے ساتھ بڑھائیں اور دنیوی اعزاز و جاہ (جو چند روزہ ہے) کے بدلے خدائے ذوالجلال اور رسولِ عربی فداہ ابی واُمی کی خوشنودی کی دائمی عزت حاصل کریں۔ معاندین اسلام کے ساتھ تمام تعلقات نصرت و حمایت کو ترک کر دیں۔ اور علمائے کرام کے متفقہ فتوے پر عمل پیرا ہوں۔ مظلومین سمرنا......... جہاں یتیم بچے لاوارث عورتیں بھوک کے مارے داعیِ اجل کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ ان کی مالی امداد میں نہایت فراخ دلی سے حصہ لے کر مستحق رحمت ایزدی ہوں۔ کیا عجب ہے کہ اس نیک کام کی بدولت تمہارے سابقہ گناہ محو ہو جائیں اور جورو سیاہی اور ظلمتِ قلبی حمایت و نصرتِ اعدائے دین کی وجہ سے تم پر چھا چکی ہے۔ دُھل جائے۔ ان الحسنات یذھبن السیّات۔

میرے عزیزو کیا تمہارے مسلمان دل اس کو گوارا کر سکتے ہیں کہ تم اونچے اونچے محلات میں چین اڑاؤ۔ صبح و مساء متعدد کھانے پہنچ جائیں اور تم خوشی سے ان کو نوشِ جان کرو۔ اور ادھر اسلام کے ننھے بچے اور بے کس عورتیں ایک لقمہ کی حسرت میں جان دے دیں۔ تمہارے گھروں میں غلہ کے انبار اور خزانوں کے خزانے دفن پڑے ہوں۔ لیکن ان اسلامی پودوں کے لئے تم اپنی جیب سے ایک پیسہ صرف نہ کرو اگر واقعی تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے تو تف تمہارے اسلام پر! قیامت کے دن حضور اقدس ﷺ کے سامنے جب اسلام اور اس کے مظلوم افراد فریادی ہوں گے کہ یارسول اللہ کفار نے تو ہم پر ظلم توڑے لیکن ان مدعیانِ اسلام نے بھی انہیں کا ساتھ دیا اور ہماری کچھ خبر گیری نہیں کی تو اس وقت تم کیا جواب دو گے۔ اگر آپ حضرات صرف بیجا اسراف و لایعنی مصارف ہی کو چھوڑ دیں تو ان مظلومین کی کافی امداد ہو سکتی ہے۔ زکواۃ و عشر ہی سے اگر امداد کی جائے تو ان کو بس کرتا ہے جس کا اصلی و اہم مصرف ایسے ہی مظلومین ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان ہدایات پر میرے عزیز آشنا عملی طور پر کاربند ہوں گے اور سعادت دارین حاصل کریں گے۔ جو صاحب، مظلومین سمرنا کے لئے رقم ارسال کرنا چاہیں وہ یا تو فقیر کے پاس بھیجدیں تاکہ یہاں سے مرکزی مجلس خلافت کو روانہ کر دی جائے یا اپنے ضلع کی مجلس خلافت کو یا اس کام پر مامور خدام خلافت میں سے کسی کو باخذ رسید عطا کر دیں لیکن فقیر کو بھی رقم مرسلہ کے متعلق اطلاع دیں تاکہ فقیر بھی ان کے لئے دعاء خیر کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اس فقیر کو بھی کارِ خیر میں حصہ لینے کی توفیق عطاء فرمائی ہے اور اپنی مختصر امداد اور کچھ عزیزوں و آشناؤں کی مدد سے تقریباً چار ہزار روپیہ اس مد میں پیش کئے جا چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے اور زبانی شور و فغاں کی بجائے شاہراہ عمل پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ اللھم آمین بحرمتہ سید المرسلین۔ الداعی: فقیر محمد ضیاء الدین سجادہ نشین سیال شریف۔

نظم

حضرت پیر حافظ عبداللہ سیالوی
برادرِ اصغر حضرت خواجہ ضیاء الدین
سیالوی رحمہ اللہ

مسلمانان دے اتے اج کل ہے مصیبت بھاری — جو تکلیف انہاندے سر تے جانے خلقت ساری

دین اسلام دی اجکل حالت ڈاڈھی نازک ہوئی — لیہر فضل خدا دے با جھوں ہورنہ ساتھی کوئی

سب عیسائیاں رل کے یارو ایڈے ظلم کمائے — جھیڑے وعدے کیتے آہے سارے چا بھلائے

شہ اسلام نوں وچ شہر دے قید انگریزاں کیتا — اس خبرنے ہر کسے دا خون جگر دا پیتا

باقی ملک جو بادشاہ دا سارا ونڈالیو نے — ٹکڑے ٹکڑے کر لیونے کجھ نال خوف کیتونے

ہندوستان دے مسلماناں کہیا انگریزاں تائیں — اسیں تساڈی رعیت آہناں تسیں اساڈے سائیں

اسا تسانوں مدداں دتیاں بندیاں چندیاں سیتی — حکم تساڈے نال اساں نے سر کٹوائے سیتی

اس محنت دے بدلے ہکامنوں عرض اساڈی — ساڈا دین وتجابو ناہیں منت کراں تساڈی

ایڈا ظلم خلیفہ اتے تسیں نہ ہرگز کریو — ترک اساڈے دین دے مالک حیف نہ سر تے دھریو

پر کجھ انگریزاں خیال نہ کیتا کجھ پرواہ نہ کیتی — آخر کار کیتونے ایسویں وجیویں انہاں نیتی

سب علاقے ترکاں کولوں کھوہ لئے عیسائیاں — بخرے حصے کر لیونے جیونکر وڈ قصائیاں

جیہڑا ملک جے ترکاں کولوں ہتھ اینہاندے آیا — رل مل سب عیسائیاں اس وچ ڈاڈھا ظلم کمایا

کرقتل عام عیسائیاں مارے چھوٹے وڈے نڈھے — گاجر مولی وانگوں گھر وچ بال بچے بیٔے وڈھے

کئی یتیم تے کئی رنڈیاں کئی بے وارث ہوئے — کئی نمانے ٹکڑے کارن عاجز ہوکے موئے

جو کجھ سر ترکاں تے گذری محض اسلام دی کارن — پر دین دی کارن سردیون تھیں مسلم مول نہ ہارن

ہن کرو خیال کہاں نال دے دے اے بھراؤ سارے — جنہاں وچ خدائیدے راہیدے سر اپنے چاوا

جنہاں محض اسلام دی خاطر سر اپنا کٹوایا — بھار مصیبت دکھ درد دا سر اپنے تے چایا

جیکر پیچھے بال بھی بھکھے مرجانون انہاندے — حیف ہے دین اساڈے اتے مسلم اسیں ناں دے

چاہیئے رقماں جمع کر کے بھیجو اوہناں تائیں — غازیاں دے وچ نام تساڈا لکھسی اللہ سائیں

گھر اپنے وچ بیٹھیاں ہویاں غازی مرد بن جاسو — غازیاں والے درجے تسیں رب سچے تھیں پاسو

ہمت ہارو مول نہ تسیں مرداں وانگوں آوو — اوہناں غریباں بھکھیاں تائیں رقماں ہی پہنچاؤ

اجکل کل مسلمان ہندو سب اکٹھے ہوئے — مدت اینہاں یتیماں کارن کمراں کس کھلوئے

ہندو بڑی مدد بیٔے کر دے سارا زور لگا کے — تسیں تا آخر مسلم ایہو رکھو قدم ودھا کے

اللہ نال تساڈے ہوسی مدد گار مدامی — خرچ کرو وچ راہ خدا دے جان تے مال تمامی

نظم

مسلمانانِ عالم گشتہ حیراں
دلِ ہریک مسلماں شد پریشاں

چہ ساں دور فلک گردیدہ امسال
تفو برتو بود اے چرخِ ناداں

نمودے ہمرہی با دشمنِ دیں
کہ کردی دینِ حق از ظلم ویراں

ہمہ عیسائیاں اجماع کرودند
نمودہ قید شاہِ آلِ عثماں

کنوں بیکس شدہ ناموسِ اسلام
چو قیدی ہست آں شاہِ مسلماں

نخستیں لائڈ جارج وعدہ کردہ
کہ ترکاں را نخواہم کرد نقصاں

کنوں کردہ ہماں وعدہ فراموش
نمودہ پارہ پارہ ملکِ سلطاں

ممالک چیدہ چیدہ خود گرفتند
گرفتہ باقی ماندہ حصۂ یوناں

ستم ہائے کہ برترکاں نمودند
نہ او را ہست حد و نیست پایاں

ہزاراں خانماں ویراں کردہ
ہزاراں بہر لقمہ گشتہ بیجاں

کنوں جملہ مسلمانانِ عالم
کمر بستہ بہ امدادِ غریباں

ہمہ کس حسبِ طاقت استطاعت
تصدق مے نماید بریتیماں

شدہ واجب بہر مسلم ہمیں کار
کہ سازد مرحمت بازیرِ دستاں

چو ترکاں نیست کس اکنوں پریشاں
بہ بینی شانِ خود پاک سبحاں

گہے بودند ترکاں شاہِ شاہاں
کنوں ہمچوں مساکیں لقمہ جویاں

نمودندے گدایاں را غنی گہ
کنوں ہستند مفلس چوں گدایاں

گہے واساختندے قیدیاں را
کنوں خود ہمچوں محبوسین برنداں

گرفتندے گہے صد خوانِ یغما
کنوں یغما شدہ خود ملکِ اوشاں

گہے مالک ہمہ آلاتِ جنگی
کنوں دو دست خالی چوں اسیراں

گہے ازحکمِ اوشاں جمعہ واجب
کنوں بہر جمعہ محتاجِ فرماں

غرض احوالِ ترکاں گفتنی نیست
فلک برحالِ ایشاں ہست گریاں

اگر اسلام داری اے مسلماں
عنایت کن بہ مسکیناں فراواں

مثالِ "لن تنا لوالبر حتیٰ تنفقو" نہ آخر خواندہ از ورقِ قرآں
نمائی صرف ہر چیزے کہ داری براہِ مالک و غفار و رحمان
خدایا ایں تمنائے عبد ہست کہ باشند اختر اسلام تاباں

نظم

اے ستم گر مجھ کو تونے خستہ و رسوا کیا خانماں ویراں کیا دل کو کیا ناشاد بھی
تیرے گیسو کم نہیں زہریلی گیسوں سے صنم تیغ ابرو نے ترے غارت کیا بغداد بھی
کیوں نہیں رکتا تو اپنے ظلم سے اے بے وفا کچھ تو ہونی چاہیئے اس ظلم کی تعداد بھی
اپنے منہ سے تو حقیقی دوست بن جاتے ہیں وہ پر نہیں دیتے وہ مرنے کے لئے میعاد بھی
یوں تو وہ اب رحم دل خود کو سمجھتے ہیں مگر خونِ ناحق کے لئے کر دیتے ہیں ارشاد بھی
ہم تو تیرے عشق میں ایمان و دولت دے چکے تو بھی اے کافر ذرا کر اپنے وعدے یاد بھی
ہے عبث چشم وفا ان طوطہ چشموں سے عبد ان کو بتلاتا نہیں سبقِ و فا استاد بھی

تاریخ احرار پر سلسلہ وار زیر طبع کتب

برصغیر میں مجلس احرارِ اسلام کی تاریخی جدوجہد کو محفوظ کرنے کے لئے مرحلہ وار مختلف موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔

وہ تمام احباب جن کے پاس مجلس احرارِ اسلام سے متعلق اپنی یادداشتیں، مطبوعہ ریکارڈ، احرار کے اخبارات و جرائد...... روزنامہ آزاد، روزنامہ نوائے پاکستان، روزنامہ ہلالِ نو، (بمبئی) ہفت روزہ دور جدید، (بمبئی) ترجمان احرار (علی گڑھ) ترجمان احرار (سرحد) سہ روزہ افضل (سہار نپور) روزنامہ مجاہد، ماہنامہ تبصرہ (لاہور) نیز اکابر احرار اور جلسوں کی تصاویر وغیرہ موجود ہوں ازراہِ کرم ادارہ کو طلاع دیں۔
استفادہ کے بعد تمام مواد شکریہ کے ساتھ واپس لوٹا دیا جائے گا۔

زیر طبع کتب

خطباتِ احرار (سید محمد کفیل بخاری)، شاہ جی کی کہانی شاہ جی کی زبانی (سید محمد کفیل بخاری)، خطباتِ امیر شریعت (سید محمد کفیل بخاری)، احرار اور تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ (محمد عمر فاروق) اکابر احرار، تعارف، سوانح، خدمات، (محمد عمر فاروق) احرار اور تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء (محمد عمر فاروق)۔

رابطہ: سید محمد کفیل بخاری، دارِ بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان۔ فون 511961 (061)

ملک محمد الدین صابر امرتسری (گوجرانوالہ)

"صفتاں بہت اوس سخی سلطان دے وچ"

مرحبا شیرا تیری موت اُتے
تیری موت دراصل خود دار دی موت

محافظ دین دے، عاشق رسول دے وی
نگہبانِ امت، باوقار دی موت

فرنگی دور نہ جنہوں دبا سکیا
اوس قافلے دے ہے سالار دی موت

ناممکن ہے کدے وی بُھل جاوے
فخرِ ملت رئیس الاحرار دی موت

آوے فرق نہ نبی دی شان اندر
الاعلان اے تیری پکار دی موت

جانباز، قاضی، تاج، مظہر، شورش
شیخ حسام دے صابر غمخوار دی موت

جدی روشنی سی ساری وچ دنیا
بجھ گئی او شمع ملتان دے وچ

ایہو جیہا سبے خوف بے باک غازی
پیدا ہونا نہیں جہان دے وچ

جدوں بولدا سی، موتی رولدا سی
اے تاثیر سی اوہدی زبان دے وچ

تختہ دار تے وی اوہنے حق کہیا
آئی جنبش نہ ذرا ایمان دے وچ

لدھا رام دا واقعہ یاد ہوسی
چرچا عام ہویا ہندوستان دے وچ

دشمن خود ذلیل خوار ہوئے
پیا فرق نہ کجھ آن شان دے وچ

پیدا ہونا نہیں، ہند، سندھ اندر
نیو یارک، نہ چین، جاپان دے وچ

نہ اے، مکہ، مدینہ، بغداد، اندر
فلسطین نہ مسقط، عمان دے وچ

نہ اے قاہرہ، مصر، نہ وچ کابل
نہ طہران اندر نہ ایران دے وچ

برِ اعظم نہ ایشیا، وچ یورپ
ناممکن ہے سارے جہان دے وچ

ایس مردِ مجاہد دی موت اُتے
گھر گھر سوگ ہو یا پاکستان دے وچ

بے مثال، کمال حسین، عاقل
صفتاں بہت اوس سخی سلطان دے وچ

اوس درِ نایاب دی صفت آکھے
طاقت کیہ اے صابر نادان دے وچ

غلام رسول مہر

وہ آدمی تھا مگر........

سید عطا اللہ شاہ بخاری اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ نیکیوں اور سعادتوں کی ایک دنیا لے گئے۔ جو گوناں گوں اوصاف وخصائل اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے، وہ پہلے بھی ایک وجود میں جمع ہوتے رہے۔ اب تو زمانہ ان اوصاف وخصائل کی تربیت ہی سے بہ ظاہر مروم نظر آتا ہے۔ پھر کس بناء پر امید رکھی جاسکتی ہے کہ ویسی کوئی شخصیت ہمیں دوبارہ دیکھنی نصیب ہوگی۔

جس دور سے میں گزر کر آیا ہوں اس میں ہر طرف عظیم القدر شخصیتوں کی صفیں نظر آتی تھیں جن میں سے ایک ایک فرد علم وفضل، ہمت وشجاعت، ایثار ونظریات اور عمل وسرگرمی کا ایک ایسا عجیب وغریب پیکر تھا کہ اسے دیکھتے ہی فرط ادب واحترام سے گردنیں جھک جاتی تھیں۔ آج ویسے وجود کہاں نظر آتے ہیں؟ اگر ہوں گے تو وہی جو اِکادکا باقی رہ گئے۔ جیسے طوفان گزر جاتا ہے تو اپنے پیچھے بادلوں کے چند ٹکڑے چھوڑ جاتا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم ومغفور کے لئے اس مجمع عظیم میں بھی اک معزز مقام حاصل تھا۔ میں آج ان کی مثال کہاں تلاش کروں؟ ایک وسیع ظلمت زار میں روشنی کی کرنیں کس امید پر ڈھونڈوں؟

گزری ہوئی دنیا

حضرت امام بخاری سے ایک شعر منسوب ہے۔ جس کا مفہوم اردو میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر تیری زندگی طویل ہو گئی تو لازماً تمام احباب کی موت کے غم برداشت کئے بغیر تیرے لئے چارہ نہ رہے گا۔ اس وجہ سے تیری زندگی اندوہ وقلق کا دردانگیز مرقع بن جائیگی۔

اس اندوہ وقلق کا صحیح اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کے احباب ورفقاء کا قافلہ منازل حیات سے تیزی کے ساتھ گزر گیا اور وہ گردو پیش کارواں کی حیثیت میں پیچھے رہ گئے۔ میں کیا عرض کروں کہ کن کن بزرگوں، محبوں اور ہمدموں کی مفارقت کے داغوں سے سینہ ودل شعلہ زار بنے ہوئے ہیں۔ کان جن صداؤں سے عمر بھر آشنا رہے۔ وہ اب کہیں سننے میں نہیں آتیں۔ نگاہیں جن مناظر کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھیں کہ انہیں کو زندگی کے طبعی اور حقیقی مناظر سمجھتی تھیں ان کی زیارت کے لئے اب دور دور تک جاتی ہیں اور ناکام واپس آتی ہیں۔ کوئی گزری ہوئی دنیا کو کہاں سے لوٹا لائے اور کیوں کر لوٹا لائے؟ زندگی کا دھارا انتہائی تیزی سے بہتا چلا جارہا ہے۔ اس میں رجعت ممکن نہیں۔ اس کا پیچھے کی طرف لوٹنا خارج از بحث ہے اور جو موجیں اپنی فطری بے تابیوں کو دھارے کی سطح پر بکھیرتی ہوئی آگے جاچکی ہیں وہ پلٹ کر نہیں آسکتیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہر موج کے بعد دوسری ویسی ہی یا اس سے ملتی جلتی موج آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور منظر میں شکست یا انقطاع ہی نہیں بلکہ تغیر وتبدل کا بھی احساس بہت کم ہوتا تھا۔ مگر اب؟۔۔۔۔۔ میں کیا عرض کروں؟ اب دوسری ہی دنیا وجود میں آگئی ہے۔ وہ دنیا یقیناً باقی نہیں رہی۔ جس میں ہم نے زندگی کے بیشتر اوقات گزارے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس گزری ہوئی دنیا کی بہت بڑی شخصیت تھے۔ ان معنوں میں بڑی شخصیت نہ تھے کہ انہیں کوئی بہت بڑا منصب یا وسیع خطے پر اقتدار حاصل تھا۔ ان معنوں میں بھی بڑی شخصیت نہ تھے کہ وہ کثیر المقدار اموال و املاک پر قابض تھے اور اس وجہ سے سینکڑوں ہزاروں افراد کی زندگیاں ان کے ساتھ وابستہ ہو گئیں تھیں۔ اسلام کے نزدیک عظمت کا معیار نہ دولت ہے، نہ اقتدار، نہ رنگ ہے، نہ نسل، تنہا علم و فضل ہی نہیں تقریر و خطابت کی سحر انگیزی اور تحریر و نگارش کی ندرت کاری بھی نہیں بلکہ صرف تقویٰ ہے۔ صرف حسن عمل ہے اور تقویٰ حسن عمل کا پیمانہ بھی اپنا بنایا ہوا ہر گز نہیں۔ بلکہ کتاب و سنت کا پیمانہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا پیمانہ۔

رفعت و منزلت

سید عطا اللہ شاہ بخاری اسی پیمانے کے مطابق دور حاضر کی رفیع المنزلت شخصیت تھے اگرچہ آج کل بیشتر نگاہوں کا انداز بینش بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ موازنے اور ناپ تول کے مُسلمہ معیار باقی نہ رہے۔ زاویہ ہائے نگاہ کچھ اور ہو گئے۔ دقیقہ شناسی کی صلاحیتوں میں فرق آ گیا۔ اس لئے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، یقین نہیں کہ اسے آجکل کی سطح فہم و نظر کے مطابق کہنے میں کامیاب ہو سکوں گا اور اپنا مطلب سمجھا سکوں گا مگر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کیونکہ نگاہوں کی دگرگونی کا موجودہ دور بہر حال عارضی ہے دیر پا نہیں اور جو کچھ عرض کرنے کا خواہاں میں ہوں، وہ جیسا پہلے تھا ویسے ہی آج ہے اور ویسا ہی ہمیشہ رہے گا خواہ زمانہ کتنا ہی چکر کاٹ ـ ـ اور کتنی ہی گردشوں کا تختہ مشق بن جائے کیونکہ حقیقتیں بدلا نہیں کرتیں۔ وہ ہر حال میں قائم و استوار رہتی ہیں۔ کلمات اللہ میں تبدیلی ممکن نہیں۔

زندگی کے دو مقاصد

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ راہ حق میں ایثار و [illegible]یت کا وہ ایک نادر پیکر تھے ان کی ہوشمندانہ زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ہوا۔ میرے علم کے مطابق ان کی زندگی کے دو اہم مقصد تھے۔ اول یہ کہ ان کا وطن اجنبی تسلط کی ہر آلائش سے بالکل پاک ہو جاتا اور سامراج کا وجود مٹ جاتا وہ سامراج کے دشمن تھے۔ مگر برطانوی سامراج کی مخالفت خصوصیت سے ان کی زندگی کا نصب العین بنی رہی کیونکہ برطانیہ ہی پاک و ہند پر قابض تھا اور برطانیہ ہی کے قبضے میں اسلامی دنیا کے وسیع ترین اور بہترین خطے تھے۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمان دنیا میں بالعموم پاک و ہند میں بالخصوص آزاد تر، خوددار تر اور خوشحال تر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں اور عقیدہ و عمل کے لحاظ سے سچے مسلمان بن جائیں۔ تفصیلات پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں معاملے میں ان کی رائے صحیح نہ تھی اور فلاں معاملے میں ان سے اندازے کی غلطی ہو گئی مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ جن مقصدوں کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کئے رکھی۔ ان کے لئے سعی و کوشش، جہاد، ایثار یا فداکاری میں کبھی تامل نہ کیا یا کبھی یہ سوچا کہ قدم آگے بڑھایا تو انہیں قید و بند سے سابقہ پڑے گا۔ اور اہل و عیال کے گزارے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ ان مقصدوں

لے لئے لڑنا انکے نزدیک اسلامی زندگی کا گراں بہا فرض تھا اور فرض اس لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چون و چرا خوش دلی سے ادا کیا جائے۔ اس لئے نہیں ہوتا کہ اسے پورا کرنے کے لئے قدم اٹھانے سے بیشتر ذاتی رنج و راحت کا موازنہ کرلیا جائے۔

شرف اولیت

چنانچہ اسلامیت و آزادی کے ہر معاملے میں انہوں نے اولیت و سبقت کا شرف برابر قائم رکھا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے فرائض کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور اس مستعدی و جانفروشی سے انہیں پورا کیا۔ میں اطمینان سے بیٹھا ہوا یہ داستان سرائی کر رہا ہوں اور داستان سرائی سے حقیقی حالات کا اندازہ مشکل ہے اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ہر شخص اپنے کسی محبوب و مرغوب مقصد کے لئے اپنے اوپر ویسی ہی حالت طاری کرے۔ پھر اسے معلوم ہوگا کہ بلند مقاصد کے دیوانوں کی زندگی کیوں کر گزرتی ہے۔

پھر یہ معاملہ دو چار دن، دو چار مہینے یا دو چار برس کا نہ تھا۔ حکومت برطانیہ اٹل ہوتی تھی سید عطاء اللہ شاہ کا عنفوان شباب تھا۔ جب انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور وہ اسی میدان میں میرے سامنے بوڑھے ہو گئے۔

آخری دور کا نقشہ

ان کے ایک نیازمند نے آخری دور کا نقشہ یوں پیش کیا ہے۔

اس سحر بیان مقرر اور شیریں مقال خطیب شعلہ نوا اور آتش نفس عالم دین کو اس حالت میں دیکھا جس کی آواز مدھم ہو چکی تھی جس کی زبان سے گفتگو بہ مشکل ہو رہی تھی۔ جس کے قوائے جسمانی و ذہنی کمزور ہو چکے تھے۔ جس کی بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ جو ٹوٹے ہوئے، کچے کرائے کے مکان میں مکین تھے۔ جس کی دینی خدمت کا صلہ عزلت و تنہائی اور جدوجہد آزادی کا انعام مسلسل پریشانی اور کسمپرسی تھا۔ وہ جس کی صحت کبھی باعث صد رشک تھی۔ آج اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھا۔ آج اس کے جوڑ جوڑ اور نس نس میں نصف صدی کی تکان اور مشقت شامل تھی۔

یقیناً ہر شخص کے بڑھاپے کی کیفیت کم و بیش اسی قسم کی ہوتی ہے مگر کیا اس کیفیت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ان مسلسل اور طویل قیدوں اور اسیریوں کا بھی خاصا بڑا حصہ نہیں، جو اس نے دو قرن تک انتہائی مردانگی اور جوان ہمتی سے راہ حق کی ناگزیر مشقتیں سمجھ کر برداشت کیں؟ اس حالت میں بسر کیں کہ حکومت برطانیہ بظاہر اٹل نظر آتی تھی؟۔

بے نفسی اور بلند ہمتی۔

پھر آپ نے دیکھا کہ جس عطاء اللہ شاہ بخاری نے راہ حق کے لئے قربانیوں میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہ کیا وہ اپنی ذات یا اہل و عیال کے لئے کبھی کسی اجر یا معاوضے کا طلب گار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ زندگی کے بالکل آخری اوقات میں بھی وہ چپ چاپ کرائے کے ایک کچے مکان میں مقیم ہو گیا اور کبھی کوشش

نہ کی کہ اسے کوئی درمیانے درجہ کا مکان ہی الاٹ ہو جائے۔ حالانکہ اس کے گردو پیش بارہ تیرہ سال تک الاٹ منٹوں کا ایک ہنگامۂ عظیم بپا رہا۔ وہ غیر معروف فرد نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل فرط عقیدت سے اسکے لئے برابر تڑپتے رہے۔ ارباب حل وعقد میں بھی اس کے شناساؤں، بلکہ عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی۔ مگر اس نے اپنے لئے زندگی کا جو سانچہ تجویز کر لیا تھا۔ اس میں ایسی باتوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اہل حق ہر متاع اہل علم کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ (اہل حق لینی ہر متاع اہل علم کی فلاح و بہبود کے لئے لٹاتے رہتے ہیں۔ مگر خود کبھی کوئی چیز لینے کے روادار نہیں ہوتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے لئے عزیز ترین متاع اس کی درویشی تھی۔ وہ اسی متاع پر اس طرح قانع اور مطمئن رہا کہ ارباب اقتدار کو اپنی بلند پایہ سندوں پر بیٹھ کر بھی کبھی وہ اطمینان شاید ہی نصیب ہوا ہو اسی مقام کے باب میں عرض کیا گیا ہے۔

گر دولت ایں بود کہ بہ درویش مے دہند
بادی گریستن جم وکے رابہ تخت خریش

میری دعوت

میری زبان اس دعوت پر آمادہ نہیں ہو سکتی کہ لوگ اس نادر شخصیت کے متعلق میں اپنے فراموش کردہ فرض کی تلافی کر دیں۔ میرے شیوۂ فکر و نظر کو ایسی دعوت سے کوئی مناسبت نہیں۔ البتہ یہ ضرور رکھتا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا کہتا جاؤں گا کہ دوسری نادر شخصیتوں کی طرح اس نادر شخصیت سے بھی خدمت اسلام، خدمت ملت، خدمت ملک اور خدمت خلق کے طور طریقے سیکھے پہلے ایسے مبارک وجود اتنے کمیاب نہ تھے جتنے آج ہیں۔ یہ آئینے ہوتے ہیں جنہیں قدرت اس لئے بھیجتی ہے کہ لوگ انہیں سامنے رکھ کر اپنے خدو خال درست کر لیں۔ قومیں ایسی شخصیتوں کے بل پر ترقی کرتی ہیں۔ عزت مندانہ زندگی کے لئے ایسے ہی ایثار، ایسی ہی فدا کاری، ایسی ہی بے نفسی اور بے غرضی کی ضرورت ہے۔

عزت مندانہ زندگی کی راہ

جس قوم کے افراد کی اکثریت یا خاصی بڑی تعداد اغراض کی گرم بازاری کا ایندھن بن جائے اس کے لئے قدم آگے بڑھانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ اس کی متاع ہمت و عمل تو اغراض کے شعلہ زار کی نذر ہو جائے گی۔ یہ بھی واضح رہے کہ قومیں دلکش الفاظ یا بہ ظاہر دل پذیر تقریروں سے زندگی کی امتحان گاہ میں کامیابی کی اہل نہیں بنتیں ایسے عمل کی ضرورت ہے جو ایثار و بے نفسی کے سر چشمے سے فوارے کی طرح اچھلے۔ سید عطاء شاہ بخاری کی ذات گرامی زندگی بھر ایسے ہی اعمال کا مصدر بنی رہی۔ وہ ہمارے عہد میں اسلامی اوضاع و اطوار کا ایک قابلِ قدر نمونہ تھے۔ ایسے نمونے جتنی تعداد میں پیدا ہو سکیں، انہیں حقیقی قومی دولت سمجھئے۔ جن باتوں کو ہم اب اپنے نزدیک اہم سمجھتے ہیں اور معیار وقعت بنائے بیٹھے ہیں۔ انہیں تو اسلام کے حقیقی معنوں سے کوئی بھی مناسبت نہیں۔

ممکن ہے میری گزارشیں آپ کو تلخ و ناخوشگوار معلوم ہوں مگر۔

من آنچہ شرط بلاغ است باتو مے گریم
تو خواہ از سخنم پند گیر، خواہ ملال

ڈاکٹر سید عبداللہ

شاہ جی اور فتنۂ راجپال

جماعت احرار اور اس کی مشکلات

آریہ سماجیوں کی طرف سے توہین رسول کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور مجلس احرار بھی ناموس رسول ﷺ کی حفاظت کے لئے ہر قربانی دینے کا فیصلہ کر چکی تھی لاہور میں "رنگیلا رسول" ناپاک کتاب کے خلاف غم و غصہ کے طوفان ابھر رہے تھے اور ساری قوم مسلم لیگ کی بے عملی سے اکتا کر مجلس احرار کے دامن سے عمل کی توقع وابستہ کر چکی تھی اور خواص سے بیزار عوام میں سے ہر ایک کی زبان سے "احرار کہاں ہیں" "احرار کہاں ہیں"؟ کی بے تاب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اب وہ دن آ گیا جب لوگ جوق در جوق دہلی دروازہ کے باہر مجلس احرار کے دفتر کی طرف ہجوم کرتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ بارہ بجے تک شاہ محمد غوث رحمہ اللہ تعالی کے مزار کے ارد گرد سارے باغات انسانی کھوپڑیوں کے گھنے جنگل بن گئے تھے۔

مجلس احرار بھی عجیب قسم کی جماعت تھی بڑی خوش قسمت مگر بڑی بد قسمت اس نے قبول عام کی ایسی بہاریں دیکھیں کہ کسی دوسری جماعت نے کم دیکھی ہوں گی۔ مگر اسے پسپائی اور زوال کی خزاں کے منظر بھی ایسے خوفناک دیکھنے پڑے کہ کیا کہوں

بات کیا تھی؟

بات یہ تھی کہ اس جماعت کا فکری رہنما اس جماعت کو ایسے انداز سے چلانا چاہتا تھا جس سے احساس مقامی کی بھی تسکین ہو جائے اور آزادیٔ وطن کے اہم تقاضے بھی پورے ہو جائیں بس اس دو عملی امتزاج میں مجلس احرار میں کبھی تو بہار آ جاتی رہی اور کبھی اسے بھیانک خزاں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسلمان عوام بڑے سادے اور مخلص لوگ ہیں۔ پیچا پیچی ان کی سمجھ سے باہر ہے وہ تو سیدھی سپاٹ بات کو سمجھتے ہیں۔ احرار کی یہ مشکل رہی ہے کہ انگریزوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ انہیں ان فتنوں کو بھی سنبھالنا پڑتا تھا جو پوری تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ فرقوں کے حقوق کے پردے میں انگریزوں کے ہی ابھارے ہوئے ہوتے تھے اور ان فرقوں کے حقوق سے زیادہ افتراق انگیزی معلوم ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شاطر اپنے مہروں کو آگے بڑھانے میں بڑی چابک دستی سے کام لیتا تھا۔ اس کے یہ مہرے مسلمانوں میں بھی تھے اور ہندوؤں میں بھی اور سب سے اچھے مہرے وہ ہوتے تھے جن کی چال کا دھوکہ ہی نہ ہو سکے ایسے موقعوں پر شاطر مخلص لوگوں سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور ایسی باتیں اٹھاتے تھے جن سے الگ ہونا ناممکن ہوتا تھا ہندوؤں کی بڑی کمزوری رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے نام سے بدکتے تھے اور یہ منصوبہ بھی ایک سو سال سے ان کے پیش نظر تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی احساس کو بار بار کے تصادم سے کمزور کیا جائے اس میں انگریز اندر سے اس کا ہمنوا تھا گو ظاہر میں ثالث بن جاتا تھا اور لطف یہ کہ مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم بھی رکھتا تھا۔

احرار کی یہ حکمت عملی تھی کہ ہندو اور انگریز دونوں سے لڑائی لڑی جائے مگر شاطر کچھ اس طرح سے چال چلتا تھا کہ ہندو سے ان کی لڑائی اچھی طرح سے گٹھ جاتی تھی مگر انگریز سے لڑائی کے وقت سارا ہجوم ان سے اس طرح ہٹ جاتا تھا گویا کبھی تھا ہی نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ احرار دونوں محاذوں پر لڑتے رہے۔

دفتر احرار میں احرار رہنماؤں کا اجتماع

بات کہیں سے کہیں نکل گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ توہین رسالت ﷺ کے خلاف احتجاج سے بھرا ہوا ایک ہجوم بے پناہ شاہ محمد غوث والی سڑک اور باغات میں جمع ہو گیا گویا ایک تقاضاً عام تھا کہ احرار اس احتجاج کو عملی شکل دینے میں قوم کی رہنمائی کریں اس صورت حال میں مجلس احرار کے دفتر کی بالائی منزل پر احرار کے بڑے بڑے رہنما سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں جمع ہوئے اور مسلمانوں کے جذبات کو کم کرنے اور منظم کرنے کے وسائل پر غور کرنے لگے۔ اس موقعہ پر میری یاد کے مطابق منجملہ دیگر اصحاب کے چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمن، مولانا مظہر علی، مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا غلام غوث ہزاروی اور سب سے اہم اور ممتاز سید عطاء اللہ شاہ بخاری موجود تھے۔ بحث کے دو نقاط تھے۔

اول: کہ توہین رسول ﷺ کے مسئلہ کو عدالت میں لایا جائے۔

دوم: آریہ سماجیوں کی سرکوبی کے لئے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی جائے۔

یہ بحث بڑے معرکے کی بحث تھی ایک طرف وضع احتیاط کا انداز تھا اور دوسری طرف جرأت غازیانہ کا مظاہرہ تھا اندرون خانہ کی اس بحث میں ہر قسم کی باتیں ہوئیں اور یہ خصوصیت احرار میں ہی دیکھی گئی تھی کہ سخت سے سخت بحث کے باوجود احرار برادری کا احساس کبھی کمزور نہیں ہوتا تھا۔

امیر شریعت کی اہل لاہور کو یقین دہانی

شاہ محمد غوث والی سڑک پر ہجوم اور زیادہ ہوتا گیا اور اب شاید مخالف جماعتوں کے لوگ بھی ہجوم میں شامل ہو گئے تھے اور نعروں کا انداز کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ گویا اگر کوئی جلد فیصلہ نہ ہوا تو دفتر احرار اور رہنمایان احرار کی بھی خیر نہیں۔

اس شور و شغب کے عالم میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بالکونی سے اپنا چہرہ دکھایا اور کہا

"اے باشندگان لاہور! معاملہ عزت رسول ﷺ کا ہے اور اس کے لئے ہماری جماعت ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس مقدس جہاد میں وہ لوگ شریک نہیں جن کو اپنے دعوے کے مطابق اب تک میدان میں آچکنا چاہئیے تھا۔ ہم عزت رسول ﷺ کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کا فیصلہ کر چکے ہیں مگر جاؤ ان رہنماؤ کو بھی لے آؤ جو ہم سے الگ مسلک رکھتے ہیں تاکہ یہ جہاد آخری جہاد ہو اور اس میں پوری قوم شریک ہو۔

سول نافرمانی کی تحریک

سید عالی مقام کی اس تجویز سے دو اثر مرتب ہوئے بعضوں نے کہا کہ جھوٹ کہہ رہے ہیں بعضوں نے کہا آخر کار احرار ہی قوم کے کام آئی، یہ خان بہادر، سر اور نواب اب کہیں نظر نہیں آتے۔

احرار کی میٹنگ پھر شروع ہوئی، شاطروں کی پہلی چال ذرا سی ناکام رہی، مگر شاطروں کی قوم حوصلے والی قوم ہوتی ہے ہجوم پھر مشتعل کر دیا گیا میٹنگ کے اندر اب بحث اس نکتے پر آ کر رک گئی کہ عدالت میں چارہ جوئی اب بہانہ جوئی کے مترادف سمجھی جائیگی۔ اس لئے سول نافرمانی کے بغیر کوئی چارہ نہیں مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ ایسی سول نافرمانی میں پوری قوم کو شریک کیوں نہ کیا جائے مگر اس کے لئے پھر التوا ضروری تھا اس لئے یہاں بحث بند ہو جاتی تھی۔

چودھری افضل حق کی رائے

چودھری افضل حق کا خیال تھا کہ سول نافرمانی کا مسئلہ طے شدہ ہے مگر شہر کے دوسرے رہنماؤں سے بھی اشتراک کی درخواست ضروری ہے تاکہ نقصان کی صورت میں یہی دوسرے رہنما قوم کو یہ کہہ کر نہ بھڑکائیں کہ دیکھا ہم عدالت کے ذریعے سارے مسائل حل کرا لیتے۔ یونہی مسلمانوں کا خون کرا دیا اور بات بھی ٹھیک تھی مگر بڑا مسئلہ یہ تھا کہ باہر کے ہجوم کو کس طرح مطمئن کیا جائے عالی مقام سید عطاء اللہ شاہ بخاری بڑے راست پسند آدمی تھے۔ مگر سیاست میں باہر کے شاطروں کی ماریں کھا کھا کر یہ ضرور ماننے لگے تھے کہ شاطروں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنا نہیں چاہیئے۔ تاہم مسئلہ کے حل کی جو صورت بھی سامنے آتی وہ خطرناک اور نازک ہی معلوم ہوتی تھی۔

امیر شریعت کا فیصلہ اور بحث کا خاتمہ

اب سہ پہر ہو چکی ہے اور چار بجا چاہتے ہیں۔ اور ہجوم اور بھی بڑھتا جا رہا ہے، نعروں کی آوازیں اتنی بلند اور گونج دار ہوتی جا رہی ہیں کہ مجلس بحث میں لوگ ایک دوسرے کی بحث کو سن بھی نہیں سکتے۔ دفعتاً سید صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور دیر تک سجدے میں رہے۔ اور جب سجدے سے اٹھے تو ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور زبان پر یہ الفاظ

اللهم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انک حمید مجید

کہتے ہوئے پھر مجلس میں داخل ہوئے اور فرمایا "آج ہمارا طریق کار صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ شہر کے سرکاری رہنماؤں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اور ہر مصلحت سے آنکھ بند کر کے ناموس رسول ﷺ کے لئے ہر وہ اقدام کیا جائے جس کی ضرورت ہو یہ فرمانے کے بعد فرمایا۔ بس میری یہی رائے ہے فقط"۔

جلسۂ عام کا اعلان اور دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ

حضرت سید صاحب کے اس نعرۂ حق کے بعد بحث و استدلال کا چراغ گل ہو گیا اور ساری جماعت نے سید عالی مقام کی پیروی کرنے کا اعلان کیا اور فیصلہ ہوا کہ دہلی دروازے کے باہر جلسہ عام کی فوری منادی کرا دی جائے مہر علم دین (جن کی اسیری کی مدت میری دانست میں بالاقساط پندرہ برس سے کم نہ ہو گی) کی آنکھیں چمک اٹھیں اور چہرہ غیرت دینی سے تمتما اٹھا ڈھنڈورا پیٹنے والے اطراف شہر میں پھیل گئے۔

اب ہجوم شہر کی کوتوالی سے لے کر اکبری دروازے تک پھیل گیا اور احرار کے رضاکار باغ میں پلیٹ فارم جمانے میں مصروف ہوگئے اب لوگ کوتوالی سے سرک سرک کر باغ میں پلیٹ فارم کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ اس اثناء میں شاطران شہر نے حکام سے مل کر ان پر اثر ڈالا کہ فرقہ وارانہ فساد کا سخت خطرہ ہے جلسہ روکا جائے ورنہ بڑا خون خرابہ ہوگا احرار بھی اپنے انتظامات درست کر رہی تھی کہ پولیس کی ایک مسلح گارد (انگریز) کے ہمیت اور شاید مسٹر فیلبوس سٹی مجسٹریٹ کی معیت میں دفتر احرار کے سامنے پہنچی اور اپنے خاص ایلچی کے ذریعے احرار رہنماؤں کو مطلع کیا کہ حکومت کے نزدیک مجوزہ جلسہ عام نقص امن کا باعث ہوگا۔ اس لئے جلسہ ممنوعہ قرار دیا جاتا ہے اور اس تاریخ سے ایک ماہ تک کے لئے دفعہ ۱۴۴ نافذ کی جاتی ہے۔

عزم امیر شریعت

اب احرار رہنماؤں کو ایک نئی مشکل پیش آئی موضوع بحث یہ تھا کہ اگر اس حکم کے باوجود جلسہ کیا جائے تو فائرنگ کا ہونا یقینی ہے اور اس صورت میں نقصان جان کی ذمہ داری کا سوال ہے ایک تجویز یہ ہوئی کہ سارے احرار لیڈر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں۔ مگر سوال پیدا ہو کہ ہجوم کی تسکین کے علاوہ اس سے اصل مسئلہ کا حق کس طرح نکلے گا۔

بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ تھا مگر اب سید عالی مقام فیصلہ کر چکے تھے انہوں نے فرمایا آج جلسہ ہوگا اور ضرور ہوگا البتہ چودھری افضل حق کی تجویز پر یہ فیصلہ ہوا کہ کھلی جگہ جلسہ کرنے کی بجائے وطن بلڈنگ کے احاطے میں جلسہ کیا جائے اور حکومت کے رویہ کے خلاف احتجاج کے علاوہ توہین رسول ﷺ کے مسئلہ پر مسلمان قوم کی کسی متحدہ روش کی تجویز پر غور کیا جائے۔

چودھری افضل حق اور مجسٹریٹ کے درمیان گفتگو

احرار رضاکار اس فیصلہ کو لے کر ہجوم میں پھیل گئے اور اب لوگوں کا اجتماع وطن بلڈنگ میں ہوتا گیا شام ہو چکی تھی۔ احرار رہنماؤں نے مسجد شاہ محمد غوث میں نماز ادا کی اور بعد از نماز معمولی سی کھلی مشاورت کے بعد جلسہ گاہ کا رخ کیا۔ یہ رہنما احاطہ کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ سٹی مجسٹریٹ نے احاطے کے اندر کے جلسہ کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ اس پر ان کے اور چودھری افضل حق کے درمیان دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا ان کا کہنا یہ تھا کہ ہجوم سے بات کرنے کا موقع ضرور دیا جائے تاکہ لوگ پرامن طریق سے گھروں کو واپس چلے جائیں مگر مجسٹریٹ نے ضد کی۔

سول نافرمانی کا فیصلہ اور شاہ جی کی تقریر

اس صورت حال کو دیکھ کر سید عالی مقام نے احرار رہنماؤں کو مشورہ دیا کہ اب حکومت سے ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا گیا اور بشرط ضرورت جلسہ شروع ہو گیا جس کی صدارت چودھری افضل حق ایم۔ ایل۔ اے نے کی۔

میں نے مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بیسیوں تقریریں سنی ہیں مگر اس رات کی تقریر کچھ ایسی تھی جس کا

نقش کبھی مٹ نہ سکے گا۔ مگر تقریر سے زیادہ سید صاحب کی تدبیر کا بھی اسی روز قائل ہوا، احاطہ مختصر تھا اور ہجوم زیادہ اور خطرہ یہ تھا کہ باہر کا ہجوم کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جس سے پولیس کو فائرنگ کا بہانہ مل جائے۔ میں نے دیکھا کہ اکثر احرار رہنما (ہرچند کہ وہ بھی شعلہ بیان تھے) بے بسی کے عالم میں تھے اس لئے صدر جلسہ نے اغراض اور صورت حال پر معمولی سی روشنی ڈالنے کے بعد فرمایا کہ آج ہماری باگ ڈور سید عالی مقام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے آپ انہی کے احکام سماعت کیجئے سید صاحب نے سب سے پہلے باہر کے ہجوم سے خطاب کیا "اے شمع رسالت کے پروانو! میں جانتا ہوں کہ آج تم شوق شہادت میں یہاں بےتابانہ آئے ہو مگر حفاظت رسول ﷺ کی لڑائی تم سے نظم و ضبط کا تقاضا کرتی ہے میں چاہتا ہوں کہ شہر لاہور بلکہ مسلمانان ہندوستان کا بچہ بچہ اپنی اپنی باری سے قربانی پیش کرے لہذا جو لوگ دروازے سے باہر کھڑے ہیں۔ دو دو چار چار کی ٹولیاں بن کر اور بکھر کر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوجائیں۔ ان کی باری کل آئے گی اور جو لوگ احاطے کے اندر ہیں وہ پولیس یا فائرنگ کے خوف سے اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور ایک نظم اور قاعدہ کے تحت اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کردیں"۔

شاہ جی کی تقریر

دروازے پر غل ہوا معلوم ہوا کہ شاطران شہر کے کچھ کارندے لوگوں کو سید صاحب کی تقریر کے خلاف مشتعل کر رہے تھے اور اس پر ملک لال دین قیصر اٹھے اور دروازے پر کھڑے ہوگئے اور باہر کے ہجوم کو سید صاحب کے اعلان سے باخبر کیا۔ ملک لال دین قیصر موقعہ پر گرفتار ہوگئے مگر باہر کا ہجوم منتشر ہوگیا اب سید صاحب کی تقریر شروع ہوئی تقریر کیا تھی آنسوؤں اور شعلوں کا اجتماع تھا جوش کی انتہا تھی اور آہ و کراہ کی آوازیں ہر طرف سے سنائی دے رہی تھیں مجھے سید صاحب کی تقریر کے الفاظ یاد نہیں رہے مگر ایک دو فقرے ابھی تک دماغ میں کھبے ہوئے ہیں۔

"اے مسلمانان لاہور آج جناب رسول ﷺ کی آبرو تمہارے شہر کے ہر ہر دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اے امت رسول ﷺ آج ناموس محمدی کی حفاظت کا سوال درپیش ہے اور یہ سانحہ سقوط بغداد سے بھی زیادہ غمناک ہے زوال بغداد سے ایک سلطنت پارہ پارہ ہوگئی تھی مگر توہین رسول ﷺ کے سانحہ سے آسمانوں کی بادشاہت متزلزل ہورہی ہے"

تقریر سید صاحب کی تھی مگر اس روز سید صاحب اپنی معمول کی تقریر کے موڈ میں نہ تھے اور یہ معلوم ہے کہ سید صاحب کی عام تقریروں میں ظرافت اور بذلہ سنجی کا عنصر اصل موضوع کے برابر ہوا کرتا تھا مگر اس روز پانی اور آگ کی ترکیب سے یعنی سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے ملاپ سے ان کی تقریر ڈھل رہی تھی یہ اور ہی طرح کی تقریر تھی

شاہ جی کا پولیس سے خطاب

احاطے کے اندر تقریر ہورہی تھی اور باہر پولیس کی جمعیت زیادہ سے زیادہ صف آرا ہوتی جاتی تھی رات

گزری جارہی تھی اور پولیس والوں کا دل قابو سے باہر ہوا جارہا تھا آخر سید صاحب نے پولیس والوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اے پولیس والو ہم یہاں صرف اظہار غم کے لئے جمع ہوئے ہیں تم کیا چاہتے ہو اگر تم ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہو تو ہم حاضر ہیں اور اگر ہمارے ساتھ وہ سلوک مطلوب ہے جو ایک سیّد زادے کو وراثت میں ملا ہے تو ہمارے سینے اس کے لئے بھی حاضر ہیں"۔ اس پر جلسہ میں شدید زور کی لہر اٹھی اور لوگوں نے کہا کہ ہماری جانیں بھی حاضر ہیں شہر کا کوتوال زیرک آدمی تھا اس نے جلسہ گاہ کے قریب آکر سید صاحب سے کہا کہ آپ جلسہ جاری رکھیئے دفعہ ۱۴۴ صرف باغ کی حدود تک ہے۔ مگر اب پبلک کا جوش بہت بڑھ چکا تھا سینکڑوں آدمی شہادتؔ کے شوق میں بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے اس پر چودھری افضل حق نے کہا (جو آئینی حدود کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے) صاحبو! وہ وقت بھی آنے والا ہے جب ہمیں تمہاری جانوں کی ضرورت ہوگی مگر ابھی وہ وقت آیا نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہم اس قانون کے پرخچے اڑا دیں جو ہمیں توہین رسول ﷺ پر اظہار غم سے روکتا ہے۔ چنانچہ عام سول نافرمانی کا اعلان ہوگیا۔

شاہ جی کی گرفتاری

دس دس اور پھر پانچ پانچ آدمیوں کے دستے پلیٹ فارم کے پاس جاتے تھے اور سید صاحب کی قدم بوسی کرکے باغ کی طرف جاکر گرفتار ہوجاتے تھے ہزاروں آدمی اس شب گرفتار ہوئے میرے پاس میرا دوست مولوی خدا بخش کھڑا تھا۔ اس کا بھائی اور اس کے بھانجے سب گرفتار ہوچکے تھے۔ میں نے اس کو روک رکھا تھا کہ تمہارے لوگ جاچکے ہیں۔ تم سب لوگوں کے گھروں میں ایک مرد بھی اب باقی نہیں جو خبر گیری کرے تمہارا جانا مناسب نہیں۔ مگر وہ دیوانہ وار اٹھا اور سید محترم کے قدموں میں جاگرا اور پھر پانچ آدمیوں کے ہمراہ باہر چلا گیا اور گورے کا ڈنڈا کھانے کے بعد گرفتار ہوگیا اور میں (اس وقت بھی صید لاغر کی طرح بے مصرف ہی رہا)۔

نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
اے خون شدہ دل تو کسی کام نہ آیا!

جب سول نافرمانی کرنے والوں کی آخری ٹولی بھی چلی گئی تو احرار لیڈروں کی جماعت سید صاحب مرحوم کی سرکردگی میں باہر نکلی اور سید صاحب کے پُردرد طریق سلام وصلوۃ کی گونج میں باغ کے قریب جا پہنچی اور وہیں گرفتار ہوگئی۔ اور اس طرح یہ شب ختم ہوگئی اور میرے ذہن پر سید عالی مقام کا انمٹ نقش چھوڑ گئی۔

احرار کے بڑے بڑے لیڈر تو گرفتار ہوگئے مگر سول نافرمانی اضلاع میں پھیل گئی اور آخر میں یہ اثر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے خلاف زبان کشائی کرنے والوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

خطابت کا معجزہ

مسلمان طالب علم پاکستان کی تحریک میں پیش پیش تھے نیشنلسٹ مسلمانوں کا عام جلسوں میں تقریر کرنا مشکل تھا۔ لڑکے انھیں بولنے نہیں دیتے تھے جلسوں میں ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ مجلس احرار اسلام کا مرکز تو لاہور تھا لیکن اس کے خطیب لکھنؤ تک پہنچتے تھے اور اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے۔ مجلس احرار کے ایسے خطیب اور مقرر کسی اور جماعت نے پیدا نہیں کئے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا انور صابری جادو بیان مقرر تھے۔ لڑکوں کا یہ خیال تھا کہ اگر ان لیڈروں کو خطاب کرنے کا موقع مل گیا تو اس کا اثر (ان کے حق میں) اچھا نہیں ہو گا۔ عوام ان کی خطابت سے متاثر ضرور ہوں گے۔ ایک دفعہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری لکھنو آئے مجلس احرار کی طرف سے امین الدولہ پارک میں جلسہ ترتیب دیا گیا۔ جلسہ شروع ہو گیا۔ شاہ صاحب ذرا تاخیر سے جلسے میں آئے۔ ان کو دیکھتے ہی لڑکوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ اور کہا کہ مولانا! آپ ہندوستان کے سب سے بڑے خطیب ہیں۔ آپ کی تقریر نہایت دل کش ہوتی ہے آپ اپنی اس ساحری سے رائے عامہ کو (ہمارے خلاف) متاثر کریں گے اس لئے ہم آپ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے ہم مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتے۔

شاہ جی کہنے لگے: خدا کی قسم اگر دس منٹ میری تقریر سن لو تو میرے ساتھ ہو جاؤ گے۔

ایک لڑکے نے جواب دیا۔ "اسی لئے تو ہم آپ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے۔ ویسے آپ کی تقریر سننے کو میرا بھی جی چاہتا ہے۔"

شاہ جی نے کہا۔ "اچھا میں سیاست پر تقریر نہیں کروں گا۔ صرف دینی معاملات پر بولوں گا۔"

یہ سن کر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے لڑکے شاہ جی کی تقریر سننے پر آمادہ ہو گئے۔

شاہ جی نے کلام پاک کی تلاوت ایسے لحن کے ساتھ کی کہ سماں بندھ گیا اور حاضرین جلسہ میں سے ہر شخص جھومنے لگا اور پھر وہ دینی معاملات پر تقریر کرنے لگے۔ تقریر تو دین اسلام کے مختلف اصولوں پر تھی لیکن اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ، حدیثوں کا بیان، حافظ، سعدی، عرفی، نظیری، غالب اور مومن کے اشعار، حالی اور اقبال کی نظمیں، لطیفے اور خدا جانے کیا کیا کچھ شاہ جی نے اپنے خطاب میں پیش کیا۔ لوگ مسحور ہو گئے اور شاہ جی ساری رات تقریر کرتے رہے اور یک شخص بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ تقریر کیا تھی اچھی خاصی ساحری تھی۔ فجر کی اذان ہوئی تو شاہ جی نے اپنی تقریر ختم کی۔

میں بھی رات بھر ان کی تقریر سنتا رہا اور ان کی ساحرانہ خطابت نے کچھ ایسی لذت اور لطف و انبساط سے آشنا کیا جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ (یادِ عہد رفتہ، صفحہ ۱۷۸-۱۷۷)

انور صابری

سالارِ کاروانِ جہانِ وفا گیا
(قطعہ تاریخ)

سالارِ کاروانِ جہانِ وفا گیا
سوئے ریاضِ خلد بخاری چلا گیا
ہر آنکھ میں ہیں اشک، ہر لب پہ آہِ سرد
اربابِ دردِ عشق کا درد آشنا گیا
پہنچا جہاں، فضا میں لطافت بکھیر دی
گزرا جہاں سے نقش قدم چھوڑتا گیا
روحِ ابوالکلام کا آئینہ دار، فکر
چشم و چراغِ محفلِ مشکل کشا گیا
تصویرِ خلق، پیکرِ اخلاص، زندگی
سرتا بپا نمونۂ صبر و رضا گیا
الفاظ کے مزاج و معانی کا رازداں
جمہور کے دلوں میں اترتا ہوا گیا
آزادیٔ وطن کا جواں عزم رہنما
آزادیٔ وطن کے ستم جھیلتا گیا
سالِ وفات کے لئے انور جو عرش تک
وابستۂ جنوں مرا فکر رسا گیا
آئی ندائے غیب کہیں کیشو آپ ہائے
"باغِ وطن کا بلبلِ آتش نوا گیا"

۱۹۶۱=۱۹+۱۹۴۲

جوگندر پال

مثالی خطیب

مجلس احرار اسلام کے قائد سید عطاء اللہ شاہ بخاری جب اپنی تقریر کے لئے لاہور سے آیا کرتے تھے تو کڑا کے کی سردی میں سارا سیالکوٹ رام تلائی(۱) میں سمٹ آتا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان، سبھی، رات کے کھانے سے سرشام فارغ ہو کر کمبلوں میں پاؤ پاؤ بھر مونگ پھلی کی پوٹلی سنبھالے پسند کی جگہ پر قابض ہو کے شاہ جی کی آمد کا انتظار شروع کر دیتے تھے۔ تلاوت کے بعد شاہ جی اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے چند لمحے بڑی متین خاموشی سے ڈھیروں حاضرین کا جائزہ لیتے، پھر یہ دیکھ کر مسکرانے لگتے کہ پوری رام تلائی بھر چکی ہے، مگر ابھی تک انبوہ کے انبوہ چلے آ رہے ہیں۔ اسی دوران کوئی منچلا مائیکروفون پر گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرۂ تکبیر بلند کرتا اور ہم سب بیک دل و صدا اپنے آپ کو اللہ کے سب سے بڑا ہونے کا یقین دلاتے۔ اور پھر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آواز رقص کرنے کے انداز میں ان کے منہ سے برآمد ہونے لگتی۔ سننے تو ہم سبھوں کو ہیں، مگر شاہ جی کا یہ تھا کہ ہم گویا ان کی آواز میں بھارت ناٹیم دیکھ رہے ہوتے۔ جولیس سیزر کے روما کے عہد کے مانند لاہور میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر مقررین تھے۔ مگر شاہ جی کی تاب کچھ ایسی تھی جیسی ستاروں کے پورے جھرمٹ میں مارک انتھنی کی۔

اقتباس مضمون "ساتھ ساتھ"
(ماہنامہ تخلیق لاہور، فروری ۱۹۹۴ء)

(۱) سیالکوٹ کی مشہور جلسہ گاہ۔

کرے گی ناز تجھ پر حشر تک تاریخ انسانی

علامہ انور صابری (دیوبند، انڈیا)

خطیب اعظم اسلام فخرِ بزمِ ایمانی
جمالستانِ عرفاں تھی تری پُرنور پیشانی

دلوں کا ذکر کیا رُوحوں کو گرماتی رہی برسوں
فضاؤں میں ترے الفاظ کے چہروں کی تابانی

چراغِ محفلِ ختمِ رسالت بن کے چمکی ہے
تری آنکھوں کے حجروں میں ضیائے شمع ربانی

جہاد حریت میں رہبرانہ شان کے صدقے
کرے گی ناز تجھ پر حشر تک تاریخ انسانی

محمد کی غلامی تیرا تاجِ زندگانی تھی!
ہمیشہ تو نے ٹھکرایا غرورِ تاجِ سلطانی

وقارِ بوذریؓ تھا تیری درویشی کی رگ رگ میں
فقیرانہ ادا تھی ہم مزاجِ فقر سلمانی

تیرے خود دار جذبوں کا مزاج عزم ہستی تھا
مکمل خاکۂ تکمیلِ دستور جہاں بانی

مری مجبوریوں کو دیکھ اے آزاد خو انساں
لحد پر آنہیں سکتا برائے فاتحہ خوانی

نئی حد بندیاں ہیں اور میری چشم گریاں ہے
ہے درس آموزِ دنیا میرے اشکوں کی پریشانی

بہاروں میں بھی میرے دل کا غنچہ کھل نہیں سکتا
تیری راہوں پہ چل سکتا ہوں، لیکن مل نہیں سکتا

علامہ لطیف انور

وہ آنچ جس سے محبت نمود پاتی ہے!

بہار باغ سے جائے نہ، اس ہوس میں رہے
ہم آشیانے میں ہوتے ہوئے قفس میں رہے

کچھ اور فیصلہ کر لے نہ دل کی بے تابی
خدا کرے کہ تری یاد میرے بس میں رہے

کہاں کہاں نہ رہے کاروان عمر رواں
اگر شریک نہ تیری صدا جرس میں رہے

وہ آنچ جس سے محبت نمود پاتی ہے
دعا کرو کہ مرے سوز نیم رس میں رہے

نمود برق سے گلشن کا حسن بڑھ جائے
کچھ ایسی بات بھی ترتیب خار و خس میں رہے

ترا کرم ہی سہی، اختراع دل ہی سہی
کوئی سکون کا پہلو تو دسترس میں رہے

مآل ربط تمنا نہ کھل سکا انور
قفس چمن میں رہا اور ہم قفس میں رہے

سیف الدین سیف

حسین یادیں

امرتسر اس زمانے میں شعر ادب کا گہوارہ تھا مولانا فیروز الدین طغرائی، مولانا عرشی، ڈاکٹر تاثیر، صوفی تبسم، ساحر، فیض اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری امرتسر میں ہی رہا کرتے تھے۔

یہ سب لوگ مولانا عرشی کے گھر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ گھر شعر و ادب کا مرکز تھا۔ حفیظ جالندھری بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اسی طرح مجلس احرار اسلام کے ایک بہت بڑے رہنما شیخ حسام الدین تھے۔ ان کے گھر پر بھی شعر و ادب کی نشستیں ہوا کرتی تھیں وہاں بھی میں جایا کرتا تھا۔ باہر سے جب لوگ آیا کرتے تھے تو شعر و شاعری کا خوب چرچا ہوا کرتا۔ اس میں ان لوگوں میں مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ جو نام لئے گئے ہیں یہ سب لوگ مطالعے کے بہت شوقین تھے اور یہ سب نہایت عالم فاضل لوگ تھے۔ فیض اردو کے بلند پایہ اسکالر تھے۔ عربی زبان نہ صرف جانتے تھے بلکہ بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ تاریخ، فلسفہ، ادب اور مختلف سیاسی و ادبی تحریکوں سے انہیں بہت زیادہ واقفیت تھی۔ فرانس، روس اور اسکنڈے نیوین ممالک کے ادب پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کی شخصیت بہت سی چیزوں کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ کوئی نشست۔۔۔۔ ہوتی جس میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا چراغ حسن حسرت، عطاء اللہ شاہ بخاری بیٹھے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ادب اور مذہب کوئی مختلف چیزیں نہیں تھیں۔ ادب کے لوگ مذہب سے بھی تعلق رکھتے تھے اور باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ علماء مثلاً عطاء اللہ شاہ بخاری کو اردو، فارسی کے ہزاروں شعر یاد تھے اور وہ اپنی تقریروں میں نگینوں کی طرح ان شعروں کو جڑ دیا کرتے تھے۔ جب دو گھنٹے کی نشست ہوتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے علم کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس میں شرکت کرتا تو وہ چاہتا تو بہت اچھی کتاب بھی مرتب کر سکتا تھا۔ میں اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ میں نے ان کی بہت زیادہ محفلوں میں شرکت کی۔ جب بھی یہ لوگ اکٹھے ہوتے تو کہتے تھے کہ سیف کو بلاؤ۔ اکثر یہ ہوتا کہ مولانا ہاشمی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حسرت، عطاء اللہ شاہ بخاری، فیض احمد فیض اور شیخ حسام الدین جب بھی امرتسر آتے تھے تو گروپ کی شکل میں آتے تھے۔ ان کی دو سے چھ گھنٹے تک ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس قسم کی نشستوں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

میں نے جن بڑے آدمیوں کو قریب سے دیکھا ان میں ادب میں فیض صاحب، صوفی تبسم اور ڈاکٹر تاثیر صاحب تھے۔ لیڈروں میں شیخ حسام الدین اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی حیثیت اس زمانے میں یہ تھی۔ (میں ۳۹-۱۹۳۸ء کی بات کر رہا ہوں) کہ وہ مجلس احرار کا دور تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ برصغیر کی تاریخ میں اتنا بڑا مقرر کوئی نہیں گزرا جیسے مولانا تھے۔ ادب سے انہیں بڑا شغف تھا۔

عربی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار انہیں از بر تھے۔ اپنی تقاریر میں اس طرح نگینے کی طرح شعر جوڑتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی موقع کے لئے شعر کہا گیا ہے۔ میں اس وقت بچہ تھا لیکن چونکہ شعر اور سیاست کا بہت شوق تھا۔ اس لئے میں ان کا جلسہ سنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں، میں نے کئی جلسے ایسے دیکھے کہ جہاں لاٹھی چارج ہونا لازمی ہوتا تھا۔ جلسے کے دوران میں ایسک وقت ایسا اتا تھا کہ لاٹھی چارج ہوتا تھا اور لوگ بھاگتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے بھی چوٹیں لگیں لیکن جاتے ضرور تھے۔ پتا نہیں کیا کشش تھی؟

امرتسر میں مولانا خیر الدین کی مسجد سیاسی و مذہبی جلسوں کا مرکز تھی اور وہاں ۵۰ سے ۶۰ ہزار آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ وہاں ایک بار عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کر رہے تھے۔ اس دوران کہنے لگے لوگ کہتے ہیں شاہ جی، آپ کہاں آپھنسے ہیں۔ دو ماہ کے لئے باہر ہوتے ہیں اور پھر دو سال کے لئے اندر ہو جاتے ہیں۔ نہ بیوی بچوں میں بیٹھے، نہ دوست احباب کی محفلوں کا مزہ لیا۔ نہ کچھ دائیں بائیں دیکھا۔ آخر آپ کو کیا شوق چڑھ گیا ہے؟ کیوں آپ بار بار جیل کی طرف جانے کے لئے رخ کر لیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسی باتیں نہ کرو۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے

ایسے انداز میں انہوں نے شعر پڑھا کہ میں حیران رہ گیا کہ واقعی اسی دن اور اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا گیا تھا۔

میں نے ان حضرات کو قریب سے دیکھا۔ بعض آدمی قریب آکر اور بڑے ہو گئے لیکن بعض قریب آنے سے اور چھوٹے ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے، اسی طرح شخصیات کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ بعض آدمی قریب جا کر چھوٹے، بھدّے، بدنُما اور غلط نظر آنے لگتے ہیں، لیکن بعض درمیانہ قسم کے لوگ ہوتے ہیں مگر ان کے قریب جانے سے ان کی شخصیت بہت بڑی اور عظیم ہو جاتی ہے اور وہ واقعی بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ بڑی محفلیں رہیں کیونکہ ان دنوں امرتسر ادبی و سیاسی سرگرمیوں کا ایک مرکز تھا۔

صوفی تبسم صاحب، امرتسر کے رہنے والے تھے، اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ جب چھٹی ہوتی تو وہ امرتسر تشریف لاتے۔ فیض، تاثیر، مولانا عرشی، شیخ حسام الدین، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سب اکٹھے ہو جاتے۔ بعض اوقات جگر اور جوش آ گئے تو پھر یہ سب مل بیٹھتے۔

دوسرا مرکز شیخ حسام الدین کا گھر تھا۔ یہ دونوں حضرات کشمیری تھے اور کشمیری گھروں میں آتش پرستوں کی طرح چولہا ہمیشہ چڑھا ہی رہتا ہے۔ کباب آ رہے ہیں، باقرخانی، روغنی نان، چاول اور کچھ نہ کچھ ہر

وقت کھانے کے لئے آتا ہی رہتا تھا۔ ان کے ہاں بڑی محفلیں ہوا کرتی تھیں اور یہاں پر اکثر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ میں انہیں جادو گر سمجھتا تھا کیونکہ میں نے انہیں دو دو لاکھ کے مجمع کو جب چاہا رلاتے اور جب چاہا ہنساتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب کبھی میں شیکسپئیر کی لکھی ہوئی انتونی کی تقریر دیکھتا تو سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ آج ہوتا تو مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا شاگرد ہوتا۔ ان کی شخصیت اور تقریر کا ایسا اثر تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ پہلے تلاوت کلام پاک کیا کرتے۔ اور تلاوت اتنی اچھی قرأت کے ساتھ کرتے تھے کہ لوگ کہتے، محسوس ہوتا ہے۔ کہ جیسے قرآن نازل ہو رہا ہے۔ بعد ازاں وہ تقریر شروع کرتے اور اذان فجر تک وہ تقریر جاری رہتی۔ اس عرصے کے دوران وہ جب چاہتے لوگوں کو رلا دیتے اور جس وقت چاہتے لوگوں کو ہنسا دیتے۔ ہر تقریر میں ان کے چند فقرے ایسے تاریخی ہوتے تھے کہ جو آج بھی لوگوں کو یاد ہیں مثلاً شاتم رسول ﷺ کے معاملے پر جسے غازی علم الدین نے قتل کر دیا تھا۔ (میں اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر آج بھی یاد ہے) کہنے لگے۔ "یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے رسول ﷺ کے بارے میں کوئی گستاخی کرے اور وہ زندہ رہے۔ انگریز کے دورِ حکومت میں یہ بات کہنا کتنی بڑی بے باکی اور جرأت تھی۔ کہنے لگے۔ "یاد رکھو، یا تو گالی دینے والی زبان نہیں رہے گی یا سننے والے کان نہیں رہیں گے۔"

انگریزوں کا ان کے بارے میں خیال تھا کہ یہ شخص جب چاہے دو ڈھائی لاکھ کا مجمع لے کر بغاوت کرا سکتا ہے۔ میں نے انہیں بڑے قریب سے دیکھا اور میں ان سے بہت متاثر تھا، حالانکہ میں خاکسار تھا اور وہ خاکساروں کے سخت مخالف تھے بلکہ میں نے مولانا صاحب کے خلاف خاکسار ہونے کی حیثیت میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔

کیونکہ میں مشن کے اعتبار سے پکا خاکسار تھا اور میرا ایمان تھا کہ یہ تحریک انقلاب لائے گی اور مسلمانوں میں تبدیلی پیدا کرے گی۔ میری ان سے جب پہلی ملاقات ہوئی اور میرے وہ شعر انہوں نے سنے تو شیخ حسام الدین سے کہنے لگے۔ "اوئے شیخا! اینہوں لے آ اپنے کیمپ وچ بھئی" (اے شیخ! اسے اپنے کیمپ میں لے آؤ)

انہوں نے کہا۔ "یہ تو پہلے ہی کیمپ میں ہے۔"

مولانا نے سوال کیا "کون سے کیمپ میں ہے؟"

شیخ صاحب نے کہا۔ "مخالف کیمپ میں۔"

مولانا کہنے لگے "کوئی بات نہیں، آدمی کو کسی نہ کسی کیمپ ہونا چاہیئے۔ چاہے مخالف کیمپ ہی کیوں نہ ہو۔"

شیخ صاحب نے مولانا کو بتایا کہ اس نے آپ کے خلاف ایک نظم بھی کہہ رکھی ہے۔

مولانا نے کہا۔ "سناؤ۔" پھر مجھ سے اپنے خلاف نظم سنی اور اس پر داد دی۔

یہ نظم اس طرح شروع ہوتی تھی کہ۔

وصالِ حُور کا قصہ سُنا کے لُوٹ لیا
عذاب گور کا نقشہ دکھا کے لُوٹ لیا
غریب قوم کو اُلّو بنا کے لُوٹ لیا
مثالِ فیل اکڑتے ہوئے، لٹکتے ہوئے
عصا زمین پر کس زور سے پٹختے ہوئے
سیاہ زُلف کو انداز سے جھٹکتے ہوئے
رہِ مبین سے ہر گام پہ بھٹکتے ہوئے
قلندروں نے تماشا بنا کے لُوٹ لیا

مجلس احرار کا یہ قصہ تھا اور جب کوئی سیاسی معاملہ ہوتا تھا تو یہ کانگریس کے ساتھ ہوتے تھے مگر مذہبی معاملات میں انفرادی طور پر مسلمانوں کی اعانت کرتے تھے۔ بہر حال اس نظم میں میرا مولانا کے ساتھ گستاخانہ لب و لہجہ تھا جو اچھا نہ تھا، لیکن وہ بہت بڑے اور عظیم لوگ تھے، ہمارا تو اس وقت آغاز ہوا تھا۔ شعر و شاعری میں نئے آئے تھے۔ جذبہ زیادہ تھا، عقل نہیں تھی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر نیا آنے والا اپنے خیالات اور نظریات میں بڑا متعصب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بالکل بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک میٹنگ میں مولانا اپنے ساتھ اپنے بیٹے کو بھی لائے تھے۔ سب سے بڑے فرزند (سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری) وہ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹا تھا۔ اسے فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ شاہ صاحب آ کر بیٹھے تو پہلے اس سے تعارف کرایا پھر کہنے لگے۔ "یہ سیف ہے، تمہارا بڑا بھائی ہے، اسے سلام کرو۔" پھر کہا۔ "چلو اب قاآنی کا فلاں قصیدہ سناؤ۔"

اس نے فر فر قصیدہ سنانا شروع کیا تو شاہ صاحب کہنے لگے۔ شیخ جی، آپ نے کچھ حساب لگایا؟"
شیخ حسام الدین نے کہا۔ "ہاں، میں سمجھ گیا ہوں۔"
شاہ صاحب کا اشارہ اردو کے ایک شاعر کی طرف تھا جنہوں نے اس قصیدے سے بہت کچھ اخذ کیا ہوا تھا اور یہ قصیدہ ان کے بارے میں ایک ریفرنس تھا۔
میرے والد مولانا کے بہت معتقد تھے انہوں نے جب قادیان میں کانفرنس تین روزہ احرار تبلیغ کانفرنس قادیان کی تو والد صاحب دو تین روز کے لئے وہاں انہیں سننے کے لئے گئے حالانکہ والد صاحب کبھی بھی کہیں نہیں جایا کرتے تھے۔ "یہ ایسا شخص ہے کہ ولی تو کیا اگر یہ اس سے بھی زیادہ دعویٰ کرے تو میں اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"
ایک مرتبہ میں اور والد صاحب شیخ حسام الدین کی گلی سے گزر رہے تھے۔ والد صاحب کا یہ حکم تھا کہ غیروں سے تعلقات نہیں رکھتے سوائے اپنے بھائیوں اور کزنز کے، اور اپنی عمر سے بڑے آدمی خواہ نیک

ہوں، فرشتے ہوں .... سے تعلقات نہیں رکھتے۔

مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری "سیف المسرور" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ تمہارے اشعار بڑے کاٹ دار ہیں۔ ہم جوں ہی گلی کا ایک موڑ مڑے تو سامنے دیکھا کہ شاہ جی "چلے آ رہے ہیں۔ وہ بڑے قوی ہیکل گورے چٹے اور سیاہ لمبے بالوں والے آدمی تھے۔ روشن آنکھیں اور سرخ پُر رعب چہرہ، ہاتھ میں بھاری بھر کم عصا ہوتا تھا اور ساتھ میں دوچار آدمی ضرور ہوتے تھے۔ مجھے دیکھا تو دونوں بازو پھیلا دئے اور کہا۔ "اوہ سیف المسرور، ابھی میں شیخ صاحب سے تمہارے بارے میں پوچھ کر آ رہا ہوں۔" مجھے سینے کے ساتھ لپٹا لیا اور ایک آدھ قرآنی آیت پڑھنے کے بعد میرے چہرے پر پھونک ماری۔ میں گھبرا رہا تھا کہ والد صاحب کھڑے ہیں اور وہ پوچھیں گے کہ یہ تمہارا واقف کیسے بن گیا، یہ تو عمر میں مجھ سے بھی بڑا ہے جبکہ میں نے تمہیں کہا ہے کہ اپنی عمر سے بڑے آدمی سے نہ ملا کرو۔

شاہ جی کے وہ بہت معتقد تھے، میں نے ان کا تعارف کرایا کہ یہ میرے والد صاحب ہیں۔

انہوں نے والد صاحب سے کہا۔ "اچھا اچھا، آپ بڑے خوش قسمت آدمی ہیں۔ اللہ نے آپ کو بڑا تحفہ دیا ہے۔ آپ کا بیٹا سیف ہمارا بھی بیٹا ہے۔"

اس کے بعد ہم اپنی اپنی راہ چلے گئے، والد صاحب نے بظاہر تو ظاہر کیا کہ وہ بہت ناراض ہیں لیکن انہوں نے سوچا ہو گا کہ جس شخص کو وہ اتنا بڑا سمجھتے ہیں، وہ بھی ان کے بیٹے کی تعریف کر رہا ہے۔ پوچھنے لگے۔ "بھئی یہ تمہارے کیسے واقف ہیں؟"

وہ اُس مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے جہاں مولانا عرشی امامت کرتے، درس اور خطبہ بھی دیتے تھے۔ اسی لئے میں نے کہا۔ "جی! وہ مولانا عرشی صاحب نے ایک بار بلوایا تھا اور وہاں شاہ جی سے ملاقات ہوئی۔"

کہنے لگے۔ "اچھا ٹھیک ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ شاہ جی ایک بار رہا ہو کر آئے۔ میں شیخ حسام الدین کے گھر بیٹھا ہوا تھا، مجھے دیکھا اور کہا! "او سیف المسرور، خدا تمہیں پوچھے"

میں نے کہا "شاہ جی کیا ہوا"

کہنے لگے۔ "تمہاری وجہ سے میں پوری رات جیل میں تڑپتا رہا ہوں اور سو نہیں سکا۔"

میں نے پوچھا "شاہ جی! میرا قصور کیا ہے؟"

کہنے لگے۔ میں جیل میں تھا اور وہاں شیخ آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ کوئی شعر سناؤ تو اس نے تمہارا ایک شعر سنایا۔ وہ شعر یہ تھا۔

تیرے قفس میں جوانی لٹا کے بیٹھ رہے
میرے چمن میں تڑپتی رہی بہار مری

خود ان کی یہ کیفیت تھی کہ ساری عمر قفس ہی میں رہے۔ گھر کے چمن کی بہاریں نہیں دیکھیں۔ بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے نہ بیٹھ سکے۔ بس آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یا تو تقریریں کرنے چلے جایا کرتے تھے یا پھر کبھی کلکتہ، بمبئی، دہلی، لکھنو، پشاور، پنڈی، لاہور میں ہیں یا پھر جیل میں ہیں۔ کبھی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے تو وہاں پر ہیں۔ اس لئے کہنے لگے۔ جب یہ شعر سنا تو ساری رات سیف، یقین کرو میں سلاخوں کے ساتھ سر پٹختا رہا ہوں۔''

میں نے بتایا کہ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے ان لوگوں کی صحبت حاصل رہی اور میں نے ان کی محفلوں میں شرکت کی۔ ورنہ لاکھوں ایسے انسان تھے کہ جنھوں نے انہیں قریب سے دیکھا تک نہیں مگر وہ مجھ سے بے حد محبت سے ملتے تھے۔ میں جب کبھی اس بارے میں سوچتا ہوں تو بہت خوش ہوتا ہوں اور خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔

شیخ حسام الدین بھی بہت بڑے لیڈر تھے مگر شاہ جی کی شخصیت اتنی نمایاں تھی کہ احرار کے باقی لیڈروں کے قد ان کی موجودگی میں چھوٹے ہو جایا کرتے تھے۔

بہادر یار جنگ کا اسلوب اور تھا جبکہ شاہ جی کا انداز مختلف تھا۔ وہ درویش تھے۔ یہ لوگ تو پیدا ہی قربان ہونے کے لئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کہ جنہیں ماں کی گھٹی میں آزادی کی تعلیم ملتی ہے اور وہ ان کے خون میں سرایت کر جاتی ہے۔ وہ تو انگریز کی غلامی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے اور کہتے تھے۔ مسلمان ہونا اور غلام ہونا یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ جس وقت تک میں آزاد نہیں ہوں، مسلمان نہیں ہوں۔ شاہ جی انگریز کے اتنے سخت خلاف تھے کہ کہتے تھے ''تمام عالم اسلام میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ذمے دار انگریز ہے، اس لئے انگریز کو یہاں سے نکال پھینکو۔'' اس لئے وہ ایسے مواقع پر انگریز کی مخالفت پر کانگریس سے اتحاد کر لیا کرتے تھے، لیکن جب مسلمانوں کے مفاد کا معاملہ ہوتا تھا تو پھر وہ سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔

مجلس احرار والے .... اس قسم کے لوگ تھے جنھوں نے انگریزوں سے لڑائی کی تھی۔ پندرہ سال تک جیلیں کاٹی تھیں، وہ اس وقت غلطی کر گئے۔ انہیں علم نہ ہو سکا کہ آنے والا وقت کیا ہے؟ اگر وہ اس قومی دھارے میں شامل ہو جاتے تو آج قوم کی حالت کچھ اور ہوتی۔ اب اگر اقتدار میں نون، چٹھے، دولتانے، ٹوانے اور خضر حیاتی آجائیں تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ گاؤں دیہاتوں میں جہاں ان کی عمل داریاں ہیں۔ وہاں جا کر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ جنگل کا راج ہے اور کوئی آدمی ان کے خلاف بول نہیں سکتا اور یہ سب کچھ اس ترقی یافتہ دور میں ہو رہا ہے۔ اس طرح آپ تھانے چلے جائیں، قتل کروانا ہو، کسی کی پٹائی کروانی ہو یا کسی کو مکان سے بے دخل کرنا ہو، تھانوں میں ہر چیز کا سودا ہوتا ہے۔ میں یہ سُنی سنائی باتیں نہیں کر رہا بلکہ میرا بڑا قریب سے مشاہدہ ہے اور میں نے اپنے کانوں سے لوگوں کو یہ باتیں کرتے سنا ہے۔

آدمی کو جب اپنے حقوق کا شعور ہو جاتا ہے تو وہ اس کے لئے لڑتا ہے۔ ابھی تک لوگوں کو اسکا شعور

حاصل نہیں ہوا ہے۔ مزارع سے اس کے حق کی بات......... کریں تو وہ انکار کردے گا کیونکہ اسے پتا ہے کہ انسانوں کی طرح رہنا اس کا حق نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسانوں کی طرح تو میاں صاحب، چوہدری صاحب یا خان صاحب رہ سکتے ہیں۔ میں تو جانوروں میں سے ہوں اور اس لئے پیدا ہوا ہوں کہ ان کی غلامی کروں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میاں افتخار الدین اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ اپنے علاقے میں اسکول نہیں کھولنے دیتے تھے کہ تعلیم نہیں آنی چاہیئے۔ حالانکہ کتنے روشن خیال اور ترقی پسند سمجھے جاتے تھے۔

(ماخوذ: انٹرویو، سیف الدین سیف۔ ماہنامہ سرگذشت کراچی، اکتوبر ۱۹۹۳ء)

فیروز سائیں

پتھر دلاں نوں موم بناؤندا سی

بڑا ہرج پہنچاوندی قوم تائیں! — درد مند عالم غم خوار دی موت
دل لکھاں سپاہیاں دا توڑ دیوے — ہو جائے جد سپہ سالار دی موت
جدوں موت آئے سچے رہبراں نوں — تدوں ہوندی اے لکھ ہزار دی موت
یاد رہے سانوں کدی بھلنی نئیں — یارو سید بخاری سردار دی موت

جھڑے قوم توں جان قربان کر دے — گھٹ ہوندے او سردار سید
اج موت نے آن کے چھڈیا نہ — ہے سی مدتاں دا بیمار سید
سچی گل سنائے نڈر ہو کے — گیا جیل اندر کئی وار سید
دلوں برا غلامی نوں جانے — ٹر گیا اوہ اج احرار سید

لکھاں رحمتاں تیرے نصیب ہوون — ہووے جنت دے وچ مکان تیرا
بخش دیوے گا رب کریم تینوں — ہے سی بڑا مضبوط ایمان تیرا
پتھر دلاں نوں موم بناؤندا سی — سچا خلق تے سوہنا بیان تیرا
قرآن دے نال سی پیار تینوں — بھلا کرے گا رب رحمان تیرا

علامہ لطیف انور مرحوم

ادائے زیست ترے قرب کا عطیہ ہے

فضا میں تیرے تکلم کی باس ہے ابتک — صبا کو تیرے تبسم کا پاس ہے ابتک
تری نگاہ نے جس کو جلال بخشا تھا — زبانِ دل پہ وہی التماس ہے ابتک
کتاب دل میں زمانے کے ہاتھ سے محفوظ — ترے خلوص کا کچھ اقتباس ہے ابتک
سکوت تیری صدا کا پکارتا جائے — کہ آدمی کے مقدر میں یاس ہے ابتک
نہ تیرے بعد کوئی محرمِ وفا گزرا! — رہِ حیات کی ہر شئے اداس ہے ابتک
متاعِ عام نہیں عشق کی توانائی — بہت ضعیف ہے جہاں کی اساس ابتک
کبھی تو سینۂ ہستی کو چاک کر دے گی — وہ اک فغاں کہ رہینِ قیاس ہے ابتک
زمیں پہ پھول ہیں شاخوں پہ جابجا کانٹے — میرے چمن کی ہوا بدحواس ہے ابتک
وہ خوئے قتل کہ پروردۂ سیاست ہے — جہانِ نخوتِ آدم کو راس ہے ابتک
اُتر فلک سے کسی دن ضرور برسے گی — زمیں کو خونِ من و تو کی پیاس ہے ابتک
وفا برہنگیٔ آرزو سے کم تو نہیں — کہ دیدۂ زیب ریا کا لباس ہے ابتک
ہزار رحمت جلوہ ہے جسکی محرومی — وہ اک طلسمِ دلِ غم شناس ہے ابتک
ادائے زیست تیرے قرب کا عطیہ ہے — مرا شعور سراپا سپاس ہے ابتک

❋ ❋ ❋

محترم ملک عبدالغفور انوری (رحمتہ اللہ علیہ) نے بیان کیا کہ شاہ جی کے آخری برسوں کی بات ہے ایک روز میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب معمول پرسش احوال کی۔ مجھے فرمانے لگے.... اک بات کہیں تم سے ؟..... خفا تو نہیں ہو گے ؟ میں نے کہا نہیں، شاہ جی ہر گز نہیں ! آپ ضرور فرمائیں۔ شاہ جی نے پھر یہی فرمایا کہ "اک بات کہیں تم سے ؟ خفا تو نہیں ہوں گے ؟" میں اس پر واقعی پریشان ہو گیا۔ اور زیادہ لجاجت سے عرض کہ شاہ جی ! آپ بلا تردد ارشاد فرمائیں۔ آخر سے مجھ کیا خطا سرزد ہو گئی ہے ؟ شاہ جی مسکرائے اور پھر سہ بارہ، یہی بات دہرائی۔۔۔۔ اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہو گے ؟ اب میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ لیکن شاہ جی نے فوراً ہی فرمایا۔۔۔۔ پہلو میں ہمارا دلِ مضطر نہیں ملتا ! اب میں سمجھا کہ اوہو، شاہ جی تو شعر پڑھ رہے تھے۔ اور میری حالت سے لطف لے رہے تھے۔ شاہ جی کا شعر پڑھنا اور شعر کی معنویت اور مناسبت کو اس حسن و خوبی سے ظاہر کرنا۔ یہ سب دل پر نقش ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے۔

اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہوگے؟
پہلو میں ہمارا دلِ مضطر نہیں ملتا۔

(یہ شعر آغا شاعر لکھنوی کا ہے۔ ذوالکفل)

کوثر نیازی

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

گاؤں میں جب سے شعور نے آنکھیں کھولیں سرخ وردیوں اور کلہاڑیوں کو دیکھنا شروع کیا' یہ احراری حضرات کا مخصوص لباس تھا' پہلی جماعت میں ہمارے استاد صوفی عبدالرحیم صاحب مسکین تھے جو اس وقت ضلعی مجلسِ احرار کے صدر اور آج کل کُل پاکستان مجلس احرار اسلام کے صدر ہیں' ان کی زبان سے پہلی بار سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر سنا' صوفی مسکین کا شمار گاؤں کے سربر آوردہ لوگوں میں ہوتا تھا' تقریر بھی اچھی خاصی کرتے تھے' پنجابی اور اردو کے شاعر بھی تھے' انہوں نے اپنے اردگرد گاؤں کی اچھی خاصی جماعت جمع کر لی تھی' کبھی کبھی یہ لوگ سرخ وردیاں پہنے اور کلہاڑیاں کندھوں پر رکھے گاؤں کی گلیوں سے گذرتے تو لطف ہی آجاتا۔ نہر کے کنارے درختوں کے نیچے ان کے جلسے منعقد ہوتے تو پورا گاؤں اُمنڈ آتا۔ کالاباغ کے مولانا گل شیر شہید ان جلسوں کے مقبول مقرر۔ دورانِ وعظ وہ بھی شاہ جی کا ذکر ضرور کرتے' اس طرح گویا بچپن ہی سے یہ نام حافظے پر مرتسم ہو کر گیا تھا۔

51ء میں مستقلاً لاہور آ گیا تو اس سے اگلے سال 52ء میں پہلی مرتبہ شاہ جی کی زیارت ہ باغ بیرون موچی دروازہ کی تاریخی جلسہ گاہ میں ایک عظیم اجتماع انہیں سننے کے لئے جمع تھا۔ میں بھی دیکھنے اور سننے کے لئے کشاں کشاں پہنچا' وہ منظر مجھے اب تک یاد ہے جب شاہ جی سٹیج پر تشریف ا سروقد' خوبصورت نقش و نگار' لمبے لمبے گیسو، بھرے بھرے پُر رعب چہرے پر گھنی ڈاڑھی' لحن میں قرآن حکیم پڑھنا شروع کیا تو یوں لگا جیسے شجر و حجر جھوم اٹھے ہوں۔ بولے تو موتی رولے۔ ظفر علی خان کا شعر زبان پر آ گیا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

مجلسِ احرار 1929ء میں قائم ہوئی یہ شروع شروع میں صرف مجلسِ احرار پنجاب تھی' 1932ء میں آل انڈیا مرکزی مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔ دونوں مرتبہ اس کے صدر مولانا حبیب الرحمان منتخب ہوئے مگر شاہ جی کا تعلق اس سے ویسا ہی تھا جیسے کانگریس سے گاندھی کا' شاہ جی اور احرار دونوں لازم و ملزوم تھے۔ ایک نام سن کر دوسرا نام خود بخود ذہن میں آ جاتا تھا' سیاسی مسلک اس جماعت کا وہی تھا جو جمعیت علمائے ہند کا تھا۔ جمعیت کانگریس کا دینی محاذ تھی تو احرار مسلمانوں میں اس کا عوامی اور سیاسی

مورچہ' احرار کے اکثر ارکان حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عقیدت مند تھے اور بدیں وجہ سیاست میں بھی انہی کے مقلّد تھے' اس لحاظ سے مجلس احرار اور شاہ جی دونوں تحریک پاکستان کے مخالف تھے مگر انگریز دشمنی اور تحریک آزادی کے لئے جو قربانیاں انہوں نے پیش کیں کوئی دیانت دار مورّخ ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا' تحریک پاکستان کی مخالفت زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کی اجتہادی غلطی تھی' پاکستان بن گیا تو مجلس احرار سیاست سے علیحدہ ہو گئی اور دل وجان سے پاکستان کی حمایت اور محافظت کرنے لگی۔ 50ء میں بھارتی فوجیں پاکستانی سرحدات پر جمع ہوئیں اور لیاقت علی خان مرحوم نے پنڈت نہرو کو مشہور عالم مکاّ دکھایا تو شاہ جی بھی میدان عمل میں آ گئے۔ انہوں نے ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا اور دفاعِ پاکستان کے موضوع پر یادگار جلسوں سے خطاب کیا۔

مجلسِ احرار نے برّصغیر کی سیاست میں کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں کی مگر یہی کیا کم ہے کہ اس نے اردو زبان کے بعض ایسے قد آور اور نامور خطیبوں سے قوم کو روشناس کرایا جو حقیقی معنوں میں میدان خطابت کے شاہ سوار تھے۔ جس طرح سیاست میں جماعت اسلامی کا اصل اثاثہ اس کا لٹریچر ہے اسی طرح احرار کی شہرت بھی اس کے بے مثال خطیبوں کی مرہونِ منت ہے۔ میں نے نہ صرف ان خطیبوں کی تقریریں سنی ہیں بلکہ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ میں نے خود جلسہ ہائے عام سے خطاب کیا ہے۔ ہمارے ہاں کون ایسا ہو گا جس نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی' ماسٹر تاج الدین انصاری' شیخ حسام الدین' صاحب زادہ فیض الحسن' مولانا مظہر علی اظہر' مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا محمد علی جالندھری اور آغا شورش کاشمیری کا نام نہ سنا ہو' یہ سب اسی آسمان خطابت کے چاند اور ستارے تھے ان تمام مقررین کی نمایاں خصوصیات ان کا جذباتی اندازِ بیاں' شعروادب کی چاشنی اور مذہب سے حد درجہ شیفتگی تھیں۔ ان کے مداحوں سے قطع نظر ان کے مخالفین بھی ان کے جلسوں میں ان کی تقریروں سے لطف اندوز ہونے کیلئے شوق سے جاتے تھے اور ان کے لطیفوں' چٹکلوں اور دلچسپ انداز بیاں کا دل سے اعتراف کرتے تھے۔
جس جماعت کے پاس اتنے بڑے بڑے عوامی خطیب ہوں اس کے اجتماعات کی کامیابی میں کیا شک وشبہ ہو سکتا ہے؟۔

مگر ان چاند تاروں نے کسبِ نور جس آفتاب سے کیا وہ شاہ جی ہی کی ذات تھی' یہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے جلسوں کو اپنی تقریر کے جادو سے مسحور کر دینے کے فن میں کوئی شخص شاہ جی کا ہم پلّہ نہ تھا وہ رات کے نو دس بجے تقریر شروع کرتے تو صبح تک کئے جاتے اور سننے والے اس طرح جم کر بیٹھتے گویا تمام عمر تقریر ہوتی رہے تو تمام عمر یوں ہی بیٹھے رہیں گے' تقریر میں جذبات کی شدت پیدا کر کے لوگوں کو بے

اختیار رلا دینا' ایثار اور قربانی کے بیان سے انہیں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار کر دینا اور چٹکلوں اور لطیفوں سے روتی ہوئی محفل کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

شاہ جی کو اگر زمانہ قدیم کے خطیبوں میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ یونان کا "ڈیما ستھینز ہے جسے اس دور کے مورخین نے سب سے پہلا بڑا خطیب قرار دیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "ڈیما ستھینز نے شجاعت کے موضوع پر فقط داد خطابت دی ہے ولولہ انگیز تقریریں کیں ہیں اور وقت آنے پر میدان کارزار سے راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھی ہے' مگر شاہ جی نہ صرف کاروانِ شجاعت کے حدی خواں تھے بلکہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ساری عمر مصائب اور آزمائشوں کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ خود فرماتے تھے "میری آدھی عمر ریل میں اور آدھی جیل میں کٹ گئی"۔

جماعت اسلامی والے عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے خطابت میں ایک نیا انداز اور نیا اسلوب پیدا کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر جماعت کا مکتب فکر خطیبانہ جوہر نہیں رکھتا۔ جس طرح مجلس احرار خطابت کیوجہ سے آگے بڑھی ہے اس جماعت کے اکابر اپنی تحریروں کی وجہ سے معروف ہیں ان کی تقریریں خشک تحریروں کی مانند ہوتی ہیں اور ان تقریروں میں وہ ایسی لق و دق اور نامانوس اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جو اکثر اوقات سامعین کے سر سے گزر جاتی ہیں البتہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت اس جماعتی رنگ سے مستثنیٰ تھی (جو مولانا مودودی مرحوم کی غیر حاضری میں امیر جماعت ہوتے تھے مگر بعد میں جماعت سے اختلافات کی بنیاد پر مستعفی ہو گئے تھے) مولانا اصلاحی نہایت بلند پایہ خطیب ہیں اور ان کی تقریریں علم اور جذبے کا حسین آمیزہ ہوتی ہیں یا پھر مولانا گلزار احمد مظاہری ہیں جن کا وعظ و خطابت میں اپنا ایک رنگ ہے مگر یہ رنگ ان میں مجلس احرار کے سابقہ تعلق کے زیر اثر پیدا ہوا ہے اس میں جماعت کا کوئی عمل دخل نہیں۔

اس مکتب فکر کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر جناب نعیم صدیقی ہیں جو جماعت کے دائرے میں ایک اعلیٰ پائے کے مقرر بھی شمار ہوتے ہیں اور اس میں شک نہیں وہ ایک اچھے لیکچرار ہیں' اپنے موضوع پر خوب محنت کرتے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عوامی خطابت کے جوہر سے وہ بھی محروم ہیں ایک بار موصوف کے فن تقریر پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے نہایت عمدہ اور موزوں تبصرہ کیا تھا یہ ان دنوں کی بات ہے جب 53ء میں ہم لوگ لاہور سنٹرل جیل میں نظر بند تھے۔ ان ایام اسیری کے دوران کبھی کبھی مجلس شعر بھی آراستہ ہوتی تھی۔ ایک ایسی ہی محفل میں جناب نعیم صدیقی کا تعارف ان سے کرایا گیا تو فرمانے لگے۔

"اچھا آپ ہیں نعیم صدیقی! خوب! کچھ تعارف تو آپ سے پہلے بھی ہے وہ اس طرح کہ ایک بار میں قاسم باغ کے قریب سے گزر رہا تھا وہاں کوئی جلسہ تھا جس میں ایک

تقریر جاری تھی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو پوچھنے پر پتہ چلا کہ مشین نہ تھی آپ تھے۔"

خطابت کا جادو جگانے کے لئے خطیب کو سحر آفریں شخصیت کا بھی حامل ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے بھی شاہ جی کا جواب نہ تھا۔ قدرت نے انہیں ایسا حسن اور مردانہ وجاہت عطا کی تھی کہ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کہتے ہیں ایک انگریز فلم ساز نے انہیں تقریر کرتے دیکھ کر کہا تھا کہ اگر مجھے اپنی فلم میں حضرت مسیح علیہ السلام کا کردار ادا کرنے کے لئے کسی شخص کو لینا ہو تو اس مقصد کے لئے اس شخص سے زیادہ موزوں کوئی نہ ہو گا۔

1892ء میں پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے' بعد میں امرتسر آ گئے' یہیں دینی تعلیم حاصل کی' پاکستان بنا تو ملتان میں قیام پذیر ہوئے' 21 / اگست 1961ء کو جان جان آفرین کے سپرد کی' انہوں نے پوری عمر اور پوری عمر کی تمام تر توانائیاں ملک و ملت کی نذر کر دیں۔ کسی اور کو یاد ہو یا نہ ہو مگر

ہمیں ہے یاد سرگزشتِ زندگی نہال کی
ہوا تمام، حسنِ گلُ رخاں سے کھیلتا ہوا

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم اور شاہ جی سنٹرل جیل لاہور میں اکٹھے ہو گئے' یہ 1953ء کی بات ہے جب تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں شاہ جی دوسرے احرار راہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے تھے' میں ان دنوں جماعتِ اسلامی میں شامل اور اس کے آرگن "کوثر" لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ اٹھارہ' انیس سال کی عمر تھی' جماعت نے اس تحریک میں باقاعدہ حصہ نہیں لیا تھا وہ اسے آئینی حدود میں رکھنا چاہتی تھی مگر مولانا مودودی اس موضوع پر ایک کتابچہ لکھنے کی وجہ سے گرفتار ہوئے تو ان کے ساتھ دوسرے جماعتی راہنماؤں کے علاوہ میں بھی پکڑا گیا۔ شاہ جی اور ان کے ساتھی سنٹرل جیل کے جس احاطے میں نظر بند تھے وہ دیوانی گھر کے نام سے مشہور تھا' ہم جس احاطے میں تھے اسے "بم کیس" کہتے تھے۔ یہ "بم کیس" نام اس احاطہ کا اس لئے پڑا تھا کیونکہ اس میں مشہور بم کیس میں ملوث بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی رہا کرتے تھے۔ بھگت سنگھ پر دہلی کے اسمبلی ہال میں بم پھینکنے کا مقدمہ چلا اس پر ایک انگریز پولیس کپتان کے قتل کا بھی الزام تھا۔ پھانسی کی سزا ہوئی تو بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے پھانسی کا پھندا خود اپنی گردن میں ڈالا اور نعرے لگاتے ہوئے موت کو لبیک کہا۔ "بہارستان" میں مولانا ظفر علی خان کی یہ نظم اسی زمانے کی یادگار ہے۔

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق کا جو ست نکلے
تو اس کے ذرّے ذرّے سے بھگت سنگھ اور دت نکلے

تو وہاں میں عرض کر رہا تھا کہ شاہ جی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیوانی گھر میں رہتے تھے اور ہم بم کیس میں، جیل حکام سے کہہ کر ہم نے یہ رعایت لے لی تھی کہ جمعہ کے جمعہ ہم لوگ آپس میں مل لیں۔ اس رعایت کے تحت ایک جمعہ ہم لوگ دیوانی گھر جاتے تو اگلے جمعہ شاہ جی اپنے رفقاء کے ساتھ بم کیس تشریف لے آتے اسی زمانے کا ایک لطیفہ اب تک یاد ہے، ہم لوگ والی بال کھیلا کرتے تھے دیوانی گھر ٹیم کے کپتان صاحبزادہ فیض الحسن تھے اور بم کیس ٹیم کا میں، شاہ جی بڑی دلچسپی سے کھیل دیکھتے، کبھی کبھی خود بھی شامل ہو کر سروس کیا کرتے تھے ایک بار مولانا امین احسن اصلاحی نے شاہ جی سے کہا:

"شاہ جی آپ سروس کرتے ہیں"۔

انہوں نے کہا "ہاں پوری زندگی سروس کرتے ہی گزار دی ہے"۔

مولانا اصلاحی برجستہ بولے "لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ سروس اکثر فاؤل ہوتی ہے"۔

سنٹرل جیل کے اس زمانہ نظربندی میں، میں نے خوب خوب شاعری کی، ایک تو میں شادی کے تیسرے ہی دن گرفتار ہوا تھا کچھ اس کا اثر اور کچھ "رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" کے اصول کا نتیجہ، ہر روز ایک آدھ غزل ہو جاتی، میرے مجموعہ کلام "زرِگل" کا بیشتر حصہ اسی عہد اسیری کی یادگار ہے۔ شاہ جی تشریف لاتے تو شعر و سخن کی محفل بھی جمتی۔ وہ شعر کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے خود شاعر تھے ندیم تخلص کرتے تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں، میرے اشعار سنتے اور بزرگانہ داد سے حوصلہ افزائی فرماتے، ایک مرتبہ میں نے غزل سنائی تو اس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

صیاد نے تیرے اسیروں کو آخر یہ کہہ کر چھوڑ دیا
یہ لوگ قفس میں رہ کر بھی گلشن کا نظارا کرتے ہیں

بے اختیار تڑپ گئے، بار بار شعر کی تکرار کرائی، کہنے لگے مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا۔ انگریز کے زمانے میں کالے پانی کے اسیر مولانا جعفر تھانیسری اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت ہوئی تو انگریز گورنر پھانسی کے دن خود یہ نظارا دیکھنے آیا، سزائے موت پانے والوں کا عالم یہ تھا کہ وہ خوشی کے مارے نعرے لگا رہے تھے انگریز حاکم نے حیران ہو کر پوچھا "ابھی تھوڑی دیر میں تو یہ لوگ پھانسی چڑھنے والے ہیں انہیں خوشی کس بات کی ہے؟ جیل کے حکام نے کہا "ان کے مذہب میں یہ موت شہادت ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ یہ اس طرح مر کر سیدھے جنت میں جائیں گے اسی لئے خوش ہیں"۔ انگریز کہنے لگا "اگر یہ بات ہے تو میں انہیں خوش نہیں ہونے دوں گا، ان کی سزائے موت سزائے عمر قید میں تبدیل کر دی جائے"۔ شاہ جی نے اپنے انداز خاص میں یہ واقعہ سنایا اور کہا "برخوردار! اب شعر پڑھو" میں نے شعر پڑھا تو شاہ جی کی اس تشریح کی روشنی میں شعر کا مزا ہی دوبالا ہو گیا تھا۔

جیل سے رہائی ہوئی تو ایک عرصے تک شاہ جی سے ملاقات نہ ہو سکی' ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے تو ایک دوست کی معرفت یاد فرمایا' ان دنوں وہ مشہور شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہو چکے تھے اور ان کا زیادہ وقت عبادت میں گزرتا تھا' حضرت رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ ایمپریس روڈ لاہور کی ایک کوٹھی میں مقیم تھے' شاہ جی نے وہیں طلب فرمایا میں پہنچا تو حضرت رائے پوری مجلس آرا تھے اور بہت سے لوگ باادب ہو کر ان کے ملفوظات سے مستفید ہو رہے تھے' انہی میں شاہ جی بھی تھے میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا' میں نے دیکھا جتنی دیر حضرت رائے پوری کی مجلس ارشاد قائم رہی شاہ جی اس ادب و تواضع سے بیٹھے رہے جیسے ان کے سر پر کبوتر بیٹھے ہوں کہ یہ ہٹے تو اڑ جائیں گے۔

دوسری مرتبہ ملنا ملتان میں ہوا' میں یہاں ایک اجتماع سے خطاب کرنے گیا تھا۔ پہنچا تو معلوم ہوا شاہ جی بیمار ہیں دوستوں کے ساتھ ان کی عیادت کی غرض سے ان کے آستانے پر حاضری دی مگر یا للعجب یہ کیا ایک کچی بستی میں کچا مکان نہ کوئی نوکر نہ چاکر' پردوں کی جگہ دیواروں پر بوریاں لٹکی ہوئیں' مجھ سے نہ رہا گیا کہا "شاہ جی! آپ یہاں رہتے ہیں؟" کہنے لگے "ہاں یہی محل تو میں نے ہندوؤں کے سرمائے سے بنوایا ہے" یہ اس الزام کی طرف اشارہ تھا جو بعض سنگ دل لوگ انہیں کانگریس کا تنخواہ دار کہہ کر لگایا کرتے تھے' طبیعت تڑپ اٹھی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر میں نے دیکھا اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی شاہ جی کے چہرے پر صبر و شکر کا نور بکھرا ہوا تھا۔ بقول حضرت انجم فوقی بدایونی ؎

اہلِ دل شدّت غم سے کہیں گھبراتے ہیں
اوس پڑتی ہے تو پھول اور نکھر جاتے ہیں

تیسری بار اور آخری بار انہیں مرض الموت میں دیکھا' وہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں اپنے عقیدت مند کی ایک کوٹھی میں بغرض علاج ٹھہرے ہوئے تھے زبان پر فالج کا اثر تھا' بول نہیں سکتے تھے اللہ اکبر! یہ منظر دیکھنا بھی تقدیر میں لکھا تھا کہ وقت کا سب سے بڑا خطیب اور زبان سے ایک لفظ ادا کرنے میں عاجز و محتاج' شاید قدرت یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ جس فصاحت و بلاغت پہ حضرت انسان ناز کرتا ہے وہ اس کا کمال نہیں کسی کی عطا ہے جب چاہے جس طوطیٔ خوش نوا کو چاہے منقار زیر پر کر سکتا ہے' انہیں دیکھ کر بے ثباتیٔ عالم کی تصویر نگاہوں میں کھنچ گئی۔ کچھ دیر ان کے سرہانے بیٹھ کر واپس آ گیا۔ دو ہی چار روز کے بعد سنا شاہ جی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

وہ حلم اور وہ تواضع اور وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگرؔ کو لاکھ انسانوں کا انساں تھا

پروفیسر خالد بزمی

اک مرد باکمال وہ بھی تھا

ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک

"برادران اسلام! آج رات کو .... بعد نماز عشاء مسجد خیر الدین مرحوم میں .... امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری......... تقریر فرمائیں گے۔ آپ حضرات کو چاہیئے کہ جوق در جوق تشریف لا کر جلسے کی رونق کو......... دوبالا فرمائیں۔"

یہ ڈھنڈورے کے وہ الفاظ ہیں جو اکثر امرتسر کے بازاروں اور سڑکوں پر گونجا کرتے تھے۔ اور جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر ہے تو یہ الفاظ ڈھنڈورے سے زیادہ لوگوں کی زبانوں کے ذریعے سارے شہر میں پھیل جایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ امرتسر میں جب بھی شاہ جی کی تقریر ہوتی تو مسجدوں میں خاص طور پر یہ خبر کسی اہتمام یا انتظام کے بغیر ہی از خود ہر نمازی تک پہنچ جاتی تھی۔ اور اگر تقریر مسجد خیر الدین میں ہوتی تو لوگ اکثر عشاء کی نماز وہیں ادا کرتے تھے تاکہ اسٹیج کے قریب ہی جگہ حاصل ہو سکے۔

میں نے لوگوں کو شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے اس طرح ٹولیاں بنا کر جلسہ گاہ کی طرف جاتے دیکھا ہے کہ جس طرح لوگ عموماً عید کی نماز پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ میں بھی اپنے بچپن ہی سے ہمیشہ ان ٹولیوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے بچپن سے تقریریں سننے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ اور خصوصاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے لئے میرے والد اور بھائی صاحب بھی ضرور جاتے تھے۔ مختلف مشاہیر ملت کی تقریروں میں شامل ہونے کی عادت تو مجھے اپنے والد صاحب ہی سے ملی ہے جو خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، مظہر علی اظہر، تاج الدین انصاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی تقریروں اور مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے مناظروں میں ضرور شامل ہوتے رہے ہیں۔

میں ذاتی طور پر ان میں سے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی جوہر اور چودھری افضل حق مرحوم کی تقاریر سے محروم رہا ہوں۔ میں نے جس شخصیت کی تقریریں زیادہ سنی ہیں وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ گویا اس سلسلے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد لاہور میں شاہ جی کی جس قدر تقریریں ہوئی ہیں میں شاید ہی کسی تقریر سے غیر حاضر رہا ہوں گا۔

شاہ جی کی ہر تقریر کے موقع پر بلا مبالغہ اگر لاکھوں نہیں تو کئی ہزار لوگ تو ضرور موجود ہوتے تھے اور

انکی تقریر جتنی دیر تک رہتی سامعین نہایت ذوق و شوق سے ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ شاہ جی کی تقریر کے موقع پر رات کے تین تین چار چار بجے تک تو میں بھی جاگتا رہا ہوں۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب میں لڑکپن کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ نہ جانے ان کی زبان میں کیا سحر اور دلکشی تھی کہ حاضرین میں سے کسی کو نیند محسوس ہوتی تھی اور نہ کوئی ایک لمحے۔کے لئے اکتاہٹ محسوس کرتا تھا۔ اگر تقریر کو جادو کہا جاسکے تو بلاشبہ شاہ جی بہت بڑے "جادو گر" تھے۔

میرے والد مکرم شیخ عبدالعزیز امرتسری اس واقعے کے راوی ہیں کہ ایک مرتبہ امرتسر میں کنھیا لال کے منڈوے میں مرزا بشیر الدین محمود کی تقریر تھی۔ شہر کے اکثر مولویوں نے مسلمانوں کو وہاں جانے سے روکا۔ چنانچہ مرزائیوں کے علاوہ وہاں شاید بہت ہی کم لوگ گئے۔ ابا جی کہتے ہیں میں نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی مرزا محمود آخر کہتے کیا ہیں۔ جب تقریر کا وقت ہوا اور مرزا صاحب نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر الحمد کی تفسیر بیان کرنا شروع کی تو نہ جانے اچانک عطاء اللہ شاہ بخاری کہاں سے نکل آئے اور انہوں نے للکار کر کہا کہ مرزا صاحب آپ قرآن کی تفسیر تو غلط نہ کیجئے۔ مرزا صاحب عطاء اللہ شاہ کو دیکھ کر سخت گھبرائے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے اس جگہ کو بہت محفوظ سمجھ کر وہاں آئے تھے۔

وہاں اس وقت محمد اعظم تھانیدار اور عزیز دین کوتوال حفاظت پر متعین تھے۔ انہوں نے سرخ سرخ آنکھیں دکھائیں لیکن شاہ جی ان باتوں سے کب ڈرنے والے تھے۔ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ آخر لوگوں نے مرزا صاحب کو شاہ جی سے مناظرہ کرنے کو کہا۔ لیکن مرزا نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر کوتوال اور تھانیدار نے شاہ جی سے کہا۔

شاہ جی! مرزا صاحب آپ کے ساتھ مناظرہ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا ہے۔ اب ہم آپ سے صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کو یہاں سے جانے دیجئے وہ اب یہاں تقریر بھی نہیں کریں گے۔ شاہ جی کہا۔

"کیسے جانے دوں اگر اس میں جرأت ہے تو سامنے کھڑے ہو کر بات کرے"

اس کے بعد شاہ جی سینما ہال کے باہر آگئے۔ وہاں اتفاق سے ایک تانگہ کھڑا تھا۔ شاہ جی نے اس پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی۔ اور آن کی آن میں سارا بازار ایک جلسہ گاہ بن گیا۔

دیکھا جائے تو شاہ جی کا جذبہ، جرأت اور دلیری محض تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں تھی۔

شاہ جی اپنی رائے کے اظہار میں بڑے بیباک تھے۔ وہ بڑے بڑوں کے منہ پر بھی حق گوئی سے باز نہ آتے۔ اور اگر کہیں مذہبی یا سیاسی اختلاف ہوتا تو لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت واشگاف الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کر دیتے تھے۔

میرے والد صاحب ہی راوی ہیں کہ ایک دفعہ سخت سیاسی بے چینی کا دور تھا اور انگریزوں کے خلاف عوام کے جذبات بہت مشتعل تھے۔ شاہ جی اپنے مرشد اول پیر مہر علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ (گولڑہ) کے

پاس گئے اور ان سے جہاد کے موضوع پر گفتگو کی۔ پیر صاحب فرمانے لگے۔ "اچھا میں دعاء کروں گا۔"
شاہ صاحب جو نہایت پر جوش الفاظ نے کر وہاں گئے تھے۔ یہ سن کر کہنے لگے۔
"سرکار! مجھے معاف کیجئے اگر ہر جگہ دعائیں ہی کافی ہوتیں تو رسول اکرم ﷺ بدر و احد کے میدانوں میں نہ جاتے۔

اسی طرح ایک مرتبہ مذہبی جلسہ ہو رہا تھا۔ مولانا نور احمد مرحوم (خطیب مسجد شیخ بڈھا) نے رسول مقبول ﷺ کی سیرت کے بیان میں کہا کہ آپ ﷺ کو غصہ نہیں آتا تھا۔
ان کے بعد جب شاہ جی تقریر کرنے کو اٹھے تو کہنے لگے۔ میں مولانا (نور احمد مرحوم) کو اپنا استاذ کہتا ہوں۔ لیکن یہاں شاگرد استاذ سے اختلاف کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ حضور ﷺ کو غصہ نہیں آتا تھا۔ میں کہتا ہوں غصہ آتا تھا۔ وہ بشر تھے اور غصہ بشر کی فطرت ہے۔ انسان میں غصے کی غیر موجودگی اس کی غیرت کے منافی ہے۔ ہمیں اپنی محبت و عقیدت میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ انسان تھے اور انسانی تقاضے ان کے ساتھ تھے۔ اور یہی ان کی فضیلت ہے۔ کہ وہ انسان ہونے کے باوجود اس قدر بلند و بالا تھے۔

شاہ صاحب کی تقریر میں بعض اوقات بڑی دلچسپ اور معنی خیز لفظی رعایات بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ کہنے لگے۔
"جب کہیں بخاری کی تقریر ہو تو ان مرزائیوں کو نہ جانے کیوں بخار چڑھ جاتا ہے!"
اس طرح ایک اور موقع پر کہنے لگے۔
مجھے تو آج تک مرزا کی نبوت کے متعلق سمجھ نہیں آئی۔ یہ ظلی بروزی، بروزی، برازی خدا جانے کیا ہے؟
ایک سیاسی جماعت کے مقابلے میں ایک بار کہا۔ ہم انکا مقابلہ کیسے کرسکتے ہیں نہ ہمارے پاس زر ہے نہ زور ہے اور نہ زور ہے!
شاہ جی نے اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہونے سے بہت پہلے امرتسر کے گول باغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا تم لوگ خدا جانے کن خوش کن خوابوں میں کھوئے ہو میں کہتا ہوں۔ یہ وہ وقت ہے کہ میں مشورہ دوں گا۔

"سونا بیچو اور لوہا خریدو"

انکا مطلب تھا کہ اپنے دفاع کا بندوبست کرو۔ لیکن افسوس کہ عوام نے ان کے ان الفاظ کی قدر نہ کی۔
شاہ جی کی ایک تقریر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے وسیع و عریض میدان میں ہوئی۔ جب شاہ جی جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو اللہ اکبر۔ تاج و تخت ختم نبوت زندہ باد عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

لیکن جب صدر اجلاس میاں ممتاز دولتانہ تشریف لائے جو ان دنوں سابق پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو انہیں عوام کا یہ دلی تپاک نصیب نہ ہوسکا۔

شاہ جی نے دولتانہ کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مولانا احمد علی لاہوری مرحوم شاہ جی کے بڑے مداح تھے۔ جن دنوں ختم نبوت کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور حکومت وقت اس تحریک کو دبانے میں مصروف تھی۔ مولانا احمد علی مرحوم نے خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا۔

حکومت کہتی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری فساد پھیلاتا ہے۔ ان اللہ کے بندوں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر عطاء اللہ شاہ بخاری فساد پر آمادہ ہوجائے تو مرزائیت کا قلعہ تادیر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بخاری شام کو حکم دے دیں تو صبح ہونے سے پہلے پہلے ربوہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔

مجھے بتاؤ کہ ایک طرف لاہور کا ڈپٹی سی تقریر کرے اور ایک طرف عطاء اللہ شاہ تقریر کرے تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟ اگر ایک طرف وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تقریر کریں اور ایک طرف عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟ اگر ایک طرف گورنر جنرل غلام محمد تقریر کریں اور دوسری طرف عطاء اللہ شاہ تقریر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟"

اور مولانا احمد علی کے جواب میں لوگ ایک آواز کہہ رہے تھے۔

عطاء اللہ شاہ کو۔ عطاء اللہ شاہ کو۔

ان مثالوں سے مسلمانوں کے دلوں میں عطاء اللہ شاہ کی محبت و عقیدت کا اندازہ مشکل نہیں ہے۔

شاہ جی کا جسم بہت رعب دار اور مضبوط تھا۔ ایک بار تقریر میں انہوں نے بتایا کہ کسی زمانے میں میری صحت اتنی اچھی تھی اور بازو اتنے موٹے تھے کہ میرے کوئی ہتھکڑی پوری نہیں آتی۔ چنانچہ انگریزی حکومت کو میرے لئے خاص طور پر الگ، ہتھکڑیوں کا انتظام کرنا پڑا۔

بعض مذہبی مسائل میں انکی رائے نہایت واشگاف اور دو ٹوک ہوتی تھی۔ کچھ مثالیں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک مثال اور سنیئے۔

ایک مرتبہ امرتسر میں ایک پیر قسم کے مولوی آئے اور مسجد جان محمد میں تقریر کر گئے کہ حضور ﷺ نوری تھے ان کو خاکی یا بشر کہنا انکی توہین ہے۔

شاہ جی نے مسجد خیر الدین میں اسکا جواب دیا اور کہا: بھائی مانو نہ مانو میرے نانا حضور اکرم ﷺ بشر ہی تھے میں انکی اولاد میں شامل ہوں۔ سارے سید انکی اولاد میں شامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور یہ عام بات ہے کہ نسل بدلا نہیں کرتی۔ انسان کی نسل ہی سے انسان پیدا ہوسکتے ہیں۔ اور اگر میرے حضور علیہ

الصلوۃ والسلام بشر نہ تھے تو میں یہاں تک کہہ دوں گا کہ جو لوگ سید ہونے کا دعوی کرتے ہیں وہ کہاں سے آ گئے ہیں۔

میں نے شاہ جی کی آخری تقریر دہلی دروازے میں سنی جو شاید لاہور میں ان کی آخری تقریر تھی۔ اس تقریر سے پہلے ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور کچھ عرصے کے لئے افاقہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس تقریر کا بیشتر حصہ ایک خط پڑھنے اور اس پر تنقید کرنے میں گزر گیا۔ جو مرزا قادیانی نے انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے لکھا تھا اور وہ شاہ جی کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

جو شخص بیک وقت لاکھوں انسانوں کے کانوں کیا، دلوں تک اپنی آواز پہنچا سکتا تھا۔ وہ اتنا بے بس تھا کہ دم آخر اپنے بیٹوں تک سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کیفیت کا مشاہدہ کر کے عرشی امرتسری نے وہیں یہ شعر کہا:

برق و رعد آسودۂ بستر شدہ
شعلہ جوالہ خاکستر شدہ

افسوس کہ وہ نادر روزگار شخصیت اب ہماری دنیا میں نہیں اور ہم ان کو اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب انکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

شاہ جی کی بلند و بالا ہستی ہندوستان اور پاکستان میں یگانہ روزگار تھی جس کا ثانی چشم فلک صدیوں تک نہ دیکھ سکے گی۔ انہیں ہم سے رخصت ہوئے پانچ سال کا عرصہ گذر گیا۔ مگر ان کی شعلہ بیانی کے اثرات اس طرح تازہ ہیں جیسے وہ ابھی گئے ہیں۔ وہ اس دنیا میں ہیں جہاں سے وہ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔ اب ان کا نام نسلوں تک اور کام صدیوں تک ہمارے ساتھ رہے گا۔ ان کی موت سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی صرف یوں ہو سکتی ہے کہ وہ آجائیں ہمارے پاس واپس۔ مگر کیا کیا جائے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور یہ خواہش اس لئے ابھرتی ہے کہ ساری قوم مل کر بھی دوسرا بخاری پیدا نہیں کر سکتی۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی شاہ جی کی پیاری شکل آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ ان کی موت المناک سانحہ ہے۔ ان کے مرنے سے ایک پورا دور ختم ہو گیا۔ اب دنیا میں بخاری نہیں آئے گا۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ مرحوم

مختار مسعود

داستانِ اشتیاق

میں نے آٹو گراف البم بند کر دی۔ خلاء میں نظریں آوارہ پھرنے لگیں۔ ذہن البتہ ایک خاص نقطہ پر جما ہوا تھا۔ مجھے اس لمحے بہت کچھ یاد آیا۔

ایک لڑکے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا ہٹیلا اور سر پھرا تھا مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ طبیعت ایسی پائی تھی کہ شرارت کرنے اور سزا پانے میں خوش رہتی۔ ڈانٹ کھا کر فوراً اسی کام میں لگ گیا جس سے اسے منع کیا تھا۔ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ ڈانٹنے والا زچ ہو کر بولا بھلا تم کب باز آنے والے ہو، تم سے بھلمنسات کی امید کون رکھے۔ تم تو احراری ہو احراری۔ یوں میں نے احراری کا لفظ پہلی بار سنا۔ اور اسے بدی کا ایک استعمارہ سمجھ لیا۔ چند دنوں بعد میں جب میں نے سنا کہ مولانا محمد علی کو رئیس الاحرار کہتے ہیں۔ اور اقبال کے کلام میں مردِ مومن کے ساتھ مردانِ حُر کا ذکر بھی ہے تو اس لفظ کے معنی میں شبہ پیدا ہو گیا۔ اس شبے کو پیر جو گوٹھ کی گدی سے بڑی تقویت ملی کہ وہاں سبھی حُر کہلاتے ہیں کچھ مدت اور گزری تو یہ عقدہ کھلا کہ تشبیہہ اور استعارے کا درست ہونا ضروری نہیں صرف نادر اور پر اثر ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشبیہات اور استعارے کا استعمال ہماری شاعری اور دشنام طرازی میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا تو میں نے اشتباہ کو دور کرنے کی کوشش بے سود سمجھ کر ترک کر دی۔ مگر اس کوشش کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میں نے الفاظ کی درجہ بندی کر لی ہے اور اس طرح بہت سی مشکلات آسان ہو گئی ہیں۔ الفاظ کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو وہ لفظ جو ابن الوقت اور مرزا ظاہر دار بیگ ہوتے ہیں ان کے معنی وقت اور موسم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ظالم، مظلوم۔ دوسرے وہ معنی خیز لفظ جن کا مطلب علم اور تجربے کے ساتھ واضح اور وسیع ہوتا جاتا ہے مثلاً حسن و عشق، تیسرے وہ تہہ دار لفظ ہیں جن کا سادہ اور قطعی مفہوم کبھی گرفت میں نہیں آتا مثلاً عوام اور استحصال۔ اس درجہ بندی کے بعد میں نے احرار کو دشنام کے استعارے سے خارج کیا اور تیسری قسم کے الفاظ میں شامل کر لیا۔ اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ جماعت احرار نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کیا کھویا اور کیا پایا اور لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کم از کم میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ آخر یہ کہاں ضروری ہے کہ انسان ہر موضوع بحث اور ہر اختلافی مسئلہ پر قطعی اور حتمی رائے کا مالک ہو اور اپنے برتاؤ میں اتنا خشک اور درشت ہو جائے کہ احراری کہلانے لگے۔

جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو ضلع کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی۔ اس میں سر کردہ افراد بھی تھے اور سر کش اشخاص بھی۔ بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔ وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے۔ اور اس انجمن کا نام مجلس احرار تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی مجلس احرار کا قافیہ بیزار، اشرار، غلط کار چندے کے طلبگار اور

رسوا سر بازار سے ملایا تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں نے اس شخص کا نام جسے بہت سے لوگ امیر شریعت کہتے ہیں ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا۔ ان دنوں الیکشن کے انتظامات کی مصروفیت تھی۔ چند ماہ گزرے تو الیکشن اور آئین دونوں منسوخ ہو گئے۔ مصروفیت زیادہ ہو گئی۔ بنیادی جمہوریت اور زرعی اصلاحات کی پہلی قسط کے ساتھ کئی دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری کاموں میں یوں لگا رہا کہ سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ کام معمول پر آیا تو یادداشت سے ایک نقطہ ابھرا اور خلش بن گیا۔ شاہ جی سے ملاقات کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کا اظہار منشی عبدالرحمان خاں سے کر دیا۔

مجلس احرار کو غیر قانونی قرار دیئے ہوئے چھے سال ہو چکے تھے۔ جماعت اپنے انجام کو پہنچی تو گویا جلسہ برخاست ہو گیا۔ نعرے گم، لیڈر اوجھل، جلوس منتشر ایک دور تھا کہ ختم ہو گیا اور اس کی صرف دو یادگاریں رہ گئیں۔ مجلس کی فرو گزاشتیں اور میر مجلس کی خطابت۔ شاہ جی ملتان میں گوشہ نشیں ہو گئے۔ ان کی تقریریں کچھ قانون وقت نے بند کر دیں اور کچھ اس قانون قدرت نے جو ہر بوڑھے آدمی پر لاگو ہوتا ہے۔ شاہ جی کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ عشاء سے فجر ہو جاتی مگر طبیعت سیر نہ ہوتی۔ خوش الحان اور خوش بیان تھے، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی محاورے پر قادر تھے۔ قرأت، نثر، نظم، لطیفہ، ہجو، اور تشنیع کو حسب ضرورت استعمال کرتے تھے۔ احتیاط کا دامن اکثر ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور کبھی کبھی اسے دانستہ اپنے ہاتھ ہی سے چاک کر دیتے اور اس بات کی بھی پرواہ نہ کرتے کہ یہ کام بر سر عام ہو رہا ہے یا بر سر منبر۔

شاہ جی اپنے زمانے کے سب سے معروف و مشہور مقرر تھے۔ عوام نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا اور خواص نے ان سے ہمیشہ خم کھایا۔ میں نے ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اکثر سنتا رہتا اور سوچتا تھا کہ وہ خطابت کس پائے کی ہو گی۔ جسے مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور بہادر یار جنگ کا زمانہ ملا پھر وہ سب پر بھاری رہی۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ابوالکلام آزاد الہلال نکالتے اور امام الہند کہلاتے تھے۔ محمد بہادر خاں نواب اور جاگیردار تھے۔ شاہ جی کے پاس کیا رکھا تھا پٹنہ میں داغ یتیمی، بنارس میں ورق کوٹنے کی مشقت اور امرتسر میں ایک چھوٹی سی مسجد کی امامت۔ اس کے باوجود شاہ جی کو جس نے سنا اس نے یہی کہا۔

چہ جادوئیست ندانم بطرزِ گفتارش
کہ باز بستہ زبان سخن طرازاں را
(فیضی)

ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند پیش کرنے کے موقع پر کہا تھا کہ اردو زبان کو ہمیشہ اس پر فخر رہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔ اردو نے جب بھی اپنے سرمایہ افتخار پر ناز کیا تو اسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل ہونگے۔ جن کے لئے سیاست دراصل ایک اسٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتظمین جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اردو تقریر تھی۔ اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہم عصر تو

بہت تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے شاہ جی کو ایک بار کراچی میں سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجھے یہ فکر تھا کہ جلسہ رات گئے ختم ہوا تو واپسی کی بس نہیں ملے گی۔ اتنے میں ضابطہ فوجداری حرکت میں آیا۔ جلسہ منسوخ ہو گیا اور شاہ جی غالباً پکڑے گئے بے بسی کی جگہ محرومی نے لے لی۔ یہ اوائل ملازمت کی بات ہے جب شاہ جی کے بولنے اور ہمارے سننے کے دن تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ خطابت کی راہ میں پیری حائل ہونے لگی اور سماعت کی راہ میں ملازمت کے آداب اور ضابطے حائل ہونے لگے۔ آج اگر تقریر نہ سنی تو کل کیسے سن سکیں گے جب ہم اس نظام کا حصہ بن چکے ہوں گے جہاں حسن انتظام کا معیار صرف یہ ہے کہ کسی مخالف کی تقریر نہ ہونے پائے۔ تقریر کا جواب تقریر سے دینے میں محنت صرف ہوتی ہے۔ اور یہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ گول باغ اور موچی گیٹ میں پانی چھوڑ دیا جائے۔

شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی۔ یہ ملاقات منشی عبدالرحمان خاں کے ذمہ تھی۔ انہوں نے شاہ جی سے بات کی تو وہ ٹال گئے۔ کہنے لگے کہ میں ساری عمر انتظامیہ سے لڑتا آیا ہوں۔ ڈپٹی کمشنر اگر بلانا چاہے تو وارنٹ گرفتاری نکالے۔ منشی صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا دیکھئے ہوئی نا احراریوں والی بات۔ یہ ان کی مرضی کہ وہ عہدے کو انتظامیہ کی علامت جانتے ہیں اور انتظامیہ کو ہر حال میں قابل ملامت سمجھتے ہیں مگر یہ کہاں کی بالغ نظری ہے کہ عہدے اور عہدہ دار کے فرق سے بھی انکار کر دیا جائے۔ اگر مجھے ان کی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تو انہیں میری ملازمت سے کیا غرض۔ ایک نوجوان دور حاضر کے عظیم خطیب سے ملنے کا خواہشمند ہے اور بوڑھا خطیب اس کے اشتیاق کا حال پوچھتا ہی نہیں۔ بس اتنا سن کر کہ وہ سرکاری ملازم ہے اسے فوراً رد کر دیتا ہے۔ رہا حفظ مراتب کا سوال تو میں نے پہلے ہی شاہ جی سے حاضری کی اجازت چاہی تھی سلام نہیں بھیجا تھا۔ پیغام بر نے یہ باتیں سنیں اور الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔ اگلے ہی روز سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرے یہاں مہمان بن کر تشریف لے آئے میں نے ~~موٹر~~ کار کا دروازہ کھولا۔ پہلے ایک پھڑکتا ہوا فارسی شعر برآمد ہوا اور اس کے پیچھے شعر پڑھنے والا اترا۔ ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کرتا، سبز چار خانہ تہ بند، دیسی جوتی، دراز قد اور دراز ریش، کشادہ جبیں اور خندہ رو، شاہ جی نے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا دوسرے سے کچھ بوجھ اپنے عصا پر ڈالا۔ کمر ذرا سی خم ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر گیلری سے ہوتے ہوئے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے تک چلتے گئے اور وہاں پہنچ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ جوتی اتاری اور پالتی ماری۔ میں نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور ان کی پرانی تصویروں کو یاد کیا۔ دونوں میں تھوڑی سی مشابہت ضرور ہے مگر مناسبت کوئی نہیں۔ کہاں وہ لحیم شحیم گیسو دراز اور عصا بردار جسے دیکھ کر دیو جانس کلبی، برنارڈ شا، ٹیگور اور ٹالسٹائی یاد آتے تھے اور کہاں یہ ستا ہوا بے وزن ڈھانچا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے شاہ جی سے اپنے اشتیاق کا قصہ بیان کیا۔ ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اتنی سنی ہے کہ زبان خلق پر ایمان لے آیا ہوں۔ جس نے ان کی تقریر سنی اور پسند کی اس کے لئے علم حاضر اور

جس نے کبھی نہ سنی تگر اوروں سے زیادہ متاثر ہوا اس کے لئے ایمان بالغیب۔ شاہ جی نے میری بات کا اعتبار اور میرے جذبات کا احترام کیا وہ ذرا سی دیر میں یوں گھل مل گئے گویا میری نیازمندی کو ایک زمانہ بیت چکا ہو۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ان کی بیماری اور کمزوری کے پیش نظر میں نے اسے طول دینے سے احتراز کیا مگر جب باتیں ختم ہوئیں تو شام ہو چکی تھی۔ اور شاہ جی کو آئے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ لمحہ بھر کے لئے بھی منطقع نہ ہوا اور اس میں میرا حصہ اسی قدر تھا جتنا ایک میزبان اور سامع کا ہونا چاہیئے۔ منشی صاحب محض سننے اور سر دھننے کے قائل نہیں ان کا اصول ہے کہ اچھا انسان، اچھی کتاب اور اچھی گفتگو جہاں میسر آئے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرو۔ ان سے تنہا فائدہ اٹھانا کم ظرفی کی دلیل ہے۔ ملاقات شروع ہوئی تو منشی صاحب مسکرا رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے پھر کاغذ نکالا اور یادداشت لکھنے میں مشغول ہو گئے وہ جو ایک نوجوان اور تھا وہ تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ چائے دو تین بار آئی مگر یوں دبے پاؤں کہ گفتگو میں کوئی خلل نہ پڑا۔ ان تین گھنٹوں میں شاہ جی نے آیات، احادیث، اشعار اور چٹکلوں سے ایک جادو جگائے رکھا۔ میں ان کی خطابت کا راز جاننا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ موضوع اتنی تیزی سے بدلتے رہے کہ خطابت پر جم کر بات نہ ہو سکی۔ گفتگو شاہ جی کی صحت سے شروع ہوئی اور توکل سے ہوتی ہوئی سیرت تک پہنچی۔ وہاں تاریخ کا ذکر آگیا اور اس میں مختلف تحریکیں شامل ہو گئیں۔ ہر تحریک کے ساتھ اس سے وابستہ افراد کا جائزہ شروع ہو گیا۔ اور بات ایک پورا چکر لگا کر شاہ جی کی ذات پر واپس آگئی۔ اس مرحلے پر شاہ جی نے واپس جانے کی اجازت چاہی ملاقات ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت شاہ جی جوتیاں اتارے صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے ابھی وہ پیر نیچے اتاریں گے چڑھی ہوئی آستین بھی نیچے اترے گی۔ گلے کا بٹن بند ہو گا۔ پان کی ڈبیہ جیب میں ڈالی جائے گی اور پھر عصا کا سہارا لے کر اٹھیں گے جو تمام عرصہ ان کے ہاتھ ہی میں رہا تھا میں نے کہا اجازت ہو تو چند سوال پوچھ لوں اجازت ملی تو میں نے دو سوالوں سے تمہید باندھی اور جواب ملنے پر تیسرا سوال داغ دیا۔ اس سوال و جواب کے دو سال بعد میں نے منشی صاحب کو خط لکھا کہ اپنی تحریری یادداشت مجھے بھیج دیں۔ منشی صاحب نے بہت ڈھونڈا مگر ایک مختصر ورق کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ وہ گفتگو جسے میں نے محفوظ سمجھا تھا اس کے الفاظ گم ہو گئے۔ اگرچہ اس کا حاصل حافظے میں محفوظ ہے۔ اور اس کا تاثر دل پر نقش ہے۔ مشاہیر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سلسلے میں حافظے پر زیادہ اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ حافظہ بھی خواہشات کا تابع ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات خواب و خیال کو واقعات اور واردات میں منتقل کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کا کہا مانیں تو نفس اور تاریخ دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔

میں نے شاہ جی سے جو سوال کئے وہ سب سود و زیاں کے بارے میں تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ گزشتہ چالیس برس میں جو آپ کی عوامی زندگی پر محیط ہیں آپ نے برعظیم کے مسلمانوں کو اسلام سے قریب آتے ہوئے دیکھا ہے۔ یا دور جاتے ہوئے پایا ہے۔ جواب ملا کہ مسلمانوں میں دو طبقے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں ایک مذہب سے قریب دوسرا اس سے کچھ دور۔ ان دونوں طبقوں کا درمیانی فاصلہ اس چالیس سال میں بہت بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں ان کی تعداد اور قوت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں

نے دوسرا سوال پوچھا۔ برعظیم کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ میں زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں ایسے نامور مسلمان ایک ہی وقت میں جمع ہوگئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر ان سب کی موجودگی میں اسلام سے بیگانہ ہوجانے والوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوا ہے تو اس مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس کے مسائل آپ کے عہد سے زیادہ الجھے ہوئے اور رہنما آپ کے معیار سے کم مایہ ہوں گے۔ کیا یہ بات قابل افسوس نہیں کہ جو ملی سرمایہ آپ کو اسلاف سے ملا تھا اس سے آپ کا ترکہ کمتر ہوگا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لئے کامیابی نہ ہوسکی کہ دو سو برس کے عرصے میں فرنگی کی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلط جما لیا تھا۔ آسودہ حال لوگ علی گڑھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصے آئے۔ جنگ آزادی کی ہمہ ہمی میں سیاست دین پر اور منافقت دنیا پر غالب آئی۔ ساری توجہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی نذر ہوگئی۔ جو لوگ باقی رہے ان میں سے کچھ ہندو تمدن کے زیر اثر رہ کر گمراہ ہوگئے صرف بچے کھچے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے قافلے میں شامل ہوئے۔ ہمارا سرمایہ خوب تھا مگر نسل ناخوب تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے آبائی ورثہ بھی کھویا اپنی کمائی بھی گنوائی اور مستقبل کو بھی مخدوش بنا دیا۔ میں نے آخری سوال کی اجازت چاہی اور اسے دو طرح سے پوچھا ایک شکل یہ تھی کہ اگر قیامت کے دن آپ سے پوچھا گیا کہ اے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی گئی تھی اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ ناکام تحریکوں کے علاوہ کیا پیش کریں گے۔ اسی سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جدوجہد کا انجام دیکھ لیا اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی خطابت اور طاقت کا دوبارہ وہی استعمال کریں گے یا آپ کی زندگی بالکل نئی ہوگی۔ شاہ جی یکایک خاموش ہوگئے۔ ان کی خاموشی میں آزردگی بھی شامل تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹو گراف البم ان کے سامنے کر دی شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا:

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اول اول
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان صحرا میں اول
غبارِ رہ کارواں آخر آخر
چمن میں عنادل کا مسجود اول
اور گیاہِ رہ گل رخاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل کشش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیئے۔ یہ بات ۲۸ جون ۱۹۵۹ء کی ہے۔ دو تین برس بعد میں اور منشی عبدالرحمٰن خاں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ شاہ جی زندہ تھے تو اپنے سامعین کو کبھی بنجر زمین کبھی صحرا اور کبھی قبریں کہہ کر پکارتے تھے۔ آج ہم ان کے سرہانے خاموش کھڑے تھے۔ قبر سے آواز آئی۔ تمہارے تیسرے سوال کا جواب اس روز نہ دے سکا تھا لو آج سنو، الفاظ اقبال کے ہیں قصہ مسلم ہندی کا اور حاصل ایک عمر کی خطابت کا:

مسلم ہندی چرا میداں گزاشت ہمت او بوئے کراری نداشت!
مشت خاکش آنچناں گر دیدہ سرد گرمیٔ آوازِ من کارے نہ کرد!

پروفیسر سید محمد وکیل بخاری

شاہ جی کی مختار مسعود سے ملاقات

پس منظر تہ منظر

منشی عبدالرحمن خان مرحوم ملتان کی ایک سماجی اور علمی شخصیت تھے سرکاری حلقوں میں انہیں خاصا رسوخ حاصل تھا۔ یہ جولائی ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے۔ وہ ایک روز حضرت امیر شریعت کے ہاں تشریف لائے اور اپنی آمد کی غرض وغایت بیان کی۔ کہ ڈی سی ملتان (مسٹر مختار مسعود) آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔

حضرت امیر شریعت نے جواب دیا کیوں؟

کیا وہ میرا مکان چھیننا چاہتے ہیں کہ اطمینان سے کیوں بیٹھا ہوں؟

منشی صاحب:۔ نہیں حضرت وہ آپکا عقیدت مند ہے۔

حضرت امیر شریعت:۔ پھر وہ تشریف لے آئیں فقیر کا در تو کھلا ہے۔

منشی صاحب:۔ وہ ڈرتا ہے کہ لوگ مجھے احراری مشہور کر دیں گے۔

حضرت امیر شریعت:۔ بھائی میری طبیعت ناساز ہے میں تو کہیں جا نہیں سکتا صحت بحال ہو گئی تو دیکھا جائیگا۔

پھر منشی صاحب چلے گئے۔

اس ملاقات کے تقریباً پانچ چھے روز بعد مولانا محمد علی جالندھری تشریف لائے تو شاہ جی نے یہ بات مولانا سے کہہ سنائی مولانا نے کہا کہ آپ ضرور تشریف لے جائیں اور مجلس تحفظ ختم نبوت (شعبۂ تبلیغ مجلسِ احرار اسلام) کے دفتر کی واگذاری کے بارے میں بھی بات کریں جو تحریک تحفظ ختم نبوت کے دنوں میں سر بمہر کر دیا گیا تھا۔ تقریباً پندرہ سولہ روز بعد منشی صاحب دوبارہ تشریف لائے۔ اور ڈی سی کے اشتیاقِ ملاقات کا ذکر کیا شاہ جی نے فرمایا کہ ان سے پوچھ آؤ وہ کس دن فارغ ہوں گے۔ ایک دن بروز ہفتہ منشی صاحب آئے اور بتایا کہ کل اتوار کو ملاقات کا وقت طے کر آیا ہوں۔ میں صبح سات بجے آپ کو لینے کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔

شاہ جی اتوار کی صبح انتظار کرتے رہے دن کافی چڑھ گیا اچھی خاصی تپش ہو گئی۔ منشی صاحب آٹھ بجے سے کچھ اوپر کار لے کر آئے۔ شاہ جی نے روانگی سے قبل مجھے فرمایا کہ منشی صاحب اور مزاج کے آدمی ہیں تم میرے ساتھ چلو۔ منشی صاحب کے تاخیر سے آنے پر شاہ جی نے اظہار ناراضی فرمایا اور کہا کہ میں بیمار آدمی ہوں اور آپ نے اتنی دیر کر دی۔

شاہ جی۔ مجھے ساتھ لیکر ڈی سی کی کوٹھی پر پہنچے۔ گاڑی برآمدے کے پاس جا کر رکی۔ تو ڈی سی مختار مسعود اور ایم ایچ شاہ۔ سی ایس پی رجسٹرار کواپریٹیو سوسائٹی مغربی پاکستان بھی موجود تھے۔ دونوں اکٹھے آگے بڑھے۔ منشی عبدالرحمن خان نے جلدی سے گاڑی سے نکل کر دروازہ کھولا۔ شاہ جی باہر نکلے تو ہر دو حضرات سے سلام و

مصافحہ کیا۔ آپ نے دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر رومال ڈال رکھا تھا۔ مختار مسعود نے آگے بڑھکر ہاتھ پکڑا شاہ جی برآمدے کی تین چار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد کھڑے ہو گئے۔ اور منشی صاحب کو مخاطب ہو کر پوچھا کہ یہی ڈپٹی کمشنر صاحب ہیں۔ مختار صاحب نے فوراً از خود جواب دیا جی ہاں میں ہی ہوں آپکا نیاز مند۔ اسکے بعد اندر کمرے کی جانب بڑھے۔ کمرے میں قالین بچھے تھے۔ شاہ جی نے دروازے میں فٹ پیڈ پر ہی جوتے اتار دیئے۔ مختار مسعود نے کہا آپ اسی طرح آجائیں کوئی حرج نہیں۔ شاہ جی نے فرمایا نہیں بھائی میں مسجد کا آدمی ہوں ایسے ہی ٹھیک ہے پھر بعد میں آپ لوگ باتیں کرتے ہیں کہ ان مولویوں کو تمیز نہیں۔ ہمارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تہذیب سے ان کو آشنائی نہیں ہوئی اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں جوتے یہیں اتار دوں۔ اسکے بعد آپ صوفہ پر بیٹھ گئے اور دوسرے لوگ بھی بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد شاہ جی نے فرمایا کہ آپ لوگ اگر محسوس نہ کریں تو میں ذرا آرام سے بیٹھنا چاہتا ہوں مریض آدمی ہوں اس لئے ٹانگیں لٹکا کر نہیں بیٹھ سکتا۔ مختار صاحب نے کہا جیسے آپ کی مرضی۔ اسکے بعد گفتگو کا آغاز مختار صاحب کے اس سوال سے ہوا۔

مختار مسعود:۔ حضرت ٹھنڈا مشروب پینا پسند فرمائیں گے یا چائے؟

شاہ جی:۔ بھائی ذیابطیس کا مریض ہوں صرف سادہ پانی پیوں گا۔ مسٹر مختار مسعود کے اصرار کے باوجود شاہ جی نے صرف سادہ ٹھنڈا پانی ہی پیا۔ باقی حضرات کی تواضع ٹھنڈے مشروب سے کی گئی۔ پھر مختار صاحب ٹھنڈے آم بھی لے آئے اور شاہ جی کو پیش کئے مگر آپ نے صرف ایک دانہ اٹھایا اور سونگھ کر واپس ڈش میں رکھ دیا اور فرمایا کہ میرے معالج نے مجھے صرف یہاں تک اجازت دے رکھی ہے اس پر بھی مختار صاحب نے اصرار کیا مگر شاہ جی نے آم نہیں چکھا۔ شاہ جی نے فرمایا چونکہ آپ نے بے تکلفی کا اظہار کیا ہے اسلئے ہم بھی بے تکلف ہو کر بیٹھ گئے ہیں ورنہ ہمارا مقام تو آپکی عدالت میں کھڑے ہونے کا ہوتا ہے۔

مختار صاحب: نہیں نہیں اب آپ کو ایسی تکلیف نہیں دی جائیگی۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کے ساتھ بیٹھکر آپ کے خیالات سے استفادہ کیا جائے اسی لئے اس نشست کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اسکے بعد مختار صاحب نے ایک طویل سوال کیا جو اپنے اندر بہت سے پہلو رکھتا تھا۔

سوال تھا، شاہ صاحب ہمیں اپنے مسلم رہنماؤں سے یہ گلہ ہے کہ انہوں نے ہماری صحیح تربیت نہیں کی ملک کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو ہم لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے وہاں سے فارغ ہوئے تو ملک تقسیم ہو چکا تھا البتہ اللہ کا فضل یہ ہوا کہ اس وسیع ملک میں ہمیں اچھی اچھی ملازمتیں مل گئیں۔

شاہ جی نے جواب دیا۔

نہیں آپکا یہ گلہ درست نہیں ہے کیونکہ ہم نے اپنے بزرگوں سے جو سیاسی تربیت ورثے میں پائی تھی اور جو اپنی محنت سے پیدا کی ہے وہ بھی نئی نسل کے حوالے کی۔ لیکن نئی نسل بھی عجیب نسل ہے وہ اس امر پر توجہ ہی نہیں دیتی، اس کا کیا کیا جائے کہ لائل پور اور کیمل پور کے شہروں میں آبادی کے اعتبار سے غیر مسلم چند تھے۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے مکانات اور جائیدادیں جوتے تک بد کرداری کے عوض

غیر مسلموں کو بیچ ڈالیں۔

مختار مسعود نے دوسرا سوال کیا کہ شاہ صاحب کیا وجہ ہے کہ گذشتہ سدی میں ہندوستان میں اس قدر کثیر تعداد میں مسلمان رہنماء پیدا ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں کوئی دور اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انہوں نے چیدہ چیدہ رہنماؤں کے نام بھی گنوائے مگر مسلمان قوم اسکے باوجود رو بہ زوال تھے؟ شاہ جی نے فرمایا "اس کی وجہ علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ جب یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے سر توڑ کوشش کی تھی کہ علی گڑھ اور دیو بند کو مل کر کام کرنا چاہیئے۔ لیکن ایک طبقہ پوری شدت سے اسکی مخالفت کر رہا تھا۔ اور آخر کار وہی کامیاب رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا دولت مند اور ذہین طبقہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پہنچ گیا، مفلس اور نادار غیر ذہین طبقہ دیو بند میں پہنچ گیا اس وقت سے مسلمانوں میں مذہب اور سیاست کی تقسیم کا آغاز ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں کے رہنماؤں میں دونوں خصوصیات ہوتیں تھیں بلکہ جو حکمران ہوتا تھا وہی مذہبی رہنماء بھی ہوتا تھا۔ اور اب یہ خلیج اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ مجھے تو یہ ملتی نظر نہیں آتی۔

اسکے بعد دفتر ختم نبوت کی واگزاری کی بات بھی آئی، پھر کافی دیر تک خالصتاً ادبی محفل جمی رہی شعر و شاعری، اور مختلف اصناف سخن پر گفتگو ہوتی رہی اسی دوران مختار صاحب نے اقبال کے متعلق ایک تیکھا سوال کر ڈالا۔ کہ شاہ صاحب اقبال کے متعلق آپ کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے کلام میں پیغام کچھ دیتے ہیں اور ان کا ماحول کچھ اور بتاتا ہے؟

شاہ جی نے فرمایا کہ نہیں ایسی بات نہیں۔ میں اقبال کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔ جو لوگ انکے گرد آپکو نظر آتے ہیں وہ انھوں نے اکٹھے نہیں کئے تھے بلکہ "کئے گئے" تھے۔ یا ہو گئے تھے۔

اسکے بعد مختار نے اپنے ترکش کا اصل تیر نکالا۔ اور اس بے تکلفی کے ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چھے مربع اراضی ٹیوب ویل سکیم کے تحت دینے کی پیش کش کی۔

شاہ جی نے فرمایا۔

"آپ نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔"

اس پر ملاقات ختم ہو گئی۔

اور مغرب کے بعد شاہ جی گھر واپس لوٹ آئے۔ پھر مختار مسعود صاحب نے کبھی بھی ملاقات کے اشتیاق کا اظہار نہ کیا اس ملاقات میں چھے افراد شامل تھے۔

۱۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ مسٹر مختار مسعود

۳۔ ایم۔ ایچ۔ شاہ (محمود الحسن شاہ)

۴۔ منشی عبدالرحمن خان مرحوم

۵- سید محمد وکیل شاہ بخاری
۶- ایک طالب علم جو غالباً مختار مسعود صاحب کے عزیز تھے۔
جب گاڑی امیر شریعت کو لینے کے لئے آئی تو منشی صاحب کے ساتھ یہ نوجوان بھی تھا۔
مسٹر مختار مسعود نے "آوازِ دوست" میں اس ملاقات کی جو تفصیل لکھی ہے وہ ادھوری ہے۔ شاہ جی نے انکے تمام سوالات کے جواب دئیے تھے اور وہ یہی سوال تھے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں زمین کی پیشکش کے واقعہ کو شاید دانستہ نظر انداز کیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟
مختار صاحب نے جس خاموش نوجوان کا ذکر کیا وہ میں تھا۔

تیرے پیکر میں ہوا، روح بلالی کا ظہور

اے امیر کارواں، اے کارواں سازِ وفا   منزلِ مقصود کی تمہید تیرا نقش پا
تیری پیشانی جلالِ آدمی کا آئینا   تیرے دامن پر تصدق ماہ و انجم کی ضیا
تجھ کو پیہم مقصدِ ہستی کا اندازہ رہا
جرأت افزائے تمنا، تیرا آوازہ رہا
تیرے پیکر میں ہوا روح بلالی کا ظہور   تیرا سوز دل تھا سازِ انجمن آرائے طُور
تیرا اندازِ تکلم سر بہ سر حق کا شعور   کس طرح آنکھیں ملاتا، تجھ سے باطل کا غرور
تیرا احساسِ خودی آسودۂ تاثیر تھا
تیرا ہر اک لفظ گویا وقت کی تقدیر تھا
نورِ ہستی جلوہ گر تھا تیری مشتِ خاک میں   کوئی ثانی تھا نہ تیرا جرأت بے باک میں
تیرا شُہرہ کیوں نہ جاتا گنبدِ افلاک میں   دیدہ و دل آ گئے تھے حیطۂ ادراک میں
تو جہاں میں خوابِ انساں کے لئے تعبیر ہے
تیری خاموشی سے بے شک زندگی دل گیر ہے۔

علامہ لطیف انور

باسم میواتی

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جو صدیوں بعد کتمِ عدم سے منصہ شہود پر آتی ہیں۔ اور لوگوں پر اپنی شخصیت اور کارکردگی کے انمٹ نشانات چھوڑ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تقریر کرنے کا وہ جوہر انہیں ودیعت کیا تھا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے برصغیر کے سیاسی و دینی سٹیج پر فاضل اور باکمال لوگ اپنی تقریروں سے لوگوں میں جادو جگاتے رہے مگر شاہ جی کی مثیل ان میں سے کوئی نہ ہوا۔ ان کی آتش بیانی اور شعلہ زبانی کا یہ عالم تھا کہ برسوں ان کی تقاریر کا چرچا رہتا تھا۔ جمال و جلال کا یہ پیکر جب سٹیج پر نمودار ہوتا تھا تو سامعین میں ایک جوش و خروش موج زن ہو جاتا تھا اور لوگ ان کی ہر بات پر "آمنا و صدقنا" کہہ اٹھتے تھے یہ پیغمبرانہ شان، خدائے برتر نے اس بیسویں صدی میں انہیں عطا کی تھی۔ ان کی قلندرانہ عظمت کا یہ حال تھا کہ مخالفین بھی اپنے دلوں میں ان سے خوف محسوس کرتے تھے، تمام ہندوستان میں ان کی تقاریر نے ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر تو یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "اگر میرا بس چلتا تو اس پنجابی جادوگر کی زبان بند کر دیتا" کیونکہ وہ عوام کو اپنی تقریر کے جادو سے جس طرف چاہیں لے جاتے تھے، حکومت کا خفیہ محکمہ جب ان کے جلسوں اور تقاریر کی رپورٹیں ارسال کرتا تھا تو کئی انگریز یہ خواہش کرتے تھے کہ کاش انہیں اردو زبان آتی اور شاہ جی کی تقاریر کی طوفان خیزیاں دیکھتے، ضلع ملتان کے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر، مسٹر مون نے ایک مکان کی چھت پر چھپ کر ان کی تقریر سنی، شاہ جی کو کوئی انگریزی پارلیمانی رکن مسٹر برک سے اور کوئی یونان کے آتش بیاں مقرر، ڈیماستھنیز سے مشابہت دیتا تھا۔ لیکن وہ ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ!

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حضرت شاہ جی اس کی مکمل تصویر تھے، سٹیج کے علاوہ ان کی مجلسوں میں شگفتگی کی عجیب فضا ہوتی تھی، قدرت نے حسِ مزاح کی نعمتِ وافر سے نوازا تھا۔ اکثر احباب پر شگفتہ طنز کرتے تھے۔ ان کی محفلوں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جرأت اور اعلیٰ حوصلہ کی وہ زندہ مثال تھے۔ کسی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا وہ ایک شعر اکثر پڑھا کرتے تھے آج وہ ہمیں پڑھنا ہوتا ہے تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

چراغوں کا دھواں، دیکھا نہ جائے
پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک اکثر شاہ جی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، پروفیسر محمد علی، سید مبارک علی شاہ جی اور میں اتوار کے روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو وہ مزاحاً کہتے تھے کہ آج شہر میں کوئی اچھی فلم نہ ہو گی، اس لئے چلیں بخاری کی دماغ سوزی کرتے ہیں، لوگوں کے ایسے ایسے واقعات اور حالات، سنا تے تھے کہ شاہ جی کی مردم شناسی اور حافظہ پر حیرانی ہوتی تھی، ایک روز میں نے کہا شاہ جی آپ نے انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا ہے اس لئے حریت کی عمارت کی پیشانی پر آپ کا نام بھی درج ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو عمارت کی بنیاد کے روڑے ہیں۔ ہمیں کون یاد رکھتا ہے۔ پھر علامہ اقبال کا یہ شعر انہوں نے پڑھا۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی نا خوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

دسمبر ۱۹۵۶ء کی کوئی تاریخ تھی کہ لاہور سے میرے ایک عزیز چودھری کنول خاں میرے پاس آئے اور انہوں نے شاہ جی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں بعد نماز عصر، شاہ جی کے پاس انہیں لے گیا۔ شاہ جی نے پہچان لیا اور کہا آپ سے دہلی میں شوکت اللہ انصاری داماد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں چودھری کنول خاں نے ذکر کیا کہ باسم، ویزا لے کر میوات جا رہا ہے اور دہلی میں بھی چند روز قیام ہو گا کسی کو کوئی پیغام دینا ہو تو اسے دے دیں، شاہ جی کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ ہم نے سوچا کہ اب مولانا احمد سعید دہلوی یا کسی اور مولوی کا نام لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ "کیا تم چودھری شیر جنگ کو جانتے ہو؟ جس نے ایک ریلوے ٹرین پر بم پھینکا تھا۔ اور بعد میں سوشلسٹ ہو گیا تھا"، (ہم نے کہا کہ ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں) "تو اسے میرا محبت بھرا سلام کہنا"۔ پھر انہوں نے چودھری شیر جنگ کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ جب اس نے ٹرین پر بم پھینکا تھا اور کئی انگریز ہلاک ہوئے تھے۔ تو وہ موت کی سزا کا حکم سننے کے بعد ملتان ڈسٹرکٹ جیل آیا۔ اس وقت میں سیاسی قیدی تھا چودھری کی پیشانی پر ماں کا دودھ جھلکتا تھا، میں نے اسے قرآن پڑھایا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ اس کی نوعمری کو دیکھ کر اس کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ اور جب اخبارات میں سزائے موت کی خبر شائع ہوئی تو ایک ہندو دوشیزہ نے چودھری شیر جنگ سے شادی کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ بعد میں چودھری شیر جنگ رہا کر دئیے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ اسے عشاء کے وقت جیل سے چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ پھر شہر کے مختلف تکیوں اور مزارات کی سیر کرنے کے بعد رات کو جیل آجاتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب "اوراق پارینہ" اس نے لکھی ہے۔ (۱) شاہ جی نے مزید بتایا کہ جس لڑکی نے اس سے شادی کا اعلان کیا تھا اس نے اسی کے ساتھ شادی کی اور وہ آج کل اندر پرست گرلز کالج میں پروفیسر ہے۔ چنانچہ شاہ جی کا سلام محبت لے کر جب میں دہلی پہنچا تو میں نے اپنے دوست سرور تونسوی سے جو ایڈیٹر اخبار شانِ ہند تھے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے چودھری شیر جنگ کا ٹیلی فون نمبر معلوم کر کے بتایا کہ وہ آج کل پنڈت نہرو کے ایما پر گوا دمن دیو کی سرحدوں پر گوریلا

جنگ کے سر براہ ہیں، اس وقت گوا دمن دیو، بھارت میں شامل نہ ہوئے تھے۔ بعد ازیں بتایا۔ پروفیسر محمد علی اور سید مبارک علی شاہ نے بتایا کہ جن دنوں شاہ جی ملتان جیل میں تھے تو ہم دونوں ان سے ملنے گئے تو شاہ جی نے ایک چھریرے جسم کا لڑکا ملاقات کو بھیج دیا اور کہا کہ اس سے باتیں کرو میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، چنانچہ سید مبارک علی شاہ نے چودھری شیر جنگ سے کہا کہ آپ نے ٹرین پر بم کیوں پھینکا۔ تشدد سے کیا آزادی مل جائے گی۔ چودھری شیر جنگ نے کہا کہ آپ سمجھے نہیں۔ آپ کو علم ہے کہ تمام ملک میں سناٹا ہے، تمام رہنما جیلوں میں بند ہیں اور سیاسی محاذ پر خاموشی ہے۔ اس لئے میں نے ٹرین پر بم پھینک کر ملک میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ بم کیوں مارا گیا۔ چنانچہ اس میں مجھے کامیابی ہوئی اور یہ سوال اور اس کا جواب لوگوں میں تازہ ہو گیا۔

مولانا مودودی اور شاہ جی

ایک روز بات چیت کے دوران، امیر جماعت اسلامی، مولانا مودودی کا ذکر آگیا۔ شاہ جی ان دنوں میں مولانا مودودی سے ناراض تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ کہیں علماء کی مجلس میں ایک قرارداد، قادیانیوں کے خلاف یا اسلامی شریعت کے نفاذ سے متعلق تھی، منظور کی گئی لیکن دوسرے روز، اخبارات میں مولانا کا یہ بیان شائع ہوا کہ علماء کے اس اجلاس میں جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی۔ وہ شریک نہ تھے، (۲) شاہ جی فرماتے تھے کہ وہ اجلاس میں موجود تھے ان سے ایسے بیان کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

ڈپٹی کمشنر کی جواب طلبی

شاہ جی نے ایک روز فرمایا کہ میں نے اب سیاسی جلسوں میں شرکت کرنا ترک کر دیا ہے کیونکہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد میں نے سیاست چھوڑ دی اور صرف تبلیغ کا کام سنبھال لیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک روز ملتان کے ڈپٹی کمشنر شیخ رشید کا ایک ایلچی آیا کہ ڈپٹی کمشنر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کام کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ صوبہ کے وزیر علی حسین شاہ گردیزی کا کوئی پیغام ہے۔ میں نے کہا کہ میں سرکاری افسروں سے نہیں ملا کرتا۔ کچھ روز کے بعد وہ سرکاری ملازم پھر آیا اور مجھے نہایت انکساری اور اصرار کے ساتھ مجبور کرنے لگا کہ آپ ضرور ملاقات کر لیں۔ کوئی ضروری کام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ڈی سی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ سید علی حسین شاہ گردیزی کی یہ خواہش ہے کہ آپ ان کے جلسہ میں نہ صرف شرکت کریں بلکہ تقریر بھی کریں۔ جو قلعہ قاسم باغ پر فلاں تاریخ کو ہو گا۔ شاہ جی نے ڈی سی کو مشورہ دیا کہ آپ ان الجھنوں میں نہ پڑیں۔ آپ سرکاری افسر ہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے مگر وہ نہ مانے چنانچہ میں نے صوبائی وزیر کی دلجوئی کے لئے تقریر کر ڈالی۔ اس جلسہ اور تقریر کے دو ماہ بعد ابدالی روڈ پر شیخ رشید سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ تو وہ کہنے لگے کہ شاہ جی آپ درست فرماتے تھے ابھی تک حکومت میرے پیچھے جھاڑ کر پڑی ہوئی ہے اور جواب طلبی پر جواب طلبی جاری ہے کہ شاہ سے تقریر کیوں کرائی تھی، گردیزی صاحب میری کوئی مدد نہیں کر پاتے۔

علامہ اقبال اور شاہ جی

شاہ جی علامہ اقبال سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ اور ان کے اشعار اکثر سنایا کرتے تھے علامہ اقبال کو بھی شاہ جی سے بڑی محبت تھی اور جب وہ لاہور میں ہوتے تھے تو ان کو ملازم بھیج کر بلایا کرتے تھے۔ شاہ جی نے کہا کہ آج کل ہر شخص، علامہ سے اپنے خصوصی تعلقات کا ذکر کرتا ہے حالانکہ جن واقعات کا ہمیں علم ہے۔ ان کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ علامہ اقبال، ہائی کورٹ میں جج لگنا چاہتے تھے۔ لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، متعصب ہندو چیف جج، سر شادی لال تھے۔ اسی دوران میں۔ لاہور کے ایک مشہور خاندان کی طرف سے علامہ صاحب کے خلاف درخواست ارسال کی گئی کہ انہیں ہائی کورٹ کا جج نہ بنایا جائے کیونکہ وہ "ایرانی ذوق" کے حامل ہیں۔ شاہ جی نے فرمایا کہ یہ بات کہہ کر علامہ صاحب آبدیدہ ہوگئے اور کہنے لگے کہ زندگی میں کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ لیکن "ایرانی ذوق" سے بخدا مجھے کوئی سروکار نہیں رہا۔

سجاد ظہیر کی سیاست

ایک روز ذکر چل پڑا کہ مسلمانوں میں بہترین مقرر کون کون سے ہیں تو ہم نے مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی، ناظم سیوہاروی، نواب بہادر یار جنگ اور شاہ جی کا نام لیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے شامل نہ کریں، میں اتنا اعلیٰ مقرر نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے ڈاکٹر کنور محمد اشرف کا نام نہیں لیا۔ (۳) وہ بہت اچھے مقرر ہیں بلکہ اسلامی تاریخ پر بہت عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستان کے ایک بڑے شہر میں ایک سیاسی جلسہ تھا۔ جس میں ڈاکٹر اشرف نے تقریر کی اور امیری و غریبی کے مسئلہ پر اہم دلائل دئے ان کا مقصد سوشلزم کی حمایت کرنا تھا ان کی تقریر نے میرے پاؤں سے زمین نکال دی لیکن پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اے عطاء اللہ ایسے سیاسی بینڈک تو ٹر ٹر کرتے ہی رہتے ہیں۔ تو کہاں چل پڑا۔ پروفیسر محمد علیؔ نے پوچھا کہ ایک دوسرے اشتراکی رہنما۔ سجاد ظہیر کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔ شاہ جی نے فرمایا کہ آپ لوگ جو ترقی پسند دانشور کہلاتے ہو، کیا بتا سکتے ہو کہ جو شخص کمیونسٹ پارٹی کارکن بھی ہو کیا وہ کسی مذہبی فرقہ سے تعلق رکھ سکتا ہے۔ جبکہ ان لوگوں کا پیرو مرشد لینن کہتا ہے کہ مذہب، افیون ہے۔ پروفیسر نے کہا کہ یہ منافقت نہیں ہو سکتی۔ تو شاہ جی نے فرمایا کہ اب سن لیجئے اپنے دانشور بھائی کی حرکت، سجاد ظہیر ہندوستان کی ایک جیل میں بند تھے۔ سجاد ظہیر، جیل میں خوش مذاقی اور شعر و شاعری سے دلچسپی کا اظہار کرتے تھے لیکن جب محرم کا مہینہ آیا تو ان پر اوس پڑ گئی وہ چھل پہل سب ختم، یہاں تک کہ دس محرم کا روزہ بھی رکھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ سجاد کیسا کمیونسٹ ہے۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

شاہ جی نے بتایا کہ جیل سے باہر آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری ایس کے ڈانگے سے کسی جگہ اچانک ملاقات ہو گئی۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر اس سے کیا۔ ڈانگے نے کہا کہ میں سجاد ظہیر سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔ میں نے شاہ جی سے پوچھا کہ پھر ڈانگے نے کیا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ڈانگے نے کیا جواب دینا تھا میں نے بمبئی کے ایک جلسہ میں یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ شیعہ ہمیشہ شیعہ رہتا ہے خواہ کمیونسٹ پارٹی میں ہو یا کسی اور جماعت میں۔

قادیانی رپورٹ

شاہ جی اپنی زندگی کے دو مقاصد بیان کرتے تھے۔ ایک انگریز حکومت کا خاتمہ اور دوسرا قادیانی تحریک کا انہدام۔ وہ کہتے تھے کہ انگریز تو گیا مگر ابھی قادیانی فرقہ موجود ہے جس کے خلاف ہم میدان میں آئے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی آپ کی سرگرمیوں کا کوئی نتیجہ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے کہا کہ برخوردار ہماری قادیانی مخالف تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ تمہارے والد قادیانی ہو گئے تو ہو گئے مگر تمہیں ہم نے قادیانی نہیں ہونے دیا۔ نئے قادیانیوں کی نرسری مرجھا گئی۔ انہوں نے بتایا کہ قادیانی کسی غیر قادیانی کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ مگر جب اس تحریک کے زیر اثر نوجوانوں نے ان کی مرمت کی تو مرزا بشیر الدین محمود نے الفضل میں ایک خبر شائع کرائی ہے کہ مرزا غلام احمد کی ایک تحریر مل گئی ہے۔ جس کے مطابق غیر قادیانیوں کے جنازہ میں شرکت کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ اگر ایک ضرب اور لگ گئی تو دوسری تحریر برآمد ہو جائے گی۔ کہ مرزا غلام احمد نبی نہیں ہیں۔ شاہ جی نے ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ وہ فیصلہ پہلے ہی لکھے بیٹھے تھے وہ ہر شخص سے جو کمیٹی کے سامنے پیش ہوتا تھا یہ سوال کرتے تھے کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ شاہ جی نے کہا کہ میرا بیان اخبارات میں شائع ہونے سے روک دیا گیا۔ میں نے جسٹس محمد منیر سے کہا کہ یہ سوال تو آپ اس انداز سے پوچھ رہے ہیں کہ کسی شخص سے سوال کیا جائے کہ کیا تو نے اپنے باپ کو زد و کوب کرنا چھوڑ دیا ہے اگر وہ ہاں میں جواب دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کتنی قبیح حرکت کا مرتکب رہا ہے۔ اگر کہتا ہے کہ نہیں تو بھی موردِ الزام ہے۔

ایک مزار

شاہ جی نے فرمایا کہ ایک دفعہ مظفر گڑھ میں ایک تبلیغی جلسہ میں خطاب کرنے والے تھے کہ جب میں نے قرآن شریف کی آیات مبارکہ کے بعد حاضرین پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ڈانگ، کلہاڑی اور پتھر اپنے ہاتھوں میں لے رکھے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ آج کوئی ہنگامہ ہو گا چنانچہ میں نے ابھی تقریر شروع کی تھی کہ ایک شخص نے کہا کہ شاہ جی آپ مزارات کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا لوگو مجھے

بتاؤ کہ خدا ایک ہے یا دو۔ انہوں نے کہا۔ ایک، قرآن شریف کتنے ہیں۔ ایک، مسلمانوں کا پیغمبر اعظم، ایک، تو پھر مزار کتنے ہونے چاہئیں لوگوں نے کہا ایک، جو مخالفین جھگڑا کرنے آئے تھے، انہیں سانپ سونگھ گیا۔

سخن فہمی

ہندوستان میں یہ بات مشہور تھی کہ شعر کی نزاکتوں کو سمجھنے کی جو صلاحیت، اللہ تعالیٰ نے مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام اور علامہ نیاز فتحپوری کو ودیعت کی ہے وہ کسی اور کا نصیب نہیں ہے لیکن ہم نے یہ دیکھا ہے کہ سخن فہمی میں شاہ جی ان تینوں حضرات سے کم نہ تھے۔ ایک دفعہ ان کو بخار چڑھا ہوا تھا کہ سلیمی دواخانہ، کچہری روڈ ملتان میں حکیم عطاء اللہ خاں سے ملنے آ گئے۔ سید مبارک شاہ جی نے بیدل کا ایک فارسی شعر پڑھا، جسے سن کر شاہ جی جھومنے لگے۔ اور بار بار اس شعر کو دوہرانے لگے۔ پھر حکیم عطاء اللہ سے کہا کہ بھئی اب میری نبض دیکھو حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر کہا اب آپ کے بخار میں افاقہ ہو گیا ہے۔ جب آپ نے آتے ہی نبض دکھائی تھی اس وقت نبض زیادہ تیز چل رہی تھی۔

زبان دانی

ایک روز میں نے پوچھا شاہ جی آپ نے اتنی پر زور اور شگفتہ اردو کہاں سے سیکھی۔ انہوں نے کہا، شاید آپ لوگ ہمیں "پنجابی ڈھگہ" سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اردو کہاں سے سیکھی، آپ مولانا ظفر علی خاں سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے، پھر شفقت سے فرمانے لگے کہ آپ اردو کے کلاسیکل شاعر، شاد عظیم آبادی کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اچھی طرح انہوں نے کہا کہ جب شاد صاحب کو اردو کے کسی محاورہ یا لفظ کے بارے میں شک ہوتا تھا تو وہ ایک خاتون سے اس سلسلہ میں استفسار کرتے تھے، پتہ ہے وہ خاتون کون تھی۔ وہ میری نانی تھی، چنانچہ اردو ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔

پنجاب کی تقسیم

ایک روز، بہاولپور سے کوئی شخص آئے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے کہا کہ ان کی بات سنو یہ کیا کہتے ہیں۔ اس شخص نے جس کا نام میں اب بھول گیا ہوں علامہ رحمت اللہ ارشد کے حوالہ سے بتایا کہ انہوں نے خضر حیات کا بیٹہ کے صوبائی وزیر۔ محمد ابراہیم برق سے یہ بات سنی تھی کہ پنجاب کے وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ کو ۱۹۴۶ غالباً ۱۹۴۶ء میں دہلی طلب کیا گیا وہ اپنے ہمراہ ابراہیم برق کو ساتھ لے گئے۔ نئی دہلی میں انہیں کہا گیا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملیں۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات، مولانا آزاد سے ملے۔ مولانا آزاد نے کہا کہ پنجاب کو تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اور کانگریس کی ہائی کمان نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لئے آپ پنجاب کے مسلم لیگی

رہنماؤں پر زور ڈالیں کہ وہ مسٹر محمد علی جناح سے کہیں کہ پنجاب کو کسی صورت تقسیم نہ کیا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو خضر حیات خاں وزیر اعظم کا عہدہ چھوڑ دیں کیونکہ تقسیم پنجاب ہونے سے جو فساد پھوٹے گا۔ اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہو گی۔ چنانچہ سر خضر حیات ٹوانہ نے دہلی میں مرکزی مسلم لیگی وزیر راجہ غضنفر علی خاں سے بات کی۔ راجہ صاحب نے کہا کہ مسٹر جناح کب کسی کی بات مانتے ہیں۔ اگر پنجاب کی تقسیم ہو رہی ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ چنانچہ سر خضر حیات نے لاہور آتے ہی وزارت سے استعفےٰ دے دیا۔ اور لاہور میں یہ نعرہ گونج گیا کہ تازہ خبر آئی ہے خضر ہمارا بھائی ہے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ مولانا آزاد، تقسیم پنجاب مین مسلمانوں کا نقصان دیکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے ایسا کیا ہو۔

حفیظ جالندھری

شاہ جی نے ایک دفعہ سنایا کہ یوپی کے شہر بجنور میں دو سیاسی جلسے تھوڑے سے فاصلے پر منعقد ہو رہے تھے۔ ایک جلسہ کے مقرر، سید الاحرار مولانا حسرت موہانی اور دوسرے جلسہ کے مقرر وہ خود تھے، مگر جب انہوں نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کی تو مسلم لیگی جلسہ کے آدھے حاضرین، ان کے جلسہ میں آگئے اور جب تقریر شروع ہو گئی تو بہت کم لوگ رہ گئے، چنانچہ حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام پر پڑھنا شروع کر دیا مگر لوگ پھر بھی نہ رکے، میں نے بلند آواز سے کہا کہ اب جو باقی رہ گئے ہو ادھر آ جاؤ چنانچہ مولانا حسرت موہانی آگئے اور حفیظ جالندھری اپنی بانسری بجاتے رہے۔

پہلی گرفتاری

شاہ جی نے اپنی پہلی گرفتاری کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ مجھے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں دونوں پہنائی گئی تھیں۔ کوئٹہ ایکسپریس سے علی الصباح، ملتان ریلوے سٹیشن پر اتارا گیا۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے علاوہ شہری بھی بہت زیادہ موجود تھے۔ چنانچہ ملتان کے لوگوں میں سے چند افراد نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ مجھے غصہ آگیا میں نے کہا مجھے حوصلہ اور ہمت دینے کی بجائے میرا دل کمزور کرنا چاہتے ہو۔

سائمن کمیشن کا بائیکاٹ

شاہ جی نے فرمایا کہ تمام ہندوستان میں سائمن کمیشن کے خلاف ایجی ٹیشن جاری تھا اور ہر بڑے شہر میں احتجاجی جلسے ہو رہے تھے۔ کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو نے الہ آباد میں ایک جلسہ کر دیا جس کی

صدارت وہ کر رہے تھے۔ چنانچہ کمیشن کے خلاف، تمام مقررین سے انہوں نے تقریر کرالی تو آخر میں میرا نام پکارا، میں نے دل میں سوچا کہ اس پنڈت نے آج مجھے بدنام کرنے کا موقع نکالا ہے۔ کیونکہ موضوع سے متعلق تمام باتیں مقررین کہہ گئے اور میرے لئے اب کہنے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ حسن اتفاق کہ ابھی میں تقریر کے لئے کھڑا ہوا تھا کہ سائمن کمیشن کی ارتھی اٹھائے ہوئے کچھ رضاکار سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ مجھے اسی وقت مرزا غالب کا شعر یاد آگیا اور میں نے بلند آواز سے کہا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

پنڈت جی فوراً کرسی صدارت چھوڑ کر میرے پاس آئے اور مجھ سے لپٹ گئے اور کہا کہ ارے، ارے شاہ جی آپ نے کمال کر دکھایا۔

مہاتما گاندھی سے ملاقات

پروفیسر محمد علی نے پوچھا کہ شاہ جی مہاتما گاندھی سے بالمشافہ کوئی ملاقات ہوئی ہے انہوں نے کہا بارہا۔ جلسوں میں ان سے ملاقات ہوتی رہی ہے اور ۱۹۴۶ء میں جب کرپس مشن آیا ہوا تھا، تو شورش کاشمیری نے گاندھی جی کے پرائیوٹ سیکرٹری شرما سے ملاقات کا ٹائم لے لیا۔ میں نے جب شورش کو باہر جانے کی تیاری کرتے دیکھا تو میں نے پوچھا کہاں کی تیاری ہے۔ اس نے جواب دیا کہ آج مہاتما گاندھی سے ملنے جا رہا ہوں، چنانچہ میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ گاندھی جی سے ملے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ چنانچہ جب بھنگی کالونی میں گاندھی سے ملاقات کی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ شاہ جی، اب بھی آپ پانچ چھے گھنٹے مسلسل تقریریں کر سکتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ ہم اپنا اصول کیوں چھوڑیں۔ جب تک انگریز یہاں سے اپنا بستر گول نہیں کرے گا، یہ تقریریں جاری رہیں گی۔ گاندھی جی اس بات سے بہت محظوظ ہوئے۔

میاں افتخار الدین

میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات نے مسلم لیگ کو چھوڑ کر ایک علیحدہ سیاسی پارٹی، آزاد پاکستان پارٹی، کے نام سے بنائی، چنانچہ وہ احرار رہنماؤں کو اس جماعت میں شامل کرنے کے خواہش مند تھے، شاہ جی نے بتایا کہ وہ اس سلسلہ میں میرے پاس آئے۔ میں نے کہا کہ افتخار ہم نے پاکستان میں اب سیاست کرنی چھوڑ دی ہے اور اب کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ اب آپ جیل سے ڈرنے لگے ہیں۔ میں نے کہا کہ بھائی آپ سچ کہتے ہیں۔ میں انگریز کی جیل تو برداشت کر سکتا ہوں مگر پاکستان کی نہیں۔ جو بھی سیاسی رہنما اور کارکن ان جیلوں میں جاتا ہے کوئی نہ کوئی زندگی کا روگ لے کر آتا ہے۔ آپ

کو سیاسی جماعتیں بنانے کا شوق ہے وہ پورا کرتے رہیں۔ یاد رہے کہ میاں افتخار الدین، پہلے پنجاب کانگریس کے صدر تھے، پھر مسلم لیگ میں آ گئے اور اس کے بعد آزاد پاکستان پارٹی قائم کی۔

اللہ اکبر کا نعرہ

شاہ جی نے بتایا کہ پشاور میں ایک سیاسی جلسہ تھا، جس میں ہندو اور سکھ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ آج اُن سے اللہ اکبر کا نعرہ لگوانا چاہیئے چنانچہ میں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کیا خدا عظیم اور بڑا نہیں ہے، لوگوں نے کہا کہ عظیم ہے اور ہمارے ہندو اور سکھ بھائی بھی اللہ تعالے کو بڑا مانتے ہیں، تو وہ اللہ اکبر کیوں نہ لگائیں گے۔ چنانچہ جب نعرہ لگایا گیا تو ہندو اور سکھوں نے بھی پرزور نعرہ لگایا۔

اراضی کی پیشکش

مسٹر مختار مسعود صاحب ۱۹۵۶ء میں ملتان میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہوں نے منشی عبدالرحمن کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ امیر شریعت عطاء اللہ شاہ جی بخاری سے ان کی ملاقات کرائیں۔ چنانچہ منشی صاحب۔ شاہ جی کے "دربار" میں حاضر ہوئے اور اپنی گزارش پیش کی۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر سے میری غرض نہیں ہے اگر انہیں ملنا ہے تو خود تشریف لائیں غریب خانہ اور بوریا حاضر ہے۔ منشی عبدالرحمن نے کہا کہ وہ سرکاری فرائض کے باعث آپ کے یہاں آنے سے گریز کرتے ہیں۔ شاہ جی نے کہا کہ غالباً وہ زمین پر بورے پر بیٹھنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ نوابزادہ لیاقت علی خاں کا پرائیویٹ سیکرٹری اور مشرقی پنجاب (بھارت) کا چیف سیکرٹری پر بودھ یہاں زمین پر بیٹھے ہیں۔ منشی صاحب نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ منشی صاحب ایک ہفتہ کے بعد پھر تشریف لائے۔ اور اصرار کرنے لگے کہ مسعود صاحب سے ایک ملاقات ہو جائے۔ شاہ جی نے کہا کہ اچھا پھر کسی دن چلیں گے۔ چنانچہ کارمن شاہ جی اپنے ایک عزیز (۴) کے ہمراہ ڈپٹی سی کی کوٹھی پر پہنچے، تو ڈپٹی سی صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ شاہ جی نے چھریرے بدن کے نوجوان کو خیر مقدم کرتے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ مختار مسعود کیا اندر کوٹھی میں ہے، انہوں نے کہا کہ میں ہی مسعود ہوں۔ چنانچہ کوٹھی میں اندر گئے تو وہاں قالین اور صوفہ تھا۔ اور ایک سرکاری افسر بھی وہاں موجود تھا۔ شاہ جی قالین پر بیٹھ گئے۔ مسٹر مسعود نے اصرار کیا کہ آپ صوفے پر تشریف رکھیں۔ شاہ جی نے کہا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ قالین دے وہ قالین پر کیوں نہ بیٹھے۔ چنانچہ مسعود صاحب بھی قالین پر بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے کہا کہ آج آپ لوگوں کو اس اعلیٰ عہدہ پر دیکھ کر دلی خوشی ہوتی ہے۔ ہم نے ان عہدوں پر قیام پاکستان سے قبل، ہندوستانی افسروں کا مطالبہ کیا تھا

مسٹر مختار مسعود صاحب، چونکہ ادبی آدمی اور ادب دوست انسان ہیں۔ انہوں نے ایک تمہید باندھی کہ جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا تو آپ کی تقریروں کا بہت زور و شور تھا۔ مگر افسوس کہ میں آج تک آپ کے کسی جلسہ میں شریک نہ ہو سکا اور نہ کبھی تقریر سنی۔ شاہ جی نے پوچھا کہ میرے بلانے کا مقصد کیا ہے۔ ڈپی سی صاحب نے بتایا کہ آپ کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آزادیٔ ملک کے لئے آپ کے عظیم جذبات ہیں۔ شاہ جی نے پوچھا کہ کیسی امداد، انہوں نے بتایا کہ بطور ڈپٹی کمشنر میں نے غلہ لگاؤ سکیم کے تحت جو مربع زمین دے دونگا، شاہ جی نے کہا کہ بنجر زمین آباد کرنے کے لئے رقم کی ضرورت ہوگی، مسٹر مسعود نے کہا کہ وہ بنک سے قرضہ دلا دونگا۔ شاہ جی نے کہا کہ مسعود تم نے گھر بلا کر اچھی بات نہیں کی۔ تم نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اگر مجھے اراضی قبول کرنی ہوتی تو کیا انگریز سے نہیں مل سکتی تھی۔ میرے امرتسر میں دو مکان تھے۔ ان کے بدلہ میں پاکستان میں آج تک کوئی مکان نہ مل سکا اور میرا لڑکا، (۵) بحالیات کے دفتر کے چکر لگاتا ہے میں کہتا ہوں کہ انہیں چھوڑ دے مجھے مکان نہیں ملتے۔

اچھی تقریر

شاہ جی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے بلکہ بعض دفعہ میں گستاخ بھی ہو جاتا تھا، ایک روز میں نے اپنی حماقت کے باعث، باغ لانگے خاں میں کی گئی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی کل آپ نے جو تقریر کی ہے اس سے آپ کی شہرت کو نقصان پہنچا ہے اچھی تقریر نہ تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ تبلیغی جلسہ تھا وہاں حاضرین کے مطابق ہی تقریر کی جاتی ہے، پھر پورے جوش میں آکر کہا کہ اگر میری تقریر سننی ہے تو دہلی، لکھنو یا الہ آباد کا پاسپورٹ دلاؤ اور پھر میری تقریر سن کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔

وضع داری

شاہ جی جس مکان میں رہتے تھے، اس کا مالک مکان، کرایہ میں اضافہ کرتا رہتا تھا، انہوں نے بتایا کہ یہ مکان غالباً پندرہ روپے ماہوار کرائے پر لیا تھا اور اب وہ چالیس روپے کرایہ طلب کر رہا ہے کیونکہ جب بھی نلکہ لگانے اور بجلی لگانے پر کچھ خرچ کرتا ہے تو کرایہ بڑھا دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اس مکان کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا کہ وضع داری بھی کوئی چیز ہے۔ یہ انسان کے کردار کا ایک حصہ ہوتی ہے چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اِسی شکستہ مکان میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا ظفر علی خان

ایک روز، سید مبارک علی شاہ نے پوچھا کہ شاہ جی آپ اپنی سیاسی زندگی میں کسی سے مرعوب ہوئے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ میں اللہ تعالے کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، لیکن جب مولانا ظفر علی خاں، مجلس احرار کے خلاف ہوگئے اور نظمیں اخبار زمیندار میں شائع ہونے لگیں تو وہ گلی در گلی مقبول ہو جاتی تھیں۔ اور یہ اندیشہ رہتا تھا کہ کل کو کیا نظم شائع ہو گی۔ چنانچہ ہمارا ایک جلسہ ہو رہا تھا کہ پوسٹر تقسیم ہونے شروع ہوگئے۔ جس پر مولانا ظفر علی کی ایک نظم موجود تھی۔ جس کے دو شعر مجھے یاد ہیں۔

طفلِ پری رخ کی شریعت افگنی نے
کل رات نکالا مرے تقویٰ کا دیوالا
مسجد کا اگر تجھ کو بنانا ہے شوالا
احرار کے بت خانے سے مظہر کو بلالا

شاہ جی نے فرمایا کہ میں نے اس پوسٹر کو ہاتھ میں لے کر تقریر شروع کی اور کہا کہ کل رات ہی نہیں بلکہ یہاں ہر شب تقویٰ کا دیوالا نکلتا ہے کیونکہ ہم کسی کے ایجنٹ نہیں ہیں۔

امیر شریعت کو کیا ہوا

پروفیسر محمد علی بخاری نے سودا کی زمین میں کہ "اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا" ایک غزل لکھی جو انہوں نے اپنے دوستوں کو سنائی۔ مطلع تھا کہ

پیمان حفظ دین و شریعت کو کیا ہوا
کچھ تو کہو امیر شریعت کو کیا ہوا
پھر ہم ہیں بت ہیں اور عقیدت کے پھول ہیں
جانے بتوں سے پہلی عداوت کو کیا ہوا

(۶)

دراصل غزل کے مطلع کا دوسرا مصرعہ یہ تھا

تقدیر دو جہاں کی امانت کو کیا ہوا

اور اسی طرح ان کی مطبوعہ کتاب میں بھی چھپا ہے مگر دوستوں کی محفلوں میں دوسرے مصرعہ کو بدل کر پڑھتے تھے۔ اب شعر تو پروفیسر نے کہہ دیا مگر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہونے سے کترانے لگے۔ ہم نے کہا کہ شاہ جی ایسی باتوں سے پریشان ہونے والے نہیں ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔ چنانچہ، سید مبارک علی کو ساتھ لے کر وہ شاہ جی کے پاس گئے۔ میں نے سنا کہ شاہ جی نے بھی اس کے جواب میں کوئی شعر کہا تھا۔ جو مجھے یاد نہیں ہے۔ (۷)

شاہ جی کی باتوں کو یاد کر کے لوگ سر دھنتے ہیں۔ اور حافظ شیرازی کے شعر ان کے بارے میں پڑھتے ہیں۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

....

(۱) شیر جنگ کی دوسری کتاب "انقلاب روس" ہے۔
شاہ جی ہی کی روایت ہے کہ شیر جنگ مجھ سے ترجمہ قرآن بھی پڑھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا۔ "شاہ جی! اس کتاب میں کہیں غلامی کا لفظ نہیں۔ جس قوم کے پاس یہ کتاب ہو وہ غلام نہیں ہو سکتی (مدیر)

(۲) ۱۹۵۲ء میں کراچی میں آل پارٹیز مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا اجلاس ہوا تھا۔ جس میں قادیانیوں سے متعلق قرار داد اقلیت اور "راست اقدام" کا فیصلہ ہوا۔ مولانا مودودی اس اجلاس میں شریک تھے مگر منیر انکوائری کمیشن میں انکار فرما دیا شاہ جی کا بیان تھا کہ وہ اجلاس میں میرے گھٹنے سے گھٹنا ملائے بیٹھے تھے۔ (مدیر)

(۳) شاہ جی روایت ہے کہ ڈاکٹر کے ایم اشرف نے ایک مرتبہ ان سے کہا "آپ کی تحریروں سے انقلاب کی بو آتی ہے۔ آپ کا علاج گولی ہے۔" (مدیر)
(۴) شاہ جی کے داماد پروفیسر سید محمد وکیل شاہ (مدیر)
(۵) سید عطاء المحسن بخاری

(۶) ایک روایت کے مطابق یہ شعر اس طرح بھی سنایا گیا۔

مسلک بدل کے آج قیادت کے ساتھ ہے
کس سے کہیں امیر شریعت کو کیا ہوا

اس شعر میں دراصل شاہ جی کی طرف سے لیگی قیادت کے ساتھ مفاہمت پر طنز ہے۔ (مدیر)
(۷) پروفیسر محمد علی بخاری نے اپنا شعر شاہ جی کو سنایا تو شاہ جی نے فی البدیہ جواب دیا۔ اور ان کی ترقی پسندی پر بھرپور طنز کیا۔ شاہ جی کا شعر ان کے کاغذات میں سے مجھے مل گیا جو یہ ہے۔

سید کے بانکے کا بھی کعبہ ہے ماسکو
سادات کی حمیت و غیرت کو کیا ہوا

الیاس رشیدی

شاہ جی کا سحر خطابت

الیاس رشیدی، دلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے۔ ان کے بڑے بھائی محمد عثمان آزاد دلی کے نامور صحافیوں میں سے تھے۔ روزنامہ "قومی گزٹ" اور روزنامہ "انجام" کے مالک و مدیر تھے۔ تحریک آزادی میں عملاً شریک رہے۔ اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ تحریک پاکستان میں وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد "انجام" کو کراچی سے شائع کیا اور ایک طویل عرصہ تک اسے زندہ رکھا۔
الیاس رشیدی، فلمی صحافت میں چلے گئے۔ اور عمر بھر کے لئے اسی کوچۂ رسوائی کے ہو رہے۔

مسلمانوں کی ایک جماعت مجلس احرار اسلام تھی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے سربراہ تھے۔ یہ جماعت لاہور میں قائم ہوئی تھی مگر اس کی شاخیں پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو اللہ تعالی نے بڑی فصاحت و بلاغت عطا فرمائی تھی۔ وہ اسلامی موضوعات پر ایسی فصیح و بلیغ تقریر کرتے تھے کہ دلی کا مشہور پریڈ میدان، ناکافی محسوس ہوتا تھا۔ اعلان ہوتا تھا کہ آج بعد نماز عشاء فلاں جگہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خطاب ہے تو لوگ دور دور سے ان کی تقریر سننے کے لئے آتے تھے اور اپنے ساتھ رات کا کھانا بھی لے کر آتے تھے کیونکہ شاہ جی تقریر شروع کرتے تو پھر صبح ہی ہوجاتی تھی۔ لوگ صبح تک ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے لوگوں کو کسی نے باندھ کر بٹھا دیا ہو۔ ان جلسوں میں، میں بھی شریک رہا ہوں اور رات رات بھر جاگ کر ان کی تقریریں سنی ہیں۔ دراصل انہیں تقریر کرنے کا ہنر آتا تھا، وہ سننے والوں کو مسحور کرلیتے تھے۔ سامعین کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ اگرچہ میں ان دنوں بہت نوعمر تھا پھر بھی ان کی تقریروں کا دیوانہ تھا۔ سیاست کی طرح اس زمانے کی صحافت بھی بہت مختلف تھی۔ آج کی طرح ان دنوں بہت سی سہولتیں نہیں تھیں مگر اخباری کارکن بہت محنت کیا کرتے تھے۔ ان کی محنت اور کام کرنے کی لگن کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اکثر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں کی رپورٹنگ چار چار اخباری صفحوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس زمانے کے بعض اخبار چار صفحوں کے ہوتے تھے جو مولانا کی تقریر کے بعد چاروں صفحات پر ان کی تصویریں شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں آج کی طرح ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی سہولت تو تھی نہیں۔ اس لئے چار چار اور چھ چھ رپورٹر مولانا کے جلسے کی رپورٹنگ کیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر آ گئے تھے۔ مگر ان کا استعمال عام نہیں ہوا تھا۔ یہ صرف بڑے بڑے لیڈروں کے جلسے جلوسوں میں استعمال کئے جاتے تھے۔ قائد اعظم، بہادر یار جنگ یا عطاء اللہ شاہ بخاری، جس جلسے میں شریک ہوتے، اس کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کیا جاتا تھا۔

انٹرویو............الیاس رشیدی، مدیر ہفت روزہ "نگار" کراچی

ماہنامہ "سرگزشت" کراچی مارچ ۱۹۹۴ء

نظیر لودھیانوی

وہ حاملِ سوز و تپش سینۂ احرار

وہ سیف زباں فاتح اقلیم خطابت
وہ سحر بیاں، بلبل بستان فصاحت

وہ واعظ شیریں سخن و عالم یکتا
وہ ساحر اعجاز فن و مصحف گویا

وہ حافظ دیں، گنجِ شریعت کا نگہدار
وہ حامل سوز و تپش سینۂ احرار

آزادیٔ جمہور کا وہ عاشق جانباز
ہر دم جسے اسلام کی تعلیم پہ صد ناز

تحریک خلافت کا وہ بے باک علمدار
وہ معرکۂ ترک موالات کا سالار

انیس سو انیس کے ہنگاموں کا شاہد
ملت کا فدائی صف اول کا مجاہد

الفاظ سے جس نے کیا عالم تہ و بالا
تصویر کش حادثۂ جلیانوالہ

انگریز کی ہیبت کو جو خاطر میں نہ لایا
آزادی کا نقارہ دلیرانہ بجایا

بیدار کیا جس نے ہمیں خواب گراں سے
ڈالی تن بے روح میں جاں زور بیاں سے

جس نے غم دوراں کو دعاؤں میں کیا گم
تاریکیٔ زنداں کو نواؤں میں کیا گم

نعمت تھی جسے پیرویٔ ختم رسالت
کی نصف صدی قوم اور اسلام کی خدمت

خم جس نے ہمیں بادۂ یثرب کے پلائے
میخانۂ توحید کے آداب سکھائے

سرمایۂ تاب و تب پنجاب تھا گویا
آزادی کی تاریخ کا اک باب تھا گویا

حکیم آزاد شیرازی

امیر شریعت کے ساتھ چند لمحے

تیس برس پہلے کی بات ہے جب میں مرحوم خاکسار تحریک کا ایک سرگرم سپاہی تھا۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی مرحوم کی کتاب "قولِ فیصل" میں نام لئے بغیر احراری رہنماؤں کا تذکرہ کچھ نامناسب الفاظ میں کیا گیا تھا۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ یہ اشارہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف ہے۔ اس طرح حضرت امیر شریعت سے میرا غائبانہ تعارف "قولِ فیصل" کے اسی پیراگراف کے ذریعے ہوا۔

قیامِ پاکستان سے پیشتر احرار رہنماؤں علامہ سید محمد داؤد غزنوی، آغا شورش کاشمیری، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور مرزا جانباز سے میرے نیاز مندانہ اور دوستانہ مراسم ضرور قائم ہوگئے تھے۔ لیکن احرار کے بارے میں حسن ظن نے میرے ذہن میں کبھی جگہ حاصل نہ کی۔

قیامِ پاکستان کے بعد میرا حلقہ احباب لائل پور میں زیادہ تر احرار دوستوں کا بنا جن میں خواجہ جمال دین بٹ صاحب، مولانا عبدالغفار غزنوی مرحوم اور مولانا عبید اللہ احرار شامل تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۲ء کے آخر میں ان دوستوں نے ترجمانِ احرار روزنامہ آزاد لاہور کے لئے مجھے اغوا کرلیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دفتر احرار کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ جہاں حضرت مجاہد الحسینی سے میرا سامنا ہوا۔ اور اس کے بعد دوسرے احرار رہنماؤں سے شرفِ نیاز حاصل ہوتا رہا۔

روزنامہ آزاد کی ادارت سنبھالے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ ایک دوپہر میں اپنے کمرے میں بیٹھا مصروفِ کار تھا کہ مجاہد الحسینی صاحب زبردستی مجھے کھینچ کر دفتر سے نیچے لے گئے۔ جہاں ایک کار کھڑی تھی۔ اس کار میں حضرت امیر شریعت تشریف فرما تھے۔ میں سلام عرض کر کے دست بستہ کھڑا ہوگیا۔ شاہ جی کار سے نکلے۔ مجاہد صاحب نے موزوں الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ شاہ جی نے مصافحہ کے بعد معانقہ بھی فرمایا۔ بڑے پیار سے تھپکی دی۔ اور فی البدیہہ فرمایا۔

"اچھا تو آپ ہیں ہمارے نئے ایڈیٹر آزاد شیرازی

اگر آزاد شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

شاہ جی تشریف لے گئے لیکن میں اس ملاقات کا مزا کئی دن تک لوٹتا رہا۔ اور آج بھی جب کبھی شاہ جی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ میرے سامنے اس پہلی ملاقات کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

روزنامہ آزاد لاہور کی ادارت کا زمانہ میری صحافتی زندگی کا بلاشبہ سنہری دور تھا۔ مجاہد صاحب کی

برادرانہ دوستی اور دوسرے احرار رہنماؤں کی شفقت و محبت نے میرے نظریات میں اہم انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن

زندگی پیار کی دوچار گھڑی ہوتی ہے
چاہے تھوڑی سی ہو یہ عمر بڑی ہوتی ہے

یہ دور مختصر ثابت ہوا اور تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلے میں آزاد پابند ہو گیا۔ شاہ جی اور دوسرے احرار رہنما اسیر ہوئے اور میں دوبارہ روزنامہ سعادت کی ادارت سنبھالنے لائل پور پہنچ گیا۔

تحریک چلی اور ختم ہو گئی۔ مقدمات چلے اور بالآخر شاہ جی اور دوسرے رہنما رہا ہوئے جس کے فوراً بعد پیپلز کالونی لائل پور کے وسیع میدان میں شاہ جی نے ایک عظیم اجتماع سے وہ تاریخی خطاب کیا جسے حرف بحرف قلمبند کرنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ یہ خطابت شاہ جی کے علم و اجتہاد ہی نہیں، ان کے خلوص، نیک نیتی، جرأت و شجاعت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اور اسے سننے کے بعد شاہ جی کی ذات سے جو والہانہ عقیدت اور مجذوبانہ محبت ہوئی ہے۔ وہ ناقابل بیان ہے۔

یہی عقیدت اور محبت تین سال بعد مجھے ترجمان تحفظ ختم نبوت روزنامہ "نوائے پاکستان" کی ادارت کے لئے لاہور کھینچ لائی۔ اور اس زمانے میں شاہ جی بیمار ہو کر لاہور میں حکیم نبی جمال سویدا صاحب کے زیر علاج حاجی دین محمد صاحب کے یہاں حبیب گنج بادامی باغ میں مقیم ہوئے۔ جہاں حسن اتفاق سے بندہ پانچ برس سے مطب کر رہا ہے۔

میں روزانہ یا ہر دوسرے روز وقت نکال کر شاہ جی کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ جہاں جلوت و خلوت میں ان کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض ہوتا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شاہ جی تہبند باندھے ڈیوڑھی میں کرسی پر تشریف فرما ہوتے۔ درویشی و سلطانی کو شاہ جی کی ذات میں جمع ہوتے جیسے میں نے دیکھا ہے۔ وہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔

شاہ جی کو میں نے جوانی میں نہیں بڑھاپے ہی میں دیکھا ہے لیکن ان کے چہرے کے نقوش، پیشانی کے نور کو دیکھتے رہنے کی خواہش ہمیشہ بیدار رہی۔ شاہ جی خاموش رہتے تو کسی قدیم یونانی فیلسوف کا مجسمہ دکھائی دیتے، بولتے تو زبان سے پھول برساتے، روتے تو آنکھوں سے خونِ دل بہاتے اور مسکراتے تو بجلیاں گراتے تھے شاہ جی، برطانیہ میں پیدا ہوتے تو لوگ شیکسپیئر کو بھول جاتے۔ ایران میں پیدا ہوتے تو بزرجمہر ہوتے۔ یونان میں پیدا ہوتے تو سقراط ہوتے لیکن وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جہاں کے لوگ پیغمبروں کا نام تک نہیں جانتے شاہ جی پیغمبر تو بہر صورت نہ تھے۔ لوگ انہیں کیسے پہچانتے۔ انہیں کیوں یاد کریں؟ ان کا ذکر کیوں کریں؟

شاہ جی عمر بھر قرآن سناتے رہے۔ قبرستانوں میں اذانیں دیتے رہے لیکن ان مُردوں کو نہ جگا سکے، ان قبرستانوں کو زندہ نہ کر سکے اور بالآخر خود ان قبرستانوں میں جا بسے

ہرگز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالمِ دوام

ریاض رحمانی

حضرت امیر شریعت

برادرِ عزیز و محترم مولانا سید عطاء المحسن بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کے والدِ گرامی قدر اور اپنے مرشد و پیشوا حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں اپنی یادداشتیں سپردِ قلم کریں۔

زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

قدرت نے شاہ جی کو بیشمار کمالات سے نوازا تھا۔ جس زمانے میں برصغیر ہند ان کی بےمثال خطابت کے زمزموں سے گونج رہا تھا وہ دور اس خطۂ ارض کا تاریخی دور تھا۔ ان دنوں زندگی کے ہر شعبے میں بلاامتیاز مذہب و ملت ایسے ایسے نابغۂ روزگار لوگ موجود تھے جن پر یہ دھرتی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ ہم بلاتامل عرض کر سکتے ہیں کہ گذشتہ ایک ہزار سال میں بیک وقت اتنے باکمال لوگ شاید ہی کہیں پیدا ہوئے ہوں مگر شاہ جی اس زمانے میں بھی سب سے انوکھے اور سب میں منفرد تھے۔ ان کو قدرت نے جس شانِ محبوبیّت و مقبولیّت سے سرفراز فرمایا تھا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ ہر طرف ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور پورے ہندوستان میں ان کے چاہنے والے موجود تھے۔

ہم نے ایک اچھا خاصا وقت ان کے قدموں میں رہ کر گذارا اور ان کی رفاقت میں دور دراز کا سفر کیا۔ ہم جہاں بھی گئے ان کے دیوانوں کی کمی کہیں محسوس نہ ہوئی۔ شاہ جی کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ کسی جنگل میں بھی ان کی تقریر کا اعلان ہوجاتا تو جنگل میں منگل کا سماں بندھ جاتا۔ وہ جس جلسہ میں شریک ہوتے وہاں کسی بھی بڑے سے بڑے خطیب اور عالم دین کا چراغ نہ جل پاتا۔ ان کا وجود ایسی شمع فروزاں کی طرح تھا جس پر نثار ہونے کے لئے پروانے سینکڑوں میل سے کھنچے چلے آتے۔ کبھی کبھی ان کی یہ مقبولیت خود ان کے لئے پریشانی و پشیمانی کا سامان بن جاتی۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے بہاولپور میں مجلس حزب اللہ اور جمیعتہ المسلمین کا جلسہ تھا۔ شاہ جی کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ، موجود تھے۔ حضرت مدنی تقریر فرما رہے تھے کہ شاہ جی بھی احتراماً حضرت کا بیان سننے کے لئے جلسہ گاہ میں چلے آئے۔ آپ جونہی سامنے آئے لوگوں نے زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا او تقریر کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ادھر شاہ جی شرم و ندامت کے احساس سے پانی پانی ہو رہے تھے، ادھر حضرت مدنی حیران و پریشان تھے۔ ان کے مزاج کا دھیمہ پن خاصا مشہور تھا مگر وہاں ان سے ضبط نہ ہوسکا اور غصے میں آکر فرمانے لگے کہ جن

جلسوں میں شاہ صاحب موجود ہوں وہاں ہم لوگوں کو بلا کر ہماری توہین کرانا مناسب نہیں ہے، جب شاہ جی رہائش گاہ پر واپس آئے تو کافی دیر تک فکر مندی اور دل گرفتگی کی حالت میں مہر بلب بیٹھے رہے۔

غالباً یہ سن بیالیس کے آخر یا تینتالیس کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، لاہور میں آل انڈیا جمیعتہ العلماء کانفرنس ہو رہی تھی۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھی خاص دعوت پر تشریف لائے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کے فقید المثال استقبال کا منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جس نشست میں حضرت امام الہند کا خطاب تھا اس میں شاہ جی بھی موجود تھے اور حضرت کی کرسی کے بالکل قریب دوزانو بیٹھے پورے انہماک سے تقریر سن رہے تھے۔ امام الہند کی تقریر کیا تھی، فصاحت و بلاغت کا ایک سیل رواں تھا مگر اچانک جلسہ گاہ کے مختلف حصوں سے بخاری۔ بخاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جب شور کچھ بڑھا تو حضرت نے اپنا بیان روک دیا اور حیرت و استعجاب کے ساتھ حاضرین کو تکنے لگے۔ اتنے میں شاہ جی دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور مولانا آزاد سے عرض کیا کہ حضرت ان جاہل لوگوں کی گستاخی کی میں معافی مانگتا ہوں لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو خاموش ہو گئے۔

کمال تو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ محبت و شفتگی کی اس کیفیت میں سب لوگ یکساں مبتلا تھے اس سلسلہ میں علماء، وکلاء تعلیم یافتہ، ان پڑھ شہری یا دیہاتی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس دور میں مجلس احرار اسلام کی صفوں میں خطابت کے ایسے ایسے شہسوار موجود تھے جن کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ قاضی احسان احمد، شورش کاشمیری، مولانا گلشیر، صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین کے علاوہ متعدد دوسرے رہنما تھے مگر شاہ جی کی مقبولیت کو کوئی نہ چھو سکا بلکہ یہ سب خود بھی ان کے حلقہ ارادت و محبت میں شامل تھے۔ حتّی کہ لاکھوں کروڑوں ہندو بھی آپ کے عقید تمند تھے۔ خیر پور میں ڈاکٹر رگھناتھ رائے بہت لکھے پڑھے اور سرد و گرم چشیدہ انسان تھے۔ مقامی ہندو سبھا کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے رات کو شاہ جی کی تقریر سنی تو اگلے روز ہم سے کہا کہ میں نے زندگی میں یہ واحد خطیب دیکھا ہے جو اپنی تقریر کے دوران پہلے خود مستی میں آتا ہے اور پھر سامعین کو مست و بیخود بنا دیتا ہے۔

جب سے سابق ریاست بہاولپور کی عدالت نے مرزائیوں کو کافر قرار دیا شاہ جی بہاولپور والوں سے بہت محبت کرنے لگے۔ جلسوں میں آتے تو مزید دو تین روز کے لئے یہاں ٹھہر جاتے۔ شاہی بازار میں واقع مجلس حزب اللہ کے دفتر میں خوب محفلیں سجتیں۔ ایک دن فرمانے لگے کہ بہاولپور کے علماء خصوصاً جامعہ عباسیہ کے مدرسین چھپ چھپا کر ملنے آتے ہیں اور رات کی تاریکیوں کی آڑ لیتے ہیں کیا حکومت سے ڈرتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ مولانا غلام محمد گھوٹوی شیخ الجامعہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ آپکو پسند نہیں کرتے یہاں تک کہ مدرسین اور طلبہ کو منع کر رکھا ہے کہ وہ آپ کی تقریر بھی نہ سنا کریں بلکہ انہوں نے راقم الحروف کو جامعہ عباسیہ سے نکلنے پر اسی لئے مجبور کر دیا تھا کہ ہمارا آپ سے تعلق خاطر ہے۔ یہ سننا تھا کہ شاہ جی نے کپڑے تبدیل کئے، کلہاڑی ہاتھ میں لی اور جامعہ عباسیہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم نے

راستے میں بہت روکا مگر وہ کب کسی کی ماننے والے تھے۔ جب ہم دونوں مدرسے کے صدر دروازے میں داخل ہوئے اور مدرسین و طلبہ نے دیکھا تو دنگ رہ گئے، ہمارے بعض سابق اساتذہ نے ہمیں گھور کر دیکھا اور خفگی کا اظہار کیا کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی ہے کہ شاہ جی کو ساتھ لے کر مدرسہ میں پہنچ گئے۔ حضرت شیخ الجامعہ دارالحدیث میں بڑے سے تخت پر بیٹھے طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے ان میں گولڑہ شریف کے موجودہ سجادہ نشین حضرت معین الدین، ان کے برادر خورد حضرت شاہ عبدالحق، ان کے ایک خدمت گار رفیق حافظ خدا بخش اور حضرت مولانا فاروق احمد کے صاحبزادے مولانا محمد احمد بھی شامل تھے کہ شاہ جی نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر السلام علیکم کہا اور حضرت شیخ کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جونہی شیخ الجامعہ صاحب نے مڑ کر دیکھا بوکھلا گئے۔ جسم پر کپکپی طاری ہو گئی، غصے میں صرف اتنا کہہ سکے کہ تم تم تم....... یہاں کیوں آئے ہو؟ شاہ جی نے کمال اطمینان سے جواب دیا کہ میں ان آنکھوں کو دیکھنے آیا ہوں جنھوں نے حضرت مہر علی شاہ صاحب کو دیکھا ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا حضرت شیخ اچھلے اور تخت سے نیچے گر کر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ کافی دیر تک یہ کیفیت طاری رہی پھر سنبھلے اور اٹھ کر شاہ جی کا منہ جسم اور ہاتھ چومنے لگے۔ جب انہیں کچھ قرار آیا تو شاہ جی اٹھے اور السلام علیکم کہ کر وہاں سے روانہ ہو گئے صحن اور برآمدے میں مدرسین اور طلبہ جو اس ڈر سے سہمے ہوئے تھے کہ ابھی کوئی دھماکہ ہو گا واپسی پر ہم دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھا تو انہیں کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ راستے میں شاہ جی ہم سے فرمانے لگے کہ دیکھا حضرت شیخ کو کیسا تڑپایا ہے۔

یہ کم لوگوں کو علم ہو گا کہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی رحمتہ اللہ علیہ کو درسگاہ سے نکال کر خطابت اور سیاست کے میدان میں لانے کا سہرا بھی شاہ جی کے سر ہے ورنہ زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے درس و تدریس میں گذارا۔ ابتداء میں کبھی کبھار جلسوں میں وہ مختصر خطاب کیا کرتے تھے مگر تقریر کے دوران مسلسل و متواتر احادیث پڑھنے کا انداز دیکھ کر شاہ جی نے ان سے کہا کہ آپ بیشک درس کا سلسلہ جاری رکھیں مگر جلسوں میں ضرور شرکت فرمایا کریں بلکہ ضلع رحیم یار خان سے جب کبھی آپکو کسی جلسے کی دعوت ملتی منتظمین کو ہدایت کرتے کہ مولانا درخواستی کو ضرور مدعو کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل میں قدرت نے ان سے جو کام لینا تھا شاہ جی کو اس کا ذریعہ بنایا۔ یہ آپکا معمول تھا کہ جب کہیں کوئی جوہر قابل دیکھتے اسے ترغیب دے دلا کر منبر کے راستے اسٹیج تک کھینچ لاتے۔ حضرت مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد شریف بھاولپوری اور مولانا عبدالرحمن میانوی رحمتہ اللہ علیہم کے علاوہ اور بھی کئی شخصیات تھیں جو آپ کے توسط سے شہرت و مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچیں۔ ہمیں یاد ہے جب عام خاص باغ میں منعقدہ ایک احرار کانفرنس میں شاہ جی نے خود مولانا محمد علی جالندھری کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ میں جالندھر سے ملتان کے لئے ایک ایسا تحفہ لایا ہوں جو ایک دن ملتان کی شناخت بن جائے گا۔

یہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ہم صرف نحو کی درسی کتابوں کے طالب علم تھے کہ خیرپور ٹامیوالی میں شاہ جی تشریف لائے۔ ساوی مسجد میں آپ نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز کے بعد خطاب فرمایا

یہ تقریر نہ صرف خیر پور والوں کے لئے بلکہ خود شاہ جی کے لئے بھی یادگار تھی جو اس وقت ختم ہوئی کہ اگر دس پندرہ منٹ مزید جاری رہتی تو عصر کا وقت ٹل سکتا تھا۔ رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد ملاقاتیوں نے اس تقریر کی تعریف کی تو شاہ جی نے فرمایا کہ آج عجیب کیفیت تھی نہ صرف دل و دماغ حاضر تھے بلکہ ایک خاص قسم کا جذبہ تھا جو بے اختیار بولنے پر مجبور کر رہا تھا۔ محترم سید غلام محی الدین شاہ صاحب ہمدانی بولے کہ حضرت اس مسجد کا سنگ بنیاد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا تھا اس پر شاہ جی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ الحمدللہ ہمارے بزرگوں کی روحانی برکتیں ہم پر ہر وقت سایہ فگن ہیں۔

خیر پور کے حوالے سے یاد آیا کہ یہاں شاہ جی کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ یہاں تشریف لاتے تو کئی کئی روز تک قیام پذیر رہتے۔ راقم الحروف کے علاوہ برادرم سید عباس علی شاہ ہمدانی مرحوم، برادرم حکیم نصیر الدین اور بعض دوسرے احباب کے ہاں دعوتیں ہوتیں اور شاہ جی کی بزم آرائیاں جاری رہتیں۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کی والدہ ماجدہ مرحومہ نے اعلیٰ درجہ کی کستوری دے کر ہمیں ہدایت کی کہ ہم شاہ جی کو پیش کریں آپ یہ تحفہ وصول کر کے بے حد خوش ہوئے۔ بار بار اس کی خوشبو سونگھتے اور سبحان اللہ پڑھتے رہے۔ آپ فرمایا کرتے کہ خوشبو میری کمزوری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہ جی کو خوشبو بہت پسند تھی اور بدبو سے اتنی نفرت تھی کہ ہلکی سی بدبو بھی خاطر پر ناگوار گذرتی۔ گھوڑے کی سواری بے حد پسند تھی۔ سب موسموں میں آپکو برسات کا موسم بہت پسند تھا۔ ساون بھادوں کے مینہ میں دل کھول کر نہاتے رہتے اس دوران اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو برستے مینہ میں تہبند کے ساتھ نماز ادا کرتے البتہ بادل کی زبردست گھن گرج اور بجلی کی چمک سے بہت ڈرتے تھے ادھر بجلی چمکتی ادھر لپک کر کمرے کے اندر چلے جاتے (حضور علیہ السلام بھی ایسی کیفیت میں پریشان ہو جاتے تھے اور اللہ سے رحمت کی دعا مانگتے تھے) شاہ جی کی اس کمزوری کو دیکھ کر ان کے تمام دوست حیران رہ جاتے۔

شاہ جی سراپا محبت و اخلاص تھے انہیں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی بھی انسان سے نفرت نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ میں صرف انگریز اور مرزائی سے نفرت کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندو آپ کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اس سلسلہ میں ایک ہندو پروفیسر سے ملاقات کا واقعہ سنیئے۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مترجم قرآن مجید میں اسم "صمد" کا ترجمہ نرادھار کیا ہے۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ انہوں نے بہت جستجو کی مگر کوئی بھی اس لفظ کا مفہوم نہ سمجھا سکا۔ جیل میں آپ کی ملاقات ایک ماہرِ لسانیات سے ہوئی وہ شخص ہندوستان کی قدیم زبانوں کا سکالر تھا۔ آپ نے جب یہ سوال اس پروفیسر سے کیا تو وہ حیرت سے آپ کا منہ تکنے لگا۔ بولا کہ آپکو یہ لفظ کہاں سے ملا۔ بہر حال پروفیسر مذکور نے وضاحت کی کہ جو اپنے کسی کام میں کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو، اور جس کی مدد کے بغیر کسی کا کوئی کام

انجام نہ پا سکے اسے نرادھار کہتے ہیں۔ فرمایا کہ پروفیسر مذکور کے ساتھ جیل میں قید کی مدت بڑی آسانی سے کٹی کیونکہ اس کے ساتھ ہر وقت علمی ادبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ دہلی تشریف لے گئے رات کو شاہی قلعہ کے سامنے جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حاضرین و سامعین کا اتنا ہجوم تھا کہ ہم نے اس سے قبل اتنا بڑا مجمع کبھی نہ دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ پورا شہر امڈ آیا ہے۔ شاہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب فرمایا اور دہلی والوں کے دل لوٹ لیے۔ جامع مسجد کے قریب ہی دوسری منزل پر مجلس احرار اسلام کا دفتر تھا۔ جہاں آپ کا قیام تھا۔ دن میں کسی بھی وقت روانگی تھی مگر دفتر کے نیچے ہلچل مچ گئی۔ پتہ چلا کہ محترم بیرسٹر آصف علی اور بیگم ارونا آصف علی آئے ہیں۔ دونوں پوری نیاز مندی کے ساتھ آپ سے ملے اور کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ دفتر کے انچارج میاں عبدالستار نے مہمانوں کی خود تواضع کی۔ پتہ چلا کہ رات کو دونوں میاں بیوی موٹر میں بیٹھ کر شاہ جی کی تقریر سنتے رہے تھے اور بیگم صاحبہ کی خواہش پر ملاقات کے لئے آئے تھے۔

آپکو قدرت نے خطاب و بیان کی ایسی صلاحیتیں عطا کی تھیں کہ سامعین مسحور ہو کر رہ جاتے۔ حسن بیان کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ بہاولپور کی پرانی جامع مسجد کے صحن میں جلسہ تھا رات کو ایک گھنٹہ تک قاضی احسان احمد صاحب کا بیان ہوا علامہ انور صابری کی نظم کے بعد شاہ جی کی تقریر شروع ہوئی۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ کتنا وقت گذر چکا ہے کہ اچانک جامع مسجد کے مرحوم مؤذن احمد بخش کی آواز گونجی اللہ اکبر اللہ اکبر تب جا کر پتہ چلا کہ رات بیت چکی ہے۔ شاہ جی نے اپنے مخصوص لحن و لہجے میں ترنم کے ساتھ یہ شعر پڑھا

دی مؤذن نے اذاں وصل کی شب پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

شاہ جی اپنی تقریر کے دوران موزوں و مناسب شعر ایسے موقع پر چست کرتے کہ حاضرین و سامعین بار بار فرمائش کر کے وہی شعر سنتے۔ ہمیں یاد ہے جب مجلس احرار اسلام نے برصغیر میں منعقد ہونے والے آخری عام انتخابات (۱۹۴۶ء) میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو شاہ جی اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ جو ان دنوں علیل تھیں کشمیر میں قیام فرما تھے اور جماعت کے اس فیصلے سے ناراض بھی تھے۔ امرتسر مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہوا جو بہت زور دار تھا۔ میاں افتخار الدین نے تقریر کی وہ اس زمانے میں کانگریس کو چھوڑ کر پنجاب مسلم لیگ کی صدارت قبول کر چکے تھے انہوں نے اپنی تقریر میں یہ الزام لگایا کہ احرار کانگریس کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں۔ جن دنوں وہ صوبہ پنجاب کانگریس کے صدر تھے ان لوگوں کو اپنے ہاتھ سے تنخواہ ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے اس الزام نے پورے شہر میں آگ لگا دی۔ گلیوں بازاروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ احرار رضاکار بے حد مایوس و ملول ہو چکے تھے۔ کہ شیخ حسام الدین اور مولانا مظہر علی اظہر نے آغا شورش کو کشمیر بھیجا کہ وہ

صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کر کے اور شاہ جی کو منا کر اپنے ہمراہ واپس لائیں۔ آغا صاحب شاہ جی کو واپس لانے میں کامیاب ہو گئے جماعت نے اپنا پہلا انتخابی جلسہ امرتسر میں کیا۔ شیخ صاحب نے صدارت فرمائی شاہ جی نے اس روز تاریخی تقریر کی۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جلسہ گاہ میں موجود تھا جب آپ نے میاں افتخار الدین کے الزام کا ذکر کیا تو یہ شعر پڑھا

حضرت زاہد نے مے پی کر یہ اچھی چال کی
محتسب سے جا ملے رندوں کے مخبر ہو گئے

یقین کیجئے اس شعر نے جادو کا اثر دکھایا۔ کئی غمزدہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، کئی لوگ قہقہے لگا رہے تھے، کچھ لوگ شعر کی معنویت کی داد دے رہے تھے اور کچھ لوگ اس کے بر محل استعمال پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ لوگوں نے بار بار فرمائش کر کے سات مرتبہ یہ شعر پڑھوایا۔ اگلے روز میاں صاحب کے الزام کی دھجیاں بکھر چکی تھیں اور جگہ جگہ شاہ جی کی معرکتہ الارا تقریر کے چرچے ہو رہے تھے۔

شاہ جی کو عوام کی نفسیات کا پورا پورا ادراک تھا خود فرماتے تھے کہ میں لوگوں کی آنکھوں سے تقریر کے لئے موضوع تلاش کرتا ہوں۔ تقریر کے دوران اپنے مقربین کو اپنے سامنے بٹھاتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ "یتلو علیہم میں شامل ہو کر بیٹھو۔ تقریر سے قبل چند لمحوں تک کچھ پڑھتے پھر دائیں ہتھیلی پر پھونک کر چہرے پر ہاتھ پھیرتے اس کے بعد مجمع پر نظر جو ڈالتے تو دلوں کو کھینچ لیتے ہم اور ہم جیسے آپ کے نیاز مندوں نے بہت پوچھا کہ آپ اس دوران کیا پڑھتے ہیں تو ہنس کر ٹال جاتے۔ ایک مرتبہ ہم نے کہا شاہ جی آپ پڑھتے وڑھتے کچھ بھی نہیں یہ آپکا محض نفسیاتی حربہ ہے تو مسکرا کر فرمایا تم بھی یہ حربہ استعمال کر کے دیکھ لو۔

آپکی معجز بیانی کا یہ کمال تھا کہ جس طرح کوئی شہسوار بپھرے ہوئے گھوڑے کو رام کر لیتا ہے اس طرح بگڑے ہوئے مجمع کو قابو کر لیتے اور لوگوں کے دل جیت لیتے تھے۔ کہروڑ کے علاقے میں ایک قصبہ ہے رانے واہن۔ وہاں احرار کا جلسہ تھا یہ پورا علاقہ بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا علاقہ ہے اس کے قریبی مواضعات میں جوئیہ برادری کی ہزاروں مربعہ اراضی واقع ہے۔ ان زمینداروں کو احرار کارکنوں کی یہ جسارت ناگوار گزری کہ یہاں ان کی اجازت و مرضی کے بغیر جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی تقریر میں کچھ زیادہ ہی تلخی آ گئی جس پر وہ لوگ بپھر گئے اور جلسہ کا بائیکاٹ کر کے کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے اپنی تقریر اس تمہید کے ساتھ شروع کی۔

"ہم لوگ اسلام کے جاروب کش ہیں دینی مسائل کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر جمنے والے اس گرد و غبار کی صفائی ہمارا فریضہ ہے جو گناہ و معصیت یا غفلت و جہالت کی وجہ سے دلوں کو آلودہ کر دیتا ہے۔ قاضی احسان نے جذبات میں آ کر عجلت سے کام لیا ہے اس لئے اس کے جھاڑو سے اٹھنے والی گرد نے آپ

کے کپڑے میلے کر دیے ہیں۔ میں تجربہ کار صفائی کنندہ ہوں پہلے پیار و محبت کے پانی سے اس مٹی کو گیلا کروں گا، پھر جھاڑو چلاؤں گا انشاء اللہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

اتنا سننا تھا کہ بپھرا ہوا مجمع سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پنڈال میں آ گیا۔

شاہ جی کا پیغام، پیغام محبت تھا جب کبھی ان کی تقریر کے دوران کوئی معترض بول پڑتا اور اس کا لہجہ سخت بھی ہوتا تو شاہ جی کمال شفقت و مہربانی سے پیش آتے۔ ایک مرتبہ میلسی میں آپ کی تقریر جاری تھی کہ کرم پور کا ایک کمہار جو ملنگ کہلاتا تھا کھڑا ہو گیا اور یہاں تک گستاخی کی کہ آپ کو دشمن رسول ﷺ کہدیا۔ احرار رضا کار اس پر جھپٹے مگر شاہ جی نے سختی سے روک دیا اور اسے اپنے پاس اسٹیج پر بلا لیا اپنی کرسی کے پاس بٹھا کر فرمایا کہ تقریر سے فارغ ہو کر آپکی بات سنوں گا پھر چشم فلک نے یہ منظر دیکھا کہ وہ شاہ جی کے خطاب کے دوران بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا اور بار بار شاہ جی کے پاؤں چومنے کی کوشش کرتا۔ ہم لوگوں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔

سفر کے دوران بھی آپ سے کئی لوگ ٹکرائے۔ جہاں ہزاروں مسافر آپ کو گاڑی میں موجود پا کر اظہار عقیدت کیا کرتے تھے وہاں کئی مخالفوں سے بھی آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ ہم نے بارہا ان لوگوں کی آنکھوں میں نفرت کے رنگ کو محبت کی قوس قزح میں بدلتے دیکھا۔ آپ نے پوری زندگی ریلوے کے تیسرے درجے میں سفر کیا عقیدت مند لوگ آپ کے لئے اونچے درجے کا ٹکٹ لے لیتے تو آپ اسے واپس کر دیتے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ کراچی سے روانگی کے وقت کسی دوست نے سیکنڈ کلاس کا ملتان تک کا ٹکٹ لا دیا تھا مجبوراً مجھے بھی آمادہ ہونا پڑا راستے میں جہاں جہاں گاڑی رکتی پیٹ فارم پر لوگوں کو بھاگ دوڑ میں مصروف دیکھتا تو یک گونہ عجب کا احساس ہوتا کہ میں آرام سے بیٹھا ہوں اور یہ بے چارے سیٹیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ فرماتے کہ وہ دن اور آج کا دن میں نے تہیہ کر لیا کہ پھر کبھی اونچے درجے میں سفر نہیں کروں گا تاکہ احساس تفاخر سے دل محفوظ رہے۔

ایک واقعہ یاد آیا کہ شاہ جی حیدر آباد سندھ سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے ہم بھی آپکے ہمراہ تھے یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک پاکستان عروج پر تھی مسلم لیگ کے ایک سرگرم رکن اور ہمارے عزیز دوست منشی عبدالحمید مرحوم بھاولپور کے لئے رحیم یار خاں سے اسی ڈبے میں سوار ہوئے جس میں شاہ جی موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر منشی صاحب کترانا چاہ رہے تھے کہ ہم پر ان کی نظر پڑی۔ شرماتے لجاتے ہمارے پاس آ گئے۔ ہم نے حضرت سے ان کا تعارف کرایا باتوں باتوں میں منشی صاحب نے طنز کیا کہ شاہ جی آپ لوگوں نے زندگی بھر قیدیں کاٹیں مگر انگریز کو ہندوستان سے نہ نکال سکے۔ شاہ جی مسکرائے اور سودا کا یہ قطعہ پڑھا

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

شاہ جی کا شعری ذوق بے حد ارفع و اعلیٰ تھا۔ ایک تقریر کے دوران ختم نبوت کے موضوع پر دلائل دے رہے تھے کہ غالب کا یہ شعر آپکی زبان پر آگیا۔

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ بتلاؤ کہ بتلائینگے کیا

فرمانے لگے کہ علوم و معارف کا سارا خزانہ تو حضور نبی کریم ﷺ لٹا کر جا چکے اب کوئی نیا نبی آئے بھی تو کیا کریگا اور کیا کہے گا؟ اس کے پاس بتانے کو کیا ہوگا؟
یقین فرمائیے کہ ہم غالب کے پرستاروں اور اس کے کلام کو سمجھنے کے دعویداروں میں خود کو شمار کرتے ہیں مگر غالب کے اس شعر کی جو تشریح شاہ جی نے کی اس پر ہم ششدر رہ گئے۔

رہبرِ عاشقانِ پاک سرشت

دل بشورید و چشمِ من بچکید — دوش چوں نغمۂ ندیم شنید
رہبرِ عاشقانِ پاک سرشت — شاہدِ عاشقانِ بزمِ وحید
یادِ لغزش زمن ربود دلم — مرغِ اندیشہ ام زلانہ پرید
شد چناں مشتعل بدل آتش — جوش زد خون و قطرہ قطرہ چکید
شد سکون از دلم زِ یادِ رُخش — مضطرب گشت و ہوش و صبر رمید
اندریں بے خُودی شنیدم من — نغمۂ کزروانِ من بچکید
اے خوش آں کس کہ برد رش برسید — در حریمش حضور او بتپید
دست بردار شد زِ ہر دو جہاں — جان و سرداد و عشقِ او بخرید
خویش را کرد بہرِ اُو ویراں — جامۂ عقل پارہ پارہ درید
فارغ از "نیل" و "سلسبیل" آمد — ہر کہ یک جرعہ از خمش بچشید
ہست برتر ہزار بار زگل — خارِ عشقش کہ در دلم بخلید
جانِ ناسک بہ رقص و وجد آمد — چوں پیامش خود از ندیم شنید

(میر غلام نبی ناسک امرتسری)

مظفر مہدی ہاشمی

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

میں پانچ چھ برس کا بچہ تھا جبکہ ان کی بھرپور جوانی تھی۔ پورا فرنگی انڈیا ان سے مسحور تھا۔ ہمارے ہاں ان کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ ضلع مظفر گڑھ میں ان کے مرید لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ میری پھوپھی نے بہت بعد میں مجھے بتلایا کہ ایک دن مشہور ہو گیا کہ امیر شریعت کو فرنگیوں کے کسی کارندے نے شہید کر دیا ہے۔ اس دن میرے والد صاحب، میاں خدا بخش ہاشمی شکار پر گئے ہوئے تھے۔ اور تو کچھ نہ سوجھی میں نے اپنے والد صاحب کی تلوار اپنے کندھے پر رکھی جو میرے قد سے بھی بڑی تھی اور گھر سے باہر نکل پڑا اور زبان سے اعلان کیا کہ جس کسی نے بھی میرے چچا کو شہید کیا ہے آج میں اسے قتل کر دوں گا میری پھوپھی نے ملازمین کو کہا کہ فوراً جاؤ اور اس سے تلوار چھین کر اور پکڑ کر گھر واپس لاؤ۔ میں ابھی گھر سے کچھ فاصلے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ وہ لوگ پہنچ گئے اور مجھے زبردستی گھر لے آئے۔ میں سارا دن روتا رہا شام کو میرے والد صاحب گھر آئے انہیں جب حقیقت حال بیان کی گئی تو انہوں نے مجھے پیار کیا۔

پھر ایک روز مجھے بتایا گیا کہ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے تقریباً پانچ چھ سو میل دور، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جانا ہے ان دنوں یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ بڑے بڑے زمیندار اور پیسے والے لوگ بھی اپنے بچوں کو، صرف تعلیم کے لئے اتنی دور نہیں بھیجتے تھے۔ اور اگر بھیجتے بھی تھے تو میٹرک کے بعد۔ اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ تو فرنگی حکومت کے خلاف ایک ادارہ تھا۔ جہاں پنجاب کے بہت کم مسلمان زمیندار اپنے بچوں کو داخل کرانے کی جرات کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ دور و نزدیک کے لوگ آ کر میرے والد صاحب کو اس کام سے منع کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر انہیں تو شاہ جی کے حکم کی پاسداری تھی۔ جنہوں نے فرمایا تھا کہ بچوں کو انگریزی حکومت کے کسی بھی ادارے میں داخل کرانے کا نتیجہ انہیں غلامی میں پختہ کرنا تھا۔ اسی بنا پر تیسری جماعت تک کتابیں میں نے ایک پرائیویٹ استاد سے پڑھیں اور پھر چوتھی جماعت میں دہلی جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں ابتدائی مدرسے کے استاد بھی ہائیڈ برگ، آکسفورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے اور جامعہ میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو ان دنوں شیخ الجامعہ تھے اور آزادی کے بعد بھارت کے صدر منتخب ہوئے، ابتدائی مدرسے میں چھٹی جماعت کے بچوں کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

میرے جیسے اور بھی سینکڑوں ہزاروں بچوں اور ان کے والدین کو جامعہ ملیہ میں داخلے کی ترغیب دیتے۔ بعض لوگ بات مان لیتے اور بعض نہیں مانتے لیکن شاہ جی نے کبھی بھی جامعہ ملیہ میں جا کر وہاں کی انتظامیہ پر کوئی احسان نہ جتلایا کہ وہ ان کے لئے کچھ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مخیر حضرات کو اس ادارے کے لئے

چندہ بھیجنے کو بھی کہتے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جامعہ والوں کو بعد میں پتہ چلتا کہ وہ رقم کس کی معرفت وہاں پہنچی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری، تمام جنوبی ایشیا میں واحد عالم دین تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ نہ کبھی

مولانا کا لقب پسند کیا اور نہ ہی علامہ کا، لوگوں نے انہیں از خود امیر شریعت کا لقب دیا جبکہ انہوں نے اس لقب کو بھی اپنے نام و نمود کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ تقریر ہو یا کسی محفل میں گفتگو وہ ہر مقام پر اپنے آپ کو یا تو صرف بخاری کہتے تھے۔ اور یا پھر عطاء اللہ شاہ۔ فرنگی حکومت ہو یا ہندو کانگریس، انہوں نے کبھی بھی ان کے کسی التفات کو در خور اعتنا نہیں سمجھا، یہاں تک کہ انہوں نے عوام سے بھی اپنے لئے نہ کبھی چندہ مانگا اور نہ ہی کسی وظیفے کے خواستگار ہوئے ان کی شیر جیسی سرخ آنکھیں اس دنیا میں کسی کی بھی ممنون نہیں ہوئیں۔ اور نہ ہی جھکیں، دین ہو یا دنیا، انہوں نے اپنی ہر بات پروردگار پر چھوڑ رکھی تھی اور یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ اور تجربہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب سے بھی کچھ مانگا تو اس کی رضا مانگی، تسلیم مانگی، اور قناعت مانگی، وگرنہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن ہمارے ہاں "قریشی مظفر گڑھ" میں تشریف فرما تھے، ان کے چند مرید بھی بیٹھے تھے کہ باتوں میں سے بات نکلی اور کہنے لگے کہ بعض اوقات میرے اوپر ایسی واردات بھی آتی ہیں کہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میں کسی دیوار کو بھی کہوں تو وہ آگے کی طرف چلنے لگے۔

ان کی بے مثل خودداری نے انہیں قناعت عطاء کی اور اسی قناعت کی بنا پر نہ وہ کسی کے احسان مند ہوئے اور نہ ہی ممنون یہاں تک کہ جب ان کی وفات کے بعد ان کا جنازہ پڑھا جا چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہزاروں لوگوں نے شور مچا دیا کہ انہیں ملتان کے قلعہ کہنہ پر دفن کر کے ان کا اونچا مزار تعمیر کیا جائے۔ اس بات کے لئے بہت سے با اثر افراد جو وہاں پر موجود تھے کہنے لگے کہ وہ ابھی جا کر کمشنر ملتان سے سرکاری طور پر اجازت لے آتے ہیں لیکن ان کے صاحبزادے سید عطاء المنعم ابو معاویہ مدظلہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ان کے ابا جی نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کوئی چیز حکومت سے نہیں مانگی اور اب ان کی رحلت کے بعد ہم انہیں سرکاری اراضی کا مرہون منت نہیں ہونے دینگے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ تقریر کے بادشاہ تھے، اردو، پنجابی، فارسی، یہاں تک کہ عربی چاروں زبانوں کے الفاظ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے تھے اور وہ انہیں جس طرح چاہتے استعمال میں لاتے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب ان کی تقریر شروع ہوتی تو صبح کی اذان ہو جاتی مگر نہ الفاظ ختم ہوتے اور نہ ہی معانی۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے اور مسحور ہو کر بیٹھے رہتے۔ شاہ جی جب چاہتے تمام اجتماع کو ہنسا دیتے اور جب چاہتے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو کی جھڑیاں لگا دیتے۔ ان کی زبان ایک ایسی دو دھاری ذوالفقار تھی کہ کاٹ کرتی تو انگریز اور ہندو، دونوں کی گردنیں اڑا دیتی اور طنز کرتی تو اپنوں کے سینوں میں اتر جاتی لطیفے بیان کرنے پر آتے تو سننے والے پہلے ہنس پڑتے اور پھر جب انہیں ان لطیفوں کی حقیقت کا علم ہوتا تو رو پڑتے

اور جب کسی المیے کی داستان چھیڑتے تو اس کے آخر میں کوئی ایک ایسا فقرہ چسپاں کر دیتے کہ لوگوں کو امید کی کرنیں دکھائی دینے لگتیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور نہ ہی اپنی قوم کو کبھی مایوسی کی طرف دھکیلنے کی کوئی کوشش کی انہیں اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ انہیں اپنے ہادی ﷺ پر مکمل ایمان تھا۔ صحابہ کرامؓ کے پیروکار تھے اہل بیت ازواج رسول ﷺ کی تعظیم کا انہیں پاس تھا اور اولیاء کرام کی خدمات کے پوری طرح قائل تھے وہ بدعت کو بدعت کی حد تک رکھتے اور جیسا قیام پاکستان کے بعد علماء غلو پر اتر آئے جن میں سے بعض، بدعت کی مذمت میں حد سے بڑھ گئے اور بعض دوسرے بدعت کو بدعت کہنے سے ہی انکاری ہو گئے۔ شاہ جی نے ان دونوں کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ سب کو مل کر مرزائیت کے کفر کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان کے دور میں تمام مکاتب فکر کے لوگ ان کے آگے زانوئے تلمذ طے کرتے۔ دیوبندی اور بریلوی جھگڑے کی جو شکل قیام پاکستان کے بعد نظر آنے لگی ہے وہ ان کے دور میں کہیں نہیں تھی۔ بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے بہت سارے شیعہ مسلک کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ان کی تقریریں سنتے اور ان کی محفلوں میں آ کر بیٹھتے۔

دہلی ہی کی بات ہے کہ ایک دفعہ مجھے پتہ چلا کہ شاہ جی دہاں آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں جمعہ کی چھٹی والے دن ان کے پاس پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے حکم فرمایا کہ کاغذ قلم سنبھالو اور جو کچھ میں کہوں لکھ کر اخبارات میں میری طرف سے بیان بھجوا دو۔ جب لکھوا چکے تو فرمایا کہ اب مجھے پڑھ کر سناؤ۔ وہاں ایک جگہ گاندھی کا لفظ تھا جس کے آگے میں نے از خود مہاتما لکھ دیا تھا۔ فرمانے لگے اسے کاٹ دو اور صرف گاندھی جی لکھو۔ یہ واقعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکا کانگریس کی طرف جھکاؤ ضرور تھا لیکن اتنا نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے فارمولے سے اختلاف انکا اپنا تھا نہ کہ کانگریس کی پیروی میں تھا۔

ویسے تو تمام جنوبی ایشیا کے برصغیر میں وادیٔ کشمیر سے لیکر راس کماری تک خلیج بنگال سے لیکر درہ خیبر تک ان کے مرید اور معتقد لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کے پیروکار جتنے جنوبی پنجاب میں تھے اتنے کہیں اور نہ تھے۔ میں بچہ تھا اور میرے والد صاحب مجھے ان کے جلسوں میں اکثر ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انکی تقریر ختم ہوتی تو لوگوں کا ہجوم ان کی بیعت کے لئے تیار ہو جاتا تو ان کے حکم پر لوگ اپنی پگڑیاں اتار کے ایک دوسری سے گانٹھ لیتے اور اس طرح ایک طویل قطار بن جاتی شاہ جی کلمہ پڑھاتے اور لوگ ان پگڑیوں کو ہاتھ لگا کر کلمے کو دہراتے اور اس طرح خوش ہو کر مرید بن جاتے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں حضرت شاہ جی جتنا سرکنڈے کے جھونپڑوں میں رہ کر خوش ہوتے اتنا پکے مکانوں میں نہ ہوتے بلکہ ہمارے ہاں جب بھی آتے تو سرکنڈے کے ایک چھپر میں ریت بچھا دی جاتی، پھر اس پر پانی کا چھڑکاؤ کر دیا جاتا جس سے ہاڑ کی لو بھی ٹھنڈی ہو جاتی جہاں آپ قیام فرماتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔

اب ایک آخری بات۔ گرمیوں کے دن تھے اگست کا مہینہ تھا اور سال ۱۹۶۱ء تھا۔ میں جب صبح کو جاگا تو مجھے قبلہ شاہ جی کی یاد آنے لگی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ملتان جا کر ان سے ضرور ملاقات کروں گا۔

تیار ہونے میں ذرا دیر ہو گئی۔ ان دنوں میرے پاس ایک موٹر سائیکل تھی۔ دن کے تقریباً ۱۱ بجے میں ملتان پہنچ گیا۔ کوٹ تغلق شاہ کے پاس جب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ مجھے ایسے لگا کہ کوئی بڑا حادثہ ہو چکا ہے۔ میں نے جب ایک راہگیر سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھا اور بتلایا کہ آج حضرت شاہ جی انتقال فرما گئے ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کر رہ گیا دُکھ ضرور ہوا اور بہت زیادہ لیکن اطمینان اس سبب ہوا کہ آج شاہ جی نے مجھے اپنے جنازے میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر بلایا ہے۔ ان کے بڑے فرزند سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں مجھے بھی شرکت کا اعزاز نصیب ہوا یہ واقعہ میری زندگی کا ایک بیش قیمت اثاثہ ہے کیا یہ ایک ولی اللہ کی کرامت تھی؟

(الاحرار لاہور، امیر شریعت نمبر اگست ۱۹۹۴ء)

شورش کاشمیری

دور تک جرأت گفتار کی بجلی کوندی

ہم نشینانِ رسالت کی دعا یاد آئی
غائب از چشم بخاری کی صدا یاد آئی

شوق پھر لے کے چلا کوچۂ قاتل کی طرف
پھر کوئی بات بہ عنوانِ قضا یاد آئی

پھر کوئی شعلہ بیاں تیغ بکف آپہنچا
پھر محمد کے گھرانے کی صدا یاد آئی

جب کبھی اس کی خطابت کا تصور باندھا
قرن اول کے خطیبوں کی ادا یاد آئی

جب کبھی معرکۂ بدر و اُحد یاد آیا
خاکِ لاہور کی گلگونہ قبا یاد آئی

جب کبھی خون شہیدانِ وغا بول اٹھا
نقش آرائی تسلیم و رضا یاد آئی

دور تک جرأت گفتار کی بجلی کوندی
دیر تک شوخیٔ نقشِ کفِ پا یاد آئی

شورش اس کشمکش دہر کے ویرانے میں
ایک محبوب قلندر کی ادا یاد آئی

رازی پاکستانی

شاہ جی سے وابستہ یادیں

محترم رازی پاکستانی حضرت امیرِ شریعت کے ارادت مندوں میں سے ہیں۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ انہوں نے شاہ جی سے آٹوگراف بھی لیا اور اس موقع پر لکھتے ہوئے شاہ جی کی تصویر بھی بنائی۔ مرحوم آغا شورش کاشمیری سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ شاہ جی کی یہی تصویر اور آٹوگراف شورش مرحوم نے شاہ جی کی سوانح حیات کے پہلے ایڈیشن میں شائع بھی کئے۔ رازی ان دنوں لندن میں مقیم ہیں۔ میرا ان سے قلمی رابطہ ہے مگر ملاقات سے محروم ہوں۔ ان کی عنایت ہے کہ میری درخواست پر ذیل کی سطور انہوں نے لکھ بھیجیں اور شاہ جی کی وہ تصویر بھی عطاء فرمائی جو ان کی ایک چینی کلاس فیلو نے ہانگ کانگ میں بنائی تھی۔ رازی صاحب کے شکریہ کے ساتھ ان کی تحریر قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ (مدیر)

۱۹۵۳ء میں جب ختمِ نبوت کی تحریک زوروں پر تھی دوسرے شہروں کی طرح ہمارے شہر میانچنوں میں بھی سر ظفر اللہ کی وزارت خارجہ سے سبکدوشی اور میرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لئے جلسے، جلوس نکل رہے تھے۔ شہر کے بزرگ عالمِ دین مولانا محمد ابراہیم جگرانویؒ، چوہدری محمد طفیل شاہین (اب اسکاٹ لینڈ کی مشہور کاروباری شخصیت) اور ملک محمد منور وغیرہ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تو ہانگ کانگ کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ کالج کے باقی ساتھی بشیر خاور کی معیت میں مختلف کالجوں کی ایک انجمن بنا کر گرفتاریاں دینے کی کوشش میں تھے۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ (وائیں) کے ذاتی حجام کا تعلق قادیان سے تھا۔ شہر کے نوجوان طلباء اکٹھے ہو کر ان سے ختمِ نبوت کے متعلق سوال کرتے۔ انہی دنوں ملتان کے تھانہ کپ میں کسی پولیس انچارج کی جلد بازی سے گولی چل گئی۔ کئی جانوں کا نقصان ہوا تو درویش شاعر ساغر صدیقی نے معرکتہ الآرا نظم لکھی۔

بیٹے کہاں ہیں میرے، ملتان پوچھتا ہے؟
کیوں چھا گئے اندھیرے، ملتان پوچھتا ہے؟

تب ہم شاہ جی سے ملنے ملتان گئے تھے۔ میں نے اب تک ان کو دور سے دیکھا تھا بہت پہلے ان کی تقریریں خیر المدارس جالندھر کے سالانہ اجلاس میں والد صاحب کی معیت میں سنی تھی۔ ان دنوں اتنی سوجھ بوجھ تو نہیں تھی لیکن شاہ جیؒ یا قاضی احسان احمدؒ کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اور آج ہم اس عظیم شخص کے ہاں بن بلائے مہمان بنے بیٹھے تھے۔ اور وہ شخص زندگی بھر کے تجربے اور پوری بزرگانہ شان کے باوصف آمنے سامنے بیٹھے اٹھارہ بیس سال کے کھلنڈرے سے لڑکوں سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ اور مختلف کالجوں کے یہ طالب علم بھی شاہ جی کو اپنا سمجھ کر کھلی کھلی باتیں کر رہے تھے۔ اب وہ عظیم انسان ہمیں چائے پلانے پر اصرار کر رہا تھا۔ تب یوں ہی کہیں مولینا ابوالکلام آزاد کی غبارِ خاطر والی چائے کا ذکر ہوا تو انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھنا تو وہ چائے شاید چین میں ملتی ہو؟ اس کے بعد میں ہانگ کانگ چلا گیا۔ وہاں کبھی کبھار چینی دوستوں کے ساتھ کسی کیفے میں ایسی چائے

بغیر دودھ اور شکر کے، پیتے تو شاہ جیؒ کی بات یاد آجاتی۔

پیکنگ میں پاکستان کے پہلے قونصلر شیخ تاج الدین اب ہانگ کانگ میں مقیم تھے۔ ان سے مشورہ کے بعد میں نے پاکستانی سفارتخانہ کے ایک صاحب کی معرفت وہ خاص چائے شنگھائی یا پیکنگ سے منگوالی۔ پارسل سے بھیج رہا تھا کہ کامریڈ مبارک ساغر نور ابو سعید انور ہانگ کانگ پہنچ گئے۔ وہ دفتر "چٹان" سے میرا ایڈریس اور فون نمبر لے آئے تھے۔ بہر حال وہ چائے شاہ جی کو پہنچ گئی۔

۱۹۵۶ء میں واپس ملک آیا تو دوستوں کے ساتھ شاہ جی کے ہاں حاضری دی۔ وہ چائے کی بات کرنے ہی لگے تھے کہ میں نے جرأت سے کام لے کر کہا کہ نہ تو آپ "اس غیر ضروری شے" کے لئے شکریہ ادا کریں اور نہ ہی آپ ایسے "جفاکش انسان" کو مولانا آزاد کی پیروی میں آئندہ کے لئے ایسے چسکوں میں پڑنا چاہیئے۔ (میں نے آغا شورش سے اتنے قریبی تعلقات کے باجود ان کی تقریر کبھی نہیں سنی۔ لاہور میں میرا قیام ۱۹۵۶ء میں آغا صاحب کے ہاں تھا۔ وہ ہر کسی کو "میرا بھائی ہانگ کانگ سے آیا ہوا رازی" سے تعارف کراتے تھے۔ ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔ ان کے بعد بھی خاندان سے یہ رشتہ اب تک قائم ہے) لاہور واپس آکر میں یہ بات آغا صاحب کو بتا رہا تھا تو حمید نظامی اور شیخ حامد محمود بھی وہاں بیٹھے تھے۔ شورش پوچھتے تھے کہ شاہ جی نے تب کیا کہا۔ میں نے کہا کہ اس عظیم شخص کی وہی مسکراہٹ تھی۔ جس سے آپ بھی شناسا ہوں گے۔ (پنجابی میں کہی گئی بات سے الفاظ تو بدل ہی جاتے ہیں)

اس دن شاہ جی نے مجھے اور میرے بھائی اکرام آصفی کو بھی آٹوگراف دیئے تھے۔ اکرام کی آٹوگراف بک پر انہوں نے یہ شعر تحریر فرمایا کہ:

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے، کیا خوش مزاج ہے

میں نے روسی کیمرہ سے ان کی تصویریں بھی لی تھیں اوروں کو تو سختی سے منع کر دیا کرتے تھے لیکن میرے "غیر ملکی" ہونے اور آغا شورش کی وجہ سے وہ ٹال سا گئے تھے۔ انہیں دنوں مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مسعود کھدر پوش نے ان کی کوئی تصویر یا باتیں ٹیپ کرلی تھیں۔ شاہ جی نے اپنی باتیں ٹیپ شدہ سنیں تو میرے اندازے کے مطابق کافی متاثر ہوئے تھے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ تم بھی ایسا آلہ لائے ہو؟

میں شاہ جی کو بتا رہا تھا کہ میں نے قیامِ پاکستان سے پہلے بارہ تیرہ سال کی عمر میں ان کی تقریریں سنی تھیں۔ اور ایک جلسہ میں انہوں نے "کنکاں دیاں فصلاں یکیاں نیں" کی بڑی لمبی تشریح کی تھی۔ وہ عظیم انسان شاید اس وقت کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے تم ذہین بھی ہو اور شرارتی بھی۔ علم ختم نہیں ہوتا بہت ہی زیادہ علم حاصل کرنا۔ تم واپس لوٹو گے تو شاید ہم نہیں ہوں گے۔ لیکن جہاں کہیں بھی رہو مذہب، ملک اور قوم کو یاد رکھنا۔

اس ملاقات میں میرے کالج کے ساتھی جو محکمہ بحالیات ملتان میں متعین تھے ہمراہ تھے۔ وہ شاہ جی کو کسی بہتر علاقے میں اچھا مکان الاٹ کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ لیکن اشارۃً کہی گئی بات کا جواب بھی نفی میں ملا تو سب خاموش ہو رہے۔ حالانکہ ملتان کے وہ چار پانچ دوست کچے مکان کو کوٹھی میں تبدیل کر سکتے تھے۔

میں نے شاہ جی سے ان کی ایک تصویر کا ذکر کیا جو ہانگ کانگ میں میری ایک چینی کلاس فیلو نے بنائی تھی۔ تو انہوں نے فارسی کا ایک مصرع کہا کہ بازی بازی۔۔۔۔۔۔۔ ترجمہ شاید ایسے تھا کہ (ہم بوڑھے لوگوں کی داڑھیوں سے کھیلو) بہرحال وہی تصویر شاہ جی کے نواسے سید محمد کفیل بخاری صاحب کو میں بھجوا چکا ہوں۔ اب تو یادیں باقی ہیں۔۔۔۔ جب تک زندہ ہیں شاہ جی یاد آتے رہیں گے۔

سفیرِ رسالت، امیرِ شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمۃ اللہ علیہ

سفیرِ رسالت امیرِ شریعت

خطیبِ نبوّت، امیرِ شریعت

صدائے حقیقت، امیرِ شریعت

حروفِ طریقت، امیرِ شریعت

رضاکارِ سلطانِ ختمِ نبوّت

سراپا ارادت، امیرِ شریعت

رہا فتنۂ قادیاں کے مقابل

امیرِ شریعت، امیرِ شریعت

جلاتا رہا جبر کی آندھیوں میں

چراغِ ہدایت، امیرِ شریعت

ترے سوگ میں چُپ ہیں محراب و منبر

کمالِ خطابت، امیرِ شریعت

زباں بندیوں میں بھی دیتا تھا ذوقی

اذانِ صداقت، امیرِ شریعت

علامہ ذوقی مظفر نگری

قرنِ اوّل کے عزائم کی پکار

شاہ جی تھے قرنِ اول کے عزائم کی پکار
عصرِ حاضر میں اساطیرِ کہن کے پاسدار
اس گئے گزرے زمانے میں فقیرِ کج کلاہ
جاں نثارانِ شہِ کون و مکاں کی یادگار
کشتگانِ خنجرِ تسلیم کے میرِ سپاہ
غازیانِ سر بکف میں خوش نہاد و خوش وقار
خواجۂ کیہاں کے میخانے میں رندِ لم یزل
عرصۂ جنگاہ میں پیشینیوں کے رازدار
چال میں ان کی عز لہائے رواں کا زمزمہ
تال میں ان کی انیس و میر و غالب کا نکھار
ان کا اسلوبِ خطابت گویا شمشیرِ رواں
ان کا اندازِ سخن مانندِ موجِ آبشار
ان کے ہر نغمہ تکلم میں رجز کا ولولہ
دنگ رہ جاتے تھے سن کر طوطی و درّاج و سار
لالۂ و گل کی لہک سے تھی لب و لہجہ کی آب
کوثر و تسنیم کی موجیں طلاقت پر نثار
خواجۂ کونین کی اُن پہ رہی شورش نگاہ
رحمتِ باری سے بہرہ یاب ہے ان کا مزار!

شورش۔ کاشمیری

اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے

دل درد میں ڈوبا ہے زباں نوحہ کناں ہے
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بخاری تو کہاں ہے
اے خطۂ فردوس کے راہی تو پلٹ آ
رحلت پہ تری غلغلۂ آہ و فغاں ہے
آواز تو دے خانہ خرابانِ وفا کو
اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے
کس حال میں ہیں پیش رسانِ عدم آباد
معلوم تو ہو گا تجھے اب کون کہاں ہے؟
ہیں نوکِ زباں قاسم[1] و محمود[2] کی باتیں
ان میں بھی کبھی تذکرۂ ہم نفساں ہے؟
ہم نے تو جلائے ہیں چراغ اپنے لہو سے
لیکن یہ جہاں کار گہ شیشہ گراں ہے
یہ کون اٹھا محفلِ ہستی سے عزیزو؟
خورشید جہاں تاب بھی خونابہ فشاں ہے
"جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا کوئی اور نشاں ہے
اس عقدۂ پرپیچ پہ مغموم ہوں شورش
کیا چیز یہاں کشمکشِ عمرِ رواں ہے

۱۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ ۲۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن

سید نذیر احمد شاہ بخاری

شاہ جی سے ایک ملاقات

اگر انسانی خواہشات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو مشہور اور عظیم شخصیتوں سے ملنے کی خواہش ایک امتیازی مقام کی حامل نظر آئے گی۔ ہر باشعور اور صاحبِ ذوق آدمی چاہتا ہے کہ وہ بڑے آدمیوں سے ملاقات کرے اور اگر ملاقات کے مواقع میسر نہ آئیں تو کم از کم ان صاحبِ عظمت انسانوں کو ایک نظر دیکھ ہی لے۔ اس بات سے انسانی خواہشات کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان اہلِ عظمت بزرگوں کی بڑائی جھلکتی ہے۔ جو اپنی پروقار سیرت کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

مجھے بھی حضرت شاہ جی کو زندگی میں صرف ایک دفعہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور میں اپنے ایک دوست حافظ عبید الرحمن کے ساتھ جب شاہ جی کے مکان پر گیا تو چٹائی پر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اور شاہ جی کے ذہن مبارک سے چند کلمات کو نہایت آہستگی کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت شاہ جی اپنے معیار کے مطابق نہ تھے اور وہ نحیف آواز کے ساتھ تخاطب فرماتے تھے۔ شاہ جی کی اس حالت کو دیکھ کر مجھے محلے کے ایک شخص کے وہ الفاظ یاد آگئے جنھیں شاہ جی کو یاد کر کے اکثر دہرایا کرتا تھا۔ الفاظ تھے۔

"کیا کوئی ماں عطاء اللہ شاہ جیسا لال جنے گی۔؟

ہر گز نہیں!

شاہ جی نے اپنی شفیق نظروں کو میری طرف موڑا اور میرے دوست سے میرے متعلق دریافت کیا۔ اور چند لمحوں کے بعد میری حیثیت کالج کے ایک طالب علم کی سی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاہ جی کچھ طنزیہ انداز میں مجھے نشانہ ہدف بنائیں گے۔ اور مجھے انگریزی تعلیم کی علامت سمجھ کر اپنی شکایت کو الفاظ کا جامہ پہنائیں گے۔

لیکن یہ گمنام ایک خیالِ خام کی صورت میں میرے دماغ میں کچھ دیر جلوہ گر رہ کر اپنی موت آپ ہی مر گیا۔

مجھے مذہب سے بچپن سے ہی لگاؤ رہا ہے لیکن جب میں اپنے مذہب کی علامتوں میں وہ خصوصیات نہیں پاتا جو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہونا چاہیئیں تو مجھے ایک رنج اور قلق محسوس ہوتا ہے۔ شاہ جی سے نہ تو میں نے اپنے متعلق کوئی شکایت سنی اور نہ ہی اس رنج و قلق نے مجھ میں جنم لیا۔

دراصل عظیم انسانوں کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے ہر چیز کے دونوں پہلوؤں سے آگاہ ہو کر ذمہ دارانہ طریقے سے اظہار خیال کرتے ہیں اور ڈاڑھی دیکھ کر "ملا" اور داڑھی نہ دیکھ کر ملحد نہیں پکارنے لگتے۔ وہ زندگی کے

پیچ و خم اور نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور اپنے تجربات کی بنا پر اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالیں تو وہ جواہر سے زیادہ بے بہا ہوتا ہے۔ اور شخصیات کی غیر موجودگی میں ان الفاظ ہی کو قومیں اپنے لئے قندیل راہ تصور کرتی ہیں۔ شاہ جی کے قریب بیٹھنے سے کم از کم مجھ پر وہ خوف طاری نہیں ہوا تھا جو آج کل کے صاحب مذہب لوگوں کے پاس بیٹھ کر بعض حالات میں ہوجاتا ہے ان کی باتیں سنکر ہی دل ان کی عظمت و شفقت کا اعتراف کر رہا تھا۔ اور مجلس میں وہ بات نظر آرہی تھی جو اقبال کے خیال میں مردِ قلندر کی بارگاہ میں اکثر ملتی ہے۔

دراصل شاہ جی کی ذات کے لوگ اتنے گرویدہ جو ہوگئے تھے اس کی ایک وجہ تو ان کی وہ خطیبانہ صلاحیتیں تھیں جن کو مذہب کی محبت نے جلا بخشی تھی۔ اور دوسرا وہ خلوص تھا جو شاہ جی کی زندگی کے دینی و دنیاوی معاملات میں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے ان شعروں میں شاہ جی کی پرکشش ذات کی تصویر جھلکتی ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق

پہلا مصرع ان کی تمام سیاسی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے جو تمام تر انگریز کے خلاف گزری۔ عوامی زندگی میں چوتھا مصرع انکے حسنِ خلق کی عکاسی کرتا ہے۔

شاہ جی کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل تھے۔ ان کی باتیں دلفریب اور نگاہیں دلنواز تھیں۔ اپنی تمام زندگی میں وہ اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے۔

نرم دم گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

شریف شوق امرتسری

محفل بخاری کے چند لمحات

شہید گنج ایجی ٹیشن عروج پر تھی۔ انگریز مجلس احرار ایسی فعال جماعت کو ہمیشہ ہمیشہ ختم کرنے کے لئے مختلف محاذوں سے شیطنیت، عیاری، اور ریشہ دوانیوں کے بم برسا رہا تھا۔ مجلس احرار چاروں اطراف سے مصائب و آلام میں مبتلا تھی۔ مرکزی دفتر احرار لاہور جہاں ہزاروں روپے تبلیغ اور مقابلہ مرزائیت کی خاطر ہر وقت جمع رہتے تھے۔ وہاں ہر کارکن کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔

چودھری افضل حق مرحوم کی تحریک پر شاہ جی کو ڈابھیل جہاں حضرت مولنا شبیر احمد عثمانی مرحوم خطیب تھے۔ بھیجنے کا پروگرام مرتب ہوا۔ اور شاہ جی کی معیت میں خاکسار کو جانے کا حکم ہوا۔ ڈابھیل میں ہفتہ عشرہ قیام کے دوران قریباً چھ سات تقریریں شاہ جی کی ہوئیں۔ اور کچھ رقم جمع ہوئی۔ واپسی پر شاہ جی امرتسر اتر گئے۔ اور میں لاہور احرار کے صدر دفتر پہنچا۔ چودھری صاحب مرحوم نے دریافت فرمایا۔ کوئی چندہ ہوا۔ میں نے عرض کی ہاں لیکن وہ ٹرنک جس میں رقم تھی۔ شاہ جی امرتسر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ مجھے وہ روپیہ لانے کے لئے امرتسر بھیجا گیا۔ شاہ جی کے گھر پہنچا۔ آواز دی۔ آواز پہچانتے ہی اندر سے فرمانے لگے بھئی جلدی آؤ۔ ہم ساری رات سوئے نہیں۔"

میں نے عرض کی کیا ہوا؟ فرمایا میری بیوی کو رات خواب آیا ہے کہ ہمارے صحن میں غلاظت کا ڈھیر لگا ہوا ہے تین بجے رات سے اس وقت تک ہم میاں بیوی پریشان ہیں کہ ایسا خواب کیوں آیا۔ اور ہمارے گھر میں یہ ڈھیر کیسا؟ ایسا معلوم ہوا کہ چندہ کی رقم قوم کی امانت تھی۔ جو ہمارے گھر بین پڑی تھی۔ اسے لے جاؤ اور میری پریشانی کو دور کرو۔ چنانچہ میں رقم لے کر روانہ ہوا اور شاہ جی نے خدا کا شکر ادا کیا۔

۱۹۳۵ء میں زلزلہ سے کوئٹہ برباد ہو چکا تھا۔ تباہ شدہ، خانماں برباد زخمی بیمار مسلمان دھڑا دھڑ لاہور پہنچ رہے تھے۔ شمالی ہندوستان میں مہاجرین کوئٹہ کی سب سے زیادہ موثر اور ٹھوس خدمت مجلس احرار نے کی۔ لاکھوں روپے نقد تقسیم کئے گئے۔ دہلی دروازہ کے باہر زخمیوں اور بیماروں کے لئے کیمپ کھول دیئے گئے۔ جہاں ہزاروں زخمی اور مریض ہر وقت موجود رہتے تھے بیوگان، یتامیٰ، مفلوک الحال مسلم مہاجرین کوئٹہ کی کماحقہ خدمت کی گئی یہاں تک کہ مجلس احرار کے شدید دشمن انگریز پر بھی اس بے لوث خدمت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس وقت کے انگریز وائسرائے نے مجلس احرار کو چٹھی لکھی کہ حکومت آپ کی اس خدمت خلق سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ اس لئے مجلس احرار کے تین چار معتبرین دہلی کے قصر حکومت میں پہنچیں۔ تاکہ ہم مجلس احرار کا شکریہ ادا کریں۔ اس پر فیصلہ کرنے کے لئے مجلس احرار کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں فیصلہ کیا جانا تھا کہ وائسرائے کے پاس شکریہ وصول کرنے کے لئے کس کس صاحب کو منتخب کیا جائے۔ اتنے میں شاہ جی

تشریف لے آئے۔ بات سن کر فرمایا۔

''اللہ کا خوف کرو۔ غضب خدا کا، قوم ہماری، ملک ہمارا، خدمت ہماری اور شکریہ ادا کرے گورنر جنرل۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ملک اور قوم کا مالک انگریز ہے۔ اور انگریز ہماری خدمت کے صلہ میں ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ظالم فرنگی بڑا چالباز ہے۔ بے ایمان ہے یہ شیطان کا بچہ دوسری دنیا میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی فعال جماعت مجلس احرار بھی انگریز کو ملک کا صحیح حاکم اور مالک تصور کرتی ہے۔''

شاہ جی کی گونج سے تمام حاضرین دم بخود ہو گئے اور وائسرائے کو یہ جواب دیا گیا۔ کہ ملک ہمارا ہے۔ قوم ہماری ہے جس کی ہم نے خدمت کی ہے تمہارے شکریہ کے کیا معنیٰ؟

شاہ جی نے فرمایا۔ ''جو لوگ بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے میری دعوت پر کسی تحریک یا مرحلہ میں موت کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کے خون کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں اللہ سے ان کی مغفرت کیلئے دعا کرتا ہوں...... اگر ان کا خون دشمنوں کی داستان سرائی کے مطابق رائیگاں گیا ہے تو اس کے ایک ایک قطرہ کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے تحریک استخلاص وطن اور ناموس رسول ﷺ کی حفاظت کے لئے اتنے مسلمان مروائے اور جیل میں بھجوائے ہیں کہ ہر نقصان کی مسئولیت قبول کرتے ہوئے مجھے اطمینان ہوتا ہے۔''

کمینوں کی ہم نشینی آوارہ کتوں کی قے چاٹنے کے برابر ہے۔

میں نے دلی کی جامع مسجد اور لاہور کی شاہی مسجد میں نماز پڑھنے سے حتی الامکان گریز ہی کیا۔ کیونکہ غلامی کے زمانے میں مجھے یہ خلش مضطرب رکھتی ہے۔ کہ آزاد انسانوں کی بنائی ہوئی سجدہ گاہوں کو اپنے غلام وجود کے سجدوں سے مجروح کیوں کروں؟ مجھ سے نہ کبھی دلی کے لال قلعہ کی بے بسی دیکھی گئی ہے اور نہ میں نے انگریزوں کے زمانہ میں لاہور کے قلعہ کو آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے۔ ان کا لٹا ہوا طنطنہ مجھے غلاموں کے حق میں اکثر بددعا دیتا ہوا نظر آیا ہے۔

لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور میں انسان پڑھتا ہوں۔ میں نے تمام عمر انسانوں کے چہرے پڑھے۔ ان کی پیشانیوں سے مضمون چنے اور ان کے کانوں میں شہد و شکر کے قطرات ٹپکائے ہیں۔

لیکن اب جی یہ چاہتا ہے کہ سناٹوں میں چلا جاؤں اور وہاں اپنی للکار کو گونجاتا رہوں، اندھیروں میں نکل جاؤں اور وہاں اپنی آنکھوں کے نور چھڑکتا رہوں لیکن میں ان لوگوں میں عمر گزار رہا ہوں جن کے ہاں دولت کی پوجا ہوتی ہے۔ اور طاقت کو سجدے کئے جاتے ہیں۔

اگر میں زندہ رہا تو پاکستان کی سرحدیں پکار اٹھیں گی کہ............ بخاری اور اس کے سپاہیوں کو اس مٹی کے ذروں سے کہاں تک وابستگی و شیفتگی ہے۔

اعجاز چشتی

دیکھا تقریر کی لذّت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میری پہلی ملاقات قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں راولپنڈی مدرسہ تعلیم القرآن کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہوئی۔ شاہ جی نے کمپنی باغ میں ایک بڑے اجتماع کو خطاب کیا۔ میں اس وقت گارڈن کالج راولپنڈی کا طالب علم تھا۔ تحریک پاکستان سے وابستگی کی وجہ سے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک مخصوص متعصبانہ نکتہ نگاہ کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچا۔ شاہ جی نے تلاوت قرآن پاک سے تقریر کا آغاز کیا۔ شاہ جی قرآن پڑھ رہے تھے، تو شورش کاشمیری کے "بوئے گل"، کے الفاظ پر یقین آیا۔

"شاہ جی کا موضوع تھا دینی مدارس اور انکی خدمات"، پہلی بار مجھے ان دینی مدارس اور علماء کی خدمات کا صحیح شعور پیدا ہوا، تقریر میں وہ جادو تھا کہ میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ دوسری صبح شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، موضوعِ سخن کے لئے میں نے جرأت کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

شاہ جی نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ دین و سیاست کی جدائی کا ذکر تاریخی واقعات کی روشنی میں اس طرح کیا کہ خلافت راشدہ سے سقوط بغداد کی پوری تاریخ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ حاضرین مجلس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بوڑھا انسان اپنے خدا کے کس قدر قریب ہے؟ اور اپنے نانا کا کس قدر وجیہ حلقہ بگوش ہے۔ کہنے لگے بھائی میں نے کتابیں نہیں پڑھیں انسانوں کو پڑھا ہے۔ میں مولانا سید انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی، حکیم محمد اجمل، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد کے قافلہ سے بچھڑا ہوا ایک راہی ہوں۔ جو اس بڑھاپے میں بھی منزل مقصود کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ سب ساتھی ایک ایک کر کے چھوٹ گئے۔

۱۹۵۱ء میں احرار دفاع کانفرنس اوکاڑہ میں مولانا محمد علی جالندھری کی دعوت پر شریک ہوا۔ آخری اجلاس جس کو شاہ جی نے خطاب کرنا تھا۔ مولانا محمد علی جالندھری کے حکم سے مجھے بھی تقریر کرنا پڑی۔ شاہ جی کی عظمت اور ان کی شخصیت کا رعب سامنے تھا۔ عرض کیا کہ شاہ صاحب کی موجودگی میں میرے لئے تقریر کرنا مشکل ہے۔

شاہ جی نے فرمایا۔

"بھائی میری عظمت یہ نہیں کہ اپنے بھائیوں میں خوف و ہراس پیدا کروں، میری موجودگی نے بہروں کو کان دیئے۔ گونگوں کو قوت گویائی بخشی، لنگڑوں کو چلنا سکھا دیا۔ میں باعث زحمت نہیں، باعث

رحمت بنا ہوں۔ تم تقریر کرو، میں سنوں گا۔

شاہ جی کے ان الفاظ نے قوت بخشی، میں نے تقریر کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے بارہا میں بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کر چکا تھا۔ گورداسپور اور دنیا نگر کے درودیوار آج تک گواہ ہیں کہ اس پندرہ سالہ مقرر نے دوستوں اور دشمنوں سے اپنی خطابت کی داد لی۔ لیکن اوکاڑہ کے جلسہ کی تقریر............رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر، صحت الفاظ کا خیال رکھتے ہوئے جاری رکھی جب میں اس مقام پر پہنچا کہ۔ ؟؟؟

"یہ ملک اسلام کے لئے حاصل کیا گیا ہے، یہاں اسلام ہی ہمارا ضابطہ حیات ہو گا۔ اور اسلام ہی کے لئے اس ملک کا تحفظ کرنا ہے"

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

شاہ جی نے تقریر کی خوب داد دی۔ جنہوں نے شاہ جی کو کبھی داد دیتے دیکھا ہے وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کی اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اکثر کانفرنسوں میں شاہ جی کے ساتھ شریک ہوا اور خطاب کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آج میں جب سوچتا ہوں کہ شاہ جی ایسا عظیم خطیب اور مجھ ایسے نو آموز مقرر کی تعریف، تو صحیح معنوں میں ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے متعلق اکثر فرماتے کہ۔

"وہ نوجوان جو جدید تعلیم سے آراستہ ہیں، اگر دین کی طرف آجائیں تو تبلیغ دین زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ ہم مولویوں نے دین کو محفوظ رکھا کیا یہی کم ہے، اب تم لوگ اسے سنبھال لو اور دور دور تک پہنچا دو؟"

۱۹۵۳ء کے بعد ناگزیر وجوہات کی بنا پر شاہ جی سے ملاقات نہ کر سکا۔ وقفہ زیادہ ہو گیا۔ اس لئے جاتے ہوئے ڈرتا کہ شاہ جی ناراض ہوں گے، نہ ملنے کا کیا جواز پیش کروں گا۔ لیکن حافظ لدھیانوی جو اُن دنوں ملتان میں تھے سے معلوم ہوا کہ جب بھی میرا ذکر آیا۔ بڑے درد کے ساتھ فرماتے کہ۔

"اعجاز ایک عرصہ سے نہیں ملا۔ نہ جانے مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے؟"

میں شاہ جی کی خدمت سے میں حق نواز خاں قمر کی معیت میں حاضر خدمت ہوا۔ اس طرح پیش آئے جس طرح ایک حقیقی باپ اپنے گم شدہ بچے کو پا کر خوش ہوتا ہے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن ایک جملہ ایسا نہ کہا جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں قصوروار ہوں۔ بار بار یہ مصرعے دہراتے رہے۔

مجھ کو تو تم پسند ہو، اپنی نظر کو کیا کروں

اور یہی کہتے رہے کہ بھائی اکثر سوچتا کہ مجھ سے کیا قصور ہوا جو تم ملاقات سے گئے......... یہ بات صرف میرے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی، بلکہ ہر ملنے والے دوست کے ساتھ ان کا یہی حسن سلوک تھا۔ دوسری طرف استغناء کا یہ عالم کہ پاکستان کے ایک سابق صدر نے اپنے زمانہ صدارت میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح شاہ جی

سے ملاقات کرے۔ لیکن شاہ جی اس کے پاس جانے کو تیار نہ ہوئے اور نہ اس بات پر ہی آمادہ ہوئے کہ وہ ان کے ہاں خود آکر مل لے، فرماتے تھے۔

"مجھ فقیر سے صدر مملکت کا کیا کام ہے، اگر جماعتی بات ہے تو صدر مجلس سے کی جائے۔"

ایک دفعہ لائل پور سے چند مل والے شاہ جی سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ شاہ جی چند عام ساتھیوں سے محو گفتگو تھے۔ سلسلہ کلام جاری رہا۔ چند منٹ بعد ایک ساتھی نے کہا کہ شاہ جی یہ فلاں مل والے ہیں اور آپ سے ملنے آئے ہیں۔ "شاہ جی نے برجستہ فرمایا کہ۔

"بھائی کسی دل والے کی بات کرو، مل والے مجھ فقیر سے کیا لینے آتے ہیں۔"

شاہ جی بعض اوقات ایک ہی جملہ میں ایسا نکتہ بیان کر جاتے جو ہزاروں تحقیقی کتابوں پر حاوی ہوتا۔ "مل والے اور دل والے" اس ایک جملہ میں کیا کچھ نہیں کہہ گئے۔ اسی طرح ایک دفعہ قیام پاکستان سے قبل اسلامیہ کالج کے چند طلباء شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں ڈاڑھی کا ذکر آ گیا۔ شاہ جی کڑ قسم کے مُلاّ نہ تھے۔ ایک طالب علم نے کہا:

"شاہ جی آج کل کالجوں میں ڈاڑھی رکھنا مشکل ہے۔"

شاہ جی فرمانے لگے کہ

"ہاں بھائی! خالصہ کالج میں ڈاڑھی رکھنا آسان ہے اور اسلامیہ کالج میں مشکل ہے۔"

شاہ جی نے زندگی بھر کسی کی غیبت نہیں کی اور ان کا مسلک پردہ پوشی تھا۔

ایک بار شاہ جی سے ایک مشہور غزل گو شاعر عبدالحمید عدم جو اپنی شراب نوشی کے لئے مشہور ہیں، مل کر گئے تو حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ:

"شاہ جی آپ تو شرابیوں کو بھی منہ لگا لیتے ہیں۔"

شاہ جی فرمانے لگے کہ

"بھائی تم نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے۔؟"

اس شخص نے کہا

"نہیں"

فرمانے لگے

پھر غیبت کیوں کرتے ہو؟"

ایک دوسرے صاحب درمیان میں بول اٹھے۔

"شاہ جی میں نے اسے شراب کے نشے میں بدمست دیکھا ہے۔

فرمانے لگے۔

"پھر پردہ پوشی سے کام لو۔"

ان کی باتیں دلوں میں اتر جاتیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے کیا خوب کہا ہے۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

ہزار رحمتیں ہوں اس مرد درویش پر......... انکے اس طرز عمل سے بہتوں نے اصلاح پائی اور دشمن دوست بن گئے۔

شاہ جی دین و سیاست کے علاوہ شعر و ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے شعر فہمی کا جو ملکہ انہیں حاصل تھا۔ وہ اکثر اہل فن کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ایک عمدہ شعر ان پر کیف و سرور کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ بقول حافظ لدھیانوی:

"شاہ جی شعر کی داد یوں دیتے تھے کہ آنکھوں کی بناوٹ اور ہونٹوں کی سجاوٹ شعر کے حسن کا پتہ دیتی تھی، شعر کے معنی انکے چہرے پر بکھر جاتے تھے"۔

مختلف مدرسہ ہائے فکر کے شعراء کا شاہ جی سے عمر بھر گہرا رابطہ رہا۔ اختر شیرانی، تاثیر، سالک، فیض، ساحر اور حافظ لدھیانوی انکی صحبت میں بیٹھنا سعادت خیال کرتے تھے۔ شعراء ان کی داد کو آج تک بطور سند پیش کرتے ہیں۔ شاہ جی خود شاعر تھے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ شعراء کا کلام اپنی تقریروں میں اس طرح استعمال کرتے، گویا یہ اشعار انکی نوک زبان تھے۔

شاہ جی کے بد ترین دشمنوں کو بھی اقرار ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ابھی وہ نسل زندہ ہے جس نے شاہ جی کی خطابت کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ انکی خطابت کا موضوع آزادی، احیائے دین اور تحفظ ختم نبوت تھا، بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاہ جہاں کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے یا ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ انکی موجودگی میں کسی دوسرے مقرر کا چراغ نہیں جلا، خود مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر ان کی عظمت کے معترف تھے۔ تقریر کرتے تو سارے مجمع پر چھا جاتے اور میر کے اس شعر کی مجسم تصویر بن جاتے۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

گوہر ملیسانی

کہاں سے آئیں گے ایسے خلوص کے پیکر

خالق کائنات نے بعض شخصیات کو اتنی فراواں خوبیوں سے نوازا ہوتا ہے کہ اُنہیں احاطہ تحریر میں لانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی ایسی ہی نابغہ شخصیات میں سے ایک ہیں۔ مجھے آج بھی یاد آتا ہے کہ ساتھی، رفقاء، احباب اور طلبہ کس پیار سے "شاہ جی" کہہ کر مخاطب ہوتے تھے گویا غنچہ دہن کھل اٹھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی حسین و جمیل صورت عطا کی تھی کہ گلشن ہستی میں ایسا نکھرا ہوا پھول کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ انہیں دیکھ کر اسلاف کے بارے میں ابھرتا ہوا تصور عملی شکل دھار لیتا تھا۔ پر کشش چہرہ، خوبصورت آنکھیں اور چوڑی پیشانی وجاہت کی درخشاں مثال ۔ جو دیکھتا دل کی دنیا بدلتی محسوس کرتا۔ واللہ کتنی کشش تھی انکے چہرے میں اور کتنا جاذب نظر تھا انکا عارض گلگونہ۔۔۔

میں نے انہیں اپنے طالبعلمی کے زمانے میں دیکھا۔ یہ غالباً سن بچاس، باون کی بات ہے۔ میں اس وقت نویں، دسویں جماعت کا ایک طالبعلم تھا۔ ایس۔ اے ہائی سکول احمد پور شرقیہ اس علاقے کی مشہور درسگاہ تھی۔ اور اس سے ملحقہ مسجد میں مولانا دوست محمد درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہم چند مہاجر طلبہ نماز فجر کے بعد ان سے قرآن مجید کا درس لیا کرتے تھے بے حد شفیق اور محنتی استاد ہونے کے ناطے سے مولانا ہم جیسے انگریزی پڑھنے والے طلبہ کو عربی کی تعلیم سے روشناس کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے ہم نے صرف پہلے دو پارے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ ان سے پڑھے تھے۔ اس طرح ہماری ابتدائی زندگی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات انہی کی محنت سے مرتسم ہوئے۔ اسی زمانے میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو قریب سے دیکھنے اور [illegible] من موہنی باتیں سننے کا موقع ملا۔

احمد پور شرقیہ میں تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اب یہ تو یاد نہیں اسکے منصرم اور مہتمم کون تھے لیکن یہ جلسہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی گراؤنڈ میں بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا تھا۔ جلسہ عشاء کی نماز کے بعد شروع ہونا تھا چنانچہ شاہ جی اور انکے ساتھیوں کے طعام کا اہتمام مغرب کے بعد تھا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کا نام یاد ہے جو اس وقت شاہ جی کے ساتھ تھے باقی چار پانچ حضرات بھی شاہ جی کی مصاحبت میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ جس وقت لذت کام و دہن کے لئے شاہ جی اور انکے رفقا، بیٹھے تو بڑی پر لطف گفتگو سننا نصیب ہوئی۔ ادب کے شاہکار جملے، محبت سے لبریز چٹکلے اور ملائمت سے بھرے ہوئے طنزیہ شگوفے۔ گویا ایک دبستان کھل گیا تھا۔ ایک حسین انداز تو آج بھی میری یادوں میں محفوظ ہے۔ جس سے رسول اکرم ﷺ کی صحبت کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ سب احباب کھانا کھاتے ہوئے ہڈیاں شاہ جی کے سامنے رکھتے جاتے۔ "شاہ جی" مسکراتے ہوئے دیکھتے جاتے۔ کھانا ختم ہوا۔ سب احباب اسی شگفتہ انداز میں گویا ہوئے "ہم نے تو کچھ نہیں کھایا۔۔۔ سب کچھ تو شاہ جی نے تناول فرمایا ہے"

سبحان اللہ کیا جواب ملا۔ شاہ جی کے حسن جواب کی مثال نہیں۔ مسکراتے ہوئے فرمایا "ہاں بھئی میں نے تو کھانا کھاتے ہوئے ہڈیاں چھوڑ دیں۔ لیکن آپ سب تو ہڈیاں بھی چٹ کر گئے۔" پھر کیا تھا محفل کشت زعفران بن گئی۔ کیسی پاکیزہ نشست تھی۔ آج بھی وہ سماں یاد آتا ہے۔ تو دل کی کلیاں کھل اٹھتی ہیں۔ مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔

رات کے جلسے کی ایک جھلک بھی شاہ جی کی جادو بیانی اور عمیق نظری کی عمدہ مثال ہے۔ جو آج تک مجھے یاد ہے۔ ایک بحر مواج ہے۔ جو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ تلاطم خیز موجیں بلند ہوتی ہیں اور سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ ابھی خطابت کے زور سے سامعین مسرت سے جھوم رہے ہیں تو دوسرے لمحے آنکھوں سے برسات جاری ہو جاتی ہے۔ آواز کا زیروبم ہے کہ کبھی للکارتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو کبھی نسیم سحری کی طرح خراماں خراماں رواں دواں ہے۔ جلسہ گاہ میں لوگوں کا جم غفیر ہے۔ لحن داؤدی سے قرآن حکیم کی آیات سن کر مسحور ہو رہا ہے بیچ پوچھیے تو فضا جھوم رہی ہے۔ کائنات دم بخود ہے۔ کہ شاہ جی ایک تمثیل بیان فرماتے ہیں۔

"ذرا اس شخص کا تصور کرو جو دن کے اس لمحے میں جب مہر عالمتاب لب بام ہے۔ اسکی شعائیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ مور ناتواں دور سے دکھائی دیتی ہے۔ کہ شمع کو کانپتے ہاتھوں میں تھامے میدان میں آنکلتا ہے اور دعوی کرتا ہے کہ وہ تاریکی کو دور کرنے نکلا ہے۔ اور روشنی پھیلا رہا ہے۔ آپ اس شخص کے بارے میں کیا تصور کریں گے۔"

جلسہ گاہ سے آوازیں گونجتی ہیں۔ "وہ پاگل ہے دیوانہ ہے۔ بے وقوف ہے، پاجی ہے۔"

"تو صاحبو! سن لو مرزا غلام احمد قادیانی یہی کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ کون ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔"

اسکے بعد شاہ جی نے سراجاً منیرا کی آیت سے وہ سماں باندھا کہ مجمع نعرہ تکبیر کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ ایسے شعلہ بیان اور آتش نوا خطیب کو دنیا کیسے بھلا سکتی ہے۔ جنکی سحر طرازی کے واقعات قلب و نظر کو خیرہ کرتے تھے۔ جو دلوں کی دھڑکن بن جاتا تھا۔

کہاں سے آئیں گے ایسے خلوص کے پیکر
زباں میں جن کی محبت کی چاشنی دیکھیں

لال دین اخگر

مجاہد تحفظ ختم نبوت

ہم اس غم کی ترجمانی سے قاصر ہیں۔ جو حضرت امیر شریعت مرحوم کے ابدی فراق سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوا ہے۔ جہاں تک رشتہ و پیوند کا تعلق ہے، شاہ جی مرحوم کے افراد خانہ کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ مگر ان کی نگاہ ناز کے گھائلوں کا شمار ممکن نہیں۔ مسلمان تو ہزار جان سے آپ کے حلقہ بگوش تھے ہی غیر مسلموں میں بھی لاکھوں آنکھیں ایسی ہوں گی۔ جو آج آپ کی وفات حسرت آیات پر خون کے آنسو رو رہی ہوں گی۔

اے ہمارے آقا:-

دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال
آنکھ وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت ہی نہیں

ہم عام لوگ جو شاہ جی مرحوم کی حسین و جمیل صورت کے شیدا اور صرف ان کی سحر بیان کے دل و جان سے قائل ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے کہ ہم ان کی اس جدائی کو بڑی مشکل سے برداشت کر سکیں گے۔ مگر وہ حضرات جنھوں نے مجاہد ختم نبوت کو زیادہ قریب سے دیکھا، سفر و حضر اور قید و بند میں ان کی معیت کا شرف حاصل کیا۔ آج ان کے قلوب کی کیفیت کا نقشہ ہم سے مختلف ہے۔ ہمارے مخدوم و محبوب امیر شریعت حق یقین کی تمام شرائط کے ساتھ ان علمائے امت اور صلحائے ملت کے سرخیل تھے۔ جن کے حق میں خاتم الانبیاء ﷺ کا ارشاد گرامی صادق آتا ہے۔ کہ

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

سید احرار حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کو ہم پیغمبر نہیں کہتے۔ اور نہ ہی حسینؓ ابن علیؓ مانتے ہیں۔ مگر زبان مصطفےٰ ﷺ کی روشنی میں یہ بھی کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں کہ پروردگار عالم نے جہاں باقی علماء خیر میں فکر و عمل کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے نبیوں کی صلاحیتیں رکھیں ہیں۔ وہاں اس مجاہد ختم نبوت کو صدیقیت کے انوار، فاروقیت کی نگاہ خداداد، عثمانی جود و سخا، اور علوی شجاعت، حسنی تدبر اور سیاست معاویہ سے بڑی حد تک نوازا تھا ہم نہیں کہتے جائیے غیر مسلم دنیا سے پوچھئے کہ شاہ جی مرحوم لاکھوں کے مجمع میں اپنی خطابت کے سحر جلال سے قلوب و ارواح کو کس قدر مسحور کر لیتے تھے۔ قرآن حکیم کی ملکوتی اور فردوسی تانیں جب سامعین پر کیف و سرور کی بارش برساتی تھیں۔ تو ان کے دل بلاامتیاز مذہب و ملت، کتاب اللہ کی الہامی عظمت سے جھوم جاتے تھے۔

ہائے ہائے ۲۱ اگست کی شام۔ چھے بجکر چند منٹ پر ہم نے کیا گنوایا؟ ہم کس رہنما کی قیادت سے ہمیشہ کے

لئے محروم ہو گئے؟ ہم اس آسمان کے نیچے اور اس سرزمین کے اوپر اس عظیم المرتب خطیب کا بدل کب پائیں گے؟ کیا ہماری زندگی میں یا ہماری آئندہ نسلوں کے سامنے پروردگار عالم کی طرف سے کوئی انسان شاہ جی سا حسن و جمال، شاہ جی سا سحر خطابت، شاہ جی سی جرأت مؤمنانہ لے کر آئے گا؟ پھر اپنوں اور غیروں کو اپنی نگاہوں کا یوں شکار کرے گا۔ اور شاہ جی کی طرح دلوں پر حکومت کرے گا۔ یہ کچھ ایسے سوالات ہیں۔ جن کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ بعض اوقات غم واندوہ جنون و دیوانگی پر منتج ہوتے ہیں۔ خدائے علیم و خبیر کو ہی خبر ہے کہ اور کتنے شاہ جی منصہ شہود پر جلوہ گر ہونے والے ہیں۔ لیکن ہم اندوہ رسیدہ خیالات اور زخمی جذبات کا کیا کریں۔ پھر خیال آتا ہے کہ لاکھوں انسان ارض ہند و پاک میں اپنی زندگی کے آخری دم تک جب شاہ جی مرحوم کا خیال کریں گے تو ان کے دل میں ایک ہوک اٹھے گی۔ جو روح کو لرزہ براندام کرے گی، جذبات کو نشتر فرقت سے مجروح کرے گی، اور آنکھوں کو اشک ہائے عنابی سے تر کرے گی۔ اور جب ہم جلسوں میں بیٹھ کر اوروں کے منہ سے وعظ سنیں گے تو یقیناً ہم کو شاہ جی کی الہامی آواز اپنی یاد دلائے گی۔

جب سامنے ساغر آتا ہے اک ہوک سی اٹھتی ہے دل میں
ساقی کی ادا یاد آتی ہے محفل کا خیال آجاتا ہے

ساقی کی ادا

اللہ! اللہ! شاہ جی کا وہ جلال خطابت، وہ لحن داؤدی، وہ حسن ملکوتی، وہ ہیبت غازیانہ، وہ فصاحت کی اثر آفرینی، وہ بلاغت کی دلربائی، وہ سامعین کا سراپا چشم و گوش بن کر شاہ جی کی تقاریر کا کئی کئی گھنٹے مستانہ وار جھوم جھوم کر سننا، وہ ظرافت کی چاشنی، وہ متانت کا دبدبہ، وہ تبسم و رقت کی ہم آہنگی، وہ آیات قرآنی کی شیریں تلاوت، وہ اشعار کی برجستگی اور جلال فسوں کاری۔ واحسرتا۔ وا نصیبا! ہم اس حسینی و حسنی منظر سے محروم ہو گئے۔ گلابی چہرے پر زلفوں کی لٹک، ایک ہاتھ میں کلہاڑی، دوسرے ہاتھ کا اس ہاتھ پر ایک خاص انداز سے مارنا، گردن کا محبوبانہ طریق سے ہلانا، بیٹھے بیٹھے جوش خطابت سے کھڑے ہو جانا، ننگا سر اور گلے میں گیروی رنگ کا اسماعیلی پیرہن یا یوں کہیئے۔ کعبۂ شہادت کے حاجی کا جامۂ احرام! زبان پر مذہب و سیاست کے نکات و حقائق اور دل میں خاتم المرسلین ﷺ کے دین کی والہانہ محبت۔ سبحان اللہ نہ حاضرین سے مرعوب نہ حکومت کا خوف۔ بلکہ سی آئی ڈی والوں کی طرف اشارہ کر کے فرمانا۔

اکثرھم لا یعقلون۔(اکثر کم عقل ہیں)

اور پھر نہایت اطمینان سے مسکرا دینا۔ خدا شاہد ہے کہ شاہ جی مرحوم حریت کا مجسمہ تھے۔

مردِ حر محکم ز ورد لا تخف
مابمیداں سر بجیب او سر بکف

ہاں ہاں۔ اے دورِ حاضر کے نوجوانو اور رسول ہاشمی ﷺ کی غلامی میں اپنی نجات کے متلاشیو! وہ کون تھا۔ جو

لاکھوں افراد میں بغیر تعارف سید وقائد نظر آتا تھا؟ اس کی آواز بھی شیر ژیاں کی گرج تھی۔ اس کی آنکھوں میں عقاب کی نگاہوں کی چمک تھی۔ وہ زندگی کے ہر لمحے میں ناموس مصطفےٰ کی حفاظت کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار تھا۔ جس کا عہد شباب تا عالم کہولت نو سال تک قید و بند میں گزرا تاکہ حضور اکرم ﷺ کی مکی زندگی کی پیروی کا حق ادا ہو سکے۔ انگریزوں کی سنگینیں، ظالمانہ سازشیں، خوف و دہشت کے گھناؤنے ماحول، مخالفوں کی معاندانہ حرکات، خفتہ مسلمان قوم کی بے حسی اور بے مروتی پر جلنا، ہمراہیوں کی کس مپرسی، خود غرضوں کی منافقانہ چیرہ دستیاں اور مخلصوں کا فقدان اس کو اپنے عزم محکم سے پیچھے نہ ہٹا سکا۔ فرمایا کرتے تھے۔

قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں! وہ طوفان میں ابھرنے والا وہ سیلابوں میں چلنے والا، اور چار دانگِ عالم کو آگ برساتے پا کر بھی باواز بلند پکارتا رہا۔

حادثو! کچھ بھی توقف نہ کرو آنے میں
ہم تو تیار ہیں ہر موجہ طوفاں کے لئے

ساتھی سہم جاتے مگر وہ ان کو یہ کہہ کر ابھارا کرتا!

موجوں سے جو کھیلنے والے ہیں وہ یہ بھی اشارہ کرتے ہیں طوفاں
ہی ڈبویا کرتے ہیں طوفاں ہی ابھارا کرتے ہیں

ہم نے شاہ جی کی فطرت کو جس قدر خطر پسند پایا اس کی نظیر قرون اولیٰ کے سوا بہت کم ملتی ہے۔ ان کا ضمیر ان کو ہمیشہ ہی کہتا رہا۔

اے ذوقِ اذیت مجھے منجدھار میں لے چل
ساحل پہ کچھ اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

المختصر! آج ہمارے محبوب شاہ جی اپنی آخری آرامگاہ میں محو استراحت ہیں مگر ہم کو یقین کامل ہے کہ خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر!

آئیے۔ اب عالم محویت میں آنسو بہالیں۔ اہل دل کو جتنا خاموشی سے آنسو پینے اور بہانے میں مزا ہے۔ باتوں میں نہیں۔

شورش کاشمیری مرحوم

آج بھی روحِ بخاری یہ صدا دیتی ہے

فاش ہیں مجھ پہ کئی سال سے اسرار دروں
سوچتا ہوں کہ سرِ عام کھوں یا نہ کھوں
کوئی ہنگامہ بہ عنوانِ وغا ہو جائے
کوئی تحریک اُبھر آئے بہ عنوانِ جُنوں
کیا ضروری ہے کہ ہم بستۂ زنجیر رہیں
دن وہ آتا ہے کہ ٹوٹے گا شبِ غم کا فسوں
رات نے گاڑ کے خورشید کے سینے میں سناں
جگمگاتے ہوئے تاروں کا اجاڑا ہے سکوں
وہ ذرا پردۂ تاریخ سے باہر آئیں
جن کی یلغار سے عشاق ہوئے خوار و زبوں
جن کے پنجے اٹھے دامانِ گل و لالہ پر
جن کی گردن پہ ہے قربانیٔ و ایثار کا خوں
ہم نے جو کچھ بھی کیا اس کا خلاصہ یہ ہے
توڑ ڈالے ہیں فرنگی کی سیاست کے ستوں
تم نے جو کچھ بھی کیا سامنے لے کر نکلو!
ہاں! وہ افسانۂ شب تاب ذرا میں بھی سنوں
آج بھی روح بخاری یہ صدا دیتی ہے
"تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشتِ جُنوں
شائد آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد"

طالب حجازی

درویش صفت عالم

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی وہ صبح زندگی کی شام تک یاد رہے گی۔ کہ جب ایک عہد آفرین تاریخ ساز شخصیت کی المناک موت کی خبر اپنے دامن میں لئے اخبارات میں شائع ہوئی اور ملک بھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ صدر مملکت محمد ایوب خاں سے لے کر ایک عام پاکستانی شہری تک کے دل سے غم والم کی ٹیسیں اٹھیں۔
میں صبح کی نماز کے بعد سیر کر کے واپس آ رہا تھا کہ ریلوے اسٹیشن حافظ آباد کے پلیٹ فارم پر عزیز دوست فضل کریم خاں ملے۔ انہوں نے دور ہی سے مجھے دیکھ کر بے ساختہ کہا کہ حجازی صاحب آپ یہاں ہیں، ملتان نہیں گئے۔ میں نے کہا کیوں خیر ہے؟ اور ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔
خاں صاحب نے فرمایا کہ رات ریڈیو کی خبر ہے کہ تمہارے استاد حضرت شاہ جی انتقال فرما گئے ہیں۔ اور خبر سنتے ہی یہاں سے چودھری محمد شریف، سالار فتح محمد اور متعدد دوست بذریعہ ٹرک ملتان چلے گئے ہیں۔ تاکہ ملت اسلامیہ کے اس عظیم مجاہد کا آخری دیدار کر سکیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان دوستوں نے مجھے تلاش بھی کیا۔ مگر وائے بد قسمتی اس سعادت سے محروم رہا۔ جس کا مجھے آج تک سخت قلق ہے۔ میں بادیدۂ گریاں افسردہ و پریشاں وہیں سے گھر لوٹ آیا۔ گھر والوں نے مجھ سے یہ وحشت اثر خبر سنی تو اندوہ وملال کی تصویر بن کر رہ گئے۔ چونکہ حضرت شاہ جی کے ساتھ ہمارے جو قدیم مراسم اور تعلقات تھے وہ نہایت خلوص و محبت پر مبنی تھے۔ حضرت شاہ جی نیاز مند کے صرف مشفق استاد ہی نہ تھے۔ بلکہ والد مرحوم کے نہایت گہرے دوست تھے۔ کانوں سے خبر سنی تھی۔ مگر دل کو پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ لہذا عالم اضطراب میں بازار گیا تو لوگ تازہ اخبارات پڑھ رہے تھے۔ شہ سرخیوں کے ساتھ حضرت امیر شریعت کی الم ناک وفات کی شائع شدہ خبر عقیدت مندوں کے قلوب مجروح کر رہی تھی صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ ظہر تک ملتان پہنچ کر شریک جنازہ ہونے کی کوئی ممکن صورت نہ تھی۔
یہ پر ملال خبر سننے کے بعد مجھے دکان کھولنے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ بھائی عبدالحمید نے فوراً اخبارات کی ایجنسی اور اسٹال کو بند کر دیا۔ اور میرے ساتھ ادبی مرکز (صدر دفتر مجلس بہار سخن) میں آ کر بیٹھ گئے۔ دوستوں نے سنا تو وہ میرے پاس آنے شروع ہو گئے۔ اہل محلہ اور عزیز و اقارب بھی دفتر پہنچ گئے۔ ان دنوں اردو کالج جاری تھا۔ وہ بھی بند کر دیا گیا۔ بورڈ الٹا دیئے گئے۔ شام تک دعائے مغفرت اور اظہار افسوس کا سلسلہ جاری رہا۔ احباب کے ساتھ حضرت شاہ جی کے اوصاف و کمالات کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ انجمن صحافیاں حافظ آباد، مجلس بہار سخن اور اردو کالج کی انتظامیہ کمیٹی نے قراردادہائے تعزیت منظور کیں۔ ان دنوں

قومی مدرسہ مسلم ہائی سکول کے ساتھ نیاز مند کا قدرے تعلق باقی تھا۔ وہاں حضرت شاہ جی کی مجاہدانہ زندگی پر محترم نور احمد صاحب، عزیزم ناشر حجازی ایم اے نے تقاریر کیں۔ اور سکول میں چھٹی کر دی گئی۔

عصر کی نماز کے بعد کمیٹی باغ حافظ آباد میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور بعد ازاں عصر حاضر کے سب سے بڑے خطیب اور عاشق رسول ﷺ کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

حکیم محمد شریف مسلم، حکیم محمد ابراہیم صاحب، مولانا محمد یحیٰ محترم فیروز فتح آبادی اور نیاز مند طالب حجازی نے قافلہ سالار آزادی۔، شیدائی تاج و تخت ختم نبوت کے محاسن و فضائل مختصر طور پر بیان کئے۔ سارے دن کی مصروفیات کے بعد جب رات کو تنہائی ہوئی تو اس وقت طبیعت کا عجیب عالم تھا۔ عالم تصور میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک پانچ چھ سالہ بچہ ہوں۔ اور اماں جی (حضرت شاہ جی کی اہلیہ محترمہ) اللہ تعالیٰ آپ کی عظمت و تقدیس میں بیش از بیش اضافہ فرمائے۔" کی خدمت اقدس میں دوزانو بیٹھا۔ بغدادی قاعدہ پڑھ رہا ہوں اور حضرت شاہ جی باہر سے تشریف لاتے ہیں۔ مجھے اور میرے ہم سبق بچوں کو دیکھ کر زیر لب مسکرائے اور پھر فرمایا۔ کہ تم سب نے سبق یاد کر لیا ہے۔ کہ میں آؤں۔ اور پھر قاعدہ لے کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میری آواز کے ساتھ آواز ملا کر پڑھو۔ محترمہ اماں جی کبھی ہمیں دیکھ کر مسکرا دیتیں اور کبھی شاہ جی کو دیکھتیں۔ اتنے میں شاہ جی فرماتے کہ بھئی جلدی جلدی کرو۔ پھر یہ (شکر چڑھے چنے یا مٹھائی کی طرف اشارہ کر کے) کھائیں گے۔ سارے بچے اونچی اونچی آواز میں تیزی کے ساتھ سبق یاد کرنا شروع کر دیتے اسی عالمِ استغراق میں چشم تصور نے دیکھا کہ حضرت شاہ جی ان چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ جو اماں جی سے قاعدہ، پہلا دوسرا پارہ پڑھ رہی ہوتیں۔ پاؤں کے سہارے بیٹھ کر کلکلی کا معروف کھیل کھیل رہے ہیں۔

کلکلی کلیر دی۔ پگ میرے ویر دی

استغراق کے بعد میں رات گئے تک سوچتا رہا۔ شاہ جی کتنے عظیم انسان تھے۔ انگریز کے عہد غلامی میں اس قدر جامع کمالات انسان کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہیں۔

شاہ جی کے گھر سے جانے کتنے گھروں میں قرآن کریم کی مقدس تعلیمات کا فیض پہنچا۔ اور جس محنت و خلوص اور نفسیاتی اسلوب سے شوخ، ضدی اور کند ذہن بچوں کو آپ کے طریق تدریس اور مشفقانہ انداز نے قرآنی فیوض و برکات سے بہرہ یاب کیا ہے۔ آج کے مادی دور میں اس کی مثال ملنی دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ آپ کے شاگردوں میں سے کئی ادیب بنے کئی خطیب۔ بیشمار اونچے اونچے مناصب تک پہنچے متعدد تجارت و صنعت کی شاہراہوں پر چلے گئے۔ آپ نے اس فقیرانہ عالم میں زندگی کا سفر طے کیا جو اہل اللہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ فقر و استغناء اور عشق رسول ﷺ کی دولت لئے ہوئے خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں پہنچ گئے۔

زاہد عباسی

قافلہ سالار خطابت

رات کے دو بج چکے تھے۔ کافی ہاؤس میں ابھی زندگی کی ہما ہمی جاری تھی۔ فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھائے کچھ لوگ مذہبی مسئلوں پر بحث کر رہے تھے۔ گیلری میں چند صحافی صبح کی خبروں پر تبصرہ کرنے میں مصروف تھے۔
جونہی میں کافی ہاؤس میں داخل ہوا میری نظر میز پر پڑے ہوئے ایک مقامی اخبار پر جا پڑی۔

پہلی خبر جس پر میری توجہ منعطف ہوئی "امیر شریعت کی موت" کی خبر تھی۔ میں اخبار لے کر ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اور زندگی کے تلخ حقائق کے متعلق سوچنے لگا۔ ذہن کے پردے پر یادوں کے دھند لے سے نقوش ابھرنے لگے۔ اپنے مکان کی چھت پر "سرخ پھریرے" کا ہلکا سا عکس دکھائی دیا اور پھر اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آنے لگیں۔ جب احرار رضا کاروں کے ساتھ قدم ملانے کی سعی کیا کرتا تھا۔

احرار کے اس بوڑھے جرنیل سے میری عقیدت قدرتی تھی۔ اس میں نہ کسی بڑے فلسفہ داں کو دخل ہے نہ کسی مذہبی آمر کو۔ اور میری اس عقیدت کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھ سے نہیں چھین سکتی۔

۱۹۲۹ء میں مجاہدین اسلام کی اٹھنے والی تحریکیں جنہوں نے برطانوی سامراج سے ٹکرلی۔ ان میں شاہ جی پیش پیش تھے۔ اور پھر جب احرار رضا کار برطانوی استعمار سے ٹکرا گئے۔ تو وہ

نغمہ حب وطن سولی پہ گایا جائے گا!

کی زندہ تصویر تھے۔

حتی کہ جب ۱۹۴۷ء کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا تو ہندوستان سے برطانوی استعمار کا سورج غروب ہو گیا۔ شہنشاہیت کے ان حامیوں کو جن کا سورج روئے زمین پر غروب نہیں ہوتا تھا۔ اپنے چھوٹے سے ملک میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔

برطانوی سامراج کی لعنت ہندوستان سے ختم کرنے میں شاہ جی کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ اور ان کے اس کردار کی بدولت ہر شخص غیر متعصبانہ طور پر یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسے لوگ بھی اس جہاں میں ہوتے ہیں
ستارے ٹوٹتے ہیں جن کی جستجو کے لئے

شاہ جی اگر چاہتے تو غداران ملک و ملت کی طرح جاگیروں کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر میری قوم کے اس مجاہد نے ضمیر کے خلاف کام کرنے میں عار محسوس کی۔ ضمیر کی موت انسانیت کی موت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے قوم کو گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی کو کنارے پر لانے کی جدوجہد کی اور اس میں وہ کافی سے زیادہ

کامیاب بھی رہا۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں جمال الدین افغانی کے بعد صحیح معنوں میں ایک یہی مجاہد تھا جو برطانوی استعمار سے ٹکرایا۔

شاہ جی کی سب سے پہلی تقریر میں نے دھوبی گھاٹ لائلپور کے وسیع پنڈال میں سنی تھی۔ اس وقت شاہ جی کافی سن رسیدہ تھے۔ اس کے برعکس خطابت میں وہی بجلی کی سی تیزی موجود تھی۔ آپ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ دہرا رہے تھے۔ ہنسانے پر آتے تو گھنٹوں ہنساتے رہتے۔ اور جب آپ گزشتہ ٹوٹے ہوئے ربط کے تاروں کو چھیڑتے تو سامعین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اور ان کی نظروں کے سامنے پانچ دریاؤں کی پاک سرزمین آجاتی جس پر کبھی ہندوستان کے رانجھے ہیروں کی یاد میں بنسری کی لے پر، ہجر و وصال کے نغمے چھیڑا کرتے تھے۔

شاہ جی متعدد بار گرفتار ہوئے اور جیل پہنچے۔ جیل میں بھی اپنے مقصد کو نہ بھولتے بلکہ قیدیوں کو توحید و رسالت کا سبق دیتے رہے۔ آپ کی باغ و بہار طبیعت جیل کو گلستان بنا دیتی۔ ادبی، ثقافتی، سیاسی محفلیں جمتیں۔ مشاعرے ہوتے۔ قوالیاں ہوتیں اور جیل کی زندگی کا طویل عرصہ گزارتے ہوئے تکلیف محسوس نہ ہوتی۔ اور جب آپ رہا ہو کر آتے تو اکثر لوگ آپ کو یاد کرتے رہ جاتے۔ جس نے ایک دفعہ بھی آپ سے ملاقات کی وہ آپ کا گرویدہ ہو کر آپ کی شخصیت و کردار سے بے حد متاثر ہوتا۔ اور ہمیشہ کے لئے آپ ہی کا ہو کر رہ جاتا۔

آپ خود کہتے تھے:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

اور ان کے اس قسم کے الفاظ میرے ذہن کو اتھاہ غم کی گہرائیوں میں پھینک دیتے ہیں کہ آہ اب یہ مردِ مجاہد ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گا۔

اور پھر سوچتا ہوں کہ قدرت کا یہی قانون ہے اور ازل سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بڑے لوگ اپنی یادوں اور اپنے عقیدت مندوں کو روتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر پھر دوسرا خیال آتا تھا کہ احرار کا یہ بوڑھا جرنیل ابھی ہمیں روتا ہوا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ قدرت اتنی ستم گر نہیں کہ ابھی ہم سے اس مجاہد کو چھین لے۔

شاہ جی نے کہا تھا دنیا میں مجھے ایک چیز سے محبت ہے وہ ہے قرآن اور دنیا میں مجھے ایک چیز سے نفرت ہے وہ ہے انگریز۔

شاہ جی اپنے اس قول کو صداقت میں انگریز کے مظالم سے نہیں ڈرے۔ بلکہ ببانگ دہل اس کے خلاف میدان جنگ میں آئے۔ جسے دنیا متحیر ہو کر دیکھتی رہ گئی۔ ایسا مجاہد ہم سے ہمیشہ کے لئے نہیں چھین سکتا۔ کہ ہم اس کے خلاف کو جہاں بھی ابھرتا ہوا محسوس کریں اس کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ حتیٰ کہ انسان کو

اس تاریکی سے روشنی میں لے آئیں۔ وہ روشنی جو کہ سرکار مدینہ کے سبز گنبد سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے سینوں میں اجالا کئے ہوئے ہے۔

قادیانیت ہمیشہ سے شاہ جی کا محبوب موضوع رہا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر آپ اس فتنے کے خلاف لڑے ہیں۔ یہ فتنہ جس کا پودا انگریز کے ایماء پر ہندوستان کی سرزمین پر اس لئے بویا گیا تھا تاکہ ہندوستان کا مسلمان متحد نہ ہوسکے۔

شاہ جی کو رسول اکرم ﷺ اور قرآن سے بے پناہ عشق تھا اس لئے انہوں نے ختم نبوت کی تحریک کو شروع کیا آج انہیں ہم سے جدا ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے مگر لگتا ہے وہ جیسے جلسہ عام سے اب بھی خطاب فرمارہے ہیں۔ مگر نہیں یہ میرا وہم ہے۔ ایسے لوگ دوبارہ نہیں آتے۔

سوزِ دروں

آغا شورش کاشمیری مرحوم

کہاں سوزِ دروں اس کا کہاں عشق جواں اس کا
خطابت کے نگر میں اب کوئی ثانی کہاں اسکا
نہ اٹھ پھر کوئی ایسا مقرر اس گلستاں سے
فضا میں مرتعش ہے آجتک حسنِ بیاں اسکا
گزرتا ہی رہا دار و رسن کی شاہراہوں سے
خدائے ذوالمنن تھا ہر ڈگر پر پاسباں اسکا
جبیں اسکی درخشاں ہی رہی ہر آزمائش میں
لیا گردونِ گرداں نے ہمیشہ امتحاں اس کا
دماغ و دل کے ویرانوں سے اکثر ہوک اٹھتی ہے
کوئی باقی نہیں اب اس چمن میں رازداں اسکا
وہ رخصت ہو گیا تو اک خلا محسوس ہوتا ہے
ہر اک سینے سے اب مفقود ہے سوز نہاں اسکا
سیاسی زلزلوں کی رو میں سینہ تان کر نکلا
رہا برقِ تپاں کی زد میں اکثر آشیاں اسکا
خطیبان جہان نو سے استفسار کرتا ہوں
کوئی مردِ خدا ہے اس فضا میں ترجماں اسکا
وہ جس مقصد کی خاطر عمر بھر کوشاں رہا شورش
گزشتہ سال اس منزل کو پہنچا کارواں اس کا

آزاد شیرازی

امیر شریعت سے۔!

عاشقِ حُسنِ ازل! آگاہ اسرارِ حیات
السلام اے قافلہ سالارِ احرارِ حیات

جانشینِ بوذرؓ و سلمانؓ تیری ذات تھی
ذات تیری منبعِ انوارِ صد برکات تھی

عمر بھر آواز کا جادو جگاتا ہی رہا
اک مسیحا تھا جو مُردوں کو جِلاتا ہی رہا

داغ وہ تو نے جدائی کا دیا احرار کو
ڈھونڈتی ہے قوم اپنے قافلہ سالار کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں تجھ کو تیرے پروانے یہاں
تُو ہی بتلا تجھ کو پائیں تیرے دیوانے کہاں

تیرے دستر خوان کے جو لوگ ریزہ چین تھے
یاد جن لوگوں کو تیرے دین کے آئین تھے

تیری تربت کے مجاور بن گئے یا گورکن
بیچ ہی ڈالیں نہ یہ اک دن ترا گور و کفن

ان کے ذہنوں پر مسلط ایسی بے ہوشی ہوئی
خود فراموشی کے بدلے حق فراموشی ہوئی

دیدہ بیدار ہیں وہ یا ہمہ تن گوش ہیں
بند ہیں ان کی زبانیں اور لب خاموش ہیں

اِن زبانوں کو خدارا! قوتِ گفتار دے
حشر جو کر دے بپا۔ وہ جذبۂ احرار دے

مولانا عبدالکریم صابر

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ایک جماعت حزب الاحناف قائم تھی جسکے صدر جناب نواب سیف اللہ خان خواتکزئی مرحوم نہایت ہی نیک سیرت انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے۔ انہوں نے شہر میں منادی کرادی کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں حزب الاحناف کی طرف سے ایک جلسہ میدان حافظ جمال میں منعقد ہوگا جس میں بطل حریت امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اپنے اپنے خیالات سے سامعین کو محظوظ فرمائیں گے۔ چونکہ یہ واقعہ دور برطانیہ کا تھا۔ اور اس وقت ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ڈپٹی کمشنر جان بل انگریز تھا اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈانڈ لے بھی انگریز تھا۔ جوں ہی اس منادی کی خفیہ پولیس نے ان کو اطلاع دی تو جان بل ڈی سی نے ڈانڈ لے ایس پی کو حکم دیا کہ ان سب کو دریاخان میں روک دیا جائے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں انہیں داخل نہ ہونے دیں۔ چنانچہ ڈانڈ لے ایس پی نے ڈی ایس پی جسکا نام گل مست خان آفریدی تھا۔ اسے حکم دیا کہ تو اور غلام حسین خان بلبل پنجاب فوراً دونوں دریاخان چلے جاؤ اور جونہی یہ ریل سے اتریں تو ان سے کہو کہ تم سب کا داخلہ ڈیرہ اسمٰعیل خان بند ہے۔ اور ان سے دستخط کرالو۔ چنانچہ ڈیرہ شہر سے تمام مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ منادی سن کر دریاں خان پہنچ گئے کہ ایسے معتبر مہمانوں کا شاندار استقبال کر کے انہیں شہر ڈیرہ لایا جائیگا۔ ادھر گل مست خان ڈی۔ ایس۔ پی۔ بلبل پنجاب غلام حسین خان پہنچ گئے۔ جونہی یہ مہمان لیڈر حضرات ریل گاڑی سے اترے تو گل مست خان اور بلبل پنجاب نے ان کو حکم ڈی۔ سی اور ایس پی کا حکم سنایا اور دستخط لینے کے لئے آگے بڑھے تو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نوراللہ مرقدہ نے کہا لاؤ حکم....... یہ میں نے سب کی طرف سے دستخط کر دیئے۔ جاؤ ہم ڈیرہ اسمٰعیل خان نہیں آئینگے۔ ادھر نواب صاحب سے کہا نواب صاحب ڈیرہ میں منادی کرادو کہ جو اجلاس ڈیرہ میں ہونا تھا۔ اب دریا خان ہوگا۔ اور اجلاس ہو کر رہے گا۔ چنانچہ دریا خان میں یوں سمجھیئے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان شہر کے علاوہ گردونواح کے لوگ بھی نہایت کثیر تعداد میں پہنچ گئے۔ اس زمانے بجلی ابھی نہیں آئی تھی اور اسٹیشنوں پر گیس جلائے جاتے تھے۔ جنہیں زنجیر کے ذریعہ اوپر لے جایا جاتا تا کہ روشنی ہر طرف پھیلتی رہی۔ دریا خان سٹیشن پر دونوں طرف سے گاڑیوں میں سوار اکثر لوگ اتر آئے کہ یہ عظیم الشان اجلاس سن کر جائیں۔ چنانچہ سب سے پہلے مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار جو فی البدیہہ اشعار کہنے میں یکتائے روزگار تھے۔ انہوں نے موقعہ کی مناسبت سے یہ اشعار پڑھے۔

اٹک کی موج کی مے گوئیاں دیکھ
ہیں دریا خان بلبل مست و گل مست
چڑھا ہے نشہ سیف اللہ خان کو
ظفر مست بخاری مست و گل مست
نچائینگے انہیں نگنی کا ہم ناچ
کریگا رقص ہو کر جان بل مست
ہلادینگے مسیحیت کی بنیاد
اگر اس بات پر جائینگے ٹل مست
الٰہی خانۂ انگریز گرجا
مچائینگے لب دریا یہ غُل مست

اس کے بعد جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی سٹیج پر تشریف لائے اور اس جوش سے تقریر فرمائی جیسے برطانیہ پر گولہ باری ہو رہی ہو۔ ان کے بعد مولانا حفظ الرحمن وقت کی نزاکت کے پیش نظر مختصر مگر دلپذیر تقریر فرما کر بیٹھ گئے۔ اب حضرت امیر شریعت اٹھے اور اٹھتے ہی الحمدللہ کے خطبہ مسنونہ سے حاضرین کو تڑپا دیا ریلوے لائنوں کے دونوں طرف کی سواریاں شاہ جی کی تقریر دلپذیر سننے کو اتر آئیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی پبلک ہی پبلک نظر آتی تھی سبحان اللہ شاہ جی کی جوانی، سیاہ گھنگریالے بال، روشن آنکھیں دیکھنے والے سننے والے مبہوت تھے اور کسی کو ہوش تک نہ تھا حتیٰ کہ صبح کی اذان گونجی اور شاہ جی نے فرمایا

ذرہ ٹھہرنا مؤذن میرا دل لرز رہا ہے
کہیں کعبہ گر نہ جائے تری مستیٔ اذاں سے

اس شعر کے بعد فرمایا کہ حضرات اب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آ گیا ہے۔ اور اب میں بھی مجبور ہوں ورنہ آپکو معلوم ہونا چاہیئے کہ بخاری کا بخار ابھی نکلا نہیں تھا۔

افسوس کہ ایسی نعمت عظمیٰ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بخشی تھی مگر ہم اس کی قدر نہ کرسکے۔

حافظ صفوان محمد

شبِ سیاہ غلامی میں نور کی قندیل

برصغیر کے ایک بہت بڑے متغرب نے ایک بار آخرت کے لئے اپنے زادِ راہ کے بارے میں کہا۔ "جب اللہ مجھ سے یہ پوچھے گا کہ دنیا میں آخرت کے لئے کیا سامان کیا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس حالی (مدوجزر اسلام) لکھوا کر لایا ہوں "مدوجزر اسلام کا اسم بامسمیٰ ہونا قطعاً لاریب ہے۔ لیکن اگر یہی سوال مجھ سے ہُوا تو میرا جواب یہ ہوگا۔ "اے اللہ میں نے شاہ جی کی صحبت اگرچہ نہیں پائی لیکن ان کے مشن کو حق سمجھا۔ ان کے افکار پر غور و فکر اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے میں اپنی سی سعی ضرور کی۔

یہ تقریباً ساٹھ برس ادھر کی ایک بہت خاموش وسطِ شب کا واقعہ ہے کہ فضاء اچانک نعرہ ہائے تکبیر فلک شگاف صداؤں سے لرز اٹھی۔ پھر اہل لاہور نے دس بارہ ہزار افراد کے ایک ہجوم کو باغبان پورہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اسی ہجوم پر ایک نظر ڈالنے سے نگاہ چمکتی ہوئی، بڑی بڑی آنکھوں، سرخ و سفید نورانی چہرہ، ملگجی ڈاڑھی، اور لمبے بالوں والے ایک کھدر پوش بزرگ پر جا کر رک جاتی تھی۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جو ابھی چار گھنٹے قبل نمازِ عشاء پڑھانے کے بعد لوگوں سے چند باتیں کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تھوڑے سے لوگ ایک بڑے مجمع میں بدل گئے۔ بات انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل سے متعلق تھی۔ جس پر الزام تھا کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ پرنسپل کی اس مذموم حرکت پر چند غیور مسلمان طلبہ مشتعل ہو گئے۔ اور اس اشتعال نے بڑھتے بڑھتے چند ہی روز میں ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی قیادت کی پاداش میں مولانا احمد علی لاہوری، اور مولانا داؤد غزنوی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ رات کے کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا۔ جب ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ایک مدلل اور متنوع تقریر لوگوں کو تڑپا رہی تھی۔ پھر ایک مجمع اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ طے یہ پایا تھا کہ نمازِ فجر کالج کے سامنے ادا کی جائے اور وہیں سے ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے اپنا فرض ادا کرنے کا آغاز کیا جائے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس کے قدم انجینئرنگ کالج کی بجائے اپنے گھر کی طرف اٹھے ہوں۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں چاہنے والے شاہ جی اور ماننے والے مجدد خطابت، سلطان المتکلمین، امام المجاہدین، سید الاحرار اور مؤسس تحریک تحفظ ختم نبوۃ کہتے تھے۔ یکم ربیع الاول (یعنی چاند رات) ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء کو جمعہ کی سحر ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ددھیال سے عطاء اللہ اور ننھیال سے شرف الدین احمد نام تجویز ہوا۔ والد گرامی کا نام سید ضیاء الدین اور دادا کا نام سید نور الدین شاہ تھا۔ نسب نامہ چھتیسویں پشت میں حضرت سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے خلف الرشید حضرت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ العالی کی تالیف "سواطع الالہام" کے مطابق آپ کے

خاندان میں سید الاولیاء حضرت سیّد عبدالقادر جیلانی اور سید محمد شاہ جیسے جلیل القدر بزرگ ہو گزرے ہیں۔ ایک اور خدا رسیدہ بزرگ سید عبدالرسول تھے۔ جن کے بارے میں مؤرخ کشمیر منشی محمد دین فوق نے لکھا ہے۔ "تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مرغی کا انڈہ اور مرغی صرف اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دنکا لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر کھالیا کرتے ہیں" شاہ جی کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی کا شجرہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ سے جاملتا ہے۔

۱۹۱۴ء تک آپ نے قرآن پاک کے حفظ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو اور فقہ کی بعض کتب کی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال آپ کا عقد آپ کے والد کے چچیرے بھائی سید مصطفیٰ شاہ کی دختر گرامی سے ہوا۔ 1915ء میں آپ نے امرتسر کو مستقر بنالیا۔ اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ آغاز تعلق کے ایام کے بارے میں فرماتے تھے کہ "اس زمانہ میں بے حد وظائف کرتا تھا۔ طبعیت میں بہت جلال تھا۔ جب کہیں گزرتا تھا تو درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی نظر آتی تھیں" اسی زمانے میں شاہ جی حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے درس میں شامل ہوئے۔

شاہ جی کے قرآن مجید پڑھنے کا منفرد انداز جب عام ہوا تو یہ آواز گلی کوچوں پھر شہر کے بازاروں تک آن پہنچی۔ جب لوگوں نے حضرت قاسمی کو مجبور کیا کہ وہ سید عالی کو کھلے میدان میں تقریر کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کمہاراں امرتسر میں ہوئی۔ ایک اور صاحب آپ کو نواحی قصبہ سلطان ونڈ لے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس امرتسر کے گول باغ میں منعقد ہوئی جس میں پہلی مرتبہ شاہ جی نے سیاسی تقریر کی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستانی خفیہ پولیس کی جانب سے تیار کردہ ایک فتویٰ پر مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے مقتدر علماء سے اس مضمون کے دستخط حاصل کئے گئے تھے کہ آلِ عثمان خادمِ حرمین شریفین ہونے کے باوجود برطانوی استعمار سے برسر جنگ ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔

رولٹ ایکٹ کی وجہ سے ملک کی سیاسی فضا میں ایک گونہ ارتعاش اور حدت پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر مسلمانان ہند نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ اپنے جیالے رضاکار اور بہترین دماغ پروانہ وار فدا کر دیئے۔ چند ہی یوم میں یہ عوامی تحریک محلات اور کوٹھیوں سے جھونپڑیوں، مساجد، پاٹھ شالاؤں اور گوردواروں تک پھیل گئی۔ ایسے ہمہ گیر جذباتی دور سے ناممکن تھا کہ شاہ جی متاثر نہ ہوتے۔ جوانی کا عالم تھا۔ قدرت نے خوش روئی کے علاوہ خوش گلوئی کی نعمت بھی ودیعت کر رکھی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۹ء کا واعظ اور خطیب تمام آسائشوں کو تیاگ کر میدان عمل میں اس بے جگری سے کود پڑا کہ ماضی قریب، بعید کے بزرگان عظمت و استقلال کی درخشندہ تاریخ کو ایک نعرۂ عشق سے روشن اور اجاگر کر دیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی محلے کی مسجد سے اٹھا کر انہیں سیاست کی سٹیج پر لے آئے۔ اور ابھی چند ماہ نہ گزرے تھے کہ حضرت شاہ جی کی شہرت اکنافِ ہند میں پھیل گئی۔

سیاسی اور اصلاحی مدوجزر میں وہ کون سا مقام آیا جہاں کلمۂ حق کو بہانگ دہل بلند کرنے کی حاجت ہوئی اور یہ شیر خدا نتائج سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کے فراعنہ اور نماردہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے سب سے اونچے مقام پر نہ دیکھا گیا ہو۔ آزادی کی جنگ ہو یا انگریز کی اسلام دشمنی کے خلاف جہاد، سردار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حملوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہو یا بدعات کے خلاف تحریک۔ شاہ جی کا عمل سرفروشی کے لباس میں معاصرین میں سب سے زیادہ افضل اور موثر نظر آتا ہے۔ فتنہ شاتم رسول ﷺ راج پال ہو یا مغلپورہ ایجی ٹیشن، کوئٹہ کے مفلوک الحال زلزلہ زدگان کی امداد ہو یا بے کس و مظلوم مسلمانان کشمیر پر ڈوگرہ شاہی مظالم، انتخابات کی سرگرمیاں ہوں یا تحفظ ختم نبوۃ کے لئے جان کی بازی، غرض ہر مقام اور ہر منزل پر شاہ جی سالار قافلہ کی حیثیت سے رجز خوانی کرتے ملے۔ اور ساتھیوں اور جانبازوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ سزا کو ہنستے ہوئے قبول کرتے نظر آئے۔ وہ ایک ایسے بے باک اور مضطرب دل لے کر آئے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا۔ ان کی آواز اتنی پُردرد تھی کہ برصغیر اور بلاد اسلامیہ کے لئے بے اختیار بلند ہو جاتی۔ آنکھیں عالم اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آلود ہو جاتیں۔ ناممکن تھا کہ مظلوم کو شکنجہ میں جکڑا دیکھ کر خاموش رہیں۔ وہ قوم کی تکلیف پر خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ انہوں نے مصر، ترکی، حجاز الغرض ہر خطہ کے مسلمانوں پر ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔

زور خطابت کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو ہمارے زمانے کے لوگ شیکسپیئر کے ڈارمہ جولیئس سیزر میں انتونی کی تقریر پر سر دھنتے نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس تقریر کا حقیقت میں کتنا اثر ہوا تھا۔ لیکن سب اپنے اور غیر بارہا اس بات کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ناموافق ماحول میں جب بھی شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے عوام کے غم و غصہ کو نعرہ ہائے تحسین و آفرین میں بدل دیا۔ جو لوگ جوتے لے کر آئے تھے۔ اپنی جیب سے آخری پائی تک نچھاور کر بیٹھے۔ جو کفر کا فتویٰ صادر کر چکے تھے پھر ان کے ہاتھ تاحیات دعا کے لئے اٹھے رہے۔ ایک بار شاہ جی نے فرمایا۔ "میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے لیکن تمہاری آواز تمہارے ہی کانوں سے ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی۔ مگر تم مجھے نہ پا سکو گے"
حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی دل و دماغ پر حکمرانی کرتے تھے۔ وہ واحد شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رقابت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ فقط ایک اشارہ پر سر دینے کو تیار ہو جاتے۔ بخاری کی تقریر کسی بستی میں ہو اور لوگ رات گھروں میں سو کر گزاریں۔ یہ ممکن نہ تھا۔ آپ نے فصاحت و بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز کے شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ اختلاف عقیدہ کے علاوہ کادیانیوں سے غیر فانی کد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بانیٔ سلسلہ مرزائیت (مرزا غلام قادیانی) نے انگریزی حکومت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا (ازالہ اوہام ص ۱۳۲) اس وجہ سے انگریزی استعمار اور مرزائیت دو ایسے نشانے تھے جن پر حضرت شاہ جی کے میزائل ہمیشہ لگتے رہے۔ قادیانیت کا ابطال دراصل ختم نبوت کا اثبات ہے جو آپ کے ایمان کا مرکز تھا۔ وہ حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سر پر

پڑتی اسے شق کر ڈالتی۔ وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھے کہ کفر و ضلالت کے جس خرمن پر پڑتے۔ اسے بھسم کر ڈالتے۔ وہ لحن داؤدی کا ایسا نمونہ تھے کہ حبیب و رقیب سب کو مسحور کر دیتے۔ وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی۔ جس کی ایک آواز پر پچاس ہزار رضاکار آزادیٔ کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر نکل آئے۔ جس کے ایک اشارے پر متحدہ ہند کے جیل خانے بھر جاتے جس کا داخلہ ایوان مرزائیت قادیان میں زلزلہ ڈال دیتا۔ جنگ آزادی کے کارکنان سے پوچھیئے کہ ان کی امروہہ والی تقریر ضرب المثل کے طور پر آج بھی یاد کی جاتی ہے کہ اس نے جنگ آزادی کو نیا رُخ دیا۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دنوں میں لاہور سنٹرل جیل میں جب مارشل لاء کے قیدیوں سے آپ کی ملاقات کرائی گئی۔ تو آپ ننگے پاؤں اور ننگے سر ان کے استقبال کے لئے دوڑے۔ آپ نے سب کو گلے لگایا۔ ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو بوسہ دیا۔ اور یوں گویا ہوئے "تم لوگ میرے سرمایۂ حیات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی یا پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے تحفظ کی دعوت دی ہے۔ میں نے جب کراچی جیل میں گولی چلنے کے واقعات سنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے بابوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئیں، ماؤں کے چراغ گل ہوگئے، اور کئی سہاگ اجڑ گئے تو مجھے اس کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے وہاں کہا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لے جائے یا ارباب اختیار تک میری آواز پہنچا دی جائے کہ تحفظ ناموس رسول ﷺ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا مقصود ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اب تک جتنی گولیاں چلائی گئیں مجھے ٹکٹکی باندھ کر میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جاتیں۔"

راقم کے دادا مولوی محمد صدیق اسیری کے ان ایام میں شاہ جی کے ہمراہ تھے۔ ان دنوں آپ ۱۳ فروری ۱۹۵۳ء کو بیرون دہلی دروازہ والی تقریر کے سلسلہ میں اسیر تھے۔ یہ وہی تقریر تھی جس میں آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر کہا تھا۔ "کوئی ہے تم میں جو یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین (وزیر اعظم پاکستانؒ) کے پاؤں پر جا کر رکھ دے اور یقین دلا دے کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں۔ اگر وہ ناموس رسول کا تحفظ کریں تو میں پوری زندگی ان کا خدمت گار رہوں گا"

جلیانوالہ باغ کے حادثہ اور قبیح رسوم کے خلاف جہاد نے شاہ جی کو وہ مقام دیا کہ جہاں وعظ فرماتے انسان ہی انسان نظر آتے۔ اسی عہد میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا تھا۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرانے کے لئے شب و روز مشورے ہونے لگے۔ اور ایک ایسی جماعت کی تنظیم ہوگئی جس کے رزق کا انحصار کذب کے شجر کی آبیاری پر تھا۔ آپ کبھی کبھی بڑے جلال سے فرمایا کرتے تھے "ایک وقت آئے گا کہ تم لوگ ہماری قبروں پر آ کر روؤ گے اور کہو گے کہ تمہیں لوگ سچے تھے" انہیں ایام میں ایک تقریر میں فرمایا۔

"میں ان سوروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپیریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا ایک فقیر ہوں اپنے نانا ﷺ کی سنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس

ملک سے انگریز کا انخلاء دو ہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں۔ یہ ملک آزاد ہو جائے یا میں تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں''

ایک بار ضلع سورت میں سکھوں اور ہندوؤں کی دعوت پر ایک تقریر منظور فرمائی۔ اس تقریر کی تاثیر اور حلاوت نے سکھوں اور ہندوؤں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی موجود تھے۔ اسلام کی حقانیت، اللہ کی عظمت، توحید اور بت پرستی کی قباحتوں پر حیرت انگیز بیان تھا۔

وہ بھی عجیب منظر تھا جب مئی ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے اجلاس میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری نے آپ کو امیر شریعت کا خطاب دیا اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے کر بیعت کی۔ حضرت شیخ خود بھی زار و قطار رو رہے تھے۔ اور شاہ جی کی آنکھوں سے بھی گویا آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔ آپ لاکھ انکار کرتے تھے اور حضرت شیخ اصرار کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد آپ کی شخصیت میں مقبولیت اور جاذبیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس سے قبل کبھی نہ تھا۔

وہ حریت و مساوات کی جنس گراں بار اٹھائے زندگی کے بازاروں میں تقریباً نصف صدی تک لوگوں کو ہر لحظہ بلاتے رہے۔ انہوں نے اس گورستان میں برسوں اذانیں کہیں۔ لیکن غلام رگوں کے منجمد خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لا سکے۔ اور یوں یہ بد نصیب لوگ اب شاید ہمیشہ کے لئے غلام ہو گئے۔ اگر بخاری پہاڑوں کو پکارتے تو شاید خاک راہ بن کر دامن سے لپٹ جاتے۔ اگر ستاروں کو آواز دیتے تو وہ یقیناً اپنی قندیلیں زمین کے حوالے کر دیتے مگر آہ! بخاری نے ان کے دروازوں پر سر پٹکا جن کے دل خون سے تہی، آنکھیں بصارت سے محروم اور کان صدائے حق سے نا آشنا تھے۔ یا بالفاظ دیگر وہ لوگ

ختم اللہ علی قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصار ھم غشاوۃ

کی حقیقی تفسیر تھے۔ دردناک اور فلک شگاف آواز کے ساتھ قرآن کا پڑھنا، عالم و جاہل اور مخالف و موافق سب کا یکساں طور پر متاثر ہونا ان کی وہ خصوصیات ہیں کہ کوئی ان کی ہمسری کر ہی نہیں سکتا۔ مخالفین کو ہم خیال بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو بولنے سے قبل ہی مجمع کو ایک ساحرانہ نگاہ سے مسحور کر دیتے تھے۔ اپنے مخالف پر یوں حملہ آور ہوتے کہ ایسا خطیب کسی نے دیکھا ہو گا اور نہ سنا۔ فکری تحلیل سے وہ نقشہ کھینچتے تھے کہ دنیا کا کوئی مقرر ان کی نقالی نہیں کر سکتا۔ احرار کی قیادت کے زمانہ میں آپ کے دہن مبارک میں دو دھاری زبان اور باطن میں قلب جرار تھا۔ جس نے قادیانیت کا جنازہ نکال دیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی خطابت اور قیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ ایک بار شاہ جی کے بارے میں فرمایا۔ ''ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جا سکتی ہے نہ بعد میں۔ اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جمتا اور اگر اس سے پہلے تقریر کریں تو اس کے اثر کو آکر یہ مٹا دیتا ہے''۔

لدھارام والے کیس کے سلسلہ میں ایک گواہ سید مقبول شاہ جو ان دنوں لالہ موسیٰ میں ہیڈ کانسٹیبل تھا کہتا ہے۔ ''جب میں ہائی کورٹ میں شاہ جی کے خلاف شہادت دینے کے لئے گیا تو لاہور کے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی کہ دوران شہادت شاہ جی سے آنکھ نہ ملانا۔ اگر آنکھ مل گئی تو شہادت نہ

دے سکو گے۔ یہ واقعہ حضرت مرحوم کی مقناطیسی شخصیت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

شاہ جی دوسروں کی عیوب کی پردہ پوشی فرماتے تھے۔ کسی کی دل آزاری ان کا شیوہ نہ تھا۔ صلح کل ان کا مسلک تھا۔ ان کے منہ سے کسی نے جھوٹی بات نہیں سنی۔ وہ اس بات یا روایت کو ہرگز بیان نہ کرتے جس کی صحت میں انہیں ذرہ برابر بھی شک ہوتا۔ بے حد منکسر المزاج تھے۔ آخری ایام میں ایک بار فرما رہے تھے۔ "میری زندگی ہی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ نہ نبی ہوں نہ ولی۔ خدا کی مخلوق میں سب سے برا اور عاجز!! میرے گناہوں پر میرے مالک نے پردہ ڈال دیا۔ ورنہ عطاء اللہ جیسے کروڑوں مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں کوئی جانتا تک نہیں۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے قرآن کی کچھ خدمت مجھ سے لے لی۔ اور اس پر بھی کوئی دعویٰ نہیں۔ استغفر اللہ! پوری زندگی میں کہا ہوا کوئی ایک حرف بھی قبول ہو گیا تو نجات ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔ نجات کی امید ضرور رکھتا ہوں۔ کیونکہ اتنا مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کے سوا کسی کو خدا نہیں مانا۔ اور میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو ان کا حریف بنتے دیکھنا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور کوئی عمل میرے پلے نہیں۔ بس اسی کے فضل و کرم کے سہارے جی رہا ہوں"

۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب اہل ملتان نے یہ دلخراش خبر سنی کہ محفل عزم و عمل کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض و ضعف کے شدید جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا۔ ۷۲ برس کی حنا گستریوں کے بعد بالآخر آج شام چھ بج کر پچپن منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ وہ جس کے دروازے پر بڑے بڑے رؤسا، آفیسرز، وزراء، علماء اور صوفیاء حاضری دینا باعث صد افتخار گردانتے تھے کرائے کے ایک بوسیدہ مکان میں اپنی زندگی گزار کر خوش رہا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے جنازے یوں نہ اٹھے ہوں گے جیسے اس فقیر کا جنازہ اٹھا۔ جنازہ اٹھائے جانے کے وقت دو لاکھ سے زائد خوش قسمت عقیدت مندوں نے ایمرسن کالج گراؤنڈ ملتان میں آپ کے بڑے فرزند اور جانشین حضرت ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ العالی کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی۔ ڈپٹی کمشنر ملتان نے حکومت کی جانب سے قلعہ ملتان میں تدفین کی پیش کش کی۔ جسے شاہ جی کے اہل خانہ نے مسترد کر دیا اور عام قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخری ایام میں آپ اکثر فرماتے تھے۔ "اللہ مجھے ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سر راہ ہو اور آتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں" ۲۲ اگست کی شام چھ بجے جلال باقری قبرستان میں برلب سڑک آپ کو سپرد لحد کیا گیا۔ شاہ جی ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے سو گئے۔ لوگوں کی گریہ وزاری کی انتہا ہو گئی۔ برصغیر کی تحریک آزادی اور جہاد دین کا ایک نہایت منور باب اپنے اختتام کو پہنچا اور دنیا اس بلبل ہزار داستان کی نغمہ طرازیوں اور خوش الحانیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ جو خرمن باطل پر بجلی کی مانند ٹوٹتی تھی۔

آج مٹی کا وہاں ڈھیر سا ہو گا ساغر
سر جھکاتی تھی جہاں لوح و قلم کی دنیا

علامہ انور صابری (دیوبند)

عصرِ نو کی ظلمتوں میں روشنی کی موت ہے

(روحِ بخاری کے نام)

اے عطاء اللہ اے شیر نیستان رسول
نور چشم مرتضیٰ ، تنویر ایمان رسول
تیری صورت میں جمال سید کونین تھا
ہر عمل تیرا مراد سیرت حسنین تھا
قلب انور شاہ کا پرتو تری تقریر تھی
تجھ سے وابستہ عروج عشق کی تقدیر تھی
موج کوثر کی روانی تھی ترے الفاظ میں
زندگانی کی جوانی تھی ، ترے الفاظ میں
تو خیابان محمد کا گل خوش رنگ تھا
تجھ کو حاصل قرن اول کا شعور جنگ تھا
حق نے دی ختم نبوت کی نگہبانی تجھے
تھی میسر دولت اسرار قرآنی تجھے!
تو لب روح الامین کا نعرہ تکبیر تھا

ورتّل القرآن ترتیلا کی خود تفسیر تھا
تیری صحبت میں نظر آئی صحابہ کی حیات
اک شجاعان سلف کا آئینہ تھی تیری ذات
گلشن احرار کی روح چمن بندی تھا تو
بہر آزادی مجسم آرزو مندی تھا تو
آج تک ممنون ہے ہر ذرہ تری آواز کا
تو حسیں نغمہ تھا حریت کے دلکش ساز کا
کانپتا تھا حلقہ افرنگ تیرے نام سے
خاص نسبت تھی تجھے پیغمبر اسلام سے
تو نے سکھلائے جہاں کو آدمیت کے اصول
طبع دشمن بھی نہ ہوتی تھی کبھی تجھ سے ملول

جز بۂ محمود تیری پاک شریانوں میں تھا
تو امیر الہند کے جانباز دیوانوں میں تھا
عصر نو کی ظلمتوں میں روشنی کی موت ہے
موت تیری درحقیقت زندگی کی موت ہے
میں کبھی حسن عقیدت کو بھلا سکتا نہیں
تیری دیرینہ رفاقت کو بھلا سکتا نہیں
مضمحل ، بیمار ، رنجیدہ ہوں ، افسردہ ہوں میں
زندہ جاوید! تیری یاد میں مردہ ہوں میں
خون دل برسائے گی تاعمر چشم اشکبار
مٹ نہیں سکتی مرے دامن سے تیری یادگار
درد ملت کی شبیہ بے قراری مر گیا
ہر نفس تصویر ماتم ہے بخاری مر گیا
اپنے سینے میں چھپائے سوز جان برق طور
آخرش جنت میں پہنچا اپنے نانا کے حضور
کاروانِ جادۂ ماضی کے اے مخلص امام
ہر ورق بھیجے گا تجھ پر مصحف دیں کا سلام

حضرت شاہ جی مرحوم ان معدودے چند ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے گذشتہ نصف صدی میں برصغیر ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں صحیح سیاسی شعور پیدا کیا۔ مگر افسوس کہ مسلمانؔ ان کی اقدار کو نہ صرف فراموش کر چکے ہیں۔ بلکہ سیاسی طور پر اسی سطح پر پہنچ چکے ہیں جہاں آج سے پچاس سال پہلے تھے۔

ہماری نااہلی اور بد قسمتی کی انتہا ہے کہ ہم نے ایسی نامور ہستیوں سے کما حقہ، استفادہ نہیں کیا؛ دراصل یہ قدرت کا اصول ہے کہ جب کسی قوم کے اعمال و افکار بہت پست ہو جاتے ہیں تو بہت عظیم شخصیتیں بھی ان کو اس قعرِ مذلت سے نہیں نکال سکتیں۔ اور ان کی تمام تر کوششیں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔

خدا کرے میرا یہ اندازہ غلط ہو مگر حضرت شاہ جی مرحوم جیسے مخلص اور بہادر رہنما کے ساتھ جو سلوک ہماری قوم نے ان کی زندگی میں اور ان کی یاد کے ساتھ ان کی وفات کے بعد کیا ہے اس سے میں مایوس ہوں۔ اور یہ ہماری قومی زندگی کے لئے ایک المناک سانحہ ہے!

میر عبدالقیوم مرحوم ایڈووکیٹ

میاں محمد شفیع

تحفظ ختم نبوت کا داعی

بچپن سے ہی میں مذہبی جلسوں میں جایا کرتا تھا۔ اور مواعظ حسنہ سے مستفیض ہوتا۔ کئی علماء کرام کو سننے کو اتفاق ہوا۔ جو کیف و سرور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سے حاصل ہوتا وہ دیگر مواقع پر کم ہی نصیب ہوا۔ اگرچہ اور علماء بھی علمی اعتبار سے بحر بیکراں تھے لیکن تقریر کرنے کا ملکہ ایک قدرتی عطیہ ہے۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی شخصیت بڑی رعب دار تھی۔ گھنی داڑھی، گندمی رنگ، مناسب جسم، کشادہ چہرہ، ہاتھ میں اکثر عصا رکھتے۔ آواز سوز سے معمور تھی۔ اگر کسی وقت لاؤڈ سپیکر خراب ہو جاتا تو آپ کی آواز اتنی اونچی اور پاٹ دار تھی کہ دور بیٹھے ہوئے سامعین کو بھی صاف سنائی دیتی۔

جب تقریر کرتے وقت قرآن پاک کی آیات کی تلاوت کرتے تو مجمع پر سکوت طاری ہو جاتا اور لوگ عش عش کر اٹھتے۔ ہر ایک یہی چاہتا کہ مولانا قرأت جاری رکھیں اور وہ سنتے رہیں۔ فرمایا کرتے میری عمر کا بہت سا حصہ جیل میں گزرا یا ریل کے سفر میں۔ عمر بھر تحریک تحفظ ختم نبوت کے زبردست داعی رہے۔ اپنے مسلک پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ اس راہ میں قید و بند کے مصائب خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلے۔ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ جو نصیب العین عمر بھر ان کے پیش نظر رہا۔ بالآخر مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے پر منتج ہوا۔ اس طرح وہ جدوجہد جو عرصہ سے جاری تھی اور جس کی خاطر شمع رسالت کے بے شمار پروانوں نے جانوں کے نذرانے پیش کیے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ایک دفعہ حاضرین کے سامنے اپنا اور مرزا غلام قادیانی کے کردار کا موازنہ پیش کیا۔ فرمایا کہ اگر مرزائی حضرات ایسے کردار کے مالک شخص کو نبی ماننے پر مصر ہیں تو پھر انہیں نعوذ باللہ نعوذ باللہ مجھے خدا ماننا پڑے گا۔ فروعی مسائل میں الجھنا پسند نہ کرتے۔ ایک شخص نے استفسار کیا کہ کیا مردہ افراد سنتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ مردوں کا کیا ذکر ہماری بات تو زندہ بھی نہیں سنتے۔

تقریر کرتے وقت سامعین کو رلاتے اور ہنساتے بھی۔ کئی معروف شعرائے کرام کے اشعار یاد تھے۔ تقریر کے دوران جہاں جہاں موضوع سخن تقاضا کرتا مناسب اشعار سناتے۔ اس سے ان کی تقریر کی چاشنی دگنی ہو جاتی۔

بذلہ سنج اور حاضر دماغ تھے۔ دہلی میں ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے کہ سامعین میں سے ایک نے اٹھ کر پوچھا کہ مولانا آپ نے جو پچھلے سال کلکتہ کے قحط زدگان کے لئے چندہ جمع کیا تھا اس کا حساب دیں۔

مولانا نے فرمایا کہ ہم سے حساب کا تقاضا ایسے حضرات کرتے ہیں جنہوں نے بذات خود کسی نیک کام کے لئے ایک دھیلا بھی نہیں دیا ہوتا۔ سوال کنندہ سے کہا کہ وہ حلفاً بیان کریں کہ اس نے کتنا چندہ دیا تھا۔ اس پر وہ خاموش رہا اور کھسیانا ہو کر بیٹھ گیا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہم حساب دیں گے ضرور لیکن قیامت کے دن احکم الحاکمین کو۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

لاہور میں موچی دروازہ کے باہر ایک پرہجوم جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا لاہوریو! میں تم سے خوب واقف ہوں۔ تقریر تم میری سنتے ہو اور ووٹ مسلم لیگ کو دیتے ہو۔ میری تقریر پر تعریف کے ڈونگرے برساتے ہو اور کہہ اٹھتے ہو واہ اور جب میں پابند سلاسل کیا جاتا ہوں تو تم کہتے ہو آہ۔ اس آہ اور واہ میں میں ہو گیا تباہ۔ (لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہماری آہوں اور جہد مسلسل سے کتنوں کے مقدر سنور گئے) گویا۔۔۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

ایسا کئی بار ہوا کہ شاہ جی نے اپنی تقریر کا آغاز عشاء کی نماز کے بعد کیا اور جب سحر کی اذان فضا میں بلند ہوئی تو آپ نے اپنا بیان ختم کیا۔ اس طویل دورانیے میں مجمع سحر زدہ رہتا اور ان کی تقریر سننے میں اتنا محو کہ بوریت یا نیند اس کے نزدیک نہ بھٹکتے۔

خفیہ پولیس کا سٹاف سایہ کی طرح ان کے تعاقب میں رہتا۔ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں تقریر کرنے جا رہے تھے۔ ٹانگے پر ایک اور شخص ان کا ہمسفر تھا۔ شاہ جی نے بھانپ لیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ جب ٹانگے سے نیچے اترے تو اس شخص سے کہا کہ کتابوں کا بھاری بنڈل جو وہ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں پیرانہ سالی کے سبب وہ اسے اٹھانے سے معذور ہیں۔ اس لئے کیا ہی اچھا ہو اگر وہ اسے اٹھالے اور فلاں گاؤں تک جو وہاں سے تین میل دور ہے پہنچا دے۔ اس نے بادل نخواستہ حامی بھر لی۔ جب منزل مقصود پر پہنچے تو ساتھی تھکاوٹ کے مارے نڈھال ہو چکا تھا۔۔۔

جب مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو شاہ جی نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ اور ان کی جماعت اس نوزائیدہ اسلامی سلطنت کا دل و جان سے دفاع کریں گے۔

مولانا نے طویل عمر پائی جب انتقال فرمایا تو انکے جسد خاکی کو ملتان کی سرزمین نے جس میں اور بھی کئی علم و معرفت کے درخشندہ ستارے آسودہ خاک ہیں اپنی آغوش میں لیا۔

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

("صدف ریزے" صفحات ۸۶ تا ۸۹)

اشرف عطاء

آزادی کا داعی۔ ایک مجاہد عالم دین

کتنے دور آئے اور ختم ہو گئے۔ کتنی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں اور عدم آباد میں ابدی نیند سو گئیں۔ کتنی حکومتیں بنیں اور انقلابات کی نذر ہو گئیں۔ تاریخ کے اوراق میں ان کے کارناموں کی مناسبت سے ان کا ذکر ہو تو لیکن گردشِ زمانہ نے عوام کے دماغوں سے ان کی یاد محو کر دی ہے لیکن کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جنہیں انسان بھولنا بھی چاہے تو بھول نہیں سکتا۔ شاہ جی کے کارنامے ان کی قربانیاں، ان کا ایثار، ان کی باغ و بہار طبیعت، ان کے لطائف، ان کے ادب پارے، ان کی طنز، ان کا مزاح اور پھر فارسی، عربی اور اردو کے شعراء کے ہزاروں اشعار جو انہیں از برتھے ان اشعار کی ادائیگی۔ ان کی قادیان شکن تقریریں، برطانوی جبر و استبداد کے سامنے خم ٹھونک کر ہر قسم کے نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر ان کی ہندوستان گیر جدوجہد، یہ وہ واقعات ہیں جنہیں کوئی شخص آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بلبل گلستانِ رسالت ﷺ تھے۔ اللہ رب العزت نے انہیں لحن داؤدی عطاء کر رکھا تھا۔ وہ جب اپنی تقریر کے دوران تلاوت قرآن مجید کرتے تو شجر و حجر وجد میں آجاتے۔ شاہ جی کا عربی فارسی اور اردو، کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہیں اردوو، فارسی اور عربی کے اساتذہ کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ الفاظ و معانی کا ایک سیلاب تھا جو ان کی تقریروں میں امڈا چلا آتا تھا۔ شاہ جی نے ابتدائی تعلیم اپنے ننہال کے ہاں عظیم آباد (پٹنہ) میں مکمل کی۔ عظیم آباد اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ اس کے چپہ چپہ پر تاریخ اسلام کے اوراق بکھرے ہوئے ہیں۔ عظیم آباد کی سرزمین نے بڑے بڑے ادباء فضلاء علماء اور شعراء پیدا کئے جن کے رشحات قلم نے ہمارے سرمایۂ ادب میں بے پناہ اضافہ کیا۔ شاہ جی کے ننہال کا گھرانہ خود علم و فضل کے میدان میں بہت شہرت رکھتا تھا۔ اس لئے شاہ جی پر اپنے ننہال کا ادبی اور علمی اثر ہمیشہ غالب رہا۔

آپ کے ددھیال کشمیر سے ہجرت کر کے گجرات میں آباد تھے۔ اور روحانی طور پر اس گھرانے کی بہت عزت تھی۔ آپ عظیم آباد سے گجرات اور پھر امرتسر میں آگئے۔ یہاں حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ سے حدیث کا درس لینے لگے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے حد ذہین تھے۔ انہوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے مفتی صاحب کا دل موہ لیا۔ ایک روز مفتی صاحب نے اپنے حلقۂ درس میں فرمایا۔

"عطاء اللہ شاہ مستقبل میں ایک تاریخی شخصیت ثابت ہو گا۔ اور ملت اسلامیہ کے مردہ قلوب میں زندگی کا نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا خون دوڑا دے گا۔"

حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف درست ہوئی۔ امیر شریعت سید عطاء

اللہ شاہ بخاری نے مسلمانانِ ہند کے قلوب میں نیا جوش، نیا ولولہ، نئی تڑپ پیدا کرنے میں جو عظیم کردار ادا کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں حریت کا قیمتی سرمایہ ہے۔

جب شاہ جی امرتسر کی مسجد خیر الدین میں پڑھا کرتے تھے ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد امرتسر کے اخبار "وکیل" کے مدیر اعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ آغا حشر عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ آغا حشر اپنے دور کے بہت بڑے مناظر تھے۔ وہ عظیم شاعر بلند پایہ ڈرامہ نویس ہی نہیں تھے بلکہ ایک شعلہ نوا مقرر اور جادو بیان خطیب بھی تھے۔

شاہ جی مولانا ابوالکلام آزاد کی ان دنوں کی جبکہ وہ "وکیل" میں مدیر تھے۔ تصویر کچھ اس طرح سے کھینچا کرتے تھے۔

"ایک سرو قد رعنا صورت، بڑی بڑی مدھ بھری آنکھوں کا نوجوان، لباس صاف ستھرا اور اجلا، اور اس کی نفاست طبع کا آئینہ دار، باتوں میں ٹھہراؤ اور قلم میں انگارے مضمر تھے۔ کسی مسئلہ پر بات کرو تو معلومات اور دلائل و براہین کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگے۔ خطابت کا شہنشاہ، تحریر کا دھنی، ایک عظیم شخصیت، دینی، علمی، ادبی، شعری، سیاسی، بین الاقوامی، اور بین المملکتی کوئی معاملہ ہو۔ اس پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتا کہ اس کا ہر الجھاؤ دور ہو جاتا اور اس کی ہر گتھی سلجھ کر سامنے آجاتی۔ علم و ادب کا یہ آفتاب پوری آب و تاب سے آسمانِ ہند پر چمکا۔ اس کے سامنے سب کی قندیلیں مدھم پڑ گئیں۔

وہ امام الہند تھا۔ اس کا مقام مذہب و سیاست میں بہت بلند تھا۔ وہ ایک گل شگفتہ تھا جس کی بو باس سے گلستان ملت کو تروتازگی ملی۔

ایک روز باتوں باتوں میں کہنے لگے

"میں نے آغا حشر کو اس عالم میں بھی دیکھا ہے۔ کہ وہ ایک بپھرے شیر کی طرح عیسائی، آریہ، سماجی اور دہریہ مبلغوں پر جھپٹتا۔ آغا حشر محمد شاہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ جب وہ تقریر کرتا تو الفاظ و معانی کے دریا بہا دیتا تھا۔ جب دلائل و براہین سے کام لیتا تو اس کے مخالف اس سے پناہ مانگتے۔ اسے مختلف مذاہب کی کتابیں از بر تھیں۔ اس نے آریہ سماجی اور عیسائی لٹریچر کا عمیق نظروں سے مطالعہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائی پادری اور آریہ سماجی اس کے مقابلے میں آنے سے کتراتے تھے۔ شکوہ یورپ کا یہ مخالف ہر طرف دندناتا پھرتا۔ کوئی مقابلہ پر نہ آتا۔ افسوس کہ حشر ایسا مناظر۔ خطیب، مقرر، محقق ڈراموں کی دلدلوں میں جا پھنسا۔ حشر جب تک زندہ رہا۔ ڈرامہ نویسی کی دنیا میں اس کا طوطی بولتا رہا۔ یقیناً وہ اپنے وقت کا شیکسپیئر اور کالی داس تھا"۔

شاہ جی ابھی حضرت مفتی محمد حسن کے حلقہ درس میں ہی شامل تھے کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی اور پھر

انگریزوں نے عراق، دمشق، فلسطین، اردن وغیرہ عرب ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ مشرق وسطی پر ہلالی پرچم کی جگہ تثلیث کا جھنڈا لہرانے لگا۔ مقامات مقدسہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اتحادیوں نے خلافت عثمانیہ کے لبادے کو تار تار کر دیا۔ ترک جو پانچ سو سال تک یورپ کے سینے پر مونگ دلتے رہے تھے۔ شکست کھا گئے۔ استنبول پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ عثمانی خلیفہ کی حیثیت ایک محکوم حکمران کی ہو کر رہ گئی۔ ان واقعات نے مسلمانوں کے قلوب میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کا ایک طوفان موجزن کر دیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی حقوق اور آزادی دینے کے سلسلہ میں جو وعدے جنگ کے دوران کئے تھے۔ وہ اپنے ان وعدوں سے منحرف ہو گیا۔ اس نے ہندوستانیوں کی وفاداری اور قربانی کا یہ صلہ دیا کہ ملک میں رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص جو سلوک کیا اس کے نتیجہ میں سارے ملک میں حکومت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان مظاہروں نے شدت اختیار کی تو جلیانوالہ باغ کا خونی واقعہ رونما ہوا۔ مسلمانوں نے احیائے خلافت کے سلسلہ میں تحریک شروع کی اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام مقامات مقدسہ کو مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ ترکی اور عرب ممالک سے اتحادی فوجوں کو نکال لیا جائے اور ترکی اور عرب ممالک کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے۔

تحریک خلافت کو چلانے کے لئے ملک میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ خلافت کمیٹی میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، عبدالرحمن صدیقی، سید راغب احسن اور مولانا ثناء اللہ پانی پتی۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور صوفی غلام محمد فرنگی محل سب ہی شامل تھے۔ یہ تحریک آندھی کی طرح اٹھی اور طوفان کی طرح پورے ملک میں چھا گئی۔ مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کی تو گاندھی جی نے جو جنوبی افریقہ سے ہندوستان آنے کے بعد گوکھلے تلک اور سی آر داس ایسے لیڈروں کی قیادت کے گھروندے گرانا چاہتے تھے۔ ملک میں عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔ ترک موالات اور خلافت تحریک کے الحاق نے برطانوی حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

تحریک خلافت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری میدان سیاست میں تشریف لائے۔ انہوں نے مسجد خیر الدین میں ایک زناٹے دار تقریر کی۔ ان کی تقریر کیا تھی ایک لاوا تھا، جس نے ہر طرف آگ لگا دی۔ ان کی دوسری تقریر موچی دروازہ کے باغ میں ہوئی۔ اس جلسہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، مولانا ظفر علی خاں، نے بھی تقریریں کیں۔ یہ وہ رہنما تھے جن کی خطابت پر کوئی شخص انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جن کی خطابت مسلم تھی لیکن جب ان تقریروں کے بعد سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر شروع کی تو ہر شخص شاہ جی کو حیرت کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ گورے چٹے رنگ اور دوہرے بدن کا ایک نوجوان تھا جس نے چوڑی آستینوں کا کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا اور تہبند زیب تن تھا۔ سر پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں ایک ڈنڈا

تھا۔

تلاوت قرآن مجید کرنے کے بعد جب شاہ جی نے تقریر شروع کی تو ان کے ایک ایک فقرہ پر ساری فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ انہوں نے برطانوی سامراج کے بخیے ادھیڑ کر رکھدئے۔ اس تقریر کے بعد شاہ جی کی دھاک بڑے بڑے لیڈر بھی مان گئے۔ اوران کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں ہونے لگا۔

تحریک خلافت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں نے نہ صرف پنجاب اور سرحد میں بلکہ پورے ہندوستان میں آگ لگا دی۔ علمائے فرنگی محل نے ان دنوں فوج اور پولیس کی نوکری حرام کا فتوی دیا۔ یہ تحریک انتہائی پرجوش تھی۔ اس کی وجہ سے طلباء نے سرکاری سکول اور کالج ترک کر دیئے، وکلاء نے پریکٹس چھوڑ دی۔ پولیس اور فوج کے سینکڑوں افسروں اور سپاہیوں نے ملازمت ترک کر دی۔ اپنے زمانہ میں شاہ جی کی تقریر سے متأثر ہو کر چودھری افضل حق نے جو پولیس میں ایس ایچ او تھے۔ ملازمت سے استعفی دیدیا اور تحریک میں شامل ہو گئے۔

چودھری افضل حق اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے میدان سیاست میں لانے کا سہرا شاہ جی کے سر ہے۔ جن کی تقریر نے مجھے گرویدہ کر کے اسلام اور ملک وملت کا شیدائی بنا دیا۔

تحریک خلافت میں شاہ جی کو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ان کے خلاف اس تحریک کے دوران اور بھی مقدمات چلائے گئے لیکن سزا صرف ایک مقدمہ میں ہوئی۔

تحریک خلافت اور ترک موالات کے بعد ملک میں ہندو مہاسبائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کر دیں۔ راجپال، سوامی شردھانند، بھولا ناتھ اور ناتھورام نے لاہور، دہلی، کلکتہ اور کراچی سے ایسی کتابیں شائع کیں جن میں مسلمانوں کے آقا و مولا رسول خدا ﷺ کی شان اقدس میں گستاخیاں کی گئی تھیں۔ شاہ جی عاشق رسول ﷺ تھے۔ وہ بھلا یہ کب برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے دہلی دروازہ کے باہر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ زبان گدی سے نکال لی جائے گی جو میرے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرے گی۔ مہاشاؤں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی کتاب اور مضامین کی اشاعت کر کے آگ کے شعلوں سے کھیل رہے ہیں۔ مسلمان ہر چیز برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے آقاؤ مولا کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا"۔

آپ نے اس جلسہ میں اپنی ٹوپی کو ہاتھ میں لے کر فرمایا۔

"ہندو فطرتاً غلام واقع ہوا ہے۔ وہ ایک ہزار سال سے غلام چلا آرہا ہے۔ وہ آزادی کا تصور تک نہیں لاسکتا لیکن مجھے تو آج بھی اپنی اس دوپلی سے بادشاہت کی بو آرہی ہے"۔ پھر فرمایا

"ہندو اور مسلمان کے درمیان اتحاد کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہندو جس گائے کو اپنی ماتا مانتا ہے۔ اس کے پیشاب کو پوتر سمجھتا ہے۔ میں اس کو کھروں تک چبا جاتا ہوں۔ ہندو کی تہذیب الگ،

تمدن الگ، مذہب الگ وہ ہزاروں بتوں کو پوجتا ہے۔ وہ شولنگ کے سامنے ماتھا رگڑتا ہے لیکن میں توحید کا علمبردار ہوں۔ میں ایک خدا کا پجاری ہوں۔ بت پرستی اور توحید کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ ظلمت اور روشنی میں کبھی ملاپ نہیں ہو سکتا۔

ہم مسلمان، بت شکن محمود غزنوی اور اورنگ زیب عالمگیر کی روایات کے حامل ہیں۔ ہندو یہ کیوں بھول گیا کہ اس نے ایک ہزار سال تک ہمارے آستانہ جلال پر خاصیہ فرسائی کی ہے یہ قوم جو ڈولے دے کر جاگیر داری کی بھیک مانگتی رہی ہے۔ آج مسلمانوں کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔ ان کی زبان درازیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ مسلمانوں کے آقا و مولا ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرنے کی جرأت کر رہی ہے۔ یاد رکھو وہ ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے جو مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کے خلاف قلم کو جنبش میں لائیں گے۔ وہ زبان کاٹ لی جائے گی۔ جو ہمارے آقا و مولا کی شان میں گستاخی کرے گی۔

شاہ جی کو اس تقریر کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا اور دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

سائمن کمیشن کی آمد کے بعد ملک کی سیاست نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ ان ہی دنوں پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے سلسلہ میں ایک دستاویز شائع کی۔ جسے نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اس رپورٹ کو مسلمانوں کے لئے ضرر رساں قرار دیا اور نہایت واضح طور پر یہ کہا کہ نہرو ایسی رپورٹ پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت ہی انگریز کی صحیح جانشین ہے۔ ہندو مسلمانوں کو اجیر اور اچھوت بنانے کی سازش کر رہے ہیں۔ ان دنوں مجلس خلافت دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک کی قیادت علی برادران کے ہاتھوں میں تھی۔ دوسری طرف پنجاب کے خلافتی لیڈر تھے۔ جنہیں علی برادران ہمیشہ پنجابی ٹولہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ پنجابی ٹولی نے جس میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری عبدالعزیز بیگو والوی، چودھری افضل حق، مولانا عبدالقادر قصوری، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، وغیرہ شامل تھے۔ نہرو رپورٹ کو تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد پنجاب میں سخت ہنگامے ہوئے۔ نہرو رپورٹ کے حق میں اور مخالفت میں جلسے ہوئے۔ مظاہرے ہوئے۔ ان ہنگاموں کے بعد لاہور میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس دریائے راوی کے کنارے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس سے قبل پنجاب کے خلافتی مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں جہازی بلڈنگ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں ایک جلسہ منعقد کر کے مجلس احرار اسلام قائم کر چکے تھے۔ کانگریس کے اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کو دریا برد کر دیا گیا اور مکمل آزادی کی قرار داد منظور کی گئی۔ جس کی تائید میں سردار عبدالرب نشتر، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مسز سروجنی نیڈو کی ہمشیرہ مسز نمیکر نے جو

سوشلسٹ لیڈر تھیں بڑی زور دار تقریریں کیں۔ ملک میں تحریک نمک سازی شروع ہوئی تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری دو سال کے لئے پھر جیل بھیج دیئے گئے لیکن گاندھی اروِن سمجھوتہ کے تحت دوسرے لیڈروں کے ساتھ ایک سال کے بعد رہا کر دیئے گئے۔

کراچی کانگرس کے اجلاس میں مولانا ظفر علی خان کے اس مطالبہ کی بنا پر کہ اگر گاندھی جی کی پرارتھنا کے لئے کانگرس کا اجلاس ملتوی کیا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز کے لئے کانگرس کا اجلاس ملتوی کیا جائے۔ مولانا ظفر علی کے اس مطالبہ کو ہندو لیڈروں نے ماننے سے انکار کر دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ فرمایا کہ جس شخص کو نماز پڑھنا ہو وہ اجلاس سے باہر جا کر نماز ادا کر سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ان الفاظ سے پنجاب کے احرار بھڑک اٹھے۔ مولانا ظفر علی خاں اجلاس سے واک آوٹ کر گئے۔ مولانا آزاد نے مولانا ظفر علی خاں کے جانے کے بعد احرار لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن شاہ جی اور چودھری افضل حق نے کانگرسیوں کی اس ذہنیت کے خلاف بطور احتجاج کانگرس سے استعفی دیدیا اور مجلس احرار اسلام من حیث الجماعت کانگرس سے الگ ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد اسلامیہ کالج حبیبیہ ہال لاہور میں احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین نے بڑی زور دار تقریریں کیں۔ اس اجلاس میں مسلمانوں کے جداگانہ طریق انتخاب کی قرارداد منظور کی۔

کشمیر میں ڈوگروں کے مظالم اور فائرنگ کی وجہ سے درجنوں مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے خانقاہ معلی میں داخل ہو کر ڈوگروں نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی۔ اس واقعہ نے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔ مظلومین کشمیر کی امداد کے لئے کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی پر مرزائیوں کا قبضہ تھا۔ علامہ محمد اقبال نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی فہمائش، ترغیب و تحریک پر اس کمیٹی کی شدید مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ مرزائی ایک الگ فرقہ ہے اسے مسلمانوں کے معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کشمیر کمیٹی میں ان کی موجودگی ملت اسلامیہ ہندیہ کے وسیع تر مفاد اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کے منافی ہے۔ مرزائی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور کشمیریوں میں مرزائیت کی تبلیغ کر کے انہیں مرتد بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ موچی دروازہ کے باہر برکت علی محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں مرزائیوں کو کشمیر کمیٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد انجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی مرزائیوں کا اخراج عمل میں لایا گیا۔ اس جلسہ میں شاہ جی نے ساڑھے تین گھنٹے تقریر کی۔ جس کی وجہ سے مرزائیوں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں مسلمانوں پر واشگاف ہو گئیں۔

تحریک کشمیر (۱۹۳۰ء) شروع ہوئی اور ہزاروں احرار رضاکار جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ درجنوں احرار سرخپوش اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی کے لئے شہید ہوئے جن میں چنیوٹ کے شیخ الٰہی بخش بھی شامل تھے۔ جن کی شہادت نے مسلمانوں میں قربانی و ایثار کا نیا ولولہ اور جذبہ پیدا کیا۔ وہ اس تحریک کے پہلے شہید تھے۔ تحریک کشمیر کے زمانے میں شاہ جی کو دہلی کی جامع مسجد میں ایک تقریر کی بنا پر گرفتار کر کے اڑھائی

سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

کمیونل ایوارڈ کے نفاذ سے مسلمان ناراض تھے اور اسے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کو مسلط کرنے کی ایک برطانوی سازش قرار دے رہے تھے۔ کانگرس نے انتخابات میں حصہ لے کر چھے سات صوبوں میں وزارتیں بنا لی تھیں۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک رکھا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب اور روایات میں مداخلت کی جا رہی تھی۔ اور پنڈت نہرو ایسے لیڈر انگریزوں کو للکار رہے تھے کہ انگریزوں نے اختیارات حکمرانی منتقل کرنے ہیں تو وہ کانگرس کو کرنے ہوں گے۔ کیونکہ کانگرس ہی اس ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس سے واضح تھا کہ پنڈت نہرو کہہ رہے تھے کہ اختیاراتِ حکمرانی ہندوؤں کو منتقل کئے جائیں۔ نہرو کی اس دھمکی نے مسلمانوں کو خبردار اور ہوشیار کر دیا۔

پھر مسٹر محمد علی جناح کو لندن سے بلایا گیا اور لکھنو کی آل پارٹیز کانفرنس میں انکو لیڈر تسلیم کر لیا گیا اور ملک میں مسلم لیگ کی تحریک شروع ہو گئی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک میں مجلس احرار اسلام کا یہ مؤقف تھا کہ پہلے ہندوستان کو آزاد کرایا جائے پھر ہندوؤں سے نپٹا جائے تقسیم میں انگریز کو فیصل تسلیم کیا جائے۔ لیکن قلبی اور ذہنی طور پر ان کا مؤقف واضح تھا کہ جو قوم گائے کو ماتا سمجھتی ہو اور اس گائے کو میں کھروں تک چبا جاؤں اس قوم کے ساتھ میرا اتحاد ناممکن ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شاہ جی نے تحریک پاکستان کی مخالفت میں اپنی تقریروں میں اظہار خیال کیا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد واقعات نے ثابت کر دیا کہ شاہ جی وطن عزیز پاکستان کی سرزمین سے کس قدر محبت رکھتے تھے۔

۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء میں جب پنڈت نہرو نے پاکستان کی سرحدات پر فوجیں جمع کر دیں اور پاکستان کی آزادی کے لئے شدید خطرہ پیدا ہو گیا تو نے احرار کانفرنس کے اجلاس میں جو دہلی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا۔ تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"پاکستان بن چکا ہے اب اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ یہ میرا وطن ہے اس کا ذرہ ذرہ میرے نزدیک مقدس ہے۔ اس کی حفاظت میرا جزو ایمان ہے۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو وطن عزیز پاکستان کی آزادی کی حفاظت میں لڑنے والوں میں سب سے آگے سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہو گا۔ اس مقدس سرزمین کی آزادی کی حفاظت میں جس شخص کا سب سے پہلے خون بہے گا وہ عطاء اللہ شاہ بخاری ہو گا۔"

آپ نے اعلان کیا کہ پوری قوم لیاقت علی خاں کے ساتھ ہے۔ آپ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ سربکف اور کفن بردوش ہو کر پاکستان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور اگر دشمن حملہ کرے تو اس کا منہ پھیر دیں۔"

شاہ جی جب تک زندہ رہے انہوں نے پاکستان کی خوشحالی، استحکام اور سربلندی کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ شاہ جی نے مجموعی طور پر ساڑھے نو سال جیل کاٹی۔ علامہ انور شاہ قدس سرہ آپ کو بلبل ریاض رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ مرزائیت کے خلاف شاہ جی تمام عمر مصروف رہے۔ اس سلسلہ میں آپ کے خلاف مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ چلا اور اس مقدمہ میں کھوسلہ نے تاریخی فیصلہ دیا۔ اس کے علاوہ مرزائیت کے خلاف تحریکوں میں آپ کے خلاف تین چار ایسے مقدمات چلائے گئے جن میں عمر قید اور پھانسی کی سزائیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن آپ ان مقدمات سے بری ہو جاتے رہے۔ آخری دفعہ آپ خواجہ ناظم الدین کی وزارت (۱۹۵۳ء) کے عہد میں تحریک تحفظ ختم نبوت میں دوسرے علماء کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ بعض چودہ چودہ سال قید کی سزا دی گئی لیکن سال ڈیڑھ سال کے بعد آپ کو دوسرے علماء کے ہمراہ باعزت طور پر چھوڑ دیا گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب طریقت تھے اکثر کہا کرتے تھے کہ میں حضرت پیر مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ گولڑوی کا مرید ہوں۔ روحانی طور پر مجھے ان سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے اپنا تعلق بیعت شیخ المشائخ حضرت عبدالقادر رائپوری قدس سرہ سے جوڑ لیا۔ اور پھر تاحیات انہیں سے منسلک رہے۔ میانوالی، مظفر گڑھ، ملتان اور ڈیرہ غازی خاں میں آپ کے ہزاروں مرید تھے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ امرتسر سے ہجرت کر کے ملتان آ کر آباد ہو گئے۔ ملتان سے انہیں محبت تھی اور اکثر ملتان کے متعلق کہا کرتے تھے۔

"ملتان ولیوں، قطبوں اور عالموں کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین پر محمد بن قاسم کے قدم آئے اور اسلام کا جو پہلا لشکر برصغیر میں محمد بن قاسم کے ہمراہ آیا۔ اس نے ملتان ہی میں اپنا ڈیرہ جمایا۔ اس میں کئی بزرگ بہت مرتبہ کے تھے جن کے نقوشِ کف پا کے نشان مجھے آج بھی نظر آ رہے ہیں۔"

"ملتان سے مجھے محبت ہے اس کا ماحول بالکل ایسا ہے جیسا عرب کا ہے۔ دور تک پھیلی ہوئی قبریں، کھجوروں کے جھنڈ، اولیاء اللہ کے مقابر، غازیوں اور مجاہدوں کے مزارات مجھے اسلام کے قرن اول کی یاد دلاتے ہیں۔ جب ہم کشور کشائے عالم بن کر عرب کے ریگزاروں سے نکلے تھے اور ہمارا سیل رواں کسی سے تھم نہ سکا تھا۔

"ملتان کی سرزمین ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جب اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو تو تمام جغرافیائی وابستگیاں بھول جاؤ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ وسیع دنیا مسلمانوں کی میراث ہے۔

عبداللہ ملک

آفتابِ خطابت

بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے۔

یہ دلفریب موسم تھا، سورج کی کرنوں کی چبھن کم ہو رہی تھی شاموں کا حسن نکھر رہا تھا، ان ملگجی شاموں کو باغوں اور پارکوں میں ہجوم بڑھنے لگا تھا، سبزہ پھوٹ رہا تھا، ہریالی آ رہی تھی ٹنڈمنڈ درختوں پر پتے پھر سے نمودار ہو رہے تھے۔ باغوں اور میدانوں میں خوشبوئیں پھیلنی شروع ہو گئیں تھیں۔ مجھے آج ایک ایسے ہی موسم اور ایسے ہی دنوں کی بات کرنی ہے۔

آج بھی یہ موسم آتا ہے، آج بھی کونپلیں پھوٹتی ہیں، ہریالی آتی ہے۔ آج باغوں اور پارکوں میں سرشام لوگوں کے ہجوم جمع ہوتے ہیں تاکہ وہ اس حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن جو بات میں بتانا چاہتا ہوں وہ بات اب نہیں ہوتی۔

ان نئی بہاروں پر، ان نئے نظاروں پر
اک رند ہی کے رو رہے ہیں میخانے

بہت برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں کی یاد کو سینے میں دبائے ایک مدت گزر گئی ہے۔ اب بھی جب یہ دن یاد آتے ہیں تو جذبات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ماضی کی ان یادوں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے۔

ایسے ہی موسم میں جب شاموں کا حسن نکھر آیا تھا اور راتیں خنک ہونی شروع ہو گئی تھیں تو قادیان میں مجلس احرار نے تبلیغ کانفرنس (اکتوبر ۱۹۳۴ء) کے انعقاد کا اعلان کیا تھا۔ صرف انعقاد کا اعلان اور وہ بھی مجلس احرار کی طرف سے ایک زبردست ہنگامے کو دعوت تھی۔ آج اتنے برس گزرنے کے بعد شاید نئی پود ان ہنگاموں کو سمجھ ہی نہ سکے اور نہ ہی کوئی مؤرخ بیان کرنے کے لئے تیار ہو۔ لیکن اس کے باوجود خطابت کی تاریخ اور شعلہ نوائیوں کی داستان میں یہ کانفرنس اپنا عنوان ڈھونڈ کر ہی رہے گی۔ ہاں تو جن دنوں اس کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا۔ اس وقت پنجاب میں مجلس احرار کا طوطی بول رہا تھا۔ اس شعلہ بیان خطیبوں کی جماعت نے مسلمانان پنجاب کو بہت حد تک متاثر کر لیا تھا۔ یہ کشمیر چلو تحریک کا معرکہ سر کر چکے تھے۔ سر فضل حسین کی پوری کامیابیوں اور کامرانیوں کے باوجود مسلمانوں کے درمیانی طبقے میں مجلس احرار انکی ساکھ پر ایک گہری چوٹ لگا چکی تھی۔ غرضیکہ چاروں طرف شہر اور قریہ میں ان شعلہ نواؤں کے چرچے تھے۔ میں بھی ان چرچوں سے متاثر تھا۔ نویں جماعت کا طالب علم مولانا داؤد غزنوی کے خطبوں سے شدید طور پر

متاثر، احرار کے جلسوں کا رسیا، اب یہ موقع کیسے کھو سکتا تھا چنانچہ کچھ بزرگ دوستوں کے ساتھ قادیان روانہ ہو گیا۔

اب اڑسٹھ برس بعد میں یہ یادیں دھندلا گئی ہیں صرف امیر شریعت کے الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں، کہ قادیان میں ایک ہجوم تھا۔ جس کو، یہ قریہ جس نے "نبوت" کو تو سنبھال لیا لیکن وہ امیر شریعت کے چاہنے والوں کو سمیٹنے سے قاصر تھا، کوئی گاڑی، کوئی بس، کوئی بیل گاڑی، کوئی ٹم ٹم، کوئی تانگہ، کوئی سائیکل ایسی نہ تھی۔ جو قادیان کی طرف نہ آ رہی ہو، اور رضا کار دنوں پہلے پیدل چل دیئے تھے۔ جیسے جیسے یہ مختلف دیہات میں گزرتے دیہات والے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے اور قادیان پہنچتے پہنچتے یہ خود ایک جلسہ بھی ہوتے اور ایک جلوس بھی۔ یہ پہلی تحریک تھی جس نے یہاں کے مسلمانوں کے دونوں جذبوں کو بیک وقت متاثر کیا، ان کے نعرے ان کے جذبۂ عشق رسول ﷺ کو بھی متاثر کرتے تھے اور ان کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی کے جذبے کی بھی ان نعروں سے تشفی ہوتی تھی۔

اس کانفرنس کا انعقاد اکتوبر ۱۹۳۴ء کے تیسرے ہفتے میں ہوا اور ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر کی تاریخوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے لئے ایک سکھ زمیندار کی اراضی حاصل کی گئی تھی اس زمیندار کا نام ایشر سنگھ تھا، اس اراضی پر پنڈال بھی تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن مرزائیوں نے اس اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اب احراریوں کے لئے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا تو وہ اس اراضی کے لئے لڑتے یا پھر شہر سے دور کانفرنس منعقد کرتے۔ احرار نے جھگڑا کرنے سے گریز کیا، کیونکہ اس وقت مرزائیوں کے ان ارادوں کو بھانپتی تھی چنانچہ اس اشتعال کے باوجود مجلس احرار نے ایشر سنگھ کی اراضی پر کانفرنس منعقد نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے بعد قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ڈی۔ اے وی سکول کے پہلو میں پنڈال تیار کیا گیا۔

کانفرنس سے دو دن پہلے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار نے قادیان سے خبر بھیجی تھی جس میں اس کانفرنس کے خدوخال اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"مجلس احرار اکیس، بائیس اور تیئیس اکتوبر کو ایک تبلیغی کانفرنس قادیان میں منعقد کر رہی ہے۔ اس کانفرنس کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مرزائیوں کی طرف سے مسلسل یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ اس کانفرنس سے انکا جان و مال خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ مرزائیوں نے اپنی حفاظت کے لئے لاتعداد دیہاتیوں کو اور اپنے مریدوں کو قادیان میں جمع کرنا شروع کر دیا ہے ادھر احرار کی اس کانفرنس میں بیس سے لے کر پچاس ہزار کا ہجوم پہنچا ہے۔ مزید براں کانفرنس کے منتظمین کا مطالبہ ہے کہ ان کو کانفرنس کے صدر کا جلوس نکالنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اور یہ جلوس قادیان شہر میں سے گزرے۔

اس کانفرنس کے پیش نظر آج صبح پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس خود بہ نفسِ نفیس

قادیان آئے۔ ان کے ہمراہ پولیس کی بھی ایک بھاری جمعیت تھی۔ چنانچہ انسپکٹر جنرل پولیس نے کانفرنس وغیرہ کا موقع دیکھا اور احکام جاری کر دیئے گئے ہیں کہ اگر اس کانفرنس کے دوران میں قادیانیوں نے کوئی اجتماع منعقد کرنے کی کوشش کی تو یہ اجتماع خلاف قانون تصور ہوگا۔ انسپکٹر جنرل نے احراریوں اور ان کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو بھی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ کانفرنس میں کسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ حتی کہ لاٹھیوں کو ساتھ لانے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مزید برآں کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے لوگوں کے لئے ایک خاص راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ نیز اگر کسی قسم کا جلوس نکالا جائے تو اسے شہر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج شام تک قادیان میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے چار سو پولیس کے سپاہی پہنچ جائیں گے لیکن میرا اندازہ یہی ہے کہ یہ تمام پیش بندیاں بالکل غیر ضروری ہیں کیونکہ احراری ہر حالت میں کسی قسم کے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہتے ہیں۔ انکی کانفرنس کا پنڈال ڈی۔ اے۔ وی سکول میں بننا شروع ہو گیا ہے۔ اور ارد گرد کے تمام علاقے میں ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ مزید لاٹھیاں نہ لانے کی بھی منادی کرادی گئی ہے۔"

اس اقتباس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پورے پنجاب میں اس کانفرنس کے کس قدر چرچے تھے اور کتنے گوشوں سے اس کانفرنس کی کامیابی اور ناکامی کی خبروں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اس فضا میں یہ کانفرنس ہوئی اس کے صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ چنانچہ رات جب اپنا پورا سایہ ڈال چکی، لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوچکے تو صدر کانفرنس سید عطاء اللہ شاہ بخاری تشریف لائے۔ ہزارہا انسان کا ہجوم اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی پنڈال میں آمد اور کون سید عطاء اللہ شاہ بخاری ملتان کی سرزمین میں دفن ہونے والا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہیں، وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہیں جس کی زبان گنگ ہو گئی تھی، جس کے چہرے کا جھریوں نے احاطہ کر لیا تھا جس کے بالوں میں بڑھاپے کی سفیدی آ گئی تھی، یہ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جن کا شباب اور شعلہ بیانی دونوں اپنے عروج پر تھے، جو لاؤڈ سپیکر کے بغیر لاکھوں کے ہجوم کو مسخر کر سکتا تھا، جس کا حسن اور بیان دونوں الگ الگ جادو جگاتے تھے۔ پچاس ہزار کا مجمع، رات کی خاموشی، قمقموں کی روشنی اور اتنے میں حسن و نور کے پیکر، شعلہ بیان خطیب اور شریعت کے امیر کی آمد

تم آ گئے تو از سر نو زندگی ہوئی

بس پھر کیا تھا مجمع میں کہاں ایک خاموشی اور ہو کا عالم تھا کہ اب وارفتگی اور دیدار یار کی بے تابی نے سب کو آن گھیرا ہے اور اس بے تابی اور وارفتگی کا اظہار نعروں کی گونج میں ہوتا ہے، شاہ جی ہیں کہ مسکراتے ہوئے مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اسٹیج پر پہنچے، چاروں طرف نگاہِ مست انداز میں دیکھا بس

پھر کیا تھا نعروں کا ایک اور سیل ٹوٹ پڑا۔ اور امیر شریعت فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے ہیں۔ مجمع خاموش ہوا۔ تلاوت ہوئی نظم ہوئی۔ اب سے اڑسٹھ برس پہلے کی تفصیلوں کو دہرائیے اور انہی تفصیلوں کو جن پر شاہ جی کی تاریخی تقریر کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہوں، شاہ جی نے یہی کوئی نو ساڑھے نو بجے تقریر شروع کی ہوگی اور رات تھی کہ وہ بھی دم بخود گزرے جا رہی تھی لیکن شاہ جی کی شعلہ بیانی بڑھتی جا رہی تھی، اس شعلہ بیانی اور آتش نوائی کو قدم قدم پر نعروں، قہقہوں اور آنسوؤں کے ذریعے خراج عقیدت پیش ہو رہا تھا۔ یہی وہ تقریر تھی جس میں شاہ جی نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔

"تم اپنے بابا کی "نبوت" لے کر آؤ اور میں اپنے نانا کی نبوت لے کر آتا ہوں تم حریر و دیبا زیب تن کر کے آؤ اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق کھدر پہن کر آؤں۔ تم یاقوتی اور پلومر کی شراب کے خم لنڈھا کر آؤ اور میں روکھی سوکھی روٹی کھا کر آؤں اور پھر زمانہ فیصلہ کرے کہ کون سچے نبی کی اولاد ہے۔"

یہ تقریر جو رات کی خاموشی میں شروع ہوئی تھی۔ جو عشاء کی نماز کے بعد جب ابھی رات کا آغاز تھا لوگوں نے سننی شروع کی تھی۔ یہ تقریر پوری رات ہوتی رہی اور مجمع بیٹھا رہا۔ ایک بھی ذی نفس ایسا نہیں تھا جس نے تھکن کا اظہار کیا ہو، جس کے چہرے سے اکتاہٹ کی غمازی ہوئی ہو۔ اتنے میں صبح کا نور پھیلنا

شروع ہو گیا۔ اور مؤذن نے اذان دے دی۔ تقریر تھی کہ اس وقت بھی اپنے عروج پر تھی لیکن موذن نے اس سیل رواں کو روک دیا اور خطابت کے دریاؤں کو بند مار دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں بہت کم خطیب اور مقرر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے رات رات بھر تقریر کی ہو جنھوں نے لوگوں کو اس قدر مسحور کیا ہو جیسا کہ امیر شریعت نے کیا ہے۔ کوئی آیا نہ آئے گا لیکن

کیا کریں گر نہ انتظار کریں

اور غالباً اسی موضوع کو حسرت موہانی نے کہا تھا۔

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں

خرابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں

آج تقریباً صدی گزرنے کے بعد جب ہم اس عظیم ہستی کی یادیں سمیٹ رہے ہیں تو کچھ حلقوں میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ آخر یہ ہستی اتنی اہم کہاں تھی کہ اسکی یاد میں آنسو بہائے جائیں، صفحات سیاہ کئے جائیں اخبارات اور رسالوں کے نمبر نکالے جائیں۔ آخر احرار یا بخاری نے کون سے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ کہ انکے کارناموں کی فہرست افتراق و انتشار انگیز تحریکوں سے بھری پڑی ہے۔ اس لئے انکو دوبارہ ہوا دینا کہاں کی خدمت اور کہاں کی نیکی ہے۔

یہ سب سوالات آج کل بہت سے حلقوں میں اٹھائے جا رہے ہیں کہ ان سوالات کے جواب دیئے جائیں تا کہ تاریخ کی گرہیں کھل سکیں۔ اور جن تحریکوں کو افتراق و انتشار کا مظہر بتایا جاتا رہا ہے۔ یا آج بتایا جا رہا ہے اس کے متعلق مورخ کو مواد مل سکے۔

مجھے اس صحبت میں صرف ایک مختصر سے سوال کا جواب دینا ہے۔ یہ سوال پچھلے پچاس ساٹھ برس سے اٹھایا جا رہا ہے کہ قادیانیوں یا احمدیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں میں افتراق پھیلنے کے مترادف نہیں ہے......؟ ایک اور طبقے کی طرف سے بھی یہ سوال اٹھایا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی سیاست کو مذہب کا تابع بنایا جا رہا ہے۔ اور اس طرح غلط اقدار اور رجعت پسند نظریات کو شہ دی جا رہی ہے؟ ان سوالوں کا جواب تفصیل چاہتا ہے اور ان کا جواب پچھلے پچاس برس کی تحریکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک بات واضح ہے کہ قادیانیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں کی ایک بہت اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سامراج دشمن تحریک تھی اور پنجاب میں سامراج اور اس کے مسلمان خلیفوں کو شکست دینی اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک قادیانیوں کا طلسم نہ توڑا جاتا اور عوام کو انکی اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا جاتا۔ باقی دوسرے سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ سامراج اور رجعت پسند طاقتیں اکثر و بیشتر غلط مذہب اور لوگوں کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے اثر کو عوام میں پھیلاتے ہیں اس لئے سامراج دشمن تحریکوں اور جماعتوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سامراج کی ان سازشوں کو بھی بے نقاب کریں۔ اور آج یہ حقیقت ہے کہ پنجاب میں اس وقت میں مجلس احرار نے سامراج کی اس سازش کو بے نقاب کیا تھا۔ اس سلسلے میں تاریخ لکھنے والوں کو بہر حال توجہ کرنی چاہیئے۔

امیر شریعت کی اس تقریر کی بنا پر ۱۵۳ الف کے تحت ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور ان پر مقدمہ چلا اور ان کو ماتحت عدالت نے سزا سنا دی لیکن جی۔ ڈی۔ کھوسلہ جو ان دنوں گورداسپور میں سیشن جج تھے نے امیر شریعت کی سزا کو گھٹا کر تا برخاست عدالت تک رہنے دیا اور اپنے فیصلے میں قادیانیوں کے متعلق بہت ہی سخت تجزیہ کیا۔ اور قادیانیوں نے قادیان میں اپنے مخالفین پر مظالم کو تسلیم کیا۔ اس فیصلے پر زبردست لے دے ہوئی اور قادیانیوں نے بالاخران ریمارکس کو حذف کروانے کے لئے ہائیکورٹ کی طرف رجوع کیا۔ یہ مقدمہ بذات خود ایک داستان ہے۔ اسے کسی اور وقت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزم تیرا کوہ کن، جرأت تری باطل شکن

باغِ ملت پر ہے طاری کیوں خزاں کا سا اثر کیوں فسردہ ہر جوان و پیر آتا ہے نظر
آنکھ کیوں ہر فردِ امت کی نظر آتی ہے تر گُم نظر آتا ہے اپنی بے خودی میں ہر بشر
آرہی ہے یہ ہر اک جانب سے کانوں میں خبر
کر گئے ہائے بخاری آج دنیا سے سفر

عمر گزری جس کی جیلوں اور ریلوں میں تمام کر دیا زیر و زبر افرنگ کا جس نے نظام
حفظِ ناموسِ رسالت میں گزارے صبح و شام بادۂ توحید کے بھر بھر دئے امت کو جام
کر لیا بے خدمتِ دیں نفس پر جینا حرام
تھا مسلمانوں کے ہر طبقے میں جس کا احترام

آلِ و اصحابِ نبی کی آن و حرمت کے لئے زندگی بھر دشمنانِ دین سے لڑتے رہے
جتنے فتنے ہند و پاکستان کے اندر اٹھے اے بخاری تو نے سب کے سر کچل کر رکھ دئے
جس طرف بھی قادیانی غول کے پیچھے بڑھے
دُم دبا کر بھاگ نکلے قادیانی بُوزنے

جب کبھی تقریر فرماتے کسی موضوع پر بے تکلف بولتے رہتے اسی پر رات بھر
اٹھ کے جانے کا نہ لیتا نام کوئی تا سحر کر دیا ہو جیسے جادو آپ نے پنڈال پر
تجھ کو بخشی تھی خدا نے دولتِ حسنِ کلام
اے علم بردار ختمُ الانبیا تجھ پر سلام

بُو تُرابی خون تھا تیری رگوں میں موجزن دیکھ کر تجھ کو عدو کا کانپ جاتا تھا بدن
عزم تیرا کوہ کن جرأت تری باطل شکن مسکراہٹ تھی لبوں پر ہر گھڑی جلوہ فگن
زندگی بھر پرچمِ اسلام لہراتا رہا
قلبِ مسلم جوشِ ایمانی سے گرماتا رہا

سرور میواتی لاہور

سلیم تابانی

وہ مردِ درویش

نہ جانے میں کس خیال میں تھا کہ خطیب جادو بیان اور مقرر شیوہ نوا رئیس الاحرار امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر سن کر ایک بیکراں سکوت کے عالم اور ہیبت ناک سناٹے کے سمندر میں کھویا ہوا جب شاہ جی کی زندگی کے چالیس سالہ شبانہ روز رفیق شیخ حسام الدین کی طلب میں نکلا۔ کہ شاہ جی کے انتقال کی خبر کی تصدیق کر سکوں تو مجھے گوالمنڈی کے میلاد النبی ﷺ کی تقریب کے لئے سجے ہوئے در و دیوار اور جیسے کسی میلے میں شریک انسانوں کی بھیڑ بھی ایک شہرِ خموشاں محسوس ہوئی مجھے یوں لگتا تھا جیسے لوگوں سے آج ان کی قوتِ گویائی اور طاقت بیانی چھین لی گئی ہے۔

شاہ جی کے دیرینہ رفیقوں میں شیخ حسام الدین کو ایک خاص درجہ حاصل ہے وہ کم و بیش چالیس سال شاہ صاحب کے رفیقِ زندگی رہے ہیں۔ اور اس اثنا میں بہت کم لمحے آئے ہیں جب دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہوں۔ ان دونوں بزرگوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جنگ کرتے ہوئے متعدد بار جیل کی کال کوٹھڑی کو رونق بخشی۔ لیکن شیخ صاحب کے قول کے مطابق ان کی زندگی میں صرف چار مواقع ایسے آئے ہیں جب انہیں زنداں کے در و دیوار میں بھی شاہ جی کی مصاحبت نصیب رہی ہے۔

۱۸ اگست کو شاہ جی ابھی بقید حیات تھے۔ شیخ صاحب ان کی تشویشناک حالت کی خبر سن کر عیادت کے لئے ملتان تشریف لے گئے۔ اور اسی شام کو جب واپس لاہور پہنچ گئے۔ تو ایک گونہ دل کو تسلی ہوئی کہ شیخ صاحب کا اتنی جلدی ملتان سے واپس چلے آنا ضرور شاہ جی کی طبیعت کی بحالی کی غمازی کرتا ہے۔ انہی خوش کن خیالات کی رو میں بہتا ہوا شاہ جی کی صحت کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے جب شیخ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ گاؤ تکیے پر ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور ان کے سرخ و سپید بوڑھے چہرے پر حزن و ملال کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا رہے تھے۔ میرے دریافت حال پر انہوں نے کروٹ لی۔ اور بمشکل تمام آنسوؤں کو روکتے ہوئے کپکپائی آواز میں گویا ہوئے۔ کہ "کیا بتاؤں بھئی شاہ جی کی طبیعت کیسی ہے۔ میں آج ان کے پاس اس لئے نہیں ٹھہر سکا۔ کہ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی۔ آہ خطیب شیوہ بیان۔ وہ مقرر نکتہ سنج جو ہزاروں نہیں لاکھوں کے مجمع میں اکیلے ہی بولے چلا جاتا تھا گھنٹوں نہیں پہروں بلکہ اگر جائز ہوتا تو دنوں، ہفتوں اور مہینوں وہ مسلسل بولے چلا جاتا۔ اور کسی کو اس کی تقریر میں بولنے تو کیا کروٹ لینے کی مجال نہ ہوتی۔ آج ایک تصویرِ حیرت ہے۔ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری جس کی موجودگی میں بڑے بڑے

مقرر تقریر کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ آج اپنے تیمار داروں اور ہمدردوں کو دیکھتا ہے پر نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے۔ اور نہ ہی اپنی قلبی کیفیت بیان کر سکتا ہے۔ اس نے زندگی کا ایک طویل عرصہ تبلیغ اسلام اور عشقِ رسول کی لگن میں گذارا ہے۔ اور آج مایوسی و دل شکستگی کے عالم میں پکار رہا ہے۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

اتنا کہنے کے بعد شیخ جی نے اپنے آپ کو کچھ سنبھالا اور شاہ جی کی زندگی کے جلی عنوانات پر گفتگو کا آغاز کر دیا۔

شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کے ساتھ شاہ جی کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے بتایا کہ کبھی کبھار ہم جب لاہور میں قیام پذیر ہوتے تو میری یا کسی دوسرے کی خواہش پر شاہ جی ہمارے ساتھ علامہ کے ہاں چلتے اور جب علی بخش کی زبانی علامہ کو شاہ جی کی آمد کا پتہ چلتا تو وہ جیسے لباس میں بھی اندر بیٹھے ہوتے اٹھ کر جلدی سے باہر چلے آتے۔ اور آتے ہی شاہ جی سے کہتے

"شاہ جی آپ اس طرح تشریف لا کر مجھے شرمندہ کیوں کر دیتے ہیں۔ کم از کم اپنی آمد سے پہلے مجھے اطلاع تو کر دیا کریں۔

اس پر شاہ جی اپنے مخصوص انداز میں فرماتے۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کو نہیں معلوم ہماری نظر میں آپ کیا ہیں۔ میں ایک فقیر ہوں اور فقیر یہاں اپنی کٹیا میں آتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ فقیر کو اپنی کٹیا میں اسی طرح بے تکلف چلے آنا چاہیئے۔"

"نہیں شاہ جی میں کس کام کا آدمی ہوں۔ آپ تو مجاہد ہیں کہ تبلیغ اسلام ایسے نہایت ہی اہم اور اس دور میں دشوار ترین فریضے کو انجام دیتے ہیں۔"

علامہ کے یہ ارشادات سن کر شاہ جی صرف کہتے کہ "ڈاکٹر صاحب! ہم مبلغ بھی تو آپ ہی کے ہیں" اور سلسلہ کلام کو قطع کرنے کے لئے علامہ سے شعر سنانے کی فرمائش کر دیتے۔

علامہ کے معتمد اور مشہور خدمت گزار بابا علی بخش نے اس ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ

"شاہ جی اکثر علامہ کو ملنے آیا کرتے تھے۔ اور ان کی آپس میں گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے درمیان نہایت خوشگوار تعلقات استوار ہیں۔ بابا علی بخش کہنے لگے۔ کہ ایک دفعہ میں ریل میں سوار پانی پت کو جا رہا تھا۔ کہ راستے میں شاہ جی بھی گاڑی کے اس ڈبے میں سوار ہو گئے سلام و دعا کے بعد سب سے پہلے تو انہوں نے مجھ سے علامہ کے حالات دریافت کئے۔ اور پھر فرمانے لگے۔ علی بخش تجھے خبر نہیں کہ ہم جو کچھ اپنی تقریروں میں کہتے ہیں وہ علامہ ہی کے افکار ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہی بات جب ہم سٹیج پر کہتے ہیں تو انگریز کی نظر میں گردن زدنی تک ہو جاتے

ہیں جو علامہ اشعار کی صورت میں فرما دیتے ہیں اور انہیں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

یہاں شیخ صاحب نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ علامہ کی وفات کے بعد ان سے اپنا رابطہ ثابت کرنے کے لئے لوگوں نے کیا کیا نہیں لکھا۔ اور چونکہ ہمارا علامہ کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ جس کی بنا پر ہمیں معلوم ہے کہ علامہ کس قسم کے لوگوں سے تعلقات استوار رکھتے تھے۔ اس لئے بعض لوگوں پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ آخر انہیں ایسا کرنے میں کیا مزا ملتا ہے۔

کم و بیش ساٹھ سالہ شیخ حسام الدین اپنی فعال اور محرک زندگی کے تجربات اور مشاہدات بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ

ایک انسان کی حقیقی تصویر دیکھنے کے لئے مسافرت اور معاملات کے علاوہ قید و بند کی رفاقت بھی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور قید خانہ بھی ایک گوشہ زندگی ہے۔ جس کے در و دیوار میں بڑھنے پھولنے والی دوستیاں اور نفرتیں بڑی مضبوط ہوتی ہیں۔ آدمی کسی کی مصاحبت میں دو چار دن اپنے آپ کو مصنوعی تکلفات کے لحافوں میں لپیٹے رکھ سکتا ہے لیکن چونکہ جیل کی رفاقت اتنی مختصر نہیں ہوتی۔ اس لئے ایک نہ ایک دن مجبوراً آدمی کو یہ لبادہ اتار کر ننگا ہونا ہی پڑتا ہے اور پھر انسان کی حقیقی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے قید خانے میں بھی شاہ جی کی صحبتوں کے لطف اٹھائے ہیں وہ کبھی بھی انہیں فراموش نہیں کر سکیں گے۔

شاہ جی کی باغ و بہار اور شرعی احکامات میں ڈوبی ہوئی زندگی جیل کی چار دیواری میں اور اجاگر ہو جاتی تھی۔ وہ پنج وقتہ نمازوں اور اپنی قرآن خوانی کے اوقات کے علاوہ بیشتر بزم شعر و سخن اور بذلہ و طرب کی محفل سجا دیتے تھے۔ اور کیسے کیسے اشعار کس مزے سے سناتے تھے یہ انہیں کا حصہ تھا۔ اور پھر جب لطیفہ گوئی پر آتے تو تاریخی واقعات کو ایسا لطیف رنگ دے کر بیان کرتے کہ یہ انہیں پر ختم ہو گیا۔

شاہ جی کی زندگی کا روشن ترین پہلو ان کی اسلام کے ساتھ شیفتگی اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ والہانہ محبت کے جذبات میں پوشیدہ تھا۔ وہ زندگی کی ہر بڑی سے بڑی مصیبت اور تکلیف کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کر جاتے تھے۔ لیکن جہاں اسلام اور حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق (معاذ اللہ) کسی نے غیر محتاط بات کہہ دی۔ شاہ جی اسی وقت شعلہ جوالا بن جاتے تھے اس معاملے میں وہ بڑی سے بڑی طاقت کے ساتھ بھی ٹکرا جانے میں اپنے آپ کو کمزور نہیں پاتے تھے۔ وہ جس طرح حضور پر نور ﷺ کے والہ و شیدا تھے۔ اسی طرح اسوہ حسنہ کے ساتھ بھی انہیں دلی لگاؤ تھا اور حتی المقدور شریعت کی جزئیات تک پر عمل پیرا رہتے تھے۔

شاہ جی کے اتباع شریعت کے کردار کے بارے میں شیخ حسام الدین نے حسب ذیل واقعہ سنایا تو ان کی پر اسرار آنکھوں میں آنسوؤں کے جگنو چمکنے لگے۔ اور دنیا کے انداز دیکھ دیکھ کر ان کے اکتائے اور تھکے

ہوئے چہرے پر حزن و ملال کے تہہ بہ تہہ بادل چھا گئے۔ فرمانے لگے

"کہ ابتداء میں جب شاہ جی کا میرے ساتھ تعلق خاطر بڑھا تو وہ مجھے نماز کی ادائیگی میں مداومت کی تلقین کرنے لگے۔ اور پھر جب میری عادات میں کچھ زیادہ تغیر نظر نہیں آیا تو یہ اصرار وابرام یہاں تک بڑھا کہ جیل کی رفاقت میں ایک دن میرے سامنے بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنی ٹوپی سر سے اتاری اور میرے پاؤں پر رکھ کر کہنے لگے۔ "حسام یہ ٹوپی کسی بڑے سے بڑے فرعون اور نمرود کے پیروں پر بھی نہیں پڑسکتی۔ میری تم سے صرف یہی التجا ہے کہ اس ٹوپی کی شرم رکھ لو اور پنج وقتہ نماز کی ادائیگی میں سستی اور کاہلی نہ کیا کرو۔"

اس سلسلے میں شیخ صاحب نے بتایا کہ شاہ جی کے قرابت داروں میں سے کسی نے اپنی جوان لڑکیوں کو بے پردگی کی اجازت دیدی تو شاہ جی ایسے کبیدہ خاطر ہوئے کہ ان سے عمر بھر کے لئے علاقہ تعلق ختم کر دیا۔

یہاں پہنچ کر شیخ صاحب کے ذہن کے پردہ پر شاہ جی کی زندگی کے مختلف عنوانات ایک تصویر کی طرح چلنے لگے۔ اور وہ پھر بحر فکر میں ڈوب گئے۔ ایک طویل وقفے کے بعد جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو نہایت ناامیدی و یاس کے ساتھ کہنے لگے۔ بس! باقی باتیں کسی دوسری نشست میں ہوں گی۔"

معلوم ہوتا تھا کہ شاہ جی کی شمع زندگی کے عنقریب ہی بھڑک اٹھنے کے اندیشے نے ان کے دل و دماغ کو جیسے سخت مضطرب اور بے چین کر دیا ہے اور اب ان میں تاب گفتار نہیں رہی ہے۔ میں نے ان سے اجازت لی اور بے کلی کے عالم میں انہیں تکیہ پر کروٹیں لیتے ہوئے چھوڑ کر اٹھ آیا۔

۲۱۔ اگست کی شام کو شاہ جی کے انتقال کی خبر فضاء کو سوگوار کر گئی تو میں نے لاکھ کوشش کی کہ شیخ صاحب سے مل کر اس گفتگو کو مکمل کر لوں۔ لیکن باوجود کہ شیخ صاحب ابھی لاہور ہی میں تھے۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اور وہ پریشان و خستہ حال ایسے کھوئے رہے کہ ان کی خبر تک نہیں لگ سکی کہ کہاں ہیں؟

حضرت امیر شریعت کی تجہیز و تکفین کے بعد ۲۳ اگست کو شیخ صاحب جب لاہور پہنچے تو انہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا گویا وہ آج ملتان میں دامن جھاڑ آئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے شاہ جی کو ذرا بھی نزدیک سے دیکھا ہے۔ اور ان کی محفلوں کے مزے لوٹے ہیں ان کی ساری متاع حیات ہی شاہ جی کی ذات گرامی تھی۔ اور شاہ جی کے زیر زمین جاتے ہی ان کی نظر میں دنیا اگرچہ اندھیر ہو گئی۔ لیکن ان کے دلوں میں شاہ جی کی زندگی کے مشن کی شمعیں اور زیادہ نور دینے لگی ہیں۔

شاہ جی کے جنازے کے جلوس کی منظر کشی کرتے ہوئے متعدد بار شیخ صاحب کے ضبط و تحمل کا پیمانہ لبریز ہوا۔ لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو اب رہ ہی کہاں گئے تھے جو چھلک پڑتے۔ انہوں نے بتایا کہ ملتان کی سرزمین نے آج تک اتنا عوامی اجتماع نہیں دیکھا تھا۔ کراچی سے لے کر پشاور تک کے لوگ وہاں پہنچے ہوئے

تھے کہ اس دیوانۂ نام محمد ﷺ کی آخری زیارت کا شرف حاصل کریں۔ کوئی آنکھ نہیں تھی جس سے سیل سرشک نہ بہہ نکلا ہو کوئی دل نہ تھا جس کی بے قراری اور بے تابی سے دھڑکنیں صاف سنائی نہ دیتی ہوں۔ کوئی زبان نہ تھی جو دبے دبے گھٹے گھٹے نالہ وفغاں میں مصروف نہ ہو۔ اور پھر جب اس درویش بے گلیم کا جنازہ اٹھا تھا اور آخری آرام گاہ کی طرف چلنے لگے تو فرط غم سے لوگوں کے پاؤں اس قدر بوجھل ہو چکے تھے کہ چلنا محال ہو گیا تھا۔ ملتان کے باشندے اتنا بڑا مجمع دیکھ کر سخت حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ لیکن جب کسی ملتانی ہی نے کہا کہ "اے پیر سائیں دا جلوس ہے نا۔" تو ان کا تحیر ٹوٹا۔ اور اب سب کی زبان پر تھا کہ

"ہاں اے پیر سائیں دا جلوس اے۔ پیر سائیں دا۔"

آج شاہ جی اس دارِ فانی میں نہیں ہیں اور صرف ان کی یاد مونس الارواح ہے۔ لیکن ان کی زندگی کے مجاہدانہ کارنامے اور عشقِ رسول ﷺ کے بے پناہ جذبات اس مرد درویش کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گے۔ اور کوئی طاقت بھی ان کے نام کو صفحۂ ہستی سے نابود نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ تاریخ کے صفحات اس نام کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں جو عوام کے لوحِ دل پر ثبت ہوں اور شاہ جی کا نام گونا گوں اوصاف کے باعث لوگوں کے دلوں پر اس طرح نقش ہے۔ کہ مٹائے نہیں مٹ سکے گا۔

شاہ جی دے نانے

قوم دے درد نوں جانن والا اج اوہ ساڈے کول نئیں
جھوٹ تے سچ نوں وکھ کر دسیا، ماسہ ایس وچ جھول نئیں
اُس دی سوچ تے فکر سنیہا ساڈے لئی اے بانگ درا
ایہہ موتی انمول نے سجنا پیراں دے وچ رول نئیں
لعنت اوس ورتارے اُتے کرے جو مکر فریباں لئی
شاہ جیؒ دا آکھان ہے یارو، تیرا میرا بول نئیں
اوہدے گھروں کیہہ کیہہ ورتی، کیہہ پچھو، کیہہ دساں میں
یاد اُوہدی تڑپاوے ساہنوں، ہجر کہانی پھول نئیں
عزت، غیرت، انڑکھ دی خاطر آہڈا لا غداراں نال
دین ایمان دی خاطر سجناں، پھڑ تلوار، کشکول نئیں
ظلمت دے ایس موسم دے وچ سورج بن نئیں سکدا
جیہڑا بندہ یار عزیزا، ہمت رکھدا کول نئیں!

عزیز سندھو (ملتان)

ظلم کے آگے ترا سر خم ہوا؟ ہرگز نہیں!

پروفیسر نذیر احمد خواجہ

تھی فضا خاموش حرکت میں نہ تھی بادِ صبا
لطمۂ امواج سے خالی تھا دامن بحر کا
ظلمتوں کے جال میں انجم تھے سب رشتہ بہ پا
ایک سناٹے کا عالم گلشنِ ملت پہ تھا
تھے خزاں کی گرد سے سب پھول کملائے ہوئے
باغبانوں کے بھی دل تھے سخت مرجھائے ہوئے
اس طرح اغیار نے لوٹی بہارِ زندگی
نے یقینِ مرگ تھا نے اعتبارِ زندگی
کوئی باقی ہی نہ تھی وجہ قرارِ زندگی
بجھ چلا تھا قلب ملت سے شرارِ زندگی
ظلمتِ باطل نے یوں مستور نورِ حق کیا
زمزموں سے عشق کے خاموش طُورِ حق کیا
ایک ہنگاموں کی دنیا اپنے دامن میں لئے
آگیا ایسے میں کوئی تیغ حقِ عریاں کئے
اُس کی پھونکوں سے چمک اٹھتے تھے ایماں کے دیئے
سوزنِ تدبیر سے سب چاک دل اُسنے سئے
اس مجاہد کا عطاء اللہ بخاری نام تھا
راستی پر ڈٹ کے جاں دینا یہ اس کا کام تھا
اے کمالِ عظمتِ ملت کے تابندہ نشاں
اے شریعت کے علمبردار اے غازی جواں
تُو تو نہ تھا اک بلبلِ رنگیں نوا شیریں بیاں
شعلۂ آواز میں تیرے نہاں تھیں بجلیاں
تو مثالِ ابر غراں چھا گیا افلاک پر
اور برسا صورتِ شبنم وطن کی خاک پر
اے غلامِ مالکِ ہر دو جہاں صاحب یقیں
ظلم کے آگے تیرا سر خم ہوا؟ ہرگز نہیں
یہ کبھی ممکن نہ تھا اے قافلہ سالار دیں
توڑ دے زنجیر آہن تیرا عزم آہنیں
جذبۂ آزادیٔ توحید زنداں کم نہ کرد
ذوقِ سیرِ راہ حق خار مغیلاں کم نہ کرد

مقبول انور داؤدی

حامل سنّتِ نبوی

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کا جائزہ لیا جائے تو حضرت شاہ جی مرحوم کا نام نامی اور اسم گرامی آسمان سیاست پر چمکتا اور دمکتا نظر آتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سارے برصغیر اور خصوصیت سے سابق پنجاب کے عوام میں روح آزادی کو جاری و ساری کرنے کا کام جتنا جی صاحب نے کیا ہے کوئی دوسرا مقامی سیاسی لیڈر ان کے پاسنگ نظر نہیں آتا۔

عوام میں موافق ہو یا مخالف جو عزت، شہرت اور عظمت شاہ صاحب کو نصیب ہوئی۔ وہ کم سیاسی زعماء کو ملی یہ جی صاحب کا کمال تھا کہ سامعین گالیاں کھاکے بھی بے مزہ نہ ہوتے تھے اور حسن تقریر کا یہ عالم کہ عشاء کی نماز کے بعد شروع کرتے تو صبح کی نماز کے وقت ختم ہوتی۔ اور وہ اس لئے کہ صبح کی نماز پڑھنی ہوتی تھی۔ اور جلسہ گاہ میں عوام کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جیسے ان پر جادو کر دیا گیا ہو ہزاروں نہیں لاکھوں کا مجمع یوں ساکت و صامت ہوتا جیسے پتھر کے بت جلسہ گاہ میں نصب کر دیئے گئے ہوں۔

مجھے ذاتی طور پر صاحب سے بہت ہی کم شرف نیاز حاصل ہوا۔ لیکن کبھی کبھی ان کی خدمت میں شرف باریابی نصیب ہو جاتی ان میں سے ایک دن کی بات جواب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے عرض کرتا ہوں۔

حضرت شاہ محمد غوث کی مسجد کے سامنے مجلس احرار کا ملحقہ دفتر تھا۔ حضرت شاہ صاحب وہاں مقیم تھے میں اور عطاء اللہ شاہ ہاشمی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حسن تقدیر کہ اہل مجلس محظوظ ہو رہے تھے اور شاہ جی کے لطائف و ظرائف کبھی کبھی مجلس کو کشت زعفران بنا دیتے۔

یکایک بات کا رخ پلٹا اور مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری پر بات چل نکلی بہت سے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ یکایک شاہ جی نے اپنے زانوں پر ہاتھ مارا اور فرمانے لگے یارو! افضل حق چودھری نے جو بات کہہ دی ہے اس نے میری آنکھوں سے اقتصادیات کے سارے پردے اٹھا دیئے ہیں۔ چودھری افضل حق نے کیا بات کہہ دی جس کی طرف کسی مسلمان کو دھیان ہی نہیں گیا۔ واہ چودھری تو نے کیا بات کہ دی۔ اور میں تو اس بات کو یاد کر کے اکثر روتا رہتا ہوں۔

اس وقت شاہ جی پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو رہی تھی سب سامعین شاہ جی کی بات سننے کے لئے سراپا گوش بنے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے فرمایا۔ چودھری نے ایک ایسی سنت کی طرف مجھے متوجہ کیا جو ہمارے

ذہن تک میں نہ تھی۔

سنت رسول ﷺ پر عمل کرنے پر مسلمان اپنی نجات خیال کرتا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ سنت رسول ﷺ کے باہر کوئی بات نہ ہو۔ لیکن جو سنت چودھری نے بتائی اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی کسی نے اس کے متعلق سوچا تک نہیں۔

سنت کیا ہے؟ چودھری نے کہا شاہ جی آپ یہ تو بتائیے کہ جب نبی آخر الناس ﷺ کا وصال ہوا تو حضور کے گھر میں کیا تھا میں چونکا اور کہا حضور کے گھر میں کیا ہوتا؟ حضور نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو اس وقت تک مسجد نبوی سے نہ اٹھتا جب تک اس کا ریزہ ریزہ مسلمانوں میں تقسیم نہ کر دیتا۔

چودھری نے کہا۔ شاہ جی! حضور ﷺ کی اس سنت پر کوئی عمل کرتا ہے؟ کہ جب وہ مرے تو حضور کی سنت میں اس کے گھر میں کچھ نہ ہو۔

شاہ جی فرمانے لگے چودھری کی اس بات نے مجھ پر وجدانی کیفیت طاری کر دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاہ جی نے اس کے بعد اس سنت نبوی ﷺ پر پوری طرح عمل کیا۔ امرتسر میں ان کا ایک عمدہ مکان تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد ملتان میں کرائے کے مکان میں زندگی بسر کر دی اور واقعی جب شاہ جی کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں کچھ نہ تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اک ضربِ کلیمانہ

تھی طبع سلیم ان کی اور ذوق حکیمانہ
شفقت میں جھلکتی تھی اک شان کریمانہ

احباب سے ملتے یا اغیار سے وہ ملتے
آنکھوں پہ بٹھاتے تھے اپنا ہو کہ بیگانہ

راسخ تھے عقیدہ میں اور عزم کے پختہ بھی
دنیائے عمل میں بھی یکتاؤ یگدانہ

اسرارِ لطیفانہ در بابِ نصیحت وہ
کرتے جو بیاں ہوتا انداز فصیحانہ

گفتار بھی شیریں تھی اور لحن بھی داؤدی
تقریر میں ہوتا تھا اک رنگ خطیبانہ

تحریر میں تھا ان کے انداز ادیبانہ
تھا طرزِ تکلم کیا؟ اک ضرب کلیمانہ

روتوں کو ہنساتے تھے اور ہنستوں کو رلا دیتے
تھی ان کی خطابت میں تاثیر طلسمانہ

وہ قوم کے خادم تھے احرار کے تھے قائد
وہ مرد مجاہد تھے، تھی شان شجاعانہ

اللہ نے بخشا تھا اک ذہن رسا ان کو
تھا نام "عطاء اللہ" اوصاف بزرگانہ!

مولانا علی محمد پاسلوی

حمید اصغر نجید

شاہ جی اور ان کا مشن

زندہ قومیں اپنے جلیل القدر رہنماؤں اور بزرگوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امیر شریعت کو جنہیں شاہ جی کے پیارے نام سے یاد کیا جاتا ہے خطابت کا وہ ملکہ عطاء کیا تھا کہ پورے ایشیاء میں انکی ٹکر کا کوئی خطیب نہ تھا "سحر بیان" اگرچہ اردو ادب میں ایک اصطلاح بہت پہلے سے وضع ہے لیکن اس کا صحیح اطلاق صرف شاہ جی پر ہوتا ہے۔ اور چونکہ شاہ جی نے اپنی اس خداداد صلاحیت کو صرف اعلائے کلمتہ الحق کے لئے مختص کر کے برصغیر پاک و ہند کے چپہ چپہ میں حضور سرور کونین ﷺ کی مدح سرائی کی اور ان کے اس فرمان کہ "میں نبیوں کا سلسلہ ختم کرنے والا ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا" کی گونج سے میدانی، صحرائی اور پہاڑی علاقوں کو آشنا کیا اسی لئے حضرت امیر شریعت مر کر بھی نہیں مرے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے انمٹ نقوش باقی چھوڑ گئے ہیں۔

شاہ جی کتنے سادہ طریقہ سے مسلمانوں کو بتایا کرتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور جعلی نبوت کا کاروبار چلانے والے مسلمانوں کے سواد اعظم کے خلاف انگریزوں کی بدترین چال ہیں۔ زبان و بیان سے اس کی تعریف و تمجید ممکن نہیں اور مسلمان بھی انگریزوں کے اس خود کاشتہ پودے کی سازشوں سے باخبر ہو کر اپنے ایمان میں نقب لگانے والوں کی چالوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر چکے تھے۔ ہر شخص یہ بات پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ کہلائے حضرت ابراہیم کو خلیل اللہ کا درجہ ملا۔ حضرت اسماعیل ذبیح اللہ ٹھہرے اور حضرت عیسیٰ روح اللہ قرار پائے تو پھر حضور سرور کونین کو رسول اللہ کا نام نامی کیوں عطا کیا گیا؟ ظاہر ہے رسول اللہ کا لقب ملنے کے بعد رسالت کا دروازہ بند ہو گیا اور حضور اکرم میں وہ تمام محاسن و محامد جمع ہو گئے جو آپ ﷺ سے پہلے آنے والے نبیوں کی خصوصیت تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے آخری نبی ہونے کی یہ بڑی ہی واضح دلیل ہے اور پھر اگر نبوت کا دروازہ کھلا ہی ہوتا تو حضور اکرم کے وصال کے بعد جب مسلیمہ کذاب نے اپنی "نبوت" کا اعلان کیا تو حضور ﷺ کے یار غار اور خلیفتہ المسلمین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس جھوٹے نبی (مسلیمہ کذاب) کی سرکوبی کیوں کی؟ کیا حضرت صدیق اکبرؓ نے اس جعلی نبی کا قلع قمع کر کے یہ ثابت نہیں کر دیا تھا کہ اب کوئی نبی نہ آئے گا بلکہ حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور قرآن مجید میں "خاتم النبیین" کا جو لفظ استعمال ہوا اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد باب نبوت بند ہو چکا ہے۔

کروڑ کروڑ رحمتیں ہوں حضرت شاہ جی کی روح پر جنہوں نے حضور اکرم کی ختم نبوت کے بارے میں بڑے ہی سادہ سلیس اور عام فہم انداز میں مسلمانوں کو سمجھایا اور انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالنے کی خاطر جعلی نبوت کا جو ڈھونگ رچانے کے لئے اپنے پس خوردہ پر گزر

بسر کرنے والوں کو آلہ کار بنایا تھا وہ بے نیل و مرام رہا اور مسلمان پوری طرح سمجھ گئے کہ خانہ ساز نبوت کے لئے برصغیر پاک و ہند میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت شاہ جی کی اس بے مثال جدوجہد کے باعث ان کا نام تاریخ اسلام کا ایک سنہری ورق بن گیا ہے۔

آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ پاکستان میں جعلی نبوت کا ڈھونگ رچانے والوں کا سختی سے محاسبہ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ لیکن کیا یہ نمائشی جلسے، حلق کے اوپر اوپر سے کی گئی دھواں دھار تقریریں اور چند قرار دادیں کافی ہیں۔ اور ان سے ہم اصل مقصد پالیں گے یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے یہ سب باتیں محض وقتی ہیں جب کہ اسلام کو بہروپیوں کی سازشوں سے بچانے کے لئے منظم اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

مسلمان راہ نماؤں کی بے حسی بڑی ہی اندوہناک ہے۔ شاہ جی کی روح تڑپ رہی ہو گی۔ کیونکہ اگر شاہ جی زندہ ہوتے تو رسول اللہ کے پروانے ملک کے گوشے گوشے سے مجسم صدائے احتجاج بن جاتے۔ وہ کمال اور آج کے دور کا یہ زوال

فاعتبرو یا اولی الابصار

کوئی نہیں سوچتا کہ قادیانیوں کے برگ و بار پھل پھول کیوں رہے ہیں؟ اور مسلمان رہنماؤں کا اثر و رسوخ کیوں سمٹتا جا رہا ہے؟ اب یہ بات ہی محو ہوتی جا رہی ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کی بادشاہت ختم کر کے ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل کیا تو مسلمانوں کی یک جہتی ختم کرنے کے لئے ان میں نئے سے نئے فرقے پیدا کرنے کی ناپاک سازش کی اور بالآخر مسلمانوں میں روح جہاد ختم کرنے اور اپنے آپ کو شرعی حاکم تسلیم کرانے کے لئے اسلام سے قطعی طور پر خارج مرزائیوں کا طائفہ بھی پیدا کر دیا اور پھر خود ہی اس پودے کی آبیاری بھی کی۔ قلق ہے تو صرف اس بات کا کہ مسلمان اپنی تاریخ بھی بھول گئے ہیں۔

شاہ جی کیا باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ وہ بڑی بڑی باتوں کو چٹکی بجانے میں حل کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ میں درجہ میں کون افضل ہے۔ شاہ جی مسکرائے اور فرمایا کہ "بھائی حضرت عمرؓ کے لئے حضور ﷺ نے قبول اسلام کی دعا کی تھی اور حضرت علیؓ نے خود اسلام قبول کیا یعنی حضرت عمرؓ مراد تھے اور حضرت علیؓ مرید اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ مراد اور مرید میں کون افضل ہے؟"

انکے عظیم مشن اور بے مثال جدوجہد کے پیش نظر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

وہ لوگ تو نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

واقعہ یہ ہے کہ شاہ جی کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ ایسے لوگ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ وقت کا اہم ترین تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنی نجی سرگرمیوں کو محدود کر کے دین کی سربلندی کے لئے کام کریں۔ انگریزی ذہن کی تعلیم نے مسلمانوں میں دینی بے حسی کی جو لہر پیدا کر دی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میٹھے زہر کے اثر کو زائل کیا جائے۔ یہ زہر تبھی بے اثر ہو سکے گا جب مسلمانوں کو صحیح دینی و

دنیوی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے گا۔ اورانہیں دین مبین کی بنیادی اقدار سے بھی پوری طرح متعارف کرایا جائے گا۔ اور دنیا میں دنیا کے طور پر زندہ رہنے کا اسلامی قرینہ سیکھایا جائے گا۔

لوگ پیاسے ہیں وہ صحیح دین کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جعلی نبوت کا کاروبار چلانے والے لوگوں کی اسی بے عملی کا فائدہ اٹھا کر ان کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں چونکہ صحیح دین کا انہیں پتہ نہیں ہوتا اس لئے ان کے سامنے جو کچھ بھی پیش کیا جاتا ہے وہ انہیں قبول کر لیتے ہیں۔ یہ بڑا ہی نازک دور ہے۔ اس میں ان لوگوں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں جو حضرت شاہ جی کے نائبین ہیں اور دین اسلام کی شمع کو فروزاں رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ کیا ہم سب اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اس سوال کا جواب اپنے دل سے پوچھیئے:

شاید کہ اتر جائے کسی دل میں میرے بات

وہ ایک مومن جو لطف احمد کی برکتوں سے قمر بنا تھا

فضا کے سینے پہ خونی کرگس کے تیز پنجے مچل رہے ہیں
چراغ علم و عمل کی لو سے دھوئیں کے بادل ابل رہے ہیں
کہ آج احرار کا نگہباں جو تخت علمی پہ تھا فروزاں
حیات فانی سے ہو کے گریاں سدھارا سوئے جہان یزداں
وہ ایک عالم جسے جہاں نے خراج تحسیں ادا کیا تھا
وہ ایک مومن جو لطف احمد کی برکتوں سے قمر بنا تھا
وہ ایک رہبر کہ جس کی نظروں میں ساری دنیا تھی کوزۂ گل
وہ اک معلم کہ جس کے صدقے میں رہ نوردوں نے پائی منزل
وہ اک مفسر دلوں سے جس نے نکالے شبہات نو دمیدا
وہ اک مقرر کہ جس کے طرز بیاں میں شعلوں کا سوز پیدا
اسی چراغ سحر بہ پہلو کے غم میں عالم یہ رو رہا ہے
مگر وہ باد قضا سے بجھ کر زمین کے پہلو میں سو رہا ہے۔

(فانی مراد آبادی)

پروفیسر خالد بزمی

جاں نثارِ سیّدُ الابرار وہ درویش تھا

مذہب حق کا علمبردار وہ درویش تھا
مسلک نبوی کا پیروکار وہ درویش تھا

جو رسول اللہ کے ارشاد سے منہ موڑ لے
اس کے حق میں عمر کی تلوار وہ درویش تھا

کفر و باطل کے مقابل، شرک و بدعت کے خلاف
دہر میں توحید کی للکار وہ درویش تھا

کیفِ حُبِّ مصطفےٰ سے بے خود و سرشار تھا
بادۂ توحید سے سرشار وہ درویش تھا

دین کی حفظ و اشاعت اس کا پہلا فرض تھا
راہِ حق میں ہر گھڑی تیار وہ درویش تھا

کو بہ کو، قریہ بہ قریہ، بستی بستی، شہر شہر
دینِ حق کی تیغِ جوہردار وہ درویش تھا

اختلاف و انتشار اس کو کبھی بھائے نہ تھے
دین کے نقصان سے بیزار وہ درویش تھا

اتحاد و اتفاقِ قوم پر مرتا تھا وہ
الغرض اسلاف کا کردار وہ درویش تھا

حفظِ ارشادِ پیمبر اس کا عین ایمان تھا
جاں نثار سید الابرار وہ درویش تھا

شاہ محمد عثمانی

سپاہی بھی سپہ سالار بھی

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی جدوجہد آزادیٔ وطن اور اقامت دین کے لئے رہی۔ مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے انگریزوں سے معرکہ آراء رہے اور اس وجہ سے زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزارا۔ جب جیل سے نکلتے تو ان کی شعلہ بیانی کی بدولت قصر حکومت میں زلزلہ آجاتا۔ وہ ملک کے طول و عرض میں سفر کر کے اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے اور پھر حکومت کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا کہ انہیں بند کر دے۔ اس طرح یہ فقرہ ان کے مناسب حال ہے کہ ان کی آدھی زندگی جیل میں گزری اور باقی زندگی ریل میں۔

مولانا نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ کی بلکہ کشمیر کے پژمردہ مسلمانوں کو اٹھانے میں بھی انہوں نے زبردست حصہ لیا۔ جس وقت شیخ عبداللہ اندرون کشمیر میں مہاراجہ کی زبردست طاقت سے لڑ رہے تھے۔ اس وقت پنجاب اور دیگر صوبوں سے مولانا نے اپنی شعلہ بیانی کے ذریعہ ہزاروں رضا کار جمع کر کے کشمیر بھیجے۔ تاکہ مہاراجہ کی طاقت سے ٹکر لی جائے۔ مہاراجہ نے مجبور ہو کر حکومت ہند سے مدد طلب کی۔ حکومت ہند نے مدد تو کی اور اپنی فوج کشمیر کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بھیج دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ جسے ایجی ٹیشن کے اسباب پر اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ کمیشن نے رپورٹ دی کہ ریاست کے عوام کی حکومت میں کوئی آواز نہیں ہے۔ اور برطانوی ہند میں رفتہ رفتہ اصلاحات نافذ ہو رہی ہیں۔ ان کے اثر سے کشمیر کے عوام بھی خواہش مند ہیں کہ ان کے یہاں بھی اس طرح کی اصلاحات ہوں۔ چنانچہ برطانوی حکومت کے دباؤ سے کشمیر میں اصلاحات کی بنیاد پڑ گئی۔ اسی طرح شاہ جی نے اپنی پرزور کوششوں سے پاکستان میں قادیانیوں کا زور بھی توڑ دیا۔ پاکستان میں پہلے کے مقابلہ میں ان کے اثرات کم ہیں۔

اس از بر آرائی زبان و قلم میں مولانا اور ان کے رفقاء دار و رسن کی منزل کے قریب پہنچ گئے۔

آزادی سے پہلے ہندوستان میں مولانا کی شخصیت معروف اور مسلم تھی۔ وہ جہاں بھی پہنچ جاتے ان کے مخالفین بھی ان کی تقریر سننے آجاتے۔ وہ گھنٹوں بھی بولتے رہتے تو لوگ مسحور ہو کر سنتے رہتے۔ فیاض ازل نے گفتگو اور تقریر کی غیر معمولی قدرت سے انہیں نوازا تھا۔ مولانا ایک اجتماع میں پنجاب کے امیر شریعت منتخب ہوئے تھے۔ لیکن انکی ہنگامی زندگی نے ان کو موقع نہیں دیا کہ اپنی امارت کو منظم کریں۔ یہ ایک تقدیری بات تھی ورنہ امارت شرعیہ ہندوستان گیر پیمانہ پر بن چکی ہوتی۔ مولانا تھے تو پنجاب کے۔ لیکن ان کی ننھیال پٹنہ سٹی میں تھی۔ انہوں نے اپنے لڑکپن کا حصہ اور عنفوان شباب تک کا زمانہ "گیا" میں گزارا۔ پٹنہ میں ان کے رشتہ دار اور "گیا" میں ان کے جاننے والے موجود تھے۔

مولانا کا حافظہ غضب کا تھا۔ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا کہ وہ "گیا" آئے جامع مسجد پہنچ کر وہ تحیۃ المسجد پڑھنے لگے

سامنے ایک آدمی آ کے کھڑا ہوا جو بہت معمولی شکل وصورت اور معمولی لباس میں تھا۔ مولانا نے سلام پھیر کر اس سے معانقہ کیا اور کہا کہ آپ کو چالیس برس کے بعد دیکھا ہے۔ جب کہ اکلاٹ کپتن تھا۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا کا تعلق ہندوستان سے نہیں رہا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں خان عبدالغفار خان، مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام کو بھی بھلایا نہیں جاسکے گا۔

مولانا کو میں نے "گیا" میں قریب سے دیکھا تھا۔ انکی جرأت اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں ان کی مجاہدانہ زندگی اور غیر مصالحانہ روش مجھ سے کہتی تھی کہ تو بھی نہ ڈر اور بے خطر اس آتش نمرود میں کود جا۔ مولانا نے جس طرح ساری زندگی جہاد آزادی میں گزاری اور مسلسل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی ہے۔ وہ آزادی کی لڑائی کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی اور تنہا لشکر جرار بھی۔ ان کے نفس گرم کی تاثیر نے ہزاروں اشخاص کے دلوں میں آزادی کا جوش بھر دیا۔ اس دور کو دیکھنے والی نسل بھی اب تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جارہی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

"ٹوٹے ہوئے تارے" (صفحات ۱۳۶ تا ۱۳۸)

بخاری عید تمنا تیرے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تیری زبان میں ہے

سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ اردو زبان جب سے معروض وجود میں آئی ہے اس وقت سے لے کر آج تک سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا خطیب اعظم پیدا نہیں کر سکی۔ اور مستقبل قریب میں بھی شاہ جی کی مثال کی کوئی امید نہیں ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اسنے یہ زبان کا جادو اس شخص کو عطا فرمایا جو کہ عقیدہ اور مسلک کے اعتبار سے اکابر اہل السنت والجماعت کے صحیح ترجمان تھے۔ حضرت شاہ جی خود اپنی تقریروں میں ارشاد فرمایا کرتے کہ میں مسلک کے اعتبار سے چاہے وہ دینی ہو یا سیاسی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیری کو اپنا امام مانتا ہوں۔ اور انہیں کے مسلک پر قائم ہوں اور اس پر مرمٹنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے عقیدہ اور مسلک جان سے زیادہ عزیز ہے۔ درحقیقت یہی وہ مسلک ہے جس کے تحفظ اور بقا کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر دیں۔ اور جس پر ان کے متعلقین اور متوسلین اور اولاد واحفاد نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ

قمر فاروقی

یاد ہیں باتیں شاہ جی کی

میرے ممدوح حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان مقدس و پر خلوص شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے افکار و کارہائے نمایاں سے تاریخ کے اوراق روشن ہیں۔

غالباً ۴۳-۱۹۴۲ء میں بھل ضلع میانوالی میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا تو حضرت شاہ جی ایک تبلیغی جلسہ میں تقریر کے لئے تشریف لائے۔ درویشانہ سادہ طرز، جسمانی لحاظ سے نہ بحد لحیم شحیم اور نہ کمزور، متوسط بدن ڈاڑھی میں سفید و سیاہ بالوں کا اشتراک۔ سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی، سادہ سفید لباس اب بھی اگر آنکھ بند کروں تو ان کی نورانی اور پاکیزہ صورت تصور پر چھا جاتی ہے۔ سفر میں بالکل تنہا، سامان مختصر بلکہ ندارد بقول شاعر

فر و ناز وعیش و نعمت اہلِ دولت کو نصیب
فقر و صبر و شکر ہے دائم شعارِ عارفاں!

اتفاقاً جمعہ کا دن تھا۔ آپ نے جامع مسجد میں جمعہ پڑھایا۔ خطبہ اولیٰ و ثانی جس دلکش اور سحر آفریں لہجہ میں ادا فرمایا۔ اس کی گونج اب تک راقم کے کانوں کو سنائی دے رہی ہے۔ آخری خطبہ میں تمام ممالک اسلامیہ کے لئے نام لے لے کر درد آفریں اور پر سوز رنگ میں دعائے کامرانی و ترقی فرمانا اور اعدائے اسلام کی تباہی و ناکامی کے لئے عربی میں دعا طلب کرنا پھر خطبہ کے بعد نماز میں قرآن کی تلاوت کا اثر۔ بس ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ قرآن اب ہی اتر رہا ہے۔ نماز کے بعد جلسہ میں اس آیت سے تقریر کا آغاز فرمایا۔

ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین وکان اللہ بکل شئی علیماً

تقریر کیا تھی ہر لفظ بلکہ ہر حرف اپنے اندر جاذبیت کا ایک سمندر رکھتا تھا۔ آپ کا پسندیدہ موضوع "ختم نبوت" تھا۔ لفظ خاتم النبیین کی توضیح و تشریح یوں فرمائی۔ "خاتم النبیین کے معانی قادیانی حضرات کے کہنے پر اگر نبوت کی انگوٹھی یعنی مہر کی جائے تو بھی "ختم نبوت" پر کوئی حرف نہیں آتا۔ گورنمنٹ کے مقرر کردہ محکمہ کی طرف سے جس مکان کے دروازے پر سیل یعنی مہر لگ جائے تو عوام کا کوئی شخص اسے نہیں توڑ سکتا۔ اسی طرح محکمہ ڈاک کے جس تھیلے پر مہر لگا دی جاتی ہے اسے راستے میں کوئی کھول نہیں سکتا۔ تاوقتیکہ منزل مقصود پر افسرِ مجاز تک نہ پہنچے مگر یہ سب دنیا کے نظام ہیں۔ خدائی نظام کے تحت نبوت کے جس تھیلہ پر خاتمے کی مہر ثبت ہو چکی ہے۔ اسے کھولنے کا تاقیامت کسی بشر کو اختیار اور طاقت نہیں ہے" غرض خطابت کا رنگ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ عہدِ حاضرہ پر تبصرہ فرمایا۔ اور اصلاح اخلاق و عمل پر مؤثر انداز اور قرآنی روشنی میں اپنا جوہر دکھایا۔ سامعین وجد میں جھوم رہے تھے ایک اور موقع پر کروڑ لعل عیسن ضلع مظفر گڑھ (اب ضلع لیہ) کے میلہ چودھویں کے اجتماع عظیم میں آپ کو وجد آفریں اور ایمان افروز لہجہ میں قرآن شریف

تلاوت فرماتے دیکھا۔ اس دفعہ آپ کا موضوع "السلام علیکم اور و علیکم السلام کا مسلمانوں میں ترویج" تھا۔ آپ نے فرمایا۔ "اگر سارے مسلمان باہم ملاقات میں یا راہ گزر میں السلام علیکم اور و علیکم السلام کو التزام سے اپنالیں تو یقین ہے نجات حاصل ہو جائے گی" غرض آپ کی تقریر دلپذیر ہندو پاکستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے قلوب پر یکساں اثر انداز تھی۔ آپ بلا کے حاضر جواب تھے۔ آپ کا دلچسپ مزاح دینی اصلاح کا موجب ہوا کرتا تھا۔ بہل ضلع میانوالی (اب ضلع بھکر) میں قیام کے دوران ایک دیہاتی سفید ریش حضرت شاہ جی کی مجلس میں آیا اور بجائے السلام علیکم کہنے کے بسم اللہ بسم اللہ کہہ کر پاؤں چھونے لگا۔ حضرت نے فوراً ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ "میاں بسم اللہ عام طور پر دو جگہ پڑھی جاتی ہے۔ روٹی کھانے سے پہلے یا اپنی منکوحہ عورت کے پاس جانے سے پہلے۔ تم نے مجھے کیا سمجھا روٹی یا منکوحہ عورت"۔ نووارد سخت نادم ہوا۔ آپ نے محبت آمیز لہجہ میں اسے سمجھایا کہ "مسلمان جب کسی مجلس میں آئے تو پہلے السلام علیکم کہے۔ جو شریعت کا حکم اور کارِ ثواب ہے"

آپ نے ملک و ملت کے لئے قید ہو کر جو کارنامے سرانجام دیئے وہ بے حد و حساب ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور ہمیں ان کے اتباع کی توفیق ارزانی کرے۔ آمین

عندلیبِ نغمہ پیرا

بہاریں پھوٹتی تھیں اُن کے اندازِ تکلم سے
خطیب سحر ساماں تھے، جلیس محفل آرا تھے
وہ جب ترتیل کرتے تھے گمانِ وحی ہوتا تھا
تلفظ میں وہ کامل، حسنِ قرأت میں وہ یکتا تھے
شریعت کا امیر اُن کو کہا جاتا ہے تو سچ ہے
کہ شرع و دیں کے اسرار اُن کے نطق پر وا تھے
نبی تسلیم کر لیتے وہ کیسے قادیانی کو
نقوشِ پائے ختم المرسلیں پر وہ جبیں سا تھے
نظر بندی رہی ان کا مقدر فصلِ گل میں بھی
اگرچہ وہ چمن کے عندلیبِ نغمہ پیرا تھے
پڑا تھا قوم کی طبعِ مکدر کا غبار ان پر
بہارستان تھے پہلے بالآخر ایک صحرا تھے
نہیں سمجھے ہیں ہم مفہوم اب تک ان کے نغموں کا
وہ تھے تو نَے نفس جعفر مگر خاموش گویا تھے

جعفر بلوچ

سید والا حشم

اے سیدِ والا حشم اے خادمِ ملت
تھا تیرا وجود اس کے لئے رحمتِ باری
نسبت ہو تری کیسے کسی شہر و وطن سے
تو ضیغمِ اسلام تھا، ہندی نہ بخاری

ڈھلتے تھے تری بارگہِ نطق میں خورشید
اٹھتے تھے ترے چرخِ تخیل سے اُجالے
ہوتے تھے مصاحب ترے جم جاہوں کے ہمسر
بنتے تھے تری بزم میں بیکس بھی جیالے

تیتر ترے کرتے تھے عقابوں کا تعاقب
آہو ترے شیروں کی کچھاروں پہ بھی لپکے
پتھر بھی ترے پاؤں تلے بن گئے سنجاب
قطرے تری صہبا کے چناروں سے بھی ٹپکے

تھا تیرے لئے صیدِ زبوں قیصرِ افرنگ
ہر دام سے بچ نکلا ترے فقر کا شہباز
ہارا نہ کسی معرکہٗ دار و رسن میں
روکی نہ تری بند و سلاسل نے تگ و تاز

ناموسِ پیمبر کا تحفظ ترا ایمان
وابستگیٔ خواجہٗ بطحا تری للکار
بچ کر کہاں جاتا ترے احرار کی زد سے
گستاخِ رسالت کوئی بدگو و بداطوار

اے میرِ شریعت تری آواز کا جادو
یوں سر پہ چڑھا ہے کہ ابھی بول رہا ہے
اس وقت بھی ہندی متنبّی کا سنگھاسن
ہیبت سے تری صبح و مسا ڈول رہا ہے
سجادہ نشینوں کی کج آموزی کے اصنام
لاریب ترے نعرۂ تکبیر سے ٹوٹے
کیا جانئے یوں کتنے اسیرانِ ضلالت
ہر مبتدعِ دین کی تزویر سے چھوٹے

صبحوں نے سمیٹی ہے تری آنکھ کی شبنم
راتوں نے بھی لوٹی ہے گل افشانیِ گفتار
رک جاتے تھے آہو ترے نغمات کی لے پر
جھک جاتے تھے قرآن کی آیات پہ اشجار
کیا میری زباں اور کہاں تیرے محاسن
کھینچے گا قلم کیا ترے ایام کی تصویر
میں نے تجھے دیکھا بھی مگر خواب کی صورت
ہاتف نے بیاں اس طرح کی خواب کی تعبیر

اک حکمت و برہاں کا سمندر تھا بخاری
لوٌ لوئے معارف کا وہ اک گنج نہاں تھا
اک پیرِ شباب آور و دارائے تہور
ابلاغ و خطابت کا وہ دریائے رواں تھا
گزرے ہوئے طوفان کی اک موجِ سبک سیر
ڈوبے ہوئے سورج کی شعاعِ افق افروز
اک آتشِ پژمردہ کا تابندہ شرارہ
اک لوٹے ہوئے قافلے کی آہِ جگر دوز

نذیر حق

شاہ جی! کچھ یادیں کچھ باتیں

.... یہ ۱۹۵۹ء کے اواخر کا ذکر ہے! ان دنوں میں روزنامہ کوھستان (اب مرحوم) ملتان میں بطور سب ایڈیٹر کام کر رہا تھا۔ کوہستان ملتان سے ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء کو جاری کیا گیا۔ میرے استاذِ محترم جناب اقبال زبیری (جو روزنامہ مشرق کے چیف ایڈیٹر اور چیف ایگزیکٹو کے عہدہ پر کئی سال فائز رہنے کے بعد اب ریٹائر ہو چکے ہیں) کوہستان ملتان کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر اور نامور صحافی جناب ایثار راعی (اب ملتان سے شائع ہونے والے روزنامہ "قومی آواز" کے مالک و مدیر اعلیٰ ہیں) کوھستان کے چیف رپورٹر تھے۔

پہلے چند ماہ تو نیا اخبار نکالنے کی ہاؤ میں گزر گئے۔ جب ذرا سکون ہوا تو ملتان شہر پر زیادہ توجہ دینے کا آغاز ہوا۔ کبھی کوئی علاقہ، کبھی کوئی بازار کبھی کوئی محلہ ہم لوگوں کی "سیر گاہ" بنتا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ صبح تقریباً دس بجے ایثار راعی صاحب تیار ہو کر نکلنے کے موڈ میں تھے۔ میں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے تو بولے آج امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری (رحمتہ اللہ علیہ) سے ملنے کا قصد ہے۔

میں شاہ جی کے نام اور کارناموں سے واقف تھا۔ لاہور میں اپنی تعلیم کے دوران شاہ جی کی تقریریں سن چکا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ علم نہ تھا کہ ملت کا یہ نقیب اعظم ملتان کے کس گوشہ میں فروکش ہے۔ شاہ جی چند سال سے عملی زندگی سے گویا ریٹائر ہو چکے تھے اور ذیابیطس اور بعض دوسرے امراض کے باعث گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ قبل ازیں وہ خان گڑھ میں مقیم رہے تھے۔ شاہ جی کا نام سُن کر میرے دل میں بھی تحریک آزادی کے اس شعلہ بیاں مقرر کی زیارت کا شوق ابھرا اور میں نے ایثار صاحب سے درخواست کی کہ اگر وہ چند منٹ رک جائیں تو میں بھی ان کے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں حاضری کے لئے تیار ہو جاؤں۔

"چل چھیتی کر" (چلو جلدی کرو) ایثار راعی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور میرے کمرے میں ہی بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگے۔ ان دنوں روزنامہ امروز (اب مرحوم) اوز نوائے وقت بھی ملتان سے نکل آئے تھے۔ نوائے وقت ابھی تک ملتان سے نکل رہا ہے۔ اور پھل پھول رہا ہے۔

میں نے جلدی جلدی شیو کیا، لباس تبدیل کیا اور ایثار صاحب کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ ان دنوں کوھستان کا پورا عملہ حسن پروانہ کالونی کی ایک کوٹھی میں رہتا تھا جو دو منزلہ تھی۔ ہم اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ گھر سے نکلے اور پرانے شہر سے ڈیرہ اڈہ کی طرف جانے والی سڑک پر آ کر تانگہ پکڑا اور شاہ جی کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوئے۔ کوئی بیس منٹ بعد ہم محلہ ٹبی شیر خان پہنچے۔

ٹبی شیر خاں ملتان شہر کے شمال مشرقی کونے میں واقع ایک پسماندہ سا محلہ تھا۔ اگرچہ ۳۵ برس کے

شب و روز نے میری اس دور کی یادوں پر کافی گرد ڈال دی ہے لیکن میرے ذہن کے پردے پر آج بھی بعض تصاویر بڑی روشن ہیں جسے میں شاہ جی کی خدمت میں حاضری کی سعادت کا پر تو تصور کرتا ہوں۔ بات ہو رہی تھی ٹبی شیر خان کی۔ یہ پختہ، نیم پختہ اور کچے مکانوں کا ملغوبہ سا محلہ تھا۔ شاہ جی جس مکان میں مقیم تھے وہ بھی ایک عام سا نیم پختہ مکان تھا۔ مکان سے کچھ دور ہی ہم تانگہ سے اتر گئے

کوئی ڈیڑھ دو سو قدم چلنے کے بعد ہم شاہ جی کے ڈیرہ پر تھے۔ یہ یاد نہیں کہ شاہ جی کو ہم نے اپنی آمد کی اطلاع کس طرح پہنچائی ہاں یہ یاد ہے کہ اجازت ملنے پر ہم مکان کے اندر داخل ہوئے۔ بیرونی دروازے سے چند قدم پر ہی بائیں طرف وہ چھوٹی سی نیم پختہ کوٹھڑی (بیٹھک) تھی جس میں برصغیر کی اقلیم خطابت کا بے تاج بادشاہ آرام فرما رہا تھا۔

شاہ جی کوٹھری کے ایک طرف، مشرق و مغرب کے رخ عام سے بستر پر آرام فرما تھے۔ ایثار راعی صاحب کا شاہ جی سے خاص تعلق تھا۔ کوٹھری میں ایثار راعی پہلے اور میں بعد میں داخل ہوا۔ ایثار صاحب کو دیکھ کر اور ان کے سلام کے جواب میں "وعلیکم السلام" کہتے ہوئے شاہ جی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ ایثار صاحب نے میرا تعارف کرایا تو شاہ جی نے مسکراتے ہوئے دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے شاہ جی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔ میں ایک پینڈو ہوں اور گاؤں کے رہنے والوں کی مخصوص کیفیات (بلکہ عادات) سے اب تک پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اور آج سے ۳۵ برس قبل۔۔۔۔۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیں۔۔۔۔ میں نے جھک کر دست بوسی کی کوشش کی مگر انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور میرے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "بیٹھو بیٹھو"

اس کے بعد بھی میں ایثار صاحب کی رفاقت میں کئی بار شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کبھی کوئی سوال کرنے کی تو جرأت نہ ہوئی ہاں ان کی باتوں کو غور سے سنتا رہتا۔ ایثار صاحب کے ساتھ شاہ جی ملک کی صورت حال اور سیاست پر بھی باتیں کرتے۔ کبھی کبھار شاہ جی اپنے احوال بھی بیان کرتے اور اس بات پر دکھ کا اظہار کرتے کہ بعض لوگ جو ان کے طفیل معاشرے میں معزز بنے پھرتے ہیں، ان کو ملنے تک نہیں آتے۔

ان دنوں شاہ جی کو تنہائی کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ ذیابیطس کا مرض بھی زوروں پر تھا اور بعض دیگر عوارض بھی، لیکن لاکھوں کے مجمعے کو مبہوت کر کے بٹھا دینے والا یہ شعلہ نوا خطیب تنہائی کے دکھ سے زیادہ کسی اور تکلیف کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ایک بار تو انہوں نے اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا جب تک یہ بولتی تھی سبھی آگے پیچھے پھرتے تھے مگر اب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہ جی خاموش ہو گئے تنہائی کا گہرا دکھ ان کے چہرے سے عیاں تھا اور سچی بات یہ ہے کہ شاہ جی کی کوٹھری بھی غم میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک دن ہم گئے تو شاہ جی خوشگوار موڈ میں تھے۔ غالباً مرض میں کچھ افاقہ تھا۔ ذیابیطس کا ذکر بھی کیا اور

فرمایا کہ اس مرض میں مبتلا افراد کو جامن کھانے چاہئیں۔ وہ خود بھی جامن کھا کر فارغ ہوئے تھے جو شاید ان کے کسی عقیدت مند نے بھجوائے تھے۔ خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے ہوئے شاہ جی نے دوستوں اور دشمنوں کے متعلق بعض پتے کی باتیں کہیں۔ ان کی ایک بات جو آج تک میرے دل پر نقش ہے وہ یہ ہے کہ "جب کسی دوست سے ملنے جاؤ، لباس خواہ کیسا بھی ہو، منہ خوب دھو کر اور بال سنوار کر جاؤ کہ دوست تمہارے چہرے کو سب سے پہلے دیکھتا ہے اور شگفتہ چہرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ اسے آپ کے لباس وغیرہ سے کم ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی دشمن سے ملاقات کے لئے جاؤ تو لباس اچھا اور خاص طور پر جوتا چمک دار، صاف ستھرا پہن کر جاؤ کہ دشمن سب سے پہلے آپ کے پاؤں کو دیکھتا ہے۔ شاہ جی کے اس فلسفے کا مجھے کئی بار عملی تجربہ ہوا اور میں نے اسے سچ پایا۔

شاہ جی نے ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز تیسرے پہر اس بے مثال خطیب اور شعلہ نوا مقرر کی نمازِ جنازہ غالباً ایمرسن کالج کی گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ جنازہ میں دو لاکھ کے لگ بھگ انسان شریک تھے۔ بہت سے لوگ جن میں حضرت شورش کاشمیری بھی شامل تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔ شاہ جی کو جلال باقری قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اتنا بڑا جنازہ ملتان کی تاریخ میں اس سے قبل اور اس کے بعد دیکھنے میں نہیں آیا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۳۴ء میں شاہ جی۔ نے ملتان میں معراج النبی ﷺ کے ایک عظیم جلسہ سے جو باغ لانگے خاں میں منعقد ہوا خطاب کیا۔ عشق رسول ﷺ میں ڈوب کر شاہ جی نے جو تقریر کی ہو گی اس کا حال سنانے والا اب شاید کوئی ہو، لیکن مشہور ہے کہ شاہ جی کی تقریر سن کر جلسہ میں شامل ایک مجذوب نے نعرہ مستانہ بلند کیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ملتانی زبان میں کہا "سیدا! شالا اتھائیں دفن تھیویں" (اے سید زادے، خدا کرے تو یہیں دفن ہو، اور مجذوب کی یہ دعا رُبع صدی بعد قبول ہوئی اور ملتان کی مٹی کو ہی یہ سعادت نصیب ہوئی کہ بیسویں صدی کا یہ فقید المثال اور عظیم خطیب محو خواب ہے۔

سید عبدالحمید عدم (مرحوم) نے شاہ جی کی وفات پر ایک حیرت انگیز نظم لکھی۔ اس کے آخری دو اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ادا کر کے فرض اپنی خدمات کا
سحر دم جاگا ہوا رات کا
ابد کے نگر کو روانہ ہوا
مکمل سفر کا فسانہ ہوا

***

جعفر بلوچ - لاہور

توحید اور رسالت کا انتھک مناد

آج بخاری سید کی پھر آئی یاد
وہ اپنا اک راہ نمائے پاک نہاد
عشق اساس و عشق سرشت و عشق نژاد
زندہ باد امیر شریعت زندہ باد

ظاہر میں احرار کا ایک سالار تھا وہ
اصل میں ساری ملت کا غم خوار تھا وہ
اس کا تابندہ دل تھا اسلام آباد
زندہ باد امیر شریعت زندہ باد

ملت بیضا پر وہ خدا کا احساں تھا
ناشر ختم نبوت، شارح قرآں تھا
توحید اور رسالت کا ان تھک مناد
زندہ باد امیر شریعت زندہ باد

بھر نماز عشق اذاں دینے والا
آزادی کی خاطر جاں دینے والا
یعنی مجسم ایقان و ایثار و جہاد
زندہ باد امیر شریعت زندہ باد

سحر سخن سے ایسے نقش اگاتا تھا
لحن اور لفظ سے وہ تصویر بناتا تھا
پھیکے پڑجاتے تھے مانی اور بہزاد
زندہ باد امیر شریعت زندہ باد

ذکر امیر شریعت یا رب اور بڑھے
اس کی عزت و عظمت یارب اور بڑھے
یارب اس پر اپنی رحمت کر ایزاد
زندہ باد امیر شریعت زندہ باد

اختر کاشمیری

عندلیبوں کا سوز اور شیروں کی گرج

زندگی میں بڑے بڑے خطیبوں کو دیکھا اور بارہا دیکھا۔ لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کو صرف ایک بار دیکھا۔ اور پھر کسی کو دیکھنے کی حاجت نہ رہی۔ اگر جمود کی ضد حرکت ہے تو حرکت کا اطلاق صرف سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی حرکت تھے جن کے ساتھ ہر شے متحرک ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اپنی ۷۱ سالہ مستعار زندگی میں کروڑوں انسانوں کو متحرک بنا دیا۔ اگر تاریکی کی ضد روشنی ہے تو بلاشبہ سرزمین ہندوستان کے تاریک اور سحر زدہ ماحول میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی وہ چراغ تھے جن سے لاکھوں چراغ روشن ہو کر مسجد و منبر کی زینت بنے۔ ایسے بہت سے مقرر دیکھنے میں آئے ہیں جو مجمع کو ہنسانے اور رلانے پر قادر تھے۔ لیکن اشکوں کے طوفان میں مسکراہٹوں کی تجلیاں اور چیخوں کے شور میں قہقہوں کا امتزاج صرف شاہ جی کے سامعین میں نظر آتا تھا۔ ادھر شاہ جی وارد ہوئے مجمع ساکت و جامد ہوا۔ ادھر شاہ جی نے تلاوت شروع کی ادھر آنسوؤں کی ایک جھڑی برسنے لگی۔ ادھر شاہ جی نے سر کو ذرا جنبش دی ادھر مسکراہٹوں کی بجلیاں چمکنے لگیں۔ ادھر شاہ جی نے ایک گرج دار آواز سے پکارا ادھر پہلو سے دل نکلنے لگے۔ ادھر شاہ جی نے ذرا لحن داؤدی چھیڑا ادھر دلوں کی حرکتیں بند ہونے لگیں۔ ادھر شاہ جی نے ایک لطیفہ چھوڑا ادھر آہ و فغاں میں قہقہوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ غرض شعلہ و شبنم کا یہ اجتماع بھی صرف شاہ جی کے سامعین کا حصہ تھا۔ شاہ جی واقعی شہنشاہ خطابت تھے۔ لفظوں کو موقع محل کے مطابق استعمال کرنا اور فقروں کی نوک پلک سنوارنا ان کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ناخن تدبیر کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا اور ان کے گھر کی باندی، محاورہ خانہ زاد اور خطابت لونڈی تھی۔ فی الجملہ اس باب میں وہ یکتائے روزگار تھے۔ ان کی تقریر میں تلواروں کی جھنکار، جذبہ ایثار، اخلاق بیدار، زمین کی عاجزی، فلک کا مذاق، سرکشی، آفتاب کا تبسم، صبا کا خرام ناز، گھٹاؤں کی رقت، بجلی کی تڑپ، کہکشاں کی بیداریاں، چشموں کی بیتابی، پہاڑوں کی استواری، کانٹوں کی خلش، گلوں کی لطافت، پہاڑوں کا استقلال، سمندروں کا سکوت، آتش کی گرمی، دریاؤں کی روانی، نرگس کی حیرانی، عندلیبوں کا سوز، شیروں کی گرج، صوفیوں کا مزاج عارفانہ، سب ہی کچھ موجود تھا۔ بخاری ایک ایسا دن تھا جسے آفتاب کی حاجت نہ تھی۔ ایک ایسی رات جسے چاند ستاروں کی ضرورت نہ تھی۔ وہ آن کی آن میں جلسہ گاہ کو قرون اولیٰ کے ماحول میں لے جاتے اور پلک جھپکنے کی دیر میں میدان محشر کا سماں پیدا کر دیتے۔ ان کے سامعین کی سوچ و سمجھ کی صلاحیتیں اس وقت تک سلب رہتی تھیں جب تک وہ بخاری کا چہرہ دیکھتے رہتے۔ بخاری کو قتل کرنے کے لئے دشمن بارہا جلسہ گاہ میں آئے لیکن جیب و داماں کی آخری متاع بھی بخاری پر نثار کر گئے۔ بخاری کے سامعین کے دل پہلو سے نکل کر بخاری کے ہاتھوں میں آ جاتے تھے۔ وہ پوری پوری رات انہیں گرماتے اور تڑپاتے رہتے تھے۔ بخاری کی خطابت کی کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ اصحاب صفہ کی

سادگی، عثمانؓ کی حیا داری، خالد کی جرأت، لقمان کی حکمت، ارسطو کی دانش، حاتم کی سخاوت، سکندر کا دبدبہ، غزالی کا علم و فضل اور فلسفۂ حکمت، امام بخاری کا تقویٰ، ابن حجر عسقلانی کی ذہانت و خطابت، ابن تیمیہ کا علم و تبحر، امام رازی کی عقدہ کشائی، شاہ ولی اللہ کا فہم و ادراک، شاہ اسماعیل شہید کا جلال جھلکتا نظر آتا ہے۔

اس وقت میں ایسے مقام پر بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں جہاں میرے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں جس سے بخاری کا نمونہ تقریر پیش کر سکوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی نصف سے زائد عمر ریل و جیل میں کٹی۔ یہ انہیں کا اعجاز تھا کہ اپنے پرائے سبھی کو ساری زندگی گلے لگائے رکھا اور دینی پرچم تلے سنی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث، تمام ہی کو اکٹھا کر دکھایا۔

خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طفینت را

اب تک دل و جاں اُس کی محبّت سے ہیں سرشار

اک مرد خود آگاہ و خدا بین و خدامست
اس عہد میں میراثِ نبوت کا سزاوار
اسلام کی پاکیزہ روایات کا حامل
ناموسِ رسالت کا نگہبان و نگہدار
خم خانۂ توحید کا اک رندِ بلانوش
مے خانۂ سنت کا سدا مست قدح خوار
بت خانۂ بدعت کے لئے ضرب براہیم
اسلام کی تائید میں اللہ کی تلوار
حق گوئی و بے باکی میں شہباز خطابت
غیور و جری مردِ خدا پیکر ایثار
لیلائے خطابت کے سنورتے گئے گیسو
منبر پہ ہوا جب بھی وہ آمادۂ گفتار
محفل میں وہ بیٹھا ہو تو جھونکا تھا صباء کا
منبر پہ کھڑا ہو تو تھا تلوار کی جھنکار
نس نس میں سمایا ہے ریاض اس طرح وہ شخص
اب تک دل وجاں اس کی محبت سے ہیں سرشار

ریاض رحمانی

علامہ لطیف انور

بول بالا رہے بخاری کا

اے قلم! اے ذریعۂ اظہار
آج کاغذ پر اپنا سر دے مار

اپنے سینے کو اس طرح کر چاک
لفظ ڈالیں خود اپنے سر پر خاک

ذکر احساس کی تباہی کا
نام روشن نہ ہو سیاہی کا

طرز تحریر نا امید ہوا
خون کاغذ کا کیوں سفید ہوا

خامشی - کو پکارتا ہوں میں
دل میں خنجر اتارتا ہوں میں

وقت کیا دار پر چڑھا دے گا
بات کو اس قدر بڑھا دے گا

اشک آنکھوں میں تھم کے رہ جائے
آہ ہونٹوں پہ جم کے رہ جائے

کارواں آس کا لٹا کیسے
کیا بتاؤں اگر کوئی پوچھے

کون تھا میرِ کارواں میرا
کیا نہیں کوئی رازداں میرا

سب مرے راز دار ہیں لیکن
اپنی راتیں ہیں اور اپنے دن

میرے دن شوقِ وصل سے محروم
میری راتیں فراق سے مغموم

میں ہلاکِ غمِ جدائی ہوں
پیکرِ رنجِ بے نوائی ہوں

مجھ کو یارا نہیں سخن کیسا!
مجھ کو اب شوقِ انجمن کیسا

شمع خاموش ہو گئی جب سے
لب جدا ہو سکا نہ پھر لب سے

کوئی پروانہ جان کیا دے گا
عشق کو اب زبان کیا دے گا

کان ترسیں گے اس کہانی کو
اوج جس نے دیا جوانی کو

جس نے پیری کو آبرو بخشی
جس نے اخلاص کو نمو بخشی

جس کا عنوان تھا کوئی درویش
جس کا ہر سانس تھا سعادت کیش

کون درویش؟ مجھ کو کیا معلوم
کیا کھلے تجھ پر اے غمِ مرقوم

اس کی تصویر میں دکھاتا ہوں
اس کی باتیں تجھے سناتا ہوں

اس کی تصویر کا سوال نہیں
اس میں وہ قال اور حال نہیں

اس کی ہر بات یاد آئے گی — اشک کیسے، لہو رلائے گی

کس کو دعوئے تھا غم گساری کا — آؤ ماتم کریں بخاری کا

وہ بخاری کہ تھا عطا حق کی — وہ بخاری کہ تھا صدا حق کی

جس کو باطل جھکا سکا نہ کبھی — جس کو باطل دبا سکا نہ کبھی

جس کے پہلو میں تھا دل زندہ — جس کے دل میں تھا عشق تابندہ

عشق دارو رسن سے بے پروا — نغمہ برلب رہا یہاں کیا کیا

کتنی اونچی تھی جبر کی دیوار — پھر بھی پیدا تھے صبر کے آثار

وہ ستم آدمی کے سہتا تھا — خوف دل میں خدا کا رہتا تھا

بے نوا تھا مگر نرالا تھا — وہ جہاں تھا وہاں اجالا تھا

منبعِ نور اس کی پیشانی — اس کا چہرہ مدارِ تابانی

اس کے گیسو جمال کی ترتیب — اس کی آنکھیں سُرور کی تشبیب

ہائے وہ آب تھا نہ وہ گل تھا — وہ ہمہ حسن تھا ہمہ دل تھا

اب کہاں اس کو ڈھونڈنے جائیں — اب اسے ہم کہاں سے لے آئیں

سن، وہ آواز کان میں آئی! — دل کی دھڑکن زبان میں آئی

ایک سناٹا چھا گیا ہر سو — بولا سر چڑھ کے نطق کا جادو

جیسے ہستی فضا میں جھومی ہے — زیست مرکز کی سمت گھومی ہے

دل جھکے عشق کی نماز ہوئی — حق کی آواز سرفراز ہوئی

چپ ہے کیوں، بول کر دکھائے اب — کوئی لب کھول کر دکھائے اب

وہ خدا کا کلام پڑھتا ہے — سیل کی طرح آگے بڑھتا ہے

اس کو روکیں گے کیا خس و خاشاک — اس کے رستے میں کوئی ٹھہرے خاک

لو، بھرم کھل گیا بلاغت کا — بند ہے ناطقہ فصاحت کا

گنگ ہے فلسفہ ہے یا منطق — چہرہ دونوں کا ایک سا ہے فق

عرش سے لائی کیا اثر آواز — اس نے الحمد سے کیا آغاز

ہے ثنا خالق دو عالم کی — چھٹ گئی ہر طرف گھٹا غم کی

ایک تسکین کا ظہور ہوا — دل کو حاصل عجب سرور ہوا
ڈھل گیا داغ بے قراری کا — بول بالا رہے بخاری کا
ہائے اب وہ صدا نہیں آتی — غم سے کیا پھٹ نہ جائے گی چھاتی
اس کی قربت تھی دل کی آبادی — وہ سراپا تھا درس آزادی
دل لرزتا تھا اس سے ٹامی کا — پاؤں ٹکتا نہ تھا غلامی کا
بھوک اور پیاس کی سزا کیا تھی — اس کو معلوم تھا وفا کیا تھی
قید میں بھی رہا سدا آزاد — اس کا منہ تکتا تھا ہر اک شداد
کوئی فرعون جب ہوا دوچار — بڑھ گیا اور جذبِ دل کا وقار
تمکنت عشق کی نمایاں تھی — کوئی منزل تھی، اس کو آساں تھی
وہ گدا تھا درِ محمد کا — پاس تھا اس کو عظمتِ جدّ کا
حق و باطل میں امتیاز رہا — وہ فقیری میں بے نیاز رہا
اس کا ثانی کہاں سے لائے گا — کیا اسے کوئی بھول جائے گا
فکر میں بود و باش ہے اس کی — زیست کو خود تلاش ہے اس کی

❊❊❊

۔ ندیم انبالوی

اگر دعاؤں سے کام چل سکتا تو.......

(چند یادیں)

ایک دفعہ میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے حسب عادت آٹو گراف کے لئے بک ان کی طرف بڑھائی۔ شاہ جی فرمانے لگے، میں تو ایک درویش آدمی ہوں۔ یہ باتیں لیڈروں کو زیب دیتی ہیں۔ بھائی، میں لیڈر نہیں ہوں۔ میں نے بہت اصرار کیا، مگر شاہ جی نہ مانے۔ شاہ جی، لاہور تشریف لے جانے کے لئے ملتان اسٹیشن پر فروکش تھے۔ راقم نے تصویر لینے کی خواہش ظاہر کی تو فرمایا نہیں بھائی! میرے افکار ہی میری تصویر ہیں۔ انہیں اپنالو تو ان ہی میں میرا عکس نظر آئے گا۔

ایک صاحب شاہ جی سے باتیں کر رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا، شاہ جی! اس دور کے انسانوں کو سکون کی زندگی نصیب نہیں ہے۔ ہر شخص مصائب کی چکی میں پس رہا ہے۔ فرمایا... بھائی مسلمان قرآن اور حدیث پڑھنے کی بجائے شکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے لگے ہیں۔ مصائب سے نجات کیوں ہو؟۔ سکون نصیب ہو تو کیسے؟ تحریک ختم نبوت کے زمانے میں شاہ جی سے کسی نے کہا۔ شاہ جی ایسے کام نہ کیجئے جن سے آپ کو تکلیف برداشت کرنا پڑے۔ اب آپ ضعیف ہیں۔ ضعیف العمری کا تقاضا ہے کہ اب آپ آرام کریں۔ شاہ جی نے بڑے جلال سے کہا۔ ناموس رسالت ﷺ خطرے میں ہے۔ اغیار، شمع رسالت بجھانے کے در پے ہیں اور تم ہو کہ مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے رہے ہو؟ بھائی تم مجھے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں خود کشی کر لوں؟ بخاری زندہ ہو اور خاموش رہے؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ ان صاحب کی یہ حالت تھی کہ...... کاٹو تو لہو نہیں بدن میں!

شاہ جی اپنے مکان کی بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ ان کے قریب ہی بہت سے عقیدت مند فروکش تھے کہ اتنے میں ایک بڑھیا آئی اور کہا۔ میری بیٹی جوان ہے۔ پیسے نہیں ہیں۔ میں اس کی شادی کیسے کروں؟ شاہ جی فوراً اندر تشریف لے گئے اور کپڑے کی ایک تھیلی بڑھیا کے حوالے کر دی۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

اور یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے..... تب میں روزنامہ ''ستلج'' بہاول پور میں سٹاف رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا، اشتہارات کے فقدان اور نیوز ایجنٹوں کے عدم تعاون کی بناء پر روزنامہ ''ستلج'' مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ پہلے یہ اخبار چار صفحات پر چھپتا تھا، پھر دو پر آ گیا۔ پھر ایک دن ایسا بھی طلوع ہوا کہ مسٹر علی احمد رفعت نے روزنامہ ''ستلج'' کو بند کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی کیونکہ ان کے پاس جو بھی پونجی تھی وہ اس کی نذر کر چکے تھے۔ میری ملازمت ختم ہو گئی اور مجھے یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

اس وقت ملتان سے صرف روزنامہ "نوائے وقت" نکلتا تھا اور اس کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر مسٹر ہمایوں ادیب تھے۔ میں بہاولپور سے ملتان پہنچا۔ ملازمت چلی جانے سے ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا۔ میں ریلوے سٹیشن سے سیدھا شاہ جی کے دولت کدہ واقع کوٹلہ تولے خاں پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے دروازہ پر دستک دی۔ چند ساعتوں کے بعد دروازہ کھلا اور شاہ جی کو بنفس نفیس اپنے سامنے پا کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایشیا کا سب سے بڑا خطیب مجھے اس سعادت سے نوازے گا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے والد مرحوم کا نام بتایا تو شاہ جی نے جذباتی انداز میں مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ بڑی شفقت سے کافی دیر تک میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

شاہ جی اپنے کمرے میں دری پر تشریف فرما ہو گئے۔ میں بھی دوزانو ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ شاہ جی مرحوم ماضی میں کھو گئے اور ایام رفتہ کا تذکرہ کرنے لگے۔ پھر فرمایا کہ کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی ملازمت سے جواب مل گیا ہے۔ بیروزگاری سے سخت ذہنی کرب و اذیت میں مبتلا ہوں۔ اب ملازمت کے لئے ملتان آیا ہوں۔ دعا فرمائیں کہ مجھے اخبار میں ملازمت مل جائے۔

شاہ جی نے میری بات سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ پھر تھوڑے توقف کے بعد فرمایا کہ میرے بھائی! دعاؤں پر تکیہ کرنے کی بجائے جدوجہد کیجئے۔ اس کے ساتھ ساتھ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کیجئے میں شاہ جی کا یہ جواب سن کر افسردہ سا ہو گیا۔ انھوں نے میری پریشانی کو بھانپ لیا اور فرمانے لگے کہ میرے نانا (حضور اکرم ﷺ کو شاہ جی ہمیشہ نانا ہی کہا کرتے تھے) کا اسوہ حسنہ قیامت تک نوع انسانی کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی پوری عملی زندگی جدوجہد کا بہترین نمونہ ہے۔ حضور اکرم نے قدم قدم پر مصائب برداشت کیے، کفار سے جنگیں لڑیں حتیٰ کہ ایک جنگ میں آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔

یہ درست ہے کہ مسلمان کے لئے دعا آخری ہتھیار ہے لیکن اس ہتھیار کو استعمال کرنے کے علاوہ عملی زندگی میں سعی وجہد بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلام اور حضور ﷺ کی تعلیمات بھی یہی ہیں لیکن پیشہ ور پیروں اور دنیا دار درویشوں نے آقائے نامدار ﷺ کی ان مقدس تعلیمات کے علی الرغم تعویذ گنڈوں کو جلب زر کا ذریعہ بنا لیا اور وہ مشکلات میں گرفتار لوگوں کی جیبوں پر خوب ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس ملت میں ایسے بھی پیر پیدا ہوئے جنھوں نے عربوں کے خلاف انگریز کی حمایت میں لڑنے والے سپاہیوں کو تعویذ دئیے کہ انہیں بازوؤں پر باندھ لینے سے دشمن کی گولی ان پر اثر نہیں کرے گی۔ ایسے لوگ دین کی پیشانی پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھائی! میں ان میں شامل نہیں ہوں۔

شاہ جی فرمانے لگے کہ بھائی اگر صرف دعاؤں سے کام چل سکتا تو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور اس کے بعد قیام پاکستان تک چلنے والی تحریکوں میں لاکھوں مسلمان تہ تیغ نہ ہوتے، ہزاروں کی املاک برباد نہ ہوتیں اور نہ انگریزی سامراج سے اتنی طویل جنگ لڑنا پڑتی بلکہ ہم بہت پہلے انگریز کو برعظیم سے نکال چکے ہوتے۔ بھائی! وقتی مصائب سے گھبرانے کی بجائے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ یہی شیوہ مردانگی ہے۔ جائیے

جدوجہد کیجئے اور اس کے ساتھ دعا بھی! اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں - جلد وہ رزق کی بہم رسانی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ بنا دیں گے۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

میں جب شاہ جی سے مصافحہ کر کے باہر نکلا تو بے روزگاری کی وجہ سے میرے دل و دماغ پر جو پریشانی غالب تھی وہ کافور ہو چکی تھی اور میں ہشاش بشاش ہو کر ملازمت کی تلاش میں نکل پڑا۔ تب سے میں نے محنت کو، جدوجہد کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ ہر موقع پر خدا کی نصرت میرے شامل حال رہی اور آج تک کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ اب جب بھی ابتلاو آزمائش کا کوئی مرحلہ پیش آتا ہے تو میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے شاہ جی مجھے ہمت و استقلال کی تلقین فرما رہے ہوں اور میں مشکلات سے دل برداشتہ اور دل گرفتہ ہونے کی بجائے اپنے ان کا مقابلہ کرنے کی نئی قوت اور توانائی کار فرما پاتا ہوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرے والد مرحوم کے سالہاسال سے تعلقات تھے۔ اور جس وقت شاہ جی نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا اور تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں جدوجہد شروع کی اس وقت والد صاحب پنجاب میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ یہ تعلقات ۱۹۲۱ء میں شروع ہوئے اور میرے والد صاحب کی زندگی تک قائم رہے۔ والد صاحب کی وفات سے پانچ سال قبل میں نے ۱۹۳۷ء میں لاہور میں وکالت شروع کر دی تھی۔ مگر شاہ جی کی شفقت میرے ساتھ اس سے سالہا سال پہلے سے تھی۔ اور مجھ پر ان کی عنایت آخری ایام تک رہی۔ آخری زمانہ میں شاہ جی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے۔ اور ملتان میں سکونت نے مستقل صورت اختیار کر لی تھی۔ اس زمانہ میں بھی جب بھی مجھے ملتان جانے کا موقعہ ملا۔ شاہ جی نے اکثر یاد فرمایا۔ اور مجھے فیضِ صحبت سے مستفیض کیا۔

میرے لئے شاہ جی کی حیثیت سیاسی رہنما سے بڑھ کر ایک مُشفق بزرگ کی تھی۔ جس کا چالیس سال میں نے احترام کیا۔ اور جنہوں نے مجھ سے محبت کی۔ میں نے جب سیاست میں دخل دینا شروع کیا تو ہماری راہیں ایک نہ تھیں مگر اس کے باوجود نہ ان کی عنایات میں فرق آیا نہ میرے احترام میں۔

میں نے شاہ جی کے خطبات بھی سنے ہیں۔ میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ زور بیانی کے ساتھ جو شیرینی ان میں موجود تھی وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ ہزارہا لوگ گھنٹوں ان کی تقریر سنتے۔ اور ان کی خوبیٔ تقریر پر سر دُھنتے تھے۔ غالباً اپنے زمانہ میں وہ اور نواب بہادر یار جنگ مسلمانوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ مقررین تھے۔ گو دونوں کا رنگ جدا تھا۔ مگر درازیٔ تقریر اور شیریں مقالی دونوں میں مشترک تھی۔

ذاتی زندگی میں درویشی ان کی نمایاں تھی۔ عشقِ رسول کے ساتھ توحید پر اصرار انکی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مرتبہ انہوں نے قید و بند کے مصائب کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اور تحریک تحفظ ختم نبوت میں سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے۔

انہیں تو لازماً مرنا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ آج ہماری قوم نہ صرف ایسی جلیل القدر ہستیوں کو آہستہ آہستہ فراموش کر رہی ہے بلکہ موجودہ دور میں ایسے اصحاب کے وجود سے محروم بھی ہو رہی ہے۔

میاں محمود علی قصوری مرحوم بار ایٹ لاء

اقبال راہی

پیشانئ افکار کا جھومر

تہذیب و شرافت کا سمندر تھے بخاری
اخلاق و مروّت کے شناور تے بخاری

وہ کام سرانجام دیا زیست میں اپنی
دنیا نے کہا مردِ قلندر تھے بخاری

احساس کی قندیل جلاتے رہے ہر سو
ایثار کا نایاب ثمرور تھے بخاری

تقریر میں ثانی نہیں ملتا کوئی ان کا
پیشانئ افکار کا جھومر تھے بخاری

دنیا کو صداقت کا سبق دے کے گئے ہیں
لاریب مقدر کے سکندر تھے بخاری

وہ دولت بیدار عطا کی گئی اُن کو !
ہر منزل احساس کے رہبر تھے بخاری

باطل کا کوئی خوف نہ موجود تھا دل میں
ہر حال میں سچائی کا پیکر تھے بخاری

منہ بولتی تصویر تھے تکریم و حیا کی
اور واقف تعظیم پیمبر تھے بخاری

پیغام دیا قوم کو حب الوطنی کا
اک شاعر خوش طینت و خوش تر تھے بخاری

راہی انہیں کیونکر نہ کرے یاد زمانہ
پاکیزہ خیالات کا محور تھے بخاری

بیادِ امیرِ شریعت

وہ شخص جو حدیقۂ دیں کی بہار تھا

وہ شخص جو حدیقۂ دیں کی بہار تھا　　اللہ کی عطا تھا، شریعت مدار تھا
شعلہ بھی تھا، شعاع تھا، برق و شرار تھا　　مانند شیر نر تھا، فرنگی شکار تھا

ابلیسیوں پہ اس کے تریڑے شہاب وار
یوں پڑ رہے تھے جیسے بتوں پر خدا کی مار

جو مٹ کے بھی کبھی نہ مٹے وہ نشان تھا　　جو کٹ کے بھی کبھی نہ رکے وہ زبان تھا
ابنائے دیں کے حق میں ردائے امان تھا　　اعدائے دیں کے حق میں کڑکتی کمان تھا

دشمن مچان پر تھے مگر ہانپتے ہوئے
اپنے لہو سے اپنے تبر ڈھانپتے ہوئے

وہ شخص تھا سپہرِ خطابت کا آفتاب　　مٹھی میں جس کی موم صفت، شیخ ہوں کہ شاب
لفظوں کا بادشاہ، تراکیب کا شباب　　لہجے میں رس، بیاں میں قیامت کا التہاب

اس کے سخن میں شعلہ و شبنم تھے یوں بہم
"کالطیر فی الحدیقۃ واللیث فی الاجم"

وہ طنطنہ کہ ارض و سما بولنے لگیں!　　بے جاں پرند لفظوں کے پر تولنے لگیں
جب حرف و صوت اپنے صدف کھولنے لگیں　　پھر لب، کہ بے تکان گہر رولنے لگیں

تکرار لفظ وہ کہ بیاں کو خبر نہ ہو
گویا وہ تیغ جس کی میاں کو خبر نہ ہو

تو کیا گیا مزاج حکومت بگڑ گیا　　تو کیا گیا کہ نخل شجاعت اکھڑ گیا
یوں لگ رہا ہے، قحط سا جذبوں کا پڑ گیا　　تو کیا اٹھا کہ کرق خطابت اجڑ گیا

یہ وضع دفن ہو گئی ہمرہ جناب کے
"اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"

پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی (لاہور)

سید محمد ذوالکفل بخاری

جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک

یادش بخیر، الطاف گوہر صاحب آج کل "نوائے وقت" میں "جنوں کی حکایت" لکھ رہے ہیں۔ اردو دان اور اردو خواں عوام کے لئے، ان ایسے خواص کا اتنا تردد، عین الطاف اور عین نوازش ہی تو ہے۔

"ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے"

لطف سخن تو ہے ہی خداداد چیز، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ مطلعوں، مقطعوں یا ان کے بیچوں بیچ، سخن گسترانہ باتوں کی "تنصیب" کا جیسا ہنر انہیں آتا ہے، اس میں بھی وہ یکتا ہیں۔ بلکہ یکہ تاز ہیں۔ اپنے یکم دسمبر (۹۳ء) کے کالم "باتیں نواب کالا باغ مرحوم کی" ---------- میں الطاف صاحب نے حسب معمول بڑے مزے کی اور بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں ------ فیض احمد فیض نے کہا "دیکھو نا! جبر کی بھی ایک سائنس ہے۔ جسے ہر وہ شخص جو اقتدار کی کرسی پر قبضہ کر لے نہیں سمجھ سکتا۔ بعض مستند جابر ہوتے ہیں اور بعض، نوآموز، اب نواب کالا باغ تھا، نجیب الطرفین جابر، کیا مجال کسی چھوٹے آدمی پر ہاتھ ڈالے مگر سارے مغربی پاکستان میں اس کی دہشت تھی۔ بھٹو صاحب اس کی نقل کرتے تھے مگر جبر کی سائنس سے ناآشنا تھے۔"

یوں، الطاف صاحب نے اپنے کالم میں جبر کی سائنس کو حوالہ بنا کر نواب کالا باغ مرحوم کی شخصیت اور کردار کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اول تو ہماری سمجھ میں یہ جبر کی سائنس آئی ہی نہیں۔ دیکھئیے، ایک ہوتی ہے جبریت، جسے آپ ایسے پڑھے لکھے Fatalism یا Determinism کہیں گے۔ اور ایک ہوتی ہے جباریت، جسے شاید آپ Omnipotence کہیں گے۔ اب اگر ان کی کوئی سائنس، دریافت کر لی جائے تو ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ لیکن یہ جو جبر کی سائنس ہے، یہ تو مستلزم ہوگی ظلم واستبداد اور جور وجفا کی سائنسز کو۔ اور جور کی سائنس، آپ کو پتا ہے، عبارت ہے ------ "افضل الجہاد، کلمۃ الحق عند السلطان الجائر" سے! جائر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنے سے (جی ہاں! سلطان جابر نہیں، سلطان جائر!) جبکہ جفا کی سائنس ------؟ یہ تو بہت پرانی ہے۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر
بہ پیش عاشقاں شرمندہ باشی

کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ظلم، ظلم ہوتا ہے، استبداد، استبداد ہوتا ہے۔ اور جبر، جبر ہی ہوتا ہے۔ باقی رہی جبر کی سائنس، تو ---- دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ ہاں البتہ یہ اپنی اپنی قسمت اور ہمت پہ موقوف

ہے کہ کون نواب کالا باغ اور بھٹو کے دور میں مقتل کو سرخرو کرتا ہے اور کون منصب و جاہ کو!

ایک اور بات جس پر ہم چونکے اور ٹھٹکے، ------- ہے وہ بھی سخن گسترانہ! الطاف، صاحب روای ہیں کہ نواب کالا باغ نے ان سے کہا۔

"ایک دفعہ عطاء اللہ شاہ بخاری میانوالی تشریف لائے، ان کی جادو بیانی کا یہ اثر ہوا کہ ضلع بھر کے لوگ رات رات بھر بیٹھے ان کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے، انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نواب کالا باغ کے ظلم اور جبر کے خلاف جہاد کا علم لے کر نکلے ہیں، نواب صاحب کے مخالفین نے شاہ صاحب کو اور چڑھا دیا۔ بے شمار لوگ اس جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ جمعرات کی شام کے جلسے میں انہوں نے اپنے جاں فروشوں کو اطلاع دی "کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سر پر کفن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا، کیا آپ میرے ہمراہ چلیں گے؟" حاضرین جلسہ نے بیک زبان کہا "ہاں چلیں گے" اس اعلان کی گونج نواب کالا باغ کے کان بھی پڑی۔ انہوں نے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں یہ پیغام بھجوایا کہ حضور شاہ صاحب بڑی خوشی سے کالا باغ تشریف لائیے، جو کفن آپ سر پر باندھ کر آئیں گے ہم آپ کو وہی کفن پہنا کر واپس بھیج دیں گے" نواب صاحب کے قول کے مطابق شاہ صاحب نے پیغام ملنے کے بعد کالا باغ آنے کا ارادہ ترک کر دیا، تو جبر کی سائنس یہ ہے کہ مدمقابل کو پہچانو اور جب اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالو تو یہ اطمینان کر لو کہ تمہارے پاؤں زمین پر جمے رہیں، اور وار کرو تو ایسا کہ رقیب روسیاہ جانبر نہ ہو سکے۔ کسی کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔"

اب میں کیا عرض کروں، کہ یہاں تو جبر کی سائنس، انتہائے لاغری سے دکھائی بھی نہیں دے رہی۔ دعویٰ، دلیل، روایت اور درایت کی رو سے بلکہ رو رعایت سے بھی، اس حکایت کو پایہ ثقاہت تک پہنچانا محال ہے۔ پایہ ثقاہت کہاں، اسے پایہ ثبوت تک بھی نہیں پہنچایا جا سکتا۔ وہ کیوں؟ اس لیے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری، ایک دفعہ نہیں، بہت دفعہ میانوالی تشریف لے گئے۔ لیکن یہ کفن والی بات تو کبھی نہیں سنی گئی۔ بالکل بھی نہیں۔ ہاں، شاہ صاحب کے ایک ساتھی تھے مولانا محمد گل شیر! احراری خطیبوں کی کہکشاں میں بہت نمایاں تھے۔ یہی وہ "مرد حر" تھا جس نے ۱۹۴۳ء میں نواب کالا باغ کے مظالم کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز کیا اور ۱۹۴۴ء کے وسط میں، نواب صاحب کے حسب الارشاد، کفن اوڑھ کر، آسودہ خاک ہو گیا۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کر دینا یوں بھی ضروری ہے کہ آج کی نسل تو نواب کالا باغ سے بھی کچھ زیادہ واقف نہیں چہ جائیکہ اسے مولانا گل شیر اور عطاء اللہ شاہ بخاری کے افکار و سوانح سے کچھ علاقہ ہو۔

یہ مولانا گل شیر ضلع اٹک کے ایک گاؤں (ملھووالی) کے رہنے والے تھے۔ شمالی پنجاب میں اٹک، کیمبل پور، میانوالی، سرگودھا، خوشاب، جہلم وغیرہ کے علاقوں میں یہی ایک آواز تھی جو جاگیرداروں، وڈیروں، ٹوڈیوں، کاسہ لیسوں اور فرنگیوں کے لئے، ۱۹۲۸ء سے سوہان روح بن گئی تھی۔ خوف، مولانا کی چمڑی میں نہیں تھا۔ مستزاد یہ کہ غضب کے خوش بیان، خوش الحان اور خوش شکل بھی! یہ واقعہ ہے کہ خلقت ان کی دیوانی تھی۔ پروفیسر مرزا محمد منور کے الفاظ ہیں کہ

"میں مولانا گل شیر کو عطاء اللہ شاہ بخاری سے برتر مقرر جانتا ہوں۔ ان کے بیان میں جو سوز اور درد

موجود تھا، کسی بھی دوسرے مقرر میں آج تک محسوس نہیں کیا۔"
خود، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے الفاظ تھے کہ "مجھے آج تک کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں مل سکا، جس کی تلاوت اتنی موثر اور کیف آور ہو" ------ خود ہی خیال فرمایئے کہ ایسے شخص کی "خطرناکی" میں نواب کالا باغ کو کیونکر شک ہو سکتا تھا۔ یہی مولانا گل شیر، ۱۹۳۹ء میں جب مجلس احرار اسلام میں شامل ہوئے تو ٹوانے، نون، خوانین، ملک، سادات اور پیر صاحبان اب ٹھیک ٹھیک انکی زد میں آنے لگے یا دوسرے لفظوں میں مولانا کی Range بہت کچھ بڑھ گئی تھی۔ قصہ مختصر، یہ کہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں مجلس احرار نے مولانا کی سرکردگی میں کالا باغ میں تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ سردار خضر حیات، وزیر اعظم پنجاب، کچھ سپر انداز بھی ہوئے۔ وہ اٹک چل کر آئے۔ لیکن نواب کالا باغ کے جبر واستبداد نے سپر انداز ہونا نہیں سیکھا تھا۔ لہذا ۲۳ مئی ۱۹۴۴ء کو، مولانا محمد گل شیر کو، ان کے اپنے گھر میں، سوتے میں گولی مار دی گئی --------- اب آپ اسے جبر کی سائنس کہہ لیں۔ Tyrany (استبداد) کہہ لیں، Despotism (مطلق العنانی) کہہ لیں، Autocracy (خود سری) کہہ لیں، یا Oppression (تعدی) کہہ لیں --- الفاظ بدلنے سے حقیقت کبھی نہیں بدلی۔ کہیں نہیں بدلی۔

ان سطور کا راقم، اعتراف کرتا ہے کہ وہ الطاف گوہر صاحب کے علم، تجربے، مشاہدے اور تجزیے کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اسے یہ سودا بھی نہیں اور لپکا بھی نہیں! کہ وہ ایک فہمیدہ و جہاندیدہ (Veteran) شخص ہیں۔ ہفت زبان (Polyglot) ہیں۔ خوبیوں کا ایک جہان ہیں۔ لیکن ان سے اتنی بات کہنے کی اجازت ضرور، مجھے ملنی چاہیئے کہ اگر جبر کی سائنس Exist کرتی ہے تو یقین جانیے کہ پھر صبر کی سائنس بھی یہاں Exist کرتی ہے۔ اگر نواب کالا باغ کی زندگی جبر کی سائنس سے عبارت ہے تو ان کی موت، صبر کی سائنس سے! الطاف صاحب خود لکھتے ہیں۔

> "مجھے اتوار کی وہ صبح کبھی نہیں بھولتی جب صدر صاحب نے مجھے طلب کیا اور بتایا کہ نواب کالا باغ کو ان کی خواب گاہ میں قتل کر دیا گیا ہے، شبہ یہ تھا کہ ان کے چھوٹے بیٹے نے کسی اختلاف کی بنا پر باپ کے سر میں پستول کی گولی پیوست کر دی، نواب صاحب نے ایوب خان سے اپنی آخری ملاقات میں ایک ہی گزارش کی تھی اور وہ یہ کہ اگر ان کا چھوٹا بیٹا کسی مشکل میں مبتلا ہو جائے تو اس کی مدد کی جائے۔"

الطاف صاحب! کہنے والے تو کہتے ہیں کہ صبر کی سائنس کا جادو، نواب کالا باغ کے صاحبزادے کے سر پر بھی چڑھ کر بولا۔ وہی ایک گولی، وہی غیر طبعی موت، وہی اجیرن زندگی --- ان کے گھر میں، یہ تسلسل تو آج بھی قائم ہے۔ اور امیر عبداللہ روکڑی کے محتاط پیرائے میں لکھے گئے الفاظ، اب بھی میرے سامنے ہیں کہ ------- "عام طور پر ایسا مشہور ہے کہ دو سو کے لگ بھگ قتل، نواب آف کالا باغ کے ذمے تھے"۔
سابق آئی جی پنجاب، راؤ عبدالرشید کی گواہی بھی تو ریکارڈ پر ہے کہ ---- "یہ ان کی سرشت میں شامل تھا کہ شریف آدمی، خاص طور سے خوددار آدمی کی پگڑی اچھالی جائے"!
وہ ایک صاحب، اور ہوا کرتے تھے ----- جناب سکندر مرزا ----- "ان کو بھی اپنے خدا ہونے کا

اتنا ہی یقیں تھا"! اپنے نواب صاحب، نواب ہی تو تھے، یا پھر مغربی پاکستان کے گورنر ہو گئے۔ جبکہ سکندر مرزا صاحب تو گورنر جنرل اور صدر مملکت بھی ہوئے۔ ان کی تب و تاب جابرانہ کا کیا کہنا۔ چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، ملک فیروز خان، ------ یہ سب وزرائے اعظم انہوں نے یکے بعد دیگرے یوں بھگتائے اور چلتے کئے کہ ------ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ان کے مزاج کی رنگینی اور دماغ کی سنگینی کی داستانیں، الطاف گوہر صاحب کے علم میں بھی یقیناً ہوں گی۔ بہر حال میں یہاں شورش کاشمیری کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شیخ حسام الدین، حسین شہید سہروردی کے ساتھ عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ ایک دن سہروردی صاحب نے ان سے کہا ----- شیخ صاحب! سکندر مرزا (صدر مملکت) کو مجلس احرار کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا ذہن صاف ہو جائے لیکن آپ کی اس سے ملاقات مفید ہو گی۔ غرض شیخ صاحب اور ماسٹر تاج الدین انصاری، اسکندر مرزا سے ملاقات کیلئے گورنمنٹ ہاؤس لاہور، میں گئے۔ اسکندر مرزا، اپنے صدارتی جاہ و جلال کے ساتھ برآمد ہوا اور شاہانہ بے نیازی کے ساتھ فروکش ہو گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب، صوبہ کے وزیر اعلیٰ، ہمرا تھے۔ سہروردی نے مرزا سے کہا" دونوں احرار رہنما، شیخ صاحب اور ماسٹر جی، آئے ہیں۔" مرزا نے حقارت سے جواب دیا "احرار؟ پاکستان کے غدار ہیں۔"

ماسٹر جی، ٹھنڈی طبیعت کے مالک، کہنے لگے۔ غدار ہیں تو پھانسی پر کھنچوا دیجئے، لیکن الزام کا ثبوت ہونا چاہیئے۔ اسکندر مرزا نے اسی رعونت سے جواب دیا۔

"بس میں نے کہہ دیا ہے کہ احرار غدار ہیں۔"

ماسٹر جی نے تحمل کا رشتہ نہ چھوڑا لیکن مرزا نے سرکش گھوڑے کی طرح پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا ------ وہی ژاژ خائی!

شیخ صاحب نے غصہ میں کروٹ لی۔ مرزا سے پوچھا، کیا کہا آپ نے؟

میں نے؟

جی ہاں!

"احرار، پاکستان کے غدار ہیں"۔ مرزا نے مٹھی بھینچتے ہوئے کہا۔

شیخ صاحب کہاں رکتے۔ گورنمنٹ ہاؤس، گورنر موجود، وزیر اعلیٰ موجود، وزیر اعظم موجود، صدر مملکت کی بارگاہ! فوراً جواب دیا ------ "احرار، غدار ہیں کہ نہیں۔ اس کا فیصلہ ابھی تاریخ کرے گی۔ تمہارا فیصلہ تاریخ کر چکی ہے کہ تم غدار ابن غدار ہو۔ تمہارے جدامجد میر جعفر نے سراج الدولہ سے غداری کی تھی۔ تم اسلام کے غدار ہو"۔ ڈاکٹر خان نے شیخ صاحب کو آغوش میں لے لیا اور اسکندر مرزا سے پشتو میں کہا۔" میں نے تمہیں پہلے کہا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ شریفانہ لہجہ میں بولنا۔ یہ بڑے بے ڈھب لوگ ہیں۔" ظاہر ہے کہ بلی، ایک ہی جھٹکے میں سپر انداز ہو جاتی ہے۔ یکایک اس کا لب و لہجہ ہی بدل گیا۔"

مجھے اس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا اور نہ کوئی حاشیہ چڑھانا ہے۔ عیاں را چہ بیاں ؟ لیکن ایک

روایت اور ملاحظہ کیجئے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی فاروقی لکھتے ہیں (ذکر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا چل رہا ہے)--------- "یہ منظر مئی ۱۹۵۸ کا ہے---- یہی فقیر منش السان (عطاء اللہ شاہ بخاری) ملتان کے ایک کچے مکان میں مقیم ہے۔ بڑھاپا بھی ہے اور افلاس بھی۔ اس عالم میں صدر پاکستان جنرل سکندر مرزا ملتان آتے ہیں۔ گیلانیوں کے ہاں دعوت ہے۔ اسکندر مرزا ایک صاحب کو اس فقیر کے پاس بھیجتے ہیں۔ پیش کش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آ جائیں۔ منہ مانگی خواہش پوری ہو گی۔ مگر یہاں اب بھی وہی جواب ہے----- "میرا اسکندر مرزا کے پاس جانا علم اور فقیری کی توہین ہے۔ سکندر مرزا، میرے جھونپڑے میں آ جائیں تو ان کی بھی عزت ہے اور میری بھی۔ لیکن میں ان کے پاس جا کر اپنی عمر بھر کی کمائی غارت نہیں کرنا چاہتا۔ "ایلچی، جس کا نام مظفر علی شمسی ہے، خاموش لوٹ آتا ہے۔"

الطاف گوہر صاحب کہہ سکتے ہیں کہ اسکندر مرزا جبر کی سائنس سے ناآشنا تھے۔ لیکن اسے کیا کیجئے اور اسے کیا کہیے کہ نواب کالا باغ کے جبر کی سائنس تو، نہ نظریاتی ہے اور نہ اخلاقی! خود الطاف صاحب کا بیان ہے کہ

> "کراچی میں لیاری کے علاقہ میں ایک ضمنی انتخاب کا مرحلہ آیا، ایوب خان نے کراچی کے ایک معزز اور صاحب اثر تاجر اور صنعت کار حبیب اللہ خان کو اپنی مسلم لیگ کی طرف سے نامزد کیا اور حزب اختلاف میر غوث بخش بزنجو کو میدان میں لے آئی۔
>
> نواب صاب کو حبیب اللہ خان پر کوئی اعتماد نہ تھا اس لئے کہ وہ "پراچوں" کو حکومت کے قریب نہیں آنے دینا چاہتے تھے انہوں نے اپنے دو وزیروں محمود ہارون اور غفار پاشا کو یہ کام سپرد کیا کہ حبیب اللہ خان کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ انتخاب کا نتیجہ نکلا تو ایوب خان کو محسوس ہوا کہ نواب صاحب نے ذاتی مخاصمت کی وجہ سے لیگ کے سرکاری امیدوار کو ہروا دیا ہے-----------، صدر ایوب سبی دربار میں شمولیت کے لئے بلوچستان گئے تو نواب صاحب بھی دربار میں موجود تھے۔ صدر اور گورنر کی کرسیاں ساتھ ساتھ رکھی گئی تھیں مگر نواب صاحب نے اپنی کرسی ذرا پیچھے سرکالی، اس پر ایوب خان نے کہا "نہیں نواب صاحب پیچھے مت ہٹئے" وہ دن بھر ساتھ رہے اور رات کا کھانا بھی اکٹھے کھایا مگر ایوب خان نے ضمنی انتخاب کے بارے میں کوئی بات نہ کی اگلی صبح ناشتے پر نواب صاحب نے خود یہ معاملہ اٹھایا اور کہا کہ لیاری میں سرکاری امیدوار کی شکست کی وجہ ان کے دو وزیروں کی سازش تھی، اور وہ ان کے خلاف تحقیقات کا حکم دینے والے ہیں، ایوب خان نے کہا " نواب صاحب سر بازار گندے کپڑے دھونے سے کیا حاصل، وہ دونوں وزیر میری رضا سے مقرر ہوئے تھے انہیں فوراً فارغ کر دیجئے میں نے اپنی رضا واپس لے لی" بس اس کے ساتھ ہی ایوب خان اور نواب کالا باغ میں برسوں کا تعلق ختم ہو گیا۔"

اب فرمائیے کہ نواب کالا باغ کی نفسیات، اخلاقیات اور جبر کی سائنس میں جھوٹے وقار، جھوٹی عزت، جھوٹی دوستی، جھوٹی وفاداری اور جھوٹے طنطنے کے سوا، اور بھی کچھ رکھا تھا؟ مجھے معلوم ہے کہ الطاف صاحب بھی نواب صاحب کی راست بازی اور راست گفتاری کے مبلغ و مناد نہیں ہیں اور اوپر کی روایت میں تو

"مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری"!

اصل میں مجھے بھی حیرانی یہ ہوئی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری سے متعلق نواب کالاباغ کے بیان کو الطاف صاحب نے یوں پیش فرمایا ہے کہ (معذرت کے ساتھ) گویا اس کی Credibility کا اشتہار ہو گئے ہیں۔ حالاں کہ ان سے بہتر کہنے انداز ہو گا کہ یہ، اصولِ روایت کے سراسر منافی ہے۔ پھر، عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس کینڈے کے دوسرے لوگوں کے متعلق یہ باور کر لینا کہ وہ حریف اور مدمقابل سے یوں آسانی سے ہار مان گئے ہوں گے "انتہائے سادگی" ہی تو ہے۔ یہ لوگ تو جس مٹی کے بنے ہوئے تھے اس میں ظلم کے مقابلے میں Diplomacy کی بجائے Contumacy کا عنصر پوری طرح (بلکہ بری طرح) غالب و حاوی تھا۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ ایسی روایتوں اور حکایتوں کا سامنے آنا کس سطح کے لوگوں کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اس اشتغال سے گریز و احتراز کس حد تک لازم ہے۔؟ خود الطاف گوہر صاحب کو آج بھی بہت سے نوابانِ سبز باغ، مجیب الرحمن کے چھے نکات کا مصنف بتلاتے ہیں۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو سے گوہر صاحب کو جو تعزیر و تعذیب پر مبنی تعلق رہا ہے، اس کے Second Phase کے متعلق راؤ عبدالرشید فرماتے ہیں کہ ---------" بھٹو صاحب نے ان کو اسٹیبلش کیا۔ ان کے بھائی (تجمل حسین) کو سفیر بنا کے بھیجا۔ انکورونی پلانٹ کا ٹھیکہ دیا۔ آخر الطاف گوہر نے بھٹو صاحب کے ساتھ سمجھوتہ اصولوں پہ کیا۔" کیا یہ سب کچھ مان لیا جائے؟ اور کیوں نہ مان لیا جائے؟-------- امید ہے گوہر صاحب میرا نکتہ سمجھ گئے ہوں گے۔

ہفت روزہ "لاہور" لاہور (مرزائی جریدہ)

ان کا بدل شاید ہی پیدا ہوسکے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات دراصل سنا بق علاقہ پنجاب کے عوامی نفسیات کے ماہر ایک ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے جس کا بدل شائد ہی پیدا ہوسکے۔ پنجاب کے عوام کو تو خاص طور پر ان کی تقریروں کا ایسا لپکا بلکہ چسکا تھا کہ وہ نظریاتی مخالفت کے باوجود رات گئے تک بیٹھ کر آپ کی تقریریں سنتے اور چسکے لیتے رہتے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل جب احرار کا کانگریس سے ساجھا ہو چکا تھا اور یہ جماعت اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کو ناممکن بنانے کے لئے ہر ممکن سعی میں مصروف تھی۔ احرار نے حسب معمول شاہ صاحب کے حسنِ خطابت کو آلۂ کار بنایا اور اس دور کی سیاست میں عملی دلچسپی لینے والے گواہ ہیں کہ مسلم لیگ کے کتنے ہی شیدا و الہ ان کی تقریریں اسی ذوق و شوق سے سننے آتے تھے جتنے ذوق و شوق سے وہ اپنے ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔

نجی زندگی میں شاہ صاحب نہایت ہی سادہ اور پُر خلوص، بذلہ سنج اور ملنسار انسان تھے۔ جماعت احرار نے ہمیشہ آپ کی سادگی کو اپنی سیاسی اغراض کے لئے اکسپلائٹ کیا اور وہ اپنی ان کمزوریوں یا صفات کے باعث ہمیشہ اکسپلائٹ ہوجاتے رہے۔ شاہ صاحب کے گلے میں ایک عجب و غریب قسم کا رس تھا جس کا حسن و جذب عام طور پر اس وقت ظاہر ہوا کرتا تھا جب اپنی تقریروں سے پہلے تلاوت کلام پاک کیا کرتے تھے۔

محمد عمر فاروق

جناب الطاف گوہر کی خدمت میں

جناب الطاف گوہر نے یکم دسمبر ۱۹۹۳ء کے روزنامہ نوائے وقت میں اپنا کالم "لکھتے رہے جنوں کی حکایت" نواب کالا باغ مرحوم کے حوالے سے لکھا ہے۔ ان کی یادداشتوں پر مبنی اس کالم میں نواب کالا باغ مرحوم کی ایک روایت نقل کی گئی ہے

"ایک دفعہ عطاء اللہ شاہ بخاری میانوالی تشریف لائے' ان کی جادو بیانی کا یہ اثر ہوا کہ ضلع بھر کے لوگ رات بھر بیٹھے ان کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے رہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نواب کالا باغ کے ظلم و جبر کے خلاف، جہاد کا علم لے کر نکلے ہیں۔ نواب صاحب کے مخالفین نے شاہ صاحب کو اور بھی چڑھا دیا۔ بے شمار لوگ اس جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جمعرات کی شام کے جلسے میں انہوں نے اپنے جاں فروشوں کو اطلاع دی' کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سر پر کفن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا کیا آپ لوگ میرے ساتھ روانہ ہوں گے؟' جلسہ نے بیک زبان کہا "ہاں چلیں گے" اس اعلان کی گونج نواب کالا باغ کے کان بھی پڑی انہوں نے اپنے معتمد کے ہاتھ عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں یہ پیغام بھجوایا کہ 'حضور شاہ صاحب! بڑی خوشی سے کالا باغ تشریف لائیے جو کفن آپ سر پر باندھ کر آئیں گے۔ ہم آپ کو وہی کفن پہنا کر واپس بھیج دیں گے" نواب صاحب کے قول کے مطابق شاہ صاحب نے یہ پیغام ملنے کے بعد کالا باغ آنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ تو جبر کی سائنس یہ ہے کہ مد مقابل کو پہچانو اور جب اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالو تو یہ اطمینان کر لو کہ تمہارے پاؤں زمین پر جمے رہیں اور وار کرو تو ایسا کہ رقیب روسیاہ جانبر نہ ہو سکے۔ کسی کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ"

یہ روایت شاید الطاف گوہر صاحب کے زور قلم کا حاصل ہے یا نواب امیر محمد خاں کی افسانہ تراشی' بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو اس وضعی روایت پر کلی طور پر اعتماد کرنا تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجلس احرار اسلام ایسی بہادر قومی و دینی جماعت کے زمانے جب بھی کوئی موقف اختیار کیا اور اس پر ہر طرح سے یقین و اطمینان کر لیا تو اس کے بعد صمیم قلب سے ڈٹ گئے۔ پھر کوئی جبر و طاغوت ان کے آہنی عزائم کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ تاریخ کے اوراق اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ کشمیر کے ڈوگرہ راج کے مسلمانوں پر مظالم کے خلاف جب مجلس احرار اسلام نے علم جہاد بلند کیا تو پچاس ہزار سے زائد احرار داسیروں نے گرفتاری دی اور بالآخر مہاراجہ

کشمیر کو کشمیری مسلمانوں کو حقوق دینا پڑے اسی طرح کپور تھلہ کی تحریک ہو یا فرخ نگر کے فسادات 'فوجی بھرتی بائیکاٹ مہم ہو یا تحریک تحفظ ختم نبوت 'احرار کے جیالوں نے جماعت مرکزیہ کے حکم پر اپنی جانوں کو داؤ پر لگا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ مجلس احرار اسلام متحدہ ہندوستان کی تمام دینی و سیاسی جماعتوں پر قربانی و ایثار اور عزم و ہمت کے میدان میں بازی لے گئی جس کا اعتراف آج بھی باشعور 'دانشمند اور غیر جانبدار مؤرخین کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے

جس طرح الطاف گوہر صاحب نے اپنی روایت کے سہارے بانی احرار حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے اجلے دامن کو داغدار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کی یہ مذموم سعی دراصل جماعت احرار کے شاندار تاریخی کردار کو مجروح کرنے کے ناپاک پروگرام کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے

میں حیران ہوں کہ ادیب احرار آغا شورش کاشمیری جب تک زندہ رہے الطاف گوہر ایسے بزعم خویش دانشور اور بے علم سیاسی تجزیہ نگار کیوں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ شورش مرحوم نے جناب الطاف گوہر کے بعض "روشن اعمال" کو جب "چٹان" میں موضوع بنایا تھا تو گوہر صاحب کا بے لگام قلم اس وقت حرکت میں کیوں نہ آیا۔ ان کی رحلت کے بعد شاید وہ یہ سوچ کر کہ اب جواب دینے والا کوئی نہ رہا لہٰذا جو منہ میں آئے کہہ دیا جائے یا قلم سے قرطاس پر منتقل کر دیا جائے۔ لیکن یہ محض ان کی خوش فہمی اور خام خیالی ہے۔

مجلس احرار میں یوم تاسیس سے لیکر آج تک تاریخی حقائق پر نظر رکھنے اور انہیں قلم کے ذریعے عوام الناس تک پہنچانے والے باشعور اور صاحب نظر لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ چودھری افضل حق سے لیکر جانباز مرزا تک ایسے ہر رہنما اور کارکن نے علم و ادب اور دین و سیاست میں وہ قلمی جواہر ریزے بکھیرے کہ جن کی چمک و دمک آج بھی نام نہاد محققین اور کور بصر لکھاریوں کی آنکھوں کو چکا چوند کر رہی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ الطاف گوہر صاحب نے جس روایت کو پیش کیا ہے وہ خود پکار پکار کر اپنی حقیقت آشکارا کر رہی ہے اولاً "سید عطاء اللہ شاہ بخاری قیام پاکستان سے قبل غالباً دو تین دفعہ ہی ضلع میانوالی تشریف لے گئے اور تقسیم ہند کے بعد بھی اتنی ہی بار۔

ثانیاً "شاہ جی نے اپنی تقاریر میں میانوالی کے قوانین اور وڈیرہ شاہی کو اپنی آتش نوائیوں کا موضوع ضرور بنایا لیکن روایت مذکورہ میں یہ اعلان کہ "کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سر پر کفن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا" شاہ جی نے کسی بھی جلسہ عام میں نہیں فرمایا آج بھی ان لوگوں کی کثیر تعداد ضلع میانوالی میں بقید حیات ہے جنہوں نے شاہ جی کے تمام جلسوں میں شرکت کی 'مگر انہوں نے بھی مذکورہ روایت کو کذب و افتراء پر مبنی قرار دیا۔

ثالثاً "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ذمہ دار دینی و سیاسی جماعت کا ایک ذمہ دار رہنما کسی پروگرام کا اعلان کرے اور پھر کسی وڈیرے کی دھمکی سے مرعوب ہو کر پروگرام ملتوی کر دے۔ نواب آف کالا باغ اپنی جگہ ظلم و خونخواری

میں مجسم غیظ و غضب سہی لیکن کالا باغ قصبے کا حدود اربعہ کشمیر کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام ملکی معاملات بالخصوص تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ میں ایسی الجھی کہ وہ کالا باغ کی طرف بحیثیت مجموعی نظر نہ کر سکی وگرنہ کالا باغ کے "ملکوں" کو اپنے جاہ و مرتبے اور خوف و دہشت کا بخوبی اندازہ کرا دیا جاتا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان خوفناک حالات میں بھی اس ضلع میں گئے جن کا تصور کرنا بھی محال ہے شورش کاشمیری نے لکھا ہے۔

"ضلع میانوالی کی ایک تحصیل (عیسی خیل) میں شاہ جی پہلی مرتبہ تقریر کے لئے گئے تو کسی مسلمان نے اپنے ہاں نہ ٹھہرایا۔ ایک ہندو نے شب بسری کے لئے جگہ دی تو اسے گاؤں چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔ ازاں بعد اس کے مکان کو آگ لگادی گئی" (سوانح سید عطاء اللہ شاہ بخاری ص ۹۸)

وہ حضرات جو برطانوی سامراج کی کمین گاہوں' اٹک' سرگودھا' راولپنڈی' جہلم اور میانوالی کے اضلاع کی سیاسی صورت حال پر گہری نظر رکھتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان تمام اضلاع اور بالخصوص میانوالی پر انگریز کے کاسہ لیس جاگیرداروں کی گرفت کتنی مضبوط تھی۔ اس دور میں انگریز کے خلاف کوئی کلمہ نکالنا قابل گردن زدنی تھا چہ جائیکہ اپنے وقت کے برطانوی حکومت کے سب سے بڑے باغی کی عیسیٰ خیل میں تقریر! لیکن شاہ جی جس دل گردے اور شجاعت و تہور کے حامل انسان تھے یہ توقع ان سے ہی کی جاسکتی تھی کہ محض اللہ کے سہارے پر جو فردتن تنہا صدائے حق بلند کرنے کے لئے یہاں آسکتا ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ یہاں مجلس احرار اسلام کا قیام بھی عمل میں نہ آیا ہو اور شب بسری کے لئے کسی میں ہمت بھی نہ ہو کہ وہ انہیں اپنے مکان میں ٹھہرائے وہ جگرادار اور حریت فطرت عظیم رہنما اگر کالا باغ جانے کا عزم کرلیتا' چاہے اس راہ میں کچھ ہوجاتا اسے روکنے کی جرات کس میں تھی؟

شاہ جی کو تحریک کشمیر کے دوران کشمیر میں داخل ہونے سے روکا گیا تو وہ دریائے توی تیر کر کشمیر میں داخل ہوئے۔ تقریریں کیں اور گرفتار ہو گئے۔ قادیان میں داخل ہونے کے تمام راستے بند کئے گئے تو وہ پانچ لاکھ مسلمانوں کا جم غفیر لیکر قادیان میں داخل ہو گئے۔ تین دن تقریر کی اور پھر گرفتار ہو گئے۔ ملتان کے گیلانیوں اور قریشیوں نے شہر میں داخل ہونے سے منع کیا اور تقریر کرنے کی صورت میں جان سے مار دینے کی دھمکی دی مگر شاہ جی نہ صرف ملتان میں داخل ہوئے بلکہ گیلانیوں کے مرکز "پاک گیٹ" میں تقریر کی اور انگریز سامراج کے مذہبی دلالوں کی غداریوں کو موضوع بنایا اور ان کے پرخچے اڑادیئے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں شاہ جی کی مجاہدانہ زندگی کا روز مرہ تھیں۔

لہٰذا الطاف گوہر کی روایت افتراء اور اتہام محض ہے جو کسی طور حقیقت سے میل نہیں کھاتی بالفرض اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو پھر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ اس روایت کا راوی ایک فرد ہے جو روایت کا سامع ہے' واقعہ کا عینی شاہد نہیں۔ جبکہ اس کی تائید میں کوئی قول کسی دیگر فرد کا نہیں ملتا۔ اور سینکڑوں لوگ جو شاہ جی کی تقاریر

کے سامع ہیں ایسی ہر روایت کا انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا الطاف گوہر صاحب کی روایت مکذوبہ و مجہول ٹھہرتی ہے
نواب کالا باغ زندہ نہیں ورنہ انہیں مخاطب کیا جاتا۔ اگر نواب نے شیخی میں آکر یہ کہہ بھی دیا ہو تو الطاف گوہر صاحب پر لازم تھا کہ وہ اس علاقہ کے کسی واقف حال سے اس کی تصدیق کر لیتے۔ اسلام آباد میں بیسیوں افراد میانوالی کے باسانی مل سکتے ہیں اس طرح ان کے "نظریہ جبری سائنس" کا بھی تجزیہ ہو جاتا۔

"احرار اور کالا باغ"

جہاں تک نواب آف کالا باغ کے خلاف جہاد کرنے کا معاملہ ہے تو الطاف گوہر صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ضلع میانوالی میں بالعموم اور کالا باغ کے خلاف بالخصوص جہاد کرنے میں مقامی مجلس احرار اسلام کا رول تاریخ کا زریں باب ہے۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے دست راست اور مجلس احرار اسلام ہند پنجاب کے نائب صدر مولانا گل شیر خاں شہید نے نواب آف کالا باغ کے خلاف اس وقت جہاد کا آغاز کیا جب نواب کی پشت پر انگریز کا دست تعاون موجود تھا مگر اس مرد حق آگاہ نے تمام خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حق و صداقت کی مشعل فروزاں کی۔

جب مولانا گل شیر شہید پہلی دفعہ کالا باغ تشریف لے گئے تو آپ نے اپنی پہلی تقریر میں ہی جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو موضوع بنایا اور نواب کالا باغ کے ظالمانہ ہتھکنڈوں کی مذمت کی نتیجتاً" آپ کو دعوت دینے والے حضرات غائب ہو گئے اور آپ کو پیدل ریلوے اسٹیشن تک سفر کرنا پڑا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور آپ کئی مرتبہ کالا باغ تشریف لے گئے یہاں تک کہ آپ نے کالا باغ میں مجلس احرار اسلام کی شاخ قائم کر دی جس کے ناظم ڈاکٹر غلام حیدر اور ان کے بھائی غلام قادر بلوچ سالار مقرر کیے گئے (جو نواب کالا باغ کے ذاتی معالج ڈاکٹر اللہ جوایا کے بیٹے تھے) ڈاکٹر غلام حیدر نواب کے مظالم سے تنگ آکر بعد میں کراچی ہجرت کر گئے اور وہیں انتقال ہوا کالا باغ میں مجلس احرار کا قیام رئیس کالا باغ کی امارت کو کھلا چیلنج تھا۔ یہاں تک کہ کالا باغ کا تحصیلدار احرار کارکنوں سے کہہ اٹھا کہ "میرا حکم ہے۔ تمہیں احرار چھوڑنا پڑے گی"

لیکن احرار سرفروشوں نے نواب کے غرور و تکبر کو پاؤں تلے روندنے کی جسارت کر ڈالی، ظلم کی چکی میں پس گئے مگر احرار کا دامن نہ چھوڑا۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں باقاعدہ تحریک کالا باغ کا آغاز کر دیا گیا جس کی تفصیلات انگریز گورنر پنجاب کی گورنر جنرل ہند کے نام خط و کتابت 246-page-23-7 ,s ,pej ,fileNo-l انڈیا آفس لائبریری لندن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عوام نے احرار کی تحریک پر نواب کے عائد کردہ ظالمانہ ٹیکس دینے بند کر دیئے جس کے نتیجے میں احرار کارکنوں اور نواب کے کارندوں میں ٹکر ہو گئی کئی رضاکار غنڈوں کے ہاتھوں سخت مجروح ہوئے اور بالآخر انہیں کالا باغ سے ہجرت کرنا پڑی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے حکم پر پنجاب اور سرحد میں "یوم کالا باغ" منایا گیا۔ حکومت نے دونوں صوبوں میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی اور احرار رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔

۲۸ نومبر ۱۹۴۳ء کو احرار پارک لاہور میں "کالا باغ مہاجرین کانفرنس" ہوئی جس میں تحریک کی دیکھ بھال مولانا مظہر علی اظہر کو سونپی گئی۔ اور انہوں نے مولانا غلام غوث ہزاروی کو ایک سو رضا کاروں کے ہمراہ کالا باغ بھیج دیا۔ تین سو رضا کار میانوالی سے مولانا کے ہمراہ کالا باغ میں پہنچے تو پولیس نے کارکنوں سے زبردستی کلہاڑیاں چھین کر انہیں نہتا کردیا کارکن ایک مسجد میں جمع ہوئے تو پانی بند کردیا گیا اور نواب کے پالتوؤں نے مسجد کا مکمل گھیراؤ کرلیا۔ احرار رہنماؤں نے تمام صورتحال دیکھ کر رضا کاروں کو مزاحمت کرنے سے روک دیا کیونکہ انہیں ہتھیاروں سے پہلے ہی نہتا کردیا گیا تھا۔

مولانا غلام غوث ہزاروی حالات کا تفصیلی مشاہدہ کرنے کے بعد لاہور تشریف لے گئے مولانا گل شیر خاں شہید اگرچہ پابندی کی وجہ سے کالا باغ نہ آسکے لیکن باہر سے رضا کاروں کو کالا باغ بھیجنے میں مصروف رہے (مولانا پر تحریک کے آغاز میں ہی ضلع میانوالی میں داخلے پر پابندی عائد کردی گئی تھی)

مرکزی مجلس عاملہ احرار، تحریک کالا باغ کے بارے میں ابھی کسی فیصلے پر نہ پہنچی تھی کہ ڈپٹی کمشنر نے ضلع میانوالی میں احرار کے تمام اجتماعات اور جلوسوں پر غیر معینہ مدت کے لئے پابندی عائد کردی۔ احرار سرگرمیاں پابندیوں کے باوجود کسی نہ کسی طور جاری رہیں جن کی وجہ سے نواب آف کالا باغ نے اپنی امارت کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ چونکہ اس تحریک میں مرکزی کردار مولانا گل شیر خاں کا تھا اور وہ نواب آف کالا باغ کے خلاف کالا باغ کے مظلوم عوام کو بیدار کرنے اور ان میں باغیانہ جذبات ابھارنے میں موثر قوت ثابت ہو رہے تھے اس لئے مولانا کا وجود نواب اور اس کے کارپردازوں کے لئے خطرے کا نشان بن گیا۔

آخر کار نواب امیر محمد خان کے اشارے پر ۲۴ مئی ۱۹۴۴ء کو مولانا گل شیر خاں کو سوتے میں گولی مار کر شہید کردیا گیا جس کی بڑی وجہ یہ بھی سامنے آئی کہ مولانا گل شیر شہید پر عائد پابندی ان کی شہادت کے دوسرے روز ختم ہو رہی تھی۔ اور وہ کالا باغ میں احرار کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کرچکے تھے۔ اس لئے نواب کالا باغ نے متوقع بغاوت کی بو سونگھ لی اور مولانا کو اپنے راستے سے ہٹا دیا۔

مگر افراد کے ختم ہو جانے سے نظریات تو نہیں مٹتے بلکہ جس تحریک کی، جو مخلصانہ انداز میں چلائی جارہی ہو خون سے آبیاری ہو جائے وہ گوہر مقصود حاصل کرہی لیتی ہے چاہے اس میں کچھ دیر ہو جائے۔ مولانا کی برپا کردہ تحریک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر رہی۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۲ جون ۱۹۴۴ء کو فیصل آباد میں نواب کالا باغ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "امیر محمد خاں، تو نے ایک مسلمان حافظ قرآن، اسلام کے مبلغ اور میرے رفیق

مولانا گل شیر خاں کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر قتل تو کروا دیا لیکن یاد رکھنا تیری قبر بھی تجھے پناہ نہیں دے گی"

شاہ جی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور نواب کالا باغ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور اس کی لاش کو دریائے سندھ میں بہا دیا گیا۔ بے شک اللہ ہی زبردست انتقام لینے والا ہے۔

جناب الطاف گوہر نے بھی دبے لفظوں میں اقرار کیا کہ "شبہ یہ تھا کہ ان کے (نواب کالا باغ کے) چھوٹے بیٹے نے کسی اختلاف کی بنا پر باپ کے سر میں گولی پیوست کر دی" (روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی یکم دسمبر ۱۹۹۳ء) مولانا گل شیر خان کی شہادت پر تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال کے قصبہ لاوہ میں ۹ جولائی ۱۹۴۴ء کو عظیم الشان "یوم گل شیر" منایا گیا چونکہ میانوالی میں احرار اجتماعات پر پابندی تھی اس لئے میانوالی اور اٹک (اب چکوال) کے اضلاع کی مشترکہ حدود پر یہ جلسہ منعقد ہوا۔ مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

"گل شیر خان کا قتل معمولی قتل نہیں کہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ گل شیر خاں کا خون رنگ لا کر رہے گا پھر تمہاری نوابی اور سرداری بھی تمہارا تحفظ نہیں کر سکے گی۔ گل شیر نے انگریز کو غاصب اور تم جاگیرداروں کو وطن کا غدار کہا اور تمہارے کرتوتوں کا پردہ چاک کیا۔۔۔ لو سنو! آج اسی مقام پر جہاں کل تمہیں گل شیر نے للکارا تھا اور تمہیں قوم و ملک کا بے وفا اور نمک حرام قرار دیا تھا بخاری بھی تمہیں اور تمہارے فرنگی آقاؤں کو ڈنکے کی چوٹ پر غاصب 'لٹیرا' غدار 'ٹوڈی' دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن اور امت محمدیہ علیہ الصلوۃ والسلام کا باغی کہتا ہے۔ تم نے جو تعزیر مجھ پر جاری کرنی ہے ابھی کر لو سید حاضر ہے۔۔۔۔۔۔۔! (مولانا محمد گل شیر شہید سوانح و خدمات ص ۲۵۹)

الغرض احرار رہنماؤں کی تقاریر نے اس علاقے میں آگ لگا دی۔ عوام الناس کے نیم خفتہ جذبات بھڑک اٹھے اور کالا باغ کے خلاف تحریک نے نئی راہیں تلاش کر لیں۔ اگرچہ مولانا گل شیر شہید اس جہان فانی میں نہ رہے لیکن ان کی سلگائی ہوئی چنگاری شعلہ جوالہ بن گئی ان کی جاری کردہ تحریک اسی انقلاب کی خشت اول تھی جس کے مقابل کالا باغ کے رئیس نہ ٹھہر سکے۔ اس تحریک کے اثرات ماضی کی نسبت آج واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ کالا باغ کے رئیسوں کو جس طاقت پر گھمنڈ تھا عوام نے اسے اپنے پاؤں کے نیچے مسل ڈالا جس کے ذمہ دار خود رؤسا تھے بقول جانباز مرحوم

"کالا باغ کے رئیسوں نے خدا کی زمین پر خدا کے بندوں سے ناانصافیاں کیں۔ مکافات عمل کا وقت آیا تو جھونپڑوں کی آگ سے نہیں بلکہ محلات کی اپنی آگ سے وہ سارا کچھ جل کر راکھ ہو گیا جس کے مان پر حاکمانہ غرور رقص کرتا تھا۔ قدرت ڈھیل تو دیتی ہے لیکن معاف نہیں کرتی"

آج کالا باغ کے صاحبزادگان نشان عبرت ہیں اور وہی کالا باغ کا قصبہ جہاں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں تھی

وہاں کالاباغ کے رئیس قدم نہیں رکھ سکتے۔ فاعتبرو یا اولی الابصار!

تاریخ کے یہ ابواب اس لئے دھرانا پڑے کہ الطاف گوہر صاحب ایسے ابن الوقت لکھاریوں کی طرف سے تاریخ کے تابناک چہرے پر پھیلائے گئے گردوغبار کو صاف کیا جائے اور حقائق کی نقاب کشائی کی جائے۔

مجلس احرار اسلام کے تمام قائدین اور کارکنان نے ۱۹۲۹ء میں جس موقف کو اختیار کیا تھا بحمداللہ آج بھی احرار اسی کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ کبھی ان کے پائے استقامت لرزش ولغزش سے آشنا نہیں ہوئے۔ جو فرد گروہ یا جماعت ان درویش منش قائدین احرار کے بے داغ وجود پر انگشت نمائی کرتا ہے اور اپنی بے رحم اور متعصب تنقید کا نشانہ بناتا ہے وہ تاریخ سے نابلد' ضمیر سے ناآشنا اور قلم کا سوداگر ہے۔ تاریخ نے ایسے کورچشموں سے ہمیشہ اغماض برتا ہے۔ وقتی شہرت' مالی مفادات اور ارباب اقتدار کی نظرکرم کے طلب گار قلمکار جب اپنی غیرت کو بیچ چوراہے میں نیلام کرچکتے ہیں تو ان کے اذہان وقلوب کی کثافت اور عفونت قلم کی ابکائیوں کی صورت میں غلیظ اور متعفن جراثیم پھیلانے کا باعث بن جاتی ہے جس کے ترجمان عاشق حسین بٹالوی میاں محمد شفیع (م۔ ش) حمید نظامی عبداللطیف سیمی اور الطاف گوہر ٹھہرتے ہیں۔ ضمیر کی سچائی ہی وہ قوت ہے جس کے ذریعے اظہار میں بے باکی' کردار میں نکھار اور قلم میں وقار پیدا ہوتا ہے اور حقائق کے سامنے آنے میں کسی قسم کی مصلحت' حالات کے تقاضے اور شخصیت پرستی کے پرفریب نظریے حائل نہیں ہوسکتے۔ دارورسن کی آزمائش اور کسی کا رعب ورعونت بھی حق گوئی وحق پژوہی سے باز نہیں رکھ سکتے اسی کا نام مجلس احرار ہے۔ جس کا ماضی وحال مذکورہ صفات کا حامل ہے

کتابیات

(۱) کاروان احرار' جانباز مرزا (۲) مولانا گل شیر شہید' سوانح وخدمات' محمد عمر فاروق (۳) سید عطاء اللہ شاہ بخاری' شورش کاشمیری

(اداریہ روزنامہ جنگ لاہور، ۲۳ اگست ۱۹۸۵ء)

عجب آزاد مرد تھا!

امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی چوبیسویں برسی ان کے عقیدت مندوں نے پنجاب کے مختلف مقامات پر منائی مگر افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان کی موجودہ نسلوں کو ان کی شخصیت اور جہاد آزادی میں ان کی خدمات اور قربانیوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ بے باک اور سحر انگیز مقرر تھے اور عالم دین بھی تھے مگر ان کا دین کا تصور انقلابی تھا جس میں سامراج دشمنی کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ وہ اسلام کو محض رسوم و قیود کا گوشوارہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے عملی زندگی کا قابلِ عمل ضابطہ قرار دیتے تھے۔ اپنی حیات مستعار انہوں نے اسی کی جدوجہد میں گذاری۔ رسول اکرم ﷺ کی ذت گرامی ان کا آئیڈیل تھی اور وہ ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں مساوات اور عدل کا دور دورہ ہو۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنا وطن الگ کر لیا تو ہندوؤں کو اتنی بڑی سلطنت مل جائے گی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملے گی اور یہ بات انہوں نے دہلی کے ایک ایسے جلسے میں کہی جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو کر رہے تھے۔ ان کا نظریہ غلط نکلا اور پاکستان معرض وجود میں آگیا تو انہوں نے اس کی وفاداری کی قسم کھائی اور اس کے استحکام کے لئے دعائیں کرنے لگے۔ مجلس احرار نے حالات کے پیش نظر عملی سیاست سے کنارہ کشی کر کے تبلیغِ دین کو اپنا مقصد حیات قرار دے دیا مگر سامراج دشمنی انہوں نے نہ چھوڑی اور اس حوالے سے انہوں نے احمدیوں (مرزائیوں) کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے آخری سال کس مپرسی میں گزرے۔ انہوں نے برسوں کی قید کاٹی، فاقہ کشی کی اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھائیں مگر اپنی زندہ دلی پر حرف نہ آنے دیا۔ وہ عاشق رسول کہلاتے تھے اور دنیا میں اللہ کی بادشاہی کے علمبردار تھے جس میں آزادی اور انصاف کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ انہوں نے اپنی پرانی سیاست کے داغ کو بعض دوسری دینی سیاسی پارٹیوں کی طرح تاویلات کے ذریعے دھونے کی کوشش نہیں کی اور آخری دم تک تسلیم کیا کہ میں پاکستان کی تخلیق کے خلاف تھا اتنی ہمت ایک مرد مجاہد ہی کر سکتا ہے جسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو۔ آج اگر ہم انگریز کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہیں تو اس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے سرفروشوں کا بھی حصہ ہے۔ تحریک آزادی کے حوالے سے ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ ان کی چوبیسویں برسی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ پاکستان آزاد ہو چکا ہے مگر سامراجی غلبے سے رہائی کا کام ابھی باقی ہے.... حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

محمد ازہر شاہ قیصرؒ
ابن علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

اور شاہ جی نے غزل سنائی.........!

۱۹۴۶ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری دیو بند آئے۔ ہمارے یہاں باہر مردانہ میں تشریف فرما تھے، اچھا خاصا مجمع تھا، ان دنوں انظر سلمہ، (مولانا انظر شاہ کشمیری) استاذ تفسیر دارالعلوم نہیں تھے بس صرف نظر، چھوٹی عمر تھی، انہوں نے سن رکھا تھا کہ شاہ جی کی آواز میں جادو ہے، شاہ جی سے فرمائش کی کہ شاہ جی کچھ گانا سنائیے۔ شاہ جی انکار کیسے کرتے، استادزادہ کی فرمائش تھی۔ انظر کو سامنے بٹھا لیا۔ فرمایا کہ گوجرانوالہ میں ایک سرحدی طالب علم نے مسجد کے حجرہ میں میری دعوت کی۔ الٹی سیدھی چپاتے، گڑ اور آٹے کا حلوہ۔ یہ کھلا پلا کر وہ طالب علم کہنے لگا کہ حضرت میں آپ کی اور بھی ضیافت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ مردہ بدست زندہ، اور جو کچھ بھی تمہاری تمنائیں ہیں وہ پوری کر لو، اس نے کہا کہ میں غالب کی غزل سناتا ہوں اور لہک لہک کر غالب کی یہ غزل اس طرح سنائی۔

کوئی امید بر نہیں آتے کوئی ضورت نظر نہیں آتے
موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتے
آگے آتے تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتے

غالب کے یہ دو چار شعر شاہ جی نے ان ہی الفاظ میں اس سرحدی طالب علم کے ترنم کے ساتھ سنائے، پھر فرمایا کہ قریب قریب ایسے ہی الفاظ کی ایک غزل قطب شاہ دکنی کی مجھے یاد ہے۔

غم دل کسی سے کہا جائے نا کہا جائے بھی تو سنا جائے نا
یہ مے کی لطافت یہ نازک سے ہاتھ پیالہ بھی ان سے دیا جائے نا
قطب شہ نہ دے اب دِوانہ کو پند دِوانہ کو کچھ پند دیا جائے نا

صاحبِ حُسن و جمال اور صاحبِ فضل و کمال

کیا سناؤں کیا بتاؤں رنج و غم کی داستاں
چھپ گیا زیر زمیں اسلام کا اک شہسوار

پیکر صدق و صفا اور معدن مہرو وفا
مجلس احرار دیں کا سب سے بڑھ کر شاہکار

خوبصورت نیک سیرت خوش جمال و خوش مزاج
غازی و نیک وولی کوہ شجاعت باوقار

صاحبِ صبر و تحمل، بردوبار و دین دار
عاجزوں بیکس، یتیموں، مفلسوں کا غمگسار

صاحبِ حسن و جمال اور صاحب فضل و کمال
ان کی صفتوں خوبیوں کا ہو نہیں سکتا شمار

وہ بخاری گوہر نایاب تھا حق کی قسم
اور تھا وہ گلشن اسلام کی تازہ بہار

وہ شرافت اور نجابت میں تھا خود اپنی مثال
قادر مطلق نے بخشے تھے فضائل بے شمار

کیا کروں میں خوبیاں مرد مجاہد کی بیاں
جس نے ساری زندگی اسلام پر کر دی نثار

حُبِ دنیا حُبِ زر سے ان کا سینہ پاک تھا
ان کا مقصد خدمت اسلام تھا لیل و نہار

سر سے لیکر پاؤں تک اسلام کی تصویر تھا
کھینچ لیتا تھا دلوں کو دین کا وہ شہسوار

ان کو بخشتا تھا خدا نے اس قدر حُسنِ بیاں
سنگدل روتے تھے اکثر ہم نے دیکھے زار زار

حافظ قرآن نمازی مونس و غمخوار قوم
کیا فصاحت کیا بلاغت ان پہ تھی یارو نثار

انکے دل میں خالق و مالک کا بس اک خوف تھا
انکی نظروں میں خس و خاشاک تھے سب تاجدار

سرور کونین کی طاعت میں وہ سرشار تھا
خاتم مرسل کی الفت میں وہ ہر دم بیقرار

مصطفےٰ کے عشق سے دل سینہ پر انوار تھا
انکی فطرت میں تواضع و عجزو حلم و انکسار

ہر رگ و ریشہ میں ان کے جذبہ اسلام تھا
ایسا مشکل سے ملے گا دین کا خدمت گزار

زندگی ان کی کٹی کچھ ریل میں کچھ جیل میں
انکی پونجی ان کا سرمایہ یہی ہے یاد گار

فقر و فاقہ تو ملا تھا ان کو ورثہ میں عزیز
کوئی مشکل سے ملے گا ان کا ہمسر نامدار

سادگی تو ان کے جسم و جان پر قربان تھی
حق پرستی فاقہ مستی بس یہی ان کا شعار

وہ صحیح معنوں میں تھا اسلام کا ماہر طبیب
قوم و ملت، دین کا ہمدرد حامی پاسدار

کیا اسیری کیا فقیری انکے دل کی تھی غذا
بس یہی دنیا میں تھا ان کا عزیز و روزگار

پرچمِ ختمِ نبوت کو وہ لہراتا رہا
کوہ استقلال تھا غازی مجاہد بردبار

انکو بخشا تھا خدا نے اس قدر محکم یقیں
دین کے دشمن نظر آتے انہیں مثلِ غبار

بغض و بخل و کبر و کینہ سے وہ بالکل پاک تھا
ان کی پیشانی پہ بل دیکھا کبھی نہ ایک بار

سر سے لیکر پاؤں تک وہ ہر صفت موصوف تھا
وہ بخاری تھا بزرگانِ سلف کی یادگار

فرد واحد تھا مگر تھی انجمن کی انجمن
گویا سمجھو فوج کولایا ہوا تھا درکنار

ساری دنیا میں ہمیں دکھلاؤ تو ایسا خطیب
نوجواں جادوبیاں، شیریں زباں، پرہیز گار

جب سرِمنبر کھڑا ہوتا وہ دنیا کا خطیب
حد سے بڑھ جاتا تھا سب کا شوق و ذوق و انتظار

جب پڑھا کرتا تھا منبر پر وہ قرآن عزیز
دم بخود مدہوش ہو جاتی تھی مجلس بے قرار

دیکھنے والوں کو پھر تو یونہی آتا تھا نظر
ہو رہا ہے آج ہی نازل کلام کردگار

پاک فطرت نیک طینت نیک خصلت خوش مقال
طور و اطوار و طریقہ سب کا سب ہی شاندار

خندہ پیشانی سروقد دین کا اک پہلواں
کانپتے تھے انکی صورت، دیکھ کر سب اہلکار

قوم کے محبوب تھے مقبول دمنظور خدا
انکی حق گوئی وبیباکی ہے سب پر آشکار

اب نہیں امید کوئی جو ملے ایسا خطیب
گرچہ عالم اور واعظ پاؤ گے تم بے شمار

روندتا تھا دشمنوں کی فوج کو مردجواں
آج تک دیکھا نہیں ہم نے کوئی ایسا سوار

خاک سمجھے گا بخاری کا عزیزو، وہ مقام
چڑھ گیا ہو جس کو کفر و شرک و بدعت کا بخار

مالِ دنیا شان و شوکت کچھ نہیں میرے عزیز
عمل صالح، زہد و تقوی پر ہے بخشش کا مدار

باغیوں کا مال و دولت دیکھ کر نہ بھولنا
کافروں کے واسطے دنیا ہے جنت کی بہار

دین اور ایمان جیسی کوئی بھی دولت نہیں
کوٹھیاں بنگلے نہیں ہیں کوئی جائے افتخار

شاہ بخاری خدمتِ اسلام پوری کر گیا
حشر میں بدلہ ملے گا نیکیوں کا بے شمار

قومِ افرنگی سے آخر دم رہا سینہ سپر
چھوڑ کر جانا پڑا ان کو یہاں سے زینہار

گورے گورے رنگ والوں کے وہ آگے ڈٹ گیا
چھوڑ کر وہ بھاگ نکلے ہند کی تازہ بہار

رات دن جو انکے دشمن درپئے آزار تھے
ہو گئے وہ خود ہی آخر قعرِ ذلت کا شکار

سوچتے رہتے تھے جو تدبیر انکے قتل کی
ان کو اپنانی پڑی پھر ایک دن راہ فرار

ڈٹ گیا دشمن کے آگے دین کا غازی عزیز — مسئلہ ختم نبوت میں رہے وہ استوار
دشمنان دین سے غازی نے بازی جیت لی — سو گئے مقصود میں اپنے وہ آخر کا مگار
اس مجاہد کا سنو اس قوم پر احسان ہے — جس نے شیرازہ فرنگی کا کیا ہے تار تار
کم بہت ہوتے ہیں پیدا نامور ایسے خطیب — اس لئے روتی ہے دنیا آج ان کو زار و زار
موت کے پنجے سے کوئی آج تک چھوٹا نہیں — انبیا، نہ اولیا، نہ مالدار و خاکسار
"کل نفس ذائقۃ الموت" ہے فرمانِ حق — سب کے سر پر موت کا ڈنکا ہے بجنا ایکبار
تخت شاہی جن کا اڑتا تھا ہوا کے دوش پر — ان کو بھی جانا پڑا دنیا سے تنہا ایک بار
چل دے دارِ فنا سے بادشاہان جہاں — قبر پر اب حسرتیں روتی ہیں ان کو زار و زار
کوٹھیاں بنگلے یہیں پر سب کے سب رہ جائیں گے — اونچے اونچے خاک پر دیکھیں گے نیچا ایک بار
تاج والے راج والے خاک میں مل جائیں گے — جوڑ سارے ٹوٹ جائیں گے عزیز و ایک بار
موت کہتی ہے نہ اترا زور پر تو اس قدر — پیس ڈالوں گی میں تیراز ورسارا ایک بار
"موتِ عالم موتِ عالم" ہے یہ فرمان رسول — ساز ہستی کر دیا ہے موت نے اب تار تار
چل بسا سوئے عدم وہ چھوڑ کر ہم کو یتیم — اب نہیں امید کوئی آئے گلشن میں بہار
شاہ بخاری دین حق کا تھا وہ اک زندہ نشان — ان کی حق گوئی کے نغمے گا رہا ہوں بار بار
شاہ بخاری مئے وحدت کے نشے سے مست تھا — مصطفےٰ کے عشق سے رہتا تھا ہر دم مستوار
یا الٰہی قوم کو فتنوں سے تو محفوظ رکھ — کیونکہ حالات زمانہ اب نہیں ہیں ساز گار
یا الٰہی شاہ بخاری پر ہو رحمت کا نزول — ماننے والوں کو ان کے طور پہ رکھ برقرار
مانگتا ہوں ہاتھ پھیلا کر خدا سے یہ دعا — ان کی تربت پہ ہو سایہ رحمتِ پروردگار
ان کے فرزند و عیال اور جسقدر احباب ہیں — یا الٰہی بخش دینا سب کے سب روزِ شمار
یا الٰہی بیکسوں پر کیجئے نظرِ کرم — حشر کے میدان میں کرنا نہ ہم کو شرمسار
یا الٰہی مومنوں کی دستگیری کیجئے — ہر بشر اسلام کا غازی بنے خدمت گزار

ان کی جرأت اور قناعت کے ہیں سب قائل ظہیر
قوم کے چھوٹے بڑے سب مردوزن ہیں اشکبار

فرشِ زمیں کی بات نہیں عرش ہل گیا
محفل سے جب وہ اہلِ نظر، اہلِ دل گیا
پیکِ اجل بھی موت پہ اُس کی مچل گیا
"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

بزمِ صحافت ماتم ماتم

روزنامہ ''امروز'' لاہور / تعزیتی شذرہ

''جہاد آزادی کا ایک اور سالار اٹھ گیا''

وہ شعلہ نوا اُٹھ گیا ہے جس نے ربع صدی تک سپاہ آزادی کا دل گرمائے اور حوصلہ بڑھائے رکھا۔ دنیائے خطابت کو اس پر ناز تھا اور اس کی یہ صلاحیت ملک و ملت کی خدمت کے لئے وقف رہی لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا عمل کا دھنی بھی تھا۔ وہی کچھ کہتا جس پر کاربند تھا۔ وہی کچھ کرنے کی تلقین کرتا جو اس کے نزدیک عامیوں کی سرفرازی کا وسیلہ بن سکتا تھا امیر شریعت کے سیاسی عقائد کیا تھے۔ یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں۔ یہ حقیقت ہے ان سے اختلاف کی گنجائش تھی اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا۔ البتہ اس بات سے مجال انکار نہیں کہ مرحوم دل میں آزادی کی تڑپ رکھتے تھے۔ آزادی کی راہ میں انہوں نے ہر کڑی مصیبت بہ خندہ پیشانی جھیلی۔ آزادی کے نام پر جو بھی افتاد پڑی اسے بطیب خاطر قبول کیا۔ اٹھارہ برس تک قید و بند کی سختیاں سہیں اور زندگی کے اس حصہ کو حاصل زندگی جانا، کوئی مصلحت ان کا دامن نہ پکڑ سکی۔ بوریا نشینی پر قانع رہے۔ موٹا جھوٹا پہنا۔ کھانے کے لئے جو مل گیا کھالیا۔ تکلف، ریا اور تصنع سے کوسوں دور رہے۔ محبت اور شفقت ان ہی کا حصہ تھی۔ اگر دشمنی بھی کی تو نظریہ کی بنیاد پر۔ ذات کا سوال آیا تو دشمنوں کے لئے بھی دیدہ و دل فرش راہ کئے۔ لیلائے آزادی کے لئے اگر مشقتیں جھیلیں، غیر ملکی حکمرانوں سے ٹکرلی اور اس کی پاداش میں قید ہوئے۔ تو دوسری طرف زندگی کے لطیف پہلوؤں پر بھی نظر رہی۔ یہ نہ تھا کہ سیاست میں ان کی طبیعت کا تنوع چھن گیا ہو۔ ان میں وہ روکھا پن پیدا کر دیا ہو جس کا عموماً سیاست سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ وہ شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے سخن فہم تھے اور مبدءِ فیاض سے انہوں نے طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور اپنی تقریر میں شعر یوں لاتے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

اگر ہم ان بزرگوں کی فہرست مرتب کریں جنہوں نے دور غلامی میں برطانوی سامراج کے خلاف گفتار و کردار سے رائے عامہ کو بیدار کیا تھا تو امیر شریعت کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد برصغیر کے مسلمان بری طرح شکستہ دل اور مایوس تھے۔ انہیں احساس کمتری اور احساس شکست سے نجات دلانے کے لئے امیر شریعت ایسے مجاہدوں کی ضرورت تھی جو قلب و ذہن کو بھی متاثر کریں اور اپنے کردار سے عمل کے لئے مثال بھی قائم کر دیں۔ یہ خدمت انجام دے کر انہوں نے قوم پر بہت بڑا احسان کیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایسے ہی بزرگوں کی جرأت، استقامت اور ایثار کا انعام ہے کہ ایک محو خواب قوم بیدار ہوئی۔ جہاد آزادی کے لئے ان گنت رضا کار ملے اور ہم غیر ملکیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔

شاہ صاحب کی زندگی کا یہ پہلو خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ وہ صرف سیاست کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے۔ اسلام کی تبلیغ کا فرض سعید بھی ہمیشہ ان کی نظروں میں رہا تھا۔ دین فطرت کی سربلندی ان کی سب سے

بڑی تمنا تھی اور ناموس رسول ﷺ کی پاسبانی اور ملت کا اتحاد ان کا مقصد حیات تھا۔ زہد و پاکبازی اور مذہب کے گہرے مطالعہ اور علم کی بناء پر وہ امیر شریعت کے منصب پر فائز ہوئے تھے اور اس منصب پر اپنا حق ثابت کر دیا تھا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رحلت سے قوم ایک بے مثال خطیب اور تحریک آزادی کے ایک نمائندے سے محروم ہو گئی ہے اور یک ایسی شخصیت کھو بیٹھی ہے جس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ایسی شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتیں ہیں۔ یہ واقعی ہی ایک المیہ ہے کہ ہم ایسے بزرگوں سے تو محروم ہوتے جا رہے ہیں جو اپنی دھن کے پکے تھے ثابت قدم تھے ایثار پسند تھے اور دل میں ملت کا درد رکھتے تھے۔ مگر ان کی رحلت سے قومی زندگی میں جو نشستیں خالی ہو رہی ہیں انہیں پر کرنے کے لئے ہمیں مخلص اور بے لوث شخصیتیں نہیں ملتیں۔ قومیں محض اپنے پیش رووں کے کارنامے گنوا کر یا ان کا ماتم کر کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ حال کے مسائل، مصائب اور ضرورتیں زندہ اصحاب سے قربانی اور ایثار کا تقاضا رکھتی ہیں۔

روزنامہ "کوہستان" لاہور / مقالہ خصوصی

اک چراغ اور بجھا........

ملک میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی موت کی خبر انتہائی رنج و ملال سے سنی جائیگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو ہماری آزادی کی شاہراہ ربع صدی قبل کے ان تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں سے جاملتی ہے جہاں چند اولوالعزم انسان درماندہ مسافروں کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کبھی ان کی شعلہ نوائی سے مردہ زندگی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور اپنے حال سے پریشان اور مستقبل سے مایوس مسافر یکایک نئے حوصلوں اور ولولوں سے سرشار ہو کر ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کڑی آزمائشوں کے دور میں ان کے پیچھے چلنے والے قافلوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن ان کوہ پیکر انسانوں کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزادی کی تمنا کرنے کے جرم کی پاداش میں ان کے لئے قید خانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے یں اور ان کی زبانوں پر سنگینوں کے پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مصیبت، ہر ناکامی اور ہر آزمائش ان کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرنگی استبداد کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا تھا۔ جب سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور آزادی کی خواہش ایک دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی۔

مرحوم برصغیر کے وہ بے مثال خطیب تھے۔ جن کی شعلہ نوائی نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں آزادی کا ولولہ پیدا کیا تھا۔ ان کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ رات جس میں

انہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا کتنی تاریک تھی اور ایمان و یقین محکم کی وہ قندیل جو انہوں نے بلند کی تھی کس قدر تابناک تھی۔ اگر ان کے راستے میں آلام و مصائب کے پہاڑ کھڑے تھے تو انہوں نے کس قدر جرأت و پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کا مقصد کروڑوں انسانوں کو آزادی کی تڑپ عطا کرنا تھا۔ اگر ہم آزادی کے ایک نڈر مبلغ کی حیثیت سے ان کے حالات پر غور کریں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیں ان کے طریق کار سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو فراموش نہیں کرسکیں گی۔ جنہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال قید و بند کی صعوبتوں میں گزارے تھے۔ ہم پورے صدق و خلوص کے ساتھ یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالے مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں اس سعادت مند قوم کا جذبہ عطا کرے جو کسی بھی حالت میں اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کرتی۔

روزنامہ ''آفاق'' لائلپور / تعزیتی شذرہ

ایک ''روایت'' کا انجام!

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک راویت کے انجام کا اعلان ہے۔ وہ اُس روایت کی پیداوار تھے جس میں لفظ گرمی آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا۔ انسانی رشتہ کے اس تصور نے خطابت کو جنم دیا۔ جسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ہندی مسلمانوں کے ایک بھرے پرے دور میں پیدا ہوئے۔ اس دور میں قد آور رہنماؤں کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس طرح ایک منفرد مقام پیدا کیا کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو سیاسی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی اور خطابت کو طریق اظہار کے طور پر اپنایا جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی دونوں میں ایک مقبول اور موثر طریق اظہار کا مرتبہ رکھتی تھی۔ خطابت ان کے ہاتھوں میں کم و بیش ایک تخلیقی ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔ ان کی ذات کو ہماری خطابت کا آخری سنبھالا کہنا چاہیئے بلکہ ان کے سفر آخرت کے ساتھ ساتھ یہ روایت ہماری اجتماعی زندگی سے سفر کرتی نظر آتی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک ایسے خطیب تھے جنہیں بیک وقت مذہبی عالم اور ایک سیاسی رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۲۰ء کو ۲۹ برس کی عمر میں وہ تحریک خلافت میں شامل ہوئے۔ مجلس احرار اسلام کے بانیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس جماعت کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے سیاسی نقطہ نظر سے

اختلافات کی بہت گنجائش ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ ان کے سیاسی خیالات سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی ہم ان کے ذاتی اوصاف کے ملی جذبہ کی قدر و منزلت کریں۔

روزنامہ ''عوام'' لائلپور / تعزیتی شذرہ

ان کے الفاظ موتیوں کی طرح دمکتے اور فقرے پھولوں کی طرح ہوتے

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات کی خبر ایک برق بے اماں ہے۔ جس نے صبر و سکون کے ہر خرمن کو جلا دیا ہے۔ خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری گزشتہ چالیس پچاس سال سے برصغیر پاک و ہند کے اقصا و اکناف پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی بڑی بڑی مرعوب کن علمی اسناد حاصل نہیں کی تھیں۔ مگر یہ فضیلت انہیں حاصل تھی کہ وہ ہر علمی و ذہنی مجلس میں سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو شعور اس وقت حاصل ہوا۔ جب غیر منقسم ہندوستان پر انگریزی استبداد پورے زوروں پر تھا۔ انہوں نے علمائے عظام پر حکومت کے عتاب کو دیکھا اور اس سے تڑپ اٹھے۔ انگریز کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ انگریز نے اپنی سنگدلانہ پالیسی سے غیر منقسم ہندوستان ہی نہیں پورے مشرق میں دین اسلام کے ستونوں کو گرانے کی کوشش کی تھی اور اس نے ان بزرگوں پر عتاب و عذاب کے دروازے کھولے تھے جو ہر اعتبار سے قابل احترام تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایسے وقت میں اپنی عملی زندگی شروع کی۔ خدا تعالیٰ نے انہیں خطابت و تقریر اور اثر آفرینی کی دولت وافر عطا کی تھی۔ وہ گھنٹوں ہزارہا کے مجمعے کو مسحور رکھ سکتے تھے اور منٹوں میں لوگوں کو جدھر چاہتے بہا لے جاتے تھے۔ ان کے الفاظ موتیوں کی طرح دمکتے تھے اور فقرے پھولوں کی طرح ہوتے تھے جن کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی تھی۔

مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے قید و بند اور سزا و تعزیر کی مصیبتیں بارہا جھیلیں مگر ان کے پائے استقلال میں کبھی جنبش نہ آئی تھی۔ ان کا انداز اور مسلک قطعی درویشانہ تھا۔ انہیں کسی سے ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ البتہ وہ اپنے تمام عقائد میں شدید تھے اور جسے ان کے عقائد سے اختلاف ہوتا وہ اسے خدا کا دشمن سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کے خلاف شدت اختیار کرتے تھے۔ مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری میں یہ وسعت قلبی موجود تھی کہ وہ اپنے کسی اقدام یا فیصلہ کو جب غلط سمجھ لیتے اس پر اصرار نہ کرتے۔ چنانچہ پاکستان کے متعلق آپ نے یہی طریقہ اپنایا تھا۔

مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے دفتر مطلوب ہے۔ وہ ایک جاذب شخصیت تھے۔ خطیبِ اعظم اور مقرر شیوا بیان ہونے کے باوجود وہ انتہائی منکسر المزاج تھے۔ کارکنوں کا ان

سے بڑھ کر اور کوئی ہمدرد نہ تھا انہوں نے مصیبتیں برداشت کیں مگر اپنے لئے نہ کبھی رحم کی بھیک مانگی نہ وسائل چاہے۔ غریب اور مخلص کارکنوں کے لئے انہوں نے کوئی مدد کرنے میں کبھی تائل سے کام نہیں لیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نہایت سلجھے ہوئے اور سخن فہم بزرگ تھے۔ اشعار کے ہزارہا نگینے ہر وقت ان کے ساتھ رہتے اور وہ جب چاہتے محفل احباب میں یا مجمع عام میں کسی بہترین نگینے کو الفاظ کی انگشتری میں جڑ دیتے۔ افسوس کہ ان کی سیماب صفت طبیعت نے انہیں جم کر بیٹھنے اور اپنے وسیع ذخائر کو مدون کرنے کی فرصت نہیں دی۔ اس طرح کوئی جامع کتاب ان سے یادگار نہیں ہے۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کی نصف صدی کی تاریخ کلی اور کامل طور پر ان کی شخصیت سے متاثر رہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک بڑا ملی صدمہ ہے۔ آج ہر پاکستانی کو محسوس ہو رہا ہے کہ شاہ جی کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے کہ وہ کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

ملت پاکستان پر یہ بہت بڑی آزمائش کا دور ہے۔ ابھی مولوی عبدالحق کی وفات کی خبر فضاؤں میں تھی کہ ایک اور صدمہ عظیم ملک کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ لوگ جو بجائے خود ایک تاریخ ہیں۔ ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالی انہیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور ملت پاکستان کو اس قابل بنائے کہ ان کے رہنما ان مرحومین کی خوبیوں کو اپنا کر، اس خلا کو پورا کر سکیں۔

ہفت روزہ ''لیل و نہار'' لاہور / تعزیتی شذرہ

تقریر کا جادو۔ استعارہ نہیں حقیقت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عجب سانحہ ہے کہ اس دور میں جو بھی بزرگ اٹھتا ہے اس کے ساتھ ایک تہذیب کی علامت اٹھ جاتی ہے۔ ایک درخشاں روایت کی مشعل گل ہو جاتی ہے اور اس کے مرنے سے اک دور مر جاتا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں تقریر کا جادو استعارہ نہیں مرحوم کی ذات میں ایک حقیقت تھا۔ وہ اپنی سحر بیانی سے لاکھوں کے مجمع کو گھنٹوں مو حیرت رکھتے۔ ہنساتے، رلاتے، تڑپاتے اور آمادۂ عمل کرتے۔ اتنا بڑا شعلہ نوا اور معجز بیاں اب پیدا نہ ہو گا اور وہ اس لئے کہ بقول ایک معاصر

......وہ روایت جس میں لفظ گرمیٔ آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا اور وہ روایت جس نے خطابت کو جنم دیا۔ کمزور ہو چکی ہے۔

شاہ صاحب مرحوم نے سیاسی تحریکات کے ایک بھرے پرے دور میں آنکھ کھولی۔ جلد برصغیر کے طول و عرض میں برطانوی غلامی کے خلاف بغاوت اور حریت کی علامت بن گئے۔ یہ موقعہ ان تحریکات پر تبصرہ اور افراد کے سیاسی مسلک پر تنقید کا نہیں۔ لیکن شاہ صاحب مرحوم کے لئے یہ کچھ کم نہیں کہ مسلمان قوم کو، جو ماضی کی شاندار روایات کے تصور میں گم تھی یا حال کی شکست اور درماندگی میں مبتلا، خواب سے بیدار کیا۔ ان میں جوش عمل پھونکا اور کچھ کر گزرنے کی ترغیب دی۔ مسلمانوں میں حقیقت پسندی اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی جو کاوش سر سید مرحوم اور ان کے رفقا نے کی تھی تحریک آزادی کے عہد شباب میں اسی کاوش کی تکمیل اپنے طور پر شاہ صاحب نے بھی کی۔ مرحوم کے سیاسی مسلک سے بجا طور پر اختلاف کیا گیا۔ لیکن ان کے جذبہ حریت سے انکار ممکن نہ تھا۔ لوگ مرحوم کی شعلہ بیانی پر عش عش کرتے تھے حالانکہ وہ محض ان کی ذات کی نمود نہ تھی۔ وہ آزادی کے انتھک سپاہی تھے اور جب قربانیوں کے دعوے کرتے اور کڑی آزمائشوں کو دعوت دیتے تو رسماً یا لطف بیانی کے لئے نہیں۔ مرحوم جب یہ کہتے کہ تین چوتھائی زندگی ریل میں (شہر شہر کا دورہ کرتے) کٹ گئی اور ایک چوتھائی جیل میں تو حقیقت بھی یہی ہوتی تھی، وہ محض ایک سیاسی رہنما نہ تھے، ایک مکمل شخصیت تھے، مجاہد بھی اور رند بھی! جس طرح لاکھوں کے مجمع میں گرجتے اسی طرح احباب کی محفل میں چہکتے اور اپنی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری سے ہر ایک کا دل مٹھی میں رکھتے! شعر و ادب کا مذاق نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ محبت و مروت، اخلاص اور ایثار و رواداری اور دوست داری کا پیکر تھے اور یہ صفات اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔

ہفت روزہ ''اقدام'' لاہور/ تعزیتی شذرہ

رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز!

اگلے روز ملتان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے انتقال سے تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا ہے شاہ صاحب مرحوم و مغفور ایک سچے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی انگریز کے خلاف جہاد میں بسر کی، وہ اس حد تک تن من دھن سے اس جہاد میں شریک تھے کہ انہیں تاریخ کے ایک نازک موڑ پر یہ بات سوچنے کی بھی فرصت نہ ملی کہ انگریز کے بوریا بستر گول کر جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے بعد جب ہندوستان میں سیاسیات جدید کا دور شروع ہوا تو متوسط طبقہ کی فعال سیاسی جتھہ بند مجلس احرار اسلام جس میں شاہ صاحب ایک گرم اور تڑپتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اجتہادی غلطی کا شکار ہو گئے اور تحریک پاکستان کا یہ ہراول دستہ بننے کی بجائے سیاسی بھمبل بھوسوں میں گرفتار ہو گئے اگر اس وقت مسلم لیگ کو مجلس احرار اسلام ایسی فعال جتھہ بند اور جانبدار جماعت کی تائید حاصل ہو گئی

ہوتی تو کم از کم پنجاب کی...... شہ رگ کے قریب سے تقسیم نہ ہوتی۔ خیر یہ تو اب تاریخ کی بات ہے اور آئندہ کا مؤرخ ہی لکھ سکے گا کہ کس نے کہاں پر غلطی کھائی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اردو اور پنجابی کے بے مثال خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ انہیں اختلاف عقیدہ کے علاوہ احمدیوں (مرزائیوں) سے غیر فانی کد کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بانی سلسلہ نے انگریز سلطنت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا (خدا تعالے ابر رحمت کی طرح ہمارے لئے انگریز سلطنت کو دور سے لایا اور ہم اور ہماری ذریت پر یہ فرض ہو گیا کہ اس مبارک گورنمنٹ برطانیہ کے ہمیشہ شکر گزار ہیں۔ ازالہ اوہام صفحہ ۱۳۲)

اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولہ باری جاری رکھی اور دونوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔

ہمارے خیال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس وقت جبکہ ان کے بے شمار نیاز مند طول و عرض ملک میں موجود ہیں ان کی مدد سے ان کی ایک مستند سوانح عمری تیار کی جائے جس میں لفاظی کی بجائے اس دور کی تاریخ کے پس منظر میں ان کی صحیح حیثیت کا یقین کیا جائے۔ ایسی کتاب لکھنے کے لئے شاعر کی ضرورت نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم تاریخ کے اصولوں سے آگاہ ہو۔

ہفت روزہ "قندیل" لاہور / تعزیتی شذرہ

ایک جرار سپاہی

برصغیر ہندو پاک کے ممتاز دینی رہنما اور مشہور سیاسی لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاری طویل علالت کے بعد ملتان میں انتقال فرما گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری گزشتہ پانچ ماہ سے شدید بیمار تھے۔ نشتر ہسپتال ملتان اور پھر لاہور میں زیر علاج رہنے کے باوجود جب آپ کی بیماری میں کوئی افاقہ نہ ہوا تو حکیم عطاء اللہ خاں نے یونانی علاج شروع کیا۔ لیکن مرض الموت کا کیا علاج۔ سید صاحب اپنے مولا کو پیارے ہو گئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک سحر بیان، شعلہ مقال اور آزادی وطن کے ایک جرار سپاہی تھے۔ ان کی تمام زندگی قومی خدمت میں گزری۔ زندگی کے آخری ایام میں ان پر فالج کے کئی حملے ہوئے پھر ملتان میں وہ ایک ایسے بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر تھے جو فالج کے مریضوں کی رہائش کے بالکل ناقابل رہائش تھا۔ شاہ صاحب انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ برے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ صدر پاکستان کو جب ان کی آخری بیماری کا علم ہوا تو انہوں نے ماہرین کو ہدایت کی وہ شاہ صاحب کا طبی معائنہ کریں اور علاج میں خاصی دلچسپی لیں۔ لیکن یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور آخری وقت آن پہنچا۔

صدر پاکستان نے شاہ صاحب کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پیغام تعزیت میں کہا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات سے مجھے بے حد رنج ہوا ہے۔ آپ جنگ آزادی اور اسلام کے ایک زبردست مجاہد تھے اور قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت جدا کر دی۔ خدا آپ کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

پنجاب یونیورسٹی کا اردو مجلہ "محور" (ستمبر ۱۹۶۱ء) تعزیتی شذرہ

اس دور کا سب سے بڑا المیہ!

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ المیہ اس لئے کہ نئی نسل یہ تو جانتی ہے کہ برک نے برطانوی پارلیمنٹ میں کیا کچھ کہا۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ روم میں انطونی نے کس طرح اپنی خطابت سے بروٹس کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ شاہ صاحب نماز عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے تھے اور ہزاروں سامعین رات بھر بیٹھنے کے بعد فجر کی نماز ان کی امامت میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کی خطابت کا سحر راہ چلتے لوگوں کو کھینچ کر جلسہ گاہ میں لے آیا کرتا۔

ایک بار انجینئرنگ کالج مغلپورہ کے انگریز پرنسپل کے خلاف لاہور میں جلسہ ہو رہا تھا۔ رات کے دو بجے تقریر کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فیصلہ کیا کہ ابھی موچی دروازہ سے جا کر سب لوگ کالج کے سامنے مظاہرہ کریں اور دس ہزار کا مجمع نعرے لگاتا ہوا شاہ صاحب کے پیچھے چل پڑا۔

یہ آواز کا جادو اس لئے تاریخی حیثیت اختیار نہ کر سکا کہ انطونی کی طرح انہیں کوئی شکسپیئر نہ ملا۔ اور پھر اس لئے بھی کہ بعد میں ان کا سیاسی مسلک انہیں مسلم لیگ سے دور لے گیا اور وہ تحریک حصول پاکستان سے کٹ گئے۔ وہ غلط راستہ پر تھے مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی دیانت، خلوص اور بے غرضی شبہ سے بالاتر تھی۔

ان کی درویشی اہل بصیرت کے لئے آج بھی چراغ راہ ہے۔

ہفت روزہ "ایشیا" لاہور / تعزیتی شذرہ

جامع کمالات شخصیت

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا صدمہ ابھی تازہ تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۷۲ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہ صاحب کو مرحوم لکھتے وقت کلیجہ کانپتا ہے لیکن موت

سے کس کو رستگاری ہے۔ وہ اپنے معین وقت پر آتی ہے اس سے فرار کسی کو ممکن نہیں۔

شاہ صاحب مرحوم گزشتہ پانچ ماہ سے شدید علالت کا شکار تھے مختلف ہسپتالوں میں قابل ڈاکٹروں کی زیر نگرانی ان کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن شاہ صاحب کی حالت روز بروز گرتی گئی اور آخر ۲۱ اگست کو شام چھے بج کر ۱۵ منٹ پر ان کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم جامع کمالات شخصیت تھے۔ برصغیر میں اس پائے کا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ جنگ آزادی میں شاہ صاحب نے نمایاں طور پر حصہ لیا اور عمر عزیز کا ایک حصہ تقریباً ۱۸ سال جیل میں بسر کئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری زندگی بھی کیا تین چوتھائی ریل میں کٹی اور ایک چوتھائی جیل میں۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ صاحب مرحوم نے اپنی شعلہ بیانی کے ذریعہ عوام میں وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی جو بہت کم لیڈروں کو نصیب ہوئی۔ ان کی تقریر سراسر اعجاز تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ عشا کی نماز کے بعد تقریر شروع کرتے اور فجر کی نماز تک تقریر جاری رہتی۔ ان کی تقریر کے دوران کسی شخص کو جلسہ سے اٹھ کر جانے کا ہوش نہ رہتا تھا۔ مخالف سے مخالف مجمع کو شاہ صاحب اپنی سحر بیانی سے مسحور کر لیتے تھے۔ ہزار ہا افراد کو بیک وقت لا دینا اور ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے کے مطابق مجلس احرار قائم کی گئی۔ شاہ صاحب مرحوم جماعت کے روح و رواں تھے۔ چوہدری افضل حق مرحوم کو جماعت کا دماغ اور شاہ صاحب کو زبان سمجھا جاتا تھا۔ جرأت، ہمت اور استقلال میں شاہ صاحب مرحوم اپنی مثال آپ تھے۔ غیرت حق اور روح ایمانی سے ان کا سینہ ہمیشہ معمور رہتا تھا۔ اسلام کے بنیادی عقائد اور نبی اکرم ﷺ کی آبرو پر جب کوئی دشمن دین ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو شاہ صاحب بے دھڑک اس کے آگے سینہ سپر ہو جاتے۔ اور پھر یہ نہیں دیکھتے تھے کہ مخالف کتنا طاقت ور اور بااثر ہے۔ برطانوی سامراج کے ہاتھوں انہیں بارہا صعوبتیں سہنا پڑیں۔ لیکن ان کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہ ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد وہ عملاً سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لیکن تحریک ختم نبوت کے دوران وہ پھر اسلام کی آبرو بچانے کے لئے میدان میں اتر آئے تھے۔ شاہ صاحب ایسی جامع کمالات شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ پرانے بادہ کش ایک ایک کر کے اس محفل ہستی سے اٹھتے جاتے ہیں اور کوئی ان کی جگہ پر کرنے والا نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالے ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور / تعزیتی شذرہ

مجاہد اعظم رحمۃ اللہ علیہ

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو یہ جگر خراش خبر سارے ملک نے انتہائی رنج و قلق سے سنی کہ ملک کے مایہ ناز فرزند بطل جلیل، مجاہد اعظم، جنگ آزادی کے شیردل رہنما، محب و محبوب اولیاء اللہ، شمع ختم نبوت کا پروانہ..... امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شاہ صاحب حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سر پر پڑتی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی، وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھی کہ کفر و ضلالت کے جس خرمن پر گرتی اس کو راکھ کر دیتی۔ وہ لحن داؤدی کا اس دور میں نمونہ تھے کہ دوست و دشمن سب کو مسحور کرلیتے۔ وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان پڑجاتی۔ جس کی ایک آواز پر ۵۰ ہزار رضاکار آزادئ کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر چل پڑتے۔ جن کے ایک اشارے پر متحدہ ہندوستان کے برطانوی جیل خانے بھر جاتے۔ جن کا داخلہ قادیان کے ایوان مرزائیت میں زلزلہ ڈال دیتا۔ جو علم و عمل، شعر و ادب، اخلاق و مزاج، ظرافت و لطافت، شریعت و طریقت اور رزم و بزم کے مجمع کمالات تھے۔ وہ جو تقریر و خطابت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ جہاں کہیں آپ کی تقریر ہوتی۔ مسلمان تو مسلمان ہندو سکھ آپ کی زبان سے قرآن کی تلاوت سننے آجاتے۔ مخالفین تقریر سے محظوظ ہونے کو شریک ہوتے اور خدام و معتقدین پروگرام لینے کے لئے حاضر ہوتے۔ آپ کے توشہ آخرت کے لئے یہ قابل فخر سامان بس ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عطاء اللہ کی باتیں تو عطاء اللہی ہوتی ہیں۔

۲۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ کے آپ منظور نظر تھے۔ یک بار مزاحاً فرمایا

"یہ میرے مرید نہیں پیر ہیں۔"

۳۔ خاتم المحدثین حضرت العلامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کشمیری نے آپ کو امیر شریعت بنایا۔

۴۔ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب نے آپ کو چھاتی سے لگایا اور دل میں جگہ دی۔

۵۔ شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مفتی اعظم کفایت اللہ صاحب اور حضرت شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی سب اکابر امت اور اولیا ملت آپ کو محبوب رکھتے۔

۶۔ قطب زماں حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سراجیہ مجددیہ، نقشبندیہ کندیاں شریف نے۔ جب سنا کہ امیر شریعت پر سکندر حیات کی حکومت نے مسلح بغاوت کا مقدمہ بنایا ہے تو وہ بے چین ہو کر متوجہ ہوئے اور اللہ تبارک و تعالے سے دعا مانگی۔

غرض کہ حضرت امیر شریعت سب کی آنکھوں کا تارا تھے۔ اب وہ اپنے حقیقی آقا کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ جہاں زود یا بدیر ہم سب کو پہنچنا ہے اور جہاں سے پھر کبھی کسی کو واپس نہیں آنا۔ بے شک یہ سانحہ ایک قومی حادثہ ہے۔ صاحبزادگان محترم کو ہم سے زیادہ صدمہ ہے۔ ان کے متعلقین بلکہ سارے ملک کو صدمہ ہے..... رونے والو! ان پر نہ روؤ۔ وہ اپنا سفر کامیابی سے طے کر چکے۔ اپنی حرماں نصیبی پر آنسو بہاؤ کہ اس نازک دور میں ہم ان مبارک ہستیوں سے محروم ہو گئے۔ اپنے ایمان کی خیر مناؤ۔ ان نفوس قدسیہ کے مشن کو زندہ کرو۔ علماء حق کا ساتھ دو۔ اسلاف امت کی اتباع کرو اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کی رضا مندی کے راستوں پر چل پڑو۔ بے شک وہ حضرات ہم سے جدا ہو گئے مگر ان کی روشن کی ہوئی مشعل ابھی تک روشن ہے۔ اس کی روشنی میں چلو۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطاء فرمائے اور ان کے فرزندان رشید کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور / تعزیتی شذرہ

محفل عزم و عمل کا روشن چراغ

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب کو ملتان سے یہ اندوہناک اطلاع موصول ہوئی کہ محفل عزم و عمل کا وہ چراغ جو کئی سال سے مرض و ضعف کے مسلسل اور شدید جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا۔ ۷۲ سال حنا گستریوں کے بعد ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ کی شام کو چھ بج کر ۵۵ منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

داغ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فالج، لقوہ اور یرقان کی تکلیف دہ بیماریوں میں متواتر چار سال مبتلا رہنے کے بعد اس دنیائے فانی کو الوداع کیا اور اپنے بے شمار دوستوں، مریدوں اور معتقدوں اور مستفیدوں کو محزون و ملول چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ بڑا ہنگامہ خیز اور پر آشوب تھا۔ اور تحریک خلافت پورے شباب پر تھی۔ اس زمانہ میں شاہ صاحب مرحوم امرتسر کی ایک مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ منصب ذمہ داری کے اعتبار سے عام طور پر ان کے زیر بحث اگرچہ مذہبی مسائل ہی رہتے تھے۔ لیکن اس ابتدائی دور میں ان کی تقریر میں بڑی روانی بڑا زور اور بڑا اثر تھا۔

مولانا سید داؤد غزنوی کا شمار اس دور میں خلافت کے مصروف اور ذمہ دار لیڈروں میں ہوتا تھا۔ شاہ صاحب کی تقریر کی تاثیر پذیریوں اور ان کے انداز بیاں کی بے پناہیوں کی اطلاع مولانا غزنوی کو پہنچتی رہتی

تھی۔ اسی اثناء میں ایک روز انہوں نے شاہ صاحب کو یاد فرمایا وار کہا کہ مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلیں۔ خطابت و امامت کی محدود ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد کریں۔ ملک کے وسیع تر اور غیر محدود مفادات کا جائزہ لیں اور سیاسیات کی دنیا میں قدم رکھیں۔ آج ملک کو آپ کی بے لوث اور مخلصانہ خدمات کی بے حد ضرورت ہے چنانچہ شاہ صاحب میدان میں اترے اور اپنی تمام تر خدمات ملک و قوم کے حوالے کر دیں۔ یہ ان کی بھرپور اور پرجوش جوانی کا زمانہ تھا۔

سیاسیات کے کوچے میں قدم رکھتے ہی ان کی تقریریں ہونے لگیں اور نتیجۃً ۳ سال کے لئے جیل بھیج دئیے گئے۔ اس کے بعد ان پر سنگین سے سنگین مقدمے چلے، زبردست آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ پھانسی اور عمر قید کے منصوبے بنائے گئے۔ بارہا جیل گئے اور عمر عزیز کے کئی سال زندانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں گزار دیئے۔ آخری دفعہ وہ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کی مشہور اور ہمہ گیر تحریک ختم نبوت میں ماخوذ ہوئے۔

مدیر الاعتصام کو ایک سلسلہ میں مولانا مجاہد الحسینی کی معیت میں مارچ ۱۹۵۶ء میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہ لاہور تحفظ ختم نبوت کی ایک کانفرنس میں تشریف لائے تھے اور دہلی دروازے کے باہر دفتر احرار میں قیام فرماتھے۔ مولانا مجاہد الحسینی نے تعارف کرایا تو اس عاجز کو اپنے پاس چارپائی پر بیٹھایا اور الاعتصام کی تعریف کی۔ بعض مضامین کی تو بہت تحسین کی اور فرمایا میرے کہنے سے ملتان کی تحفظ ختم نبوت نے ان کو کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ مختلف عنوانات پر باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا داؤد غزنوی کی خیر و عافیت دریافت فرمائی اور کہا میں تو ایک گوشہ نشین فقیر تھا اور مجلس میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ خلافت کے زمانہ میں مجھے داؤد غزنوی ہی مسجد کے گوشہ عافیت سے کھینچ کر سیاست کے خاردار میں لے آئے تھے۔

شاہ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ان کی موت تنہا ایک شخص اور یک فرد کی موت نہیں ہے۔ ایک عہد ایک دور اور ایک جماعت کی موت ہے۔ وہ ایسا بے تاب و مضطرب دل لے کر آئے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے قرار ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز اتنی پُردرد اور پُرسوز تھی کہ برصغیر پاک و ہند اور عالم اسلام کے ہر سانحہ میں بے اختیار بلند ہو جاتی تھی۔ ظلم کے خلاف ان کی صدا اتنی موثر تھی کہ ایک آن میں صور اسرافیل بن جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں اسلام اور اہل اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آلود ہو جاتی تھیں۔ مسلمانوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف بھی نہ وہ خود برداشت کر سکتے تھے اور نہ یہ گوارہ کرتے تھے کہ کوئی برداشت کرے۔ ناممکن تھا کہ وہ مظلوم کو ظلم و ستم کے شکنجہ میں جکڑا ہوا دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ ملک و قوم کی تکلیف کے وقت خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ انہوں نے غلام آباد ہندوستان میں انگریز کے خلاف زبردست ٹکرلی اور اس کی حکومت کو اپنا سب سے بڑا حریف قرار دیا۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر ماتم کناں ہوئے اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت پر بھی مضطرب ہو گئے۔ انہوں نے

عراق، ایران، تجار، حجاز مصر، شام، ٹرکی، بیت المقدس غرض ہر خطہ ارض کے مسلمانوں کی مظلومیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔
یہی وجہ ہے کہ آج صرف ہندوستان ہی نہیں، پورا عالم اسلام کا ان کا عزادار ہے اور ہر مسلمان کی آنکھیں ان کی موت پر اشکبار اور ہر شخص کا دل محزون و غمگین ہے۔ وہ قادر الکلام مقرر تھے جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ وہ بلبل خوش نوا تھے جس کے ترانے اب کبھی نہ سنے جائیں گے۔ وہ آتش زبان خطیب تھے جو قیامت تک نہ بول سکیں گے۔ وہ بہادر اور بے خوف انسان تھے جواب کبھی اپنی بہادری کے جواہر نہ دکھا سکیں گے۔ وہ جنگ آزادی کے ایسے بے باک اور نڈر سپاہی تھے جو ہمیشہ میدان جنگ میں دشمن سے لڑتے تھے اور اب ایسے گرے ہیں کہ کبھی نہ اٹھ سکیں گے وہ ایک مردم آفریں عہد اور خاص دور کی پیداوار تھے۔ اب نہ وہ دور واپس آئے گا اور نہ اس قسم کے اولوالعزم اور باہمت و جری لوگ پیدا ہوں گے۔ "الوداع عطاء اللہ شاہ بخاری الوداع"

ماہنامہ "الصدیق" ملتان
ربیع الاول ۱۳۸۱ھ / تعزیتی شذرہ

میرِ کارواں

دنیا فانی ہے۔ اس میں جو آیا اس نے جام فنا پینا ہے۔ اس میں سکندر رہا نہ دارا۔ نہ شاہان عرب رہے۔ نہ سرداران عجم۔ امیر ہو یا غریب۔ بچہ ہو یا بوڑھا۔ کمزور ہو یا توانا۔ اس دنیا میں پل بھر دم لینے والے مسافر کی مانند ہے۔ جس کا دور ٹھکانہ ہے۔ پل بھر ستانے کے وقفہ میں اسے اختیار ہے کہ غفلت کی نیند سو جائے یا بیدار رہ کر دوسرے ساتھیوں کی معیت میں عیش و عشرت، لہو و لعب اور غلط کاریوں میں وقت کاٹ دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی خوش قسمت مسافر خدمت پر کمر بستہ ہو جائے۔ ساتھیوں کی مشکلات حل کرے۔ انہیں مفید مشورے دے۔ ان کی الجھنوں کی گتھیاں سلجھا دے۔ بکھرے ہوئے مردوں میں وحدت کا جذبہ ابھار دے۔ اور انہیں انفرادی سفر کی بجائے قافلہ کی شکل میں سفر کی تعلیم دے کر راستہ کی کھٹن منزلوں کو آسان بنا دے۔ اپنے عزم و استقلال کی وجہ سے قافلہ کو دشوار گزار گھاٹیوں سے صحیح سلامت لیکر پار اتر جائے۔

اس آخری نوع کے مسافر کے لئے میر کارواں کا خطاب زیبا ہے۔ اور اسی بنا پر میں نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب کو مذکورہ بالاخطاب کا مستحق قرار دیا ہے۔ پرسوں تک سید عطاء شاہ صاحب ہم میں تھے۔ کل ان کا جنازہ اٹھا۔ نماز ادا ہوئی۔ اور سپرد خاک کئے گئے۔ شاہ صاحب ایسا مرد آہن، ان تھک مجاہد، بیدار مغز، مستقل

مزاج، حق گو، حق پرست، برعظیم ہندوپاک کی سرزمین نے مشکل سے دیکھا ہو گا۔ سب سے بڑھ کر فن خطابت اور قرآن دانی کی خوبی میں شاہ جی ممتاز ترین شخصیت کے مالک تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ عشاء کی نماز ہوئی اور شاہ جی نے منبر مصطفوی پر قرآن سنانا شروع کیا۔ پھر کیا ہوا؟ شاہ جی کا ذوق تلاوت بڑھتا گیا۔ اور سامعین کا شوق سماعت بھی یہاں تک کہ صبح کی اذانیں صدائے مرغ بے ہنگام تصور ہونے لگیں۔ اور لوگ بے ساختہ پکار اٹھے کہ کیا ہوا ابھی سے اذانیں کیوں؟ کیا رات چھوٹی ہو گئی ہے؟ حقیقت میں نہ رات چھوٹی تھی نہ بانگ بے ہنگام۔ بلکہ قاری و سامعین کی شب وصال تھی جس کے پہر گھنٹے، گھنٹے منٹ اور منٹ سیکنڈ ہو کر رہ گئے۔

انگریز بہادر کی عملداری میں جبکہ آزادی کا نام لینا بھی جرم تھا۔ مجاہدین آزادی کو بے دلیل و اپیل جیل میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں ۱۸۵۷ء کا بھیانک نقشہ تھا۔ اور آزادی کا لفظ منہ پر لانے سے کانپ اٹھتے تھے۔ ان دنوں شاہ جی ہی کی ذات گرامی تھی۔ جس نے چپہ چپہ زمین پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے۔ اور اس سے بڑھکر یہ کہ اہل باطل کو اہل حق پر حکومت کرنیکا کوئی حق نہیں ہے۔ شاہ جی کی بلند ہمتی اور مخلصانہ جدوجہد کے نتیجہ میں ہزاروں علماء کے اجتماع میں آپ کو امیر شریعت مانا گیا۔ اور پاک و ہند میں شریعت کی باگ ڈور حضرت شاہ جی کے متبرک ہاتھوں میں دے دی گئی۔ ادھر یہ ہوا۔ ادھر انگریزی راج کے عتاب میں جوش آیا۔ نت نئے مقدمے بننے لگے۔ ایک مقدمہ سے رہائی ہوئی۔ تو دوسرے میں پھنسا دیئے گئے۔ مگر حضرت شاہ جی ہر سٹیج پر حضرت موسےؑ کے یہ الفاظ دہراتے گئے۔

فاقض ماانت قاض انما تقضی ہذہ الحیوۃ الدنیا۔

شاہ جی کو خریدنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ تب آپ یوسفؑ کے یہ الفاظ نقل فرمایا کرتے۔

معاذاللہ انہ، ربی احسن مثوی۔ انہ لایفلح الظلمون۔

شاہ جی یہ جوابات کیوں نہ دہراتے جبکہ آپ میں جلال موسوی اور حسن یوسفی دونوں بیک وقت جمع تھے۔ آخر کار جھوٹے مقدمے بنا کر شاہ جی کو عمر قید میں دینے کی کوششیں کی گئیں۔ مگر مرد مجاہد تائید ایزدی سے ان تمام مصائب کی پروا نہ کرتے ہوئے صدائے حق بلند کرتا گیا۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ خدایا میری ان دو دعاؤں میں سے ایک ضرر مقبول فرما لے یا تو انگریزی راج کو برعظیم ہندوستان سے نکلتے ہوئے مجھے میری آنکھوں سے دکھا دے (اور یہی میری دلی خواہش ہے) یا پھر توفیق دے کہ ملک کی آزادی کی خاطر ہنسی خوشی تختہ دار پر چڑھ کر مجاہدانہ جان دے دوں۔ چنانچہ بارگاہ ایزدی میں ان کی پہلی دعا ہی منظور و قبول ہوئی۔ اور شاہ جی نے اپنی صحت و سلامتی میں انگریز کی روانگی دیکھ لی۔

شاہ جی صرف آپ ہی مجاہد نہ تھے۔ بلکہ اللہ تعالےٰ نے ان میں مجاہد گری کی خاصیت بھی ودیعت فرمائی

تھی۔ اور عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جو شخص بھی شاہ جی کی خدمت میں چند دن تک رہا اس نے تحریک آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اور صرف جیل ہی نہیں۔ دار ورسن تک کو چومنے کے لئے تیار ہو گیا۔ آج جالندھری و شجاع آبادی، کاشمیری ولاہوری، سرحدی و میانوی، جس فلک کے درخشاں ستارے نظر آتے ہیں۔ شاہ جی اس فلک کے نیر اعظم تھے۔

آج شاہ جی ہم سے چھن گئے۔ آج ہم ان کے مفید مشوروں اور مخلصانہ دعاؤں سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر وہ ہمیں اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل دیئے گئے ہیں۔ خدا ہمیں ان کی پیروی کی توفیق دے۔ اور انہیں اخص الخاص جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ (عبدالوہاب ابراہیمی ملتان۔)

ماہنامہ "تدریس القرآن" ہری پور / ستمبر ۱۹۶۱ء (غلام ربانی لودھی)

"ملت کا ترجمان...... شیوا بیان!"

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو ملت اسلامیہ کا وہ عظیم و جلیل ترجمان شیوا بیان دار فانی سے منہ موڑ کر رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جو بچوں کا رفیق، جوانوں کا سپہ سالار اور بوڑھوں کا غمگسار تھا۔ اور جس کا نام عطاء اللہ شاہ بخاری تھا۔ جو ہر دلعزیزی اور محبوبیت کا گویا عنوان اعتباری تھا متانت اور مسائل مشکلہ کے صدر الصدور کی جگہ خالی ہو تو وہ مولانا بخاری کے ذریعہ پر ہو سکتی تھی۔ اور اگر صدر مجلس مولانا آزاد، شیخ الہند، انور شاہ وغیرہ جبال علم و فضل موجود ہوں تو عطاء اللہ شاہ بخاری عسکری سالار کی حیثیت سے ان کی پر نور مجلس کے لئے وسیلہ قوام و قیام تھا۔ صحافیوں اور ادیبوں کا قبیلہ علوم عربیہ کے طالب علموں کی طرف بہ نگاہ استخفاف دیکھنے کی جرأت نہیں کر پاتا تھا کہ جب تبلیغ و دعوت اور مسائل دینیہ سے فرصت حاصل کر کے ادیبوں کی طرف حضرت مولانا بخاری رخ انور کو پھیر لیتے تھے تو ملک کے ادیب سر پھیرنے لگتے تھے کہ مساجد کے تعلیم یافتہ متقشف عالمانِ دین کے شدید ضبط کے پابند و وفادار لوگوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں جو شعر کہنے والے، شعر کے تنقید کرنے والے اور چست و برجستہ کلام سے دھاک بٹھا دینے کی صلاحیت رکھنے والے ہوں؟ جب مستقبل کا مؤرخ انگلستان کی سرزمین سے اٹھنے والے فتنوں کی دست برد سے یثربی در یتیم ﷺ کی مشرق و مغرب میں بکھیری ہوئی دولت ایمانی کو بچانے والے مجاہدین کے اعمال کا جائزہ لے گا تو سید الاحرار حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام کو سر خیل جانبازانِ جیش محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں پائے گا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک خصوصیت جس نے ان کے حسین و جمیل نامۂ اعمال پر مہر تکمیل ثبت کی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے وسائل پر قدرت پانے کے باوجود اپنی اولاد کو تہذیب جدید کی اندھی تقلید سے بچانے کی سعی فرمائی۔ چنانچہ ان کے بچے عربی علوم کے فاضل، حافظ قرآن اور ماہر تجوید ہیں اور یہ بشارت بھی سن لیجئے کہ مرحوم کے صاحبزادہ اکبر عطاء المنعم بلاغت و فصاحت: اور خطابت و شجاعت میں باپ سے کم نہیں۔ اور انشاء اللہ اب ان کے آگے بڑھنے کا وقت ہے دعا ہے کہ مرحوم کو اعلےٰ علیین کا مقام اور وارثین کو صبر جمیل کا انعام نصیب ہو۔

عاصی کرنالی

ایک شعلہ جو بہت بے تاب و برہم ہو گیا۔

ایک شعلہ جو بہت بے تاب و برہم ہو گیا
شاہ صاحب کی خطابت میں مجسم ہو گیا
آندھیوں کا زور، بادل کی گرج، طوفاں کا جوش
سیل کی آہٹ، کڑکتے صاعقے جیسا خروش
زلزلہ، صرصر، تلاطم، آگ، لاوا، بانگِ صور
موت کی للکار، برزخ، نعرۂ یوم النشور
کاٹ میں ایک ایک لہجہ خنجرِ باطل شکن
گفتگو کی تیغِ براں اور فرمانِ "بزن"
جانِ باطل کے لئے ہر لفظ مرگِ ناگہاں
اہلِ ایماں کے لئے آبِ حیاتِ جاوداں
ایک جانب ہر خطابِ آتشیں حق کا جلال
ایک جانب ہر کلامِ دل نشیں حق کا جمال
ابرِ رحمت، رشحۂ الطاف، بارانِ کرم
شاخِ زمک، برگِ گل، بادِ سحر گاہی کا نم
علم، قرآں، آگہی، ایقاں، تفکر، اعتقاد
شرع، ایمان، معرفت، حکمت، تفقہ، اجتہاد
رمز، ایما، طرفگی، ایجاز، تشبیہ و مثال
بذلہ سنجی، خوش دلی، نکتہ طرازی، اعتدال
قول، مصرع، ضلع، دوہا، کہہ مکرنی، چٹکلہ
طب و حکمت، ہئیت و سائنس، شعر و فلسفہ
ایک کہسارِ بلاغت، محکم و گردوں نشیں
ایک دریائے فصاحت جس کی کوئی حد نہیں
جب تلاوت آشنا ہوتے تھے وہ گل ہائے لب
جگمگا اٹھتے تھے مانندِ سحر رخسارِ شب

سب پہ چھا جاتے تھے وہ شاداب موسم کی طرح
آیتیں ذہنوں کو تر کرتی تھیں شبنم کی طرح
ہاں تو اے اربابِ مجلس! ان کا اندازِ خطاب
جو دلوں میں تیر جائے وہ صدائے انقلاب
زندگی جاگی نوائے مردِ حق آگاہ سے
جی اُٹھے دل اس صدائے قُم باذن اللہ سے
ہم سے خاک آسودگاں کو جسم و جاں دیتے رہے
شاہ جی جا جا کے قبروں پر اذاں دیتے رہے
اس خطابت کے جِلو میں دوسرا منظر بھی تھا
لفظ کے آئینے میں کردار کا جوہر بھی تھا
سختیاں، آلام، بیماری، مصائب، زجر و بند
ظلم، تعزیرِ وفا، دشنام، زنداں، قید و بند
جبر کی ایک ایک آندھی کے مقابل ڈٹ گئے
ہرچہ بادا باد، زندہ بچ گئے یا کٹ گئے
یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے مِرے مضمون سے
حریت کی داستاں لکھی گئی ہے خون سے
ملتِ اسلام! اے روشن نصیب و خوش نظر
دیکھ اس انمول آزادی کی ظالم! قدر کر
خطۂ ارضِ وطن اک مشترک تعبیر ہے
شاہ جی کا خونِ دل بھی شاملِ تعمیر ہے

(پروفیسر عاصی کرنالی بنام حفیظ رضا پسروری)

امیر شریعت قلندر، فقیر

وہ سامنے جلوہ گر تھے۔ جیسے شمع اور گرد مریدان صادق اور محبان وفا کیش جیسے جانثار پروانے۔ کیا عالم نور وظہور تھا اور شہود و حضور کی کیسی دل نواز محفل تھی۔

زبان حال سے پروانۂ بسمل یہ کہتا ہے
حضوری ہو اگر حاصل مزا ہے نیم جانی ہے
(اکبر)

اور شاہ جی علیہ الرحمتہ سامنے متمکن تھے اس لئے حضوری کے انوار و تجلیات کی بارش ہورہی تھی میری نظر ان کے روئے اقدس پر تھی۔

خوشا نگاہ کہ گلچین صد تماشا ہے
(عاصی)

اور رومی کے اس شعر کی حکومت تھی

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
نکتہ حل می شود بے قیل وقال

میں ایسی انجمنوں کی جلوہ آفرینی اور سعادت اندوزی کا ذکر آپ سے کیوں کروں۔ آپ صاحب غیاب تو نہیں، آپ کو تو خود حضور و تجلی کا مقام حاصل ہے اور ان خدائی چراغوں سے اکتساب نور و ضیا کا شرف اور توفیق آپ کو بخشی گئی ہے۔ کیا یہ عالم نہیں ہوتا تھا کہ شاہ جی...... جیسے نور کا ایک بے کراں سمندر ہے اور ہم ان امواج تجلی میں غرق ہوگئے اور ہماری ارواح نے غسل نور کیا ہے...... اور یہ لوگ اٹھ گئے تو یہ حالت ہوگئی۔

رات انجمن میں ایک ترے پر تو بغیر
کیا شمع، کیا پتنگ، ہر اک بے حضور تھا
(میر)

ہاں تو شاہ جی مسند نشین تھے اور ہم ان کے قدم بوس خوشہ چینِ جمال و کمال۔ میں نے عرض کی شاہ جی!...... چند شعر آپ پر ہوئے ہیں اجازت ہو تو سناؤں۔
مسکرائے شعر پڑھا،

برو ایں دام بر مرغ و گرنہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

میں نے کہا شاہ جی! میں دام ضرور پھیلاؤں گا۔ آپ عنقا ہونے کے باوجود اس میں پھنسیں گے۔ اس لئے کہ یہ دام عقیدت ہے جو ارادت و نیاز کے تانے بانے سے تیار ہوا ہے۔ اجازت مل گئی۔ شعر سنانے لگا۔ اس وقت میری حالت کا تصور کیجئے، سنا ہے سیدنا حسان بن ثابتؓ جان دو عالم ﷺ کے سامنے جمال کے ترانے گاتے تھے۔ یہاں، ایک جانب اس نبی کی اولاد، ایک سید زادہ کہ مرکز مہر و وفا اور قرار دل و نظر تھا اور دوسری جانب حسانؓ کا ایک ادنی سا شاگرد جسے اس کے جذب و نیاز نے مدح طرازی کے لئے دل آمادہ کیا تھا۔ کیا کیفیت تھی۔ مجھ پر اس وقت........ محبوب سامنے ہو اور عاشق بمصداق.... دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بین!..... مدح کے مضامین ادا کر رہا ہو۔ اس خوف کے ساتھ کہ کہیں فکر کی نارسائی اور سلیقے کی کوتاہی اس مدحت سرائی کو سوئے ادب کی تعریف میں نہ لے آئے۔ الحمدللہ۔ شعر شاہ جی کو پسند آئے اور خاتمے پر فرمایا۔ اگر یہ شعر پہلے ہو جاتے تو "سواطع الالہام" (شاہ جی کا مجموعہ کلام) میں صوفی تبسم کی غزل کے ساتھ چھاپتا۔ یہ حدیث بخاری میری نجات و مغفرت کا پروانہ ہے۔ انشاء اللہ العزیز

میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ یہ شعر آپ کو لکھ بھیجوں۔ اس لئے ایک تو آپ میرے پیر بھائی ہوئے۔ دوسرے آپ کا مرتبۂ فن شناسی اور منصب شعر گوئی اس کا متقاضی تھا اور تیسرے ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے! اور سب سے بڑی بات یہ کہ درد کی بات درد آشناہی سے کہی جا سکتی ہے۔ آپ اسے بے شک شاہ جی کے ایک مخلص عقیدت مند جناب عبداللہ ملک کے روزنامے میں دبے سکتے ہیں۔

امید ہے یہ شعر آنکھوں کو نمناک اور شبنم افشاں کر دیں گے۔ کہ یہی شبنمِ اشک ہے جو اہل درد کے دل کی کھیتی کو ہرا کر دیتی ہے۔

والسلام خاکپائے اہل دل........ عاصی کرنالی

(روزنامہ "آزاد" لاہور، ۲۱ اگست ۱۹۷۱ء، ص ۴)

سرور میواتی

نطق کا سیلِ رواں

واعظِ شیریں بیاں سید عطاء اللہ شاہ
طوطیِ شکر فشاں سید عطاء اللہ شاہ

نطق کا سیلِ رواں سید عطاء اللہ شاہ
قائد شعلہ بیاں سید عطاء اللہ شاہ

دینِ حق کا پاسباں سید عطاء اللہ شاہ
اہلِ حق کا ترجماں سید عطاء اللہ شاہ

قائد و میرِ شریعت نکتہ سنج و نکتہ داں
قوم کی روح و رواں سید عطاء اللہ شاہ

اپنی تقریروں میں ہر عنوان و ہر موضوع پر
باندھ دیتے تھے سماں سید عطاء اللہ شاہ

نام سونے کا نہ لیتا پورے مجمع میں کوئی
صبح تک کرتے بیاں سید عطاء اللہ شاہ

اہلِ مجلس کو ہنسا دیتے، رلا دیتے کبھی
تھے بڑے جادو بیاں سید عطاء اللہ شاہ

ہو گیا وہ بندۂ بے دام جس نے سن لیا
آپ کا کوئی بیاں سید عطاء اللہ شاہ

محفلِ صاحبدلاں میں بادۂ توحید کے
ساقی و پیرِ مغاں سید عطاء اللہ شاہ

رزم گاہ حق و باطل میں نظر آئے سدا
شیرِ نر، پیلِ دماں سید عطاء اللہ شاہ

زندگی بھر حق و باطل کی لڑائی میں رہے
کامیاب و کامراں سید عطاء اللہ شاہ

حفظِ ناموسِ رسالت روز و شب کرتے ہوئے
ہو گئے خلد آشیاں سید عطاء اللہ شاہ

جب پیام موت آپہنچا تو ہنس کر ہو گئے
داخلِ باغِ جناں سید عطاء اللہ شاہ

سرِ شاخِ طوبیٰ تھا جس کا نشیمن

امیرِ شریعت وہ مردِ قلندر وہ شہبازِ اسلام وہ مردِ آہن
وہ باغِ نبوّت کا ایسا تھا بلبل سرِ شاخِ طوبیٰ تھا جس کا نشیمن
بہارِ فصاحت نگارِ بلاغت سفیرِ رسالت ضمیرِ شرافت
نثارِ نبوت مدارِ عزیمت، وہ مینارِ عظمت پہ تھا جلوہ افگن
وہ تنویرِ جذباتِ صدیقِ اکبرؓ، وہ تصویرِ اخلاقِ شبیرؓ و شبرؓ
وہ شمعِ رسالت پہ جل بجھنے والا وہ سینائے توحید پر جس کا مسکن
وہ شورِ سلاسل پہ زورِ خطابت، وہ جوشِ شجاعت پہ ہوش و فراست
وہ شوقِ شہادت پہ ذوقِ تلاوت وہ سوزِ محبت سے دل مثلِ گلشن
وہ زندانِ افرنگ کے صحن میں لحنِ داؤدی سے گنگناتا جو قرآن
تو جھوم اٹھتے تھے عاشقانِ محمد لرز اٹھتے تھے دین و ایماں کے دشمن
شب و روز عشقِ محمد میں تڑپے، دلِ شیرِ نر اس کے سینے میں دھڑکے
دھاڑے تو ڈھے جائیں باطل کے قلعے جو بولے تو کھل جائیں گلشن کے گلشن
وہ قرآن کی لوریاں دے کے ملت کی بے چین گھڑیوں کو تسکین بخشے
سمندر کی بپھری ہوئی موج بن جائے ظالم لگائیں زباں پر جو قدغن
وہ تقریر کی موسلادھار سے دل کی بنجر زمینوں کو شاداب کرتا
مگر برقِ عشقِ نبوت سے دزدانِ ختمِ نبوت کے جل جاتے خرمن
سزاوار حضرتؒ مرے پاس ارادات کے گوہر کہاں نجم، پھر بھی کروں پیش
خراجِ عقیدت بالفاظِ شورش "جوشہ جی" کے عنوان سے ہے معنون
کہ اٹھے تو آندھی جو گرجے تو بادل جو کڑکے تو بجلی جو بولے تو ہے شیر
نگہ بھر کے دیکھے تو کانپ اٹھیں دشمن ذرا مسکرائے تو بن جائیں ساجن

عبد الستار نجم ابوالخیری (جھنگ)

سید محمد کفیل بخاری

تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن میں موجود ہے۔

۱۹۳۸ء کا زمانہ ہے۔ محلہ لال جہانیاں میلسی شہر (ضلع وہاڑی) کے احاطہ قبرستان میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالی کے عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں نے تبلیغی جلسہ اہتمام کیا ہے۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کا علاقہ، جعلی پیروں اور اندھے مریدوں کی شکار گاہیں اس پر مستزاد شاہ جی کی آمد اور تقریر اسے سہ آتشہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں شاہ جی کی تقریریں جاگیرداروں کے ظلم اور پیران درہم و دینار پر گرز البرز شکن سے کم نہ ہوتی تھیں۔ تقریر کا اعلان سنتے ہی یہ لوگ احتیاطی تدابیر سوچنے لگے۔ چنانچہ علاقہ کے پیر مولوی سید کریم حیدر شاہ نے اپنے ایک مرید محمد شعبان کمہار کو تیار کیا کہ جونہی شاہ جی تقریر شروع کریں تم کھڑے ہو کر سوال جڑ دینا۔ ''آپ رسالت، معراج، اولیاء اور درباروں کے منکر ہو؟ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سوال پر شاہ جی کے عقیدت مند اٹھ کھڑے ہوئے اور مخالف بھی، ارادت مند سائل پر غضبناک ہوئے اور مخالف خوشی سے غل غپاڑہ کرنے لگے۔ مجمع میں ایک ارتعاش پیدا ہوا اور لوگوں کی اکثریت سائل کی اس حرکت پر مشتعل ہو گئی۔ پولیس ''شعبان'' کی گرفتاری کے لئے جلسہ گاہ میں پہنچ گئی۔ اسی شور و غل میں یکایک ایک نعرۂ مستانہ بلند ہوا، دلوں کو ہلا دینے والی گرجدار صدا سنی گئی، شاہ جی پورے جلال کے ساتھ فرما رہے تھے۔

''لوگو! بیٹھ جاؤ، میں دیدۂ بینا رکھتا ہوں۔ جس شخص نے مجھ سے سوال کیا ہے اس کا جواب دینا صرف میرے ذمہ ہے آپ کے نہیں۔ اگر آپ لوگ خاموش ہو کر نہ بیٹھے تو میں تقریر کئے بغیر چلا جاؤں گا''

اس کے ساتھ ہی فضا پر سکون تھی، لوگ گوش بر آواز اور شاہ جی ان سے مخاطب۔ آپ نے محمد شعبان کو سٹیج پر بلایا اور میز پر بٹھا دیا۔

پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا!

''میرا موضوع تو کچھ اور تھا مگر ''شعبان'' تم جانتے ہو۔ فقیر کے میکدے کی روایت ہی کچھ اور ہے۔ یہاں صراحی، مینا اور جام تشنہ لبوں کے منتظر اور ساقی فیاض ہے۔ آج تمہیں نہ مناؤں گا تو لوگ مجھے کیا کہیں گے؟''

شاہ جی نے ان جملوں کے بعد سائل سے فرمایا

''دیکھو! تم میرے مسلمان بھائی ہو آؤ میں تمہیں قرآن سناؤں''

مختصر خطبہ کے بعد آپ نے سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی چار آیات اس انداز میں تلاوت فرمائیں کہ میز پر بیٹھے ہوئے محمد شعبان پر بے خودی اور وجد کی کیفیت طاری ہو گئی پھر سورۂ نجم کی تلاوت شروع کی تو شعبان میز سے زمین پر آ گرا اور جب

فکان قاب قوسین او ادنی

پر پہنچے تو پیر مرید دونوں زمین پر بے خود پڑے تھے۔ پیر اپنے مرید کے سوال پر ہونے والا تماشہ دیکھنے کے لئے سٹیج کے قریب ہی جلسہ گاہ میں موجود تھا۔ کچھ دیر بعد حواس بحال ہوئے تو تقریر ختم ہوچکی تھی اور رات بیت چکی تھی مؤذن کی پکار کفر و شرک کی تاریکیوں کو چیرتی ہوئی مؤمنوں کو بیدار کررہی تھی اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ پیر مرید دونوں شاہ جی کے قدموں پر گر پڑے۔ شاہ جی نے فرمایا

"یہ سر صرف اللہ کی بارگاہ میں جھکاؤ اس لئے کہ عظمت آدم محسن انسانیت ﷺ بھی اسی ذاتِ وحدہ لاشریک لہ کے سامنے سر بسجود ہیں"

پیر نے کہا! شاہ جی مجھے معاف کردیں میں آپ کو غلط سمجھتا تھا مگر آپ نے قرآن سنا کر مجھے غلط ثابت کردیا ہے۔ مرید نے کہا! مجھے بھی معاف کردیں میں تو پیر کے اکسانے پر سوال کے لئے کھڑا ہوا۔ شاہ جی نے فرمایا! جاؤ قرآن پڑھو، قرآن سنو، قرآن سناؤ اور قرآن کی دعوت کو گھر گھر پہنچاؤ۔ تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن میں موجود ہے۔ شاہ جی کی تبلیغی جدوجہد سے بھرپور زندگی کے بے شمار واقعات ہیں جو صفحۂ قرطاس پر نہیں دلوں میں محفوظ ہیں۔

یہ واقعہ حافظ شمس الدین صاحب (ساکن چک نمبر W-B/۶۹ وہاڑی) کی روایت ہے ان کے بقول مولوی سلطان محمود صاحب اور مولوی غلام قادر صاحب بھی اس منظر کے عینی شاہد اور جلسہ میں موجود تھے۔

حافظ ارشاد احمد دیوبندی

عدوہائے محمد کا شکاری دیکھتے جاؤ

کسی سلطان جائر کو کبھی حق بات کہنے سے — ہوا ہرگز نہ دل پہ خوف طاری دیکھتے جاؤ
نہ خاطر میں کبھی لایا کسی کی جاہ و حشمت کو — منال و مال سے پرہیز گاری دیکھتے جاؤ
امیروں سے یہ بے پرواشہنشاہوں سے مستغنی — فقیروں سے مروت انکساری دیکھتے جاؤ
خدا کی راہ میں جھیلے مصائب طیب خاطر سے — یہ عبرت خیز ان کی بردباری دیکھتے جاؤ
گزاری ریل میں یا جیل میں کل زندگی اپنی — رہِ مولیٰ میں یہ دیوانہ واری دیکھتے جاؤ
نہ چھوٹی ان سے ہرگز بھی کسی حالت میں حبل اللہ — صراطِ حق پہ ان کی پائیداری دیکھتے جاؤ
خدائے پاک کے امر و نواہی کی اشاعت میں — رہی ہے عمر بھر تک جہد جاری دیکھتے جاؤ
رگ مرزائیت کو کاٹ ڈالا جذبۂ حق سے — ذرا ابنِ علی کی ذوالفقاری دیکھتے جاؤ
غلامی کو مٹانے میں لگائی جان کی بازی — مسلمانوں کی سچی غمگساری دیکھتے جاؤ
نبوت کی حفاظت میں اٹھائی تیغ حق گوئی — عدوہائے محمد کا شکاری دیکھتے جاؤ
رخِ زیبا سے ہوتا ہے ہویدا نور ایمانی — مجاہد مرد کی صورت پیاری دیکھتے جاؤ
ملک صورت فلک رتبہ سراپا اسوۂ حسنہ — گزاری جس نے حق پر عمر ساری دیکھتے جاؤ
بہت دل گیر ہے ارشاد ان کے ہجر میں دائم — تأسف، حُزن، حسرت اشکباری دیکھتے جاؤ

منظور سعید احمد

آج تک ہے مہک دماغوں میں

اے دلِ بے قرار کیا کہیئے — اور پھر بار بار کیا کہیئے

ذکر کرنا پڑا مجھے ان کا — جو تھے باغ و بہار کیا کہیئے

تھیں ستودہ صفات کے اندر — خوبیاں بے شمار کیا کہیئے

دشمنوں کے لئے قیامت تھا — اور اپنوں سے پیار کیا کہیئے

خرمنِ ارتداد پر برسوں — وہ رہا شُعلہ بار کیا کہیئے

ہیں شناسا قدوم سے اسکے — منزل و رہگزار کیا کہیئے

اپنے نانا کی ہر ادا پر وہ — جان و دل سے نثار کیا کہیئے

کب نہ دار و رسن کو چوم لیا — اس نے دیوانہ وار کیا کہیئے

وہ خطابت ہو یا سیاست ہو — ہر جگہ شہسوار کیا کہیئے

وہ جلال اسکا وہ جمال اسکا — ہائے وہ حسنِ یار کیا کہیئے

آج تک ہے مہک دماغوں میں — گیسوئے مشکبار کیا کہیئے

اک قیامت تھا اس کا جانا بھی — مرگِ احسنِ شعار کیا کہیئے

اے امیرِ وطن تیرے غم میں — ہم ہیں سب سوگوار کیا کہیئے

دل تڑپتے ہیں سینوں کے اندر — آنکھیں ہیں اشکبار کیا کہیئے

یہ فضائے چمن پرندوں کو — اب نہیں سازگار کیا کہیئے

ہر طرف حبس ہے، گھٹن سی ہے — ہر کوئی بیقرار، کیا کہیئے

ہر کلی شاہ جی، گلستان کی — یاس سے ہمکنار، کیا کہیئے

روشنی کی تلاش ہے ہمکو — شبِ تیرہ د تار، کیا کہیئے

ضبط کا حوصلہ نہیں باقی — ہر تنفس ہے بار، کیا کہیئے

اے خداوندِ بیقراراں تُو — کب سُنے گا پکار، کیا کہیئے

نعیم آسی (مرحوم)

"ڈیماگاگ"...؟

عربی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ الفضل ماشہدت بہ الاعداء کہ عظمت وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کریں۔ اور اس محاورہ کی یاد اس نسبت سے آئی کہ پچھلے دنوں مشہور انگریز مصنف ڈبلیو سی اسمتھ (W.C. Smith) کی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" (Modern Islam in India) مطبوعہ ۱۹۴۶ء پڑھ رہا تھا۔ اس میں وہ احرار پارٹی کے زیر عنوان حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"This remerkable man might lay claim to being Indias most effective demagogue" (1)

"ڈیماگاگ" Demagogue یونانی لفظ ہے۔ Demos یونانی زبان میں عوام کو کہتے ہیں اور agoagos رہنمائی یا رہنما کو۔ انگریزی زبان میں یہ لفظ "a popular and a factious orator" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ (۲) یعنی ایک مقبول عوام رہنما اور زبردست مقرر۔ "Collins English Gem Dictionery" میں اس کے معنی "Mob leader or agitator" کے دیئے گئے ہیں۔ (۳) یعنی ایک بڑا رہنما یا ایجی ٹیٹر۔

شاہ جی اپنی ذات میں واقعی ایک زبردست "ڈیماگاگ" Demagogue تھے۔ آپ کی زندگی ایک بہت بڑے انقلابی اور مجاہد کی زندگی ہے۔ جس نے انگریزی استبداد کے پہاڑ سے ٹکرا ٹکرا کر اسکی ہیبت مٹا دی۔ دنیا ان کی بوقلموں شخصیت پر ایک عرصہ تک لکھتی رہے گی اور ہر بار ایک تشنگی سی محسوس کرے گی۔ شاہ جی اگر اپنے سوانح خود لکھتے تو ٹالسٹائی کی خود نوشت یا ابوالکلام کے غبار خاطر کی برابر کی چیز ہوتی۔ اب مستقبل کا سوانح نگار جو کچھ بھی لکھے گا وہ اس کی تمام تر محنت کے باوجود شاید مکمل نہیں ہوگا۔

شاہ جی کی تحریروں کی کمیابی کے دو باعث ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاہ جی بہت کم لکھتے اور غیر ضروری خط و کتابت سے اجتناب برتتے تھے۔ دوسرا انہیں چھپنے چھپانے سے طبعاً بعد تھا۔ آغا شورش کاشمیری ان کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔ "تمام عمر کسی عنوان سے اخبارات میں کوئی بیان نہ دیا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی میں ایک دلچسپ خموشی تھی۔ مجلس احرار نے اپنا اخبار جاری کیا لیکن وہاں بھی ان کی منشا تھی۔ قلم نہیں! راقم کے علم میں صرف ایک مثال ایسی ہے جو اس سے مستثنیٰ ہے اور وہ ایک خط ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد روزنامہ آزاد میں ان کے قلم سے نکلا۔" (۴)

سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا وہ بھی زمانہ کی دست برد کی نذر ہو چکا اور اب لے دے کے اک حسرت ناتمام باقی ہے۔

شاہ جی جب زندہ تھے تو ان کے حریف استعمار کو اعتراف کرنا پڑا کہ "یہ غیر معمولی انسان،

ہندوستان کی سب سے زیادہ اثر آفریں شخصیت ہونے کا نہایت قوی دعویٰ کر سکتا ہے۔"

اور جب انتقال ہوا تو اپنی قوم کے سربراہ، ایوب خاں نے کہا

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات پر مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے۔ شاہ جی جنگ آزادی اور اسلام کے زبردست مجاہد تھے۔ قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت چھین لی ہے۔"

---

(۱) "ماڈرن اسلام ان انڈیا" ص ۲۲۶ از ڈبلیو سی اسمتھ مطبوعہ لندن ۱۹۴۶ء

(۲) چیمبرز ڈکشنری لفظ ڈیماگاگ (Demagogue) مطبوعہ ۱۹۶۰ء

(۳) کولنز انگلش جیم ڈکشنری ص ۱۳۰ (مطبوعہ ۱۹۶۹ء)

(۴) "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" ص ۱۱۹ از شورش کاشمیری، اشاعت جدید ۱۹۷۳ء

سید عطاء المحسن بخاری

وہ ایک شخص ....

وہ سادہ سا، دلیر سا
وہ ایک شخص... شیر سا
کہاں گیا؟
زمین کھا گئی اسے
کہ یاسمے نگل گئے
وہ میرا دل اجاڑ کر
کہاں گیا؟
محبتوں کی تیز لو جلا گیا
لطافتوں کی نرم رو بہا گیا
کثافتوں کو چیرتا، دلوں کو نور دے گیا
کہ وہ شعور دے گیا

جو آج بھی جہانِ نو میں
فاصلوں، مسافتوں، جہالتوں کے باوجود
سعی و جہد کے سفر میں
قافلوں کی رہ گزر میں
اک منار نور ہے

ماہنامہ نقیب ختم نبوت کا امیر شریعت نمبر (جلد اوّل)

آراء و افکار

کی روشنی میں

لندن سے مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کا مکتوبِ گرامی

محترم سید کفیل بخاری صاحب۔ سلامِ مسنون!

ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت کے امیرِ شریعت نمبر (جلد اول) سے نوازنے کی عنایت آپ نے فرمائی اور اس سے یہ انکشاف ہوا کہ آپ مولانا عطاء المحسن بخاری صاحب کے بھائی نہیں ان کی ہمشیرہ کے فرزند ہیں۔ اور پھر اسی انکشاف کے ساتھ بچپن کی ایک یاد بھی ذہن میں اُبھری کہ بریلی میں شاہ جی رحمہ اللہ ہمارے مکان پر ایک دفعہ تشریف لائے تھے تو اس سے پہلے یا اس کے بعد میں نے گھر میں ایک خوبصورت پلنگڑی (شاید مع تکیے اور بستر کے) دیکھی تو والدہ ماجدہ (مرحومہ) سے پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہے؟ انہوں نے مجھے بتایا کہ: ''یہ شاہ عطاء اللہ صاحب بخاری کی بیٹی کے لئے تمہارے والد نے منگائی ہے۔ بتاتے ہیں کہ وہ اُن کی بہت چہیتی بیٹی ہیں''۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ کی والدہ ہی تھیں۔ (۱) میں نے سب سے پہلے آپ کی والدہ ماجدہ کا مضمون پڑھا ہے۔ اللہ اُن کا سایہ آپ بھائیوں پر سلامت رکھے۔ تاہم جن شاہ صاحب کی بیٹی کے لئے میرے والدِ ماجد (۲) نے اس محبت کا اظہار فرمایا ان کے کسی نواسے بلند اقبال کے لئے میری طرف سے بجز دعائے خیر کے اور کسی چیز کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ بلکہ یہ یاد نہ بھی آتی تب بھی محض یہ انکشاف جو امیرِ شریعت نمبر سے ہوا اس کا بھی حکمِ ناطق

۱۔ حضرت امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی ایک ہی بیٹی زندہ رہیں جو میری والدہ ہیں۔ باقی بیٹیاں کم سنی میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ (مدیر)

۲۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ۔

میرے لئے یہی ہوتا۔ کیونکہ ہم لوگوں نے ہمیشہ شاہ جی کے لئے اپنے دلوں میں عزت اور محبت ہی محسوس کی ہے۔
اور پھر ان کی اولاد کے سلسلے میں اس عزت و محبت کا پاس کرنا تو وہ عام انسانی فطرت یا کمزوری ہے کہ اس کے زور پر شعیت کا جادو ہم سنیوں کے سر پہ چڑھ کے بولا ہے۔
امیرِ شریعت نمبر کی دوسری جلد کے لئے کچھ لکھنے کی آپ کی فرمائش میرے لئے اعزاز ہے۔ تین چار بار انہیں دیکھا اور سنا۔ میرا حافظہ بہت خراب ہے تاہم پورے بھروسے کے ساتھ ان کی دو باتیں یاد ہیں۔
ایک۔ بریلی میں جلسے کے دوران میں سالار اعظم احرار سے (غالباً محمد لطیف اُن کا نام تھا) اسٹیج ہی سے مخاطب ہو کر باواز بلند فرمانا کہ: "لطیف وردی اتار لوں گا"۔ اور دوسری لکھنؤ کی احرار کانفرنس (غالباً ۱۹۳۶ء) میں (جبکہ میری عمر ۹-۱۰ برس کی ہو گی) اُن کا دورانِ تقریر اپنی داڑھی پر ہاتھ لے جا کر فرمانا کہ: "تمہیں یہ جڑ دار گنا کہاں پسند آئے گا۔ تمہیں تو چھلی گنڈیری چاہیئے"۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور دنیا و آخرت کی کامرانیاں نصیب کرے۔ (آمین)

والسلام
عتیق الرحمٰن سنبھلی لندن

ماہنامہ نقیب ختم نبوت کے امیرِ شریعت کی یاد میں خصوصی اشاعت پر ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں۔
بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ حضرت امیرِ شریعت رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجلسِ احرار اسلام کو ۴۸ء میں ختم کر دیا تھا اس کذب و افتراء کی اشاعت میں بعض شرعی چہرے بھی پیش پیش ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ "صاحب البیت ادریٰ بمافیہ" کے اصول کے مطابق خاندان امیرِ شریعت کا قول اس بارہ میں قولِ فیصل کی حیثیت کا حامل ہے۔ پھر آپ نے اس خصوصی اشاعت میں شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اُن خطوط کو شائع کر کے جن میں شاہ جی نے جماعتی پالیسی کو بیان کیا اور ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "مجلس کا قیام و بقا بہرحال ایک شرعی امر ہے" ان حضرات کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا ہے۔
۵۸ء کو جب جماعت سے پابندی ختم کر دی گئی تھی تو شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ نے چوک گھنٹہ گھر ملتان میں اپنے ہاتھ سے پرچم کشائی کی تھی۔ یہ گنہگار اپنے طالب علمی کے زمانہ میں اس تقریب میں خود موجود تھا۔ پھر ماسٹر تاج الدین انصاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی سٹیج پر تقریر کی تھی اور ان کی تقریر سے قبل برادر محترم مولانا سید عطاء المحسن بخاری زید لطفہ نے قرآن مجید کی تلاوت کی تھی۔ اور پھر یہ بھی اتفاق ہو گیا کہ اسی یوم باغ لانگے خان میں جماعتِ اسلامی کا جلسہ بھی تھا۔ جو لوگ جماعت اسلامی کی پالیسی سے متاثر تھے وہ یہ کہتے تھے کہ مجلسِ احرار اسلام سے حکومت نے پابندی اس لئے ختم کی ہے تاکہ یہ لوگ جماعتِ اسلامی کا مقابلہ کریں کیونکہ حکومت جماعت کی سیاسی قوت سے خوف زدہ ہے۔ پھر انہی دنوں میں مجلسِ احرار اسلام نے دوسرا جلسہ حسین آگاہی میں منعقد کیا۔ جس میں محترم شیخ حسام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف لائے تھے۔ لیکن اس رات سخت بارش ہونے کی وجہ سے جلسہ جلد ہی برخاست ہو گیا۔ اور انہی دنوں روزنامہ "آزاد" کی ایک خصوصی اشاعت میں شاہ جی کی یہ پرچم کشائی والی تصویر بھی ثبت تھی۔

بہر حال آپ نے یہ ضخیم نمبر شائع کر کے نہ صرف حضرت امیرِ شریعت کی حیات کے مختلف گوشوں کو نئی نسل کے سامنے اجاگر کیا ہے بلکہ اُن کی جماعت مجلس احرار اسلام کی تاریخ بھی محفوظ کر دی ہے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مولانا عبدالحق۔ رحیم یار خان

حضرت شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ علمائے دیوبند نے یہ کب کہا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری مانند ہیں۔ آپ علیہ السلام کا اپنا فرمان ہے کہ:

ایکم مثلی۔

"کون ہے تم میں میری مثل؟" شاہ جی اس پر مزاحاً فرماتے تھے کہ میں کہتا ہوں:

ایکم مثلی۔

"تم میری مثل لے آؤ"۔ جب ایک اُمتی کی مثل نہیں ہے تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثل کہاں سے؟

اگرچہ حضرت شاہ جی اپنے متعلق یہ بات مزاحاً کہا کرتے تھے مگر آج سوچیئے کہ حقیقت میں آپ کتنی بڑی بات فرما گئے ہیں۔ شاہ جی کی مثل تو الگ بات ہے کہ یہ ناممکن ہے۔

کل یوم ابتر۔

مگر جن اسلاف کے ہم اخلاف ہیں خدا کرے کہ ہمارا یہ روحانی تعلق تازیست بلکہ تاحشر قائم رہے۔ جب یہ بڑی بات سوچتا ہوں تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ ایمان اور اسلام کے ڈاکو ہر دن نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ابلیسی فتنوں کی بھرمار کر رہے ہیں۔ وی سی آر اور ویڈیو فلم صالحین کے گھرانوں تک کو ویران کر رہی ہیں۔ استغفراللہ۔ سچ فرمایا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے:

یصبح الرجل مومناً ویمسی کافراً، ویمسی مومناً ویصبح کافراً۔

"کہ آدمی صبح کو مومن اٹھے گا شام کو کافر ہو گا۔ شام کو مومن ہو گا صبح کو کافر اٹھے گا۔ اوکما قال علیہ السلام۔"

ارشاد احمد دیوبندی ظاہر پیر ضلع رحیم یار خان

یوں تو امیر شریعتؒ نمبر کا ایک ایک لفظ سچے موتیوں کی مانند ہے مگر محترمہ و مکرمہ بنتِ امیر شریعتؒ سیدہ اُم کفیل مدظلہا کی تحریر "تری حیات ہے قندیل رہ دکھاتی ہے" میں پیار و محبت، خلوص و شفقت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ پاکباز و عفت مآب بیٹی نے اپنے انتہائی شفیق و عظیم باپ کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ میں اس تحریر کو بمشکل چار قسطوں میں پڑھ سکا۔ ایک دو پیرے پڑھتا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور ہچکی بندھ جاتی۔ مزید پڑھنے کی ہمت نہ رہتی۔ یہ سب خاندانِ امیر شریعتؒ کے خلوص اور للہیت کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے ہم سب زندگی کے آخری سانسوں تک حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے راستے پر چلتے رہیں اور قیامت کے دن ان ہی کے ساتھ ہمارا حشر ہو۔

ابوسفیان تائب حاصل پور منڈی

"امیرِ شریعت نمبر" موصول ہوا۔ از حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ پر عنایتِ خاص فرمائی۔ اللہ پاک آپ کو جزائے خیر عطاء فرمائیں۔ نمبر میں آپ کا اداریہ اور محترمہ خالہ جان (بنتِ امیرِ شریعت) کا مضمون لاجواب ہیں۔ اگرچہ مضمون اشاعت سے پہلے میری نظر سے گزر چکا تھا لیکن اس کے باوجود میں اسے چار پانچ دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ بالخصوص سکھر جیل میں ملاقات کا واقعہ بہت زیادہ اثرانگیز ہے۔ اور اسے پڑھ کر کئی دفعہ پنجابی کا یہ ماہیا بے اختیار زبان پر آیا کہ:

بیری نال بور ہوسی
ساڈے وِل کنڈ کر کے ماہیا رویا ضرور ہوسی

اُن کی شاہ جیؒ سے روح کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی اٹوٹ محبت پورے مضمون پر جابجا پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر حافظہ ایسی نعمتِ خداداد کا بھرپور اظہار اور اس پر اسلوب نگارش مستزاد ہے۔ اللہ پاک انہیں صحتِ کاملہ عاجلہ سے نوازے اور اُن کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر سلامت رکھے (آمین)۔ میں پہلے بھی کئی دفعہ آپ سے گذارش کر چکا ہوں اور اب بھی دست بستہ ملتجی ہوں کہ:

"خدارا! ان کی یادداشتوں کو محفوظ کرنے کا اہتمام کریں۔ شاہ جیؒ سے وابستہ یادیں اور مجلسِ احرارِ اسلام اور اکابرِ احرار سے متعلق حالات و واقعات کا ایسا ذخیرہ ہمیں کہاں سے میسر آئے گا۔ اُن کا دم غنیمت ہے اور اُن سے پوری طرح استفادہ کرنے کا اہتمام ہر لحاظ سے ضروری ہے۔"

محمد عمر فاروق — تلہ گنگ

○

دینی صحافت میں مختصر وقت میں وقیع نام و مقام پانیوالے ماہنامہ "نقیبِ ختمِ نبوت" ملتان کا ۶۴۰ صفحات پر مشتمل امیرِ شریعت نمبر" بلاشبہ رئیسِ ادارہ حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری مدظلہ اور نوجوان فاضل مُدیر جناب سید محمد کفیل بُخاری کے لئے وجۂ اعزاز و تبریک ہے۔

حضرت امیرِ شریعت قدس سرہٗ تاریخ کی اُن نابغۂ روزگار اور عبقری شخصیات میں سے ایک تھے جو تاریخ کا صرف حصہ نہیں بنتیں بلکہ خود تاریخ اُن کے کارناموں سے مُرتب ہوتی اور سنورتی ہے حضرت شاہ صاحبؒ اقلیم خطابت کے وہ فرمانروا اور تاجدار تھے کہ برصغیر کے بڑے بڑے خطباء اور سحر طراز مقرر انکی بارگاہ میں ایک اُدنیٰ درباری کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے سے بڑے مقرر کو شاہ جیؒ کے بعد تقریر کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ برصغیر کے شعلہ بیان اور آتش نوا خطباء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نواب بہادر یار جنگ مولانا احمد سعید دہلویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے حضرات کے نام ضرور آتے ہیں لیکن ان ائمہ خطابت میں بخاریؒ کا مقام سب سے برتر اور بلند تر رہے۔ آپ بلاشبہ پچھلی صدی میں "آیۃ من آیات اللہ" کا مصداق تھے، قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ انسانیت کے لئے باعثِ رشک صفات کو عطاء اللہ شاہؒ کا وجود دے دیا تھا۔ ایمان و ایقان، توکل و عزیمت، بصیرت و فراست، حمیت و غیرت، اخلاص و ہمت، تہور و شجاعت، ایثار و ریاضت، تکلم و خطابت، احساس و لطافت

محبّت و شرافت، فخر و استغنا، حلم و حیا، جود و سخا، فقر و رضا —— کونسی ایسی نعمت تھی جس سے اس درویشِ حق آگاہ کا دامن مالا مال نہ تھا اور پھر اُس مردِ حُر نے دین و ملّت اور قوم و وطن پر اپنے دامن کے ان موتیوں کو یُوں نچھاور کیا کہ کروڑوں افراد کو "بُخاری" کی حمیّت و شجاعت اور حرارتِ ایمانی کی ردائے جمیل اوڑھا دی۔ نصف صدی پر محیط اس عبقری صفت مجاہد کی خدمات کا احاطہ، "نقیبِ ختمِ نبوۃ" کی ایک اشاعت کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس پورے نمبر کے مطالعہ کے بعد بھی یُوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ابھی کتابِ بخاریؒ کا ایک ہی ورق سامنے آیا ہے ع ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔" امیرِ شریعت نمبر میں یُوں تو ایک سے ایک مضمون بڑھ کر ہے مگر جس مضمون پر ان سطور کا عاجز راقم بھی اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کرسکا، وہ بنتِ امیرِ شریعت سیّدہ ام کفیل زید مجدھا کا "تری حیات ہے قندیل....." ہے۔ اس مضمون میں اس مجاہدِ حریتؒ کے صبر و استقامت، تسلیم و رضا اور پھر زندگی کے آخری لمحات کی بے بسی کی تصویر کچھ اِس انداز سے کھینچی ہے کہ پڑھ کر آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی عظمت و محبت کا نقش کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ امیرِ شریعت نمبر میں اگر صرف یہی مضمون ہوتا تو بلاشبہ یہ "نمبر" کہلانے کا مستحق تھا۔ مگر مدیرِ محترم نے امیرِ شریعت کی زندگی پر ایک سو بیس تاریخی مضامین اور ۸۰ کے قریب معیاری نظمیں جمع کر کے اُسے تاریخی حیثیت دے دی ہے اور پھر یہ نوید بھی سُنائی ہے کہ عنقریب امیرِ شریعت نمبر حصہ دوم بھی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ ع خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ

ہم اس تاریخی دستاویز کے مطالعہ کی درخواست ہر اُس قاری سے کرتے ہیں جو گزشتہ پچاس سالہ حفاظتِ دین اور استخلاصِ وطن کی تحریکِ جدوجہد سے شعوری واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(مولانا محمد ازہر مدیر ماہنامہ "الخیر" ملتان۔)

امیرِ شریعت کا خُطبہ مسنونہ

حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اپنے خطاب اور تقریر سے پہلے اپنے مخصوص وجد آفریں اور سحر طراز لہجے میں عموماً یہ خطبہ مسنونہ پڑھا کرتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ، نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ
وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا
وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا
هَادِيَ لَهٗ ۔ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ ۔ وَحْدَهٗ ، وَحْدَهٗ
لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَلَا نَظِيْرَ لَهٗ ، وَلَا مِثْلَ لَهٗ وَلَا مِثَالَ لَهٗ وَلَا مَثِيْلَ
لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ وَلَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا
وَسَنَدَنَا وَشَفِيْعَنَا وَرَحِيْمَنَا وَكَرِيْمَنَا وَهَادِيَنَا وَمُرْشِدَنَا وَمَوْلَانَا
اِمَامَ الْاَتْقِيَآءِ وَسَيِّدَ الْاَنْبِيَآءِ وَخَاتَمَ الْاَنْبِيَآءِ اِمَامَ الْمُتَّقِيْنَ
وَسَيِّدَ الْمُرْسَلِيْنَ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ بِالْيَقِيْنِ مُحَمَّدًا سَيِّدَ الْمُرْسَلِيْنَ
وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ بِالْيَقِيْنِ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ
وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَهٗ وَلَا اُمَّةَ بَعْدَ اُمَّتِهٖ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ
خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ صَلٰوةً
تَكُوْنُ لِلنَّجَاةِ وَسِيْلَةً وَّلِعُلُوِّ الدَّرَجَاتِ كَفِيْلَةً ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى

سَیِّدِنَا وَمَولٰینَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَولٰنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَصْحَابِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَزْوَاجِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تُفَرِّجُ بِھَا الْکُرَبُ وَتَحُلُّ بِھَا الْعُقَدُ وَتُقْضٰی بِہٖ الْحَوَائِجُ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَولٰینَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَولٰینَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اَصْحَابِ سَیِّدِنَا وَمَولٰینَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَزْوَاجِ سَیِّدِنَا وَمَولٰنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تَکُوْنُ لَکَ رِضَاءً اَوْلِحَقِّہٖ اَدَاءً ۔ وَصَلِّ عَلٰی جَمِیْعِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَالْمَلٰئِکَۃِ الْمُقَرَّبِیْنَ وَعَلٰی عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ ٥

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّم دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

مُحَمَّدٌ سیدالکونین وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ من عرب وَمِنْ عَجَمِ

جَاءَتْ لِدَعْوَتِہِ الْاَشْجَارُ سَاجِدۃً

تَمْشِیْ اِلَیْہِ عَلٰی سَاقٍ بلا قَدَمِ

وَقَالَ حَسَّانُ بن ثابت رضی اللہ عنہ فی مدح النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

وَاَحسنُ منک لم ترقط عینی

وَاَجْمَلُ مِنکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّاءً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ

كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

مُحَمَّدٌ بَشَرٌ وَلَيْسَ كَالْبَشَرِ!

بَلْ هُوَ يَاقُوتَةٌ وَالنَّاسُ كَالْحَجَرِ

أَمَّا بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ ۝ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلٰنَا الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَ نَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اگر کسی مدرسے کا جلسہ ہوتا تو عموماً یہ شعر پڑھا کرتے تھے

خوشا مجلس و مدرسہ و خانقاہے

کہ در وے بود قیل وقال محمدؐ!

صدرِ محترم، بزرگانِ ملت، برادرانِ عزیز، میری قابلِ صد احترام ماؤ! بہنو! اور بیٹیو!

سلاسلِ طریقت

۱ امیر المومنین ابوالحسن علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ (وصال ۲۱ رمضان ۴۰ھ)
۲ حضرت خواجہ ابی النصر حسن بصری (وصال ۴ محرم ۱۱۱ھ)
۳ حضرت خواجہ ابی الفضل عبدالواحد بن زید (وصال ۲۷ صفر ۱۷۰ھ)
۴ حضرت ابی الفیض فضیل ابن عیاض (وصال ۳ ربیع الاول ۱۷۰ھ / مزار جنت المعلی مکہ مکرمہ)
۵ حضرت خواجہ سلطان ابراہیم ادھم بلخی فاروقی (وصال ۲۶ جمادی الاول ۱۸۰ھ / مزار بلاد روم)
۶ حضرت خواجہ سدید الدین حذیفہ مرعشی (وصال ۲۴ شوال ۲۵۲ھ.............)
۷ حضرت خواجہ امین الدین ابی ہبیرہ بصری (وصال ۷ شوال ۲۷۹ھ)
۸ حضرت خواجہ ممشاد علودینوری (وصال ۴ محرم ۲۹۹ھ)
۹ سر سلسلہ چشتیہ حضرت خواجہ ابی اسحاق شامی چشتی (مرزا......... عکہ، ملک......... شا،، / وصال ۳۴۳ھ)
۱۰ حضرت خواجہ سید ابی احمد ابدال ابن سلطان فرسنافہ چشتی سید حسنی (ولادت ۲۶۰ھ وفات......... غرۂ جمادی الثانی ۳۵۵ھ / مزار قصبہ چشت)
۱۱ حضرت خواجہ سید ابی محمد ابن خواجہ ابی احمد ابدال حسنی چشتی (وصال ربیع الثانی ۱۱۴ھ / مزار چشت)
۱۲ حضرت خواجہ سید ناصر الدین ابی یوسف نقوی چشتی خواہر زادہ حضرت ابی محمد (وصال ۴۵۹ھ / مزار چشت)
۱۳ حضرت خواجہ سید قطب الدین مودود ابن حضرت ابی یوسف نقوی چشتی (وصال غرۂ رجب ۵۲۷ھ / مزار چشت)
۱۴ حضرت خواجہ مخدوم حاجی شریف زندنی (وصال ۱۰- رجب ۶۱۲ھ بعمر ۱۲۰ سال)
۱۵ حضرت خواجہ عثمان ہارونی (وصال ۵ شوال ۶۱۷ھ / مزار مکہ مکرمہ)
۱۶ حضرت خواجہ سید معین الدین حسن سنجری اجمیری رضوی (وصال ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ)
۱۷ حضرت خواجہ سید قطب الدین بختیار اوشی کاکی تقوی (وصال ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ- مہرولی

شریف۔ دہلی)

۱۸ حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر اجودھنی فاروقی (۵٦۴ھ تا ٦۵۹ھ / ۵ محرم پاک پتن)

۱۹ حضرت خواجہ سلطان المشائخ سید نظام الدین محمد بدایونی بخاری رضوی (٦۳۴ ۷٦۵ھ / ۱۷ ربیع الثانی / مزار مضافات دہلی)

۲۰ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ اودھی دہلوی (۷٦۷ھ تا ۷۵۷ھ۔ ۱۳ رمضان۔ مزار دہلی)

۲۱ حضرت خواجہ کمال الدین دہلوی (وصال ۷۵٦ھ مزار دہلی.........)

۲۲ حضرت خواجہ سراج الدین بن خواجہ کمال الدین (وصال ۷۷۰ھ مزار پیران پٹن برکات پورہ گجرات)

۲۳ حضرت خواجہ علم الدین بن خواجہ سراج الدین (وصال ۸۹۵ھ / مزار پیران پٹن گجرات)

۲۴ حضرت خواجہ محمود راجن بن خواجہ علم الدین (وصال ۹۰۰ھ / مزار پیرا ن پٹن گجرات)

۲۵ حضرت خواجہ جمال الدین جمن بن خواجہ محمود راجن (وصال ۹۸۰ھ / مزار احمد آباد گجرات)

۲٦ حضرت خواجہ جمال الدین حسن محمد نوری (وصال ۹۸۲ھ / مزار احمد آباد گجرات)

۲۷ حضرت خواجہ قطب شمس الدین محمد بن خواجہ حسن محمد (وصال ۱۰۴۱ھ / مزار احمد آباد.........)

۲۸ حضرت خواجہ یحیٰ مدنی نبیرہ خواجہ محمد (وصال ۱۱۲۲ھ بعمر ۱۱۲ سال / مزار جنت البقیع مدینہ منورہ.........)

۲۹ حضرت خواجہ کلیم اللہ جہان آبادی (وصال ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ مزار دہلی.........)

۳۰ حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی (وصال ۱۱۴۲ھ / مزار اورنگ آباد دکن)

۳۱ حضرت خواجہ فخر الدین بن خواجہ نظام الدین (۱۱۲٦ھ تا ۱۱۹۹ھ۔ ۱۷ جمادی الثانی۔ مزار مہرولی شریف مضافات دہلی)

۳۲ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی (۱۱۴۳ تا ۱۲۰۵ھ۔ ۳ ذی الحجہ۔ مزار چشتیاں بہاولپور)

۳۳ حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی (۱۱۸۳ھ تا ۱۲٦۷ھ۔ ۷ صفر۔ مزار تونسہ ضلع ڈیرہ غازیخان)

۳۴ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی (وصال ۱۳۰۰ھ۔ ۲۴ صفر۔ مزار سیال ضلع سرگودھا)

۳۵ حضرت پیر سید مہر علی شاہ حسنی گیلانی (۱۲۷۵ھ تا ۱۳۵٦ھ۔ ۲۹ صفر۔ گولڑہ ضلع راولپنڈی)

۳٦ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ حسنی بخاری (یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ تا ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ۔ ملتان)

رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ امدادیہ

شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
۲ حضرت خواجہ حسن بصری
۳ حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید
۴ حضرت خواجہ فضیل بن عیاض
۵ حضرت سلطان ابراہیم ادھم بلخی
۶ حضرت خواجہ حذیفہ مرعشی
۷ حضرت خواجہ ابوہبیرہ بصری
۸ حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری
۹ حضرت خواجہ ابواسحاق شامی
۱۰ حضرت خواجہ ابواحمد ابدال چشتی
۱۱ حضرت خواجہ ابومحمد چشتی
۱۲ حضرت خواجہ ابویوسف چشتی
۱۳ حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی
۱۴ حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی
۱۵ حضرت خواجہ عثمان ہارونی
۱۶ حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری
۱۷ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
۱۸ حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر
۱۹ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر
۲۰ حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی
۲۱ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی
۲۲ حضرت شیخ احمد عبدالحق رودولوی
۲۳ حضرت شیخ عارف رودولوی
۲۴ حضرت شیخ محمد رودولوی
۲۵ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی
۲۶ حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری
۲۷ حضرت شیخ نظام الدین بلخی
۲۸ حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی
۲۹ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی
۳۰ حضرت سید شاہ محمدی
۳۱ حضرت شاہ محمد مکی
۳۲ حضرت شاہ عضد الدین امروہی
۳۳ حضرت شاہ عبدالہادی امروہی
۳۴ حضرت شاہ عبدالباری امروہی
۳۵ حضرت شاہ عبدالرحیم شہید ولائتی
۳۶ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی
۳۷ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۳۸ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
۳۹ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری
۴۰ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری
۴۱ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمتہ اللہ علیہم اجمعین

۲ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ گیسودرازیہ قدوسیہ امدادیہ

شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ

۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
۲ حضرت خواجہ حسن بصری
۳ حضرت خواجہ عبد الواحد بن زید
۴ حضرت خواجہ فضیل بن عیاض
۵ حضرت سلطان ابراہیم ادھم بلخی
۶ حضرت خواجہ حذیفہ مرعشی
۷ حضرت خواجہ ابو ہبیرہ بصری
۸ حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری
۹ حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی
۱۰ حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتی
۱۱ حضرت خواجہ ابو محمد چشتی
۱۲ حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی
۱۳ حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی
۱۴ حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی
۱۵ حضرت خواجہ عثمان ہارونی
۱۶ حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری
۱۷ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
۱۸ حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر
۱۹ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی
۲۰ حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی
۲۱ حضرت سید محمد حسینی گیسودراز گلبرگوی
۲۲ حضرت شیخ صدر الدین اودھی
۲۳ حضرت شیخ علاء الدین اودھی
۲۴ حضرت شیخ ابن حکیم اودھی
۲۵ حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی
۲۶ حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری
۲۷ حضرت شیخ نظام الدین بلخی
۲۸ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی
۲۹ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی
۳۰ حضرت سید شاہ محمدی
۳۱ حضرت شاہ محمد مکی
۳۲ حضرت شاہ عضد الدین امروہی
۳۳ حضرت شاہ عبد الہادی امروہی
۳۴ حضرت شاہ عبد الباری امروہی
۳۵ حضرت شاہ عبد الرحیم شہید ولایتی
۳۶ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی
۳۷ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۳۸ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
۳۹ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائپوری
۴۰ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائپوری
۴۱ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمتہ اللہ علیہم اجمعین

۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
۲ حضرت خواجہ حسن بصری
۳ حضرت خواجہ حبیب عجمی
۴ حضرت خواجہ داؤد طائی
۵ حضرت خواجہ معروف کرخی
۶ حضرت خواجہ سری سقطی
۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی
۸ حضرت شیخ ابوبکر شبلی
۹ حضرت عبدالواحد بن عبدالعزیز تمیمی
۱۰ حضرت شیخ ابوالفرح طرطوسی
۱۱ حضرت شیخ ابوالحسن علی الھنکاری
۱۲ حضرت شیخ ابوسعید مخزومی
۱۳ غوث الثقلین حضرت سید عبدالقادر جیلانی
۱۴ حضرت سید عبدالرزاق القادری
۱۵ حضرت سید زین الدین
۱۶ حضرت سید یحییٰ زاہد
۱۷ حضرت سید عبدالوہاب
۱۸ حضرت سید عبدالقادر
۱۹ حضرت سید احمد قدسی
۲۰ حضرت مولانا محمد مغربی
۲۱ حضرت سید عبدالحق
۲۲ حضرت سید الیاس مغربی
۲۳ حضرت سید شاہ قمیص الاعظم قادری
۲۴ حضرت سید شاہ محمد
۲۵ حضرت سید ابومحمد
۲۶ حضرت سید محمد غوث
۲۷ حضرت سید عبدالحق
۲۸ حضرت سید عبدالرزاق
۲۹ حضرت سید رحم علی شاہ قمیصی
۳۰ حضرت سید حاجی عبدالرحیم شہید ولایتی
۳۱ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی
۳۲ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۳۳ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
۳۴ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری
۳۵ قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری
۳۶ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔

سلسلہ عالیہ قادریہ مجددیہ غفوریہ رحیمیہ

شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
۲ حضرت خواجہ حسن بصری
۳ حضرت خواجہ حبیب عجمی
۴ حضرت خواجہ داؤد طائی
۵ حضرت خواجہ معروف کرخی
۶ حضرت خواجہ سری سقطی
۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی
۸ حضرت شیخ ابوبکر شبلی
۹ حضرت شیخ عبدالواحد بن عبدالعزیز تمیمی
۱۰ حضرت شیخ ابوالفرح طرطوسی
۱۱ حضرت شیخ ابوالحسن علی الہکاری
۱۲ حضرت شیخ ابوسعید مخزومی
۱۳ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی
۱۴ حضرت سید عبدالرزاق
۱۵ حضرت شاہ شرف الدین قتال
۱۶ حضرت سید عبدالوہاب
۱۷ حضرت سید بہاء الدین
۱۸ حضرت سید شاہ عقیل
۱۹ حضرت شاہ شمس الدین صحرائی
۲۰ حضرت شاہ گدا رحمٰن بن ابی الحسن
۲۱ حضرت سید شمس الدین عارف
۲۲ حضرت شاہ گدا رحمٰن ثانی
۲۳ حضرت شاہ فضیل
۲۴ حضرت شاہ کمال کیتھلی
۲۵ حضرت شاہ سکندر کیتھلی
۲۶ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی
۲۷ حضرت سید آدم بنوری
۲۸ حضرت شاہ حبیب پشاوری
۲۹ حضرت شاہباز پشاوری
۳۰ حضرت شاہ مومن گگری
۳۱ حضرت محمد صدیق بسیری
۳۲ حضرت حافظ محمد صاحب
۳۳ حضرت محمد شعیب توردھیری
۳۴ قطب العارفین حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات
۳۵ قطب الاقطاب حضرت میاں جیو عبدالرحیم سہارنپوری
۳۶ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری
۳۷ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری
۳۸ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

⑤ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ آفاقیہ امدادیہ

❶ شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱ خلیفہ رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

۲ صاحب رسول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

۳ حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر

۴ حضرت جعفر صادق

۵ حضرت سلطان بایزید بسطامی

۶ حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی

۷ حضرت خواجہ ابو علی فارمدی

۸ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی

۹ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی

۱۰ حضرت خواجہ عارف ریوگری

۱۱ حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی

۱۲ حضرت خواجہ عزیزان علی رامیتنی

۱۳ حضرت خواجہ محمد باباسماسی

۱۴ حضرت سید میر کلال

۱۵ حضرت سید بہاء الدین نقشبند

۱۶ حضرت خواجہ علاء الدین عطار

۱۷ حضرت مولانا یعقوب چرخی

۱۸ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار

۱۹ حضرت مولانا محمد زاہد

۲۰ حضرت خواجہ درویش محمد

۲۱ حضرت مولانا خواجگی امکنگی

۲۲ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ

۲۳ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

۲۴ حضرت خواجہ محمد معصوم

۲۵ حضرت خواجہ محمد نقشبند ثانی

۲۶ حضرت خواجہ محمد زبیر

۲۷ حضرت خواجہ ضیاء اللہ

۲۸ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی

۲۹ حضرت مولانا نصیر الدین دہلوی

۳۰ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی

۳۱ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

۳۲ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری

۳۳ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری

۳۴ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

⑥ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ ولی اللّٰہیہ امدادیہ

شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ

۱ خلیفہ رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
۲ صاحب رسول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ
۳ حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر
۴ حضرت جعفر صادق
۵ حضرت موسیٰ کاظم
۶ حضرت علی رضا
۷ حضرت خواجہ معروف کرخی
۸ حضرت خواجہ سری سقطی
۹ حضرت خواجہ جنید بغدادی
۱۰ حضرت خوجہ ابوبکر شبلی
۱۱ حضرت خواجہ ابوالقاسم نصر آبادی
۱۲ حضرت خواجہ ابوعلی وقاق
۱۳ حضرت امام ابوالقاسم قشیری
۱۴ حضرت خواجہ ابوعلی فارمدی
۱۵ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی
۱۶ حضرت خوجہ عبدالخالق غجدوانی
۱۷ حضرت خواجہ عارف ریوگری
۱۸ حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی
۱۹ حضرت خواجہ عزیزان علی رامیتنی
۲۰ حضرت خواجہ محمد باباسماسی
۲۱ حضرت سید میر کلال
۲۲ حضرت سید بہاء الدین نقشبند
۲۳ حضرت خواجہ علاء الدین عطار
۲۴ حضرت مولانا یعقوب چرخی
۲۵ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار
۲۶ حضرت مولانا محمد زاہد
۲۷ حضرت خواجہ درویش محمد
۲۸ حضرت مولانا خواجگی امکنگی
۲۹ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ
۳۰ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی
۳۱ حضرت سید آدم بنوری
۳۲ حضرت سید عبداللہ اکبر آبادی
۳۳ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی
۳۴ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۳۵ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی
۳۶ حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی
۳۷ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی
۳۸ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۳۹ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
۴۰ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری
۴۱ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری
۴۲ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمتہ اللہ علیہم اجمعین

١ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

٢ حضرت خواجہ حسن بصری

٣ حضرت خواجہ حبیب عجمی

۴ حضرت خواجہ داؤد طائی

۵ حضرت خواجہ معروف کرخی

٦ حضرت خواجہ سری سقطی

۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی

٨ حضرت خواجہ ابوبکر شبلی

٩ حضرت خواجہ ابوالقاسم نصر آبادی

١٠ حضرت خواجہ ابوعلی دقاق

١١ حضرت امام ابوالقاسم قشیری

١٢ حضرت خواجہ ابوعلی فارمدی

١٣ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی

١۴ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی

١۵ حضرت خواجہ عارف ریوگری

١٦ حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی

١۷ حضرت خواجہ عزیزان علی رامیتنی

١٨ حضرت خواجہ محمد باباسماسی

١٩ حضرت سید میر کلال

٢٠ حضرت سید بہاء الدین نقشبند

٢١ حضرت خواجہ علاء الدین عطار

٢٢ حضرت مولانا یعقوب چرخی

٢٣ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار

٢۴ حضرت مولانا محمد زاہد

٢۵ حضرت خواجہ درویش محمد

٢٦ حضرت مولانا خواجگی امکنگی

٢۷ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ

٢٨ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

٢٩ حضرت سید آدم بنوری

٣٠ حضرت شیخ سعدی بلخاری لاہوری

٣١ حضرت شیخ محمد یحیٰ اٹکی

٣٢ حضرت شیخ محمد عمر چمکنی پشاوری

٣٣ حضرت سید شاہ محمد سدومی

٣۴ حضرت خواجہ محمد صدیق بُنیری

٣۵ حضرت حافظ محمد صاحب

٣٦ حضرت خواجہ محمد شعیب تورڈھیری

٣۷ قطب العارفین حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات

٣٨ قطب الاقطاب حضرت میانجیو عبدالرحیم سہانپوری

٣٩ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری

۴٠ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدلقادر رائپوری

۴١ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمتہ اللہ علیہم اجمعین

(۸) سلسلہ عالیہ سہروردیہ قدوسیہ ولی اللہیہ امدادیہ

شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ

۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
۲ حضرت خواجہ حسن بصری
۳ حضرت خواجہ حبیب عجمی
۴ حضرت خوجہ داوٗد طائی
۵ حضرت خواجہ معروف کرخی
۶ حضرت خواجہ سری سقطی
۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی
۸ حضرت خواجہ ممشاد علودینوری
۹ حضرت شیخ احمد دینوری
۱۰ حضرت شیخ ابو محمد بن عبداللہ
۱۱ حضرت شیخ وجیہ الدین عبدالقاہر سہروردی
۱۲ حضرت شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی
۱۳ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی
۱۴ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی
۱۵ حضرت شیخ صدر الدین عارف ملتانی
۱۶ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی
۱۷ حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں
۱۸ حضرت سید اجمل بہرائچی
۱۹ حضرت سید بڈھن بہرائچی
۲۰ حضرت شیخ درویش بن قاسم اودھی
۲۱ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی
۲۲ حضرت شیخ رکن الدین گنگوہی
۲۳ حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی
۲۴ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی
۲۵ حضرت سید آدم بنوری
۲۶ حضرت سید عبداللہ اکبر آبادی
۲۷ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی
۲۸ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۲۹ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی
۳۰ حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی
۳۱ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی
۳۲ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۳۳ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
۳۴ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری
۳۵ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری
۳۶ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمتہ اللہ علیہم اجمعین

مدارس احرار اور مستقبل کے منصوبے

مجلس احرار اسلام، دینی انقلاب کی داعی جماعت ہے۔ یہ انقلاب دینی مزاج اور دینی ماحول پیدا کئے بغیر ممکن نہیں۔ اکابر احرار نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ یہ کام دینی مدارس میں ہی باحسن انجام دیا جاسکتا ہے۔ نئی نسل کی ذھن سازی اور تربیت کے لئے ان مدارس میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو دینی انقلاب کی منزل کو قریب تر کر دے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے شعبۂ تبلیغ کے ساتھ ساتھ شعبۂ تعلیم بھی سرگرم عمل ہے اور درج ذیل مدارس تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔

۱	مدرسہ ختم نبوت	مسجد احرار	ربوہ ضلع جھنگ فون: 211523
۲	بخاری پبلک سکول	"	"
۳	مدرسہ معمورہ	جامع مسجد ختم نبوت	دار بنی ہاشم، ملتان فون: 511961
۴	مدرسہ معمورہ	مسجد نور	تغلق روڈ، ملتان
۵	مدرسہ محمودیہ	مسجد المعمور	ناگڑیاں، گجرات
۶	دارالعلوم ختم نبوت	جامع مسجد چیچاوطنی	فون: 2112
۷	احرار ختم نبوت مرکز	مسجد عثمانیہ	چیچاوطنی
۸	مدرسہ ختم نبوت	مسجد ختم نبوت	شہزاد کالونی صادق آباد
۹	مدرسہ ختم نبوت	مسجد ختم نبوت	نواں چوک، گڑھاموڑ
۱۰	مدرسۃ العلوم الاسلامیہ	جامع مسجد	گڑھاموڑ (وہاڑی) فون: 13
۱۱	مدرسہ ابوبکر صدیق	جامع مسجد ابوبکر صدیق	تلہ گنگ (چکوال)
۱۲	بستان عائشہ (برائے طالبات)		دار بنی ہاشم، ملتان فون: 511356
۱۳	مدرسۃ البنات (برائے طالبات)		گڑھاموڑ
۱۴	سادات اکیڈمی (برائے طلباء)		دار بنی ہاشم، ملتان
۱۵	مدرسہ احرار اسلام		بستی شام دین (قائم پور)
۱۶	مدرسہ احرار اسلام رحیمیہ		بستی گودڑی (حاصل پور)
۱۷	مدرسہ احرار اسلام		مسجد سیدنا علی المرتضیٰ، چکڑالہ، ضلع میانوالی
۱۸	مدرسہ و مسجد معاویہ	جھنگ روڈ	ٹوبہ ٹیک سنگھ

ان میں سے بعض مدارس اپنے اخراجات کے سلسلہ میں خود کفیل ہیں اور جماعت کی سرپرستی میں ہی کام کر رہے ہیں۔ جن مدارس کا کفیل مرکز ہے ان میں باشاہرہ تعلیم و تدریس اور دیگر امور سرانجام دینے والے افراد کی کل تعداد ۲۰ ہے۔ ان مدارس کے اخراجات کا سالانہ بجٹ دس لاکھ روپے ہے۔ مستقبل کے تعلیمی، تنظیمی اور تعمیری منصوبوں کی تکمیل پر تقریباً تیس لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ تعاون آپ کریں دعاء اور کام ہم کریں گے۔ اجر اللہ پاک دیں گے۔

ترسیل زر کے لئے: ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری، دار بنی ہاشم۔ مہربان کالونی ملتان۔
اکاؤنٹ نمبر 29932 حبیب بینک حسین آگاہی ملتان۔

"مخلوق میں جب تک خالق کا نظام نہیں چلایا جائے گا
دنیا میں امن نہ ہو گا۔"

سید [illegible]

۲۸ر دسمبر ۴۵ء

بمبئی دفتر ہلال نو

www.ahrar.org.pk